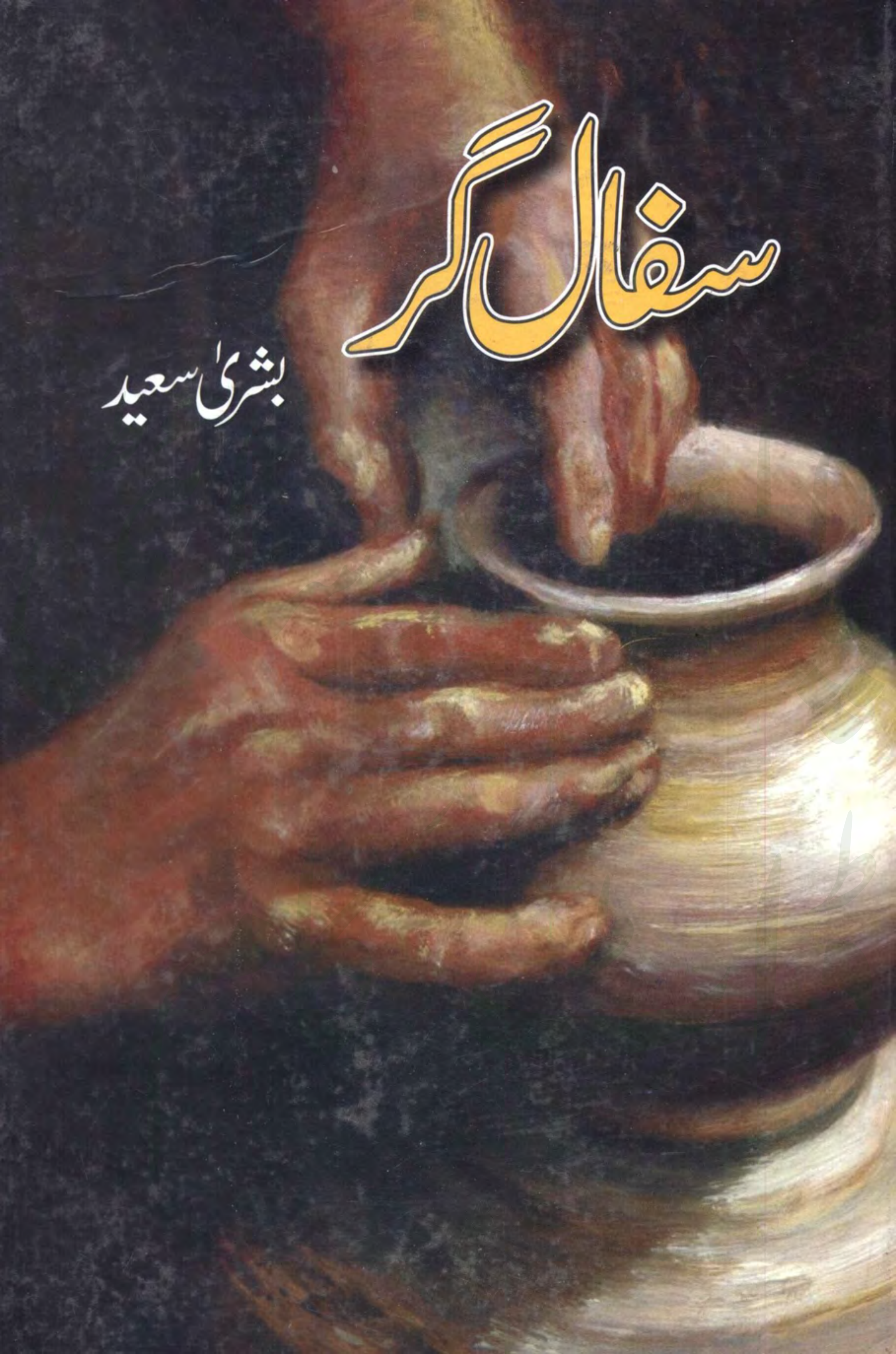

سفال گر
بشریٰ سعید

پیش لفظ

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں ''گیلی مٹی'' کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا ''کمہار'' تربیت کے ''چاک'' پہ دھرتا ہے اور بازارِ حیات کی ''مانگ'' کو مدنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی ''انگلیاں'' ہر برتن کے بدن پر ریتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ ''سانچے'' حالات کے ''آوے'' میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا ''ظرف'' اور ''نصیب'' اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ ''سفال گر'' کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ ''آوے'' کی ''دہک'' برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی ''خریدار'' میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر ''ظرف'' کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو، مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

یہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں، مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھئے گا۔ یہ جیتے جاگتے، وقوف رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

سفال گر میری اب تک کی تحریروں میں سب سے طویل ہے۔ میں اسے لکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ جب یہ کہانی میرے دماغ میں نشوونما پانے لگی تو مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں اسے نہیں لکھ پاؤں گی کہانی مشکل تھی، کردار اس سے زیادہ مشکل اور پاپولر فکشن لکھنے والے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے کہانی کو دلچسپ بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ قریب دو سال تک میں اسے ٹالتی رہی لیکن بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو خود کو لکھوا کر چھوڑتی ہیں۔ سفال گر بھی ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس کہانی نے میری راتوں کی نیندیں اڑا دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ آپ کی نیند پر کس قدر اثر انداز ہوگی، یہ آپ کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا۔

اس کتاب کو میرے قارئین تک پہنچانے میں القریش پبلی کیشنز اور محمد علی قریشی صاحب نے جو کردار ادا کیا اس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔

بشریٰ سعید

دھرتی ایک سرمئی بانات کی مانند بچھی تھی اور رات ایک مشک فام نرتکی تھی جو اس سرمئی بانات پر بچے تلے قدموں سے ناچتی تھی۔ روشنیوں کے زیورات سے سجی، خوشبوؤں میں بسی اس شیام رنگ رقاصہ کے ہر غمزے میں ایک بھید تھا۔

شہر اس کے کانوں میں شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتا تھا۔ اس مصروف سڑک پر وہ یوں قدم گھسیٹ رہی تھی، جیسے اس کے پاؤں گیلی روئی سے بنے ہوئے ہوں۔

بار سے نکلتے ہوئے تین کورین لڑکوں کو دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے اپنی دلکش ترین مسکراہٹ چہرے پر تانی اور مخمور آواز میں پکار کر انہیں متوجہ کیا۔

''کیا ارادہ ہے......؟ ایک گھنٹے کے پچاس Bucks خیال برا نہیں......کیا سوچتے ہو؟''

وہ چند ثانیے خاموشی سے اسے گھورتے رہے پھر ان تینوں نے آپس میں سوالیہ نظروں کا تبادلہ کیا اور اتنی شدت سے ہنسے کہ ان کی چندھی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

''اگر پچاس اپنی جیب سے ہمیں دو پھر بھی تم مہنگی ہو۔''

ان میں سے ایک زرد رو لڑکے نے جس کے دانتوں پر بریسز braces لگے تھے ہنسی کے دوران بمشکل کہا۔

''تم ہارر فلموں میں قسمت آزماؤ'' وہ بے تحاشا ہنستے چلے گئے۔

وہ بت بنی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

یہ دوسری بار ہوا تھا!

اس چربیلے میکسیکن نے بھی اسے بدصورت کہہ کر دھتکار دیا تھا اور تب اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا کہ وہ نشے میں تھا لیکن کورین لڑکوں نے بھی وہی بات کہی تھی، اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور دیر تک اپنے عکس پر نظریں جمائے رہی۔ کہیں کچھ غلط نہیں تھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، ویسی ہی رنگت، اس کے سارے نقوش ہمیشہ کی طرح ہی تھے۔ پھر اس کے ساتھ دوبارا ایسا کیوں ہوا تھا؟

کیا اس کی سماعت اسے دھوکہ دے رہی تھی یا شاید وہ خود نشے میں تھی۔ مگر کس شے کا نشہ......ان پانچ سگریٹوں کا جو پچھلے ایک گھنٹے میں اس نے پھونک ڈالے تھے۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ چھٹا سگریٹ سلگا کر اس نے ایک گہرا کش لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈھلتی عمر کے ہسپانوی مرد سے مخاطب تھی، جو پارکنگ لاٹ سے گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

''بیس bucks جواب دینے سے پہلے سوچو کہ اس سے کم میں تم کیا خرید سکتے ہو۔ شاید چند ہاٹ ڈاگ۔''

کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

وہ خاموش رہا اور ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

''پندرہ۔''

اس نے ایک کوشش اور کر دیکھی۔

''اگر تم دنیا کی آخری عورت ہو تو بھی میرا جواب نہ میں ہوگا۔ تم نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ تم عورت نہیں عفریت ہو۔''

اس پر گویا کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ خوف میں بدل رہی تھی۔

گنجے جرمن اور اس کے ایشیائی ساتھی کے پاس جاتے ہوئے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔

''دس bucks تم دونوں کے۔''

''Hassliche Fratze۔'' جرمن نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''اس نے کیا کہا ہے؟'' اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ چلائی تھی۔

''وہی جو تم ہو۔'' ایشیائی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''ڈراؤنا چہرہ۔''

اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اس کے کانوں میں ناقوس بجا رہا تھا۔

''Hassliche Fratze...... ڈراؤنا چہرہ...... عفریت۔''

وہ بھاگتے ہوئے سڑک کے پرلے کنارے پہنچی اور لوگوں کے چہروں کو کھوجنے لگی۔ وہاں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر عمر کے مرد تھے مگر اسے ایک بدصورت مرد کی تلاش تھی، جس کی شکل اتنی گھناؤنی ہو کہ کوئی عورت پیار کرنا تو کجا ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتی ہو۔ پھر وہ اسے مل گیا تھا۔

وہ ایک سیاہ فام تھا، جس کا ہونٹ نصف سے زائد کٹا ہوا تھا اور اوپری جبڑے کے پیلے دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں ایک پھریری دوڑ گئی تھی۔ وہ گفٹ شاپ کے دروازے میں کھڑا ونڈ چائمز کو اپنے بھدے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے چھیڑ رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی اس نے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔

''تمہارے لیے صرف پانچ bucks......'' حروف اس کے تالو سے چمٹ گئے تھے۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔ اس کٹے ہوئے ہونٹ نے ایک ابدی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چسپاں کر رکھی تھی۔

''ایک بات ایمانداری سے بتاؤں۔'' اس نے سانس روک لیا تھا۔

''میں نے اتنا خوفناک چہرہ اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔''

وہ دوبارہ ونڈ چائمز سے کھیلنے لگا تھا۔

وہ کسی کافکائی کابوس (جرمن مصنف فرانز کافکا کے تخلیق کردہ دہشت ناک خواب) میں مبتلا تھی اور اس بھیانک خواب کا کوئی اختتام نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ کر کاؤنٹر پر پہنچی اور سیلز گرل کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر چلانے لگی۔

''مجھے دیکھو کیا میں بدصورت ہوں۔ دیکھو میرا چہرہ کیا تمہیں مجھ سے خوف آ رہا ہے؟''

''دفع ہو جاؤ...... باؤلی کتیا۔''

وہ اس سے اپنا بازو چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔

''شراب پینے سے پہلے خود کو کمرے میں بند کر لیا کرو۔''

''اس شہر کا سب سے بدصورت مرد مجھے کہتا ہے۔ اسے دیکھو کیا وہ اس قابل ہے کہ کوئی عورت اس کے قریب جائے۔ وہ مجھے بدصورت کہتا ہے۔''

''یہ واہیات مذاق کرنے کے لیے تمہیں میں ہی ملی ہوں۔ کیا میں نہیں جانتی وہ ریمنڈ مادرزاد (پیدائشی) اندھا ہے۔''

اسے لگا جیسے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا ہو۔ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر ڈھے گئی تھی۔ اس کا پورا بدن یوں لرزتا تھا جیسے آندھی کی زد میں آیا ہوا خشک گھاس کا تنکا۔

اس صبح کا آغاز بھی دوسری تمام صبحوں کی طرح ہوا تھا۔ آج بھی اس کی آنکھ الارم کے شور کی بجائے اس ملائم آواز سے کھلی تھی جو روز اس کے کانوں کی لوؤں کو بوسے دے کر اسے نرمی سے جگاتی تھی۔

''Twenty four robbers came knocking at my door''

وہ دیوانی بڑھیا روزانہ اس وقت بچوں کی ایک Jump Rope Rhyme (ایسا گیت جو بچے رسی پھلانگنے کے کھیل میں گاتے ہیں) گنگناتے ہوئے کھڑکی کے قریب سے گزرتی تھی۔

اس نے ادھ مندی آنکھوں سے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا جس پر مسلسل جھماکے ہو رہے تھے۔ رات کو وہ ٹیلی ویژن چلتا ہوا چھوڑ کر سو گئی تھی۔ تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر اس نے ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیا، ٹیلی ویژن آف کیا اور پاؤں سلیپروں میں گھسیڑتے ہوئے ان مانے جی سے اٹھ کر ٹوائلٹ کی جانب بڑھ گئی۔

بڑھیا کی ڈوبتی آواز کھڑکی کے کنارے پر پھیلی ہوئی سبز بیل کے چکنے پتوں سے پھسل کر کمرے کے فرش پر سر کے بل گرتی تھی اور معدوم ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو اس نے وہ بوسیدہ اسکرٹ پہن رکھا تھا، جس کا رنگ مسلسل دھلائی اور مٹیلے دھبوں کے باعث ایسا ہو چکا تھا کہ کوئی بھی اس کی اصل رنگت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ الجھے بالوں میں الٹی سیدھی انگلیاں چلاتے ہوئے بیڈ کے نیچے سے مٹ میلے بھورے جوتے کا ایک پاؤں برآمد کیا اور دوسرے پاؤں کی تلاش میں دائیں بائیں نگاہ دوڑانے لگی۔ وہ ڈسٹ بن میں پرانے اخباروں کے پلندے تلے ٹھنسا ہوا ملا تھا۔ بائیں پنڈلی کے گرد جوتے کا اسٹریپ لپیٹتے ہوئے اس نے ایک نظر رسٹ واچ کو دیکھا تھا۔ اسے معمول سے کچھ بڑھ کر دیر ہو چکی تھی لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ اس کے سب ہی اساتذہ اس کے دیر سے پہنچنے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ کسی دن اگر وہ جلدی کلاس روم میں پہنچ جاتی تو وہ پریشان ہو جاتے یہ اور بات تھی کہ اب تک ایسا دن طلوع نہیں ہوا تھا۔

اب اس کی تیاری کا ایک ہی مرحلہ باقی تھا جو سب سے کٹھن بھی تھا۔ اسے یاد کرنا تھا کہ کل اسکول سے واپس آ کر اس نے اپنی سائیکل کہاں پھینکی تھی۔ شاید سڑک کے پار اس خشک باڑھ کی اوٹ میں جسے مسز برگنز امیک گریگور گرمیوں کے موسم میں اپنے کتے کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتی تھیں یا شاید موٹر مکینک انتھونی جڈ کے گیراج میں کھڑی اس سبز ''جیگوار'' کے پہلو میں جو گزشتہ دو ہفتوں سے وہیں موجود تھی اور جس کی پسنجر سیٹ پر رکھا ہوا بڑا سا اجلے زرد رنگ کا ''ٹیڈی بیئر'' وہ اسکول سے واپسی پر اس روز خاموشی سے اٹھا لائی تھی جب پہلی بار وہ اسے نظر آیا تھا۔

یا پھر سائیکل پڑوس میں رہنے والا مجہول سالڑ کا میبل اس سے مانگ کر لے گیا تھا جو گرانٹ کی غیر موجودگی میں کئی بار دروازے پر دستک دیتا اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی شے مانگتا۔ اس نے ایک دو بار میبل کو اندر آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن وہ اندر آنے کے بجائے دروازے میں کھڑا مختلف چیزیں مانگنے پر قناعت کرتا۔ اکثر وہ ایسی چیزیں طلب کرتا جن کی اسے قطعاً ضرورت نہیں تھی، جیسے کہ کبھی کبھار وہ اس کی بائیسکل ادھار لے لیتا حالانکہ وہ اسے چلا نہیں سکتا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ گھٹنے کے جوڑ سے کٹی ہوئی تھی۔

میبل کے بارے میں سوچتی ہوئی وہ اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی جس میں وہ سوائے اشد ضرورت کے کبھی داخل نہیں ہوتی تھی اور اس وقت بھی ایک ضرورت اسے یہاں تک لائی تھی۔ دروازے پر دباؤ ڈالنے سے وہ چرچراہٹ کی آواز کے

ساتھ کھل گیا تھا۔ گرانٹ کبھی بھی سوتے ہوئے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کرتا تھا۔

وہ فرش پر اوندھا لیٹا تھا اور اس کے چاروں طرف کھردرے خاکستری قالین پر سگریٹوں کے ادھ جلے ٹوٹے، ایک ٹوٹی ہوئی بوتل کا کانچ اور بے شمار کاغذ، کچھ ادھ لکھے، کچھ بالکل کورے، مسلے ہوئے کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ایک نسبتاً کم جلا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا ہونٹوں میں دبایا اور گرانٹ کے پھیلے ہوئے ہاتھ تلے دبا لائٹر دو انگلیوں کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ کھسکا کر قریب کیا۔ وہ فرش پر گھٹنے ٹکا کر چند لمحے کڑوا دھواں حلق سے نیچے دھکیلتی رہی تھی۔ پھر اس نے بجھے ہوئے آتش دان کے قریب پڑی ہوئی ''واڈ کا'' کی بوتل اٹھائی تھی جس میں چند گھونٹ باقی تھے۔ ایک جرعہ...... ایک سانس اور حلق سے معدے تک دہکتی ہوئی تلخی۔ خالی بوتل واپس اسی جگہ رکھ کر سگریٹ کا ٹکڑا آتش دان کی بجھی ہوئی راکھ میں اچھالا اور گربہ پائی سے چل کر باہر آ گئی۔ گرانٹ اب تک ویسے ہی بے سدھ پڑا تھا۔

سڑک کے کنارے مکنولیا کے پیڑ سے ٹیک لگائے میبل اور سائیکل دونوں موجود تھے۔ میبل اس پر نگاہ پڑتے ہی باچھیں پھیلا کر ہنسنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیچ بھری تھی اور موٹے ہونٹوں پر سفید پپڑیاں تھیں۔ شاید وہ بستر سے نکلتے ہی اس کا انتظار کرنے یہاں آ گیا تھا۔ وہ قریب پہنچی تو اس نے پہلے سے پھیلے ہوئے ہونٹوں کو کچھ اور پھیلا دیا۔ گرانٹ کی عجلت بھری پکار پر وہ رک کر مڑی تھی۔

وہ سوجن زدہ آنکھوں، سرخ ناک اور ننگے پیروں کے ساتھ ہاتھ میں ایک لفافہ اور کچھ ریزگاری لیے تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔

''اسکول سے واپسی پر پوسٹ آفس چلی جانا۔''

لفافہ اسے تھماتے ہوئے گرانٹ کی انگلیاں اس کی ہتھیلی سے مس ہوئی تھیں۔ گرانٹ کا ہاتھ حرارت سے جھلس رہا تھا۔

''لاپروائی مت کرنا۔ تم اکثر بھول جاتی ہو۔''

وہ خاموشی سے اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے رستے خون کو دیکھ رہی تھی، شاید کانچ کا کوئی ٹکڑا اسے چبھ گیا تھا۔

''گروسری اسٹور سے کچھ تازہ سبزیاں اوکرا، پارسنپ اور......''

اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

وہ پچھلے چند ہفتوں سے اسے ایسے ہی کھانستے، بلغم تھوکتے، بخار میں جلتے دیکھ رہی تھی۔ ہر دم اس کے ماتھے اور اوپری ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکتی دکھائی دیتیں اور چہرہ کسی ان دیکھی آگ کی حدت سے دہکتا رہتا۔

اس نے سائیکل پر سوار ہو کر پیڈل پہ پاؤں دھرا اور کھانستا ہوا گرانٹ بولا۔

''رہنے دو سبزیاں تم مت لانا اور اسکول سے پہلے پوسٹ آفس چلی جاؤ۔ چند منٹ لگیں گے۔ بعد میں تمہیں یاد رہے یا نہیں۔''

جاتے ہوئے اس کی توجہ میبل کی جانب منعطف ہوئی تھی۔ وہ اب تک مسکرا رہا تھا۔ اس کے بے ڈھب مگر سفید دانت بھدے ہونٹوں سے جھانک رہے تھے۔

صنوبر کے دیو قامت درختوں کی آخری پھننگیں سرمئی بادلوں میں مدغم تھیں۔ سرد ہوا میں پیڑوں کی سبز خوشبو گھلی تھی اور سنگلاخ سڑک بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ اس نے تیزی سے پیڈل چلاتے ہوئے لفافے کو ایک نظر دیکھا تھا۔ اس پر سرخ روشنائی سے لکھا ہوا وہ مانوس پتا موجود تھا جو اسے زبانی یاد ہو چکا تھا۔ اس لفافے کے اندر کیا تھا۔ اس بارے میں اسے کوئی تجسس نہ تھا۔ پڑھے بغیر بھی وہ جانتی تھی۔ خط میں لکھی گئی ہر ایک بات، ایک ایک حرف سے وہ آشنا تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہر خط میں

ایک پھول بھی ہوتا تھا۔ ہر بار مختلف رنگ اور مختلف قسم کا پھول۔
جب وہ اس تراہے پر پہنچی جہاں سے ایک سڑک پوسٹ آفس کی جانب جاتی تھی تو اس نے ہینڈل چھوڑ کر دونوں بانہیں فضا میں پھیلا دیں۔ لفافہ اس کی دو انگلیوں میں اٹکا ہوا تھا۔ پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے انگلیاں کھول دیں اور لفافے کو ہوا کے سپرد کر دیا تھا۔

مٹی پر سے دھوپ سرک کر آنگن میں اتر آئی تھی اور وہ کل پوٹیا کبوتر جو دوپہر سے مٹی پر سر نیہوڑائے بیٹھا تھا، اب کسلمندی سے اڑتا ہوا مسجد کے سنہری کلس کے گرد چکریاں کاٹ رہا تھا۔ وہ اس کے چکر گننے لگا لیکن چند ہی لمحوں میں بیزار ہو گیا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے چکر کے آغاز اور اختتام میں تمیز کیسے کرے۔ وہ ایک بار پھر بکائن کی اس شاخ کی جانب متوجہ ہو گیا۔
سفید پروانوں ایسی کلیاں جن کے مکھ پر ارغوانی بندکیاں تھیں، وہ پھولوں کو گن گن کر توڑ تا رہا مگر یہ کھیل بھی اس کے دل کو بھا نہیں رہا تھا۔ اس کا دھیان بار بار حکیم بیگم کی طرف بھٹکتا اور وہ گنتی بھول جاتا۔ وہ اسکول سے واپس آیا تھا تو وہ چبوترے کی لپائی کر رہی تھی اور اب تک وہ اسی کام میں جتی تھی۔ چبوترہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور حکیم بیگم اب تگاری کے کنارے پر کہگل (مٹی اور گھاس) سے لتھڑے ہاتھ ٹکائے ہانپ رہی تھی۔ بالوں کی چند سفید لٹیں چادر سے نکل کر اس کے دھوپ جلے چہرے سے چمٹی تھیں۔ پسینے کی دھار کنپٹیوں سے کانوں کی لوؤں پر گرتی اور پیشانی سے ناک کی پھننگ پر پھسلتی۔ دھوپ کی تمازت سے سرخ آنکھیں جب بھی اسے دیکھتیں، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔
''کہیں بے جی کو پتہ نہ چل جائے۔''
اسے بکائن کے شگوفوں کی گنتی بھول جاتی۔ اس کا دل اتنی اونچی آواز میں دھڑک رہا تھا کہ اسے پورا یقین تھا، اگر وہ حکیم بیگم کے قریب سے ایک دفعہ بھی گزر گیا تو وہ آواز اسے سنائی دے جائے گی۔
اس نے بکائن کی شاخ کو دور اچھال کر مسجد کے گمٹ کو دیکھا۔ اب وہ کبوتر وہاں نہیں تھا۔ سنہری کلس دھوپ میں ایسے چمکتا تھا کہ اس پر نظر ٹکانا مشکل تھا۔ اس کے بستے میں پڑا ہوا وہ قلم بھی تو ایسا ہی سنہرا اور اتنا ہی چمکیلا تھا۔ اس کا دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ بے اختیار گھبرا کر اس نے دونوں ہاتھ سینے پر زور سے باندھ لیے۔
حکیم بیگم ہاتھ میں بدھنا لیے آب گیر پر چہرہ جھکائے پانی کے چھپاکوں سے بالوں اور پیشانی پر لگی مٹی دھو رہی تھی۔ اس کی چادر اور قمیص کی آستینوں پر بھی کیچڑ لگی تھی۔
''کاکا! آ کے کروا (بدھنا) ہی پکڑ لے۔ تو نے اج ساری دُھپ (دھوپ) سر میں وسائی (برسائی) ہے۔ جے (اگر) بمار ہو گیا تے (تو) فیر (پھر) میری تے اک ئیں سندا'' سنتا'' وہ ڈھیلے قدموں سے چل کر جب تازہ لپے ہوئے چبوترے کے قریب پہنچا تو اس کا جی مچلا اور وہ جست لگا کر اسے پھلانگنے لگا مگر اسے اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی تھی۔ چبوترہ اس کی استطاعت سے زیادہ چوڑا تھا نتیجتاً اس کے دونوں پاؤں نرم گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے۔
''گندا، چوہڑہ......'' حکیم بیگم نے قہرمان آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اسے جب بہت غصہ آتا تھا تو وہ یہی دو گالیاں دیتی تھی۔ اس کے سوا اسے کوئی گالی آتی ہی نہیں تھی۔
شرم کے مارے اس کی نظریں گارے میں کھبے اپنے پیروں پر جم گئیں۔ حکیم بیگم کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔
''میں نے تیرا کیا بُرا کیا ہے۔ کیوں مجھ نمانی نال (کے ساتھ) دشمنی کرتا ہے۔ ساری دوپہر تیرے سامنے میں اس چونترے کے واسطے کلپتی رہی، تجھے بھورا (ذرا) ترس نئیں آیا میری بڈھی جان پر۔''

وہ ہنوز سر جھکائے چبوترے کی گیلی سطح میں دھنسا ہوا کھڑا رہا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اس کا بازو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لے کر اسے چبوترے سے اتار لیا۔

''میرا دل کرتا تھا بے جی۔''

اسے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ ''ٹھوس'' وجہ سوجھی تھی۔

''جی کردا (کرتا) ہے تیرے دل نوں (کو) سو کھلے (جوتے) ماروں۔ سارے بھیڑے (برے) کم (کام) کرنے نوں کرواہے تیرا دل۔ چل ہن (اب) پیر تے دھولے۔ میں نے وی (بھی) ٹیں ٹھیک کرنا ہے چبوترہ۔ تجھے نہیں چاہی دا (چاہیے) تے مجھے وی ٹیں چاہی دا۔ گلی مٹی دا (کا) نشان ہے۔ آپی پکا ہو جائے گا، فیر جے کوئی پچھے (پوچھے) تے آکھیں (کہنا) دل کردا تھا میرا۔''

حکیم بیگم نے ناراضی سے کہا اور اس کے پاؤں دُھلانے لگی۔

وہ خاموشی سے چبوترے پر کھبے ہوئے اپنے پیروں کے نقوش دیکھتا رہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سو طرح کی باتوں سے حکیم بیگم کا دل بہلا دیتا۔ اسکول کے لطیفے سنا کر، ہم جماعت لڑکوں کی شرارتیں اور غصے میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ماسٹر جی کی نقل اتار کر اسے ہنسا لیتا مگر آج ہنسنا بولنا تو کجا، اس کے ساتھ ایک ایک پل بتانا کٹھن تھا۔

''اگر باتوں کے دوران وہ بات میری زبان سے پھسل گئی تو......'' اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اشد ضرورت کے سوا حکیم بیگم سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

اسکے پیروں پر آخری بار پانی بہا کر حکیم بیگم نے اس کی قمیص کا دامن پکڑ کر ذرا سا کھینچا تھا۔

''تو نے وہ دیکھا۔ پتہ ٹیں کی (کیا) ہے۔''

وہ آنگن کے نکڑ میں لگے انار کے بوٹے کی جانب اشارہ کرتی ہوئی اٹھی۔ اس نے بھی حکیم بیگم کی نظروں کا تعاقب کیا تھا اور گلابی شگوفوں سے لدے انار کے بوٹے کے قریب زمین پر پڑی اس چمکیلی شے کو دیکھ کر اس کا سانس حلق میں اٹک گیا تھا۔

وہ وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ اس نے تو بستے کو چھوٹی کوٹھڑی میں کھیسوں کے نیچے چھپا کر رکھا تھا۔ پھر اسے یاد آیا تھا کہ اسکول سے آ کر صحن میں قدم دھرتے ہی وہ بڑی سی زرد تیتری کے پیچھے بھاگتا ہوا انار کے بوٹے تک گیا تھا اور تب بستہ اس کی بغل میں دبا تھا اور شاید قلم اس سوراخ میں سے پھسل کر گر گیا تھا، جسے رفو کرنے کے لیے کل حکیم بیگم چاچے صدیق کی ہٹی سے پکے دھاگے والی نلکی خرید کر لائی تھی۔

وہ اب اس ''شے'' کو ہاتھ میں لے کر اس کی جانب مستفسرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے تھوک نگل کر گلے کو تر کیا اور لرزتی آواز میں بولا۔

''ماسٹر جی کا ہے۔ میز پر پڑا رہ گیا۔ میں نے سوچا کل واپس کر دوں گا۔ سچی میں نے چوری نہیں کیا...... میں کر دوں گا واپس ایمان سے۔''

وہ چند لمحے وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے چلتی ہوئی آئی اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

وہ بے یقینی سے اس کی ہتھیلی پر دھری ازار بند ڈالنے والی سنہرے رنگ کی تیلی کو دیکھنے لگا جو شاید کوئی کوا ان کے صحن میں گرا گیا تھا۔

پسینے کی بوندیں اس کی گردن کی پشت سے کمر پر رینگنے لگیں۔

''بستہ کدھر ہے تیرا؟'' حکیم بیگم نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

جواباً اس نے سرگوشی میں بتایا تھا اور وہیں دھوپ سے جھلسے فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کھلے دروازے سے

اِدھر بھاگ جائے مگر وہ بیٹھا رہا اور حکیم بیگم کے کوٹھڑی سے نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے دل میں اللہ سے شکایت پیدا ہوئی۔

"تو مجھ سے پیار نہیں کرتا، اسی لیے میرے عیب کو نہیں چھپایا۔ لوگ اتنے برے کام کرتے ہیں تو نے ان کو کبھی نہیں پکڑوایا۔ پرسوں اچھی نے آصف کی کاپی چرا کر پہلا ورقا (ورق) پھاڑ دیا اور اپنا نام لکھ کر کاپی چھپا دی۔ ماسٹر جی نے سارے بستوں کی تلاشی لی۔ سارا کمرہ چھان مارا پر ان کا دھیان اپنی میز کی دراز کی طرف نہیں گیا۔ اچھی کھڑا ہنستا رہا۔ تو نے اس کا پردہ رکھ لیا تو میرا کیوں نہیں۔ وہ تو نماز بھی نہیں پڑھتا اور اپنے ابے کا کہنا بھی نہیں مانتا۔ تجھے اس سے زیادہ پیار ہے نا۔"

حکیم بیگم نے چند لمحوں بعد اس کے بستے سے وہ قلم برآمد کر لیا تھا مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کی چپ سے عمر کا دل ڈوبتا تھا۔

حکیم بیگم نے بازو سے پکڑ کر اسے زمین سے اٹھایا اور بولی۔

"چل وضو کریے (کریں)۔"

اس نے پوچھنا چاہا کہ عصر کی اذان ہونے میں تو ابھی بہت وقت باقی تھا۔ پھر وضو کس لیے۔ مگر اپنی موجودہ "حیثیت" کو مدنظر رکھ کر خاموش رہا۔

وضو کرتے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے حکیم بیگم کی جانب نظر اٹھائی اور فروترین آواز میں منمنایا۔

"میرا دل کرتا تھا۔"

حکیم بیگم نے ہونٹوں پہ انگلی دھر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ وضو کے دوران باتیں کرنے سے منع کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ چپ چاپ وضو کرتا رہا مگر جیسے ہی کلمہ شہادت پڑھ کر حکیم بیگم نے چادر کو سر اور کندھوں پر پھیلایا وہ پھر بولنے لگا۔

"اس نے میری دونوں تلیوں (ہتھیلیوں) پر توت کی پانچ پانچ چھمکیں ماریں اور مجھے گالی بھی دی۔ وہ بہت بری بات تھی، میں بتا نہیں سکتا۔"

یہ بات اس نے حکیم بیگم کے دل میں تجسس ابھارنے کے لیے کہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار وہ بات اس نے سن لی تو وہ اس کی ہم خیال بن جائے گی اور ماسٹر جی کا قلم اٹھانے والی حرکت کو بالکل برا نہیں جانے گی۔ مگر وہ کچھ پوچھنے پر آمادہ نظر نہ آتی تھی۔ اب وہ شہادت کی انگلی سے اس کے گرد زمین پر ایک مدھم لکیر پر مبنی دائرہ کھینچ رہی تھی۔

"اس نے مجھے......" وہ ایک لمحے کو ہچکچایا۔

"کمو کمھیاری (کمہارن) کا بچہ اور......حرامزادہ کہا۔ وہ روز ہی مجھے ساری جماعت کے سامنے حرامی کہہ کر بلاتا ہے۔"

وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دائرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور تعوذ پڑھنے لگی۔

"میرے پچھے پچھے (پیچھے پیچھے) پڑھ۔"

وہ حیران ہو کر چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا اور پھر پڑھنے لگا تھا۔

تسمیہ پڑھنے کے بعد اس نے سورۃ فلق اور سورۃ ناس کی تلاوت کی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ دوہراتا رہا مگر اس ساری کارروائی کا مقصد اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ وہ نہایت جذب سے کچھ مانگ رہی تھی لیکن الفاظ عمر کے کانوں تک نہ پہنچتے تھے۔

"میں نے تیرے دوالے (گرد) نور کا گھیرا کر دیا ہے۔ انشاء اللہ اب تو چوری نہیں کرے گا۔ یہ دل بڑا چندرا ہوتا ہے بیبا

اس کی ہر بات من (مان) لیس تے یہ گل وچ (گلے میں) کتے والا پٹہ ڈال کر اپنے پیچھے بھگاتا ہے۔ جیبھ لٹک آتی ہے۔ ڈیلے پھٹ پڑتے ہیں پر اس ڈاڈھے (زبردست) دی (کی) من مرضی فیروی پوری ہوتی ہے تجھے اس بات کا بڑا ڈر تھا کہ بے جی نوں پتہ نہ لگ جائے پر اللہ سے ڈر نئیں لگا جس توں (سے) تیرا کوئی کم نہیں چھپ سکدا (سکتا) اگلی وار (بار) جد (جب) تیرا دل کوئی پٹھی (الٹی) مت دے تے یاد رکھیں (رکھنا) کہ اللہ تجھے ہر ویلے (وقت) دیکھتا ہے۔ اس سے شرم کرنا سیکھ۔ بندوں کے سامنے کچیائی (شرم) دا کی فیدا (فائدہ) یہ تو آپ بڑے وچارے (بیچارے) ہیں۔ تیرا کی (کیا) وگاڑیں (بگاڑیں) گے۔"

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ پھر لجاجت سے بولا۔

"مارے گا اللہ اب۔ مجھے آگ میں ڈالے گا۔ میں نے چوری جو کی ہے۔ وہ تو بہت ناراض ہوگا۔"

حکیم بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک طویل سانس بھری۔

"تو معافی منگ (مانگ) لے۔ اسے پتہ ہے کہ تو شرمسار ہے۔ اور ایک بات بتاؤں تجھے؟"

"ہاں بے جی!"

"وہ تجھ سے بڑا پیار کرتا ہے۔" اس نے حیرت سے حکیم بیگم کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اس نے تیری چوری پکڑوا دی۔ جے مجھے پتہ ہی نہ لگدا اور تو پکا چور بن جاندا (جاتا) فیر پیار دے (کے) سو طریقے ہوتے ہیں اور اس دا انداز سب توں نویکلا (انوکھا) ہے۔" عمر کا دل سینے میں بے قرار ہوگیا۔ اس کے پیٹ سے ایک گولا سا اٹھا اور حلق میں آ کر اٹک گیا۔ اس نے دھندلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

"لے دس (لو بتاؤ) مجھ کو یاد ہی نئیں میں نے تیرے لئی (لیے) روے (سوجی) دا حلوا بنایا ہے اور سن...... تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نوں وی لوک گالیاں دیتے تھے۔ وہ کیا کرتے تھے بھلا۔"

اس نے آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے پونچھ کر صاف کیں۔

"معاف کر دیتے تھے۔"

"سویرے جا کر ماسٹر جی نوں قلم واپس کرے گا ناں اور معافی وی مانگے گا۔ میں تیرے ساتھ چلوں گی۔"

"کروں گا۔ پر مجھے حلوا تو دے۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے۔"

وہ شدت سے روتے ہوئے بولا تھا۔

حکیم بیگم اس کا سر گود میں لے کر بہت دیر تک تسلی دیتی رہی تھی۔

اگلی صبح جب وہ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے صحن میں آیا تو کچھ خیال آنے پر چبوترے کی طرف آ نکلا۔

اس کے پاؤں کے نقش اب پختہ ہو چکے تھے۔

"اگر بے جی اتنا غصہ نہ کرتی اور اسی وقت دوبارہ لپائی کر دیتی تو چبوترہ اتنا خراب تو نہ بنتا۔"

اس نے کھبے ہوئے پنجوں کی انگلیوں کو پوروں سے چھوتے ہوئے تاسف سے سوچا تھا۔



صبح کی سروس میں شرکت کرنے کے بعد وہ کیتھیڈرل کے مرکزی دروازے سے باہر نکلی تو آسمان پر بادلوں کے دھبے بکھر رہے تھے۔ ہوا کی خوشگوار ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے وہ پارک کی سنگلاخ روش پر بے مقصد ٹہلنے لگی۔ چھٹی کا دن تھا مگر ابتدائی پہر

ہونے کے باعث اکادکا لوگ ہی پارک میں دکھائی دیتے تھے جن میں سے اکثریت ایک گوشے میں تعمیر کردہ مصنوعی جھیل کے گرد جمع تھی۔ جھیل میں تیرتے بطخوں کے غول کی جانب ڈبل روٹی کے ٹکڑے اور بھنی ہوئی مکئی اچھالتے ہوئے بچے اور بڑے یکساں طور پر حلق سے پُر جوش، بے معنی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

ارغوانی پھولوں کے تختے میں سے گزرتی روش پر وہ اس لمحے ٹھٹک کر رکی تھی، جب اس کے عقب میں آتی بھاری بوٹوں کی چاپ تھم گئی تھی اور کسی نے گمبھیر لہجے میں پکارا تھا۔

''کارا!''

وہ قطعی غیرارادی طور پر مڑی اور اس چھ فٹ سے نکلتی ہوئی قامت کے شخص کو دیکھا جس نے جاپانی میپل کے پتوں والے نمونے اور گہری سبز زمین کے ساتھ کمونو پہن رکھا تھا، جو بمشکل اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ بدرنگ جینز بوسیدگی کے باعث جھرجھری ہو چکی تھی۔ اس کی قومیت کے بارے میں وہ فوری طور پر کوئی اندازہ نہیں لگا سکی تھی کیونکہ اس کا چہرہ رنگین چھپیوں سے مزین مکھوٹے (ماسک) کے پیچھے چھپا تھا۔ ہاتھوں اور بالوں کی رنگت سے وہ ایشیائی لگتا تھا، تاہم لہجہ اسے یورپین ثابت کر رہا تھا اس کے دائیں ہاتھ میں کاسنی رنگت کا پھول تھا اور کسی سنگ تراش کے شاہکار جیسا وہ ہاتھ اس لمحے اس کی جانب بڑھا ہوا تھا۔ وہ کئی ثانیے اس کے ہاتھوں کو پلکیں جھپکائے بنا گھورتی رہی۔ اس نے اتنے بڑے ہاتھ آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

''Cara mia! vieni al Parco di domani''

بولتے ہوئے وہ اس قدر قریب آ گیا تھا کہ اس کی سانسوں کی حدت اور وجود کی مردانہ باس کو تن سے لپٹتا محسوس کر کے وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

الفاظ کا مفہوم وہ نہیں جان سکی تھی۔ جانے وہ کون سی زبان تھی۔ شاید اطالوی کیونکہ اتنا اسے معلوم تھا کہ cara اطالوی زبان میں کسی عورت کو پیار سے مخاطب کرنے کے لیے کہا جاتا ہے لیکن وہ اسے کیوں مخاطب کر رہا تھا اور وہ تھا کون۔ اس نے دل کی دھڑکن کو کانوں میں گونجتے ہوئے سنا۔ خدا جانے کس جذبے کے ہاتھوں پسپا ہو کر اس نے وہ پھول لے لیا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے کیا چاہتا تھا مگر پھول اسے دینے کے بعد نہ تو اس نے کچھ کہا تھا اور نہ ہی وہ ٹھہرا تھا۔ اسے آواز دینے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے وہ اسی جگہ کھڑی اسے لمبے لمبے ڈگ بھر کر خود سے دور ہوتے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ وہ آرائشی پودوں کی ایک لمبی قطار کے پیچھے کھو گیا۔ وہ جانے کتنی دیر اور وہیں جمی رہتی اگر وہ یورپی بوڑھا اسے چونکا نہ دیتا جو پرام میں چھ سات ماہ کے بچے کو لٹائے اسی روش پر چہل قدمی کر رہا تھا۔

''میں پچھلے پانچ منٹ سے یہاں کھڑا ہوں۔''

''معاف کیجیے گا۔''

اس نے غائب دماغی سے بوڑھے کی بات سنی۔

''تم نے میرا راستہ روک رکھا ہے۔''

''اوہ...... مجھے اندازہ نہیں ہوا۔''

وہ بدحواسی میں معذرت کرتے ہوئے روش کے ایک طرف ہو گئی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔''

بوڑھے نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پرام دھکیلتا اس کے قریب سے گزر گیا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے گردن موڑی اور مسکرایا۔

''تم اسے کل پارک میں ملوگی نا۔''

اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بناوہ بوڑھا ہاتھ ہلا کر رخصت ہو گیا تھا۔

وہ چند لمحے وہیں ٹھہر کر کچھ سوچتی رہی پھر پیڑ تلے نصب چوبی بنچ کی جانب بڑھ گئی۔ بنچ پر بیٹھ کر اس نے وہ ریشمی موباف کھولا جس نے اس کے بالوں کو سمیٹ رکھا تھا۔ مخملیں پتیوں والے کاسنی پھول کو اس نے موباف میں احتیاط سے لپیٹ کر ہینڈ بیگ میں رکھا اور بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے سوچا۔

''میں اسے پہچانوں گی کیسے۔ کاش میں نے اس کا چہرہ دیکھا ہوتا۔''

پھر ایک خیال آنے پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

''اتنے بڑے ہاتھ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ میں اسے لاکھوں کے ہجوم میں بھی شناخت کر سکتی ہوں۔''

✠ ✠ ✠

''پرنیاں! تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ اتنی صبح تم اس ویران پارک میں کیا لینے آئی ہو۔''

داؤد نے جماہی لیتے ہوئے گھڑی دیکھی۔

''غضب خدا کا ابھی چھ بجے ہیں۔ تمہارا دماغ تو درست ہے؟ اب تک تو پرندے بھی سو رہے ہوں گے۔''

وہ اس کی مسلسل خاموشی سے سخت جھنجلایا ہوا لگتا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں یہاں مجھے کتنا وقت لگ جائے گا، ورنہ میں تمہاری گاڑی لے آتی۔ تمہیں میری وجہ سے بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔''

وہ ڈور ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''بھاڑ میں گئی زحمت اور معذرت۔ میں نے تم سے ایک نہایت سادہ اور آسان سوال پوچھا ہے اور میں دس بار اس سوال کو دوہرا چکا ہوں۔ آخر تم بتا کیوں نہیں دیتیں، یہاں تمہیں کس سے ملنا ہے اور......''

اس نے لحہ بھر توقف کیا اور پرنیاں کی غیر معمولی تیاری کا جائزہ لیا۔

''تم نے جتنی محنت سے سنگھار کیا ہے۔ لگتا نہیں کہ رات کو سونے کے لیے تمہارے پاس کچھ وقت بچا ہوگا۔''

نیند کے خمار نے اب تک اسے اس پہلو پر دھیان دینے کی مہلت نہیں دی تھی۔

زنگاری رنگ کے اس شوخ لبادے میں، کانوں میں جھولتے برف ایسے سپید آویزوں کے ساتھ وہ بہت چونچال نظر آ رہی تھی۔ بالوں کی گندھاوٹ صاف بتاتی تھی کہ اس پیچیدہ مگر خوشنما چٹیا کو بنانے میں طویل وقت اور محنت صرف ہوئی تھی۔

وہ چند لمحے چپ چاپ داؤد کے سوال بنے چہرے کو دیکھتی رہی اور نہایت آہستہ آواز میں ''شکریہ داؤد'' کہہ کر گاڑی سے اتر گئی۔

اسے ایک ناراض نگاہ سے نواز کر وہ زن سے گاری نکال لے گیا تھا۔

وہ کیونکر اسے بتاتی کہ وہ اس پارک میں ایک ایسی اجنبی سے ملنے آئی تھی، جو عجیب وضع کا کمونو پہنتا تھا، جو اس کے پُرشکوہ بدن کو پوری طرح ڈھانپ نہ پاتا تھا اور چہرے کو بھڑکیلے رنگوں سے سجے مکھوٹے سے چھپاتا تھا اور اس غیر معمولی حلیے میں سنبل کا پھول معلوم ہوتا تھا۔ بیک وقت رعنا اور کڈھب......اور جو اطالوی نہ تھا مگر اطالوی بولتا تھا اور اسے ''کارا'' کہہ کر پکارتا تھا......جس کے ہاتھ اتنے بڑے تھے کہ انہیں دیکھ کر مائیکل اینجلو کے شاہکار مجسمے موسز کا خیال آتا تھا۔ وہ اس کاسنی پھول کے بارے میں کیسے

بتاتی جو اس کے ہینڈ بیگ میں ایک ریشمی موباف میں لپٹا ہوا کل سے موجود تھا۔ وہ یہ ساری باتیں داؤد کو کیسے سمجھا سکتی تھی۔

پارک میں دم سادھے خاموش درختوں، کسی کینچوے کی مانند رینگتی سرد ہوا، مصنوعی جھیل میں رک رک کر تیرتی ہوئی بطخوں اور پیڑوں کی شاخوں میں پھدکتی چند گوریاؤں کے علاوہ صفائی کرنے والے عملے کے افراد اور صبح کی سیر کو آئے ہوئے دو بوڑھے تھے۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس چوبی بنچ کی جانب بڑھی جو سنگی روش کے قریب ریٹھے کے پیڑ تلے بچھا تھا۔

ہوا نہایت دھیمی رفتار سے بہتی تھی اور اس کی خنکی دھیرے دھیرے بدن کو چھوتی تھی۔

وہ بینچ پر قدرے سکڑ کر بیٹھ گئی اور بیگ سے ایک رسالہ نکال کر سامنے پھیلا لیا۔ کچھ دیر وہ ایک مقالے کو پڑھنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہی مگر لکھاری نے جانے کون سی زبان استعمال کی تھی۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے لیے قطعی نامانوس تھے۔ خاصی دیر تک وہ یہی اخذ نہ کر سکی کہ مقالہ کس موضوع پر تھا۔ ہر دو سطروں کے بعد اس کی نظریں پارک کے داخلی راستوں میں بھٹکنے لگتیں۔

سات بج گئے...... آسمان کی ملگجی سیاہی، اجلی نیلاہٹ میں بدل رہی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر ریٹھے کے پیڑ کو دیکھا۔ پھولوں کے جھرمٹ یوں دکھائی دیتے تھے جیسے گلابی تتلیوں کے غول ریٹھے کی ڈالیوں پر اترے ہوں اور کسی سحر کے اثر سے وہیں منجمد ہو گئے ہوں۔ اس کے عین اوپر ایک خمیدہ شاخ پر سرخ سینے والی روبن چڑیا بیٹھی تھی۔ اس نے روبن چڑیا کے بارے میں بہت سی دیومالائی داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس نے انہیں یاد کرنے کی کوشش کی مگر ایک بھی دیومالا اس کے ذہن میں نہ آ سکی۔ ہاں روبن چڑیا کے سینے کے سرخ پروں کو دیکھتے ہوئے ایک رنگین مکھوٹا اس کی نظروں میں مرتسم ہونے لگا تھا اور اس مکھوٹے میں روبن چڑیا کے سینے کا رنگ خاص طور پر نمایاں تھا۔

آٹھ بجے تک کوئی بھی پارک میں نہیں آیا تھا اور صفائی والا عملہ جا چکا تھا جبکہ وہ دونوں بوڑھے اب ''کلغہ'' کی کیاری کے قریب بیٹھے خوش گپیوں میں محو تھے۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

نو بجے تک اسے یہاں آنے پر افسوس ہونے لگا تھا۔

اور دس بجنے سے قبل وہ بینچ پر گھٹنوں میں سر دیے بے خبر سو رہی تھی۔

جانے وہ بینچ کی جانب بھاگ کر آتے ہوئے بچوں کے شور سے جاگی تھی یا اس جوانی کے لوچ میں بھیگے نسوانی قہقہے سے جو عقب میں بلند ہوا تھا۔ گلابی رنگت کی چند ''تتلیاں'' اس کی گود میں اتر آئی تھیں اور ایک تتلی اس کی چٹیا سے آزاد ہونے والی لٹ میں الجھی ہلکورے لے رہی تھی۔

"cara mia!"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، مڑ کر آواز کی سمت دیکھا اور ساکت ہو گئی۔

وہ نسوانی قہقہہ ایک بار پھر اٹھا اور اس قہقہے کا رنگ گلابی تھا۔

سنہری ریشم کے لچھوں جیسے بالوں والی، وہ دبلی پتلی لڑکی کاسنی پھول کی مخملیں پتیوں کو ہونٹوں سے لگائے مسلسل ہنس رہی تھی۔

آج بھی وہ اسی حلیے میں تھا اور اپنی بلند قامت کے ساتھ اس بے حد شوخ اور ناکافی کمونو اور دھوپ میں چمکتے بھڑکدار رنگوں والے مکھوٹے میں کسی پگوڈا (بدھ مت میں ایک مقدس عمارت) کی مانند نظر آتا تھا۔

معاً اس نے پگوڈا کو اپنی جگہ سے سرکتے دیکھا۔ وہ اس کے قدموں پر قدم رکھتے ہوئے چلنے لگی۔

دوپہر ہونے تک اس نے چار نوجوان لڑکیوں کو پھول دیے اور وہ ایک مخصوص فقرہ کہا جو کل صبح سے پرنیاں کے کانوں

میں ایسے سنسناتا تھا جیسے وہ صدیوں سے سنتی آ رہی ہو۔ ان میں سے ایک اداس، کھوئی ہوئی سی لڑکی نے پھول نہیں لیا تھا اور اسے گالی دی تھی مگر جواباً وہ کچھ نہیں بولا تھا اور نئی "منزل" کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا تھا۔

جب تھکن اس کے متحرک قدموں کو بوجھل بنانے لگی اور پرنیاں کو یقین ہو گیا کہ اس کے پاس موجود تمام کاسنی پھول ختم ہو چکے تھے تو وہ نرم گھاس پر سہج سہج پاؤں دھرتی اس کے قریب چلی آئی۔

وہ ایلوسٹونیا Alostonia کے تنے سے پشت لگائے، ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر ٹکائے کشن کنہیا بنا کھڑا تھا اور اس لمحے پرنیاں جانتی تھی کہ چاہے وہ اجنبی شیام تھا یا نہیں مگر وہ رادھا ضرور تھی جو بے خود ہو کر اس کی اور کھنچی چلی جاتی تھی۔

"یہ سینڈوچ ٹھنڈا ہو چکا ہے مگر اس کا ذائقہ اتنا خراب نہیں ہے۔"

بیگ سے سینڈوچ نکالتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ اس نے کل شام کافی کا ایک مگ زبردستی حلق میں انڈیلنے کے بعد اس وقت تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک تھی ہی کہاں جو وہ کچھ کھاتی۔

"سینڈوچ کھالو۔ مجھے معلوم ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔"

اسے خبر نہ ہوئی اس کی آواز مرتعش تھی یا نہیں مگر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ بری طرح کپکپا رہا تھا۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا اور چہرے سے مکھوٹا ہٹا دیا۔ تب پرنیاں نے جانا کہ اس کے پاس جوگ مایہ تھی۔ وہ کوئی بھی روپ بدلنے پر قادر تھا۔

ایک زندہ پگوڈا......

رادھا کا من بسیا شیام......

اور اب...... پریوں کی کہانیوں کا ایک کردار......

وہ ساکت پلکوں کے ساتھ سانس روکے اسے دیکھتی رہی۔ جانے کب تک اس کی آنکھیں اس نظارے پر منجمد رہیں۔ شاید ایک قرن یا اس سے کچھ زیادہ۔

"میں تمہیں جانتا ہوں؟"

اس نے وہ بڑا سا ہاتھ بڑھا کر سینڈوچ لے لیا۔

"سینڈوچ کے لیے شکریہ۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ اگر ہم پہلے مل چکے ہیں تو مجھے اپنی یادداشت سے شکایت ہے۔ اتنی خوب صورت لڑکی کو بھولنا تو گناہ ہے۔"

وہ جھرجھری لے کر جاگی۔

"میں...... پرنیاں آئزک ہوں...... پاکستان سے، یہاں اپنے چچا کے گھر رہتی ہوں۔ وہ چرچ میں Elder ہیں۔ طب کی طالبہ ہوں اور کل تم مجھے یہیں ملے تھے۔ تم نے ہی تو مجھے دوبارہ ملنے کا کہا تھا۔"

"میں نے......؟ مجھے تو بالکل یاد نہیں ہے۔" اس نے سینڈوچ کا کونا کترتے ہوئے بایاں ابرو اچکایا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

"یاد کرو۔ کل ہی کی تو بات ہے۔ میں صبح چھ بجے سے اس بینچ پر وہ جو ریٹھے کے درخت کے نیچے ہے۔"

اس نے بینچ کی سمت اشارہ کیا۔

"وہاں بیٹھ کر تمہارے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ تم کیسے بھول سکتے ہو؟"

وہ رو دینے کو تھی۔

''اور تم نے یہ پھول بھی مجھے دیا تھا۔''

اس نے ہینڈ بیگ سے موباف نکالا اور تہیں کھول کر اس کے سامنے پھیلا دیا۔

''یہ دیکھو......اسے تو پہچانتے ہو تم۔''

''اوہ۔میں سمجھ گیا۔''

اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''تم نے اس بات کو اتنی سنجیدگی سے لیا لیکن......''

اس نے خاموش ہو کر پرنیاں کے زرد چہرے کو تشویش سے دیکھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اور تم اطالوی جانتی ہو۔''

''کیا ہم بیٹھ جائیں۔''

''ہاں ضرور......بیٹھ کر ہم یقیناً زیادہ آرام دہ طریقے سے بات کر سکتے ہیں۔''

وہ دونوں آمنے سامنے گھاس پر براجمان ہوئے۔

''تم جس بھی وجہ سے مجھے ملی ہو۔یہ ایک الگ بحث ہے۔''

وہ گویا ہوا تو پرنیاں مجسم سماعت بن گئی۔کسی دھارمک پاٹھ شالا میں بیٹھے ہوئے ودیارتھی کی طرح مؤدب اور ہمہ تن گوش۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تم اس ملاقات پر فخر کرو گی اور اپنے جاننے والوں میں نہایت غرور کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا کرو گی۔تمہیں نہیں معلوم کہ انجانے میں تمہاری ملاقات مستقبل کے عظیم اداکار سے ہو گئی ہے۔ایک ایسا لازوال فنکار جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔''

اس کی آواز میں شوخی رچنے لگی تھی۔

''تمہیں آٹو گراف چاہیے تو آج لے لو کیونکہ اگر تم نے کل کا انتظار کیا تو ہو سکتا ہے تمہیں ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی قطار میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے اور میں تمہیں اس کوفت سے بچانا چاہتا ہوں۔تمہارے پاس کاغذ ہے۔''

اس نے پوچھا تو پرنیاں کی گردن نفی میں ہلی۔

''کوئی بات نہیں......ہاتھ لاؤ۔''

مائیکل اینجلو کے موسز کا ہاتھ بڑھا اور اس کا سرد ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ لمس دہکتا ہوا انگارہ تھا اور پرنیاں کو یقین تھا کہ اس کا ہاتھ جل جائے گا۔

وہ جینز کی جیب سے قلم نکال کر اس کی ہتھیلی پر کچھ لکھنے لگا تھا۔پرنیاں نے نہیں دیکھا کہ اس نے کیا لکھا تھا۔

''میں بھی پاکستانی ہوں۔ویسے تو میں اسپرنگ فیلڈ میں پیدا ہوا اور کبھی پاکستان نہیں گیا۔مگر میرے والدین پاکستان سے تھے۔میں اردو بھی بول سکتا ہوں مگر تھوڑی بہت......خیر میں بتا رہا تھا کہ اداکاری میری محبوبہ ہے۔میرا خواب ہے۔ابھی تک مجھے پردے پر اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع نہیں مل سکا مگر ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو پھر کوئی بھی میرا راستہ روک نہ پائے گا۔میری منزل بہت آگے ہے۔میں ہالی وڈ کے آسمان کا جگمگاتا ستارہ بنوں گا۔ایسا ستارہ جس کی ضیاء کے سامنے سورج بھی ماند ہو۔اپنی منزل کو پا لینے کے لیے میں گھر چھوڑ کر لاس اینجلس کی سڑکوں پر بھٹکتا پھر رہا ہوں لیکن اب تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔مجھے اپنے کیریئر کا پہلا کردار مل گیا ہے اور اسی کردار کی وجہ سے تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔دراصل یہ ایک قاتل کا کردار ہے، جو پوری فلم میں صرف دو مرتبہ نمودار

ہوتا ہے اور دونوں مرتبہ اس کا چہرہ ظاہر نہیں ہوتا۔

پہلا منظر ایک ''ہیلووین'' پارٹی کا ہے اور قاتل، جس نے کمونو پہنا ہے اور چہرے پر ماسک لگا رکھا ہے، فلم کی ہیروئن کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پھول دیتا ہے اور اطالوی میں کہتا ہے ''کل مجھے پارک میں ملو'' ہیروئن اسے اپنا محبوب سمجھتی ہے کیونکہ قاتل آواز اور لہجہ بدل کر بولتا ہے۔

دوسرے منظر میں ہیروئن پارک میں اپنے محبوب کی منتظر ہے۔ اچانک قاتل ایک پیڑ کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور پشت سے ہیروئن کی گردن دونوں ہاتھوں مین دبوچ لیتا ہے۔ یہاں بھی اس کا چہرہ پوشیدہ رہتا ہے۔ وہ ہیروئن کو گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے۔ قاتل کی شناخت فلم کے اختتام پر ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا چہرہ نہیں دکھایا جاتا اور یہی اس کردار کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ میں ایک بار بھی ناظرین کو دکھائی نہیں دوں گا۔''

اس نے ایک طویل سانس لیا۔

''لیکن عظیم مقاصد کے لیے قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ چونکہ اپنی زندگی کے پہلے کردار کو میں یادگار انداز میں ادا کرنا چاہتا ہوں اس لیے اس ہونق حلیے کے ساتھ پارک میں اپنے طور پر ریہرسل کر رہا ہوں۔ پچھلے دو دن سے۔ اب تو تمہاری الجھن دور ہوگئی ہوگی۔''

پرنیاں نے بزاخفش کی مانند سر ہلا دیا۔ جانے اس کی الجھن دور ہوئی تھی یا بڑھ گئی تھی۔ وہ تو اس کے ہاتھوں کو گھور رہی تھی جنہیں وہ بات کرتے ہوئے مسلسل حرکت میں رکھتا تھا۔ ان ہاتھوں میں یقیناً قتل کرنے کی صلاحیت تھی۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے؟ بالکل خراب ہے؟''

''کیا ٹھیک نہیں ہے؟ میرا کردار؟''

''نہیں یہ کمونو، تمہیں معلوم نہیں ہے شاید یہ زنانہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے جھینپ کر استفسار کیا۔

''آستینوں کی ساخت سے صاف ظاہر ہے۔ مردانہ اور زنانہ کمونو میں بنیادی فرق آستینوں کی بناوٹ کا ہی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ''اوبی'' یعنی مخصوص طرز کا کمر بند ضرور ہوتا ہے جو تم نے نہیں باندھ رکھا۔ کمونو کے ساتھ پہننے کے لیے جوتے بھی مخصوص ہوتے ہیں مثلاً ''Geta'' اور ''Zori'' وغیرہ اور اس کا ڈیزائن بھی موسم کے لحاظ سے منتخب کیا جاتا ہے۔ میپل والا نمونہ سرما کے لیے موزوں ہے۔ تمہیں ضرورت ہے ایک عدد ''Yukata'' کی۔''

وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔

''تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں۔ کیا تم کمونو پر کوئی تھیسز وغیرہ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہو؟ تم تو ڈاکٹر بننے والی تھیں نا؟''

اس کا جواب محض ایک مدھم مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ کل داؤد کی ملنے والی ایک جاپانی لڑکی کے ساتھ دو گھنٹے اسی موضوع پر بات ہوئی تھی۔

''میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں نے اتنی گہرائی میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں جس فلم میں کام کر رہا ہوں وہ تیسرے درجے کی پروڈکشن ہے اور تم سمجھ سکتی ہو ایسی پروڈکشنز میں ہر بات پر سمجھوتہ کیا جاتا ہے اور خاص طور سے معیار پر۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہا ہے کہ اسٹوڈیو کے وارڈ روب میں کمونو نہیں ہے۔ اس کا بندوبست مجھے خود کرنا ہوگا۔ میں نے کہا بھی کہ قاتل کو کمونو پہنانا ضروری نہیں ہے اسے ایک سادہ پتلون قمیص یا عام سے گاؤن میں ماسک لگائے ہوئے دکھا کر گزارہ کیا جاسکتا ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے نہایت حقارت سے جواب دیا ''گزارہ تو تمہارے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔ تخلیق کاروں کی حس جمال کو تم جیسا چھوٹا انسان

کیسے سمجھ سکتا ہے۔'' اسے پچھتانا پڑے گا ایک روز۔ میرا وعدہ ہے یہ۔ میں نے استعمال شدہ ملبوسات کی ایک سستی دکان سے یہ کمونو کرائے پر حاصل کیا ہے کیا کروں، اس نام نہاد حس جمال کے حامل ڈائریکٹر سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ قاتل جاپانی نہیں ہے تو کمونو کیوں پہنتا ہے اور کمونو پہنتا ہے تو جاپانی کیوں نہیں ہے اور بالفرض اگر جاپانی ہے تو اطالوی کیوں بولتا ہے۔''

وہ ہنسنے لگا۔

''تم پھولوں کی زبان سمجھ سکتی ہو؟''

اس کا سوال سن کر وہ حیران ہوئی۔

''ہاں پھولوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں اس زبان سے واقف ہوں۔ میں نے جو پھول تمھیں دیا تھا وہ Gloxinia ہے اور Gloxinia علامت ہے۔ پہلی نظر میں محبت کی۔''

پرنیاں کا سفید چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے کسی نے دودھ میں لال روشنائی کا قطرہ ٹپکا دیا ہو۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے ویسا ہی پھول اور لڑکیوں کو بھی دیا تھا لیکن پھر بھی......

وہ دونوں مختلف موضوعات پر بات کرنے لگے۔ پرنیاں کو کچھ خبر نہ تھی، وہ کیا بولتی تھی اور کیوں بولتی تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ دنیا کی تمام گھڑیاں تھم جائیں، ان کی سوئیاں ایک ہی نقطے پر تھرتھراتی رہیں۔

پھر اس منظر میں سرخ جوتوں کا ایک جوڑا داخل ہوا۔ وہ نوکدار چمکیلے جوتے ٹک ٹک کرتے ان کی جانب چلے آرہے تھے۔ اس نے ذرا نظر اٹھائی تو ان جوتوں میں زرد موم سے بنی ہوئی دو لانبی ٹانگیں بھی تھیں۔ وہ لڑکی ہسپانوی تھی جس کا قد عام ہسپانوی عورتوں کی نسبت دراز تھا۔ اس کی رنگت اتنی زرد تھی کہ دور سے دیکھنے پر وہ مومی پتلی معلوم ہوتی تھی۔ سیاہ آنکھیں، باریک ہونٹ، ہنسلی کی ہڈی ابھری ہوئی، بالوں کو اس نے کسی عجیب سے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کے جوتوں اور بالوں کا رنگ تقریباً یکساں تھا۔

قریب پہنچ کر وہ جھکی اور باریک ہونٹ اس کے گال سے چپکا دیے۔

پرنیاں گنگ ہو کر وہ منظر دیکھتی رہی۔ اس کے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی تھی۔

''یہ البا مارسیلو ہے اور البا اس سے ملو۔ پرنیاں آئزک پاکستان سے۔''

وہ بیٹھی نہیں تھی۔ اس مختصر اسکرٹ میں اس کی ٹانگیں بہت لمبی نظر آتی تھیں۔

اس نے پرنیاں پر ایک لاتعلق نگاہ ڈالی اور بولی۔

''جلدی سے اٹھ جاؤ۔ بہت سخت بھوک لگ رہی ہے اور یہ بے ہودہ کمونو تو اتار دو۔''

عام ہسپانویوں کی طرح وہ بھی ''ٹی'' T کو ''تی'' اور ''ڈی'' D کو ''دی'' بولتی تھی اور ''آر'' R کو ''ررر'' ادا کرتی تھی۔

اس کی زرد مومی ٹانگیں سورج کی تیکھی شعاعوں سے دمکتی تھیں اور ان کی لشک پرنیاں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

''چلیں......مس مارسیلو۔''

جب وہ اسے لنچ کے لیے ساتھ چلنے کی رسمی دعوت دینے کے بعد سرخ بالوں والے مومی مجسمے کا ہاتھ تھامے رخصت ہوا تو وہ ہونٹ کچلتے ہوئے آنکھوں میں تنی دھند کی چادر کو ہٹانے میں کوشاں تھی۔

''ہم پھر ملیں گے......''

جاتے ہوئے اس نے کہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ ایک بے معنی فقرہ تھا۔ اس کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔

اس کی توجہ ریٹھے کے پیڑ کی جانب منعطف ہوئی، پیڑ تلے مردہ گلابی تتلیاں بکھری تھیں۔

وہ دونوں چھوٹے بچوں کی طرح اٹکھیلیاں کرتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی شوخ ہنسی ہوا میں معلق رہ گئی تھی۔ ان لمحوں میں وہ دنیا کی سب سے بدنصیب عورت تھی۔ اس سے بڑھ کر کوئی تہی داماں نہ تھا۔ ایک دہکتے ہوئے لمس کے سوا اس کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا اور اس کی سانس سینے میں اٹک گئی۔



بھونرے کو کیتکی کے پھول سے ایسا عشق نہیں ہوگا، جیسا حکیم بیگم کو مٹی کے باسنوں سے تھا۔ وہ پہروں بیٹھی گیلی مٹی کے تودوں سے الجھتی۔ انہیں اپنی خواہش کے قالب عطا کرنے کی کوشش کرتی۔ اپنے خوابوں کو مٹی کے سانچوں میں ڈھالنے کی تدبیریں کرتی۔ حکیم بیگم کی لگن میں کمی نہیں تھی۔ اس کا عشق سچا تھا۔ وہ ایک مجبوری کے ہاتھوں بے بس تھی۔

وہ بے ہنر تھی۔

اس کی انگلیوں سے تخلیق کے چشمے تو جاری ہوتے تھے مگر وہ پہاڑی جھرنوں کی طرح منہ زور تھے۔ وہ حکیم بیگم کے بس میں نہیں تھے۔ وہ آبخورہ بنانے لگتی تو نندولا بن جاتا، صراحی بنانے بیٹھتی اور گاگر بنا ڈالتی۔ کوزے آڑے ٹیڑھے بنتے۔ برتن کی گگر یکساں نہ رہتی۔ پیندے چپٹے ہو جاتے۔ جب سے اس کے ہاتھوں میں رعشہ اترا تھا معاملہ اور بھی بگڑ گیا تھا۔ اس کی کانپتی انگلیوں سے لغزشیں پہ لغزشیں سرزد ہوتیں۔ وہ گیروے رنگ سے برتنوں پر گل بوٹے کاڑھتی اور لکیریں پھیل جاتیں۔ پتیاں اور ڈنٹھل اک دوجے میں مدغم ہو کر بے معنی نقوش میں ڈھل جاتے۔ یہ سب ناکامیاں اپنی جگہ مگر حکیم بیگم کے استقلال میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ ہر ہزیمت کے بعد وہ نئے عزم سے برسرپیکار ہو جاتی۔

شروع شروع میں عمر اس کے پاس بیٹھ کر بڑی توجہ سے گھومتے چاک اور قالب بدلتی گیلی مٹی کو تکا کرتا۔ وہ مشتاق نگاہوں سے منتظر رہتا کہ اب مٹی کا بے ڈھب تودا کسی صورت میں ڈھلے گا۔ کوئی ناند، کٹورا، کلسی یا ٹمیا۔ وہ حیرت سے مٹی کے مقدر کو بدلتے ہوئے دیکھتا۔ پھر جب اس پر حکیم بیگم کے اناڑی پن کا عقدہ کھلا تو اس کی دلچسپی خود بخود کم ہونے لگی۔ وہ اس سے فرمائش کرتا۔

''بے جی! مجھے کجا بنا دے میں اس میں ماسی چھوماں کی بلی کو دودھ پلاؤں گا۔''

وہ فوراً وعدہ کر لیتی اور جب آوا کھلتا تو ایک بینڈا سا برتن جو نہ مکمل گول ہوتا اور نہ پوری طرح چوکور اس کے ہاتھوں میں تھما دیتی اور اس کی طرف رائے طلب نظروں سے دیکھتی پھر اس کی آنکھوں میں مایوسی اور ناپسندیدگی کو محسوس کر کے نادم سی ہو جاتی اور ایک لمبی آہ بھر کر اپنی تازہ تخلیق اس سے واپس لے لیتی۔ عمر سوچتا کہ وہ اب عذر تراشے گی۔ اپنی ناکامی کو بہانوں کی چادر تلے ڈھانپنے کی کوشش کرے گی جیسا اس نے باقی سب لوگوں کو کرتے دیکھا تھا، پر وہ کبھی کوئی جھوٹی سچی دلیل پیش نہ کرتی۔ ہمیشہ بڑی سادگی سے اپنی شکست تسلیم کر لیتی۔

''اڑیا! میں بڑی نکمی ہوں۔''

وہ سفید بالوں والے سر کو تاسف سے ہلاتی۔

''میرا قصور ہے۔ سارا میرا قصور ہے۔ اللہ نے مجھے ہتھ دیے پر مجھے ان سے کم لینا ہی نہ آیا۔ پر میں پورا ٹل (زور) لگاتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں۔ جے اک بھانڈا (برتن) وی ٹھیک بن گیا تے ساری کھیچل (مشقت) دا صلہ مل جائے گا۔''

وہ حکیم بیگم کا ''اعتراف'' سن کر شرمندہ ہو جاتا اور اس کے نسیلے ہاتھ، ہاتھوں میں تھام کر کہتا۔

''تیرے بڈھے ہاتھ کانپتے ہیں بے جی۔ اس میں تیرا کیا قصور۔''

وہ ہنس دیتی۔

''جیہڑی (جو) کوتاہی آپ وچ ہو من لینی چاہی دی اے (چاہیے) اللہ بخشے میرا سوہرا (سسر) بڑا نامی گھمیار (کمہار) تھا۔اس دے بنائے ہوئے بھانڈے دور دور پنڈوں سے لوک خرید کرنے آتے تھے۔جد کوئی گاہک کسی بھانڈے میں نقص نکالتا یا کوئی بھانڈ اپلا (کچا) نکل آتا تو میرا سوہرا کہتا۔

''میرے ہتھ کے گھڑے ہوئے بھانڈے میں عیب نئیں ہوسکدا یہ کیمو نے بنایا ہے وچاری سکھ رہی ہے پر ہالی (ابھی تک) کم میں کچی ہے۔'' وہ جد بھانڈے بنا رہا ہوتا تو مجھے چاک کے نیڑے توں وی لنگنے نہ دیتا (قریب پھٹکنے نہ دیتا) اور ساری حیاتی اس نے مجھے ہنر نہ سکھایا۔اللہ جانے کیوں۔مجھے بڑا چا تھا اس کی شاگرد بنوں۔ایک گل سن لے کاکا! میں لکھان ولی (اناڑی) سہی، بے عقل سہی پر میری نیت وچ کھوٹ نئیں، میرے من وچ میل نئیں۔''

(میری نیت میں کھوٹ نہیں، میرے من میں میل نہیں) یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور عمر کا دل ایک بے نام تاسف میں مبتلا ہو جاتا۔

اس کی مستقل مزاجی محض برتنوں تک محدود نہ تھی۔کم و بیش سب معاملات میں وہ ایسی ہی تھی۔اس کی اکلوتی بیٹی آمنہ، جو عمر کی پیدائش سے بھی پہلے بیاہ کر امریکہ جا بسی تھی اور اپنے شوہر یوسف کے ساتھ جو رشتے میں حکیم بیگم کا بھانجا تھا، کبھی دو چار سال بعد اس سے ملنے آجاتی اور ہر تین ماہ بعد کچھ رقم بھجواتی اور ایک خط بھی ہمراہ ہوتا جس میں چند بندھے ٹکے الفاظ میں حکیم بیگم اور عمر کی خیریت دریافت کی جاتی اور اپنی خیریت سے آگاہی دی جاتی، اس پردیس میں بسنے والی کے لیے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی۔اس لیے نہیں کہ بیٹی کا ہجر اسے رُلاتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ بیٹی بے اولاد تھی۔

عمر نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔اسے ہر نماز میں روتے بلکتے دیکھا تھا۔چاہے وہ دنیا کا ہر کام بھول جاتی پر آمنہ کی اولاد کے لیے دعا مانگنا نہ بھولتی۔کبھی جب وہ اس کی زاریوں سے اوب جاتا اور اسے حکیم بیگم کی ''ڈھٹائی'' پر غصہ آنے لگتا تو وہ جھنجلا کر پوچھتا۔

''آمنہ باجی کی شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں؟''

وہ پہلے انگلیوں کی پوروں پر گنتی پھر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس دیوار کو دیکھتی جس پر وہ ہر سال محرم کی پہلی تاریخ کو گیروے رنگ سے ایک لکیر کھینچ دیتی تھی۔

''بارہ ورے (سال)۔''

''اچھا یہ بتا بارہ سالوں میں تو نے کتنی بار اللہ سے کہا ہے کہ وہ باجی کو بچہ دے دے۔''

''سدائیا مجھ گنوار نوں اتنا حساب کتاب کہاں آتا ہے۔''

''اللہ نے تیری بات ماننی ہوتی تو وہ اب تک مان گیا ہوتا۔تو بھلکڑ ہے۔وہ تو نہیں، تو اتنی بار اسے کیوں یاد کراتی ہے اور تو تھکتی بھی نہیں۔''

وہ اسے یوں سمجھانے لگتا جیسے وہ کوئی نادان بچی ہو۔

''میرا کم اے منگنا۔میں مانگتی رہوں گی۔وہ وے نہ دے اس سوہنے کی مرضی، میں اپنے کم وچ کوتاہی کیوں کروں۔'' وہ اس کی کم عقلی پر کڑھتا رہ جاتا۔

ایک دوپہر حکیم بیگم پسینے میں لت پت چاک سے اٹھی تو بہت پُرجوش تھی۔اس نے عمر کو بلا کر ایک نہایت خوب صورت پیالہ دکھایا جو اس نے ابھی ابھی چاک سے اتار کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھا تھا۔پیالے کی بناوٹ میں ایسی عمدگی تھی کہ عمر کو یقین

ہی نہ آتا تھا وہ حکیم بیگم نے بنایا ہے۔

''جدا آوے سے نکال کر پھل بوٹے بناؤں گی تو کیسا روپ نکلے گا۔ بس تو ایس وچ ددھ پیا کرنا۔ اج تو بول کہ میں کچی (بے ہنر) ئیں۔''

خوشی کے مارے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔

وہ ہانڈی پکانے چولہے کے آگے جا بیٹھی اور عمرو ہیں گیلے برتنوں کی قطاروں کے قریب زمین پر کوئلے سے لکھنے لگا۔

معاً موسم رنگ بدلنے لگا اور بادلوں کے سرمئی ہاتھوں نے سورج کا کندنی چہرہ ڈھانپ دیا۔ حکیم بیگم کی ہدایت پر اس نے ایک ایک کر کے سارے برتن احتیاط سے اٹھا کر چھپر تلے ترتیب سے رکھ دیے۔ چند لمحوں بعد آسمان کے پیالے سے ننھی ننھی بوندیں گریں جیسے حلوائی کے تھال سے چند نکلتیاں کناروں سے اچھل جائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تھال الٹ پڑا۔ چھا چھم بارش کے چھینٹے دھرتی سے ٹکرا کر اچھلتے اور چھپر تلے رکھے گیلی مٹی کے برتنوں پر مدھم نشان چھوڑ جاتے، عمر کے دل میں جانے کیا آئی۔ اس نے اوک میں بارش کا پانی بھرا اور اس کوزے میں چند قطرے گرا دیے جس کو بنا کر حکیم بیگم بجا طور پر فخر کے احساس میں گھری تھی۔

کوزے میں پانی کے قطروں نے چھوٹے چھوٹے گڑھے سے بنا دیے تو اسے یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی اوک میں پانی بھر بھر کے کوزے میں انڈیلتا رہا پھر اس نے حکیم بیگم کی نظروں کی زد سے بچتے ہوئے وہ پیالہ اٹھا کر اولتی (چھپر کا کنارا) تلے دھر دیا۔ بارش کی بوندیں اولتی سے ٹپکتی ہوئی پیالے میں گرتی رہیں اور چھوٹے بڑے گڑھے اور مبہم سی لکیریں بنتی مٹتی رہیں۔

اسے یہ کھیل بڑا دلچسپ لگ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ بعد میں تھپک کر ان نشانات کو مٹا دے گا، جو بارش کے پانی سے کوزے کے بدن پر بن رہے تھے۔ پیالے کو دیکھتے ہوئے چھپر کی بیساکھی پر بازو لپیٹ کر وہ گول دائرے میں گھومنے لگا اور ساون کا ایک گیت گانے لگا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس نے آبخورے سے نظریں ہٹائیں اور جب دوبارہ اسے دیکھا تو ٹھٹک کر بیساکھی سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اب وہ بارش کی بوندوں سے پگھلنے لگا تھا۔

ہیئت بدل رہا تھا...... اس کی صورت بگڑ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہا تھا۔

اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔ وہ اسے نیست ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کیچڑ کے بے شکل لوتھڑے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے بے ضرر کھیل نے کیسا غضب ڈھایا تھا۔ اس کی دل گرفتی بے انت تھی۔

✠ ✠ ✠

صوفیہ پچھلے پندرہ منٹ سے نشست کے ہتھے پر کہنی ٹکائے اور ہتھیلی پر چہرہ تھامے اونگھ رہی تھی۔ یوں تو اسے سب مضامین ناپسند تھے مگر کیلکولس سے اسے خاص طور پر نفرت تھی۔

رچرڈ ڈیفلک جو اعداد اور علامات وائٹ بورڈ پر لکھ رہا تھا، ان کی حیثیت صوفیہ کے نزدیک روشنائی سے بنائی گئی کیڑے مکوڑوں کی شبیہوں سے زیادہ نہیں تھی۔ جب سے کلاس شروع ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی رچرڈ ڈیفلک کی منوم آواز یا اس کے سرعت سے چلتے ہاتھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے جاگتے رہنے کی شعوری کوشش کی تو وہ ایسی گہری نیند میں چلی جائے گی کہ اس کے نشست سے گرنے کا بھی امکان تھا۔ ویسے بھی رچرڈ اسے کیلکولس کا استاد کم اور ماہر نومیت زیادہ لگتا تھا جو اپنے مریضوں سے خواب ناک آواز میں پرسکون ہو جانے اور نیند میں چلے جانے کی فرمائش دہراتا رہتا۔

''تمہیں نیند آ رہی ہے...... تم سونا چاہتے ہو...... تمہارے اعصاب تھک چکے ہیں انہیں آرام چاہیے......''

کیلکولس کی کلاس میں سونے والی اور دیگر مصروفیات تلاش کرنے والی وہ تنہا نہیں تھی۔ پوری کلاس میں شاید ہی کوئی رچرڈ ایفلک کو دھیان سے سن رہا تھا۔ یوں بھی وہ جس پبلک ہائی اسکول میں پڑھتی تھی وہاں طلباء کی بڑی تعداد دوسرے اسکولوں سے نکالے گئے یا وہ تھے، جنہیں کوئی اچھا اسکول قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بہت سے منشیات کے عادی اور سابقہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے بھی وہاں پڑھ رہے تھے۔ ایک معقول تعداد ایسے طلباء پر مشتمل تھی جو یا تو غیر شادی شدہ والدین تھے یا اس فہرست میں شمار ہونے کی توقع رکھتے تھے۔

اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی جسیکا عقب میں کیلی کے ساتھ مستقبل کے منصوبے بانٹ رہی تھی۔ اسے ان کے مستقبل یا منصوبوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اُسے پرواتھی تو اپنی نیند کی جس میں وہ مسلسل خلل انداز ہو رہی تھیں۔

''میں تو ہمیشہ سے ہاورڈ لاء گریجویٹ بننے کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔''

جسیکا نے ایک طویل آہ بھری۔

''مگر جب سے ڈیڈی تیسری بار جیل گئے ہیں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔''

''کتنے دکھ کی بات ہے'' کیلی نے آواز میں تاسف پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ پھر وہ publicist بننے کی خواہش اور اپنی غیر متوقع پریگنینسی کا تذکرہ کرنے لگی تھی۔ پھر گفتگو میں ایسا موڑ آیا جب کیلی اپنے پرتگالی بوائے فرینڈ کے ساتھ تنہائی میں ملاقاتوں کا احوال سرگوشیوں میں سنانے لگی اور ایسی ہی ایک ملاقات میں کسی ''شرارت'' کا ذکر چلا تھا کہ دونوں نے یک آہنگ ہو کر بلند قہقہہ لگایا جس نے رچرڈ کی توجہ ان کی جانب مبذول کروادی تھی۔ وہ وائٹ بورڈ سے ہٹ کر انہیں کلاس روم میں بیٹھنے کے اطوار اور اخلاقیات پر تفصیلی لیکچر دینے لگا تو مجبوراً صوفیہ کو بھی آنکھیں کھول کر اور قدرے سیدھا ہو کر بیٹھنا پڑا۔

جسیکا نے رچرڈ کو کوئی اہمیت دیے بنا کیلی سے ادھوری بات پوری کرنے کو کہا۔

''آگے بتاؤ نا پھر کیا ہوا؟''

''بعد میں بتاؤں گی۔ اس بکواس نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے۔ صوفیہ!'' اچانک کیلی نے اسے پکار لیا۔

''تم نے کبھی نہیں بتایا کہ ہائی اسکول کے بعد تم نے کیا کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ کیا تم بھی اپنی ماں کی طرح مشہور اداکارہ بننا چاہتی ہو۔''

اس نے مشہور کہتے ہوئے منہ کو جیسے بگاڑا تھا۔ اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ اس کی ماں کو کوئی رکیک گالی دے لیتی۔ وہ صوفیہ کو کبھی مخاطب نہیں کرتی تھی اور اگر کرتی تھی تو صرف طنز کرنے کے لیے۔

صوفیہ نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے قبل ہی اسے اپنے متوقع مستقبل سے آگاہ کر دیا تھا اور جو کچھ وہ کرنا چاہتی تھی اسے سن کر ان دونوں کے منہ پہلے کھلے اور پھر نچلے جبڑے ڈھیلے ہو کر گر گئے۔

''کیلی! کیا اس نے حقیقتاً وہی کہا ہے جو میں سمجھ رہی ہوں؟''

جسیکا کے سوال کا جواب کیلی کی بجائے صوفیہ نے دیا تھا۔

''میں Hooker بنوں گی، یہی میری خواہش ہے۔''

شاید وہ مذاق کر رہی تھی۔ ان دونوں کو یہ خیال ایک ساتھ ہی سوجھا تھا مگر انہیں فوراً اسے رد کرنا پڑا۔ وہ جانتی تھیں، صوفیہ کبھی مذاق نہیں کرتی تھی۔

''لیکن کیوں؟''

''میں اپنے باپ اور اس کے خدا کو بتانا چاہتی ہوں کہ یہ میری زندگی ہے۔ صرف میری......اور میں اس کے ساتھ جو

چاہوں کرسکتی ہوں۔ان دونوں میں سے کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔“

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“ کیلی نے الجھ کر استفسار کیا۔

ان دونوں کو حیران ہونے کا موقع دے کر وہ جیروم کی بات سننے لگی تھی جو اس کی طرف ایک تہہ کیا ہوا کاغذ بڑھا رہا تھا۔

”کیا ہے یہ؟“ اس نے کاغذ لیتے ہوئے اس سمت دیکھا، جدھر جیروم نے اشارہ کیا تھا۔

دروازے میں ایستادہ کارل میکارتھی نے نظروں کا ملاپ ہونے پر آنکھ کا کونہ دبایا تھا اور ہاتھ ہلا کر پلٹ گیا تھا۔

وہ کاغذ کی تحریر پڑھنے لگی۔

”ٹھیک بارہ بجے مجھے پروجیکشن روم میں ملو۔ لیٹ مت ہونا۔“

اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ رچرڈ ایفلک کا لیکچر اختتامی مراحل میں تھا۔ اس نے بیگ سے وکٹر ہیوگو کا دی ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم نکالا اور درمیان سے کھول کر سطور پر سرسری نظر دوڑانے لگی۔ اس نے یہ ناول پڑھ رکھا تھا اور ان لمحات میں ورق گردانی کا مقصد محض وقت گزاری تھا۔

کچھ دیر تک اوراق پلٹتے رہنے کے بعد اس نے دوبارہ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو بارہ بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ ناول کو بیگ میں رکھتے ہوئے وہ نشست سے اٹھ گئی، کسی سے کچھ کہے بنا کلاس روم سے باہر نکلی اور نہایت سست روی سے قدم گھسیٹتی ہوئی دائیں جانب بڑھنے لگی۔

پروجیکشن چیمبر، آڈیٹوریم ہال کے اوپر ایک مختصر سے کمرے میں بنایا گیا تھا۔ دروازہ دھکیل کر صوفیہ اندر داخل ہوئی تو وہ ایک گوشے میں پڑی میز پر بیٹھا تھا اور خاصا برہم نظر آتا تھا۔

”تم بہت دیر سے آئی ہو۔ شاید تم نے میرا پیغام غور سے نہیں پڑھا۔“

”میں نے پڑھا تھا۔ میں جان بوجھ کر دیر سے آئی ہوں۔“ وہ حیرت سے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔

کارل میکارتھی مقامی کالج کی فٹ بال ٹیم کا کوارٹر بیک تھا۔ پانچ فٹ دس انچ قد، مضبوط کاٹھی، چہرہ قدرے لمبوترہ، رخساروں کی ہڈیاں ذرا سی ابھری ہوئی، گہری نیلی آنکھیں اور ٹھوڑی کے وسط میں زخم کا ترچھا نشان وہ لڑکیوں میں پُرکشش ترین مجرد مرد کے طور پر مشہور تھا۔

وہ کسی لڑکی کو دیکھ کر مسکرا دیتا تو جواباً اسے قہقہے سے نوازا جاتا۔ وہ ہاتھ ملانے کی بات کرتا تو لڑکیاں گلے لگنے کی کوشش کرتیں۔

وہ اپنی تمام خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ایسے میں صوفیہ جیسی خستہ حال لڑکی، جس کا کوئی بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ بھی نہ ہو، کا اسے جان بوجھ کر انتظار کروانا یقیناً باعث حیرت تھا۔ اگرچہ وہ بہت خوبصورت تھی لیکن یہ کوئی ایسی قابلیت نہیں تھی جس پر یوں اترایا جائے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی لڑکیاں خوبصورت تھیں۔

صوفیہ میں اس کی دلچسپی اس روز پیدا ہوئی تھی جب وہ ایک دوست کی طرف سے دی جانے والی Thanksgiving پارٹی میں شریک تھا۔ اس نے صوفیہ کو میز کے ایک کونے میں خاموش بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں Pumpkin Pie کا ایک مختصر ٹکڑا رکھے فورک کی مدد سے اسے مسلسل گھما رہی تھی اور ایک بار بھی ان کی گفتگو میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ کارل کا جی چاہ رہا تھا وہ بولے اور اس نے کئی بار اسے بات چیت میں گھسیٹنے کی کوشش بھی کی البتہ وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن جب وہ بولی تو بے اختیار کارل کو اپنی اس خواہش پر پچھتانا پڑا۔ پارٹی کے اختتام پر جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو کارل نے میزبان مارٹن پر احسان جتانے کے لیے کہا۔

''میں آج اونٹاریو میں مدعو تھا۔ سلینا نے تھینکس گوِنگ کے لیے صرف مجھے بلایا تھا اس کا واحد مہمان اس وقت......''

صوفیہ نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

''کینیڈا میں تھینکس گوِنگ اکتوبر کے دوسرے پیر کو منایا جاتا ہے اور آج نومبر کا آخری جمعرات ہے۔''

کارل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ سب لوگ خاموش ہو کر اسے گھور رہے تھے۔ اس کی بہت سبکی ہوئی تھی اس کے لیے وہاں مزید ایک لحہ گزارنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ اسپورٹس کار سڑک پر لے آیا تو صوفیہ فٹ پاتھ پر بائیسکل چلاتی ہوئی نظر آ گئی۔ کارل نے اس کے برابر لا کر کار کو ذرا سا لہرایا اور ترچھا کر کے فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ کار اسے چھو کر واپس سڑک پر آ گئی تھی۔ صوفیہ دھچکا لگنے سے گری ضرور تھی مگر اس نے اٹھنے میں اتنی پھرتی دکھائی تھی جیسے گری ہی نہ ہو۔ وہ بھاگتی ہوئی سڑک پر آئی اور کوئی وزنی شے کار کی جانب پوری قوت سے اچھال دی۔ شیشہ چھناکے دار آواز سے ٹوٹ گیا تھا۔

کارل کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وزنی شے دراصل سنگ مرمر سے بنا ہوا ایک آرائشی مجسمہ تھا جو مارٹن کے گھر سے آتے ہوئے صوفیہ نے سب کے سامنے ایسی ہشیاری سے اٹھا لیا تھا کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔

وہ کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکلا اور اسے گالی دینے کے لیے منہ کھول ہی رہا تھا کہ وہ برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی قریب آئی اور اس کے گال پر زوردار تھپڑ مارنے کے بعد ایک لحہ رکے بغیر پہلے سے بھی زیادہ رفتار سے دوڑ کر فٹ پاتھ پر پہنچی، گری ہوئی بائیسکل سیدھی کی اور چند لمحوں بعد اندھیرے میں کھو گئی۔ کارل نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہکا بکا وہیں سڑک پر کھڑا رہ گیا تھا۔

اس واقعے کے چند دن بعد اس نے صوفیہ کو ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں دیکھا تھا اور اس پر پہلی نظر پڑتے ہی کارل کو شک گزرا تھا کہ وہ خریداری تو کرنا چاہتی تھی مگر کسی کے علم میں لائے بغیر...... وہ مختلف کاؤنٹرز کے درمیان گھومتے ہوئے بار بار کلوز سرکٹ ٹی وی سیٹ کی اسکرین کو جس انداز سے دیکھ رہی تھی، وہ اس کے ارادے ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ وہاں کچھ چیزیں خریدنے آیا تھا مگر اس نے صوفیہ کی پراسرار سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے اس ارادے کو کچھ وقت کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

کافی دیر ادھر سے ادھر پھرتے رہنے کے بعد صوفیہ کی نظر انتخاب جیولری کے ایک کاؤنٹر پر ٹھہری۔ وہ لیڈیز بریسلٹ نکلوا کر دیکھنے لگی تھی۔ کارل اس کے قریب ہی ایک، دوسرے کاؤنٹر پر بظاہر مردانہ گھڑیوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا لیکن اس کا دھیان پوری طرح صوفیہ کی جانب تھا۔ اس نے پی کیپ ترچھی کر کے پیشانی پر ایسے جھکا لی تھی کہ اس کی آنکھیں اور چہرے کا کچھ حصہ چھجے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صوفیہ اسے وہاں دیکھ کر چونک جائے۔

وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑوانے کا خواہاں تھا۔ وہ نہایت تحمل کے ساتھ صوفیہ اور سیلز گرل کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا اور صوفیہ کے بریسلٹ پرکھتے ہاتھوں کی ایک ایک جنبش دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد کارل نے اسے کچھ بریسلٹ ایک ساتھ کاؤنٹر سے اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ انہیں آنکھوں سے قریب لا کر ایسے انہماک سے جانچنے لگی تھی جیسے ان کا مقابلتاً موازنہ کر رہی ہو۔ اسی معائنے کے دوران اسے زوردار چھینک آئی اور کچھ بریسلٹ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گرے، کارل یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ چھینک مصنوعی تھی۔ لیکن لاشعوری طور پر اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

''میں معذرت چاہتی ہوں۔ یہ بے ہودہ فلو۔''

صوفیہ نے ناک رگڑتے ہوئے باقی ماندہ بریسلٹ کاؤنٹر پر رکھے اور تیزی سے نیچے جھکی۔ اس نے سیدھا ہونے اور گرے ہوئے بریسلٹ سیلز گرل کے حوالے کرنے میں محض چند سیکنڈ صرف کیے تھے مگر یہ چند سیکنڈ بہرحال وہ کیمرے کی آنکھ سے اوجھل رہی تھی۔ یہ سب اگرچہ بہت تیزی میں ہوا تھا، لیکن کارل اس کے کارڈیگن کی آستین سے جھانکتا ہوا سنہری زنجیر کا سرا دیکھ چکا

تھا۔اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔
''میرا خیال ہے مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں آ سکا۔'' وہ بیزار صورت والی سیلز گرل سے رخصت ہو کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھی تو کارل دانستہ اس کے راستے میں آ گیا۔
صوفیہ نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور کترا کر گزر گئی۔
''لگتا ہے بہت جلدی میں ہو۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' کارل نے اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کی۔
وہ یکدم بپھر گئی تھی۔
''دور رہو۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔''
''وہ بات بھی نہیں جو......ایک سنہری بریسلٹ کے بارے میں ہے۔'' وہ چند لمحے کارل کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر اسے چھینک آئی جو فنی اعتبار سے پہلی چھینک سے زیادہ حقیقی محسوس ہوئی تھی۔
''تمہارے پاس رومال ہوگا؟''
کارل کے ہونٹوں پر زہرناک تبسم نے کروٹ لی۔
''یہ فلو بڑی لعنتی شے ہے۔''
وہ اپنے ٹراؤزر کی جیبیں ٹٹولنے لگا اور صوفیہ اس کے قریب آ کر سرگوشی میں بولی۔
''اگر تم اپنی زبان بند رکھو تو میں اپنے سابقہ رویے کا ازالہ کرنے کو تیار ہوں۔''
وہ بات کرتے ہوئے یوں اس کا کالر سنوارنے لگی تھی، جیسے دونوں بہت گہرے دوست ہوں۔
''مجھے منظور نہیں ہے۔'' کارل اس کا ہاتھ جھٹک کر نخوت سے بولا۔
''جیسے تمہاری مرضی۔''
اس نے کندھے اچکائے اور تیز تیز قدم اٹھاتی بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔
کارل کو اس کے پرسکون انداز نے سخت سلگایا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر گارڈ کو پکارنے لگا۔
کارل کے لگائے ہوئے الزام کی تصدیق کے لیے اسٹور کے منیجر نے صوفیہ کو تلاشی دینے کے لیے کہا۔ پہلے تو اس نے سخت احتجاج کیا اور کارل کو ایسی ایسی گالیاں دیں جنہیں سن کر کسی کو بھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ وہ صوفیہ جیسی نوعمر اور معصوم صورت لڑکی کے منہ سے برآمد ہوئی تھیں۔
ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں موجود تمام لوگ دیگر مصروفیات ترک کر کے اسی کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ جب وہ ہینڈ بیگ میں موجود سامان فرش پر ڈھیر کرنے لگی تو کارل نے گارڈ کو اشارے سے بتایا کہ بریسلٹ اس نے کہاں چھپایا تھا۔ جس پر اس نے سمجھنے والے انداز میں سر کو جنبش دی اور قریبی کاؤنٹر پر موجود بھاری تن و توش والی سیاہ فام سیلز گرل سے صوفیہ کی تلاشی لینے کی درخواست کی۔ سیلز گرل اسے ساتھ لے کر لیڈیز روم میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئیں اور سیلز گرل نے بتایا کہ اس سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا تو مغلظات تازہ کا سلسلہ صوفیہ کی زبان سے جاری ہو گیا۔ اس نے منیجر کی معذرت سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی، کارل کے کم و بیش سارے خاندان کا اس نے ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ بے اختیار وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اتنے گھناؤنے کردار شاید ابھی تک ہالی وڈ کی کسی فلم میں بھی تخلیق نہیں کیے گئے ہوں گے۔ آخرکار منیجر کو مداخلت کرنا پڑی۔

''آپ لوگوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہے تو باہر جا کر حل کریں۔ میں آپ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسٹور سے چلے جائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''تم بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ بوڑھے گدھ۔ میں تم پر ہتک عزت کا دعوا کروں گی۔ میرے وکیل کی طرف سے لیگل نوٹس کا انتظار کرنا۔''

وہ مینجر کو دھمکاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد کارل باہر نکلا تو وہ اس کی منتظر تھی۔ فٹ پاتھ پر آئسکریم سوڈا سے محظوظ ہوتے ہوئے اس نے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ کارل کی جانب اچھالی تھی۔ وہ ڈھیلے قدموں سے چل کر اس کے قریب پہنچا اور چند ثانیے بغور اسے دیکھتا رہا۔ وہ حیرت انگیز طور پر پرسکون نظر آتی تھی۔

''آخر تم کیا شے ہو؟''

کارل نے بے بسی سے شانے اچکائے۔

''میں تم سے معافی مانگتا ہوں لیکن اتنا تو بتا دو کہ وہ بریسلٹ تم نے کہاں چھپایا تھا۔ سیلز گرل کو کیوں نہیں مل سکا؟''

ایک پراسرار مسکراہٹ نے صوفیہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔

''وہ میرے پاس ہوتا تو اسے ملتا بھی۔''

''تو پھر؟''

''وہ تمہارے پاس ہے۔''

''میرے پاس؟''

کارل نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

''ہاں......وہ میں نے تمہارے سویٹر کے کالر میں اٹکا دیا تھا۔''

اس دن کے بعد ان کے مابین تعلق ایک نیا رخ اختیار کر گیا۔ مختصری ملاقاتیں، جن کے لیے خاص طور پر فرصت ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ سرراہ ہیلو ہائے۔ کبھی کبھار کارل اسے سکول جاتے ہوئے یا واپسی پر اپنی اسپورٹس کار میں لفٹ دے دیتا اور وہ کوئی عام اسپورٹس کار نہ تھی۔ اس میں بیٹھنا لڑکیاں اپنے لیے اعزاز گردانتی تھیں۔ صوفیہ کو خبر تھی کہ کارل کی گرل فرینڈز کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں تھی۔ تاحال وہ خود اس فہرست میں شامل تو نہیں ہوئی تھی لیکن اتنا بھی غنیمت تھا کہ کارل کے التفات کے باعث وہ دیگر لڑکوں کے لیے اہم ہوگئی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک خاص حد سے زیادہ میل جول رکھنے سے کارل کے ''درجات'' میں کمی واقع ہو سکتی تھی، کیونکہ وہ اس ''معیار'' پر ہرگز پوری نہیں اترتی تھی جو کارل میکار تھی کی گرل فرینڈ ہونے کے لیے مطلوب تھا۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود وہ کارل کو آدھا گھنٹہ انتظار کروانے کے بعد پروجیکشن چیمبر میں آئی تھی اور یہ بات اسے نہایت سردمہری سے بتا بھی رہی تھی۔

''لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟''

وہ اچھل کر میز سے نیچے اتر آیا تھا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ ''تمہیں جرأت کیسے ہوئی۔'' صوفیہ نے ایک لمحہ اس کی سکڑی ہوئی گھنی بھنوؤں کو دیکھا اور ہموار لہجے میں بولی۔

''تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد نہیں ہو۔''

یہ سفید جھوٹ تھا اور کارل کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے تھے ان سے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ اس بات کی سچائی پر ایمان نہیں لایا تھا لیکن اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔

''میں عمر میں بھی تم سے بڑی ہوں۔ ہمارے گھریلو حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ میری اسکول کی پڑھائی بہت دیر سے شروع ہوئی۔''

''تو......؟'' کارل نے الجھ کر پوچھا۔

''تو یہ کہ میں ان معاملات کو تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ محبت کا کھیل میں نے بہت کھیلا ہے۔ میں جانتی ہوں تم نے مجھے کسی مہنگے ریستوران میں ڈنر ڈیٹ پر کیوں نہیں مدعو کیا اور جارڈن ہائی اسکول کے دور افتادہ گوشے میں اس ساؤنڈ پروف، گھٹن زدہ اور بوسیدہ پروجیکشن روم میں کیوں بلایا ہے۔''

کارل کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ تم مجھ جیسی معمولی لڑکی کے ساتھ کھلے عام گھوم پھر نہیں سکتے۔ یہ تمہاری شخصیت کی توہین کرنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا کہ ایک لڑکی تمہاری زندگی میں آئے اور تمہاری فتوحات میں شمار ہونے سے رہ جائے۔ تم اس سے کچھ فیض نہ اٹھا سکو۔ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہو مسٹر میکارتھی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے انتخاب کرنے میں غلطی کی ہے۔ میں تر نوالہ نہیں۔''

''بند کرو اپنی بکواس۔ تم پاگل ہو گیا۔''

کارل کے بھاری جبڑے سختی سے بھینچے ہوئے تھے لیکن اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والی پسینے کی بوندیں صوفیہ کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکی تھیں۔

''میں نے تمہیں اس لیے آدھا گھنٹہ انتظار کروایا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے تڑپ پیدا ہو۔ میں جانتی ہوں، میں تم سے جتنی بے نیاز رہوں گی اسی قدر تم میری طرف مائل ہوتے جاؤ گے۔''

یہ بات اس نے گرانٹ اور البا بارسیلو سے سیکھی تھی۔

اسے یاد نہیں تھا کہ گرانٹ کی کوئی بھی دعا کبھی قبول ہوئی ہو مگر وہ ہر بار رد کیے جانے کے بعد اور بھی شدت سے خدا کے سامنے گڑگڑاتا۔ بھکاریوں کی طرح فریادیں کرتا۔ جس قدر خدا اس سے بے نیاز تھا، اسی درجہ وہ خدا کے قرب کے لیے تڑپتا تھا۔

اور البا بارسیلو جو مرن گھڑی تک گرانٹ سے محبت کی بھیک مانگتی رہی۔ اس کی محبت کی جتنی تذلیل گرانٹ نے کی تھی اگر اس میں ذرا بھی عزت نفس ہوتی تو اس کے منہ پر تھوک کر اس کی زندگی سے نکل جاتی مگر ہر بار ٹھکرائے جانے پر وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ گرانٹ کو اپنی تذلیل کرنے کی دعوت دیتی۔

''ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟''

کارل کی آواز ایک دبی دبی غراہٹ سے مشابہہ تھی۔

''وہی بتانے لگی ہوں۔ دیکھو کارل! تم پورے والس میں کسی بھی اسٹریٹ واکر کو بک کرو گے تو وہ تم سے بیس سے تیس bucks چارج کرے گی۔ لیکن میں چونکہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں اور میں نے کسی سڑک پر آوارہ گھومتے ہوئے خود کو تمہیں پیش نہیں کیا اس لیے میری قیمت تھوڑی سی زیادہ ہوگی۔ میرا مطلب ہے میرے وقت کی قیمت۔''

کارل کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا کہ صوفیہ نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

''میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اور یہ بتانے کی زحمت بالکل نہ اٹھانا کہ تمہیں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں اور لڑکیاں تم پر رقم

خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ میں ان تمام لڑکیوں سے مختلف ہوں اور تم مجھے کھونا نہیں چاہتے۔ کسی اچھے ریستوران میں دو لوگوں کے ڈنر کا جتنا بل بنتا ہے وہ تم مجھے دے دو لیکن ریستوران کا انتخاب میں کروں گی اور آئندہ جب بھی تم مجھے ڈیٹ پر لے جانا چاہو یعنی نہ لے جانا چاہو اور چاہو کہ ہمارے درمیان وہ سب کچھ ہو جو کسی ڈیٹ پر ہوتا ہے تو بے جھجک مجھے بتا دینا۔میں تمہیں قیمت بتا دیا کروں گی۔''

''صوفیہ!تمہیں کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟''

''میں غصے میں نہیں ہوں۔دیکھو میں مسکرا بھی رہی ہوں۔''اس نے ہونٹوں کو پھیلا کر عجب استہزاء سے کہا تھا۔

''اچھا تم بیٹھ تو جاؤ۔میں نے ملاقات کے لیے کسی قدر رومانی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔تم نے داد بھی نہیں دی۔مجھے معلوم ہے تم مذاق کر رہی ہو اور وہ بھی اس صدی کا سب سے بھونڈا مذاق۔''

کارل اسے میز کی سمت لے جانے لگا تو صوفیہ نے اس کا ہاتھ سختی سے ہٹا دیا اور آگے بڑھ کر میز سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

کارل کو سو فیصد یقین تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی لیکن اس نے ایک اور پینترا بدلنے کا فیصلہ کیا، چاہے وہ مختلف تھی اور اسے ہینڈل کرنا آسان نہیں تھا مگر وہ بھی کوئی اناڑی اور جذباتی قسم کا عاشق نہیں تھا۔اسے معلوم تھا کہ تعریف ایک ایسی آگ تھی جو پتھر سے بنی ہوئی عورت کو بھی موم کی طرح پگھلا سکتی ہے۔

وہ صوفیہ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے گہری نیلی آنکھوں کو قدرتی پھیلاؤ سے ذرا سا زیادہ پھیلا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔اس کا یہ انداز لڑکیوں کے دل پر ہمیشہ بجلی بن کر گرتا تھا۔

''صوفیہ!میری آنکھوں میں دیکھو۔''

اس نے آواز کو گمبھیر بنا کر سرگوشی کی۔

''تمہارے منہ سے گھٹیا تمباکو کی بو آ رہی ہے۔''

صوفیہ کا جواب اس کے لیے طمانچہ تھا۔سنبھلنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔

اس واہیات لڑکی سے زیادہ گھٹیا بھی کوئی شے ہو سکتی تھی۔اسے کیا معلوم کہ وہ کتنے مہنگے برانڈ کے سگریٹ پیتا تھا اور اس کے ہونٹوں سے پھوٹتی تمباکو کی مہک اس کی مردانہ دلکشی میں کتنا اضافہ کرتی تھی خیر......وہ کسی نہ کسی طرح اس دھچکے کو سہہ گیا۔اپنے کھولتے ہوئے دماغ کو تھپک کر بولا۔

''تم کہو تو میں تمہارے جوتے اتار دوں۔میں نے سنا ہے کہ ہسپانوی عورتوں کے پاؤں بہت حسین ہوتے ہیں۔میں پرکھنا چاہتا ہوں کہ میں نے سچ سنا ہے۔''

''میری ماں ہسپانوی تھی۔میں اپنی زندگی میں کبھی اسپین نہیں گئی۔''وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صوفیہ پر تھپڑوں کی بارش کر دے۔

''ابھی تمہارے پاس کچھ رقم ہے یا ہم بعد میں ملیں۔''

وہ ٹانگیں جھلاتے ہوئے شدید بیزاری کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

''صوفیہ!یہ کیا بے ہودگی ہے۔میں بھی تمہاری طرح اسٹوڈنٹ ہوں اور میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہوتی۔ڈیڈی مجھے بہت تھوڑے......''

''تمہارے ڈیڈی جس لاء فرم میں پارٹنر ہیں، وہ کلائنٹس کو لوٹنے کے لیے بدنام ہے۔تمہاری چھوٹی بہن جس پرائیویٹ سکول میں پڑھتی ہے وہاں ماہانہ ٹیوشن فیس ایک سو پینتالیس ڈالر وصول کی جاتی ہے۔اور تمہارے پاس جو بینٹلے ہے اس کی قیمت

مارکیٹ میں ایک سونوے ہزار ڈالر ہے۔''

کارل کو اس کی معلومات پر حیرت نہیں ہوئی۔اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

''تم چاکلیٹ کھاؤ گے؟ میرے بیگ میں ہے۔''

اسکول سے واپس آ کر وہ میبل کے اپارٹمنٹ کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانے لگی تھی۔

دروازہ جونہی کھلا وہ میبل کو ایک طرف دھکیل کر اندر گھس گئی۔وہ بہت عجلت میں لگتی تھی۔

''میبل! یہاں آؤ۔جلدی کرو۔''

میبل اسے تیزی سے جوتے اور جرابیں اتارنے کی کوشش میں ایک ٹانگ پر اچھلتے دیکھ کر پورا منہ کھول کر ہنسنے لگا تھا۔

''یہ دیکھو میبل!'' اس نے جوتے دور اچھال دیئے۔

''دیکھو ناں۔'' وہ دائروں میں گھومنے لگی۔

میبل خاموش ہو کر اسے گھورنے لگا تھا۔

''میبل! دیکھو میرے پاؤں۔''

وہ کسی بیلے رینا کی طرح اسکرٹ کے دونوں کونے اٹھائے پیروں کے پنجوں پر گھوم رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے ہسپانوی عورتوں کے پاؤں دنیا میں سب سے حسین ہوتے ہیں۔دیکھو ناں میبل! میرے پاؤں کتنے حسین ہیں۔تمہیں تو پتہ ہی نہیں میں بھی ہسپانوی ہوں......میرے پاؤں......آہ......میرے پاؤں......''

گھومتے گھومتے وہ دھم سے گری اور یوں ساکت ہو گئی جیسے اس کے تن سے روح نکل گئی ہو۔

✠ ✠ ✠

میگھ گھام (بادلوں کے باعث حبس) درو دیوار سے کسی خودرو جنگلی بیل کی طرح لپٹا تھا۔انار کی گلابی ہنسی شام کی دہلیز پر اٹکی تھی۔بکائن کے پھولوں کی کسیلی مہک ہر آتی جاتی سانس کے گرد ایک پھندہ سا کس دیتی تھی۔

حکیم بیگم نے آلے (چراغدان) میں دھرے چراغ کے فتیلے کو دیا سلائی دکھائی اور چراغ اٹھا کر اندر چلی آئی، جہاں گھاٹ پہ عمر گٹھڑی سا بنا ہوا پڑا تھا۔وہ گزشتہ رات سے بخار میں پھنک رہا تھا اور حکیم بیگم نے تمام ٹوٹکے آزما دیکھے تھے مگر بخار تھا کہ ٹوٹنے میں ہی نہ آتا تھا۔حکیم اجمل کے مطب سے لائی ہوئی دوا سے بھی ذرا افاقہ نہ ہوا تھا۔مینگوی والے ڈاکٹر تک جانا اس لیے ممکن نہ تھا کہ ساون کی برساتوں نے نالہ بئیں کو اتنا بھر دیا تھا کہ اس کا پانی کناروں سے چھلکنے لگا تھا۔ان دنوں اسے ان بیڑیوں کی مدد سے بھی پار نہیں کیا جا سکتا تھا، جو معمول کے ایام میں اسکول پڑھنے والے بچوں اور دیگر ضروریات کی خاطر مینگوی یا اڈہ نور کوٹ جانے والے لوگوں کو آمدورفت کی سہولت مہیا کرتی تھیں۔ہر سال برسات کے دنوں میں نالہ بئیں کے اس پار بارڈر کے نزدیک بسنے والے دیہات کی روزمرہ زندگی تعطل کا شکار ہو جاتی تھی اور اسکول پڑھنے والے بچے غیر معینہ مدت کے لیے تعطیلات پر رہتے تھے۔

عمر کے سرہانے بیٹھ کر وہ اس کا پُر حدت سر پولے (نرم) ہاتھوں سے دبانے لگی تھی۔اس کا ناتواں بدن تنور میں لگی روٹی کی طرح سلگتا تھا۔

''بے جی!'' اس نے نحیف آواز میں پکارا۔

''میری ماں اچھی عورت نہیں تھی؟ ماسی چھوماں کہتی ہے وہ......''

''چھوماں کا جو دل کرتا ہے آکھ (کہہ) دیتی ہے۔تیری ماں ایسی سوہنی بیبا بس کی صفت کراں (کروں) جد پہلی وار اس

گھر وچ آئی تے مجھے ویہڑہ میلا لگنے لگا۔ سمجھ نہ آئے اس نوں کتھے (کدھر) بٹھاؤں۔ نہ موڑھا ملے نہ چوکی۔ میں تو کملی ہو گئی۔''

''وہ چنگی تھی میرے جیسی۔''

اس کے بخار سے تپیدہ چہرے پر اشتیاق پھیل گیا۔

''ہاں تو اس ورگا (جیسا) ہے۔ اسی واسطے تے لوک مانتے نئیں تو میرا پتر ہے۔ میں جلتے ہوئے بالن ورگی تے تو چٹا دودھ (دودھ) میری آمنہ دی میری طرح شاہ کالی۔ تیرا رنگ روپ ہی وکھرا ہے ہم سے۔ میں کنج (کس طرح) لوکوں کی زبانیں پکڑوں کوئی کچھ بولے تے سن لیا کر چپ کر کے۔''

عمر نے ماتھے پر رکھا ہوا حکیم بیگم کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھنجوڑا۔

''ماں کے بارے میں تو بتا۔''

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''کنی (کتنی) وار سنے گا؟ سوہنی تھی۔ سنکھی (خوش اطوار) تھی۔ کدی کدی جوڑا بناتی تھی۔ پیروں میں گرگابی پہنتی تھی۔ جو رنگ دی پہن لیتی پھب جاتا۔ لاکھانہ مسّی نہ غازہ فیروی جھرمل جھرمل (جگمگ) کرتا روپ تھا۔ رات کو جد وہ چھینٹ دی رضائی وچ سوتی تے مجھے دیوا بالن (جلانے) دی لوڑ (ضرورت) نہ رہتی۔

''اسے دیوے کی لاٹ اچھی نئیں لگتی ہو گی۔ تیل کی بو بری لگتی ہو گی۔ وہ شہر کی رہنے والی تھی۔ اسی لیے ناں۔''

عمر کی آواز میں اپنی ماں کے شہری ہونے کے ''وصف'' کا غرور بولتا تھا۔

''نئیں سدائیا (دیوانہ) حکیم بیگم نے اس کے بال سنوارتے ہوئے ماتھے پر ہولے سے تھپکی دی۔

''اس دا اپنا چانن ہی اتنا تھا کہ جیویں (جیسے) نور سے بنی مورت ہو کوئی۔ بڑی پڑھی لکھی تھی۔ ہمیش (ہمیشہ) سیانی گل کرتی تھی۔ تیرے ورگی چبوڑی (بکواسی) نئیں تھی۔ ہن چپ کر کے سو جا۔ گلاں کرے گا تو ہور پنڈا تپے گا۔''

وہ دیکھ رہی تھی کہ بخار کی شدت سے مسلسل آنکھیں کھلی رکھنا بھی عمر کے لیے باعث تکلیف تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کے گوشوں سے پانی کی لکیریں کنپٹیوں کی جانب رینگ رہی تھیں۔ بولتے ہوئے اس کا گلا بار بار سوکھتا تھا اور ہر چند لمحوں بعد وہ پانی مانگنے لگا تھا لیکن موضوع ایسا تھا کہ چاہے ساری رات بات کی جاتی اور وہ جتنی بھی تکلیف میں ہوتا، ہرگز نہ اکتاتا۔ اس کے بدن کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی تپش سے حکیم بیگم کی تشویش میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طویل رات باقی تھی اور اس حالت میں...... صبح تک جانے کیا ہو جائے۔ وہ پریشانی سے بوجھل وجود لیے اٹھی اور پاؤں گھسیٹتی صحن میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس عمر کے پاس آئی تو انوکھا سکون اس کے انگ انگ سے پھوٹتا تھا۔

''اٹھ کاکا! دوا پی لے۔''

عمر نے بڑی دقت سے کروٹ لی اور اس کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

''بے جی! یہ کدھر سے لائی ہے؟''

اس نے کوزے میں تیرتے بے رنگ سیال کو دیکھ کر پوچھا۔

''یہ دوا ایسے ڈاکٹر دی ہے جو دنیا دے سب ڈاکٹروں تے سارے حکیموں سے زیادہ علم والا ہے۔ اس دی دوا ہمیش اثر دکھاتی ہے۔ شفا نہ ہو یہ تے ہو ہی نئیں سکدا۔ بس اس ڈاکٹر دی اک شرط ہے۔ وہ ماننی پڑے گی تجھے۔''

''وہ کیا بے جی۔''

''وہ کہتا ہے میرے علم وچ میری حکمت وچ کوئی شک نہ کرے۔ جے تجھے شرط قبول ہے تو پی جا یہ دوا۔ فیر دیکھنا بخار دا

نام نشان وی باقی نہ رہے گا۔''

عمر نے سر کو آہستگی سے جنبش دی اور ہاتھ بڑھا کر کوزہ اس سے لے لیا۔

''زیادہ کوڑی (کڑوی) تو نئیں ہے ناں۔''

''بس تھوڑی جنی (ذراسی)'' حکیم بیگم نے تسلی دی۔

''چل میرا پتر شاباش پہلے اکھاں میٹ کر بسم اللہ پڑھ تے دل وچ سب توں وڈے ڈاکٹر تے پکا یقین کر۔ جے تو نے کیڑی دی ٹنگ جنا (چیونٹی کی ٹانگ جتنا) وی شک کیا تے دوا نے اثر نئیں کرنا۔''

اس نے پہلا گھونٹ لے کر برا سا منہ بنایا تھا۔

''یہ تو پانی ہے۔ سادہ پانی، کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔''

''جو وی ہے تو پی جا چپ چپیتے (خاموشی سے) رولا نہ پا۔'' (شور نہ مچا)

خالی پیالہ لے کر حکیم بیگم نے اسے نرمی سے لٹا دیا تھا۔

''اس ڈاکٹر کا نام تو بتا دے بے جی۔ وہ کدھر دکان کرتا ہے۔''

''میں آکھیا ناں (کہا ناں) چپ کر جا۔''

وہ اسے سلانے کے لیے تھپکنے لگی تھی۔

جب سورج کی اولین کرنوں کے ساتھ وہ بیدار ہوا تو بخار رخصت ہو چکا تھا۔ وہ چار پائی سے اترا اور حکیم بیگم کو آوازیں دیتا صحن میں آ گیا۔ وہ بکائن کے درخت تلے جھڑے ہوئے پروانہ رو پھولوں کو جھاڑو سے سمیٹ رہی تھی۔

''بے جی! بخار اتر گیا۔ وہ دوا تو بڑی زبردست تھی۔ کس ڈاکٹر سے لے کر آئی تھی تو۔ اس کا نام تو بتایا ہی نہیں تو نے۔''

حکیم بیگم جھاڑو ایک طرف رکھ کر خاصی دیر تک اسے دیکھتی رہی اور زیر لب مسکراتی رہی۔ ''تو جانتا ہے، اس نوں سب جانتے ہیں۔ اس دا نام ہے اللہ۔''

✠ ✠ ✠

کبودی سیال سے چھلکتا ایک جام سفال تھا جس کے کنارے دوب سے ڈھکے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ پر تصنع کا گمان ہوتا تھا۔ ہوا میں مجیرے بجنے کی آواز تھی۔ جھیل کی سطح پر ایک راج ہنس تیرتا تھا۔ اجلا سفید جیسے ہاتھی دانت سے بنا ہو۔ اس کا عکس شفاف پانی میں تھا۔

''جانے اس کے پروں کی ملائمت کیسی ہوگی؟ اس کے سفید بدن کی نرماہٹ کیسے انگلیوں کو گدگداتی ہوگی؟''

وہ اسے چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ قدم بڑھا کر جھیل کے سرد پانی میں اتر گئی۔ آسمان کا نیلگوں رنگ تیزی سے سیاہی میں بدلنے لگا تھا۔ اس کی پیشانی نے کس سرد شے کے لمس کو محسوس کیا۔ وہ ٹھہر گئی تھی۔ اب کی بار اس کی گردن کو کوئی چیز چھو کر گزری تھی۔ شاید بارش شروع ہو گئی تھی لیکن وہ بوندیں نہیں تھیں شاید خشک پتے یا گھاس کے تنکے کسی عجیب سے احساس سے اس کا دل بیٹھ گیا۔

اب وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ تتلیاں تھیں جو آسمان سے اتر رہی تھیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں یا شاید لاکھوں لیکن ایک عجیب بات تھی کہ وہ تمام تتلیاں مردہ تھیں۔

اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا مگر اس کے پاؤں مفلوج تھے وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پاتی تھی۔ یکبارگی دو بڑے

بڑے ہاتھ آگے بڑھے اور اس کی گردن گرفت میں لے لی۔ قاتل کا چہرہ اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ صرف ان ہاتھوں کو دیکھ سکتی تھی، جو اس کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ اس کا دم اکھڑنے لگا......

وہ بیدار ہوگئی۔ اس کی سانسیں ناہموار تھیں اور قمیص پسینے سے بھیگ کر بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ بستر سے نکل کر کھڑکی کے سامنے جا پہنچی، کھڑکی کے پٹ وا کیے اور چند گہری گہری سانسیں بھر کر خنک ہوا کو سینے میں اتارا۔

''کیسا بھیانک خواب تھا۔''

اس کی رگوں میں اب تک کھچاوٹ برقرار تھی۔ ہتھیلی سے گردن مسلتے ہوئے اسے ایک خیال آیا تو وہ لائٹ جلا کر آئینے میں اپنی گردن کا جائزہ لینے لگی۔ اسے یقین تھا کہ انگلیوں کے ثبت شدہ نشانات وہ دیکھ پائے گی۔

✠ ✠ ✠

گردے سے اٹی گرے ہاؤنڈ بس وائن اسٹریٹ پر رکی تو اترنے والوں میں سب سے پہلا ایک خوش شکل، دراز قامت نوجوان تھا، اس نے گہرے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جس کے کالر شانوں سے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ سبزی مائل بھوری پتلون رانوں سے تنگ اور پائنچوں سے کھلی تھی۔ اس کی چھاتی فراخ، شانے مضبوط اور کمر سڈول تھی۔ لباس کی تراش نے اس کے متناسب خد وخال کو خصوصیت سے نمایاں کر دیا تھا۔ قریب سے گزرتی سنہرے بالوں والی لڑکی نے اسے دیکھ کر ایک شوخ اشارہ کیا تھا، جس پر وہ کھل کر مسکرایا تھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک گیا تھا۔ جواباً وہ لڑکی اونچے سروں میں ہنستی ہوئی چلی گئی تھی۔

اس نے سفری بیگ کو کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور بانہیں پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی۔

''میں پہنچ گیا ہوں۔''

گردوپیش کو خوابناک آنکھوں سے تکتے ہوئے اس نے خود کو یقین دلایا تھا۔

''ہالی وڈ۔''

اس کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ چند راہگیر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے مگر اسے مطلق پروا نہ تھی۔

''ہالی وڈ۔''

اس نے بلند آواز میں دہرایا تھا۔

''میں ہالی وڈ میں آ گیا ہوں۔ ہاں ہاں میں پہنچ گیا ہوں۔''

وہ آسمان کی جانب چہرہ اٹھا کر حلق کی پوری قوت سے چلایا کوئی اسے پاگل سمجھ رہا تھا تو سمجھا کرے۔ اگر یہ لوگ جانتے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے اسے کتنی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا تو کبھی اسے حیرت سے نہ تکتے۔

''اسپرنگ فیلڈ'' سے لاس اینجلس-تک کا سفر چاہے بہت طویل نہیں تھا لیکن اسے یہاں تک آنے میں کئی برس لگ گئے تھے۔

وہ چودہ سال کا تھا جب پہلی بار اس نے خود کو خواب میں اس الکھ نگری میں دیکھا تھا اور اس رات کے بعد ہر رات اس خواب کو دہراتا رہا تھا، کبھی سونے سے پہلے اور کبھی نیند میں، آج جب اس نے اپنے خوابوں کے دیس میں حقیقت کا پہلا قدم رکھا تھا تو وہ بائیس سال کا ہو چکا تھا۔ سپنے اور حقیقت کے بیچ آٹھ طویل سالوں کی تھکن گزیدہ مسافت حائل تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن ہالی وڈ بلیورڈ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کی سماعت سے ایک شوخ گیت ٹکرایا۔ وہ فرانسیسی ہپی اپنا ہیٹ فٹ پاتھ پر رکھے گٹار بجا رہا تھا اور اس کے گرد چند تماشائی جمع تھے۔ وہ خوش گلو نہیں تھا اور اس کا انگریزی تلفظ بھی بہت برا تھا

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ مسلے ہوئے پراگندہ لباس والا ہپی بھی اور اس کا بے سرا گیت بھی۔ چند لمحوں بعد وہ گیت کی دھن پر ناچ رہا تھا۔ فرانسیسی اور بھی جوش سے گانے لگا۔ محفل میں ولولے کی ایک لہر اٹھی اور سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سب لوگ تالیاں بجانے اور یک آہنگ ہو کر گانے لگے۔ تب پہلی بار اس نے گیت کے بولوں پر دھیان دیا اور اس کے رقصاں پیر تھم گئے۔

میں جانتا ہوں......

ہاں میں جانتا ہوں......

وہ راز کی بات......

جو تم چھپاتے ہو......

ہاں میں جانتا ہوں......

ہپی لہک لہک کر گائے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سایہ سا لہرایا اور دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔ اس نے جیب سے سکہ نکال کر ہیٹ میں اچھالا اور اپنا بیگ اٹھا کر وہاں سے چل دیا۔ ایک دم اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

میں جانتا ہوں......

وہ راز کی بات......

فرانسیسی ہپی کی بھدی آواز اس کے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔

✠ ✠ ✠

ابراہیم چالیس کی دہائی میں برصغیر سے امریکہ کی ریاست میساچیوسٹس میں اپنے تایا اور ہونے والے سسر کے بلاوے پر آیا تھا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں گیا تاہم جب تقسیم ہند عمل میں آئی تو اس نے خود کو پاکستانی کے طور پر شناخت کرانا شروع کر دیا، کیونکہ وہ لائلپور میں پیدا ہوا تھا اور تقسیم کے نتیجے میں لائلپور، پاکستان کا حصہ بن گیا تھا۔ امریکہ آنے کے تیسرے سال اس کی شادی اپنی تایا زاد ماریہ سے ہو گئی اور ان تین سالوں میں وہ اپنے سسر کے کاروبار کو نہ صرف اچھی طرح سمجھ گیا تھا بلکہ انتظامی امور بڑی حد تک اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔

ابراہیم کا سسر اسپرنگ فیلڈ میں ایک فرنیچر شوروم کا مالک تھا۔ شوروم کی باگ ڈور ابراہیم کے ہاتھوں میں سونپ کر اس نے دھیرے دھیرے کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی۔ ماریہ اس کی واحد اولاد تھی اور اس نے اپنا سب کچھ اسی کے نام لگا دیا تھا۔ اس ''سب کچھ'' میں ایک تین بیڈروم کا وکٹورین طرز کا گھر، جدید ماڈل کی کار اور بینک اکاؤنٹ میں معقول رقم شامل تھی۔

ابراہیم نے اپنا لڑکپن یتیمی میں بنیادی ضرورتوں کے لیے ترستے ہوئے گزارا تھا اور یہ پُر آسائش زندگی اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ کی مانند تھی۔ اسے ماریہ سے محبت تھی مگر نہ بھی ہوتی تو اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔ ان تمام تعیشات کے سامنے محبت کی حیثیت یوں بھی ہیچ تھی۔

اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے کیا اور پہلے ہی سال ماریہ کی رضامندی سے شوروم کا نام ''امداد فرنیشرز'' سے بدل کر ''ابراہام فرنیشنگ ہاؤس'' رکھ دیا۔ شادی کے بعد ہر سال اس کی زندگی ایک نئے تغیر سے آشنا ہوتی رہی۔

دوسرے سال ماریہ کا باپ حج کرنے گیا اور جہاز کے پہیے سعودی عرب کی سرزمین کو چھونے ہی والے تھے کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

تیسرے سال کے آغاز میں ابراہیم نے شووم سے ملحق ایک پلاٹ خرید لیا اور شوروم کو توسیع دیتے ہوئے نئے فرنیچر کے ساتھ ساتھ پرانے استعمال شدہ فرنیچر کی فروخت شروع کر دی۔

چوتھے سال احمد پیدا ہوا اور اس سال ابراہیم کی زندگی نے ایسا پینترا بدلا کہ اس کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔

اس روز ماریہ کو کلینک میں داخل کروانے کے بعد وہ شوروم جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ایکسیڈنٹ سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گاڑی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اسے یہ حادثہ بد شگونی معلوم ہوا۔ ایک ایسے دن جب اس کی پہلی اولاد کی آمد متوقع تھی، اس کا خالی سڑک پر جاتے ہوئے گاڑی کو سڑک سے اتار کر ایک ٹھنٹھ سے ٹکرا دینا جبکہ اس نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا اور گزشتہ رات کو پوری نیند لے کر صبح معمول کے مطابق بیدار ہوا تھا۔ وہ اسے بد شگونی نہ سمجھتا تو اور کیا کہتا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے واہمے آ رہے تھے۔ گاڑی ورکشاپ میں کھڑی کر کے بس کے ذریعے جب وہ شوروم پہنچا تو مائیک اسٹون کی ''رولز رائس شو روم کے سامنے موجود تھی۔ وہ مائیک اسٹون کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دو مقامی بنکوں، چند شراب خانوں اور ایک شاندار ہوٹل کے علاوہ ''ہارٹ فورٹ'' میں ایک مشہور جوا خانے کا مالک تھا۔ وہ آج سے پہلے بھی چند بار فرنیچر خریدنے کے لیے آ چکا تھا اور ابراہیم کو اس کی آمد سے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی کیونکہ اگر ایک بار کوئی چیز مائیک اسٹون کو پسند آ جاتی تو وہ منہ مانگے دام ادا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ ابھی وہ اسٹون کو دفتر میں بٹھا کر اس کا حال احوال ہی دریافت کر رہا تھا کہ کلینک سے فون آ گیا۔ ماریہ کی حالت کس درجہ خراب تھی، اس کا اندازہ اسے نہیں ہو سکا مگر ٹیلی فون کرنے والی نرس کی آواز میں بدحواسی بھانپ کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔ فون رکھ کر وہ بوکھلاہٹ زدہ انداز میں کرسی سے اٹھا اور اسٹون سے معذرت کرنے لگا۔ اس نے ابراہیم کی بات سننے کے بعد اسے تسلی دی اور بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ تم اپنے ملازم سے کہہ دو۔ میں اس کی رہنمائی میں اپنا کام نمٹاتا ہوں اور تم اپنا کام نمٹاؤ۔''

وہ بھاگتا ہوا دفتر سے باہر نکلا۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''سنو......'' اسٹون کے پکارنے پر وہ پلٹا۔

''تم نے ابھی ذکر کیا تھا کہ تمہاری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میری گاڑی لے جاؤ۔ میں بعد میں شوفر کو بھیج دوں گا۔''

''اور آپ......؟'' وہ ہکلایا۔

''میری فکر مت کرو۔ میں فون پر دوسری گاڑی منگوا لیتا ہوں۔''

''شکریہ بہت شکریہ۔''

اس سے چابی لیتے وقت وہ رو دینے کے قریب تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ مسلسل سگریٹ پیتا رہا اور اسٹیرنگ وہیل کو زور سے تھام کر اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ دنیا کی مہنگی ترین گاڑی میں بیٹھا تھا مگر اسے ان لمحات سے لطف اندوز ہونے کی توفیق نہیں تھی۔ اس کے پیروں کے پاس پسنجر سیٹ تلے شراب کی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس کے دل میں کئی بار آیا کہ شراب کے چند گھونٹ حلق سے اتار کر اپنے اعصاب کو پرسکون کر دے اور اس ارادے سے اس نے بوتل کا کارک بھی ہٹا دیا تھا مگر پھر کسی نہ کسی طرح اس پر عمل کرنے سے باز رہا۔ وہ ایسے نازک وقت میں اللہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کلینک پہنچنے تک اس پر اتنی بدحواسی طاری ہو چکی تھی کہ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کی ٹھوکر لگنے سے شراب کی بوتل، جس کا ڈھکن لگانا اسے یاد نہیں رہا تھا اوندھی ہو گئی اور رقیق سیال گاڑی میں پھیل گیا۔ اسے تشویش تو ضرور ہوئی مگر وہ مائیک اسٹون کو گاڑی بھجوانے سے پہلے اس کی صفائی کروا سکتا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر اسے جو کچھ نظر آیا تھا اس کے بعد اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی ماریہ اسے ایک بیٹا دے

کرشکریہ کا ایک بھی لفظ وصول کیے بنا، اسے خدا حافظ کہے بغیر رخصت ہو چکی تھی اس لمحے ابراہیم کو لگا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے سانحے سے دوچار ہوا ہے مگر وہ غلط تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا جو المیہ چند منٹ بعد اسے پیش آنے والا تھا اس کے مقابلے میں یہ نقصان بہت معمولی تھا۔

وہ کلینک سے باہر آیا تو شعلوں میں لپٹی رولز رائس کو شناخت کرنے میں اسے اتنی دقت پیش نہیں آئی تھی جتنی اس منظر پر یقین کرنے میں ہوئی تھی۔

یقیناً جلتا ہوا سگریٹ کا ٹوٹا وہ گاڑی میں پھینک آیا تھا اور الکوحل نے آگ پکڑ لی تھی۔ چند لوگ گاڑی سے خاصے فاصلے پر جمع اسے جلتا ہوا دیکھ رہے تھے مگر فیول ٹینک پھٹ جانے کے خوف سے کوئی بھی نزدیک نہیں جا رہا تھا۔ وہ 1922ء مین تیار کردہ رولز رائس کا خصوصی ماڈل تھا جو ''سلور گھوسٹ'' کہلاتا تھا۔ اس کی صحیح قیمت ابراہیم کو معلوم نہیں تھی مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ دنیا کی چند مہنگی ترین گاڑیوں میں سلور گھوسٹ سرفہرست تھی۔

ڈالروں کا وہ ڈھیر اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے بھڑ بھڑ جل رہا تھا۔ پھر اس کے ماؤف ہوتے دماغ میں امید کی موہوم سی کرن جاگی۔ گاڑی یقیناً انشورنس شدہ ہوگی۔ یعنی وہ اتنی بڑی مشکل میں نہیں تھا لیکن وہ اس تکلیف کا مداوا کیسے کر پائے گا جو ''سلور گھوسٹ'' کے کھو جانے سے مائیک اسٹون کو ہوتی۔ رولز رائس کا وہ مخصوص ماڈل 1926ء میں بننا بند ہو گیا تھا اور اس صورت حال میں سلور گھوسٹ کاریں انمول نوادر سے کم نہیں تھیں۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ نرس نے اسے اسٹون کے ٹیلی فون کی اطلاع دی۔ ریسیور لرزتے ہاتھوں میں تھام کر اس نے بے ربط جملوں میں معافی مانگنا شروع کی۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

''میں تمہیں بتانا بھول گیا۔'' مائیک کی آواز سنائی دی۔

''گاڑی کو لاک کیے بغیر مت چھوڑنا پچھلی سیٹ کے نیچے ایک بریف کیس رکھا ہے۔ اس میں کچھ رقم ہے۔''

ابراہیم کا سر چکرانے لگا۔

''کتنی......؟''

''زیادہ نہیں......صرف دو ملین ڈالر۔''

تب اس نے خواہش کی تھی کہ وہ سلور گھوسٹ کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گیا ہوتا۔

ایک ہفتے بعد جب وہ شوروم بند کر کے گھر پہنچا تو دروازے کے اطراف میں کھڑے دو قوی ہیکل نیگرو آگے بڑھے اور اس کا راستہ روک لیا۔ ان میں سے ایک نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر بے بس کر دیا اور اس کے ساتھی نے ابراہیم کا بایاں ہاتھ پکڑ کر اس کے کچھ سمجھنے سے قبل جیب سے پلاس نما آلہ نکالا اور اس کی چھنگلی کی ایک پور کاٹ کر اس کے چیخنے کے لیے کھلے ہوئے منہ میں ٹھونس دی اور ہتھیلی سے اس کا منہ بند کر کے نہایت پرسکون آواز میں کہا۔

''مائیک اسٹون نے ہر ماہ تمہاری ایک انگلی کاٹنے کا حکم دیا ہے اور انگلیاں ختم ہونے پر یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ کاٹنے کے لیے تمہارے اور بہت سے اعضاء ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔''

اگلی صبح طلوع ہوتے ہی اس نے اثاثہ جات بیچنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ جب تک فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اس کے ہاتھ آئی وہ مزید دو انگلیوں سے محروم ہو چکا تھا۔ مائیک کے پیروں میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ گڑگڑانے کے بعد جب اس کا حلق سوکھ گیا اور آواز نکلنی بند ہو گئی تو اسٹون نے ایک ٹھوکر اس کے ماتھے پر ماری اور بولا۔

''میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

ابراہیم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی خواہش پوری کر دی تھی۔ جو رقم اس نے مائیک اسٹون کو دی تھی وہ اس کے اصل

نقصان کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی لیکن شاید اس نے ابراہیم کی انگلیوں کی قیمت کو بھی وصول ہونے والی رقم کے ساتھ شمار کیا تھا۔ اگر چہ ابراہیم کے خیال میں اس کی انگلیاں اتنی مہنگی ہرگز نہیں ہوسکتی تھیں۔ صورت چاہے کچھ بھی ہو، اس نے گھر، گاڑی شوروم اور بائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کے عوض اپنی جان بچالی تھی اور یہ سودا گھاٹے کا نہیں تھا۔

وہ سات سال پہلے جہاں سے چلا تھا ایک بار پھر اس مقام پر آ پہنچا تھا۔ اسے زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا تھا اور اس پر ایک نومولود کی ذمہ داری تھی، جو اسے بیگار سے کم نہیں لگتی تھی۔ وہ ہر وقت روتا رہتا، اکثر بغیر کسی وجہ کے، ابراہیم کو اس کے رونے کی وجہ سمجھ میں نہ آتی۔ اسے بار بار بھوک لگتی۔ وہ ہر دم گیلا رہتا۔

اس نے کئی بار سنجیدگی سے غور کیا کہ اسے کسی یتیم خانے کو دے دے لیکن ہر بار اس فیصلے سے باز رہا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اپنے وجود کے حصے کو خود سے جدا کرنے میں مشکل درپیش تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اللہ سے ڈرتا تھا۔ اپنی زندگی کی کایا پلٹ کے بارے میں وہ جتنا بھی سوچتا، اسے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی۔ اللہ اس سے ناراض تھا اور وہ اس ناراضی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نڈھال کرنے والی تلاش بسیار کے بعد اس نے ایک سستے علاقے میں کرائے پر اپارٹمنٹ حاصل کیا۔ اس راکھ جیسی رنگت والی کہنہ عمارت کو پہلی بار دیکھنے پر اسے خیال آیا تھا کہ وہ اب تک گری کیوں نہیں تھی۔ عمارت کے ماتھے پر جو حروف رقم تھے وہ خصوصی توجہ دینے پر پڑھے جاسکتے تھے۔ کوزی اپارٹمنٹس۔ وہ اپارٹمنٹ صرف نام کا کوزی (آرام دہ) تھا۔ اس میں مکینوں کو تکلیف پہنچانے کے تمام اسباب بہم تھے۔ ٹوٹی کھڑکیاں اکھڑے ہوئے دروازے، دیواروں اور چھتوں سے لگاتار جھڑتا ہوا چونا، چوہے اور لال بیگ، پانی کے نل کھولنے سے ایسی آواز تو ہمیشہ سنائی دیتی جس سے گمان گزرتا کہ پانی ہے مگر خود پانی کبھی کبھار ہی برآمد ہوتا۔ زندگی ایک مسلسل بھیانک خواب تھی۔ وہ احمد کو تنہا چھوڑ کر کہیں باہر بھی نہیں جاسکتا تھا اور باہر نہ جاتا تو وہ دونوں سردی اور بھوک سے سسک کر مر جاتے۔ اس مسئلے کا اس نے یہ حل نکالا کہ بلڈنگ میں رہائش پذیر تمام شادی شدہ کنبوں کی فہرست تیار کی اور پھر خواتین کے مزاج اور ان کے بچوں کی تعداد کو مدنظر رکھ کر فہرست کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ ہر نام کے سامنے اپارٹمنٹ نمبر، دن اور تاریخ کا اندراج کر کے اس نے وہ فہرست اپنے تکیے تلے رکھ لی۔

اگلی صبح وہ باہر جانے کے لیے تیار ہوا اور احمد کو صاف کرنے اور دودھ پلانے کے بعد فہرست میں سب سے اوپر لکھے ہوئے نام اور اپارٹمنٹ نمبر کو ذہن نشین کرلیا۔ دستک دینے پر جس مہربان چہرے والی ڈھلتی عمر کی عورت نے دروازہ وا کیا اسے دیکھ کر ابراہیم نے کہا۔

''مسز جوزف! میں آپ کو زحمت دینا نہیں چاہتا لیکن مجبور ہوں۔ میں دوپہر تک لوٹ آؤں گا۔''

اس نے کلبلاتے ہوئے احمد کو خاتون کی طرف بڑھایا لیکن اس کے بازو ساکت رہے۔ وہ کچھ دیر عجیب سی نظروں سے اسے گھورتی رہی پھر پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

''تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ اپنی ملازمہ، اس بہانے تم مجھ سے راہ ورسم نہیں بڑھا سکتے، سمجھے اور میں مسز جوزف بھی نہیں ہوں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ شرابی کہیں کے۔''

وہ دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ تک گیا اور فہرست کا از سر نو جائزہ لیا۔ اگلا نام منتخب کرنے میں اس نے بہت احتیاط برتی تھی۔ ابھی اس کی معلومات ناکافی تھیں اور مشاہدہ کمزور لہٰذا اس نے فی الحال ترتیب کو نظر انداز کر دیا تھا۔

اس نے بہت سی ملازمتیں اختیار کیں۔ ہاکر انشورنس ایجنٹ، ٹیکسی ڈرائیور، ہوٹل کا دربان، بیرا، سیلز ایجنٹ۔ وہ جب بھی کسی نوکری سے نکالا گیا تو احمد کی وجہ سے، آئے روز اسے طرح طرح کی بیماریاں لگ جاتیں۔ کبھی پیٹ خراب ہوتا تو کبھی بخار ہو جاتا۔ یا کسی دن کوئی بھی خاتون اسے اپنے پاس رکھنے پر آمادہ نہ ہوتی تو ابراہیم کو اس کی دیکھ بھال کے لیے اپارٹمنٹ

میں ٹھہرنا پڑتا۔ ہر بار ملازمت سے فارغ کیے جانے پر جب وہ لوٹتا تو اس کے ذہن کے پردے پر ایک جیسے مناظر مرتسم ہونے لگتے۔
میکسیکن بیوہ سانتھا روتے ہوئے کہتی "میں اسے کمبل اوڑھانا بھول گئی۔ کھڑکی جانے کیسے کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے دیکھا تو یہ نیلا پڑ چکا تھا۔ خداوند مجھے معاف کرے میں نے اسے مار ڈالا" وہ ماتھا پیٹنے لگتی۔
خوف سے سہمی ہوئی انڈین عذرا ایک خون آلود گٹھڑی اسے تھماتی "میرے کتے نے اسے بھنبھوڑ ڈالا۔ میں نہیں جانتی تھی وہ معصوم سا پلا اتنا خونخوار ہو سکتا ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔"
اس کے تخیل نے کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھارا۔ وہ سخت تشویش زدہ چہرہ بنائے بڑی امید سے پوچھتا "وہ ٹھیک تو ہے۔" اور اس کی امید دم توڑ جاتی جب فوراً ہی چیختا چلاتا احمد اسے سونپ دیا جاتا۔

دن بھر کی خواری کے بعد رات کو بھی وہ چین سے سونے نہ پاتا تو احمد کا گلا دبانے کو اس کا دل شدت سے مچلنے لگتا۔ ابراہیم کو یقین تھا کہ اللہ اسے کسی ایسے گناہ کی سزا دے رہا تھا جو نادانستگی میں اس سے سرزد ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا اور مہلت ملتی تو مسجد بھی چلا جاتا اور وہاں کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر روتے ہوئے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی طلب کرتا۔ اس نے ویک اینڈ پر کال گرلز کو اپارٹمنٹ میں لانے کا شغل بھی ترک کر دیا تھا۔

شراب وہ پہلے بھی کبھی کبھار پیتا تھا۔ اب مستقل چھوڑ دی۔ جب اس کے مالی حالات کچھ معمول پر آئے تو اس نے ایک پختہ عمر کی مطلقہ عرب عورت سے نکاح کر لیا۔ ان کی نبھ نہ سکی اور چھ سال بعد ہی ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد ابراہیم کی زندگی میں کسی عورت کا گزر نہیں ہوا۔ اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی اور بہت مذہبی ہو گیا تھا۔ پھر قسمت نے اسے ایک موقع فراہم کیا۔ ایک چھوٹی سی بک شاپ، جس کی گرتی ہوئی ساکھ کو حادثاتی آگ نے مزید گرا دیا تھا اور اس کا مالک اس سے جان چھڑانے کے لیے بے چین تھا۔

اسے خریدنے کا اکلوتا خواہشمند ابراہیم تھا اور یہ سودا خوش اسلوبی سے طے پا گیا تھا۔ بھلے اس دکان سے حاصل ہونے والی آمدنی نہایت قلیل تھی اور اس کی تجدید نو کے لیے کثیر سرمایہ درکار تھا مگر اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ وہ کم از کم اس کی ملکیت تو تھی اور انواع و اقسام کی نوکریوں سے بھی اس کی جان چھوٹ گئی تھی اور اس نئے معمول کی بدولت وہ اپنی عبادت کو مناسب وقت دے سکتا تھا۔ بہر حال اللہ کا قہر اس سے ٹل رہا تھا۔

احمد ففتھ اسٹینڈرڈ میں ہوا تو ابراہیم نے اسے قرآن پاک پڑھانا شروع کیا۔ وہ اسے نماز کے لیے بھی ساتھ لے جانے لگا لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ اسے کامیابی ہو۔ جب قرآن پڑھنے کا وقت ہوتا یا وہ مسجد جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوتا تو احمد چپکے سے باہر کھسک جاتا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طور کھینچ کھانچ کر اسے مسجد لے بھی جاتا تو پہلی رکعت کے دوران ہی وہ الٹے قدموں لوٹ جاتا۔ پہلے پہل ابراہیم نے اسے نرمی سے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی مگر جب اسے احساس ہو گیا کہ وہ فطرتاً ہٹ دھرم تھا تو اس نے بھی اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا شروع کر دی۔

ایک بار وہ نماز جمعہ کے لیے احمد کو گھنٹہ بھر تلاش کرتا رہا اور جب نماز کا وقت نکلنے کو تھا وہ اسے اپنے بیڈ کے نیچے گتے کے بڑے ڈبے میں چھپ کر بیٹھا ہوا مل گیا۔ اگر کچھ دیر اور اسے گھٹن کے سبب کھانسی نہ آتی تو ابراہیم نماز کے لیے جا چکا ہوتا، اس نے گھسیٹ کر احمد کو ڈبے سے نکالا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر زوردار طمانچہ اس کے گال پر مارا۔
"کتے کے پلے۔ تمہیں اللہ سے اتنی دشمنی کیوں ہے۔ تم کسی یہودی کے گھر کیوں نہیں پیدا ہو گئے۔ چلو جا کر اپنا حلیہ درست کرو ہم مشکل سے جماعت کے ساتھ شامل ہو پائیں گے۔"
وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔

''تم بہرے ہو گئے ہو؟ جلدی کپڑے بدل کر آؤ۔''

وہ اب بھی ساکت تھا۔

''تو تم نہیں جاؤ گے۔''

ابراہیم نے ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور تب اسے احمد کی پتلون پر ران سے نیچے رینگتی گیلی لکیر اور پائنچے سے پھسل کر فرش پر پھیلتا ہوا رقیق مائع نظر آیا۔ اس نے بے یقینی سے احمد کو دیکھا۔ وہ گیارہ سال کا ہو چکا تھا اور ہر طرح سے صحت مند تھا۔ طیش سے اس کا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔ اس نے احمد کا سر اپنے گھٹنوں میں پھنسا کر دونوں ہاتھوں سے اسے مارنا شروع کر دیا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا حرامی۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔''

''میں ڈر گیا تھا بابا...... آپ مسجد چلے جائیں میں تو ناپاک ہو گیا ہوں۔ نہائے بغیر جاؤں گا تو اللہ ناراض ہو گا۔''

وہ مار کھاتے ہوئے چلا رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ احمد کی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھنے لگا اور جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ اسے دنیا میں صرف ایک کام سے شغف تھا۔ فلمیں دیکھنا۔ وہ سو طرح کے بہانے تراش کر اس سے رقم حاصل کرتا اور اس کی بے خبری میں تھیٹر چلا جاتا۔ یہ بات ابراہیم کو ایک روز اس کا تعاقب کرنے پر معلوم ہوئی تھی۔ اس نے اسکول کے بعد احمد کو بک شاپ پر آنے کا پابند کر دیا۔

ایک بار جب وہ چند گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا اور جواب طلبی پر کوئی مناسب وجہ نہ بتا سکا تو ابراہیم تب تک چمڑے کی بیلٹ سے اسے پیٹتا رہا تھا جب تک وہ اس کی پیروں پر گر کر فلمیں دیکھنے سے تائب نہیں ہوا تھا۔ اسے بعد میں پتہ چلا کہ اس روز احمد جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ حقیقتاً اس کے ہم جماعت لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہسپتال تک گیا تھا۔ وہ اپنے رویے پر بہت نادم ہوا تھا۔ اسے خود بھی اپنے چڑچڑے پن پر حیرت ہوتی تھی۔ شاید وہ بوڑھا ہو رہا تھا۔

ہر دم اس کے اعصاب پر ایک بے عنوان اضمحلال سوار رہتا، بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے سر گھڑی کے لٹکن کی طرح ڈولتا اور کبھی کبھی ناقابل برداشت درد اٹھتا۔ بارہا اس نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کا سوچا لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آ جاتی۔

دو سال کے عرصے میں بھی احمد قرآن کو روانی سے پڑھنے پر قادر نہیں ہوا تھا۔ ابراہیم کے لاکھ سر پٹخنے کے باوجود وہ عربی زبان سے مانوس نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کے لیے ایک آیت پڑھنا گویا پورا پارہ پڑھنے کے مترادف تھا۔ ابراہیم کی شدید خواہش تھی کہ وہ قرآن پاک کو حفظ کرے لیکن اسے کسی چیونٹی کی رفتار سے رینگتے دیکھ کر اسے اپنی خواہش سے دستبردار ہونا پڑا مگر کم از کم اسے چند سورتیں تو زبانی یاد ہونی چاہیے تھیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے سورۃ یاسین کا انتخاب کیا۔

''یہ قرآن کا دل ہے۔ جب کوئی جانکنی کی تکلیف میں ہو تو اسے پڑھنے کی ہدایت ہے اور میں دیکھ رہا ہوں۔ تم بہت تکلیف اٹھانے والے ہو۔ تمہیں اس کی بہت ضرورت پیش آئے گی۔''

چھ ماہ کی صبر آزما مشقت کے بعد وہ اسے سورۃ یاسین حفظ کروانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اس دوران اسے کئی بار مجبوراً

اس پر ہاتھ اٹھانا پڑا۔ جس روز احمد نے پوری سورت بغیر اٹکے اور بنا غلطی کیے سنائی تھی، اسے لگا تھا جیسے اس کی رائیگاں زندگی بامقصد ہوگئی ہو۔ اس رات وہ بہت عرصے بعد پُرسکون نیند سویا تھا۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ ایک کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں لیٹا رہا اور پھر بیڈ سے اتر آیا۔ کھٹکے کی سمت کا تعین اس نے کر لیا تھا۔ لیکن احمد کے کمرے میں اس وقت شور کیا معنی رکھتا تھا۔ وہ بہت گہری نیند سونے کا عادی تھا اور اسے فجر کی نماز کے وقت اٹھانے کے لیے روزانہ ابراہیم کو اچھی خاصی محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ تشویش زدہ ہو کر احمد کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ بتی بجھی ہوئی تھی اور اندر مکمل خاموشی تھی۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور کمرے کی نیم تاریکی میں احمد کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے بستر میں نہیں تھا۔ اس وقت وہ کھڑکی کے سامنے موجود تھا اور اس کی پشت ابراہیم کی طرف تھی۔ اس کے کندھوں پر ایک بیگ لدا ہوا تھا۔ وہ کہیں جا رہا تھا۔ گھر سے بھاگ رہا تھا!

طیش کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی اور سارے وجود پر چھا گئی۔ اس کا لہو کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا اس نے چیخ کر احمد کو پکارنا چاہا لیکن جانے کیوں اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے احمد الٹے قدموں اس کی طرف سرکنے لگا ہو لیکن وہ ایسے کیوں چل رہا تھا۔ اس کے رخسار میں کسی پتھریلی شے کی ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ کیسی ناقابل فہم کیفیت تھی۔ احمد کی آواز بہت دور سے اس کے کانوں میں آتی تھی مگر وہ خود دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ مسلسل اسے جواب دے رہا تھا مگر اپنی آواز سن نہ پاتا تھا۔ ابراہیم کو خیال آیا کہ وہ مر رہا تھا یا شاید مر چکا تھا لیکن وہ بھول گیا تھا کہ مرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔



عمر نے سیمنٹ کا دابڑہ مستری غلام مرتضٰی کے پیروں کے قریب رکھ کر پسینے سے تربتر چہرے کو آستین سے پونچھا اور ذرا دیر ستانے کو بانسی مچان سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس بار وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آیا تھا تو حکیم بیگم نے گھر کی چار دیواری اور دو کمروں کا فرش پختہ کرنے کا کام، جس کی وہ پچھلے کئی برسوں سے آرزومند تھی شروع کرا دیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی۔

''تیری ووہٹی آئے تو اسے گارا لمب لمب کے ہتھ نہ لبیڑنے (لتھیڑنا) پڑیں۔ دھوڑ نہ پھکنی پڑے۔ گھر پکا ہونا چاہی دا ہے۔''

آج مزدور صابر نے طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے چھٹی کر لی تھی اور مستری اکیلا ہی کام پر آیا تھا تو عمر اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

حکیم بیگم بکائن کے درخت تلے چرخہ بچھائے بیٹھی تھی اور چرخے کی گھوک سے سارا آنگن بھرا ہوا تھا۔ نمبرداروں کی حویلی میں مور جھنگارتے تھے۔ چرخے کی گھوک اور موروں کی جھنگاریں ایک مدھر گیت بن کر سماعت کو چھو رہی تھیں۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

حکیم بیگم نے نیم نگاہی سے اس کے سنولائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر سے چرخے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ذرا سا دھیان بھٹکنے سے کلابہ (کچا سوت) ٹوٹ سکتا تھا۔

''کاکا! ہالی جیٹھ چڑھا ہے تے تیرا یہ حال ہے۔ تجھے شہر وچ رہ رہ کر بجلی کے پکھوں اور ٹھنڈی مشینوں کی عادت پڑ گئی ہے۔ تیرا ہن گزارہ نئیں ہونا بجلی دے بغیر۔ ہمارے پنڈ توڑی (تک) آ گئے ہیں بجلی دے کھمبے۔ ہم وی تار لے لیں گے۔ تو فکر نہ کر۔''

اس نے حکیم بیگم کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ برگد کے اس معمر پیڑ کی جانب دیکھ رہا تھا، جو سبز کھیتوں کے اختتام پر کسی

ریشائیل (بڑی اور لمبی داڑھی والا) سادھو کی طرح ایستادہ تھا، جس کی جٹائیں زمین تک جھولتی تھیں اور جس کے گرد لہریا بناتی ہوئی پگڈنڈی نالہ بئیں کی جانب رینگتی تھی۔ وہ عورت چھتنارے برگد کے عقب سے نکل کر پگڈنڈی پر آئی تو عمر کی نظریں اس پر جم گئیں۔ اس کا ملبوس اور ظاہری وضع قطع غماز تھی کہ وہ شہر سے آئی تھی۔ شاید گاؤں میں کسی کی مہمان ہو لیکن اس کے پاس کسی طرح کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ کچھ دیر اسے گاؤں کی طرف آتے دیکھتا رہا اور پھر خالی دابڑہ اٹھا کر بانسی مچان سے اتر آیا۔

جب وہ ان کے گھر سے ملحق گلیارے میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں ایک بار پھر اس کے اٹھتے قدموں میں الجھ گئیں۔ کیا وہ ماسی چھوماں کی مہمان تھی مگر ان کی ایسی کوئی رشتے دار...... وہ عورت اب ماسی چھوماں کے دروازے کے سامنے کھدی چھپلی (مختصر جوہڑ) کو پھلانگ رہی تھی۔

اس کے دل کو کسی نے انگلی سے ٹھکورا۔ ایک بے نام اضطراب اس کے بند بند میں چٹکیاں بھرنے لگا۔

وہ دہلیز پار کر کے آنگن میں آ گئی۔

حکیم بیگ نے ایک نظر پلٹ کر دیکھا اور اس کی پونی کی تند ٹوٹ گئی۔ اس نے آنے والی کو بیٹھنے کا نہ کہا اور نہ ہی اٹھ کر اسے ملی۔ وہ ہتھی کو زور زور سے گھماتے ہوئے چرخے کی پھرتی ہوئی ماہل کو گھورے جا رہی تھی۔

''میں اپنے بیٹے کو لینے آئی ہوں۔''

وہ چادر اتار کر اسے تہہ کر رہی تھی۔

نمبرداروں کی حویلی میں مور دردبھری آواز میں کوکتے تھے۔ حکیم بیگم کا چرخہ گھوکتا جاتا تھا اور اس کی تند بار بار ٹوٹتی تھی۔

عمر اس کی ہنسلی سے چپکی صلیب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا تھا۔

✠ ✠ ✠

احمد ابراہیم اس دنیا کا باسی نہ تھا۔ وہ کسی اور جہان میں بستا تھا۔ ایک ایسا جہان جس کی صبحیں بھی انوکھی تھیں اور شامیں بھی۔ جہاں کی خوشیاں بھی دلفریب تھیں اور غم بھی۔ وہ اک ایسا نگر تھا جس کے رہنے والے سب ہی ساحر تھے۔ وہ جب چاہتے اور جو چاہتے وہی روپ دھار لیتے۔ وہ وقت اور زمانے کی قید سے آزاد تھے اور احمد ان ساحروں کو پوجتا تھا۔ اس کی ایک ہی تمنا تھی کہ وہ بھی ان جیسا ہو جائے۔

وہ اپنے ہائی اسکول کا مقبول ترین لڑکا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں ہی اس کا سراپا ایسا شاندار تھا کہ اس سے بڑی عمر کی لڑکیاں بھی اسے دیکھ کر ٹھٹکنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ دیکھنے والوں کو یوں لگتا تھا جیسے کسی بھرپور مرد کے شانوں پر ایک نوعمر لڑکے کا چہرہ رکھ دیا گیا ہو۔ کلاس میں ایسی لڑکیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو اس کے سحر سے محفوظ تھیں۔ جو اس کے خدوخال کو قابل توجہ نہ گردانتی، اسے وہ باتوں سے رجھا لیتا۔ بہت کم لوگ اسے اصلی نام سے جانتے تھے۔ وہ ''Casanova'' اور ''Maverick'' کے ناموں سے پہچانا جاتا تھا۔

وہ جو فلم ایک بار دیکھ لیتا، اس کے مکالمے اسے زبانی یاد ہو جاتے اور اس میں ایک حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ وہ کسی بھی مرد اداکار کے لہجے اور آواز کی ہوبہو نقل کرنے پر قادر تھا۔ کبھی وہ Humphrey Bogart ہوتا تو کبھی Gary Cooper اور کبھی Clark Gable بنا وہ لڑکیوں کے دلوں سے کھیلتا۔ لیکن اس کی انہی صلاحیتوں کی بنا پر جب اسے اسکول کے کسی پلے میں کوئی کردار نبھانے کے لیے کہا جاتا تو وہ ہمیشہ انکار کر دیتا۔

''ایسے چھوٹے موٹے کردار ادا کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ میں ہالی وڈ کے لیے پیدا ہوا ہوں۔''

وہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا اور بعض حلقوں میں یہ بات بھی گردش کرتی تھی کہ اسے لڑکیوں میں دلچسپی ہی نہیں

تھی۔ چونکہ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اس کی کمزوریوں پر بھی خصوصی نظر رکھی جاتی تھی لہٰذا جلد ہی یہ راز طشت از بام ہوا کہ جو بھی اسے فلم کا ٹکٹ خرید کر دیتا وہ اس کی لمحاتی رفاقت حاصل کر سکتا تھا۔ اس میں جنس کی قید نہ تھی۔ لیکن نوعمر لڑکیاں جن کی آنکھوں پر جذبات کی رنگین پٹی بندھی ہو، ان کے پاس ایسی باریکیوں میں پڑنے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی نئی فلم ریلیز ہوتی، احمد کی چاہنے والیوں کے درمیان ایک غیر اعلانیہ مقابلہ شروع ہو جاتا اور فیصلہ ہمیشہ پہلے آیئے پہلے پایئے، کے اصول پر ہوتا۔

اسے اس بات سے چنداں غرض نہ ہوتی کہ اس کے ہمراہ کون جاتا ہے۔ فلم شروع ہونے کے بعد وہ یوں گردوپیش سے بیگانہ ہو جاتا، جیسے ہال میں موجود ہی نہ ہو اور ''دی اینڈ'' تک اس کی محویت ٹوٹنے نہ پاتی۔ اکثر واپس آنے کے بعد اسے اپنی ''ہم سفر'' کا نام بھی یاد نہ رہتا۔ اس معاملے میں سب سے خوش قسمت روزی جونز تھی۔ جس کا باپ ایک مقامی تھیٹر میں پروجیکٹر آپریٹر تھا۔ سب سے زیادہ احمد کی معیت میں فلم دیکھنے کا ''اعزاز'' اسی کے پاس تھا اور لڑکیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔

روزی جونز چونکہ احمد سے زیادہ قریب تھی، اس لیے اسے خبر تھی کہ یوں تو وہ سب ہی چھوٹے بڑے ستاروں سے محبت کرتا تھا۔ مگر انگلش اداکار کیری گرانٹ سے اس کی عقیدت عشق کی سرحدوں کو چھوتی تھی۔ وہ جب گرانٹ کی کوئی فلم دیکھ رہے ہوتے تو احمد اس کے ساتھ مکالمے ادا کرتا وہ اس قدر ڈوب جاتا کہ اس کے ساتھ قہقہے لگاتا اور دھاڑیں مار کر رونے بھی لگتا، اسی باعث چند دفعہ ہال میں بیٹھے دوسرے لوگوں سے ان کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ روزی بڑی سنجیدگی سے کہا کرتی۔

''تم میں اور گرانٹ میں صرف تین باتیں مشترک نہیں ہیں۔''

''اور وہ کون سی؟'' احمد کا اشتیاق قابل دید ہوتا۔

''پہلی تو یہ کہ وہ انگریز ہے اور تم ایشین، دوسرے وہ تمہارے مقابلے میں کم اچھا اداکار ہے اور آخری تضاد یہ ہے کہ......''

وہ لہجے میں ڈرامائی تاثر پیدا کرتی اور چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر اس کے تجسس کو ہوا دیتی۔

''جلدی بولو۔'' وہ بے چین ہو جاتا۔

''وہ تمہارے جیسا کمینہ نہیں ہے، کم از کم اسکرین پر تو وہ لڑکیوں سے پیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔''

وہ ہنسنے لگتا اور اس کی آنکھوں میں الوہی روشنی بھر جاتی۔

''آپ کو اپنی زندگی کا ہر دن اپنی ایمانداری ثابت کرتے ہوئے بسر کرنا نہیں پڑتا، لیکن میں کرتا ہوں۔''

وہ کیری گرانٹ کے مڈاطلانٹک لہجے میں اس کا ایک فلمی مکالمہ بولتا۔

اسے جب بھی کیری گرانٹ کے مماثل قرار دیا جاتا، وہ ایسے ہی خوش ہوتا تھا اور ''انعام'' کے طور پر روزی کو ایک آدھ بے کیف بوسہ یا ادھورا سا لمس عطا کر دیتا اور وہ اسی پر قانع ہو جاتی۔

احمد کے شب و روز خواب بُنتے ہوئے گزرتے۔ وہ کھلی آنکھوں سے بھی سپنے دیکھتا۔ وہ روز گھر سے بھاگ کر ہالی ووڈ جانے کے ارادے باندھتا اور سمجھا بجھا کر خود کو روک لیتا۔ ابھی وہ بہت کم عمر تھا اور اس کے پاس رقم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا کہ وہاں جانے اور چند دن بسر کرنے کے اخراجات کا بندوبست کر پاتا۔ وہ ہر معاملے میں اپنے باپ ابراہیم کا محتاج تھا اور اگر ابراہیم اس کے عزائم سے واقف ہو جاتا تو اس کا ردعمل کیا ہوتا، اس بارے مین اسے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ لیکن وہ اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روز منصوبے بناتا اور انہیں کسی بہتر وقت تک ملتوی کر دیتا۔

وہ بہتر وقت کب آنے والا تھا، اسے علم نہ تھا، لیکن ایک بات طے تھی کہ اس کی منزل ہالی ووڈ تھی اور اسے وہاں پہنچنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ چاہی وہ ابراہیم ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ایک رات احمد نے ایک خواب دیکھا اور ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر رختِ سفر باندھ لیا۔ وہ خواب ہی ایسا فسوں خیز تھا کہ اس نے احمد کے تلووں میں تتلیوں کی بے چینی بھر دی تھی۔

اس نے خود کو ہالی ووڈ میں دیکھا۔ وہ سیاہ ڈنر سوٹ زیب تن کیے ایک لمبی سفید لیموزین میں سوار تھا اور اس کے پہلو میں ایک سنہرے بالوں والی طرح دار دوشیزہ بیٹھی تھی۔ وہ اس کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ لیکن وہ چہرہ اسے مانوس لگتا تھا۔ وہ دلربا اسے محبوبانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک ایسا گیت گا رہی تھی، جس کی دھن سے وہ آشنا تھا اور بول اسے سمجھ میں نہ آتے تھے۔ پھر گاڑی رک گئی اور وہ دونوں پہلو بے پہلو ملا کر تا حد نگاہ بچھے ہوئے سرخ قالین پر چلنے لگے۔ ان کے ساتھ لوگوں کا انبوہ کثیر چلتا تھا جو ان سے بات کرنے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ کیمروں کی فلیش لائٹس رہ رہ کر چمکتی تھیں اور آنکھوں کو چندھیا دیتی تھیں۔ ایسے میں اس سنہری بالوں والی قیامت نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا تم نہیں جانتے ایک مرد کا دولت مند ہونا ایسا ہی ہے، جیسا ایک عورت کا خوب صورت ہونا۔''

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ وہ مارلن منرو تھی اور وہ گیت بھی اسے یاد آ گیا تھا۔

وہ ''Gentlemen Prefer Blondes'' نامی فلم میں مارلن منرو نے پرفارم کیا تھا اور اس کے بول تھے۔

''Diamonds are a girls best friend''

جو فقرہ مارلن منرو نے اس سے کہا تھا وہ بھی اسی فلم کا ایک مکالمہ تھا۔ وہ اس کی پسندیدہ ترین فلموں میں سے ایک تھی۔

اس نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن اب یہ ممکن نہ رہا تھا۔ اس خواب نے اس کے دل میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑتا خون ایک آتشیں سیال میں ڈھل گیا تھا اور پورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ وہ بہت بے چین کر دینے والی کیفیت تھی۔ کروٹوں کا لامتناہی سلسلہ اسے بستر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک منتقل کرنے لگا۔ بالآخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے دل کو وہ انگلیوں کی پوروں میں دھڑکتا ہوا محسوس کر سکتا تھا وہ بستر سے اتر کر فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

اسے ابھی ہالی وڈ جانا تھا۔

وہاں جانے کے لیے اسے رقم کی بھی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہچ ہائکنگ کرتے ہوئے جا سکتا تھا۔

''ایک بار میری ملاقات جان فورڈ یا ہاورڈ ہاکس جیسے فلمی ہدایت کاروں سے ہو گئی تو میں راتوں رات اسٹار بن جاؤں گا۔''

وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے کپڑے اور کچھ دیگر سامان بیگ میں ٹھونسنے لگا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ اس میں ابراہیم کے جاگ جانے کا احتمال تھا۔ اسی خدشے کے تحت اس نے لائٹ بھی نہیں جلائی تھی۔

''اگر چند روز مجھے کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرنا پڑی تو بھی مضائقہ نہیں۔ شروع میں ایم جی ایم یا ''وارنر برادرز'' کم معاوضے پر میرے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیں گے تو میں انکار نہیں کروں گا۔ بہت سے بڑے اداکاروں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔''

کپڑے تبدیل کرنے اور جوتے پہننے کے دوران وہ تمام تفصیلات طے کر چکا تھا۔

کھڑکی کے پٹ کھولنے میں اسے خاصی طاقت صرف کرنا پڑی تھی۔ طویل عرصے سے بند رہنے اور زنگ کی تہیں چڑھنے سے وہ جامد ہو چکے تھے۔ پٹ ایک جھٹکے سے باہر دھکیلنے پر جو زوردار دھماکہ سنائی دیا تھا اس نے احمد کو وہ گملا یاد دلا یا جو گذشتہ کئی برسوں سے کھڑکی کے بیرونی کنارے پر دھرا تھا۔ اس پر بوکھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ اگر ابراہیم جاگ جاتا تو اس صورت حال کی وضاحت کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ اس نے تیزی سے بیگ اٹھا کر کندھوں پر لادا اور آزادی کی جانب پہلا قدم بڑھایا۔ تب اس نے ایک مہیب آواز سنی جیسے کوئی بھاری گٹھڑی بلندی سے نیچے گرائی گئی ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بھاگتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچا اور لائٹ آن کر دی۔

ابراہیم عجب مضحکہ خیز انداز میں فرش پر لیٹا تھا۔ نہ پوری طرح اوندھا اور نہ پہلو کے بل، اس کا بایاں گھٹنا پیٹ سے چپکا تھا

اور پھیلا ہوا ہاتھ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف نہ تو دیکھتا تھا اور نہ ہی اس کی پکار کا جواب دیتا تھا۔ یہ وہ یہ ابراہیم نہیں تھا جسے وہ کئی سالوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔

یہ تو سفالہ (مٹی کا ٹوٹا ہوا برتن) تھا۔ ایک ٹھیکرا جس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور جس کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔

✠ ✠ ✠

ڈاکٹر ڈینیل ملر نے تاسف سے اس خستہ حال نوعمر لڑکے کو دیکھا۔

اس کی سوجن زدہ سرخ آنکھیں بے خوابی کی غماز تھیں۔ اس کے بال الجھے ہوئے، چہرہ زرد اور ہونٹوں پر سفید پپڑیاں جمی تھیں۔ وہ بڑی پر امید نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر ڈینیل کے دل میں شدید خواہش ابھری کہ وہ اسے تسلی دینے کے لیے کچھ کہہ سکے، اس کے دکھ کو کم کر پائے۔ اس کی زندگی میں متعدد بار ایسے لمحات آئے تھے جب مریضوں کے لواحقین ایسی ہی پر امید نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے تھے اور اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر ان کی خوشیوں اور غموں کا دارومدار ہوتا تھا۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ کڑوی حقیقت کو ہر ممکن حد تک خوشنما بنا کر پیش کرے لیکن بعض اوقات معاملات اس کے بس سے باہر ہو جاتے تھے۔ اس بار بھی وہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ میز کی دوسری طرف نشست پر بیٹھے ہوئے معصوم صورت لڑکے کی وہ کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے الفاظ کا چناؤ کیا اور گلا کھنکار کر بولا۔

''مجھے افسوس ہے، میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔''

وہ نشست پر آگے کھسک آیا اور کہنیاں میز پر رکھ دیں۔ اس کی آنکھوں میں رقم کرب کی تحریر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

''تمہیں طبی اصطلاحوں کی پیچیدگی میں الجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بس تمہارے لیے اتنا جاننا ضروری ہے کہ ابراہام اب زندگی بھر چلنے پھرنے اور بولنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔''

اس نے اپنی نظریں مقدس کنواری (مریمؑ) کی شبیہ پر مرکوز کر لیں۔ اس لڑکے کی آنکھوں میں امڈنے والے آنسو اسے بہت تکلیف دے رہے تھے۔

''اسے تم جب چاہو گھر لے جا سکتے ہو اسے اب مزید ہسپتال میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا اعصابی نظام اس بری طرح متاثر ہوا ہے کہ کسی بھی طرح کی therapy تجویز نہیں کی جا سکتی۔ میرا مطلب ہے فزیوتھراپی بے سود ہوگی۔ اب اس کی حالت میں کبھی بھی بہتری آئی تو...... وہ ایک معجزہ ہوگا۔''

اس نے ایک نظر لڑکے کو دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ خود کو رونے سے روکنے کے لئے یقیناً اس کو بہت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔

''میری رائے کو حتمی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دانش اور تجربے میں مجھ سے ہزار گنا بہتر ماہرین موجود ہیں تم جس سے مناسب سمجھو، مشورہ کر سکتے ہو اور طب کی دنیا میں معجزات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

وہ لڑکا اب ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ رہا تھا۔ شاید اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔

''نوجوان! ابراہام کی حالت اب کسی نومولود بچے سے بھی بدتر ہے۔ وہ اپنی کسی ضرورت کا اظہار تک نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اشارے سے بھی نہیں۔ اگر تم کسی کو مستقل اس کی دیکھ بھال کے لیے رکھنے کا بندوبست کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ یہ سب بھی تمہیں خود کرنا ہوگا۔''

اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور ہچکیوں کے درمیان بمشکل بولا۔

''میری ماں میری پیدائش کے وقت مرگئی تھی۔ میرے بابا نے تنہا مجھے پالا ہے۔ ان کے لیے جو بھی کرنا پڑا، میں کروں گا۔''

ڈاکٹر ڈینیل کو اپنی نرم دلی پر غصہ آرہا تھا۔ اتنے سال اس شعبے میں بتانے کے باوجود اس میں وہ حوصلہ اور مضبوطی کیوں نہیں آسکی تھی جو اس پیشے کی اولین شرط تھی۔ آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے بھی ہمیشہ اس پر گھبراہٹ طاری ہوجایا کرتی تھی۔ وہ جلد از جلد اس مرحلے سے سبکدوش ہونے کا خواہاں تھا۔

''تم بہت کم عمر اور ناتجربہ کار ہو۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا، لیکن تمہیں بتانا ضروری ہے کہ اب بہت سے جسمانی افعال اس کے اختیار میں نہیں رہے یعنی پیشاب، پاخانہ، تم سمجھ رہے ہونا۔ ان سب باتوں کا کسی دوسرے فرد کو خیال رکھنا ہوگا۔ بہرحال یہ تمہارا مسئلہ ہے اور تمہیں ہی حل کرنا ہے۔ خدا تمہارے دل کو مضبوطی عطا کرے۔''

اس کی خواہش تھی کہ وہ فوراً اس کے دفتر سے رخصت ہوجائے۔

''ڈاکٹر ملر!'' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

''وہ لمبا عرصہ جی تو سکیں گے۔ ان کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

اسے بدقسمت لڑکے کی فراخ آنکھوں میں امید کی کرن لودیتی نظر آئی۔ کاش وہ اس کے لیے کچھ کرسکتا۔

''ہوسکتا ہے وہ بہت سال جیے اور ہوسکتا ہے...... سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا جواب دوں۔''

وہ شدید بے بسی محسوس کررہا تھا۔

اس کی آنکھوں کی روشنی مدھم ہوگئی اور وہ شکست خوردہ انداز میں پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

خدا کے فیصلے اتنے ناقابل فہم کیوں تھے۔ ان پہیلیوں کو بوجھنا ممکن کیوں نہ تھا۔

ڈاکٹر ڈینیل نے مقدس مریم کی شبیہ کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

✠ ✠ ✠

پرنیاں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ خاصی دیر گھنٹیاں بجتی رہیں، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے چٹختے اعصاب کو سمیٹتی آرام کرسی پر ڈھے گئی۔ پچھلے چار، پانچ روز میں وہ یہ نمبر کتنی بار ملاچکی تھی، شمار کرنا ممکن نہ تھا۔ ان لمحات میں وہ ایسی تھکن محسوس کررہی تھی جیسے کسی تپتے صحرا میں کئی صدیوں کی مسافت طے کرچکی ہو۔

''کیا وہ ایک مذاق تھا؟ محض دل لگی، اسے تو یاد بھی نہیں ہوگا میں کون ہوں۔ لیکن میں اسے کیسے بھولوں۔ وہ آسیب کی طرح مجھ سے چمٹ گیا ہے۔ میں کیسے جان چھڑاؤں، کیا کروں کہ میرے حافظے سے اس کا عکس مٹ جائے۔''

وہ آرام کرسی میں جھولتے ہوئے سوچنے لگی، بھوک اور بے خوابی کے عطا کردہ بوجھل پن نے اسے نڈھال کررکھا تھا۔

''وہ جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ خدا میرا اتنا کڑا امتحان کیسے لے سکتا ہے۔ یسوع میری مدد کر، یہ تکلیف میری برداشت سے بڑھ کر ہے۔''

زیر لب دعا مانگتے ہوئے اس نے بہ دقت خود کو اٹھنے پر مائل کیا اور ایک بار پھر وہ نمبر ملانے لگی۔ پانچویں گھنٹی پر اسے شبہ ہوا کہ کسی نے ریسیور اٹھالیا تھا۔ یکبارگی اس کا دل اپنی چال سے چوک گیا۔ مانوس گمبھیر آواز ائیر پیس کے سوراخوں سے فضا میں بکھرنے لگی تھی۔

''مجھے پہچانا؟ تم اور میں پارک میں ملے تھے۔''

''مجھے سوچنے دو۔آواز سے تو تم جوان اور خوبصورت لگتی ہو۔''

''تم نے میری ہتھیلی پر اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیا تھا۔تمہاری دوست بھی وہیں تھی،وہ سرخ بالوں والی ہسپانوی لڑکی۔''

''یہ کب کی بات ہے؟مجھے یاد نہیں آ رہا۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارا کمونو زنانہ ہے اور تمہیں پھولوں کی زبان آتی ہے۔تمہارا کردار ایک قاتل کا تھا۔وہ اطالوی بولتا تھا،فلم کی ہیروئن مرجاتی ہے اور میں پریشان تھی کہ تمہارا......''

رابطہ کاٹ دیا گیا تھا۔

وہ کریڈل پر ہاتھ مار کر تیزی سے ڈائل گھمانے لگی۔بزی ٹون سنائی دے رہی تھی۔شاید فون کسی دوسری لائن پر مصروف ہوگیا تھا۔بمشکل دو منٹ کے وقفے سے اس نے پھر کوشش کی۔اب بھی وہی بزی ٹون سماعت میں زہر گھول رہی تھی۔اگلے پندرہ منٹ وہ لگاتار کوشش کرتی رہی۔ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی دھڑکنیں مدھم تر پڑتی جارہی تھیں۔جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس نے جان بوجھ کر فون انگیج کردیا تھا تو بے جان ہاتھ سے ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ہونٹوں پر پھسلتی نمکینی کو محسوس کر کے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

''وہ مجھے نہ ملا تو میں ختم ہو جاؤں گی۔''

وہ بے آواز سسکنے لگی۔پُرحدت قطرے مسلسل اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔

''مجھے ایک بار اور کوشش کرنی چاہیے،ایک آخری بار۔''

وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھ رہی تھی کہ گھنٹی بجنے لگی۔اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا تھا۔

''پرنیاں آئزک؟''اس نے مختصر ہاں سے تصدیق کی تھی،اب اگر وہ بولنے کی غلطی کرتی تو اسے پتا چل جاتا کہ وہ رو رہی تھی۔

''تم سے بات کرتے ہوئے میرے پاؤں میں الجھ کر ٹیلی فون کا تار ٹوٹ گیا تھا۔ بس اسے مرمت کرتے ہوئے کچھ دیر لگ گئی۔تمہیں میں کیسے بھول سکتا ہوں اور مجھے پوری امید تھی کہ تم مجھ سے رابطہ کرو گی۔پچھلے پانچ روز سے میں شہر سے باہر تھا اور میں مسلسل پچھتا تا رہا کہ مجھے تمہارا ٹیلی فون نمبر اور پتا لے لینا چاہیے تھا۔اس دن پارک میں جانے کیسے بھول گیا۔''

وہ اور بھی شدت سے رونے لگی تھی۔

''مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔تم ٹھیک ایک گھنٹے بعد مجھے چائنیز تھیٹر کے باہر ملو۔میں وہیں آ رہا ہوں،ہالی ووڈ بلیورڈ پر بہت مشہور۔''

رابطہ ایک بار پھر کٹ گیا۔

✠ ✠ ✠

Grauman کا چائنیز تھیٹر سینکڑوں ہنرمند ہاتھوں اور زرخیز دماغوں کی صناعی کا کرشمہ تھا۔وہ پرشکوہ رنگین چینی ڈریگن،جس کے سامنے دو''ہیون ڈاگز''ایستادہ تھے،پہلی نظر میں ہی دل کو بھا جاتا تھا۔

''لاس اینجلس میں آکر چائنیز تھیٹر نہ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسا چین جا کر دیوار چین نہ دیکھنا۔''

گرانٹ نے اسے بتایا تھا۔

اس کے پاس دو ٹکٹ تھے اور وہ اس فلم کو دیکھنے کے لیے بہت پرجوش تھا۔

پرنیاں نے ایک لمحے کے لیے بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ فلم کی کہانی کیا تھی اور کردار کیا کہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ ہال سے باہر آئی تو اسے فلم کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ وہ ہال کے تنگ تاب ماحول میں بار بار گردن موڑ کر اپنے پہلو میں بیٹھے گرانٹ کو دیکھتی رہی تھی اور خود کو یقین دلاتی رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ موجود تھا۔

فلم کے دوران گرانٹ نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔ فلم شروع ہوتے ہی گویا وہ سکتے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسکرین پر کریڈٹس آنے شروع ہوئے تو اس کی محویت ٹوٹی تھی۔ پھر اس نے فلم کے جملہ پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا جیسے وہ چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو پرنیاں نے فقط اتنا کہا۔

"بلاشبہ یہ بہت خوبصورت فلم تھی۔"

وہ اسے تھیٹر کا وسیع و عریض سیمنٹ فورکورٹ دکھانے کے لیے لے گیا۔

"یہاں تمہیں دیکھنے کو کچھ بہت انوکھا ملے گا۔ کچھ ایسا جسے تم تمام عمر بھول نہ پاؤ گی۔"

وہ سیمنٹ کی چوکور سلوں میں پیوست مختلف ستاروں کی نشانیاں تھیں۔ وہ اسے ایک ایک نقش کے بارے میں بتانے لگا۔ Judy Garland کے دستخط، مارلن منرو کے ہاتھوں اور پیروں کے کھبے ہوئے نقوش، Groucho Marx کے سگار کا نشان، Tom Mix کے گھوڑے کے سم، Betty Grable کی ٹانگیں۔

وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں جانتی تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی یہ نام نہیں سنے تھے۔ اسے فلموں یا فلمی ستاروں سے رتی برابر دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ گرانٹ کو دکھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ جب بھی کسی سنگین چوکور میں منجمد نقوش کی تاریخ سنا کر اس کی طرف دیکھتا، وہ چہرے پر ستائشی مسکراہٹ سجا لیتی۔

وہ اسے ایک اطالوی ریستوران میں لے گیا۔

"تمہیں اطالوی کھانے پسند تو ہیں نا؟"

گرانٹ نے مینو کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں میں اطالوی کھانوں کی گرویدہ ہوں۔"

اس نے جھوٹ بولا۔

"یہ تو کمال ہے۔" وہ بچوں کی مانند خوش ہوا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ طب کی دقیق کتب کے سوا تمہیں دنیا کی کسی بھی شے سے دلچسپی ہو گی۔ اور مجھے شک سا تھا کہ تم بات بھی طبی اصطلاحوں میں کرو گی۔ تم نے جس انہماک سے فلم دیکھی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے حیرت ہوئی۔"

"ابھی تو میرا پہلا سال ہے۔ شاید زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد میں سنکی اور خشک مزاج ہو جاؤں۔ میڈیکل کی پڑھائی بہت مشکل ہے۔"

"تو پھر چھوڑ دو۔ اگر تم بدذوق ہو جاؤ گی تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

وہ ہنسا اور مینو کارڈ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

"کیا کھاؤ گی؟"

پرنیاں نے بے بسی سے اس قطعی اجنبی فہرست کو دیکھا۔ وہ لمحہ آن پہنچا تھا جس سے وہ خائف تھی۔ اسے امریکہ آئے ہوئے محض چند ہفتے ہوئے تھے اور اطالوی تو کیا کسی بھی ریستوران میں کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اسے متذبذب دیکھ کر گرانٹ بولا۔

''تمہیں فیصلہ کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے؟ یہ درست ہے کہ یہ کوئی زیادہ اچھی جگہ نہیں ہے اور یہاں پیش کیے جانے والے کھانوں کی تعداد خاصی محدود ہے۔ مگر تم مجھ پراعتماد کرو تو تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔''

اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا اسے یاد نہیں تھا آخری بار کب اس نے کچھ کھایا تھا۔ جب گرانٹ ویٹرس کو کسی کھانے کا نامانوس مگر اشتہا انگیز نام بتا رہا تھا تو اس کے معدے میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔

''تمہیں پسند آئے گا۔ یہاں کے چند کھانے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔''

ویٹرس نے کھانا سرو کر دیا تھا۔ ایک پل میں اس کی بھوک اڑ گئی۔ سفید رکابی میں اسپیگٹی اور انڈوں کے ٹکڑے تھے۔ ایک بار چاچی نے بہت اصرار کر کے اسے اسپیگٹی کھلائی تھی اور وہ اتنا برا تجربہ تھا کہ اس نے تاحیات اسپیگٹی نہ کھانے کا تہیہ کیا تھا لیکن اس وقت وہ اسے کھانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ناپسندیدگی کی کوئی وقعت نہیں تھی کیونکہ وہ گرانٹ کی پسند تھی۔

''صوفیہ لارین اپنے ہوش ربا جسمانی خدوخال کے بارے میں کہتی ہے کہ ''جو بھی تمہیں نظر آتا ہے، وہ اسپیگٹی کا مرہون منت ہے۔''

وہ بہت رغبت سے کھا رہا تھا۔ وہ جب نوالہ نگلتا یا مشروب کا گھونٹ بھرتا تو اس کے گلے کا کنٹھ ہلکا سا ابھر آتا اور گردن میں ایک لہر اوپر سے نیچے تک رینگ جاتی۔ پرنیاں مبہوت سی اسے تکتی رہی تھی۔

''لگتا ہے تمہیں پسند نہیں آیا'' اسے فورک سے کھیلتے دیکھ کر وہ تشویش سے پوچھنے لگا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے ایک بڑا سا نوالہ منہ میں دھکیل کر تردید کی۔

''مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے، آج ہمیشہ جتنا مزیدار نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ اور منگوا لیتا ہوں۔''

اس کے منع کرنے کے باوجود گرانٹ نے ویٹرس کو بلا لیا تھا۔

''یہ میری اولین پسند نہیں ہے لیکن لذت میں اس کا بھی جواب نہیں۔''

پرنیاں کو بتاتے ہوئے وہ ویٹرس کی طرف متوجہ ہوا اور مینو کارڈ پر ایک جگہ انگلی رکھ کر پڑھنے لگا۔

''Spaghetti all' aglio, olio e peperoncino'' اس نے اسپیگٹی پر مشتمل ایک اور کھانا لانے کی ہدایت دی تھی!

رخصت ہونے سے قبل گرانٹ نے پھولوں کی دکان سے دودھیا سفید رنگ کا پھول خریدا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔

''یہ سفید Cammelia کہتا ہے کہ تم پرستش کے لائق ہو۔ مجھ سے ملتی رہو گی تو تمہیں پھولوں کی زبان سمجھ میں آنے لگے گی۔''

گھر لوٹتے ہوئے تمام راستہ وہ اس کی باتوں کو ذہن میں دہراتی رہی۔ کیا ان میں اس کے لیے چاہت کا کوئی رنگ پنہاں تھا؟ طلب کے بھانبھڑ جو اس کے تن من کو جلا رہے تھے، کیا ان کی آنچ گرانٹ تک بھی پہنچی تھی۔ لیکن اس کی تو ہر بات فلمی ستاروں سے شروع ہوتی تھی اور ان پر ہی تمام ہوتی تھی۔

''گریس کیلی کے پالتو پوڈل کا نام اولیور تھا۔''

''کلارک گیبل کے برتھ سرٹیفکیٹ پر اسے غلطی سے لڑکی لکھ دیا گیا۔''

''پال نیومین کلر بلائنڈ ہے۔''

''مارلن منرو کے برنٹ وڈ والے گھر میں، جہاں اس کی موت واقع ہوئی، دہلیز کی ٹائلوں پر لاطینی زبان میں ''cursum perficio'' کندہ تھا جس کا مطلب ہے ''میرا سفر تمام ہوا۔''

اور کیری گرانٹ جس کی وہ پوجا کرتا تھا۔ گرانٹ کی ہر دوسری بات میں اس شخص کا تذکرہ تھا۔ وہ اس کا نام اتنی عقیدت سے لیتا تھا کہ کیری گرانٹ پرنیاں کو کوئی دیوتا لگنے لگا تھا۔

وہ مسلسل سوچتی رہی اور اسے کوئی ایک ایسا فقرہ بھی یاد نہ آسکا جس کو وہ محبت کے معنی اوڑھا سکتی۔ لیکن وہ سفید پھول۔ وہ تو خاص طور پر اس کے لیے چنا گیا تھا۔

''تم پرستش کے لائق ہو۔'' وہ تادیر اس جملے کو زیر لب گنگناتی رہی۔ اس نے باقی تمام باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی توجہ کا محور اس سفید پھول کو بنالیا تھا۔ وہ اس کی شام کا حاصل تھا۔

وہ مسرور وار بے خودسی گھر پہنچی تو چچا، چاچی اور داؤد کھانے کی میز پر موجود تھے۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں پرنیاں؟ کم از کم بتا کر تو جاتیں۔ تمہارے ابو نے دو بار فون کیا اور مجبوراً مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔''

اس نے چاچی کو کوئی جواب نہ دیا اور کرسی کھینچ کر داؤد کے مقابل بیٹھ گئی۔

''تم کب آئے؟''

وہ سان فرانسسکو کے ایک ہسپتال میں ریزیڈنسی پیریڈ گزار رہا تھا اور ہفتے میں ایک آدھ بار ہی گھر آیا کرتا تھا۔

''میں تو دوپہر میں ہی آ گیا تھا۔ خیال تھا، تمہارے ساتھ کچھ گپ شپ رہے گی مگر تمہیں تو شاید فرصت ہی نہیں ہے۔ کھانا نہیں کھاؤ گی؟'' وہ خفا لگتا تھا۔

''میں کھا چکی ہوں۔ تم کسی کیری گرانٹ نامی اداکار کو جانتے ہو؟''

''ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو۔''

وہ متحیر ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ پرنیاں کو فلموں سے ذرا بھی شغف نہیں تھا۔

''اس کے بارے میں جو بھی معلومات اکٹھی کر سکتے ہو۔ وہ مجھے لادو۔ اخبارات، رسائل، جو کچھ بھی مہیا ہو سکے۔''

'پتا تو چلے کہ اچانک تمہیں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے۔''

''اس کی فلمیں بھی چاہئیں مجھے۔ جتنی بھی مارکیٹ میں دستیاب ہوں۔''

''ایک بات کہوں پرنیاں! برا تو نہیں مانو گی؟''

داؤد نے کھانے سے ہاتھ روک کر اسے گہری نظروں سے جانچا۔

''تمہاری سرگرمیاں آج کل پراسرار ہیں۔''

''تمہیں آخر اعتراض کس بات پر ہے؟'' چاچی نے مداخلت کی تھی۔ کسی مشہور آدمی کو پسند کرنے میں کیا اسرار ہے۔''

وہ کندھے اچکا کر اپنی پلیٹ پہ جھک گیا تھا۔

چچا اور چاچی چائے پینے کے بعد میز سے اٹھ گئے تو وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''میری بات کو مذاق میں مت ٹالنا۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ اگر تمہارے پاس وقت نہیں ہے تو مجھے کسی لائبریری وغیرہ کا پتا بتادو جہاں سے یہ سب مواد مل سکے۔''

''تمہارے شوق اتنے نرالے کیوں ہوتے جارہے ہیں؟ سچ بتاؤں، مجھے تم کافی سے زیادہ مشکوک لگنے لگی ہو۔''

وہ ناخنوں سے میز کی سطح کھرچنے لگی۔

''وہ عجیب سے عنوان والی کتاب جو تمہاری رائٹنگ ٹیبل پر رکھی ہے۔ وہ تمہیں کہاں سے ملی؟ کیا انوکھا موضوع ہے۔ پھولوں کی زبان۔''

پرنیاں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور ایک خالی مگ قریب کھسکا کر اسے انگلیوں سے گھمانے لگی۔

''تم میرے کمرے میں گئے تھے؟''

اس کے لہجے میں ناگواری بھانپ کر وہ چونکا۔

''کیا بات ہے پرنیاں! تمہارے مزاج کو کیا ہوا ہے۔ جانے کس الجھن میں ہو کہ تمہیں کسی کی پروا ہی نہیں ہے۔ پچھلا ہفتہ تم نے مجھے ایک بار بھی فون کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہسپتال کی ٹف روٹین میں مشقت بھرے دن اور جاگتی راتیں بسر کر کے میری ذہنی اور جسمانی حالت کیا ہو جاتی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ فراغت کا وقت وہاں سو کر میں اپنی نیند بھی پوری کر سکتا ہوں مگر سوچتا ہوں کہ تمہاری سنگت میں کچھ تفریح ہو جائے گی تو تھکن اتر جائے گی اور تمہارے پاس فرصت ہی نہیں ہے۔''

وہ شکوہ کناں ہوا۔

''مجھے اپنی بے دھیانی پر افسوس ہے داؤد! میں کل تمہیں اسپیگٹی بنا کر کھلاؤں گی۔ چاچی سے کوئی ترکیب سمجھ کر۔ وعدہ کرتی ہوں۔''

داؤد نے چائے کی آخری چسکی لے کر کپ زور سے میز پر پٹخ دیا۔

''چھٹی کے دن تمہاری مصروفیات کا یہ عالم ہے تو کل وقت کیسے نکال پاؤ گی۔''

مگ کو گھماتی ہوئی پرنیاں کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

''چھٹی کا دن۔'' اس نے زیر لب دہرایا۔

تمام دن میں پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ آج سنڈے تھے اور ہوش سنبھالنے کے بعد پہلا سنڈے تھا۔ جب وہ چرچ جانا بھول گئی تھی۔

اس کے اندر خالی پن پھیلنے لگا۔



ابراہیم مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اپنی پلکوں کو تیزی سے جھپکانے پر بھی قادر نہ رہا تھا۔ اس کے اندرونی اعضاء کے سوا ظاہری طور پر کوئی عضو زندہ تھا تو وہ اس کی آنکھیں تھیں اور جب احمد کمرے میں چل پھر رہا ہوتا تو وہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ ان پھٹی پھٹی آنکھوں میں کیسی بے بسی اور ویرانی تھی۔ ڈاکٹر طلر نے اسے بتایا تھا کہ ابراہیم ذہنی طور پر پسماندہ نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ سمجھ سکتا تھا۔

احمد نے اپنا بستر ابراہیم کے کمرے میں منتقل کر لیا تھا۔ اس کا اسکول جانا موقوف ہو چکا تھا۔ بک شاپ بھی بند پڑی تھی۔ اس کی زندگی کا ایسا خوف ناک باب شروع ہوا تھا جس کا اس نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ دن کا آغاز ابراہیم کو صاف کرنے اور اس کے کپڑے تبدیل کرنے سے ہوتا۔ وہ گیلے کپڑے سے اس کی جسمانی آلائشیں صاف کرتا، اس کے چہرے اور داڑھی سے وہ لعاب پونچھتا، جو رات بھر اس کی باچھوں سے بہتا تھا۔

اس دوران اسے مسلسل ابکائیاں آتیں۔ پھر اس کے لیے ناشتہ تیار کرتا اور اس کے بے جان جبڑوں میں تھوڑی تھوڑی غذا دھکیلنے کا صبر آزما مرحلہ۔ دودھ، دلیہ یا سوپ اتنا اس کے معدے میں نہیں پہنچتا تھا جتنا ٹھوڑی اور داڑھی پر بہہ جاتا تھا۔

وہ دن میں کئی بار کپڑے گیلے کرتا اور احمد کے لیے اعصاب شکن مشقت کا نیا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دس روز کے اندر اندر کمرے میں اس قدر تعفن بھر گیا تھا کہ اسے لگتا، وہ کسی گٹر میں رہ رہا ہے۔ اس کی بھوک بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ نوالہ منہ میں ڈالتا تو

جی متلانے لگتا۔ ابراہیم کے ہونٹوں سے گرتی رال، گندگی سے لتھڑے ہوئے کپڑے، بدبودار بستر جس کی رنگت رفتہ رفتہ پیلی ہوتی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگتیں۔

ایک بار اس کے اسکول کے چند ساتھی، جن میں روزی جونز بھی شامل تھی، اس کے باپ کی عیادت کرنے آئے تو اس نے انہیں دروازے سے باہر ہی روکے رکھا۔ وہ ان پر اس بدبو کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا جو اب اس کے وجود کا ایک جزو بننے لگی تھی۔

ایک طویل پر اذیت دن گزارنے کے بعد وہ بستر پر لیٹتا تو اس کا بند بند دکھ رہا ہوتا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس خواب کو ذہن میں دوہراتا جو اس کی واحد اور آخری امید تھا۔ وہ اسے تمام جزئیات کے ساتھ یاد کرتا۔ لموزین، سیاہ ڈنر سوٹ، مارلن منرو، اس کا گیت، سرخ قالین، پرستاروں کا ہجوم، کیمروں کی چکا چوند، منرو کا فقرہ۔ وہ تمام تفصیلات کو بار بار سوچتا اور اسے ایک انوکھا سرور محسوس ہوتا، اس کے دل میں میٹھا سا درد جاگنے لگتا وہ زیر لبی میں بڑبڑاتا۔

''یہ سچ ہوگا۔ ایک دن یہ سب سچ ہوگا۔ وہ دن ضرور آئے گا۔ ایک دن یہ سپنا حقیقت بنے گا۔ وہ دن آنے ہی والا ہے۔''

ان لمحات میں وہ ابراہیم اور اس غلیظ کمرے سے کہیں دور چلا جاتا اتنی دور کہ اپنی حقیقی زندگی اسے ایک واہمہ لگنے لگتی۔

رات کو کئی بار اس کی آنکھ کھلتی۔ کبھی ابراہیم کے حلق اور نتھنوں سے پیدا ہونے والی غیر انسانی آوازوں سے اور کبھی کمرے میں پھیلتے ناقابل برداشت تعفن سے۔ یوں تو ابراہیم کی معیت میں ایک ایک پل بتانا قیامت سے کم نہیں تھا مگر سب سے زیادہ اذیت ناک امر اس کی آلائشوں کو صاف کرنا تھا۔ شروع شروع میں جب احمد کو یہ کام کرنا پڑتا تو اسے رونا آجاتا مگر رفتہ رفتہ اس کے آنسو خشک ہوگئے۔

پہلی بار ابراہیم کی غلاظت صاف کرنے پر اسے اتنی دیر تک الٹی آتی رہی کہ اسے شبہ ہونے لگا کہ اس کی تمام آنتیں منہ کے راستے باہر آجائیں گی۔ جب طبیعت قدرے سنبھلی تو اس نے غسل کیا اور عصر کی نماز ادا کرنے مسجد چلا گیا۔ یہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے مسجد گیا۔ اس روز اس نے باقی دونوں نمازیں بھی مسجد میں پڑھی تھیں۔ اگلے دن وہ صبح پانچ بجے اٹھا اور فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ مسجد ان کی رہائش گاہ سے محض تین بلاک کی دوری پر تھی۔ وہ پانچوں نمازیں مسجد میں پڑھنے لگا۔ ہر نماز کے بعد وہ گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگتا۔ اپنے لیے نہیں، ابراہیم کے لیے۔

''میرے بابا بڑی اذیت میں ہیں۔ میں ان کو ایسے نہیں دیکھ سکتا۔ تو ان کی مشکل آسان کردے۔ اے اللہ! تو انہیں موت دے دے۔ یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ تو انہیں اپنے پاس بلالے۔ مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے لیکن میرے بابا کو اتنی تکلیف نہ دے انہیں موت دے دے......''

پورا ہفتہ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا رہا اور رو رو کر خدا سے ابراہیم کے لیے موت مانگتا رہا۔ ایک ہفتے بعد اس نے ابراہیم کے بائیں ہاتھ کی ادھ کٹی چھنگلی کو جنبش کرتے دیکھا۔ جانے وہ ابراہیم کی دماغی قوت کا نتیجہ تھا یا دیگر غیر اختیاری افعال میں سے ایک تھا۔ وہ فجر کی نماز کے لیے وضو کرنے جارہا تھا جب وہ معمولی سی حرکت اس کی نظروں کی گرفت میں آئی تھی۔ وہ ابراہیم کے پاس بیٹھ گیا اور تقریباً آدھا گھنٹہ اس کے بائیں ہاتھ کو گھورتا رہا۔ لیکن اس کا پورا جسم ساکن تھا۔ کسی لاش کی طرح۔

اس نے مسجد جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اگلا ہفتہ وہ چار نمازیں ادا کرتا رہا۔ فجر کی نماز کے لیے اٹھنے میں اسے بہت دقت پیش آتی تھی۔

تیسرے ہفتے کے آغاز میں ڈاکٹر ڈینئل ملر ایک جونیئر ڈاکٹر کو ہمراہ لے کر اپارٹمنٹ میں آیا اور ابراہیم کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد احمد کو تسلی دی۔ اس کا جسم مناسب حالت میں تھا اور اعضائے رئیسہ درست کام کر رہے تھے۔ دونوں ڈاکٹرز نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خوف ناک باس کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا تھا جو احمد کے بدن میں رچ بس چکی تھی۔ کچھ دنوں سے اسے

اپنی سانس سے بھی وہی بو آنے لگی تھی۔

''ابراہام بہت خوش قسمت ہے۔اسے تم جیسا تیمار دار ملا ہے۔''

ڈاکٹر ڈینئل نے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

''اگر تم اس کا اسی طرح خیال رکھتے رہے تو مجھے لگتا ہے اس کا خود بھی ٹھیک ہونے کو دل نہیں چاہے گا۔اسے زیادہ دیر لٹائے مت رکھا کرو کرسی پر بٹھا دیا کرو اور اگر لیٹا بھی رہے تو کم از کم کروٹ بدلواتے رہا کرو ورنہ کمر کی جلد جھڑنے لگے گی باقی فکر کی کوئی بات نہیں۔''

احمد نے عشاء کی نماز چھوڑ دی۔

دعا مانگنے کی شدت میں بھی کمی آنے لگی تھی۔ پہلے والا خشوع وخضوع ناپید ہوتا جا رہا تھا۔

تیسرے ہفتے کے پانچویں دن اس نے ابراہیم کو بولتے ہوئے سنا۔وہ کوئی واضح الفاظ نہیں تھے لیکن وہ اس کا نام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔دس منٹ اس کے منہ سے سیٹیاں سی برآمد ہوتی رہیں۔''اے......ہا......اہ......اے......'' صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ زبان کی نوک کو تالو سے لگانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔اسکے ہونٹ ذرا سا سکڑتے اور پھر بے جان ہو کر پھیل جاتے۔

اس روز احمد نے ظہر کی نماز چھوڑ دی اور اپنے بستر کے سامنے دیوار میں ایسی جگہ میخ گاڑ کر کیلنڈر ٹانگ دیا کہ اٹھتے بیٹھتے وہ اس کی نظروں کی زد میں رہے۔ابراہیم کی بیماری سے لے کر اب تک کی تمام تاریخوں کے گرد اس نے سرخ دائرے کھینچ دیے تھے۔ پھر اس نے معمول بنا لیا کہ صبح بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلے کیلنڈر پر ایک نیا دائرہ بناتا۔

چوتھے ہفتے میں اس کی عبادت صرف عصر کی نماز تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور اس ہفتے کا اختتام ہونے سے قبل اس نے وہ بھی ترک کر دی۔ابراہیم کے ساتھ اپارٹمنٹ میں بند ہوئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔اور اس دوران کئی بار اس نے بک شاپ کھولنے کا ارادہ کیا لیکن ابراہیم کے تنہا رہ جانے کے خیال سے اس پر عمل نہ کر پایا تھا۔

اکتیسویں روز کی صبح اس نے ابراہیم کے کپڑے بدلوا کر اسے ناشتہ کروایا اور اسے کرسی پر بٹھانے کے بعد ٹوائلٹ چلا گیا۔ آئینے میں اسے جو عکس نظر آیا تھا وہ کسی اجنبی کا تھا۔ہڈیالہ چہرہ، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، پیشانی پر بے شمار لکیریں، خشک ہونٹوں کی ادھڑی ہوئی جلد......وہ اپنی اصل عمر سے کئی برس بڑا نظر آ رہا تھا۔اس نے تمام نل پوری رفتار سے کھول دیے اور شاور کے نیچے بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا تھا۔اس کی چیخیں بہتے پانی کے شور تلے دب کر دم توڑ دیتی تھیں۔ٹھنڈے پانی کی پھواریں اس کے تھکن زدہ بدن کو سہلا کر اسے تسلی دیتی رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ ابراہیم کے پاس آیا تو اس نے ایک استری شدہ جوڑا پہن رکھا تھا اور اس کے بال نفاست سے بنے ہوئے تھے۔

''بابا! میں آج شاپ پر جا رہا ہوں۔دوپہر میں چکر لگاؤں گا، آپ کو کھانا کھلانے کے لیے۔اس وقت تک آپ ایک اچھے والد کی طرح میرا انتظار کیجئے۔اپنا خیال رکھیے گا۔''

کمرے سے نکلتے ہوئے اسے مبہم سی آواز اور ناگوار باس محسوس ہوئی تو وہ تیزی سے پلٹا۔

ابراہیم نے خود کو گیلا کر لیا تھا۔

اس کی رگ رگ میں قہر سما گیا۔اس عذاب سے سبکدوش ہوئے ابھی اسے بمشکل ایک گھنٹہ گزرا تھا۔اس نے ابراہیم کو گالی دینے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر لب بھینچ لیے۔چند گہری گہری سانسیں بھر کر اس نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ مشرقی دیوار کے ساتھ رکھی لوہے کی الماری کی طرف بڑھا اور پٹ کھول کر اس میں سے کچھ تلاش کرنے لگا۔تھوڑے

سے تردد کے بعد اسے وہ چمڑے کی بیلٹ مل گئی تھی۔ جو اسے قرآن پڑھاتے ہوئے ابراہیم ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ بیلٹ ہاتھ میں لیے ہوئے ابراہیم کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے گرتے موٹے موٹے آنسو مردہ رخساروں پر رینگ کر داڑھی کو بھگو رہے تھے۔ وہ کچھ دیر اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے سوچا۔

''ڈاکٹر ملر نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اسے درد محسوس ہوتا ہے یا نہیں......''



وہ بک شاپ میں ایک کتاب پڑھتے ہوئے اونگھ گیا تھا کہ کسی کے گلا کھنکارنے پر چونکا۔ فادر الیگزینڈر کو دیکھ کر وہ احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ پچیس چھبیس سال کی قدرے فربہ لڑکی تھی۔ جس نے لمبی آستینوں والا ایک ڈھیلا سا لبادہ پہن رکھا تھا اور اپنے خدوخال سے آئرش معلوم ہوتی تھی۔ فادر الیگزینڈر ابراہیم کے بہت اچھے دوست تھے اور اس کی بیماری کے بعد اکثر اسے دیکھنے کے لیے آیا کرتے لیکن آج سے پہلے کبھی وہ بک شاپ میں نہیں آئے تھے۔ اس نے ان دونوں کو بیٹھنے کے لیے اسٹول پیش کیے اور اپنے سامنے پڑی کتاب کو اٹھا کر بک ریک میں رکھ دیا۔ فادر اس لڑکی کا تعارف کروا رہے تھے۔

''یہ میری بھتیجی ہے۔ ایک سال ہوا، یہ آئرلینڈ کو چھوڑ کر مستقل میرے پاس آ گئی ہے، بہت دکھی اور نیک روح ہے مونا۔ اپنے منگیتر کی حادثاتی موت کے بعد اس نے اپنی زندگی یسوع کے نام وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

اس نے از سرِ نو لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور ناک ستواں تھی۔ سرخ چہرے پر بھورے تل اتنی کثرت سے تھے کہ لگتا تھا اس نے گالوں پر تتلی کے پر چپکا رکھے ہوں۔ بالوں کی رنگت کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں لگا پایا تھا کیونکہ وہ انہیں ایک بدرنگ اسکارف سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ اگر اس نے کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہن رکھے ہوتے تو شاید وہ خاصی پُرکشش نظر آ سکتی تھی۔ اسے دیکھنے پر ایک ہی لفظ ذہن میں لہراتا تھا۔ نن......

''آج میں خاص طور پر اسے تم سے ملوانے لایا ہوں۔'' اس نے تعجب سے فادر کو دیکھا۔

''مجھ سے ملوانے......؟''

''ہاں میرے بچے! مجھے تمہاری مشکلات کا پورا احساس ہے۔ تم پچھلے چار ماہ سے جس مصیبت میں مبتلا ہو اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک ہمت ہار چکا ہوتا۔ لیکن تم بہت بہادر ہو۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ ابراہیم کی دیکھ بھال کرنا کیسا کڑا امتحان ہے اور تمہاری کم عمری اس صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیتی ہے، کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ خود غرضی کے اس دور میں بھی تم جیسے لوگ موجود ہیں۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید یہ سب نہ کر پاتا جو تم اپنے معذور باپ کے لیے کر رہے ہو۔''

وہ بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا اس ساری تمہید کا مقصد کیا تھا۔

''میرا دل تمہارے لیے دن رات کڑھتا تھا لیکن میں آخر کر بھی کیا سکتا تھا۔ شروع دن سے میں تمہاری مدد کرنے کے طریقوں پر غور کرتا رہا ہوں اور بالآخر آج میں خدا کی دی ہوئی طاقت سے اس قابل ہوا ہوں کہ تمہارا درد بٹا سکوں۔''

ان کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔

''مونا ہے خدا کی وہ مدد۔''

اس نے الجھ کر مونا کو دیکھا تھا۔ وہ مسلسل گود میں دھرے اپنے گداز ہاتھوں کو گھور رہی تھی اور ایک پل کے لیے بھی اس کی نظروں کا ارتکاز نہیں ٹوٹا تھا۔

''میں نے مونا کو تمہارے مسائل کے بارے میں سب بتا دیا ہے اور خدا نے اس کے دل میں تمہارے لیے رحم ڈال دیا

ہے۔ کسی صلے کی امید کے بغیر یہ بخوشی تمہاری مدد کرنے پر تیار ہے۔''

''میں ہفتے میں دو دن مسٹر ابراہیم کی دیکھ بھال کیا کروں گی۔''

پہلی بار مونا نے لب کشائی کی تھی۔ اس کی آواز نن والے سراپے سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ کسی اوپیرا سنگر کی آواز لگتی تھی۔

احمد کو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کی برف زندگی میں حرارت سے بھرپور آتش دان در آیا ہو۔ ''ہفتے میں آزادی کے دو دن'' فادر الیگزینڈر جانے کیا کہہ رہے تھے اور وہ سوچتا تھا کہ ان دو دنوں میں وہ کیا کیا کر سکے گا۔''



وہ گاتھک طرز تعمیر کی ایک قدیم اور ویران عمارت تھی، عقبی دیوار کے قریب پہنچنے پر گرانٹ نے گردن گھما کر دائیں بائیں جائزہ لیا اور ایک ہی جست میں دیوار پھلانگ کر اندر اتر گیا۔ پرنیاں خائف سی ہو کر اپنی جگہ تھمی رہی۔ وہ خاموش عمارت دیگر رہائشی عمارتوں سے الگ تھلگ سڑک کے آخری کنارے واقع تھی اور اس طرف کسی کی آمد بھی خارج از امکان تھی۔ اس کے باوجود اسے گرانٹ کا یوں چوری چھپے دیوار پھاندنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم رک کیوں گئی ہو۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ پچھلے سات ماہ سے یہ میری ملکیت ہے۔ میں جب کچھ وقت سکون سے تنہا گزارنا چاہتا ہوں تو یہاں آ جاتا ہوں۔ تم بہت اچھا محسوس کرو گی۔''

اس کے یقین دلانے پر وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ دیوار کی اونچائی بمشکل ساڑھے چار فٹ تھی اور گرانٹ کی مدد سے وہ باآسانی اندر پہنچ گئی۔ وہ دونوں اندرونی عمارت کے گرد چکر کاٹنے لگے۔

لکڑی اور پتھر کے اختلاط سے سیاہ اور بھورے رنگوں کا بھید بھرا امتزاج قائم ہوا تھا۔ دیواروں پر آپس میں گتھی ہوئی ان گنت چوکوریں، تکونیں، دائرے اور محرابیں اور ان میں مقید خوابیدہ شبیہیں، تاریک کھڑکیاں، دیو قامت مرکزی دروازے پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔ اس کہنہ حسن نے پرنیاں کو فوراً حصار میں لے لیا تھا۔

وسیع لان میں گھاس کا سبز اور خاکستری فرش بے ترتیبی سے بکھرا تھا۔ وہاں سفید سوسن (للی) کے پودے کثرت سے تھے۔ شاید وہاں رہنے والے کو للی کے پھول پسند تھے۔ پرنیاں سوچنے لگی کہ للی کے پھول کس شے کی علامت ہوتے ہیں لیکن اپنے محدود مطالعے سے اسے اس سوال کا جواب نہ مل سکا۔ پھر گرانٹ نے اسے وہ گوشہ دکھایا جو اس کے من کو سب سے زیادہ لبھاتا تھا اور وہ حقیقتاً قابل ستائش تھا۔

وہ تین سفید جل پریاں تھیں جو ایک فراخ سرمئی، سنگلاخ طشت میں بل کھائے ہوئے بدن دھرے، اپنے الوہی حسن پر نازاں، پرغرور گردنیں تانے موجود تھیں۔ ان کے زیریں دھڑوں پر فلوس ماہی (مچھلی کے چھلکے) ایسی عمدگی سے تراشے گئے تھے کہ پرنیاں بے اختیار ہاتھوں سے انہیں چھو کر محسوس کرنے لگی۔ پتھریلی ناند کے پیندے کے گرد پھول دار جھاڑیاں حلقہ بنائے ہوئے تھیں۔ وہ آتشی گلابی رنگت کے لمبوتری پتیوں والے انوکھی وضع کے پھول تھے۔ انہیں دیر تک محویت سے تکتے رہنے پر وہ بڑی بڑی گلابی مکڑیاں نظر آنے لگتے تھے۔

جب وہ جل پریوں کے قدموں میں گھاس پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو اس کے دل میں کھد بدی ہونے لگی۔ گرانٹ اسے اس خواب ناک تنہا جگہ پر کیوں لایا تھا؟ کیا وہ اس محبت کا اعتراف کرنا چاہتا تھا جو پرنیاں کے دل میں کسی روگ کی طرح جاگزیں تھی۔ اس نے دھڑکنوں کو متوحش ہوتے ہوئے پایا تھا۔ لیکن چند لمحے سنگین پیالے کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز رہنے کے بعد وہ اٹھ کر سیدھا

ہوا تو اس کے لبوں سے ادا ہونے والا پہلا جملہ کیری گرانٹ کے بارے میں تھا اور کم وبیش ایک گھنٹہ وہ اسی موضوع پر بولتا رہا تھا۔

''الفرڈ ہچکاک فنکاروں کو ناپسند کرنے کے لیے بدنام ہے لیکن کیری گرانٹ اس کا پسندیدہ اداکار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''گرانٹ وہ واحد اداکار ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔'' تمہیں اس کی کون سی فلم سب سے زیادہ پسند ہے؟ ویسے تو یہ فیصلہ کرنا ناممکن سی بات ہے کیونکہ ہر فلم میں اس کی اداکاری کا فطری پن پچھلی فلموں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔''

پرنیاں نے خود پر غلبہ پاتی مایوسی کو بھلاتے ہوئے کیری گرانٹ کے سلسلے میں حاصل کردہ معلومات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ ذہن کو بہت کھنگالنے پر بھی اسے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اس کی معلومات محدود اور سطحی نوعیت کی تھیں لیکن گرانٹ آنکھوں میں اشتیاق لیے منتظر تھا اور وہ ان آنکھوں کو بجھتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی تھی۔ سب سے پہلے اسے جس فلم کا نام یاد آیا اس نے وہی بتا دیا تھا۔

''گنگا دین'' مجھے یہ فلم اتنی پسند ہے کہ ہزار بار بھی دیکھ لوں تو میرا دل نہیں بھرے گا۔ مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک معلوم ہیں۔ فلم کی کہانی رڈیارڈ کپلنگ کی مشہور نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ جارج اسٹیونس نے اسے پروڈیوس کیا۔ ڈائریکٹر بھی وہ خود ہی تھا۔ فلم کو Rko نے ڈسٹری بیوٹ کیا اور لاس اینجلس میں پریمیر شو 24 جنوری 1939ء کو ہوا۔''

اس نے فلمی رسالے میں دی گئی وہ معلومات قابل رشک روانی سے سنا دیں جو گزشتہ رات اس نے ذہن نشین کی تھیں۔

گرانٹ کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتمایا ہوا لگتا تھا۔ وہ پُرشوق آواز میں بولا۔ ''میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا تم اتنی گہری نظر رکھتی ہو گی، تمہیں اس ناقابل فراموش فلم میں کیری گرانٹ کی اداکاری کیسی لگی۔ کچھ فلمی نقادوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا۔''

''مجھے تو اس میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔'' اس نے گرانٹ کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ ''گنگا دین'' کا کردار کیری گرانٹ نے اس انداز میں نبھایا ہے کہ اس سے بہتر شاید ممکن ہی نہیں ہے۔''

اس نے گرانٹ کے تاثرات بدلتے ہوئے دیکھے۔ وہ اس طرح اسے دیکھنے لگا تھا، جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ایک لمحہ قبل اس کے چہرے سے پھوٹتی مسرت جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا؟ اچانک تم پریشان کیوں ہو گئے ہو؟''

''کیا تم نے وہ فلم دیکھی ہے؟''

''کون سی فلم'' وہ ہکلائی۔

''گنگا دین'' کیسا کڈھب سوال تھا۔

''تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''تو تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں ''گنگا دین'' کا کردار کیری گرانٹ نے نہیں سیم جیفی نے ادا کیا تھا۔ گرانٹ کے کردار کا نام ''کٹر'' تھا۔''

وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

جھوٹ آخر جھوٹ تھا۔ وہ اسے دھوکا نہیں دے پائی تھی اور اس کے پاس اپنے جھوٹ کی کوئی وضاحت نہ تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے۔ اس کی نظریں گھاس پر جم چکی تھیں۔ جانے کتنی دیر وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے گرانٹ کو کہتے سنا۔

''تم نے یہ سب میرے لیے کیا؟''

''ہاں، میں مجبور تھی۔''

''تمہیں فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں؟''

''وہ تو میں نے تمہاری خوشی کے لیے......''
''تمہیں اسپیگٹی پسند نہیں ہے؟''
''تمہیں جو پسند ہے......''
''تم کیری گرانٹ کو نہیں جانتیں؟''
''میرے پاس میں کچھ نہیں......''
''تم مجھے خوش کرنے کے لیے یہ سب کرتی رہیں؟''
''میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمہیں دیکھے بنا میں مرجاؤں گی۔''
اس کی سانس حلق میں اٹک رہی تھی۔ پھر اس نے دو بڑے بڑے ہاتھوں کو اپنے شانوں پر پایا۔ اس سحر آفریں لمس نے پرنیاں کو ساکت کر دیا۔
''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے سنگ سفید سے تراشی گئی جل پریوں کے سنگلاخ ہونٹوں پر شرگیں مسکراہٹ رینگتے دیکھی۔
گرانٹ کی انگلیاں اس کے بھیگے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔
''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''
وہ چوتھی جل پری تھی، جو سات سمندر کی مسافت طے کر کے اس آدم زاد سے ملنے آئی تھی۔

✠ ✠ ✠

جب پہلی بار مونا اپارٹمنٹ میں آئی تو احمد نے اسے اندر آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا۔
''اندر آ جاؤ سسٹر مونا۔''
''تم مجھے سسٹر کیوں کہہ رہے ہو؟''
''کیونکہ تم......'' وہ گڑبڑا گیا۔
''نن بننا بہت کٹھن اور صبر آزما عمل ہے۔'' وہ اس کے ادھورے جملے کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''میں نے تو ابھی محض ارادہ کیا ہے۔''
''تو ارادہ بدل ڈالو۔'' وہ کہنا چاہتا تھا، لیکن خاموش رہا۔
''تم مجھے تفصیل سے سمجھا دو کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔''
''ایک مرد عورت کو نہیں بتاتا کہ اسے کیا کرنا ہے، وہ خود طے کرتی ہے۔''
''کیا مطلب؟'' اس کی نیلی آنکھوں میں استعجاب تھا۔
''یہ فلم ''Notorious'' میں کیری گرانٹ کے کردار ''Devlin'' کا ایک مکالمہ ہے۔ وہ میرا پسندیدہ اداکار ہے۔''
اس کی وضاحت پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی اور احمد نے دیکھا کہ اس کے گالوں پر بیٹھی، تتلی کے بھورے پروں کی رنگت مدھم پڑ گئی۔ تب اس کے دل میں شدید خواہش جاگی تھی کہ مونا اکثر مسکراتی رہا کرے۔
وہ درحقیقت خدا کی مدد تھی۔ اس کے آنے سے احمد کی پُر درد زندگی کا ایک ہفتہ جو سات صدیوں پر محیط ہوتا تھا، گھٹ کر

پانچ صدیوں تک محدود ہو گیا، جن دو دنوں میں مونا آتی، وہ گویا پلک جھپکنے میں بیت جاتے۔ وہ کھانا بھی تیار کرتی اور رات کو اپارٹمنٹ میں ہی سوتی۔ جب وہ ابراہیم کے ساتھ موجود ہوتی تو احمد ہر فکر سے آزاد ہوتا۔ وہ بک شاپ سے فارغ ہو کر کوئی فلم دیکھنے چلا جاتا اور دیر تک سڑکوں پر بے مقصد گھومنے کے بعد رات گئے لوٹتا، لیکن وہ جتنی بھی دیر سے پہنچتا، مونا اسے اپنے انتظار میں جاگتی ہوئی ملتی۔ اس نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی۔

وہ اس کے ساتھ کبھی بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ اگر وہ ہنسی مذاق کر کے اس کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کرتا تو وہ نہایت سرد مہری سے اس کی پیش قدمی کو ناکام بنا دیتی۔ شاید وہ اسے بچہ سمجھتی تھی یا پھر وہ ضرورت کے علاوہ بات کرنے اور ہنسنے کو گناہ تصور کرتی تھی۔ کم از کم احمد کو یہی لگتا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن اُسے مونا بہت اچھی لگتی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ان کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے۔

ایک رات وہ اپارٹمنٹ میں آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کے پسندیدہ میوزیکل بینڈ ''The Beatles'' نے اپنا نیا گیت امریکہ میں ریلیز کیا تھا۔ مونا جونہی اس کے سامنے آئی، اس نے اچانک بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اونچی آواز میں گانے لگا۔

''I want to hold your hand''

اس کے کچھ سمجھنے سے قبل احمد نے اسے کسی گڑیا کی طرح گھما دیا تھا۔

''بیٹلز نے میرے دل کی آواز کو الفاظ دیے ہیں۔''

''Oh please say to me you ll let me be your man''

اپنی ترنگ میں اس نے مونا کا ردِعمل جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔

''And when I touch you I feel''

وہ خاموش ہو گیا۔

مونا کی رنگت خطرناک حد تک سفید پڑ چکی تھی اور اس کے لب تیزی سے ہل رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے گلے میں لٹکتی صلیب کو زور سے بھینچ رکھا تھا اور شاید کوئی دعا مانگ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگا، مجھے معاف کر دو۔'' وہ شرمندہ ہو گیا۔

''کیا تم چاہتے ہو، میں یہاں نہ آیا کروں؟''

اس کے حلق سے پھٹی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی اور وہ بھاگ کر کمرے سے نکل گئی۔

پورے پانچ روز وہ بے چینی سے اس کی آمد کا منتظر رہا۔ اپنی دلی کیفیت خود اس کے لیے چیستاں (پہیلی) بن گئی تھی۔ مونا کے لرزتے ہونٹ اور پانی میں ڈوبتی ہوئی نیلگوں آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن سے محو نہ ہوئی تھیں۔ وہ اسے کسی بھی قیمت پر منانا چاہتا تھا۔ جس روز وہ آنے والی تھی، اس نے بک شاپ معمول سے پہلے بند کر دی اور اپارٹمنٹ جاتے ہوئے راستے میں ایک فلاور شاپ پر رکا۔

وہ ابراہیم کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھی، اسے ایک کتاب پڑھ کر سنا رہی تھی۔ احمد پر ایک مختصر نگاہ ڈال کر وہ دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے چل کر اس کے نزدیک پہنچا اور اس کے پیروں کے پاس فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''مجھے معاف کر دو۔''

اس نے گرم کوٹ کی اندرونی جیب سے ہائی سنتھ کا ارغوانی پھول نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔

اس نے پھول لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ احمد نے وہ پھول اس کی گود میں رکھ دیا۔ پھر اس نے دوسرا پھول نکالا۔

''گل داؤدی، یہ پھول کہہ رہا ہے کہ تمہاری دوستی میرا سرمایہ ہے۔'' اسے بھی مونا کی گود میں رکھنے کے بعد وہ بولا۔

''کیا تم نن بننے کا ارادہ نہیں بدل سکتیں۔ کرائسٹ کو تو اور بہت مل جائیں گی، لیکن مجھے تو کوئی دوسری مونا نہیں ملے گی۔''

وہ خاموش رہی اور اس نے کتاب بند کر کے ابراہیم کے بستر پر رکھ دی۔

''تم ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم میرے لیے اپنی سنجیدگی میں تھوڑی کمی کر لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، یہ کوئی برا کام نہیں ہے۔''

وہ مسلسل بولنے لگا تھا۔ پھر اسے پتا بھی نہ چلا کب وہ اسے اپنے خواب کے بار... بتانے لگا۔ جو باتیں اس نے کبھی کسی سے نہیں کی تھیں، وہ سب مونا کے سامنے زبان پر آتی چلی گئیں۔ اس نے اپنی اذیتیں بیا... یں، اپنے خوف، اپنی محرومیاں، ہر وہ بات جسے وہ آج تک خود سے بھی پوشیدہ رکھتا چلا آیا تھا۔

''مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے مونا! ان پانچ دنوں میں ایک سیکنڈ بھی میں تمہیں ... ل نہیں سکا۔''

اس کی آواز جذبات سے رُندھی ہوئی تھی۔ مونا کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت تھی۔ ا... کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔

احمد نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سرخ گلاب کی ادھ کھلی کلی نکالی اور مونا کے ... تے ہوئے ہاتھ میں تھما کر اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ اس نے مونا کے تنفس کو تیز ہوتے ہوئے پایا۔

''سرخ گلاب پیامبر ہیں، سچی محبت کے، میں تم سے''

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے تیزی سے دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر وہ اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگا۔ مونا نے دوسرے کمرے میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ وہ زور، زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

''دروازہ کھولو، مونا! میرے ساتھ ایسا مت کرو، خدا کے لیے دروازہ کھولو۔''

وہ چیخنے لگا۔ جب کافی دیر تک اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور کندھے سے دروازے کو زوردار ضرب لگائی۔ وہ جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ تیسری ضرب سے سال خوردہ دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے دیوار ٹٹول کر لائٹ جلا دی۔

مونا ایک کونے میں دیوار کے ساتھ سمٹ کر بیٹھی تھی۔ اس نے صلیب کو مٹھی میں دبا رکھا تھا اور زیر لب کوئی دعا مانگ رہی تھی۔

تب احمد نے بہت قریب سے تتلی کے پروں کو بھیگتے ہوئے دیکھا تھا۔

جب وہ اپارٹمنٹ سے نکل رہی تھی تو احمد کو لگا جیسے اس کی روح بدن سے کھنچی جا رہی ہو۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ وہ جنوری کی بے حد سرد رات تھی اور یخ بستہ ہوا بدن کو چیرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ لیکن وہ اسے روک نہیں سکتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گی۔



ٹیکسی سے اتر کر وہ ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہی تھی کہ عقب سے گرانٹ کی آواز سنائی دی۔

''میں جیت گیا۔ میں نے کہا تھا پرنیاں کو ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں ہو گی۔'' وہ اس سے مخاطب نہیں تھا۔

پرنیاں نے مڑ کر دیکھا اور یکا یک رات کا رنگ بدل گیا۔ رنگین روشنیوں میں بھیگی ہوئی موی گڑیا آنکھوں کی پتلیوں میں گھس گئی تھی۔

البا نے لباس کے نام پر بھڑکتے سرخ رنگ کی چند پٹیاں بدن پر چپکا رکھی تھیں۔ آج بھی وہ سرخ جوتے پہنے ہوئے تھی جن کے لمبے اسٹریپ سرخ سنپولیوں کی مانند اس کی موی پنڈلیوں کے گرد لپٹے تھے چہرے پر گہرا میک اپ تھا اور اس نے باریک ہونٹوں کو نمایاں بنانے کے لیے پھیلا کر لال لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ اسے شاید سرخ رنگ بہت پسند تھا۔ اس نے گود میں سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی چار، پانچ ماہ کی بچی اٹھا رکھی تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا، اتنے کم عرصے میں تم اسے اتنا زیادہ جاننے لگے ہو۔ مجھے شرط لگانا ہی نہیں چاہیے تھی۔ بہر حال اب ڈنر کا بل تو مجھے ہی ادا کرنا ہوگا۔''

اس کے شکست خوردہ انداز پر گرانٹ نے فاتحانہ قہقہہ بلند کیا تھا۔

پرنیاں نے اپنے اندر ناگواری کی ایک لہر اٹھتی محسوس کی۔ اسے ڈنر کے لیے بلاتے ہوئے گرانٹ نے بالکل بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ البا بھی آنے والی تھی۔

''البا کو دیکھ کر تمہیں بہت برا لگا ہوگا۔'' گرانٹ نے گویا اس کے دل کی بات بوجھ لی تھی۔

''نہیں مجھے کیوں برا لگے گا۔''

''میں نے اسے بہت سمجھایا کہ ہمارے ڈنر کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ اس میں دو سے زیادہ لوگ شریک ہو ہی نہیں سکتے ،لیکن یہ کسی طرح جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یہ میرا پیچھا کرتی ہے۔ تم کرتی ہو نا البا۔''

گرانٹ نے اپنے پہلو میں چلتی البا کے رنگے ہوئے بالوں کی ایک لٹ پکڑ کر ہولے سے کھینچی۔

''ہاں میں کرتی ہوں، میں مجبور ہوں۔''

اس نے بے ساختہ ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔

پرنیاں نے ریستوران کے داخلی دروازے کی طرف بڑھتے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی تھی۔ اس نے گرانٹ کے لیے تیار ہونے میں کتنا وقت صرف کیا تھا۔ سرِ شام ہی وہ آئینے کے سامنے جم گئی تھی۔ لباس اور جوتوں کے انتخاب میں کم و بیش دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ تمام وقت وہ سوچتی رہی تھی کہ گرانٹ اسے سراہے گا تو جواب میں کیا کہے گی۔ وہ ذہن میں تمام تفصیلات کو ترتیب دیتی رہی تھی۔ لیکن البا جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر پرنیاں کی طبیعت سخت مکدر ہو گئی تھی اور اس کا جی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ انتظار کر رہے تھے کہ گرانٹ کسی شناسا چہرے کو دیکھ کر اس سے ملنے چلا گیا۔ چند لمحے ان کے درمیان خاموشی سے بیت گئے، پھر پرنیاں نے سکوت کو توڑنے میں پہل کی تھی۔ اس نے البا کی گود میں بیٹھی بچی کا گال ہاتھ سے چھوا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکاتے ہوئے بولی۔

''بہت پیاری بچی ہے۔ لیکن اس کی صورت تم سے بہت کم ملتی ہے۔''

''یہ بات مجھے اور لوگوں نے بھی بتائی ہے۔ صوفیہ کے زیادہ تر نقوش اپنے باپ پر ہیں۔''

البا کی اٹکتی، لڑھکتی ہسپانوی گزیدہ انگلش سن کر کوفت ہوتی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ مخاطب کو زچ کرنے کے لیے جان بوجھ کر ایسے بول رہی ہو۔

''صوفیہ کا باپ کیا کرتا ہے؟''

''میری طرح اسے بھی اداکاری کا جنون ہے۔''

پرنیاں کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ خاموش ہو کر گرانٹ کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

صوفیہ کسمسا کر رو پڑی تو البا اسے چپ کروانے کے لیے بازوؤں میں جھلانے لگی۔

"No Llores mi nino"

وہ شاید ہسپانوی میں اسے بہلا رہی تھی، پھر اس نے صوفیہ کی ننھی سی انگلی تھام کر پرنیاں کی طرف اشارہ کیا اور اس کا گال چومتے ہوئے بولی۔

Ella es una perra

اس نے ایک ہی لفظ کی تکرار کی تھی۔

"'Perra! Perra!! Perra!!!"

پھر وہ پرنیاں سے مخاطب ہوئی۔

"تم نے صوفیہ کے باپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ بھی اسی جگہ موجود ہے۔ تم ملنا نہیں چاہو گی۔"

"کیوں نہیں۔"

وہ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

"وہ دیکھو۔" پرنیاں نے اس کی اٹھی ہوئی انگلی کا تعاقب کیا تو اس کی نظر اس میز پر ٹھہری جہاں گرانٹ ایک ادھیڑ عمر ہسپانوی مرد کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"تمہارا شوہر تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے۔ کیا تم دونوں کے بیچ کوئی ناراضی ہے۔" اس نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

"وہ میرے ساتھ ہی ہے اور وہ میرا شوہر نہیں ہے۔ ہم نے ابھی شادی نہیں کی۔ دراصل گرانٹ پہلے اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہے۔"

اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"تم نے ابھی کیا کہا؟ گرانٹ کا اس بات سے کیا تعلق ہے۔"

"اوہ! کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں، گرانٹ ہی صوفیہ کا باپ ہے۔" البا نے اس پر انگارے اچھالے تھے۔

وہ سوکھی لکڑی کی طرح چٹخنے لگی۔ اپنی آواز ڈھونڈنے میں اسے زمانے بیت گئے۔

"تم خوش قسمت ہو البا۔"

گلے میں بے شمار آنسو اٹکے تھے۔

گرانٹ واپس آ گیا تھا۔ اس کے بیٹھنے سے قبل پرنیاں کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے گرانٹ! میں گھر جا رہی ہوں۔"

لاکھ جتنوں سے وہ خود کو دھاڑیں مار کر رونے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ وہ رخ پھیر کر چل پڑی تو گرانٹ تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔

"اچانک کیا ہو گیا ہے پرنیاں! ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔"

اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور بغیر رکے بولی۔

"میں مزید رک نہیں سکتی، تم مجھے مجبور نہ کرو۔"

دفعتاً اسے البا کا بلند قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے گردن موڑ کر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھا تھا۔ اس کے کوکنار ہونٹ اتنے کھلے ہوئے تھے کہ گلابی مسوڑھے وضاحت سے نظر آ رہے تھے اور پرنیاں کو لگا کہ ہنستے ہنستے اس کا دم

نکل جائے گا۔

''اس کا چہرہ دیکھو ذرا۔'' اس کے منہ سے پھنسی ہوئی سی آواز نکلی۔ ''یہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔'' اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔

''یہ کیا معاملہ ہے البا! تم نے اس سے کیا کہا ہے؟''

گرانٹ کی آواز جھنجلائی ہوئی تھی۔

''میں نے کہا، میں نے اس سے کہا کہ...... صوفیہ...... صوفیہ تمہاری بیٹی ہے۔'' اس نے ہنسی کے دوران بمشکل بتایا تھا۔

''تو یہ بات ہے۔'' گرانٹ کے حلق سے اطمینان بھرا سانس نکلا۔ ''اپنی بے ہودہ حس مزاح سب پر نہ آزمایا کرو۔ پرنیاں بہت حساس ہے۔''

وہ اسے کندھوں سے تھام کر دوبارہ میز کی طرف لے جانے لگا۔

''تو وہ مذاق کر رہی تھی۔'' اس کا تھما ہوا دل پھر سے دھڑکنے لگا۔

''صوفیہ، البا کی بھانجی ہے۔ اس کے ماں باپ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ تب سے صوفیہ اس کے پاس ہے۔''

گرانٹ اسے تفصیل بتانے لگا تھا۔ اس نے ایک نظر البا کو دیکھا۔ وہ ایک خالی گلاس کے کناروں کو اپنے رنگے ہوئے ہونٹوں سے دھیرے دھیرے چھو رہی تھی اور گلاس کی گگر پر سرخ غبار چھا رہا تھا۔ اس نے تاسف کا اظہار کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا، لیکن آواز نے ساتھ نہ دیا۔ اب سے کچھ دیر پہلے تک اس کا خیال تھا کہ البا اسے ناپسند تھی، لیکن اب اس کی سوچ بدل چکی تھی۔ وہ البا کو ناپسند نہیں کرتی تھی، اس سے نفرت کرتی تھی۔

ان کی میز پر کھانا سرو کر دیا گیا تو وہ جیسے تیسے نوالے نگلنے لگی۔ وہ جلد از جلد اس مرحلے سے سبکدوش ہو کر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ چچا اور چاچی اپنے کسی جاننے والے کے ہاں رات کے کھانے پر مدعو تھے اور ان کی واپسی رات گئے متوقع تھی۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی ہرگز نہیں تھی۔ لیکن البا کی موجودگی اور اس کی ہرزہ سرائیاں اس کے صبر کی آزمائش بن گئی تھیں۔

''میں گرانٹ کی زندگی میں بہت اہم ہوں۔ مجھ سے ملنے کے بعد ہی اسے اپنا پہلا کردار ملا۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں نا گرانٹ؟''

اس نے البا کی بات کا جواب نہ دیا اور قریب سے گزرتی ایک ویٹرس کو اشارے سے پاس بلا لیا۔ کرسی سے اٹھتے ہوئے گرانٹ نے اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ جواباً اس نے مسکرا کر البا اور پرنیاں کو دیکھا اور سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ اسے رخصت ہوئے چند ہی لمحے بیتے ہوں گے کہ وہ مختصر ڈائننگ ہال تیز موسیقی سے گونجنے لگا۔ گیت کسی اجنبی زبان میں تھا اور اس کی دھن بے حد شوخ تھی۔ شاید گرانٹ نے ویٹرس کو وہ گیت لگانے کے لیے ہی کہا تھا، کیونکہ جونہی گیت شروع ہوا وہ پُر جوش انداز میں کھڑا ہو گیا اور پرنیاں کے سامنے آتے ہوئے ایک گھٹنا زمین پر جما کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ کمر کے پیچھے لپیٹ کر دوسرا ہاتھ اس نے پرنیاں کے سامنے پھیلا دیا تھا۔

''مادموزیل! (فرانسیسی طرز تخاطب) کیا، مجھے تمہارے ساتھ رقص کرنے کا اعزاز مل سکتا ہے۔''

اس نے گردن کو ذرا سا خم دیتے ہوئے نہایت مؤدب لہجے میں درخواست کی۔ اس اچانک افتاد نے پرنیاں کے ہوش گم کر دیے تھے۔ ریستوران کا کچھ عملہ اور قریبی میزوں پر بیٹھے ہوئے چند لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

اسے رقص کرنا بالکل نہیں آتا تھا اور اگر آتا بھی تو اس مجمعے کے سامنے ایسی جرأت کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو گرانٹ! خدا کے لیے اٹھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں رقص نہیں کر سکتی۔''

اس نے تھوک سے حلق تر کرتے ہوئے التجا کی تھی۔ آئینہ دیکھے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ بدن کا تمام خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''میرا دل نہ توڑ و مغرور حسینہ، میرا ہاتھ نہ جھٹکو، تمہاری سنگدلی میری جان لے لے گی۔''

گرانٹ نے سینے پر بائیں طرف ہاتھ دھر کے آہ بھری تھی۔

اسے خدشہ تھا کہ گرانٹ اسے زبردستی کھینچ کر اٹھا دے گا اور اس تصور سے ہی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ پھر یہ مسئلہ خود بخود ہی حل ہو گیا۔

کہیں سے لمبے سرخ ناخنوں سے سجا ایک زرد مولی ہاتھ گرانٹ کے ہاتھ میں آ گیا اور ہسپانوی لہجہ سنائی دیا۔

''وہ بہت شرمیلی ہے، اسے مجبور نہ کرو۔ تم بھول رہے ہو کہ وہ پاکستان سے آئی ہے۔ وہاں کی ثقافت مختلف ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لیے صوفیہ کو سنبھالو۔''

آخری فقرہ اسے مخاطب کر کے کہا گیا تھا۔

روتی ہوئی صوفیہ کو گود میں بٹھائے وہ البا اور گرانٹ کو رقص کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اردگرد کی میزوں پر بیٹھے لوگ تالیاں بجا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ البا کی بانہیں گرانٹ کے شانوں پر تھیں اور گرانٹ کی ہاتھ البا کی عریاں کمر پر دھرے تھے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، وہ میزوں کے درمیانی خلا میں راج ہنسوں کی مانند تیر رہے تھے۔

صوفیہ گلا پھاڑ کر چلا رہی تھی لیکن وہ جیسے بہری ہو گئی تھی۔

ساری فضا سرخ رنگ سے اٹی ہوئی تھی۔ سرخ بال، سرخ ہونٹ، سرخ پیراہن، سرخ جوتے۔ ہر سو سرخ چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اس ایک رنگ کے سوا کوئی رنگ نظر نہ آتا تھا۔

اب وہ گرانٹ کی بانہیں تھام کر اپنے کولہے تھرکا رہی تھی۔

لال جوتوں کی نوکیلی ایڑیاں فرش پر گرتیں اور اچھلتیں۔ پہلے دائیں ٹک، ٹک، پھر بائیں ٹک ٹک، آگے اور پیچھے، اس کی پنڈلیوں سے چمٹے سرخ سنپولیے پرنیاں کی گردن کے گرد کنڈلی مارنے لگے۔ اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

صوفیہ چلائے جاتی تھی۔ مگر آوازوں کے ہجوم میں اس کی آواز کی حیثیت ہی کیا تھی۔ پھر اس نے البا کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ اس کا توازن بگڑا، لیکن اس کے گرنے سے قبل گرانٹ نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا تھا، وہ کراہ رہی تھی۔

''جوتے کی ہیل ٹوٹ گئی ہے۔ بہت برا ہوا، یہ میرے پسندیدہ جوتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، مرمت کروا لینا۔'' گرانٹ نے اسے تسلی دی تھی۔

ریستوران سے نکلتے وقت اسے گرانٹ کی گردن پر چپکی ہوئی گوکنار کی دو پتیاں دکھائی دی تھیں۔

پرنیاں کو ٹیکسی میں بٹھا کر وہ الوداعی کلمات کہہ رہا تھا کہ کچھ خیال آنے پر وہ پوچھنے لگی۔

''گرانٹ! ہسپانوی لفظ Perra کا کیا معنی ہے؟''

''مجھے تو معلوم نہیں۔ البا ہی بتا سکتی ہے، ویسے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' البا نے کھڑکی سے اندر جھانکا اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے سرد آگ کے شرارے پھوٹتے تھے۔

''تم نے یہ برا لفظ کہاں سن لیا؟''

یک لخظہ پرنیاں کا تنفس تیز ہو گیا۔ ''Perra کا مطلب کیا ہے البا؟''

''اس کا مطلب؟'' کوکنار کی لہو رنگ پتیاں ذرا سا کھنچ گئیں۔ ''اس کا مطلب ہے.....کتیا۔''

✠ ✠ ✠

وہ ایک پرچھائیں تھی، جو بستر کی سلوٹوں سے چپکی تھی۔ ابراہیم کی کوئی شباہت اس میں ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔ اس کے بدن کا گوشت دھیرے دھیرے ہڈیوں سے جُدا ہو رہا تھا۔ وہ قطرہ قطرہ مرتا تھا، پر جان نہ نکلتی تھی۔ زندگی اس کے اندر کسی کونے کھدرے میں پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔

''آپ نے بہت گناہ کیے ہیں بابا اور اللہ آپ کو ان سارے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ مجھے آپ کی بے بسی دیکھ کر بہت برا لگتا ہے۔''

احمد نے اس کا استخوانی سر اپنی ران پر رکھا تو اس کی غیر فطری حد تک کھلی ہوئی آنکھوں میں سراسیمگی چھا گئی۔ کچھ عرصے سے وہ جب بھی احمد کو اپنے آس پاس دیکھتا تھا، ایسے ہی خوف زدہ نظر آنے لگتا تھا۔

''میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں، ڈریں مت بابا۔''

وہ اس کے چہرے پر جھکا تو ابراہیم کے حلق سے گونگی کراہٹیں نکلنے لگیں۔

''چپ ہو جائیں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

اس نے وہ بجھی ہوئی راکھ جیسی سرد آنکھیں چوم لیں۔ پھر وہ اسے بستر پر لٹا کر ٹوائلٹ میں چلا آیا۔ وضو کے دوران وہ مسلسل اپنے ہاتھوں کو کانپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سر کا مسح کرتے ہوئے اسے اپنی کنپٹی کے پاس غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی رگ نظر آئی۔ اس نے انگلی سے اسے چھوا تھا۔ وہ ایسے دھڑکتی تھی جیسے ابھی پھٹ جائے گی۔ اس کا حلق خشک تھا اور اس میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ ابراہیم کے بستر کی طرف جاتے ہوئے وہ کسی اپاہج کی طرح ڈولتا رہا تھا۔

قریب پہنچنے پر اس نے لرزتے ہاتھوں سے تکیہ اٹھایا اور آنکھیں سختی سے میچ کر تکیے سے ابراہیم کے چہرے کو ڈھانپ دیا پھر وہ تکیے کے اوپر بیٹھ گیا اور گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ ابراہیم کے جسم کی ٹھنڈک اسے اپنی ہڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اب اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

''اللہ میرے بابا کی جان جلدی نکل جائے تُو ان کی تکلیف کو کم کر دے۔ ان کی روح آسانی سے جسم کو چھوڑ دے، انہیں درد نہ ہو۔''

اس نے اونچی آواز میں تسمیہ پڑھا۔

''یٰسٓ o وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ o''

وہ روتے ہوئے سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے لگا۔ وہ ابراہیم نے اسے ایسے ہی وقت کے لیے یاد کروائی تھی۔ گردن کی رگوں میں تناؤ کے باعث اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ وہ پڑھتا رہا اور کانپتا رہا۔

''فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ o''

آخری آیت تک پہنچتے پہنچتے اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔ تکیہ ہٹا کر اس نے ابراہیم کے ٹھنڈے گال پر چہرہ رکھ دیا اور اس کے ساتھ لپٹ کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے پانی کی پتلی لکیریں پھسل رہی تھیں۔

ابراہیم کی بُو کے ساتھ ایک اور بو بھی اس کے نتھنوں میں گھستی تھی اور وہ موت کی بو تھی۔

✠ ✠ ✠

برف کے نرم گالے یوں آسمان سے اترتے تھے جیسے راج ہنسوں کے کسی غول نے اپنے پر گرا دیے ہوں۔ برف کی سفید خوشبو ایک ٹھنڈا سیال بن کر بدن میں گھلی جاتی تھی۔ وہ صبح اتنی سفید تھی کہ اسے اپنا آپ میلا لگنے لگا تھا۔

بھربھری برف پر چلتے ہوئے اس کے دائیں پاؤں کی موٹی اونی جراب لحہ بہ لحہ بھیگتی جا رہی تھی اور پیر کی انگلیاں لکڑی کی مانند سخت ہوگئی تھیں پھٹی جوتی کے اگلے سرے میں ننھا سا چھید نمی کو اندر آنے کی راہ دے رہا تھا۔ اس کا لباس شکن زدہ اور بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرے اور ہاتھوں پر خشکی کے چھلکوں سے اکڑن پیدا ہو گئی تھی۔ ناخنوں میں میل جما تھا۔ اسے یاد نہیں تھا، نہائے ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا تھا۔ پچھلے چند روز ایسی مصروفیت میں گزرے تھے کہ اسے خود پر دھیان دینے کا وقت ہی میسر نہیں آ سکا تھا۔ اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ کم از کم لباس تو تبدیل کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں تھا کہ چند لمحوں کی تاخیر بھی برداشت کر پاتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ پلکوں کی ایک جنبش سے بھی پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

''سب بدلنے والا ہے۔ یہ سب بدل جائے گا۔''

اس نے خود کو یقین دلایا، وہ لباس، وہ جوتے، اس کا نصیب، ہر شے تبدیل ہونے والی تھی۔ ہر اٹھتا قدم اسے دکھ اور محرومی سے دور لے جا رہا تھا۔

زندہ آنکھوں والا مردہ ابراہیم، گٹر کی سڑاند سے ابلتا ہوا اپارٹمنٹ، سیلن زدہ بک شاپ، سسکتے ہوئے روز و شب، سب ماضی کی داستانوں میں ڈھل رہے تھے۔ وہ انہیں پیچھے چھوڑ آیا تھا، بہت پیچھے۔

''جنوبی کیلی فورنیا میں برف باری نہیں ہوتی۔'' بالوں میں اٹکے برف کے گالوں کو جھاڑتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

''میں برف کی کمی محسوس کیا کروں گا اور، مونا۔'' اس کے تصور میں ایک عکس مرتسم ہونے لگا۔ بے ڈھنگ ملبوس، سر پہ بدرنگ اسکارف، نیلی آنکھیں، ناک کی پھننگ پر سرخ دھبہ، گالوں سے چپکی ہوئی بھوری تتلی۔

''تم مجھے سسٹر کیوں کہہ رہے ہو؟''

اس کے دل سے ایک ٹیس اٹھی اور سارے بدن میں پھیل گئی۔ ابراہیم کی آخری رسومات کے دوران جتنی بار بھی فادر الیگزینڈر سے سامنا ہوا تھا، اس نے مونا کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا، لیکن ہمت نہیں پڑی تھی۔

برف دبے قدموں دھرتی پر اترتی تھی۔ بنا کوئی آہٹ کیے، بلی کے پنجوں والی برف اس کی بے خبری میں اسے چھو رہی تھی۔

اس کی سوچیں بے وزن گالوں کی طرح ہوا میں بکھر گئیں، جب ایک پولیس کار اس کے نزدیک آ کر رکی تھی۔ دو باوردی پولیس آفیسرز دونوں اطراف کے دروازوں سے اتر کر تیزی سے اس کے دائیں بائیں پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھ چوکنے انداز میں ہولسٹروں پر جمے تھے۔

اس کا دل کسی اندھی کھائی میں ڈوب گیا۔

کیا وہ حقیقت جان گئے تھے، لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ اس نے ڈاکٹر کا مہربان چہرہ یاد کیا، جس نے ابراہیم کی طبعی موت کی تصدیق کی تھی، اور اس کے الفاظ، وہ اپنے ذہن میں ایک ایک لفظ کو دہرانے لگا۔

''یہ تم دونوں کے حق میں اچھا ہوا۔ اس سے بچھڑنے کا دکھ چاہے ناقابل مداوا ہو لیکن تمہیں یہ سوچ کر صبر کرنا چاہیے کہ جس ہولناک عذاب میں وہ مبتلا تھا اس کا اختتام موت ہی کر سکتی تھی۔''

پھر وہ کیوں آئے تھے؟

کوئی اس کے سر میں ہتھوڑے برسا رہا تھا۔
''احمد ابراہیم! تم شاید کہیں جا رہے تھے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ ممکن نہیں، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''
ان میں سے ایک نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک چل رہا تھا۔
''میں نہیں جا سکتا، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے سہمی ہوئی سرگوشی کی۔
''کار میں بیٹھ جاؤ۔''
اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سرد بدنوں والے کینچوے سرکنے لگے۔ اس نے پلٹ کر ان سے دور ہونا چاہا، لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ اس کے دونوں بازو ان کی مضبوط گرفت میں تھے۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ دائیں پاؤں کا پنجہ جیسے کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ وہ یخ بستہ گیلی زمین پر بیٹھ گیا۔
''مجھے جانے دو، خدا کے لیے مجھے نہ روکو۔''
وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کار کی طرف لے جانے لگے۔ وہ برف سے بھرے خلا میں گھورتے ہوئے چیخ رہا تھا۔
''میں جانا چاہتا ہوں، مجھے آزاد کر دو، مجھے جانے دو۔''
سرخ قالین اسے پکار رہے تھے۔
بیورلے ہلز ہوٹل کے ڈرائیو وے پر لگے ہوئے پام کے درخت جھکے چلے آتے تھے۔
اور مارلن منرو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکاتی تھی۔ ''کیا تم نہیں جانتے Diamonds are a girls best friend''



آئینہ اسے جو عکس دکھا رہا تھا، وہ مایوس کر دینے والا تھا۔ وہ مضحکہ خیز ملبوس کسی طور اس قابل نہ تھا کہ اسے پروم نائٹ کے موقع پر پہنا جائے۔ بہت سی رنگ برنگی کترنوں کو بے ہنگم انداز میں جوڑ کر تخلیق کیا گیا پہناوا نہ تو گاؤن کہلا سکتا تھا اور نہ میکسی۔ ان میں ہلکے سنہری سے گہرے بنفشی تک تمام رنگ موجود تھے اور یہ تعین کرنے میں اسے تقریباً دس منٹ لگے تھے کہ اسے کس رخ سے پہنا جائے۔ اس ''کاسٹیوم'' کے بارے میں البا ہمیشہ بڑے فخر سے بتایا کرتی تھی کہ وہ اس نے خود ڈیزائن کیا تھا اور جب وہ مارلن برانڈو کی طرف سے منعقدہ ایک تقریب میں دیگر جونیئر اداکاروں کے ساتھ شریک ہوئی تھی تو اس نے یہی لباس پہن رکھا تھا اور برانڈو نے خاص طور پر اس لباس کی تعریف کی تھی اور اسے دلربا کہہ کر اپنے سنگ رقص کی دعوت بھی دی تھی۔ جس پر اس نے نہایت شائستگی کے ساتھ معذرت کر لی تھی۔ متجسس سامع جب اس کے انکار کی وجہ دریافت کرتا تو وہ بے نیازی سے کہتی۔ ''اس روز دراصل میرا ہیر اسٹائل کچھ اس نوعیت کا تھا کہ اس تیز دھن پر رقص کرنے سے وہ بگڑ سکتا تھا۔''
صوفیہ اس واقعہ کی سچائی کے بارے میں ہمیشہ مشکوک رہی تھی۔ اول تو مارلن برانڈو جیسے مشہور اداکار کی کسی تقریب میں البا کی شرکت ہی بعید از قیاس تھی اور دوسرے البا سے بڑھ کر جھوٹے کسی شخص سے اس کی تمام زندگی ملاقات نہ ہوئی تھی۔
اس نے ایک طویل سرد سانس خارج کرتے ہوئے اپنے عکس سے نظریں ہٹائی تھیں۔ ٹوائلٹ کی طرف جاتے ہوئے اس کی نگاہ کھڑکی کی سمت اٹھی تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ میبل نے کھڑکی سے ہٹنے میں خاصی پھرتی دکھائی تھی۔ لیکن وہ اس کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی۔ وہ تیزی سے کھڑکی کے پاس پہنچی اور شیشہ اوپر دھکیل کر پکارنے لگی۔
''میبل! ادھر آؤ، ڈرومت۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔'' مسز برگنز امیگ گریگور کے لان میں لگی باڑھ کے پیچھے اکڑوں

بیٹھا ہوا میبل اسے فوری دکھائی دے گیا تھا۔ وہ دیوزادتھا اور وہ نانے قد کی باڑ ھ اسے پوشیدہ رکھنے سے قاصر تھی۔

''یہاں آؤ، میں تمہیں دیکھ چکی ہوں۔اب چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

اس نے باڑھ کی اوٹ سے لجائی ہوئی نظروں سے صوفیہ کو دیکھا اور بیسا کھی سنبھالتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ اس کے قریب آتے ہوئے میبل کی آنکھیں مسلسل جھکی رہی تھیں۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر صوفیہ کو ہمیشہ کلیسا نوٹرے ڈیم کا کبڑا یاد آ جاتا تھا۔ حالانکہ وکٹر ہیوگو کا Quasimodo سیاہ فام نہیں تھا اور میبل کبڑا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی ہر دفعہ میبل کو دیکھنے پر اس کے تصور میں وہ کردار ضرور لہراتا تھا۔

''تم مجھے چھپ چھپ کر کیوں دیکھ رہے تھے؟ پہلے بھی دیکھتے ہو کیا؟'' اس کے سیاہ چہرے پر ایک جھینپی سی مسکراہٹ ابھری۔

''یہ اچھا ہے، بہت اچھا ہے۔''

''کیا اچھا ہے؟''

''یہ لباس مجھے پسند ہے، بہت خوبصورت ہے۔''

اس نے انگلی سے صوفیہ کے ملبوس کو چھوا۔

''نہیں میبل!'' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔''تم کچھ نہیں جانتے۔ یہ لباس شرمناک ہے۔اگر میں اسے پہن کر پروم نائٹ میں گئی تو سمجھو میں، بس یوں سمجھو کہ میں تباہ ہو جاؤں گی۔''

اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ وہ لباس کے دامن سے لٹکتی چمکیلی سبز پٹی کو انگلی پر لپیٹنے میں مشغول تھا۔

''میرے پاس کوئی ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں اور آج شام تک کا وقت باقی ہے۔رقم بھی نہیں ہے اور میں سنڈریلا بھی نہیں ہوں جو مشکل میں ہوتی ہے تو Fairy godmother آن پہنچتی ہے اور جادو کی چھڑی سے اس کے چیتھڑوں کو شاہانہ پیراہن میں بدل ڈالتی ہے۔''

میبل اب ایک بھوری کترن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

''یہ مجھے دے دو۔''

اس نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ وہ بمشکل سن پائی۔

''یہ کاسٹیوم تمہیں چاہیے؟ تم اس کا کیا کرو گے؟'' وہ متحیر ہوئی۔

''sis (بہن) کے لیے۔ وہ اگلے سال اپنی پروم نائٹ میں پہنے گی۔''

وہ خاصی دیر خاموشی سے اسے گھورتی رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی چیزیں مانگا کرتا تھا، جن کی اسے قطعاً ضرورت نہ تھی۔ صوفیہ جانتی تھی اس کی ایک ہی بہن تھی اور وہ اس لباس کو پہننے کے قابل ہرگز نہیں تھی۔ وجہ صرف اتنی سی تھی کہ اسے مرے ہوئے کئی برس بیت چکے تھے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اسے پسند کرے گی۔''

''وہ بڑے شد و مد سے سر اثبات میں ہلانے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ مڑ کر ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے وہ لباس لا کر میبل کے ہاتھ میں تھما دیا، جس کا گولہ سا بنا کر بغل میں دبانے کے بعد وہ یوں قہقہے لگانے لگا تھا، جیسے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے اسے ہنستے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

''تم اچھی ہو۔خدا تم سے خوش ہوا ہے۔''

صوفیہ کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوئے۔معاً وہ اپنی جگہ سے آگے آئی اور کھڑکی میں سے بازو لمبا کر کے میبل کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا فٹ پاتھ پر ڈھیر ہو گیا اس کی بیساکھی اور وہ لباس دونوں مخالف سمتوں میں گرے تھے۔خاصی تگ و دو کے بعد وہ دونوں اشیاء کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکا تھا۔اس کی گدلی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو پھسل کر گالوں پر گر رہے تھے۔

''یہ میں نے خدا کو ناراض کرنے کے لیے کیا ہے۔کیونکہ میں اسے خوش نہیں کرنا چاہتی۔''

صوفیہ نے ایک دھماکے سے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا تھا۔

کاؤچ پر لیٹ کر وہ ان تمام ممکنہ راستوں پر غور کرنے لگی، جو اسے ایک عمدہ پروم ڈریس تک پہنچا سکتے تھے لیکن بہت دیر مغز ماری کرنے کے بعد بھی اسے اس کے سوا کچھ نہ سوجھا تھا کہ وہ کارل میکارتھی سے بات کرے۔پوری دنیا میں خود اس کے علاوہ وہ واحد فرد تھا، جسے اس بات کی فکر ہو سکتی تھی کہ آج کی رات صوفیہ اچھی نظر آئے۔

اسے خبر تھی کہ کارل نے بہ امر مجبوری اسے پروم نائٹ میں آنے کی دعوت دی تھی۔اس کی چہیتی گرل فرینڈ نے ایک میکسیکن لڑکے کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا اور پچھلے دو ماہ سے وہ جس اطالوی لڑکی سے پینگیں بڑھا رہا تھا اس کے رخساروں پر اچانک پمپلز نکل آئے تھے اور وہ پروم نائٹ میں آنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہو رہی تھی۔ایسی صورت حال میں کارل میکارتھی کے پاس صوفیہ سے رجوع کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔کئی ماہ پہلے پروجیکشن روم میں ہونے والی ملاقات کے بعد ان دونوں کے درمیان کبھی بات چیت نہ ہوئی تھی اور سامنا ہونے پر وہ اجنبیوں کی طرح گزر جایا کرتے تھے۔جب کیفے ٹیریا میں وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھا تو بہت الجھا ہوا لگتا تھا اور بات کرتے ہوئے ہکلا رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں پروم نائٹ میں تم میری 'ڈیٹ' ہو۔''

اس کے تاثرات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اسے راضی کرنے کے لیے موزوں الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھا کہ صوفیہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''میں ضرور چلوں گی۔صرف سو bucks اور ڈنر تمہارے ذمے ہوگا۔میں جانتی ہوں تم ضرور مان جاؤ گے۔میں تمہاری آخری امید ہوں۔''

اور کارل بے حد توہین محسوس کرنے کے باوجود یہ کڑوا گھونٹ بھرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

''یہ ایک سو bucks تمہارے ساتھ ڈنر کرنے اور رقص کرنے کی قیمت ہے اس کے سوا اگر تم کچھ چاہو تو......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کارل کوئی جواب دیئے بنا دانت پیستا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ اس اعزاز کے لیے تم نے مجھے چنا۔''

وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

سیل فون پر کارل کی آواز سنتے ہی اس نے بنا کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔

''تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ بات تو ہمارے درمیان طے نہیں پائی تھی کہ تمہیں لباس بھی میں ہی دلاؤں گا۔'' وہ طیش سے مغلوب آواز میں بولا۔

''لیکن اگر میں کوئی گھٹیا لباس پہن کر تمہارے ساتھ جاؤں گی تو بے عزتی تمہاری ہوگی۔مجھے تو کوئی جانتا تک نہیں۔سب

یہی کہیں گے کہ کارل کی 'ڈیٹ' کسی کوڑے کے ڈرم سے نکل کر آئی ہے کیونکہ میرے پاس جتنے بھی لباس موجود ہیں، ان کو دیکھ کر اس سے بہتر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''اس کا انتظام کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ میں تمہیں سو bucks سے ایک ڈائم زیادہ نہیں دوں گا۔ تم مجھے اس طرح سے بلیک میل نہیں کر سکتیں۔''

''تم سمجھے نہیں۔ میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ وہ سو bucks تم مجھے ابھی دے دو۔''

''لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اگر رقم لینے کے بعد تم اپنی بات سے پھر گئیں اور عین وقت پر میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو......''

صوفیہ نے رابطہ منقطع کر دیا اور کارل کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا وہ ضرور آئے گا کیونکہ ڈیٹ کے بغیر پروم پارٹی میں جانے سے بدرجہا بہتر تھا کہ وہ نہ جاتا۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دروازے پر موجود تھا۔ اس نے چند نوٹ والٹ سے نکال کر صوفیہ کے ہاتھ میں تھمانے کے بجائے اس کے منہ کی طرف اچھال دیئے تھے۔

''مجھے تمہارا انداز پسند آیا۔ یہ ذرا ہٹ کے ہے۔''

ایک لحہ توقف کیے بغیر وہ فرش پر گرے ہوئے نوٹوں کو اٹھانے لگی۔

''یہ سو نہیں ہیں۔ ایک سو پچاس ہیں۔''

''اس فیاضی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟'' اس نے متعجب ہو کر کہا۔

''Neustro Pueblo (وائس ٹاور) سے محض چند بلاک کے فاصلے پر میرا دوست آرنلڈ ایک بہت خوبصورت اور آرام دہ فلیٹ میں رہتا ہے۔ اس کے گھر والے ایک شادی میں شریک ہونے Half Moon Bay گئے ہوئے ہیں اور پرسوں شام سے پہلے ان کے لوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ......''

اس نے چند لمحے خاموشی اختیار کر کے صوفیہ کے چہرے پر متبسم نگاہیں جمائیں۔

''ہم ڈانس میں شامل ہونے کے بعد کچھ وقت وہاں پر گزاریں گے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''لیکن میں پوری رات باہر نہیں گزار سکتی۔ گرانٹ کے گھر آنے سے پہلے مجھے ہر صورت واپس آنا ہوگا۔''

''تو ٹھیک ہے پچاس مجھے لوٹا دو۔''

اس نے ہتھیلی صوفیہ کے سامنے پھیلا دی۔

''وہ بارہ بجے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔''

اس نے تمام نوٹ جینز کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا تھا۔

کارل کے جاتے ہی اس نے کسی تاخیر کے بغیر مبل کو ہمراہ لیا اور مارکیٹ روانہ ہوگئی۔ بہت سی شاپس پر بھٹکنے کے بعد اس کی نظر انتخاب جس ایمرانڈ ڈسیاہ لباس پر ٹھہری تھی، اس کی قیمت ایک سو ستاسی ڈالر تھی۔ جو ولولہ گھر سے نکلتے ہوئے اس پر چھایا ہوا تھا، وہ یکدم مفقود ہوگیا۔ وہ بے دلی سے باقی ملبوسات کو پرکھنے لگی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے سمجھوتہ کرنا تھا۔ جب وہ من پسند لباس نہیں خرید سکتی تھی تو باقی سب لباس اس کے لیے ایک جیسے تھے۔

اس نے سیلز بوائے کو متوجہ کیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

اس شاپ میں پروم نائٹ کی مناسبت سے جو سب سے کم قیمت لباس ہے وہ دکھاؤ۔''

''میں سمجھ گیا۔'' سیلز بوائے نے تفہیمی انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ ''وہ اسی قطار میں دائیں طرف سب سے آخر میں لگا ہے۔''

اس نے قرمزی رنگ کے اسٹریپ لیس پروم گاؤن کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کی قیمت تو پچھتر ڈالر اور ننانوے سینٹ ہے لیکن آپ کے لیے صرف ساٹھ ڈالر میں۔ دراصل اس کے دامن میں پچھلی طرف ایک نہایت معمولی سا چھید ہے۔ پہلی نظر میں تو وہ محسوس تک نہیں ہوتا۔ آپ چاہیں تو اس......''

''اسے پیک کردو۔''

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے میبل کو کہنی سے ٹھوکا دیا تھا۔

''وہ دیکھو۔'' وہ اس وقت جوتوں کی ایک بڑی شاپ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ''میں جب بھی یہاں آتی ہوں، ان جوتوں کو دیکھنے کے لیے ضرور ٹھہرتی ہوں۔''

اس نے شوکیس میں سجے قرمزی رنگ کے جوتے میبل کو دکھائے جو اتنے نفیس تھے کہ کانچ سے بنے معلوم ہوتے تھے۔

''تمہیں اچھے لگتے ہیں؟'' میبل نے اتنی بلند آواز میں پوچھا کہ ایک لمحے کے لیے تو وہ ڈر گئی۔

''ہاں بہت اچھے لگتے ہیں اور میں نے جو گاؤن خریدا ہے، اتفاقاً اس کا رنگ ان سے میل کھاتا ہے۔ اگر میں انہیں حاصل کرسکوں تو میں اتنی خوش ہو جاؤں گی کہ بس میں بیان نہیں کرسکتی۔''

''میرے پاس ایک بہت اچھا منصوبہ ہے۔''

میبل نے آنکھیں چمکائیں۔

''وہ کیا منصوبہ ہے میبل؟''

''تم انہیں خرید لو۔'' اس نے بچوں کی طرح قلقاری ماری صوفیہ نے حسرت بھری نظروں سے آخری بار ان جوتوں کو دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ کیسے میبل کو سمجھاتی کہ وہ انہیں دیکھ تو سکتی تھی مگر چھونے کی جسارت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ Monolo Blahnik'' جوتوں کا جوڑا تھا، جس کی قیمت تین سو ڈالر تھی۔

بس شیلٹر کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ الما کے سرخ جوتوں میں سے کوئی ایک صاف کر کے پہن لے گی۔ گاؤن اور جوتوں کے رنگ میں معمولی سا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

✠ ✠ ✠

شام کو کارل اسے کرائے کی لموزین میں لینے آیا تھا۔ وہ باہر آئی تو اسے دیکھ کر کارل کی آنکھوں میں ستائش کے رنگ اتر آئے تھے۔ قرمزی اسٹریپ لیس گاؤن میں اس کے دودھیا شانے، مرمریں بانہیں، گہرے سرخ جوتوں میں اجلے سپید پاؤں اور سڈول پنڈلیاں، اس سے نظر ہٹانا آسان نہیں تھا کارل کو اعتراف کرنا پڑا۔

''تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ مجھے تمہارے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔''

''مجھے وہ مت بتاؤ، جو میں پہلے سے جانتی ہوں۔ کیا تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نیا نہیں ہے؟''

وہ گاڑی میں اس کی طرف سے قدرے رخ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

کارل نے برا نہیں مانا۔ وہ جلد ہی حساب برابر کرنے والا تھا اور وہ جو بڑے غرور سے کہہ رہی تھی۔ ''میں جانتی ہوں'' وہ کتنی بے خبر تھی۔ بس اسے تھوڑا سا وقت اور انتظار کرنا تھا۔

''میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ میں کیسا لگ رہا ہوں؟''

صوفیہ نے ایک مختصر سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ سیاہ tuxedo (ایک روایتی مردانہ لباس) نے اس کی مردانہ وجاہت کو دوچند کر دیا تھا۔ وہ معمول سے بڑھ کر ''قاتل'' نظر آتا تھا۔

''اس غلط فہمی کو دماغ سے نکال دو کہ میں تمہاری مشہور زمانہ کشش سے مجبور ہو کر تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ معاملات کچھ اور ہیں۔'' وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی تھی۔

کارل نے اپنے اندر مچلتے قہر کو مصلحت کے ہاتھوں سے تھپکا۔ جانے کیا بات تھی کہ وہ معمولی لڑکی جتنی اس کی توہین کرتی تھی، اسی قدر اس پر دسترس حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں جڑ پکڑتی جاتی تھی۔ لیکن اب تو کچھ ہی وقت باقی تھا۔ محض تھوڑا سا وقت۔ اس کے سیل فون پر کال آ رہی تھی۔

دوسری طرف آرنلڈ تھا۔

''میں نے ویڈیو کیمرہ ایسی جگہ پر چھپا دیا ہے کہ وہ اگر ایف بی آئی کی تربیت یافتہ ایجنٹ بھی ہوئی تو بھی اسے شک تک نہیں گزرے گا۔''

وہ اسے تفصیل سے اپنے ''انتظامات'' کے بارے میں سمجھانے لگا تھا، کارل ہوں، ہاں میں جواب دیتا رہا۔ ذرا سی بے احتیاطی سے وہ چوکنی ہو سکتی تھی۔

''اسے جلدی لے آنا۔ تمہیں تو علم ہے، میں رات کو دیر تک جاگنے کا عادی نہیں ہوں۔''

اس کا قہقہہ سنائی دیا تھا۔

کارل کی نظریں صوفیہ کی کمر پر پھسلنے لگیں۔ اس کے دائیں شانے پر ایک چوڑا سا سیاہ تل تھا۔ وہ اسکرین پر کیسی لگے گی؟ کیا کیمرے کی آنکھ بھی اسے اتنا ہی دلکش دکھائے گی جتنی وہ حقیقت میں تھی؟

وہ ایک شوخ دھن پر سیٹی بجانے لگا تھا۔



حکیم بیگم نے یوں اسے، اس اجنبی عورت کے ساتھ روانہ کر دیا تھا، جیسے وہ اتنے سالوں سے اسی انتظار میں ہو۔ اس نے احتجاج کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرے پر پتھریلا پن پھیلا تھا۔ آخر وقت تک عمر نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کا سامان باندھتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑاتی رہی تھی۔

''ویلے توں پہلاں (وقت سے پہلے) آ واکھل گیا۔ میں نئیں جاندی بھانڈا کچا رہ گیا کہ پک گیا پر میں نمانی بے تقصیر۔ مری نیت کھری ربا! میری نیت کھری۔''

وہ لاہور کے ایک قدیم محلے میں دو کمروں اور مختصر صحن پر مشتمل کرائے کے مکان میں بستی تھی اور ایک ہائی اسکول میں جاتی تھی۔ شروع کے چند دن تو عمر کو یہی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا کہہ کر پکارے لیکن پھر محلے داروں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی ''آپا'' کو اپنا لیا تھا۔ ویسے تو ان کے درمیان بات چیت ہی اتنی مختصر اور اس ڈھب سے ہوتی تھی کہ اس سے اپنا رشتہ ظاہر کرنے کے لیے، وہ کوئی بھی لفظ اختیار نہ کرتا تو بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرتے۔ آپا چن کے دروازے کو مخاطب کرتی۔

''دودھ کا گلاس میز پر رکھا ہے۔ آ کر پی لو۔'' وہ اپنی کتاب سے کہتا۔

''ٹیلی ویژن کی آواز آہستہ کردیجئے۔''

آپا بیرونی دروازے کے پردے کو بتاتی۔

''میں اسکول جارہی ہوں۔تمہیں کہیں جانا ہو تو چابی بجلی کے میٹر کے اوپر رکھ دینا۔''

جس کے بارے میں وہ بچپن سے سنتا آیا تھا اور جسے وہ ایک ادھوری کہانی کا پراسرار، ان چھوا اور ان دیکھا کردار سمجھتا تھا۔ جو صرف اس کے تخیل میں بستی تھی اور جس کے تذکرے سے اس کے دل میں میٹھی چبھن سی ہونے لگتی تھی، جب وہ حقیقت کا لبادہ اوڑھ کر اس کے سامنے آئی تھی تو وہ حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس گھر میں آپا کے ساتھ ایک ایک پل گزارنا اس کے لیے نہایت کٹھن تھا۔ اس کا دل کسی پر قینچ پنچھی کی طرح مضطرب رہتا تھا۔ اڑان بھرنے کے لیے بے چین اور صلاحیتِ پرواز سے محروم۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ کس طرح نالہ بئیں کے پار اس آنگن میں پہنچ جائے جہاں انار کا ایک بوٹا تھا، بکائن کا پیڑ تھا، سرکنڈوں کے چھپر تلے بیٹھی ایک بوڑھی بے ہنر عورت گیلی مٹی سے آڑے ٹیڑھے برتن بناتی تھی اور جہاں سے مسجد کا سبز گنبد اور سنہری کلس دکھائی دیتا تھا۔

وہ محض اس آس پر وقت کاٹ رہا تھا کہ چھٹیوں کے اختتام پر سیالکوٹ اپنے ہاسٹل چلا جائے گا تو اس اجنبی ماحول سے چھٹکارا مل جائے گا لیکن یہ امید نابود ہوئی جب آپا نے اسے ہاسٹل سے اپنی کتابیں اور دیگر سامان لانے کی ہدایت کی۔

''لاہور میں بہت اچھے ادارے ہیں۔ تم جہاں چاہو گے میں ایڈمشن لے دوں گی۔''

عمر نے اپنا مدعا بیان کرنے کی بہت کوشش کی، مگر بے سود۔ وہ کیا کہہ کر اسے قائل کرتا۔ اس کے سامنے تو یوں بھی الفاظ ناپید ہونے لگتے تھے۔

ایک رات وہ بلب کی پیلی روشنی تلے کتاب پھیلائے پڑھنے میں منہمک تھا کہ آپا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بدستور سر جھکائے خود کو کتاب میں محو ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مجھے خوشی ہے تمہیں مطالعہ کا شوق ہے، میں تمہارے لیے کچھ کتابیں لائی ہوں، انہیں پڑھنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔''

اس نے چند کتابیں عمر کے سامنے میز پر رکھ دیں۔ اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ سب سے اوپر رکھی کتاب کی سیاہ پوشش پر روپہلے حروف میں ''عہد نامہ قدیم و جدید'' رقم تھا۔

اس کی نظریں پھر سے کھلی ہوئی کتاب کے اوراق پر جم گئیں۔

''ان میں انگلش بائبل بھی ہے اور اردو بھی۔ میں نہیں جانتی تمہاری انگلش اچھی ہے یا نہیں۔ بہر حال جس زبان میں بھی تمہیں سہل لگے۔ اس کے علاوہ دیگر لٹریچر ہے جو تمہیں بائبل کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔''

وہ خاموش رہا اور اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں۔ تمہیں دکھ ہوگا۔ اتنے سالوں ایک عقیدہ تمہارے دل میں راسخ کیا گیا اور اب اچانک، لیکن سچائی کی طرف تو لوٹنا ہی پڑے گا۔ یہ عمل تکلیف دہ تو ہے، لیکن تم راحت محسوس کرو گے، جلد ہی۔''

اس نے جلد ہی پر زور دے کر کہا۔

اب بھی عمر کی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تھا۔ آپا چلی گئی تو اس نے کتاب بند کی۔ اٹھ کر بتی بجھائی اور چارپائی پر لیٹ کر چادر چہرے تک تان لی۔

تقریباً دس روز بعد آپا اس کے کمرے کی صفائی کے لیے آئی تو وہ کتابیں اب تک ویسے ہی پڑی تھیں، جیسے وہ رکھ کر گئی

تھی۔عمر نے انہیں چھوا تک نہیں تھا۔

"تم نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔میں نے کہا تھا،تم ضرور پڑھنا۔"

وہ جھاڑن میز پر پھینکتے ہوئے اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"میں نہیں پڑھ سکتا۔"

"کیوں نہیں؟ کیا حرج ہے؟"

"ایک بار میرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی دوست اور ساتھی عمر فاروقؓ کو بعض اہل کتاب سے ایک کتاب ملی،وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا۔جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا اظہار کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاف صاف دین لے کر آئے ہیں۔میں ہدایت کے لیے ان کتابوں کو نہیں پڑھوں گا۔"

وہ پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔

"میں مانتی ہوں مجھے بہت دیر ہوگئی۔"

"زیادہ نہیں صرف اٹھارہ سال۔"

عمر کا دل کھارے پانی میں بھیگ گیا۔

"اس عورت نے تمہارے اندر زہر بھر دیا ہے،لیکن کیا تم اس قدر متعصب ہو کہ انہیں صرف پڑھنے سے تمہارے ایمان پر آنچ آتی ہے۔روشنی کے لیے نہ سہی موازنے کی خاطر تو پڑھ سکتے ہو۔"

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا،میرے تمام مسائل اور ساری الجھنوں کا حل قرآن پاک میں موجود ہے۔"

آپا کچھ دیر خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔

"تم کرسچن ہو عمر! تمہاری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے۔تم گمراہ ہوگئے ہو۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام زندگی گمراہی میں گزارو گے۔میری زبان میں ایسی فصاحت نہیں کہ تمہیں قائل کر پاؤں۔میں تمہیں فادر آرون سے ملواؤں گی۔وہ بہت نیک آدمی ہیں۔ان سے بات کر کے تمہارے سارے خدشات دور ہو جائیں گے۔تیار رہنا کل اسکول سے واپس آ کر میں تمہیں ان سے ملوانے لے چلوں گی۔"

✠ ✠ ✠

فادر آرون نے اس سے کچھ رسمی سوالات کرنے کے بعد بائبل کے چند اقتباسات سنائے اور یسوع مسیح علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں بتانے لگے۔ان کی آواز میں مٹھاس اور گداز تھا۔وہ نہایت توجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا تھا۔جب کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوئے تو عمر بولا۔

"میں بھی ان کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔آپ سننا چاہیں تو میں بتاؤں فادر۔"

"ضرور کیوں نہیں۔خداوند کے تذکرے سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔"

"قرآن میں بارہا کرائسٹ کا ذکر آتا ہے۔پچیس مقامات پر اللہ نے انہیں نام سے مخاطب کیا ہے۔اس کے علاوہ کلمۃ اللہ،روح اللہ،ابن مریم،رسول اللہ،عبداللہ،نبی،المسیح،یہ سارے نام انہیں قرآن نے دیے ہیں۔"

اس نے سورہ مریم کی آیات تلاوت کیں اور ان کا اردو ترجمہ سنایا۔پھر اس نے فادر آرون کے پُرسوچ چہرے پر نظریں

جمائیں اور دھیمی آواز میں پوچھا۔
''کیا میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی بائبل میں کچھ لکھا ہے؟ اگر ہے تو فادر مجھے وہ سنائیے۔''
وہ ایک ہفتہ فادر آرون سے ملنے آتا رہا اور ایک ہفتے کے بعد فادر آرون نے آپا سے کہا۔
''تم عمر کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔''



ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے کروٹ لے کر وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے اور آپا اب تک اسکول سے نہ لوٹی تھی۔ اسے تشویش محسوس ہوئی۔
ظہر کی نماز کے بعد وہ بلا مقصد لیٹ گیا تھا اور پھر اسے خبر بھی نہ ہوئی کب نیند میں کھو گیا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجتی تو شاید کچھ دیر اور سویا رہتا۔ ریسیور اٹھانے سے قبل اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ دوسری طرف حکیم بیگم ہوگی۔
''کاکا! اڈے نور کوٹ آئی ہوں۔ ایتھے اک ٹیلی فون والی دکان کھل گئی ہے۔ تجھ سے گل کرنے کو بڑا جی کردا تھا۔ تیری ماں نے جیہڑی (جو) پرچی دی تھی مجھے وہ دکان والے نوں دکھائی تے اس نے لمبر (نمبر) ملا دیا۔ کڈا فیدا (کتنا فائدہ) ہے۔ ایس مشین دا۔ ہن میں آمنہ نال وی ایتھوں گل کرلوں گی تو سرکار نوں عرضی دے دے۔ وہ ہمارے پنڈ میں وی ٹیلی فون لگوا دے۔ میں روز تجھ سے گلاں کروں۔ بیبا! تیرے لئی میرا دل ہوکدا ہے۔''
ایئر پیس کے سوراخوں سے چھن کر آتی وہ آواز اس کے لیے ایسے ہی تھی جیسے صحرا میں بھٹکتے ہوئے کسی کو بادل کا ایک ٹکڑا میسر آ جائے۔ ضبط کے باوجود اس کا گلا رندھ گیا۔ اگر وہ عمر کے سامنے ہوتی تو شاید وہ اس سے لپٹ کر رو دیتا۔
''بے جی! تُو نے کیوں اتنی مصیبت کی۔ میں تجھ سے ملنے آنے ہی والا تھا۔ تھوڑے دنوں میں چکر لگاؤں گا تو بتا لاہور سے تیرے لیے کچھ لے کر آؤں؟''
''نا بھئی۔ میں تیری خدمتیں ئیں کر سکدی وارو واری (بار بار) ہن تو پروہنا ہو گیا ہے۔ پنڈ رہواڑے نہ ملنے آیا کر۔ تیری پڑھائی دا حرج ہوتا ہے، تیری ماں نہ غصے ہو کتے (کہیں)۔ گھٹ وگھٹ مہینے پچھوں آنا۔''
''تو اکیلی ہے بی جی! میرا دل کرتا ہے میں...... میں تیرے پاس آ جاؤں...... تیرا خیال رکھنے والا کوئی بھی نہیں۔ مجھے ہر وقت تیری فکر ستاتی......''
حکیم بیگم نے بات کاٹ دی۔
''بہتا ہمدرد نہ بن میرا۔ تیری ماں وی کلی ہے۔ اتنے ورے اس نے تیرے بغیر اللہ جانے کیویں (کیسے) لنگا دیئے۔ دھن جگرا ہے اس دا تو میری فکر نہ کریا کر۔ ام کلثوم کی نو پوتریاں (پوتیاں) ہیں۔ ساریاں ہیٹھ اتے (ساری اوپر تلے) جوان۔ ان کی واری ئیں آتی میری خدمت کرنے کی۔ اک بو کر دیتی ہے (جھاڑو لگاتی ہے) تے دو جی ہانڈی پکاتی ہے۔ چھوماں کہہ رہی تھی، دو چار کڑیاں پھیری والے نوں دے کے پاپڑ یا کچھ دے گلاس لے لیتی ہوں۔ ساریوں کو میں نے کیا کرنا ہے۔''
حکیم بیگم نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا تھا وہ کتنی ہی دیر ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔
آپا شام چھ بجے لوٹی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ درمیانی قامت کا ایک خوش پوش مرد تھا جو دیکھنے میں چالیس کے لگ بھگ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک ہاتھ آپا کی بغل تلے سے گزارا اور اسے یوں نیچے اتار لیا جیسے وہ کوئی ننھی سی بچی ہو۔ آپا کی رنگت گل مریم جیسی زرد ہو رہی تھی۔ اور آنکھوں کی سطح پر نمی کی ہلکی سی تہہ پھیلی تھی۔

اس نے کراہتے ہوئے پٹی میں لپٹا پاؤں دہلیز سے اندر رکھا تھا۔ اس کی چادر شانوں سے ڈھلک کر زمین پر گھسٹ رہی تھی اور اس مرد کا بازو اس کی کمر کے گرد لپٹا تھا۔ عمر کو وہ بازو مار پیچ لگ رہا تھا۔ وہ آپا کو اس زہریلے بندھن سے آزاد کروانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں شل تھے۔ وہ ذرا سی حرکت کرنے جتنی توانائی بھی اپنے اندر نہ پا تا تھا۔

''بیٹا! تمہاری آنٹی اسکول میں سیڑھیوں سے پھسل گئیں۔ فریکچر نہیں ہوا۔ معمولی موچ ہے۔ دو، ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔ گاڑی کے گلوکمپارٹمنٹ میں ڈاکٹر صاحب کا پرسکرپشن پڑا ہے۔ جا کر بازار سے میڈیسنز لے آؤ۔''

وہ کوئی بات کیے بنا بازار چلا گیا تھا۔ جب دوائیں لے کر آیا تو شوکت صاحب آپا کے سرہانے کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنا ہاتھ آپا کے ہاتھ پر رکھے اسے تسلی دے رہے تھے۔

''آپ کے بغیر ہمارا دل بھی کہاں لگتا ہے بھلا۔ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ ورنہ میں اپنا آفس آپ کے گھر میں شفٹ کرلوں گا۔''

عمر نے دواؤں والا لفافہ میز پر رکھ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''سارے اسکول کا اسٹاف ایک طرف اور آپ ایک طرف۔ آپ کے گرنے کا سن کر میں تو اتنا گھبرا گیا تھا کہ آفس سے نکلتے ہوئے دو بار دروازے سے ٹکرایا۔''

وہ بہت باتونی لگتے تھے۔ عمر نے آپا کے زرد چہرے پر مسکراہٹ بکھرتے دیکھی۔

''مجھے خوامخواہ میڈم شاہینہ پہ غصہ آنے لگا۔ دو دو انچ موٹے شیشوں والی عینک لگاتی ہیں اور ان کا بایاں پاؤں بھی پیدائشی ٹیڑھا ہے۔ پھر بھی کبھی سیڑھیوں سے نہیں گریں۔''

وہ بالوں بھرا ہاتھ اب بھی آپا کے ہاتھ کو سہلا رہا تھا۔ وہ دروازے کو دیکھنے لگا۔ چوبی دروازے پر منبت کاری کی گئی تھی۔ ایک الٹی قوس اور ایک سیدھی جن سے ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ قوسوں کو گننے لگا۔

اوپر سے نیچے پھر دائیں سے بائیں۔

''آپ کو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو رکشوں میں دھکے کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں گاڑی لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر کہہ رہا ہوں زیادہ دیر بیمار رہنے کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ آپ کے بغیر تو سارا اسکول سونا لگتا ہے ہمیں۔''

دروازے پر بنے ابھرواں نقوش پھیل کر بدوضع ہونے لگے۔ ان کے جانے کے بعد وہ آپا سے بولا۔

''آپ مجھے فون نہیں کر سکتی تھیں؟''

''جب شوکت صاحب موجود تھے تو تمہیں پریشان کرنے کی کیا تک تھی۔''

آپا نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ جتنے روز وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئی، شوکت صاحب تیمارداری کے لیے آتے رہے۔ کبھی موسمی پھلوں سے لدے ہوئے آتے تو کبھی مٹھائی یا کیک لے آتے اور آ جاتے تو پھر جانے کا نام نہ لیتے۔ یوں جیسے آپا کی بیمار پرسی کے سوا ان کے پاس دنیا میں کوئی کام ہی نہ ہو۔ ان کی موجودگی میں عمر کے لیے پڑھنا یا کوئی بھی کام کرنا ناممکن ہو جاتا۔ وہ اتنے زور سے قہقہے لگاتے اور ایسے بے تکان بولتے کہ اسے پاگل لگنے لگتے۔

وہ آپا کے اسکول کے پرنسپل تھے اور گزشتہ برس ان کی بیوی نے جو نفسیاتی مریضہ تھی، خودکشی کر لی تھی۔ وہ بے اولاد تھے اور ان دنوں تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ یہ اسے آپا نے بتایا تھا۔

✠ ✠ ✠

وہ پہلی بار آپا کے اسکول آیا تھا۔ صبح جاتے ہوئے وہ کہہ گئی تھی کہ اسکول کے بعد اسے کچھ خریداری کے لیے بازار جانا

ہے۔لہٰذا وہ کالج سے فارغ ہو کر اسکول پہنچ گیا تھا۔ چپڑاسی نے تعارف اور آنے کا مقصد پوچھنے کے بعد اسے میل اسٹاف روم میں بٹھا دیا تھا۔

''چھٹی کتنے بجے ہوگی؟''

''چھٹی تو ڈیڑھ بجے ہو جائے گی، لیکن وہ تب ہی آئیں گی، جب پرنسپل صاحب انہیں چھٹی دیں گے۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے عمر کو چونکا دیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ اپنے تمام پیریڈ پڑھا چکی ہیں اور اس وقت پرنسپل صاحب کے آفس میں موجود ہیں۔ میں اطلاع دے دیتا ہوں۔''

وہ وضاحت کر کے پلٹ گیا تھا۔

جنوبی دیوار کے گوشے میں نصب دروازے کا پٹ آدھے سے زیادہ کھلا تھا اور شنگرفی پردہ چھت کے پنکھے کی ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ شاید وہ فی میل اسٹاف روم تھا، کیونکہ دو عورتوں کے بولنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچتی تھیں۔

''شوکت کا بس چلے تو......'' جملے کا باقی حصہ تیزی سے گھومتے ہوئے پنکھے نے اچک لیا۔

''سائنس ٹیچر ارشد......رنگے ہاتھوں پکڑ......طلاق تک بات......گھناؤنا کردار''

''شوکت کے آفس......گھنٹہ بھر میٹنگ......بے حیائی......حد ہے۔''

پوری بات اس کی سماعت کی گرفت میں نہ آتی تھی اور آدھی بات دل میں وسوسے جگاتی تھی۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ کچھ لمحے شش و پنج کا شکار رہنے کے بعد اٹھا اور اس سنگل صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا، جس کے بازو کو لہراتا ہوا شنگرفی پردہ بار بار چھو رہا تھا۔ اب جملے اور ان کا مفہوم سمجھنا آسان تھا۔

''شوکت کی تو اسے دیکھ کر رال ٹپکتی ہے۔ دونوں آفس میں گھسے کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے گھنٹوں کیا کرتے رہتے ہیں۔''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔''

لہجہ معنی خیز تھا۔

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں، شگفتہ نے اسی وجہ سے زہر پھانک لیا۔ ایک بار وہ شوکت سے ملنے اسکول آئی اور بغیر دستک دیے آفس کا دروازہ کھول دیا۔ جانے اندر کیا دیکھا کہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔ یہ موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے بہتے تھے۔''

''تب بھی وہ دونوں اندر اکٹھے تھے؟''

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔ مجھے جب ماسی حنیفاں پوچھتی ہے باجی جی صفائی ٹھیک ہوئی ہے تو میں کہتی ہوں، کیا خاک ٹھیک ہوئی ہے، گند سے تو اسکول بھرا پڑا ہے۔ اس بے چاری کو سمجھ ہی نہیں آتی۔ بٹر بٹر میرا منہ تکنے لگتی ہے۔'' پردے کی سلوٹوں سے پھوٹتے الفاظ نیش (بچھو کا ڈنک) بن کر اس کے وجود میں اترتے تھے۔

''تمہارا مطلب ہے کہ......''

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا......''

انہوں نے دبا دبا قہقہہ لگایا تھا۔ پھر ان کی ہنسی دم توڑ گئی۔ شاید کمرے میں کوئی آیا تھا۔ نزدیک آتی قدموں کی چاپ سن کر وہ سنبھل کے بیٹھ گیا۔ شنگرفی پردہ ہٹا کر آپا اندر آئی تھی۔ عمر نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور تیز قدموں سے چل دیا۔

بازار میں بھی وہ حتی الوسع کوشش کرتا رہا کہ اسے مخاطب نہ کرنا پڑے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اندر جو زہر گھل رہا ہے اس کی کڑواہٹ آپا کو محسوس ہو۔

یوٹیلٹی اسٹور سے نکل کر سڑک پر آتے ہوئے آپا یوں ساکت ہوگئی، جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ وہ ٹکٹکی باندھے ایک ویڈیو شاپ کے شیشے کے دروازے کو، جس پر چند فلمی پوسٹر آویزاں تھے۔ گھورے جاتی تھی۔ مجبوراً عمر کو پوچھنا پڑا۔ ”کیا ہوا؟“ وہ کچھ نہ بولی اور پوسٹروں کو دیکھتی رہی۔

”رکشہ رکواؤں یا کچھ خریدنا باقی ہے؟“

اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ اسے ویڈیو شاپ کے اندر جاتے دیکھ کر عمر کو بھی تقلید کرنا پڑی تھی۔

”یہ فلم ہوگی، آپ کے پاس؟“

وہ جس خستہ حال پوسٹر کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ ایک انگلش فلم کا تھا اور نہایت اخلاق سوز منظر پیش کر رہا تھا۔

”باجی جی! یہ فلم فیملی کے دیکھنے والی نہیں ہے۔“ کاؤنٹر کے پیچھے موجود لڑکے نے قدرے رازدارانہ انداز اپناتے ہوئے اطلاع دی۔

آپا نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ اب قریب جا کر اس پوسٹر کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

”میں اس فلم کا پوچھ رہی ہوں۔ یہ ہے آپ کے اسٹاک میں؟“

اس نے کانچ کی دیوار کو انگلی سے ٹھکورا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے تو بتا دیا ہے آپ کو۔ ویسے آپ کو اسی ٹائپ کی فلمیں پسند ہیں تو ہمارے پاس اس سے بڑھیا آئٹم بھی دستیاب ہیں۔“

اس نے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔ تذلیل کے احساس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دیں۔

”آپ نے بتایا نہیں، میں یہ فلم خریدنا چاہتی ہوں۔“

”باجی! اس فلم میں کیا رکھا ہے۔ یہ تو کوئی آٹھ، دس سال پرانی ہے۔ آپ کو اس پوری مارکیٹ میں نہیں ملے گی۔ میں آپ کو کچھ نئی۔“

”نہیں، مجھے یہی چاہیے۔“ وہ قطعی لہجے میں کہہ کر دکان سے نکل گئی۔

”ویسے آپ کو لازمی یہ ہی موی چاہیے تو ہال روڈ سے شاید مل جائے۔ رفیع پلازہ اور زیتون پلازہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ وہاں سے پتا کرلیں۔“ لڑکے نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔ آپا نے رک کر سنا اور ایک دوسری ویڈیو شاپ کی طرف بڑھ گئی۔ عمر کی برداشت اب جواب دے چکی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر رک کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے تقریباً آدھا گھنٹہ وہیں ٹھہرنا پڑا۔ آپا مارکیٹ کی ہر چھوٹی بڑی ویڈیو شاپ میں وہ فلم تلاش کرتی رہی۔ اس کے لیے یہ صورت حال قطعی ناقابل فہم تھی۔ ایک گھٹیا موی کے لیے آخر وہ اس طرح ہلکان کیوں ہو رہی تھی۔ آپا نے اس کے پاس لوٹتے ہی عجلت میں رکشہ رکوایا اور بغیر کرایہ طے کیے بیٹھ

گئی۔

''بی بی! کدھر چلنا ہے۔''

''ہال روڈ۔''

عمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔



آوازوں، رنگوں اور خوشبوؤں سے چھلکتے ہوئے آڈیٹوریم ہال میں وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے داخل ہوئے تو کارل کی کئی 'پرستاروں' کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ صوفیہ اس سیارے پر موجود وہ آخری لڑکی تھی جسے وہ کارل کے ساتھ دیکھنے کی امید کر سکتی تھیں۔ اس نے کارل کی جانب نگاہ اٹھائی۔ وہ کچھ بجھا بجھا اور قدرے جھینپا ہوا سا لگتا تھا۔ شاید وہ اپنے فیصلے پر پچھتاوے کا شکار ہو رہا تھا۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا'' صوفیہ نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا۔ ''اس پورے ہال میں سب سے خوب صورت مرد میرے پہلو میں ہے اور شاید اتنی توجہ اور ایسی اہمیت مجھے اپنی زندگی میں پھر کبھی میسر نہ آئے۔ آج کی رات میری زندگی کی یادگار ترین رات ہوگی۔''

اس نے لڑکیوں کے چہروں پر کھدے حسد سے محظوظ ہونے کی کوشش کی۔ مگر اسے اپنے من سے جامد خاموشی کی صدا آئی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اگر رات حسین تھی اور زندگی اسے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے کا موقع دے رہی تھی تو وہ خوش کیوں نہیں تھی۔ اس کے اندر کوئی امنگ کیوں نہیں جاگتی تھی۔

جب کارل نے اسے رقص کی دعوت دیتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو اس کا سیل فون بجنے لگا۔

''میں شرط لگاتا ہوں، یہ دنیا کا سب سے کمینہ شخص ہے جو اس وقت دو پیار کے پیاسے دلوں کے بیچ حائل ہو گیا ہے۔''

کارل نے کوفت کا اظہار کیا تھا۔

اس نے ایک نظر اسکرین پر چمکتے ہندسوں کو دیکھ کر سیل فون آف کر دیا اور اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر دیگر جوڑوں کے ساتھ رقص میں شامل ہو گئی۔ وہ ایک مشہور میکسیکن گیت تھا جس کے بول خون کو گرما دینے والے تھے۔ پورے ہال میں رقصاں جوڑے آپس میں 'دوئی' مٹانے کی سعی کر رہے تھے۔ لحظہ بہ لحظہ اسے اپنے شانوں اور کمر کے گرد کارل کے بازوؤں کی گرفت سخت ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے گرم سانسوں کی بھاپ صوفیہ کی پیشانی کو جھلسا رہی تھی۔ لیکن نہ تو اسے گیت کی دھن کا ہوش تھا، نہ بول اس کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ کارل کی قربت بھی اس پر اثر انداز نہ ہوتی تھی۔ شیری کے دو پیگ جن کو حلق سے اتارنے کے بعد اسے کچھ سرور سا محسوس ہونے لگا تھا، ان کا دیا ہوا خمار بھی اب غائب ہو چکا تھا۔

وہ اپنے سیل فون پر آنے والی کال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا گرانٹ اتنی جلدی گھر واپس آ گیا تھا؟ یا اس نے اسٹوڈیوز سے ہی فون کیا تھا اور اگر وہ گھر آ چکا تھا تو وہ رات گئے تک باہر رہنے کا کیا جواز پیش کرے گی اور اس لباس میں اس کے سامنے جانا کیونکر ممکن ہوگا۔ وہ قیامت کھڑی کر دیتا۔

''میرے لوٹنے سے قبل وہ سلیپنگ پلز اور شراب کے نشے میں ڈوب کر بے سدھ ہو چکا ہوگا۔''

اس نے خود کو تسلی دی اور کارل کے تھرکتے قدموں کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی۔

''لیکن دروازہ تو اسے ہی کھولنا ہوگا اور وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا تو......''

وہ لے سے بچھڑنے لگی تھی اور اس کے پاؤں الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔

''ضروری نہیں کہ وہ واپس ہی آ گیا ہو اور اگر آ بھی گیا ہے تو اسے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ میں یہاں ہوں......میبل ''

اس نے کارل کا پاؤں بری طرح کچل دیا۔ وہ حواس باختہ ہو رہی تھی پھر اس کے چاروں اور گونجتی موسیقی تھم گئی۔ اس کے متحرک پاؤں بھی ساکت ہو گئے تھے۔ کیا وہ کوئی دوسرا گیت لگانے والے تھے؟ اس نے ہال میں چھائے ہوئے سکوت کے غیر فطری پن کو محسوس کیا۔

''اپنے غلیظ ہاتھ اس سے ہٹا لو ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' اس نے کارل کے شانے کی اوٹ سے اسے آتے دیکھا تھا۔

کیا وہ اشتباہ نظر کا شکار ہوئی تھی لیکن اگر وہ حقیقت نہیں اس کا واہمہ تھا تو موسیقی کیوں رک گئی تھی۔

پھر صوفیہ نے اسے کارل کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑتے دیکھا۔ گرانٹ منہ سے کف اڑاتے ہوئے اسے گالیاں دے رہا تھا۔

کارل کی سیاہ tuxedo جیکٹ کھل گئی تھی۔ اس کی فرانسیسی کفوں والی سفید قمیص پھٹ کر دھجیوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے کارل کی برہنہ چھاتی پر ہلکے زرد بالوں کا گچھا دیکھا تھا۔

اب گرانٹ وحشت سے چیختا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے سیل فون کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ شولڈر بیگ جانے کہاں چھوڑا تھا؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ گرانٹ نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا تھا۔ اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس جدوجہد میں اس کے جوتے کی ہیل ٹوٹ گئی اور وہ منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں کے گوشے سے رستے خون کو زبان سے چاٹا اور حلق کی پوری قوت سے چلائی۔

''کوئی پولیس کو بلاؤ۔ میری مدد کرو۔ پولیس کو بلاؤ۔''

گرانٹ اس کے سر پر پہنچ کر جھکا اور اس کا بازو گرفت میں لے لیا۔

''ریٹا! تم پاگل ہو گئی ہو؟ سب کو پھنسواؤ گی کیا۔ جیروم اور کوفی کے پاس کوکین ہے۔ خبردار پولیس کو نہ بلانا۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم بیچ میں پڑنے کی کوشش نہ کرو۔''

اس نے کسی کو تیز تیز بولتے سنا تھا۔

گرانٹ اب اسے فرش پر گھسیٹ رہا تھا۔

''تمہاری رگوں میں خون نہیں، گٹر کا غلیظ پانی دوڑ رہا ہے۔ تم گناہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتیں۔ تم بھی اپنی ماں کی طرح بدکار ہو''

اسے البا کا مسخ چہرہ یاد آیا اور اس کی پیشانی پر کھرچی ہوئی وہ گالی یاد آئی۔

''تم جہنم کا ایندھن ہو صوفیہ! خدا نے جہنم تم جیسوں کے لیے ہی دہکایا ہے۔ تم جلو گی۔ تم قیامت تک جہنم میں جلو گی۔''

قیامت تو شاید آج ہی تھی۔ پھر وہ کس قیامت کی بات کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد وہ ان لوگوں میں سے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت نہیں کر پائے گی۔ وہ کتنا صحیح سوچ رہی تھی۔ آج کی رات حقیقت میں اس کی زندگی کی یادگار رات بن گئی تھی۔

وہ گھسٹتے ہوئے ان کے جوتوں کو دیکھنے لگی۔

سفید، نیلے، سرخ، زعفرانی، بھورے، زمردیں، سیاہ......وہاں ہر رنگ کے جوتے تھے۔

اسے آج سے پہلے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ آڈیٹوریم ہال اتنا طویل تھا۔ وہ کسی طور ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔
آج بھی خدا نے اس کے ساتھ وہی کیا تھا، جو وہ ہمیشہ سے کرتا آ رہا تھا۔



وہ بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ جب کال بیل کی آواز سنائی دی۔ دروازے پر موجود دونوں پولیس آفیسرز نے اپنے بیج اسے دکھائے اور باری باری تعارف کروایا۔

''کیا وہ فون تم نے کیا تھا؟''

آفیسر پال نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

مختصر جسامت اور پچکے ہوئے گال اسے کم عمر ظاہر کرتے تھے۔ وہ ایڑیاں اچکا کر دروازے سے اندر جھانک رہا تھا۔

اس نے آفیسر نیلسن کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ وہ اپنے ساتھی آفیسر کے برعکس پختہ عمر کا تھا اور اپنی وضع سے گرم سرد چشیدہ قسم کا شخص نظر آتا تھا۔

''کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ میرا مطلب ہے فوری خطرہ۔'' پال نے دوبارہ سوال کیا۔

اس نے بالوں کو برش سے سنوارتے ہوئے دوبارہ گردن ہلائی۔

''تو وہ کہاں ہے جو تمہیں قتل کرنے والا تھا۔''

''وہ شراب خانے میں ہوگا یا شاید کسی اسٹوڈیو میں۔ وہ فنکار ہے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' اس کا مخاطب آفیسر نیلسن تھا۔

''کیا تم ہمیں اندر آنے کو نہیں کہو گی؟ اور کیا وہ کوئی مشہور آدمی ہے؟'' کسی ہنگامی صورت حال کی عدم موجودگی کو محسوس کر کے نو عمر پولیس آفیسر کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔

اس کے سوالوں کو نظر انداز کر کے وہ آفیسر نیلسن کو تفصیل بتانے لگی تھی۔ وہ ٹو کے بغیر توجہ سے سنتا رہا اور جب وہ خاموش ہوئی تو ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اگر ہنگامی نوعیت نہیں تھی تو تمہیں نائن ون ون پر کال نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس شہر میں بہت سے لوگ مشکلات کا شکار ہیں اور انہیں تمہاری نسبت ہم لوگوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ آئندہ کال کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچنا۔ جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے، تم خود یا اپنے نمائندے کے ذریعے لوکل فیملی کورٹ میں ریسٹرینگ آرڈر حاصل کرنے کے لیے درخواست دو۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''کورٹ ٹی۔ آر۔ او یعنی ٹمپریری ریسٹرینگ آرڈر جاری کر دے گا اور کورٹ پیپرز کی نقل مسٹر گرانٹ کو دے دی جائے گی۔ وہ تم سے ایک خاص فاصلے پر رہنے کا پابند ہوگا۔ یہ فاصلہ عموماً سو گز یعنی فٹ بال کے میدان کی لمبائی کے برابر متعین کیا جاتا ہے اور اسے تم سے ٹیلی فون، ای میل یا خط و کتابت کے ذریعے رابطہ کرنے کی ممانعت ہوگی۔''

''کیا وہ ٹی آر او جو تم بتا رہے ہو، مجھے اس شخص سے محفوظ کر دے گا؟''

آفیسر نیلسن نے ہنکارا بھر کر اپنے ساتھی کو دیکھا جس کے تنے ہوئے نقوش اس کی بیزاری کے گواہ تھے۔

''وہ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ کچھ لوگ ایسے احکامات کا احترام کرتے ہیں اور کچھ نہیں بھی کرتے۔ تم کسی ڈومیسٹک وائیلنس شیلٹر یا کسی دوست کی پاس جا سکتی ہو۔''

''لیکن اگر میں ٹی آر او حاصل کروں تو کیا وہ جیل جائے گا۔'' صوفیہ دروازے کا پٹ تھامے اسے دھیرے دھیرے ہلا رہی تھی۔

''نہیں۔ یہ ایک دیوانی عمل ہے نہ کہ فوجداری۔ جب تک وہ عدالتی احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور اس پر کوئی فوجداری الزامات نہیں لگتے، تب تک اسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا برش اپنی پشت پر اچھال دیا تھا۔ ''اگر وہ ٹی آر او کی خلاف ورزی کرے تو میں کیا کروں؟''

''تو پھر تم نائن ون ون پر کال کر سکتی ہو اور ٹی آر او کی کاپی ہمیشہ اپنے پاس رکھنی چاہیے۔ ویسے تو ان کا ریکارڈ California's law enforcement telecommunications system میں رکھا جاتا ہے پھر بھی احتیاطاً ایک نقل پاس موجود ہونی چاہیے۔''

''تو خدا اس کے ساتھ ہے۔ ٹھیک ہے میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ دروازہ اتنا اچانک اور اس زور سے بند ہوا تھا کہ آفیسر پال کو، جو پنجوں کے بل اچک کر اس کے عقب میں کمرے کے اندر دیکھنے میں کوشاں تھا، اپنا چہرہ زخمی ہونے سے بچانے کے لیے اچھلنا پڑا تھا۔



کمرے میں بلب کی زرد روشنی گندھک کے غبار کی مانند پھیلی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت اور اس روشنی میں حیرت انگیز ہم آہنگی تھی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظریں اسکرین سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل ایک ہی سین کو ریوائنڈ کر کے دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً چار منٹ دورانیے کا ایک منظر تھا جس میں پہلے لانگ شاٹ میں کیمرہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں پر ڈولتی ایک لانچ دکھاتا تھا۔ چند لمحے لہروں کا تموج اور طوفانی کیفیت رجسٹر کروانے کے بعد لانچ کی اندر ایک ادھیڑ عمر مرد ایک چرخی گھماتے ہوئے نظر آتا تھا۔ چرخی سے منسلک رسی لپیٹنے کے لیے اسے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا، اور اس کے نس دار ہاتھوں کا کلوز اپ لیا گیا تھا۔ پانی میں ڈوبی ہوئی رسی دھیرے دھیرے ابھرتی تھی، پھر ایک جھماکے کے ساتھ جال میں الجھی دو لڑکیوں کی نیم برہنہ مسخ شدہ لاشیں نظر آتی تھیں اور مرد کا چہرہ قریب سے دکھایا جاتا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف تھا۔

جونہی اگلا سین شروع ہوا، اس نے ریموٹ کنٹرول پر ریوائنڈ کے بٹن کو انگلی سے دبایا۔ مگر شاید سیل پوری طرح خرچ ہو چکے تھے۔ وہ اٹھ کر کروی سی پی کی طرف بڑھی۔ وہ ایک بار پھر وہ منظر دیکھنا چاہتی تھی۔

آپا کے کمرے کے بند دروازے پر ابھرواں تو سیں گنتے گنتے عمر کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔

من میں کوئی پھانس تھی جس کی چبھن ایسی شدید تھی کہ سانس لینا بھی دشوار تھا۔



وہ چائے بنا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کچھ دیر وہ آپا کی طرف سے جواب کا انتظار کرتا رہا اور پھر یاد آنے پر کہ وہ غسل خانے میں تھی، آنچ دھیمی کر کے آپا کے کمرے میں چلا آیا۔

ریسیور سے کچھ دیر کسی کے تیز تیز سانس لینے کی آوازیں آتی رہیں، لیکن اس کی ہیلو کا جواب نہیں دیا گیا۔ ریسیور رکھ کر وہ کچن میں جانے لگا تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو، کون بول رہا ہے؟''
اس بار بھی ایسی آوازیں سنائی دیں، جیسے کوئی ماؤتھ پیس پر ہونٹ رکھ کر زور، زور سے سانس خارج کر رہا ہو۔ خاصی دیر وہ پوچھتا رہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ شاید فون کرنے والے کا مقصد محض تنگ کرنا تھا۔ ابھی ریسیور رکھے اسے پانچ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ گھنٹی پھر بجی۔ ایک دفعہ پھر وہی کارروائی دہرائی گئی تھی۔ چوتھی بار فون سننے کے لیے اسے کچن سے پلٹنا پڑا تھا۔ لیکن ابھی وہ ریسیور اٹھا نہ پایا تھا کہ آپا آ گئی۔ اس نے گیلے بالوں کے گرد تولیہ لپیٹ رکھا تھا اور پانی کی بوندیں اس کے چہرے اور گردن پر لرز رہی تھیں۔ اس وقت وہ ایک نوخیز لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کا جسم اکہرا، چہرے اور گردن کی جلد تنی ہوئی اور آنکھیں شفاف تھیں۔ اگر اس کے بالوں میں کہیں کہیں جھلکنے والی سفیدی چھپ جاتی تو اس کی عمر کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔
''میں سن لوں گی۔'' اس نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہوئے عمر سے کہا تھا، جو اشارہ تھا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔
''جی شوکت صاحب! نہیں بزی تو نہیں تھا۔'' اس کے کچن کی جانب بڑھتے قدموں کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔
''آپ کے علاوہ یہاں فون ہی کس کا آتا ہے۔ مجھے تو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آپ نے خوامخواہ ہی کنکشن دلوا دیا۔''
وہ دروازے کے قریب ٹھہر گیا تھا۔ آپا دوسری طرف سے بات سنتے ہوئے اپنی پیشانی اور گردن کی پشت پر پھسلتی نمی کو پونچھ رہی تھی۔
''ایک اور وعدہ، آخر کب تک میں یہ وعدے سنتی رہوں گی۔ سال ہونے کو آیا اور بات وعدوں سے آگے نہیں بڑھی۔ انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' اس کی آواز میں خفگی تھی۔
''کچھ کیجیے شوکت صاحب! میں اس سلسلے سے تنگ آ چکی ہوں۔''
عمر کو چولہے پر دھری پتیلی یاد آئی تھی۔ وہ عجلت زدہ قدموں سے کچن میں پہنچا، لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ تمام چائے پتیلی کے کناروں سے ابل کر چولہے پر بہہ گئی تھی اور خالی پتیلی آگ کی لپٹوں سے جھلس رہی تھی۔
''عمر!'' آپا نے اپنے کمرے سے آواز دی۔
اس کا ہاتھ جل گیا۔ پتیلی اتارتے ہوئے وہ کپڑا ہاتھ پر لپیٹنا بھول گیا تھا اور ننگے ہاتھ سے دہکتی ہوئی دھات کو چھو لیا تھا۔
''جی آپا!'' اس نے جلی ہوئی انگلیاں ہونٹوں میں دبا لیں۔ ''آج تم میرے ساتھ چرچ جاؤ گے اور میں تمہارا انکار نہیں سنوں گی۔''
وہ بولتے ہوئے کچن کے دروازے تک آ گئی تھی۔ ''دریا میں اترو گے تو تیرنا سیکھو گے۔ کنارے پر بیٹھے سوچتے رہنے سے تمہارے اندیشے بڑھتے جائیں گے۔''
''میرے لیے وہاں کچھ نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔'' جلن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔
''میں تمہیں اپنی مامتا سے مجبور ہو کر نہیں لائی عمر! جہاں میں نے اتنے سال تمہارے بغیر گزار دیے، کچھ اور بھی گزار سکتی تھی۔''
اس نے آپا کے لیے اپنے دل میں کبھی کوئی محبت محسوس نہیں کی تھی، لیکن پھر بھی اس کی بات نے عمر کو بہت دکھ دیا۔
''مجھے یہ فکر مارے ڈالتا تھا کہ میں نے تمہیں جانتے بوجھتے ہوئے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ایک کرسچن بچے کو متعصب مسلمان عورت کے ہاتھوں میں سونپنے کا گناہ، مجھے خداوند کبھی معاف نہیں کرے گا، لیکن میں مجبور تھی۔''
اس کی مجبوریاں کیا رہی تھیں اور وہ انہیں کیوں ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اب ان باتوں سے عمر کو کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ آپا کے آنے سے پہلے اس کی زندگی ایسی منتشر نہ تھی۔ وہ گہرے غبار کی طرح اس کے افق پر چھا گئی تھی اور کچھ بھی سجھائی نہ

دیتا تھا۔

''میں پچھتاوے کے اس بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو عمر، میں تمہیں اپنی آنکھوں سے جہنم کی طرف بڑھتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی ہوں، تم میرے جسم کا حصہ ہو۔''

وہ خاموش رہا اور جھلسی ہوئی پتیلی کو سنک میں رکھ کر نل کھول دیا۔

''ہر کسی کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ بٹا بھی کیسے سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میری تمام کوشش عبث ہے۔ ایمان سب کا مقدر نہیں ہوتا۔'' اس نے ایک سرد سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر کچن کی پُر حدت فضا کے سپرد کیا۔

''کتے کو دھنک کے رنگ کیسے دکھائے جا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں، کیونکہ وہ کلر بلائنڈ ہوتا ہے۔''

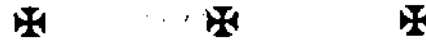
''اندھا ہونے سے کلر بلائنڈ ہونا بہتر ہوتا ہے آپا!''

عمر نے انگلیوں کی پوروں پر بننے والے آبلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب یہ سلسلہ موقوف ہو جائے گا، لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ شام کو دروازے پر دستک کا جواب دینے وہ گلی میں نکلا تو habit (ننوں کا مخصوص لباس) میں ملبوس ایک نرم نقوش والی، سانولی ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی۔

''تم عمر ہو؟ میں تم سے ہی ملنے آئی ہوں۔'' اس کے تصدیق کرنے پر وہ بولی۔

''میں سسٹر سوزین ہوں۔ تمہاری آنٹی کی دوست، اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم کسی الجھن میں ہو، سوچا تم سے مل کر اسے دور کرنے کی کوشش کروں۔''

جانے وہ اس کی الجھن سلجھانے آئی تھی یا اسے مزید الجھانے آئی تھی۔ عمر نے بے دلی سے اسے اندر آنے کی دعوت دی تھی۔



ڈٹیکٹو اسٹینلے والٹر انٹروگیشن روم میں داخل ہوا تو کھردری اور غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے سیاہ فام لڑکے نے چونک کر گردن موڑی اور میز پر رکھی ہوئی بیساکھی نیچے اتار لی۔ اسٹینلے والٹر نے داغ دار، بوسیدہ میز کی دوسری طرف اس کے عین سامنے کرسی سنبھالنے سے قبل اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس کے مصافحہ کرنے کا انداز اس کی جسمانی طاقت کا مظہر تھا۔ اگر وہ خوف زدہ ہوتا تو اس کی گرفت اتنی مضبوط نہ ہوتی۔ اسٹینلے اسے گہری نظروں سے جانچتے ہوئے بیٹھ گیا۔ وہ بہت بدصورت تھا۔ اس کی پیشانی تنگ، آنکھیں دھنسی ہوئی، نتھنے ناک کی بانسی سے بے حد ہٹے ہوئے اور ہونٹ جھلسے ہوئے گوشت کے دو لوتھڑے تھے۔ چکنائی زدہ گھنگھریالے بالوں سے جا بجا سر کی جلد جھانکتی تھی۔ اس نے ایک بوقلموں زنانہ لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے لمبے چوڑے جثے کے لیے نہایت تنگ تھا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کوئی بیمار ذہنیت کا حامل شخص تھا۔

اسے ایک پولیس پیٹرول کار نے اس وقت چیک کیا تھا، جب وہ اپنی رہائش گاہ کے قریب ایک نوجوان لڑکی کے مردہ جسم کو فٹ پاتھ سے نیچے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گشت پُر تعینات آفیسرز کے دریافت کرنے پر اس نے ایک بے سروپا کہانی سنائی تھی اور قتل کی واردات سے مکمل لاتعلقی ظاہر کی تھی، جبکہ اس کی کلائی پر کھرونچوں کے تازہ نشانات تھے۔ جن سے خون بھی رس رہا تھا، جو اس بات کے گواہ تھے کہ لڑکی کی موت سے قبل بھی وہ اس کے ساتھ موجود تھا۔ ظاہری طور پر ایسی کوئی علامات نہیں تھیں جن سے پتا چلتا کہ لڑکی کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔

Coroner's office اور فورنزک سائنس سنٹر سے رپورٹیں موصول ہو جاتیں تو کوئی واضح رائے قائم کی جا سکتی تھی۔

ڈیٹکٹیو اسٹینلے والٹر چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا اور اس دوران اپنے ذہن میں سوالات کو ترتیب دیتا رہا۔ وہ لڑکا یوں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا تھا جیسے اسٹینلے کے چہرے سے نظر ہٹانا اس کے اختیار میں نہ ہو۔ بالآخر گلا کھنکارتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ تمہیں باقاعدہ طور پر حراست میں نہیں لیا گیا اور تم جس وقت چاہو اٹھ کر اس کمرے سے جا سکتے ہو۔'' یہ بات اس نے قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کی تھی۔ اس کمرے میں ہونے والی بات چیت ریکارڈ ہو رہی تھی اور اسے عدالت میں استعمال کیا جانا مقصود تھا۔ اگر اسے باقاعدہ طور پر حراست میں لیا گیا ہوتا تو اس کے اٹارنی کی عدم موجودگی میں ان سوال و جواب کی حیثیت غیر قانونی ٹھہرتی اور نا قابل ادخال شہادت کے زمرے میں آتی۔

''تمہارے تعاون کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تم نے یہاں آنے کی درخواست پر ذرا بھی مزاحمت نہیں کی اور اپنی رضامندی سے پولیس آفیسرز کے ساتھ چلے آئے۔ تمہارا رویہ قابل تعریف ہے۔''

اس نے لہجے کو دوستانہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

''تمہارا نام؟ کیا بتایا تھا تم نے؟ میں بھی کیسا بھلکڑ ہوں۔ یہ کوئی بھولنے کی بات ہے؟''

اس سوال اور ایسے بہت سے دوسرے سوالوں کے جواب وہ پہلے سے جانتا تھا لیکن اس وقت انہیں پوچھنے کا مقصد مد مقابل کی جھجک دور کرنا اور اسے بولنے پر آمادہ کرنا تھا۔

''میبل۔'' اس نے بیساکھی کو زور سے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو لڑکیوں والا نام ہے۔ میں تمہارا نام پوچھ رہا ہوں۔''

''نہیں میرا نام میبل ہے، یہی میرا نام ہے، میبل، میں میبل ہوں۔'' وہ میبل کی گردان کرنے لگا۔

''لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں، یہ تمہاری چھوٹی بہن کا نام تھا جو 1992ء کے فسادات میں ہلاک ہو گئی تھی۔''

وہ خاموش رہا اور بیساکھی کو اور بھی سختی سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ شاید وہ بیساکھی اسے کوئی جذباتی آسرا فراہم کر رہی تھی یا پھر ایسی حرکتیں کر کے وہ خود کو سہما ہوا ثابت کرنا چاہتا تھا۔

''اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں ٹوبی کریگ کہہ کر پکاروں۔ میرا مطلب ہے جو نام تمہارے والدین نے رکھا تھا۔''

وہ ساکت پلکوں کے ساتھ اسٹینلے کو گھورتا رہا۔

''ٹوبی کریگ! تم انتھونی جڈ کے گیراج میں کب سے کام کر رہے ہو؟''

''چار سال سے۔''

''تمہارے کام کی نوعیت کیا ہے؟''

''میں کیش رجسٹر مین ٹین کرتا ہوں۔''

''یہ تو بہت ہوشیاری کا کام ہے۔ انتھونی نے تمہیں یہ ملازمت کیوں دی؟ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ذرا مختلف ہو نا۔''

''وہ میرا انکل ہے۔''

''تم انتھونی کے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟ تنہا کیوں رہتے ہو؟''

''میں تنہا ہوں۔''

''ٹوبی! مجھے معلوم ہے تم ایک قانون پسند شہری ہو اور میں دل سے تمہاری قدر کرتا ہوں۔''

وہ لوکل کریمنل ڈیٹابیس کو کھنگال چکا تھا اور ٹوبی کریگ کا کوئی سابقہ مجرمانہ ریکارڈ اسے نہیں ملا تھا۔ جانے اس سے قبل ٹوبی نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تھا یا اب تک وہ قانون کی نظروں سے بچا رہا تھا۔

بات چیت میں روانی لانے کی خاطر وہ خاصی دیر غیر ضروری اور فروعی نوعیت کے سوالات پوچھتا رہا اور جب اسے محسوس ہوا کہ لوہا گرم تھا تو اس نے پہلی چوٹ کی۔

''تمہاری کلائی پر زخم کیسے آئے؟''

وہ ہاتھ سے اپنی کلائی ٹٹولنے لگا تھا۔ ''مجھے درد ہو رہا ہے۔''

''تم مقتولہ کو کب سے جانتے تھے؟''

وہ چپ رہا۔

''تم اسے پسند کرتے تھے؟''

اس کے ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

''کیا اس نے تمہاری دل آزاری کی تھی؟''

وہ گونگا بہرا بنا بیٹھا تھا۔

''تم نے اسے وہیں کیوں نہیں چھوڑ دیا؟ تم اس کی لاش کے ساتھ کیا کرنے والے تھے؟'' یہ سوچ کر اسے کراہت آنے لگی کہ ٹوبی شاید necrophile (ایک نفسیاتی عارضہ جس کا مریض لاشوں میں جنسی کشش محسوس کرتا ہے) تھا۔

''تمہیں لاشیں اچھی لگتی ہیں؟ ان پر حکمرانی کرنا؟ وہ تمہارا کوئی حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتیں۔''

''میں چلا جاؤں؟'' وہ کرسی میں کسمسانے لگا۔

''چند بے ضرر سوالات کا جواب دینے میں حرج ہی کیا ہے۔ تم اپنا ارادہ بدل لو تو مجھے خوشی ہوگی۔'' اسٹینلے نے دھیمے مگر تنبیہی لہجے میں کہا۔

''کیا تم Andrei Chikatilo, Jaffrey Dahmer, Ted Bundy کو پسند کرتے ہو یا تم نے ان پر بننے والی فلمیں دیکھی ہوں یا کوئی کتاب پڑھی ہو جس میں ان کا تذکرہ ہو؟''

اس نے کچھ مشہور سیریل کلرز کے نام لیے جو necrophilic مقاصد کے لیے قتل کرتے تھے۔ وہ ذاتی طور پر ایسے لوگوں کی تشہیر کے سخت خلاف تھا کیونکہ اس کے خیال میں نوجوان لوگ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے منفی رجحانات کو آسانی سے قبول کرتے تھے اور بعض اوقات جرائم میں سنسنی خیزی تلاشنے لگتے تھے۔

ٹوبی کا چہرہ بے تاثر رہا۔ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ انہیں جانتا تھا یا نہیں۔

اسٹینلے چند منٹ خاموش بیٹھ کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کا مقصد ٹوبی کو سوچنے کی مہلت دینا تھا۔ آخر کار اس نے ایک سرگوشی کی۔

''اس کے جوتے۔'' ایک بار پھر اس نے وہ بے تکی کہانی سنانی شروع کر دی جو وہ پہلے بھی بیان کر چکا تھا۔

مقتولہ نے ایک مہنگے برانڈ کے نئے جوتے پہن رکھے تھے اور ٹوبی کی کہانی قرمزی رنگت کے ان جوتوں کے گرد گھومتی تھی۔

اسٹینلے نے ایک طویل سانس بھری اور اٹھ کر اس کی پشت پر آ گیا۔ یہ اسے ہراساں کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ جب اس نے ٹوبی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو وہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ اب وہ رو رہا تھا اور اس زاویے سے اور بھی بدصورت نظر آتا

تھا۔ اسٹینلے کو اس شعبے میں کام کرتے ہوئے دس برس سے اوپر ہو چکے تھے۔ اسے چہرے پڑھنے میں ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ Suspect (مشتبہ) کی ایک چشمک سے وہ سچ جھوٹ کا پتا چلا لیا کرتا تھا لیکن جانے کیا بات تھی کہ ٹوبی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے سلسلے میں وہ دگدھا (تذبذب) میں پھنسا تھا۔ اس کی تمام تر بدصورتی اور اس سے منسوب جرم کی تفصیلات جاننے کے باوجود وہ دل میں اس کے لیے نفرت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں اس کے کندھوں کو ہولے ہولے تھپکنے لگا۔ روتے ہوئے اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے رال بہنے لگی تھی۔ ان لمحات میں وہ کیسا مکروہ دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسٹینلے کو بیکنگ کلے کا وہ کھلونا یاد آ گیا جو اس کے سات سالہ بیٹی نے بڑی لگن سے بنایا تھا۔ لیکن پھر نادانستگی میں اس کے اپنے ہی پاؤں تلے دب کر وہ بدہیئت ہو گیا تھا۔ ٹوبی نے اشارہ کر کے اسے خود سے قریب ہونے کو کہا، جیسے وہ کوئی راز کی بات بتانا چاہتا ہو۔

''ہاں بولو۔ شاباش سچ بول دو ٹوبی! یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔'' اسٹینلے نیچے نہیں جھکا اور اس کی کمر ہاتھ سے سہلانے لگا۔ اس کے لٹکے ہوئے سیاہی مائل ہونٹوں سے سسکاری برآمد ہوئی۔

''خدا مجھ سے نفرت کرتا ہے۔''

اسٹینلے کو اپنے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

✠ ✠ ✠

ساری فضا میں برف کے گالے سفید چنگاریوں کی مانند اڑ رہے تھے تیزی سے بہتی ہوا بھٹ میں چھپے درندے کی طرح پھنکارتی تھی۔ جس دن کا آغاز آسمان سے اترتی ملائم سفید پھواروں سے ہوا تھا، وہ اب طوفان کی آماجگاہ بن رہا تھا۔

وہ پولیس آفیسرز کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے بری طرح کسمسا رہا تھا۔ پولیس کار اس سے چند قدم کی دوری پر تھی۔ وہ لوگ کچھ ہی لمحوں بعد اسے ہتھکڑی لگا کر اس بھیانک نظر آنے والے مشینی عفریت کے اندر دھکیلنے والے تھے اور وہ کوئی گاڑی نہ تھی۔ وہ اس کا تابوت تھا۔ جس میں بند کر کے وہ اسے گورستان لے جانے کے لیے آئے تھے۔ اس کی تمام خواہشوں کو اس کے ساتھ ہی دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ریاست میں Minors (قانون کی نظر میں نابالغ) کے لیے کیا قوانین رائج تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا مگر اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ ابراہیم کو قتل کرنے کی پاداش میں اسے ہر اس خوشی سے محروم کر دیا جائے گا، جس کا وہ ہمیشہ سے متمنی تھا۔ وہ چند قدم اسے ہالی ووڈ سے برسوں کی دوری پر لے جا رہے تھے۔ ان ہی چند لمحوں میں اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ان میں سے ایک آفیسر اسے چھوڑ کر آگے بڑھا اور کار کے ریڈیو پر آنے والی کسی کال کا جواب دینے لگا۔ تب ہی احمد نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ فیصلہ کرتے ہی adrenaline کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ اچانک اس نے اپنے قریب موجود آفیسر کے ہولسٹر میں لگی گن پر جھپٹا مارا اور اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔

''چلو۔ تم دونوں گاڑی سے دور ہو جاؤ۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔'' اس نے ریوالور ان پر تان کر چیختے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس افتاد پر ہکا بکا رہ گئے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر ساکت کھڑے تھے۔ بھاری جسامت والے نے جو گاڑی کے قریب تھا۔ سنبھلنے میں پہل کی اور اونچی آواز میں بولا۔

''دیکھو میری بات سنو۔ تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ اپنے لیے اور بھی پیچیدگی پیدا کر رہے ہو۔ یہ گن مجھے دے دو۔ یہ

لوڈڈ ہے۔''

احمد دیکھ رہا تھا کہ اس نے اب تک ریڈیو کا مائیک ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔ کار سے دور ہٹو اور اپنی گن نکال کر میری طرف پھینکو۔'' وہ بہت بدحواس ہو رہا تھا۔ بھربھری برف پر الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اسے ایک ٹھوکر بھی لگی تھی۔ اس کا پورا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے اس نے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں کوئی واضح منصوبہ بندی نہیں کی تھی اور اب چیخ چیخ کر انہیں سرنگوں ہونے کی ہدایات دیتے ہوئے وہ اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا تھا۔ اگر وہ ان دونوں کو بے بس کر کے باندھنے میں کامیاب ہو جائے اور کار کے ٹائر برسٹ کر کے ریڈیو کو بھی ناکارہ بنا ڈالے تو جب تک ان کو کوئی مدد میسر آتی۔ وہ باآسانی قریبی اسٹیشن سے جو صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ٹرین میں سوار ہو کر یہاں سے نکل سکتا تھا۔ ان کے سوا دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا اور اس خراب موسم میں کسی کا جلدی اس طرف آنا بھی بعید از قیاس تھا۔

اسے اچھی طرح احساس تھا کہ پولیس آفیسرز اس کی دھمکیوں کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے اور سمجھانے بجھانے کی آڑ میں دھیرے دھیرے اس کے قریب آ رہے تھے۔ اس نے کبھی کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا لہٰذا اسے اپنے نشانے کے سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ان دونوں کے پیروں کے بیچ برف کی طرف نال کا رخ کر کے اس نے جھجکتے ہوئے ٹریگر دبایا۔ عین اسی لمحے جسیم آفیسر نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے دھماکا سنا۔ جو اس کے اندازے سے کئی گنا زیادہ شدید تھا، آفیسر کے بوجھل جسم کو خود پر گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو بھاگ کر آتے اور ٹھوکر مارنے کے لیے پاؤں اٹھاتے ہوئے دیکھا، جبڑے کی ہڈی پر بوٹ کی سرد ٹو کی ضرب محسوس کی، بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی لیکن اس سارے منظر میں تازہ سرخ لہو کے چھوٹے سے تالاب کو وہ کہیں فٹ نہیں کر پایا تھا۔ اجلی سفید برف پر پھیل کر جمتا ہوا گاڑھا سرخ لہو کیسا عجیب دکھائی دیتا تھا۔

پولیس اسٹیشن کے بکنگ روم میں اسے 'book' کیا جا رہا تھا تو وہ خواب کی سی کیفیت میں تھا۔ اس نے ایک نظر بھی اس آدمی کا چہرہ نہیں دیکھا، جس نے اس کے فنگر پرنٹس لیے تھے۔ mug shots (فوٹوگرافک پورٹریٹ جو کسی کو گرفتار کرنے کے بعد لی جاتی ہے) اتارتے ہوئے ایک سیاہ تختی، جس پر سفید حروف میں کچھ لکھا تھا، اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ اس نے ایک بار بھی ان مندرجات کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ زندگی میں یہ پہلی تصویر تھی، جسے کھینچنے سے پہلے اسے مسکرانے کے لیے نہیں کہا گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ mug shots کے لیے مسکرانا معیوب ہو گا یا نہیں۔

مردہ ابراہیم اس کے راستے کا پتھر نہیں بنا تھا۔ بلکہ مونا اسٹوکر کی ایک غلطی نے اس کی راہ کھوٹی کی تھی۔ مونا نے زہر کھا کر اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی لیکن شاید زہر کا انتخاب کرنے میں اس نے کچھ بے احتیاطی برتی تھی اور اسی بنا پر سولہ گھنٹے ہسپتال میں تڑپتے رہنے کے باوجود مرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن یہ وہ غلطی نہیں تھی جس کا خمیازہ احمد کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ دراصل خودکشی کرنے سے قبل اس نے ایک خط فادر الیگزینڈر کے نام تحریر کیا تھا اور اسی خط سے یہ تمام سلسلہ شروع ہوا تھا۔

اس کے اٹارنی کا نام ولسن آرنو تھا اور وہ تقریباً پینتالیس سال کا خوش لباس اور ذہین آدمی تھا۔ اس سے مل کر احمد کو کچھ امید بندھی کہ وہ کوئی راستہ نکال لے گا مگر دوسری ملاقات میں ہی ولسن نے اسے غلط ثابت کر دیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم زیادہ بیوقوف ہو یا زیادہ بدقسمت۔ مونا نے تم پر ریپ کا الزام لگایا تو یہ کوئی ایسی سنگین صورت حال نہیں تھی۔ اس کا طبی معائنہ بروقت نہیں ہوا، اور اتنے دن گزر جانے کے بعد تمام مادی شہادتیں ویسے ہی ضائع ہو چکی ہیں۔ کوئی عینی گواہ نہیں ہے۔ اس الزام کو ثابت کرنا قریب قریب ناممکن ہے اور مونا جس قسم کی عورت ہے۔ وہ عدالتی کارروائی کا دباؤ

برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ ریپ کیسز میں جس طرح کے سوالات اور جرح کی جاتی ہے، ایسی کمزور اعصاب والی عورتوں کے لیے اس کا تصور بھی روح فرسا ہوتا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں فادر الیگزینڈر کو آؤٹ آف کورٹ سٹلمنٹ کے لیے آمادہ کر لوں گا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا اور تمہیں Convict (سزایاب) کر دیا گیا جس کا میرے تجربے کی روشنی میں بہت کم امکان ہے تو بھی پہلی بار جرم کرنے والوں کے لیے عدالت کا رویہ نرم ہوتا ہے اور پھر تم minor (نابالغ) ہو۔"

احمد اپنی نادانی اور عجلت پر دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا، اس نے خود سے یہ کیوں فرض کر لیا کہ اسے ابراہیم کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اور اب اسے یاد آیا تھا کہ پولیس آفیسر زا سے کار میں بیٹھنے پر آمادہ کرتے ہوئے کچھ بتانے کی کوشش بھی کر رہے تھے لیکن تب وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ کچھ سننے اور سمجھنے پر تیار ہی نہیں تھا۔ ولسن آرنو کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اس کے اندر موہوم سی امید جگانے لگے تھے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ولسن کی بات ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔

"اب یہ مونا اسٹوکر والا معاملہ تو ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آفیسر براؤن پر گولی چلا کر تم نے اپنے لیے بڑی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ میں تمہیں کوئی جھوٹی تسلی دے کر غلط امید نہیں دلانا چاہتا۔ مجھے خدشہ ہے کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے جیل جانا ہوگا۔"

احمد نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ زیر لب کچھ بولنے لگا تھا۔

"اگر تم دعا مانگ رہے ہو تو اپنے لیے نہیں براؤن کے لیے مانگو۔ وہ اب تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔ اور وہ بچ بھی گیا تو شاید فیلڈ ورک کے قابل نہ رہے۔"

اب احمد اس کی بات بھی نہیں سن رہا تھا۔

"اب نہیں کروں گا۔ دوبارہ کبھی نہیں۔ اب میں تجھے کبھی ناراض نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دے۔ ایک بار۔ مجھ سے راضی ہو جا۔ میں پھر تجھے خفا نہیں ہونے دوں گا۔" وہ سختی سے آنکھیں میچے گڑگڑا تا رہا۔

ولسن آرنو کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔

فادر الیگزینڈر اور مونا نے کیس کی پیروی نہیں کی تھی لیکن پیٹر براؤن چند ہفتے ہسپتال میں رہنے کے بعد مر گیا تھا۔ احمد کو پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی جس کے اختتام پر اسے ڈیڑھ سال probation پیریڈ بھی گزارنا تھا۔



سزا کا ابتدائی حصہ اس نے ایک juvenile correctional facility میں گزارا اور بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر اسے state prison میں منتقل کر دیا گیا۔

اس کی زندگی میں بس اتنی ہی تبدیلی آئی اور باہر کی دنیا میں تغیرات کی موجیں اٹھتی رہیں۔

خلا میں "چلنے" سے آگے بڑھ کر انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا۔ اپالو اور نیل آرمسٹرانگ گویا 'Arabian Nights' کے کسی محیر العقل قصے کے جز و تھے۔ ہائیڈروجن بموں اور گائیڈڈ میزائل کروز رز کا ذکر روزمرہ استعمال کی اشیاء کی طرح ہونے لگا۔ Gambia، Barbados، Malavi، Botswana جیسے نامانوس نام خود مختاری کا طغرہ سجا کر دنیا کے چہرے پر ابھرے۔ یہ ساٹھ کی دہائی کا دوسرا نصف تھا اور اس عرصے میں امریکیوں کے پاس بات کرنے کے لیے تین ہی موضوعات تھے۔ ویت نام جنگ، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور "دی بیٹلز" ایک رات اپنے cell میں bunk پر لیٹا ہوا وہ ساتھی inmates کے ہمراہ Bien Hoa کے مقام پر امریکن میرینز اور Veit Cong دستوں کے مابین ہونے والے محاذ کے بارے میں بات کر

رہا تھا تو ان میں سے کسی نے مذاق میں کہہ دیا۔
''میں کبھی کبھی یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اگر اس وقت میں یہاں نہ ہوتا تو شاید مجھے لازمی فوجی خدمات کے لیے بلایا جا چکا ہوتا اور شاید اس لمحے میں ویت نام کے جنگل میں ٹوائلٹ ڈھونڈنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوتا۔ یہ جیل جہنم کی چھوٹی بہن سہی مگر پھر بھی یہاں رہنا Viet Cong کی گولی کھانے یا Pow (جنگی قیدی) بننے سے تو ہزار گنا بہتر ہے۔''
وہ لوگ ہنس رہے تھے مگر احمد بالکل چپ ہو گیا تھا۔ لازمی فوجی خدمات کا ذکر سن کر اس کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔
پریزیڈنٹ لنڈن بی جانسن ......جنوبی ویت نام میں امریکی دستوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کر رہے تھے اور ہر ماہ پینتیس ہزار کے قریب امریکی نوجوانوں کو draft کیا جا رہا تھا۔ وہ خود بھی ''ڈرافٹ'' کی عمر کو پہنچ چکا تھا اور جیل میں نہ ہوتا تو قوی امکان تھا کہ اسے ویت نام بھجوا دیا جاتا اور بالفرض ایسا نہ ہوتا اور اس نے وقت سے پہلے ابراہیم سے جان چھڑانے کی کوشش ہی نہ کی ہوتی تو شاید ابراہیم اتنے ہی برس اور جی پاتا۔ پانچ چھ سال تو کیا وہ خدا کے منصوبے سے متصادم ہو رہا تھا یا خدا چاہتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہالی ووڈ جائے۔ اس نے سلگتی ہوئی سوچ کا سرا بجھا دیا۔ وہ بے جا وہم تراش رہا تھا تو یہ سب مفروضے ہی تھے ناں۔
یہ دور جنگ کا تھا۔ بے امنی کا زمانہ تھا۔ امریکہ کئی قسم کی جنگوں میں ملوث تھا۔ کچھ محاذ سرحدوں سے باہر لڑے جا رہے تھے اور کچھ ملکی حدود کے اندر بپا تھے۔
سرفہرست ویت نام کی جنگ، جس کے خلاف امریکہ میں ملک گیر احتجاج ہو رہے تھے لیکن ان کی صدا پینٹاگون کی دیواروں سے ٹکرا کر عوام کے کانوں میں لوٹ آتی تھی۔
پھر سرد جنگ جو کئی برسوں سے امریکہ اور روس میں جاری تھی۔
ایک سول حقوق کی جنگ بھی تھی، جسے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور روزا پارکس -- جیسے لوگ بنا ہتھیاروں کے لڑ رہے تھے۔
ان سب کے علاوہ نسلی فسادات کی آگ تھی، جو Watts، Milwaukee، Detroit، Harlem میں بھڑکی اور بہت کچھ خاکستر کر دیا۔
اس پر آشوب دور میں بھی ہالی ووڈ نے محبت اور خوب صورتی پر سے انسانوں کا ایمان اٹھنے نہیں دیا اور دنیا کو Mary Poppins، My Fair Lady، Oliver، Man of All Seasons جیسے تحفے دیئے۔

✠ ✠ ✠

پرنیاں نے رائٹنگ ٹیبل پر رکھے کانچ کے ڈبے کو دیکھا اور وہ اسے پہلے سے زیادہ اچھا لگا۔ اس کی بناوٹ میں نہایت عمدگی تھی۔ کانچ کی دیواریں بالکل شفاف تھیں۔ یہ اسے گرانٹ نے خرید کر دیا تھا۔ سن سیٹ بلیورڈ پر گھومتے ہوئے وہ بلا ارادہ ہی ایک کوشک نما عمارت میں گھس گئے تھے۔ اندر انواع و اقسام کی اشیاء شوکیسز اور کاؤنٹرز پر زیر نمائش تھیں۔ ایک حصہ والٹ ڈزنی کی فیری ٹیلز اور کامک کریکٹرز کے لیے مختص تھا اور وہی پرنیاں کو سب سے زیادہ دلچسپ لگا تھا۔ وہاں سنڈریلا کے جوتے، سنو وائٹ کی سوتیلی ماں کا جادوئی آئینہ، لکڑی سے بنا Pinocchio، پیٹر پین کا کاسٹیوم اور ایسی ہی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔ اس حصے میں زیادہ تعداد بچوں کی تھی۔ پرنیاں کو ان سب چیزوں میں ایک شیشے کا منی ایچر صندوق بہت منفرد لگا تھا وہ شش پہلو تھا۔ اس کے ڈھکن کو نچلے ڈبے سے جوڑنے کے لیے سنہری گل میخیں جڑی تھیں اور وہ باقاعدہ کھل سکتا تھا۔ اس کی شفاف چھت پر سنہری حروف میں رقم تھا۔ ''سنو وائٹ جو ایک بادشاہ کی بیٹی تھی۔'' اس نے سنو وائٹ کی کہانی پڑھ رکھی تھی، لیکن اسے یاد نہیں تھا اس صندوقچے کا ذکر کہاں آتا تھا۔ وہ دیر تک اسے ہاتھوں میں تھامے قریب سے دیکھتی رہی تھی۔ گرانٹ نے شاید اس کی پسندیدگی محسوس کر لی تھی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کب

اس نے خاموشی سے جا کر قیمت ادا کر دی۔

''خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو بس ایسے ہی......'' پرنیاں نے احتجاج کیا۔ گرانٹ کی مالی حالت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

اس نے جواب میں محض مسکرا کر کندھے اچکا دیے تھے۔

''لیکن فیری ٹیل میں ایسے کسی ڈبے کا تذکرہ تو نہیں تھا۔''

''جب سنو وائٹ زہریلا سیب کھا کر ابدی نیند سو جاتی ہے تو سات بونے اسے کانچ کے تابوت میں لٹا کر جنگل میں چھوڑ آتے ہیں۔''

وہ توہم پرست نہیں تھی، پھر بھی تابوت کا سن کر اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

اور اس وقت وہ اسے سامنے رکھے سوچ رہی تھی کہ گرانٹ کے اس تحفے کا کیا مصرف ہونا چاہیے۔ کچھ خیال آنے پر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔ وہ اٹھی اور الماری کے پٹ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ چند ثانیے بعد اس نے کچھ چیزیں لا کر احتیاط سے رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیں۔ وہ سب گرانٹ کے تحائف تھے۔ پانچ باسی پھول جو اس نے مختلف مواقع پر اسے دیئے تھے کاسنی Gloxinia، ایک زرد ڈیزی، سفید Camellia، سرخ جرینیم اور ایک ارغوانی سورنجان۔ وہ سب مرجھا چکے تھے۔ پتیوں پر بھوری سیاہ چتیاں پڑنے سے اصل رنگ کھو گئے تھے اور پتیاں بکھر کر ڈنٹھلوں سے جدا ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے ان پھولوں کو ایک سفید ریشمی موباف میں لپیٹ کر اس ڈبے میں رکھ دیا۔ باقی جو اشیاء اس نے سنبھالیں، ان میں ایک لائٹر تھا جو ناکارہ ہونے پر گرانٹ نے فٹ پاتھ پر پھینک دیا تھا اور پرنیاں نے اس کے علم میں لائے بغیر اٹھا کر ہینڈ بیگ میں ڈال لیا تھا ایک استعمال شدہ رومال جس سے گرانٹ کے پسینے اور کلون کی ملی جلی باس آتی تھی۔ سگریٹ کا ادھ جلا ٹوٹا جس میں اس کی سانسیں رچی تھیں۔ اگر اس کے پاس کوئی ذریعہ ہوتا تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بھی محفوظ کر لیتی۔ جس پر پارک میں گرانٹ نے اپنا نام اور فون نمبر لکھا تھا اور جہاں اس کے بدن پر لمس کا پہلا چاند کھلا تھا۔

قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دروازے کی جانب نگاہ اٹھائی اور داؤد کو اندر آنے کے لیے کہا۔

''میں اور ڈیڈی بس نکلنے ہی والے تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ تمہیں یہ دینا تھا۔'' داؤد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا زرد لفافہ اسے دکھایا۔

''یہ کہاں سے آیا ہے۔ کیا پاکستان سے؟''

''نہیں یہ ڈاک میں نہیں آیا۔ دروازے پر کوئی لڑکا دے گیا تھا۔ تمہارا نام لے کر۔''

''تو تم نے دیکھا نہیں اس میں کیا ہے۔'' وہ چل کر داؤد کے قریب آ گئی۔

''تمہاری اجازت کے بغیر دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ویسے بند لفافے تجسس تو جگاتے ہیں۔ کھلنے تک ان میں بڑا اسرار ہوتا ہے۔''

''تو اب اسے کھول لو۔'' اس نے ہنس کر کہا اور رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں سے پیپر کٹر نکال کر اسے دیا۔

داؤد نے اس کے متبسم چہرے پر نظریں جماتے ہوئے لفافے کا بند سرا کاٹ ڈالا۔ اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر وہ ٹھٹکا اور لفافے کو آرام کرسی پر پھینک کر بولا۔

''ہسپتال سے میری بہت ضروری کال آنے والی تھی۔ شام کو چائے پر ملتے ہیں۔ Backgammon میں مجھ سے ہارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا۔''

اس کے جانے کے بعد پرنیاں نے وہ لفافہ اٹھایا، وہ بالکل سادہ تھا اس پر کوئی تحریر نہ تھی اور اندر موجود کاغذوں کا پلندہ باہر کھینچ لیا۔ اسے لگا جیسے اس کے نچلے دھڑ میں جان باقی نہ رہی ہو۔ دل ایسے ڈوب کر دھڑکا تھا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو۔ بے جان انگلیوں سے لفافے کے مشمولات اس میں واپس ٹھونستے ہوئے وہ کرسی پر ڈھے گئی تھی۔

وہ ایک میگزین تھا اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ کس قسم کا میگزین تھا، اسے ایک ورق بھی پلٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ سرورق پر ایک نگاہ پڑتے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا۔ وہ ایک پورنوگرافک رسالہ تھا۔ اور رہا اس سوال کا جواب کہ وہ اسے کیوں بھیجا گیا تھا، یہ معمہ حل کرنے کے لیے کسی راکٹ سائنٹسٹ کی مدد درکار نہ تھی۔ سرورق جن تین مادرزاد برہنہ جسموں کے رنگین عکس سے مزین تھا ان میں سے ایک جسم گرانٹ کا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ لفافہ داؤد کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے دیکھنے سے چند ساعت کی دوری پر تھا۔ اگر وہ ٹیلی فون سننے نہ جاتا تو۔ اس سے آگے سوچنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ چاچی کس وقت اندر آئی اسے بالکل خبر نہ ہو سکی۔ اس کے پکارنے پر وہ خالی خالی نظروں سے اس کا منہ تکنے لگی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟ کتنی زرد لگ رہی ہو۔ بولو کیا بات ہے۔'' پرنیاں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا اور نظروں کے سامنے کسی زہریلے سانپ کی طرح کلبلاتے ہوئے لفافے کو اٹھا کر سرعت سے قریب رکھی شیشے کی صندوقچی میں بند کر دیا۔

تب اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کو اس بلوریں تابوت میں سنبھال رہی تھی۔



کئی بے خواب راتیں گزارنے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور سر پتھر کی مانند بوجھل ہو رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں ایک پل کے لیے بھی وہ میگزین اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوا جاتا تھا۔ جب سے گرانٹ اس کی زندگی میں آیا تھا، نیند کی اس کی آنکھوں سے ویسے ہی نہیں بنتی تھی۔ پہروں اس کے تصور میں بیت جاتے تھے۔ ہر کروٹ کے ساتھ وہ اسے یاد کرتی۔ اس کی آنکھیں اس کا چہرہ، اس کی ہنسی، اس کی باتیں، یہ تسلسل ٹوٹنے ہی نہ پاتا تھا۔ سونے کے لیے وقت ہی کہاں بچتا تھا اس کے پاس۔

اب اس زرد لفافے نے اس کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی۔ وہ یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ اسے زیادہ صدمہ گرانٹ کے کس عمل کا تھا۔ اس میگزین کے لیے کام کرنے کا یا اس سے چھپانے کا۔ اس نے بے شمار بار ٹیلی فون پر گرانٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اپارٹمنٹ شاید خالی تھا۔ ہر دفعہ اسے ریکارڈ شدہ پیغام سننے کو ملتا تھا۔ تین دن سے وہ اسکول بھی نہیں گئی تھی۔ گھر میں اس نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر مزید سوالات کی راہ روک دی تھی، داؤد ان دنوں ایک ہفتے کی رخصت پر تھا اور اس کی وجہ سے پرنیاں کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ داؤد کی جانچتی نظروں اور کریدتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنے کی سکت اس میں ہرگز نہ تھی۔

وہ لونگ روم میں کاؤچ پر نیم دراز قالین کے ملائم ریشوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گہری سوچ میں مستغرق تھی کہ داؤد کے کسی سے باتیں کرنے کی آواز سن کر چونکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داؤد کے ساتھ اندر آنے والے شخص کو دیکھ کر دل بے اختیار اپنی چال سے چوک گیا تھا۔ گرانٹ پہلی دفعہ اس سے ملنے کے لیے گھر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ داؤد ان دونوں کو بیٹھنے کا کہہ کر خود کچن کی طرف چلا گیا تھا۔ شاید وہ ان کے لیے کچھ پینے کو لانے گیا تھا۔ گرانٹ نے سر کے بالوں کو ایک سفید دھاریوں والے سیاہ بینڈانا سے ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے گھنے بالوں کے نچلے سرے کانوں کی لوؤں اور گردن کے آس پاس خم کھا کر مڑ گئے تھے۔ چند دن کا بڑھا ہوا شیو سرمگیں غبار کی صورت اس کے گالوں اور ٹھوڑی پر پھیلا تھا۔ دائیں کلائی میں اس نے باریک سیاہ چرمی ڈوری لپیٹ رکھی تھی۔ شاید

اس نے پہلے اتنے غور سے کبھی گرانٹ کو دیکھا نہیں تھا یا شاید آج سے پہلے وہ کبھی اتنا دلکش لگا ہی نہیں تھا۔ اس لمحے سے پہلے پرنیاں اس سے ناراض تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ گرانٹ کے سامنے آتے ہی اس پر برس پڑے گی۔ اسے برا بھلا کہے گی۔ اس نے ذہن میں جملے بھی ترتیب دے رکھے تھے۔

''اتنی اخلاقی گراوٹ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں تمہیں کیا سمجھتی تھی اور تم کیا نکلے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمہاری ذات کا ایسا گھناؤنا پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ آج کے بعد میں تمہاری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہوں گی۔'' اگر وہ انکار کرتا تو وہ اور بھی بھڑکتی اور میگزین لا کر اس کے منہ پر مار دیتی۔ لیکن وہ حیران رہ گئی جب گرانٹ کو اچانک سامنے پا کر اسے ایک بھی تلخ لفظ یاد نہ آ سکا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہی نوعمر لڑکوں والی بے ریا مسکراہٹ۔ اس مسکراہٹ نے پرنیاں کو لڑنے سے قبل ہی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کئی لمحوں تک اسے بے بسی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولی تھی۔

''تم کہاں تھے گرانٹ۔''

''یہ مت پوچھو کہ میں کہاں تھا۔ اس سوال کا جواب تو خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ شاید زمین اور آسمان کے درمیان میں کہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں اتنے سالوں سے جس منزل کی تلاش میں بھٹک رہا تھا، اسے میں نے پا لیا ہے۔ میں اتنا خوش ہوں کہ کسی لغت کا کوئی لفظ میری خوشی کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ میں اسٹار بننے والا ہوں۔ نہیں بلکہ سپر اسٹار، میں نے تو ابھی سے آسکر قبول کرنے کی تقریر کی مشق بھی شروع کر دی ہے۔''

بے اختیار پرنیاں کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''تمہیں کوئی بڑا کردار مل گیا ہے؟''

''بہت بڑا۔''

''کیا لیڈ رول''

''یہ سب تفصیل تو میں تمہیں کل رات کو بتاؤں گا۔ جگہ کا انتخاب ابھی نہیں کیا۔ ٹیلی فون پر بتا دوں گا۔'' بات کرتے ہوئے وہ جوش سے ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔

پرنیاں اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالنے کا گناہ کیسے کرتی۔ ان لمحات میں اس میگزین کا ذکر کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

''آئندہ بہت سے مواقع آئیں گے۔ میں کسی مناسب وقت پر اس سے ضرور پوچھوں گی۔ شاید وہ مجبور رہا ہوگا۔ وہ کئی برسوں سے ہالی ووڈ میں جگہ بنانے کے لیے بند دروازوں سے سر ٹکرا رہا ہے۔ جانے اس نے کیسے کڑے حالات کا سامنا کیا ہوگا۔''

آج سے قبل اس نے کبھی گرانٹ کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس موقع پر اسے دکھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر اسے شرمسار کرنے سے بھلا حاصل ہی کیا تھا۔ جو بیت چکا تھا وہ تو لوٹنے سے رہا۔ وہ میگزین اسے کس نے بھجوایا تھا۔ اس بارے میں اس کے ذہن میں کوئی شائبہ نہ تھا۔ اور بھیجنے والا اپنا مقصد پا لیتا، یہ اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ گرانٹ کے لیے اس کی محبت کے سامنے اس بات کی حیثیت ایسے ہی ہیچ تھی، جیسے خالص سونے کے بت میں ایک کیل ملمع دار تانبے کی لگا دی جائے۔

داؤد مشروبات لے کر آیا اور گرانٹ سے اس کے متعلق چھوٹے چھوٹے سوالات کرنے لگا۔ اس کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی رسمی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اسے پرنیاں سے اس کا ملنے کے لیے آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے لہجے سے ہی عیاں تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ داؤد انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دے لیکن وہ گرانٹ کے رخصت ہونے تک وہیں جم کر بیٹھا

رہا تھا۔

''تم اس ہپی کو کیسے جانتی ہو۔'' دروازہ بند کر کے پلٹتے ہوئے داؤد نے پوچھا تھا۔

''وہ ہپی نہیں ہے۔''

''اچھا۔ حلیے سے تو لگ رہا تھا ضرورت سے زیادہ خوش امید ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہالی ووڈ میں اس کا کوئی مستقبل ہے۔''

''تم نجومی کب سے ہو گئے داؤد؟''

''تمہیں اس art-shit سے ہمدردی ہے شاید۔'' وہ آرٹسٹ کو بگاڑ کر بولا تھا۔

''میں تمہیں مہذب سمجھتی تھی۔ یہ کیا طریقہ ہے کسی کے بارے میں بات کرنے کا۔'' اس کا ضبط جواب دینے لگا۔

''تمہیں اس کی بدحالی پر ترس آتا ہے تو چند سکے لٹانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اپنے جذبات کی دولت ضائع کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔''

''میری برداشت کو اتنا مت آزماؤ کہ میں تمہاری توہین کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔'' اس کی آواز میں ایسی تلخی تھی کہ داؤد اسے دیکھتا رہ گیا۔

✠ ✠ ✠

آسمان ایک بیکراں سیاہ غربال (چھلنی) تھا اور ستارے پارے کی چمکیلی بوندیں جو اس غربال کے بے شمار موکھوں میں اٹکی تھیں اور کسی بھی آن پھسل کر گرنے والی تھیں۔

خنک ہوا میں سمندر کی کھاری سانسوں کی باس تھی۔

ڈنر کے بعد وہ سانتا مونیکا بیچ پر ٹہلتے ہوئے ایک تنہا گوشے میں آ نکلے تھے۔

اس کے جوتے میں گیلی ریت چلی گئی تھی اور وہ گرانٹ کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کچھ بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے رکنے کا کہے اور جوتا اتار کر ریت جھاڑ ڈالے مگر اس کی محویت توڑتے ہوئے ڈرتی تھی۔ خوش آئند مستقبل کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اس قدر مگن تھا کہ پرنیاں چاہ کر بھی اسے ٹوک نہ سکی۔ اس بے ضرر خواہش کو دبائے وہ خاموشی سے گرانٹ کے ساتھ چلتی رہی۔

''تم صرف میری محبت نہیں ہو، تم میری اچھی قسمت ہو، جب سے تم ملی ہو، میری قسمت بھی بدل گئی ہے۔ میں بالکل مایوس ہو چکا تھا، گھپ اندھیرے میں تھا اور تم سے ملنے کے بعد مجھے روشنی ایسے ڈھنگ سے ملی، جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تم میری روشنی ہو۔''

پرنیاں کے Poncho (لباس) میں نم آلود ہوا بھر گئی تھی۔ اس نے بازوؤں کو سینے کے گرد لپیٹتے ہوئے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ خنکی کے سوا کوئی شے تھے جس نے اس پر خفیف کپکپی طاری کر دی۔

''اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں تو میرا کیا ہوتا۔ یہ سوچتا ہوں تو مجھے یہاں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔'' اس نے چھاتی پر بائیں طرف ہاتھ رکھا۔ ''میں تمہیں کبھی خود سے دور نہیں ہونے دوں گا، ورنہ میری خوش قسمتی مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ میں اس معاملے میں اوہام پرست شخص ہوں۔''

پرنیاں کو جوتے کا بوجھل پن برا نہیں لگ رہا تھا۔

عظیم چھلنی کے پیندے سے پارے کی بوند ٹپکی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اچانک گرانٹ پہلو سے نکل کر سامنے آیا اور اسے بازوؤں کے حلقے میں بھر لیا۔

ہوا سے پھڑ پھڑاتا ہوا Poncho ساکت ہو گیا۔

''ہم پوری رات کھلے آسمان تلے ساحل پر گزاریں تو کیسا ہو۔ میں تمہیں کیٹس کی شاعری سناؤں گا۔ چاندی کی پریاں ٹھہر کر ہمیں دیکھیں گی۔ چاندی کی پریاں نہ سہی Scuba divers تو ضرور ہی دیکھیں گے۔''

چندر جوت اس کی آنکھوں کی سیاہی میں گھل کر ایک سرد آگ دہکا رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں کا عنکبوتی طلسم اس کے چاروں اور جال بننے لگا۔ اس گرفت سے آزاد ہونے میں وہ نیم جان ہو چلی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ پوری رات نہیں رہ سکتی۔ آج میں ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کا بہانہ بنا کر آئی ہوں۔'' اس نے تیز ہوتے تنفس پر قابو پا کر بمشکل بتایا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں، تم مشرقی لوگوں کے مسائل، لیکن شادی کے بعد میں تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ تم مجھ سے یوں بدکتی ہو جیسے میں تمہارا بوائے فرینڈ نہیں کوئی چھوت کی بیماری ہوں۔ تمہارا ہاتھ چھوتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کروں گا۔ اب ہمیں شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔''

اس نے بارہا اپنی اور گرانٹ کی شادی کو سوچا تھا، لیکن گرانٹ کے ہونٹوں سے شادی کا تذکرہ پہلی بار سنا تھا۔

پرنیاں کے کنول روپی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرانٹ نے اس کی پیشانی پر گرم سانسوں کی بھاپ چھوڑی۔ ''مجھے لگتا ہے خدا نے تمہیں چاندی کی مٹی سے بنایا ہے۔ کہیں تم چاند سے تو نہیں آئی ہو۔''

''میں ایلین نہیں ہوں۔''

اب وہ بھول چکی تھی کہ اس کے جوتے میں مٹھی بھر ریت تھی۔ اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ کہاں تھی۔ زمین پر تو ہرگز نہیں تھی، کیونکہ زمین پر چلنے کے لیے قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ تیر رہی تھی۔ آسمان پر ہونا یوں محال تھا کہ وہ اس کے سر سے ذرا اوپر ان گنت ستاروں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ تو وہ کہاں تھی......شاید کہیں نہیں تھی۔

گرانٹ بند ہونٹوں میں کوئی انوکھی دھن گنگنا رہا تھا جو اس دنیا کی نہیں لگتی تھی۔

اچانک اسے کچھ یاد آیا اور ایسے میں کچھ بھی یاد آنا بڑے اچنبھے کی بات تھی۔

''کل ہم سب عشائے ربانی میں شامل ہونے جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ میں تمہیں چچا اور چاچی سے ملوانا چاہتی ہوں۔''

گرانٹ نے گنگنانا موقوف کر دیا۔

''ہرگز نہیں۔''

پرنیاں چونک گئی تھی۔

''تم میرے چچا اور چاچی سے نہیں ملنا چاہتے؟''

''میں ان سے ملوں گا لیکن mass میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

وہ اسی گیت کو اب لفظوں کے ساتھ گا رہا تھا اور پرنیاں کو اس کے بول بے محل لگے تھے۔

شاید وہ کسی مصروفیت کی بنا پر کل چرچ جانے سے قاصر تھا یا پھر وہ پروٹسٹنٹ تھا اور کیتھولک mass میں شرکت کرنا نہیں چاہتا تھا یا شاید وہ ان ترقی یافتہ سوچ کے مالک نوجوانوں میں سے تھا، جو مذہب سے دوری کو فیشن کی ایک قسم گردانتے تھے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، اسے گرانٹ کا اتنی قطعیت سے منع کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم کیوں شامل نہیں ہو سکتے گرانٹ؟'' یہ سوال پوچھتے ہوئے جانے کیوں اسے خوف محسوس ہوا۔ وہ ایک پاؤں کو قدرے گھسیٹ کر چلنے لگی تھی۔ اسے وہ گیت اب بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''میں مسلم ہوں، اس لیے، میرا وہاں کیا کام۔'' دور ایک تارا سر کے بل بحرالکاہل میں گرا۔

تمام تر ہوا کے باوجود اسے سانس لینے میں دقت پیش آئی تھی۔

''لیکن تم تو...... ایڈم گرانٹ ہو، تمہارا نام۔'' فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی پرنیاں کو اس کے بودے پن کا ادراک ہوا۔ صرف نام سے کیسے اس نے من چاہا نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہودی، بدھ، پارسی، ناستک، کچھ بھی۔

''میرا اصل نام احمد ابراہیم ہے۔ یہ تو میرا Screen name ہے۔'' سانس لینے کے لیے اسے بہت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی سماعت کو جھٹلانا چاہتی تھی۔ مگر یہ اس کے بس میں نہ تھا۔

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' لفظ اس کے حلق میں دم توڑ رہے تھے۔

''بس یونہی، کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا۔''

''لیکن تمہیں شروع سے پتا تھا کہ میں کرسچن ہوں۔'' ریت بھرا جوتا اس کے پاؤں کو تکلیف دینے لگا تھا۔

''ہاں پتا تھا، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق پڑتا ہے، مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔''

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ میں...... یسوع سے محبت کرتی ہوں۔''

''تم لنگڑا رہی ہو، کیا پیر میں کچھ چبھ گیا ہے؟''

''میں تمہارے لیے یسوع کو نہیں چھوڑ سکتی۔ کسی قیمت پر نہیں۔''

''میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''کیا تم میری خاطر کرسچن ہو جاؤ گے؟''

''تمہارے پاؤں میں واقعی تکلیف ہے۔ شاید تمہارا جوتا تمہیں کاٹ رہا ہے، اسے اتار کر ننگے پاؤں ریت پر چلو، تمہیں اچھا لگے گا، یہاں زیادہ کیکڑے نہیں ہوتے۔''

''خدا کے لیے تم مذہب تبدیل کر لو۔'' وہ گھگھیائی۔

ایک اور ستارہ ٹوٹا اور اس کی راکھ تاریکی میں بکھر گئی۔

''Poncho کا رواج آج کل ختم ہو رہا ہے۔ ان دنوں تو صرف بچے ہی اسے پہنتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ تم اس میں اچھی نہیں لگ رہیں، تم پر تو ہر لباس جچتا ہے۔''

پرنیاں نے نیم تاریک فضا میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانا شروع ہو گئی تھی۔

''تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''کیونکہ تمہیں یہ سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے۔ مذہب اور مجھ میں سے تمہیں کسی ایک کو چننا پڑے تو کسے چنو گی۔''

''تم میرے ایمان کے مقابل نہیں آ سکتے۔ میں تمہارے لیے، کسی کے لیے بھی یسوع کی طرف سے منہ نہیں پھیر سکتی۔''

اسے اپنے ہونٹوں پر سمندری پانی کی نمکینی محسوس ہوئی۔

''تم نے کہا تھا، تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔''

''ہاں وہ تو میں......لیکن۔''

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو کہ دنیا کی کوئی بھی شے ہمارے درمیان نہیں آ سکتی۔''

''وہ خداوند ہے، دنیا نہیں۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تم میرے پاس نہ آؤ۔''

''انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''محبت میں نفع نقصان کون دیکھتا ہے؟''

وہ ٹھہر گئی تھی۔ گیلی، بوجھل ریت پاؤں کی انگلیوں اور تلوے کی کھال میں درد کی سوئیاں چبھو رہی تھیں۔

وہ گرانٹ یا احمد جو بھی تھا، اس سے دور جا رہا تھا۔ پرنیاں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ایک قدم اٹھانا بھی محال تھا۔

ایک اور تارا ٹوٹ کر روشنی کی جلتی لکیر میں ڈھلا اور بحر الکاہل میں غرقاب ہوا۔ اس نے کسی ایک رات میں اتنے تارے ٹوٹتے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

✠ ✠ ✠

ہالی ووڈ......روئے گیتی پر ایک ایسا خطہ تھا، جہاں خوابوں کی کاشت کی جاتی تھی۔ یہاں ہر رنگ اور ہر نوع کے خوابوں کی تجسیم ہوتی تھی۔ بوالعجبی اس جگہ کا وصف تھا۔ یہاں کچھ بھی ممکن تھا۔ گلاب اگر نیلے رنگ میں نہیں پایا جاتا تو یہ باقی جہان کا مسئلہ ہوگا، یہاں نیلے گلاب بھی کھلتے تھے۔

احمد چند خوابوں کے بیج مٹھی میں دبائے، اس زمین کی کوکھ سے کانچ کی فصل اگانے کی آس لیے آیا تھا۔

ایک چمکیلی گرم دوپہر میں جب وہ وائن اسٹریٹ پر بس سے اترا تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ وہ خوش تھا، یہ اسے ایک نظر دیکھ کر کوئی بھی جان سکتا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا، یہ وہ کسی کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ خاصی دیر ہالی ووڈ بلیورڈ پر گھومنے کے بعد وہ وائن اسٹریٹ پر واپس آیا اور راہ چلتے ایک لڑکے سے براؤن ڈربی ریسٹورنٹ کی سمت معلوم کی۔ قریباً چار گھنٹے قبل اس نے دو باسی Muffins کھائے تھے۔ لیکن اسے بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ براؤن ڈربی میں بہت سے ستارے کھانا کھانے کے لیے آتے تھے۔ اسے امید تھی کہ شاید اس وقت بھی وہ ان میں سے کسی کو دیکھ پائے۔ اسی لیے وہ سفر کی تھکان کو بھلا کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے کوئی مانوس چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیواروں پر بنائے گئے ستاروں کے Caricatures (مبالغہ آمیز خاکے) کو دیکھنے لگا۔ مشہور تھا کہ کلارک گیبل نے یہیں پر Carole Lombard کو پروپوز کیا تھا اور آج وہ خود اسی جگہ موجود تھا اور کچھ دنوں بعد وہ باقاعدگی سے یہاں کھانا کھانے آیا کرے گا۔ اس نے دیواروں کو چھو کر خود کو یقین دلایا تھا۔ کسی کے پکارنے پر وہ مڑا۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟''

وہ ایک ویٹرس تھی۔

''ہاں ضرور۔'' احمد نے بیک پیک کو کندھے کے جھٹکے سے اچھال کر کمر کے درمیان میں کھسکایا اور زور سے ہنسا۔ ''مجھے یہاں سے باہر نکال دو ورنہ شاید میں یہیں رہائش اختیار کر لوں۔''

✠ ✠ ✠

مورش بورڈنگ ہاؤس سہ منزلہ تھا اور اس کے ساتھ مختصر پاتیو بھی بنا ہوا تھا۔ عمارت پرانی اور غیر متاثر کن تھی، البتہ شام سے وہ جن چار جگہوں کو دیکھ چکا تھا۔ ان میں سب سے بہتر اسے یہ ہی بورڈنگ ہاؤس لگا تھا۔

''تم نے لکھا ہے کہ یہاں سستی رہائش میسر ہے۔'' اس نے جیب سے مقامی اخبار کا مڑا تڑا ورق نکال کر جھری زدہ لمبوترے چہرے والے اسمتھ ہاکنز کے سامنے پھیلایا اور انگلی رکھ کر شائع کردہ اشتہار کی نشاندہی کی۔

''آئے کہاں سے ہو؟'' اس نے اخبار احمد کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف اچھال دیا۔

''خاصی دور سے۔''

''کرتے کیا ہو؟''

''ابھی تو کچھ نہیں، لیکن بہت کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔ میں دراصل فلموں میں......''

''میں سمجھ گیا۔'' اسمتھ ہاکنز نے عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔ ''تمہیں کمرہ دے کر مجھے فخر محسوس ہوگا، کیونکہ مستقبل قریب میں تم کوئی عظیم اور مشہور شخصیت بننے والے ہو۔ فلمی اداکار یا قلم کار یا پھر شاید موسیقار۔''

''تم کو یہ اندازہ کیسے ہوا؟'' اس کے طنز سے احمد بے حد محظوظ ہوا۔ ''اسمتھ ہاکنز اپنی کہی ہوئی بات پر ایک روز بہت شرمسار ہوگا۔'' یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگا تھا۔

''کیونکہ تم جیسے لوگ چہرے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پچھلے پچیس سالوں سے اس بورڈنگ ہاؤس میں ایسے ہی لوگ رہتے آئے ہیں۔ اس وقت بھی میرے پاس اسکرپٹ رائٹر میاں بیوی، دو یا تین گلوکار اور چند ایک فلم ایکٹرز رہ رہے ہیں۔ صلاحیتوں کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔ تمہیں یہاں رہ کر بہت اچھا لگے گا۔ ایک ہفتے کے آٹھ ڈالر۔''

''یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ زیادہ ہیں۔ اس میں تھوڑی کمی۔'' ہاکنز نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ویسٹ ہالی ووڈ میں اتنی اچھی جگہ پر تمہیں اس سے سستی رہائش ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔''

''میں چھ ڈالر دے سکتا ہوں۔''

''بے کار بحث کر رہے ہو۔ یہ بورڈنگ ہاؤس سالویشن آرمی (ایک خیراتی ادارہ) کی ملکیت نہیں ہے۔ اور ناشتا بھی اس میں شامل ہے۔ میری بیوی بہت عمدہ پین کیکس بناتی ہے۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تم شام سے ادھر ہی منڈلاتے نظر آرہے ہو۔''

آخری جملے اس سے نہیں کہے گئے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ستائیس، اٹھائیس سال کا درمیانی قامت والا لڑکا ملگجے لباس میں کھڑا نظر آیا۔ اندر آتے ہوئے بھی احمد کو وہ پاتیو میں فوارے کے پاس فرش پر بیٹھا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس نے ہاکنز کے سوال پر غور نہیں کیا اور ایک طرف پڑا ہوا احمد کا بیک پیک اٹھالیا۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ یہاں زیادہ سامان لانا حماقت ہے۔ ادھر سب کچھ نئے سرے سے خریدنا پڑتا ہے۔'' بے تکلفی سے اس کا بازو پکڑ کر وہ باہر چل دیا تھا۔

''میرے کسٹمر کو تم کہاں لیے جا رہے ہو؟ ہو کون تم؟ میں پچاس سینٹ کم کر دیتا ہوں۔'' ہاکنز نے جھنجلا کر پکارا، لیکن وہ احمد کو تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ پاگل ہو گیا؟'' احمد نے اپنا ہاتھ چھڑا کر بیک پیک واپس لینا چاہا۔

''مجھے ایک روم میٹ چاہیے۔ میرا اشتہار بھی اسی اخبار میں چھپا تھا۔ لیکن شاید تم نے دیکھا نہیں، میں سہ پہر سے یہاں ٹھہرنے کے لیے آنے والے لوگوں کی نگرانی کر رہا تھا اور مجھے تم سب سے بہتر لگے۔ اب تمہاری بات یہاں تو بنی نہیں، لیکن میرے

ساتھ جا کر تم خوش ہو جاؤ گے۔ کرایہ یہاں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔"
احمد نے ایک طویل سانس لیا۔ اس کے ساتھ جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ آخر اس کے پاس کھونے کے لیے تھا ہی کیا۔
"لوکیشن بہت شان دار ہے۔ سارے فلم اسٹوڈیوز وہاں سے نزدیک ہیں اور تم میری کار بھی استعمال کر سکتے ہو۔ میں نے La cinega Blvd سے استعمال شدہ گاڑیوں کے ایک ڈیلر سے پچھلے ماہ ہی خریدی ہے۔ بہترین حالت میں ہے اور تمہیں یقین نہیں آئے گا صرف تیرہ سو---بکس میں۔ شاید چوری کی ہو۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "مذاق کر رہا ہوں۔"
وہ ایک خستہ حال Dodge Dart Swinger تھی۔ جس کی رنگت زنگ جیسی تھی یا شاید بعض جگہوں پر اسے زنگ بھی لگا ہوا تھا۔ لیمپ پوسٹ کی پیلی روشنی میں احمد کو صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوا۔
"اوہ۔ کیا میں تمہیں اپنا نام بتانا بھول گیا ہوں۔ رائن سدر لینڈ Hells Kitchen سے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ اس جگہ کا نام ایسا واہیات کیوں ہے۔ ویسے مجھے ٹھیک طرح سے معلوم بھی نہیں، شاید کسی Cop کی شرارت ہے۔ مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ میں ان آئرش بدمعاشوں میں سے نہیں ہوں۔ سچ بتاؤ کیا میں صورت سے گینگسٹر نظر آتا ہوں۔ جھوٹ مت بولنا۔"
وہ بہت باتونی تھا۔ اس کے بال سنہری اور ایسے ملائم تھے جیسے مکئی کے بھٹے کا رواں۔ وہ اس کی پیشانی پر بھنوؤں تک گرے ہوئے تھے۔ وہ تیز تیز لہجے اور نہایت اونچی آواز میں بولتا تھا اور مخاطب کا ردعمل جاننے کی زحمت بالکل گوارہ نہیں کرتا تھا۔
"تم ڈرائیو کرو گے؟"
"نہیں مجھے ڈرائیو کرنا نہیں آتا۔"
"تو کوئی بات نہیں، میں تمہیں سکھا دوں گا۔ یقین کرو، تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ میرے پاس ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔ اور میں جانتا ہوں ابتدا میں تمہیں کسی عارضی جاب کی ضرورت ہوگی، اس کا بندوبست بھی میری ذمہ داری ہے۔ وہاں پچھلی طرف کی کھڑکی سے ہالی ووڈ سائن بالکل نزدیک نظر آتا ہے۔ کھانے کی بہت ساری اچھی جگہیں قریب ہیں۔ تم چالیس سینٹ میں کچھ بھی کھا سکتے ہو سوائے Caviar (ایک مہنگی ڈش) کے۔" وہ کسی رئیل اسٹیٹ بروکر جیسی چرب زبانی سے کام لے رہا تھا۔
انجن اسٹارٹ کرنے سے قبل اس نے جوتوں کے تسمے کھولے، پاؤں جوتوں سے نکال کر جرابیں اتاریں اور انہیں اسٹیرنگ وہیل کے اوپر پھیلا کر رکھ دیا۔ اس کے پیروں اور جرابوں سے سخت بدبو اٹھ رہی تھی۔
"اب پیروں کو کچھ راحت ملی۔ بہت دکھن ہو رہی تھی۔ گاڑی کا ایئر کنڈیشنر خراب ہے۔ تم کھڑکی کھول لو۔ خیر آج تو موسم بے حد خوشگوار ہے۔"
احمد نے حیرت سے موسم پر اس کا تبصرہ سنا۔ گرمی کی وجہ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سورج ڈھلے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب بھی ہوا میں ہلکی سی تپش باقی تھی۔ لیکن آج اس کا ہالی ووڈ میں پہلا دن تھا اور اسے کچھ بھی برا نہیں لگ سکتا تھا۔
راستے میں وہ ایک گیس اسٹیشن پر رکے تو رائن نے بدحواسی میں جیب پر ہاتھ مارا۔
"میں اپنا والٹ کہیں بھول آیا ہوں۔ یاد نہیں آ رہا کہاں۔"
گیس اسٹیشن کے مالک نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔
"ایک ڈالر، پانچ سینٹ۔"
"تمہارے پاس ہوں گے؟ بعد میں تمہیں لوٹا دوں گا اور اب تو یہ کار ہم دونوں ہی استعمال کیا کریں گے۔"
احمد نے خاموشی سے رقم کی ادائیگی کر دی تھی۔ کچھ دیر بعد رائن نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
"میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میرا والٹ کبھی گم ہو ہی نہیں سکتا۔ میری یادداشت بہت تیز ہے۔"

جب وہ منزل پر پہنچے تو احمد کو بھوری اینٹوں اور گھن کھائی لکڑی سے بنی بھدی عمارت کو دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ وہ علاقہ بھی شہر کے مصروف حصوں سے خاصا دور تھا۔ رائن کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے اور بتی جلنے کے بعد جس شے پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ ٹیلی ویژن سیٹ کے اوپر پڑی بچے ہوئے کھانے کی پلیٹوں سے نکل کر بھاگنے والے لال بیگ تھے۔ ٹیلی ویژن چل رہا تھا اور اس پر ''I dream of Jeannie'' نشر ہو رہا تھا۔ کمرے کے فرش کا نصف فرسودہ گلیم سے ڈھکا تھا اور باقی ماندہ برہنہ چوبی تختوں سے جا بجا پھانسیں نکلی ہوئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ کھڑکی کے نیچے ایک بیڈ تھا، جس پر میلے کپڑے اور موزے بکھرے تھے۔ ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب فرش پر گرے ہوئے گلاسوں میں سگریٹ کی راکھ اور شراب کی تلچھٹ تھی۔ کچھ دیر میں اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اپارٹمنٹ اس -- ایک کمرے اور ایک مختصر باتھ روم پر مشتمل تھا۔

''میں کہاں سوؤں گا؟''

''قریب ہی پرانے فرنیچر کی دکان ہے۔ وہاں سے ایک آرام دہ سستا میٹرس ڈھونڈنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔'' رائن نے اسے اطمینان دلایا تھا۔

''اب ہمیں کرائے کی بات کر لینی چاہیے۔'' احمد نے اپنا سامان رکھنے کے لیے کوئی مناسب گوشہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔

''صرف چونسٹھ bucks ماہانہ، لیکن تم فکر نہ کرو تمہیں صرف بتیس دینا ہوں گے۔''

''لیکن مسٹر ہاکنز ناشتا بھی کرائے کی رقم میں دے رہے تھے۔''

''پین کیک بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔'' رائن نے برا سا منہ بنایا۔ پہلے تو اسے لگا کہ وہ لاپروا نظر آنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ تھوڑا عرصہ بتانے کے بعد احمد پر واضح ہو گیا کہ ہر معاملے میں اس کا رویہ ایسا ہی سرسری نوعیت کا ہوتا تھا۔ وہ ایک اوسط روایتی امریکن تھا۔ ہنسوڑ، جلد بے تکلف ہونے والا، منہ پھٹ، غیر متعلق اور جذباتی لحاظ سے اتھلا۔

وہ کھردرے فرش پر چادر بچھا کر سویا تھا۔ پوری رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ کچھ آنے والی صبح کے خوش کن خیالوں نے سونے نہیں دیا اور کچھ اوپر Attic میں دوڑنے والے چوہوں کی آوازیں اسے پریشان کرتی رہیں۔

اسپرنگ فیلڈ والے اپارٹمنٹ اور رائن کے اپارٹمنٹ میں کچھ خاص فرق نہیں تھا۔ صرف اتنا کہ اسپرنگ فیلڈ والا اپارٹمنٹ ذرا سا کشادہ اور نسبتاً کم گندہ تھا۔ لیکن چند دن وہاں رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ جب وہ Bel-Air یا بیورلے ہلز -- میں اپنا گھر بنائے گا تو اس اپارٹمنٹ کا خاکہ بھی اسے بھول چکا ہو گا۔ صبح اس نے رائن سے اس کے کام کے متعلق پوچھا تو وہ بولا۔

''میرا کام مووِیز سے متعلق ہے۔ اگر تم بھی اسی سلسلے میں یہاں آئے ہو تو میں تمہاری بہت مدد کر سکتا ہوں۔ فلمی دنیا میں میرے بہت کانٹیکٹس -- ہیں۔''

اس کے حالات سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے روابط کس درجے کے لوگوں سے ہوں گے۔ احمد نے اس کے کام اور کانٹیکٹس -- کے بارے میں مزید تجسس ظاہر نہیں کیا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ کھڑکی سے ''ہالی ووڈ سائن'' نظر آتا ہے۔'' کھڑکی کھولنے پر جب اسے چند گرد آلود پتوں والے پیڑ اور دور تک بے ترتیبی سے بکھری ہوئی کڈھب عمارتیں نظر آئیں تو اس نے رائن کو یاد دلایا تھا۔

''ہاں وہ Binoculars (دوربین) جانے میں نے کہاں رکھ دیے ہیں۔ ویسے میری یادداشت اتنی بری تو نہیں، شاید کوئی ادھار مانگ کر لے گیا ہو۔''

وہ سبز جنگلے والی ٹیرس پر آیا تو اسے دیوار پر رکھا گل صد برگ کا گملا دکھائی دیا۔ چند لمحے وہ زرد پھولوں کو دیکھتا رہا اور پھر

آگے بڑھ کر ہاتھ کی ضرب سے گملے کو نیچے سڑک پر گرا دیا۔ گیندے کے پھول مایوسی اور دکھ کی علامت تھے۔ وہ انہیں ہالی ووڈ میں اپنی کھڑکی میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔



اگلے دو ہفتوں میں اس نے ان تمام جگہوں کی سیر کی جن کے بارے میں وہ بچپن سے سنتا یا پڑھتا آیا تھا اور جنہیں پہلے اس نے صرف اسکرین پر دیکھ رکھا تھا۔ اس نے ہالی ووڈ بلیورڈ پر اٹیچپشن تھیٹر اور چائنیز تھیٹر دیکھے، ہائی لینڈ ایونیو پر عظیم الجثہ ''ہالی ووڈ باؤل'' دیکھا۔ Griffith پارک کی روشوں پر ٹہلا۔ Melrose Avenue پر Panpacific Studio کی عمارت کے گرد چکر کاٹے، سن سیٹ بلیورڈ پر گٹاروں کی بہت سی دکانیں اور Cinerama dome تھیٹر، وہ بیورلے ہلز ہوٹل گیا، جسے پام کے درختوں نے ایک نیم دائرے میں سمو رکھا تھا، بڑے بڑے باغات سے گھرا ہوا ایک شاندار ڈرائیو وے جو بل کھاتا ہوا مرکزی دروازے تک چلا گیا تھا۔ سن سیٹ اسٹرپ پر واقع Duddly Do-right emporium جہاں کھلونے، بھس بھرے جانور، ہاتھوں کے زیور، ہیٹ اور کلائی کی گھڑیاں فروخت ہوتی تھیں۔ اس نے بیورلے ہلز اور Bel-air میں فلمی ستاروں کی رہائش گاہیں بھی دیکھیں۔

وہ جہاں بھی گیا، اسے پام کے درخت ملے، وائن اسٹریٹ ہو یا سن سیٹ بلیورڈ، وہ ہر جگہ تھے۔ پرشکوہ، دیوتاؤں کی مانند قطار اندر قطار، روشن فراخ سرمئی سڑکیں داسیاں تھیں، جو ان کے قدموں میں بچھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک اچھا فوٹو گرافر تلاش کیا اور پچاس ڈالر میں اپنا Portfolio تیار کروایا۔ ایک Haberdashery سے کچھ اچھے Outfits حاصل کیے۔ اس کے پاس بہت کم رقم تھی، لیکن ان لوازمات کے بغیر وہ ہالی ووڈ کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ اسے خود کو سجا کر بہترین روپ میں پیش کرنا تھا۔ خیر رقم کوئی ایسا گمبھیر مسئلہ نہیں تھی۔

جونہی اس نے اپنا پہلا پروجیکٹ سائن کیا، اس کی وارڈ روب پیرس اور لندن کے بہترین ڈیزائنرز ترتیب دیا کریں گے۔

جو وقت باقی بچا اس میں وہ رائن سے ڈرائیونگ سیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ براہ راست پروڈکشن کمپنیوں یا کاسٹنگ ڈائریکٹرز سے نہیں مل پائے گا۔ اس کام کے لیے اسے ایک اچھے اور نامور ایجنٹ کی ضرورت تھی۔ تخلیق کاراداروں اور فن کاروں کے درمیان ایجنٹوں کی حیثیت بالکل وہی تھی، جو کینوس اور رنگوں کے بیچ موقلم کی ہوتی ہے۔ اس دیس میں ایجنٹ ہی تھے جو فن کار کو ''ستارہ'' بناتے تھے۔ Screen Actor میں دیے گئے انڈسٹری کے بہترین ایجنٹوں کی فہرست سے لیس ہو کر وہ اپنی پہلی مہم پر روانہ ہوا۔

جارج فلپ کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ اس نے نصف درجن سے زائد اداکاروں کو بین الاقوامی شناخت دلوائی تھی۔ سالانہ کئی ملین ڈالر کمانے والے موسیقار، پیانسٹ، کامیڈینز اس کے گاہک تھے۔ ایک بار وہ جس کا ہاتھ تھام لیتا اس کے لیے تمام مووی اسٹوڈیوز کے دروازے کھل جاتے۔ اس کے پاس جادو کی کنجی تھی۔ احمد کی فہرست میں سب سے پہلا نام جارج فلپ کا تھا۔

گلابی موزیک کا فرش اور ہم رنگ چرمی پوششوں سے مڑھے صوفے، قدِ آدم فرانسیسی طرز کی آرائشی کھڑکی، ساگوان کی وسیع الماری اور اس کے پہلو میں دیوار پر آویزاں William Hogarth کی پینٹنگ The bench کی نہایت عمدہ نقل، وہ آفس امارت اور خوش مذاقی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

سنہری، لچھے دار بالوں والی لڑکی، جس نے پنسل اسکرٹ پہن رکھا تھا، اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر دوبارہ Daily

Variety کے پرانے ایشو میں مشغول ہوگئی، اس کے قریب جا کر کھنکارنے پر بھی اس کا زاویہ نگاہ نہیں بدلا تھا۔ یہ احمد کے لیے پہلا دھچکا تھا۔ وہ خوب صورت تھا اور صنف مخالف کے لیے بے حد پرکشش، اس بارے میں اسے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔

''میں مسٹر فلپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟''

''میں ایکٹر ہوں اور چاہتا ہوں کہ بطور ایجنٹ وہ میری نمائندگی کرے۔ Blonde کے جھکے ہوئے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیلی، جیسے اس نے کوئی لطیفہ سن لیا ہو یا شاید اسے میگزین میں کوئی بات ہنسنے کے قابل مل گئی تھی۔''

''اپائنٹمنٹ لیا تھا؟''

''نہیں۔''

''تو اپائنٹمنٹ لے کر دوبارہ آنا۔''

''میں بہت دور سے آیا ہوں اور میرے پاس کار بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تو اپنا پورٹ فولیو اور ٹیلی فون نمبر دے جاؤ۔ میں تمہیں کال کرلوں گی۔'' اس نے میگزین سے نظر ہٹائے بنا اس کا پورٹ فولیو لے کر میز پر رکھ دیا۔

اس کے رویے سے احمد کو بالکل امید نہیں تھی کہ وہ جارج فلپ سے اس کا ذکر بھی کرے گی۔ اس برف کو پگھلانے کے لیے اسے فوراً کچھ کرنا ہوگا۔ اس نے گلا کھنکارا اور کیری گرانٹ کی آواز میں بولا۔

''میرے ساتھ احتیاط سے پیش آؤ، میں گراں مایہ مال ہوں۔'' سنہری بالوں سے ڈھکا وہ سر نہیں اٹھا۔ دوسرا دھچکا۔

''یہ کیا تھا؟''

''کیا تم نے North by North west نہیں دیکھی۔ یہ کیری گرانٹ کے کردار Roger Thornill کا مکالمہ ہے اور شاید تم نے دھیان سے نہیں سنا۔ میں نے گرانٹ کی آواز میں ہی مکالمہ ادا کیا ہے۔ ہو بہو وہی لہجہ۔''

''میں پرانی موویز نہیں دیکھتی اور کیری گرانٹ اب ماضی کا قصہ ہو چکا۔'' اس بار اس نے میگزین رکھ کر پورٹ فولیو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ اپنے باس کو ایک بہترین کلائنٹ سے محروم کرنے جا رہی تھی۔

''کریڈٹس میں کچھ نہیں ہے؟'' احمد نے سچ بتانا چاہا اور پھر بروقت اسے خیال آیا کہ وہ دوبارہ بگڑ سکتی تھی۔

''وہ سب میں خود مسٹر فلپ کو بتاؤں گا۔ میں روایتی انداز میں کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' یہ بات کس قدر غیر موزوں تھی، اس کا اندازہ خود احمد کو بھی تھا، مگر اس کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔

پہلی بھرپور نظر اس کی سراپے پر گھومی۔ برف پگھل رہی تھی۔ احمد نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے ان سبز آنکھوں کو خوش آمدید کہا تھا۔

''تم نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ تم روایت سے کچھ زیادہ ہی روگردانی کر رہے ہو۔'' اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا اور تب اس کی نظر دیوار پر سجی فریم شدہ رنگین تصویر پر پڑی۔ وہ Charade کا پوسٹر تھا -- کیری گرانٹ اور آڈرے -- ہیپ برن ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے کیسے انوکھے لگ رہے تھے۔

''میرا اسکرین کا نام ایڈم گرانٹ ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''بہت دلچسپ نام ہے۔'' ایک دفعہ پھر اسے شک گزرا کہ وہ طنز کر رہی تھی۔

''کس ایکٹنگ سکول سے تربیت حاصل کی ہے؟''

جواب دیتے ہوئے وہ ہچکچایا تھا۔ ''کسی بھی ایکٹنگ سکول سے نہیں۔ میں فطری اداکار ہوں، مجھ میں قدرتی......''

''براڈوے کا کوئی تجربہ؟''

''نہیں۔''

''آف براڈوے؟''

''نہیں۔''

''ٹیلی ویژن؟''

''نہیں۔''

''فلم؟''

وہ خاموش رہا۔

''تو وہ کون سے کریڈٹس ہیں، جن کا ذکر تم مسٹر فلپ سے کرو گے؟'' وہ اس کا پورٹ فولیو اسے لوٹا رہی تھی۔ یہ اس کے لیے جانے کا اشارہ تھا۔

''میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔ میں اسے قائل کرلوں گا۔ مجھ پر یقین کرو۔''

''وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے اور اگر آفس میں ہوتا تو بھی اس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ صرف پروفیشنل ایکٹرز کی نمائندگی کرتا ہے۔'' اس نے کلائی میں بندھی روپہلی زنجیر والی گھڑی میں وقت دیکھا اور نشست سے اٹھ گئی۔

''میرے لنچ کا وقت ہوگیا ہے۔ تم سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ وقت آسانی سے گزر گیا، شکریہ۔''

اس کے جانے کے بعد احمد کچھ دیر وہیں ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے چند گہری سانسیں بھریں اور مڑ کر آفس سے باہر نکل آیا۔ اس معمولی سیکریٹری کی بد دماغی سے وہ ہمت نہیں ہارے گا۔ اگر جارج فلپ اس کا ایجنٹ نہیں بن سکتا تو خسارہ خود جارج کے حصے میں آنے والا تھا۔

اس نے ذہن میں محفوظ شدہ ناموں پر غور کرتے ہوئے دوسری ایجنسی کا انتخاب کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ یہاں بھی اس کے ساتھ بالکل وہی سلوک ہوا جو جارج فلپ کے آفس میں کیا گیا تھا۔ وہ لوگ اس سے بات کرنے کے روادار نہ تھے۔

اگلے چند روز میں اس نے ہالی ووڈ کے تمام درجہ اول اور درجہ دوم کے ایجنسز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، نتائج کم و بیش ایک سے ہی تھے۔

''تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ اتنی بڑی ایجنسی تمہیں خوش آمدید کہے گی۔''

''مسٹر کنتھرا اپنی فیملی کے ساتھ جنیوا گئے ہیں۔ واپسی کے بارے میں علم نہیں۔''

''کیا تم حقیقت میں بھی اتنے ہی بے وقوف ہو، جتنے شکل سے نظر آتے ہو۔''

''تم ایک ہفتے میں پچاس دفعہ ٹیلی فون کر چکے ہو۔ تم ٹیلی فون آپریٹر بننے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔''

''وہ پورٹ فولیو نہیں محض فوٹو البم ہے اور تم بہت ہاٹ لگ رہے ہو۔ تم جب بھی مجھے ڈیٹ پر جانے کی دعوت دو گے میں انکار نہیں کروں گی۔''

''تم ایک Nonentity ہو۔ اس ایجنسی کے لیے تمہارے ساتھ اپنا نام جوڑنا شرم ناک ہوگا۔''

''کیا سیدھے مریخ سے آرہے ہو؟ مہذب دنیا کے رواج نہیں جانتے؟ میں بتا چکا ہوں مسٹر پی باڈی جونیئر میٹنگ میں ہیں اور یہ میٹنگ پورا سال جاری رہے گی۔ آئندہ ٹیلی فون کر کے اپنا قیمتی وقت برباد مت کرنا۔''

چھ ماہ میں اس نے ان تمام دروازوں پر دستک دی، جو اسے کامیابی کی راہ پر گامزن کر سکتے تھے، لیکن اس کی ہر دستک رائیگاں گئی۔ اسے ان تمام اداروں نے دھتکار دیا تھا اور اب صرف وہ ایجنٹ بچے تھے جن کے ساتھ وہ خود کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ اس کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے۔ اس کی صلاحیتوں کو پرکھے بنا اس کے مستقبل کے بارے میں کیسے فیصلہ صادر کیا جا سکتا تھا۔

وہ جارج فلپ کے آفس میں ساتویں بار آیا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی۔۔ بلونڈ کیتھی نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''وہ آفس میں نہیں ہے۔'' اس کے دریافت کرنے سے قبل ہی کیتھی نے بتایا تھا۔

''میں اس سے ملنے نہیں آیا۔''

''تو؟''

''میرا خیال ہے کہ مجھے تم اچھی لگنے لگی ہو۔''

''دیکھو میں صرف ایک سیکریٹری ہوں۔ میں اس کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ اس کے تمام کلائنٹس سپر اسٹارز ہیں، اس نے کبھی کسی نو وارد کو......''

''پہلی ملاقات میں تم مجھے اتنی دلکش نہیں لگی تھیں، لیکن دوسری بار اور پھر تیسری بار...... میرے خدا، میں بیان نہیں کر سکتا۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

''تم میرے ذریعے اس تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''تمہارے ذریعے تم تک تو پہنچ سکتا ہوں۔ کیا میں چہرے سے ایسا ہی سادہ لوح نظر آتا ہوں۔ ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد ہی مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ میں قیامت کے دن تک جارج فلپ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ میں صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آتا رہا اور تمہیں جان کر خوشی ہو گی کہ میں Actors West میں enrol ہو گیا ہوں۔''

کیتھی کچھ دیر بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی اور جب بولی تو اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ ''میں تمہارے لیے بہترین کیریئر کی خواہش کرتی ہوں۔ میری ذاتی رائے میں تم میں بہت اچھا اداکار بننے کی استعداد ہے۔ اب تم نے صحیح راہ کا انتخاب کیا ہے۔ Actors West ایک مایہ ناز ادارہ ہے۔ اور...... تمہاری آنکھوں کی پتلیاں کتنی بڑی ہیں بالکل سیاہ زیتون کی طرح، میں نے پہلے غور ہی نہیں کیا۔''

احمد مسکرایا۔ ''میں نہیں جانتا، تمہیں زیتون پسند ہیں یا نہیں۔''

''اوہ...... میں ان کی پرستش کرتی ہوں۔''

احمد قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''آج رات میرے ساتھ ڈنر کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''بہت حسین خیال ہے، لیکن اس وقت تمہیں جانا ہو گا، میں تمہیں کال کروں گی۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ مسٹر فلپ کچھ اہم لوگوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہے۔ اور کچھ دیر بعد وہ فاکس اسٹوڈیو چلے جائیں گے۔ ابھی میں اندر کافی دینے جا رہی ہوں۔''

احمد اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ ''تو ٹھیک ہے میں تمہاری کال کا منتظر رہوں گا۔ تمہارے ہاں آج رات کا مطلب آج رات ہی ہوتا ہے نا۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، مگر جانے کے بجائے وہیں راہداری میں دیوار سے چپک کر کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے دروازے میں ذرا سی جھری پیدا کر کے اندر جھانکا اور کیتھی کو وہاں موجود نہ پا کر دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔

جارج فلپ ایک ادھیڑ عمر، دراز قد، دبلا، باریش اور قدرے گنجا شخص تھا۔ اس کے مقابل صوفے پر اس کے دو ہم عمر مرد اور ایک دلکش سراپے والی brunette بیٹھی تھی۔ ان سب نے ایک ساتھ ہی احمد کو تیزی سے اندر گھستے دیکھا تھا۔

''میں ایک بہت باصلاحیت ایکٹر ہوں، لیکن میرے پاس کوئی ایکٹنگ کریڈٹس نہیں ہیں۔ تم مجھے ہالی ووڈ میں متعارف کرواؤ اور میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔'' کسی کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ عجلت زدہ آواز میں بولنے لگا۔

''مجھے ایک بار سن لو، مجھے آزما کر دیکھ لو اور اس کے بعد کوئی فیصلہ سنانا۔''

جارج فلپ کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا، لیکن احمد نے اسے موقع نہیں دیا۔ ''پڑھنے کے لیے مجھے کوئی اسکرپٹ دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے بے شمار فلموں کے مکالمے زبانی یاد ہیں۔''

اسے علم تھا، اس کے پاس بہت کم مہلت تھی۔ جارج اسے کسی بھی لمحے آفس سے باہر نکلنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور جب اس کے لبوں سے آواز برآمد ہوئی تو وہ To catch a Thief کا چور Robie John تھا۔

''میں نے چوری کو کیوں اختیار کیا۔ بہتر زندگی جینے کے لیے، ان چیزوں کو پانے کے لیے جنہیں میں حاصل نہیں کرسکتا تھا، اس اچھے مذاق کو اپنانے کے لیے جس سے تم اب محظوظ ہوتے ہو اور جسے ترک کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔''

پھر وہ رزمیہ فلم Gone with the wind کا سورما Rhett Butler بن گیا اور وہ بھورے بالوں والی لڑکی اس کی Scarlet تھی۔

''جنوب کا ایک سپاہی ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ Scarlet جو اپنے گرد تمہاری بانہوں کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے بوسوں کی یادداشتیں اپنے ساتھ جنگ میں لے جانا چاہتا ہے۔ مجھے چاہنے کے بارے میں کچھ خیال نہ کرنا۔ تم وہ عورت ہو جو ایک سپاہی کو اس کی موت کی طرف روانہ کررہی ہے......ایک حسین یاد کے ساتھ......Scarlet مجھے بوسہ دو، مجھے بوسہ دو، ایک بار۔'' وہ brunette کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہایت جذب سے بول رہا تھا۔ پھر جب اس نے روپ بدلا تو وہ Its a Wonderful Life کے George Bailey میں ڈھل گیا جو اپنی بیوی میری سے مخاطب تھا۔

''تمہاری چاہ کیا ہے۔ میری؟ تم کیا مانگتی ہو؟ تم چاند کی تمنائی ہو؟ بس کہہ ڈالو اور میں اس پر سرک پھندا ڈالوں گا اور اسے نیچے کھینچ لوں گا۔ ہاں یہ بہت سہانا خیال ہے۔ میں تمہیں چاند دے دوں گا۔ میری اور تب تم اسے نگل لینا اور وہ سارا گھل جائے گا۔ دیکھو اور کرنیں تمہاری انگلیوں اور تمہارے پنجوں اور تمہارے بالوں کی نوکوں سے پھوٹنے لگیں گی۔''

وہ جیسے منہ زور لہروں کی زد میں تھا۔ اسے ان چار لوگوں کی نظروں اور ان کے تاثرات کی قطعاً پروانہ تھی۔ اسے کلاسیکی انگریزی ادب سے بھی کچھ سنانا چاہیے تھا۔ شیکسپیئر کے ''رومیو اینڈ جولیٹ'' کے خوب صورت الفاظ اس کے ذہن کے پردے پر مرتسم ہوئے۔

''قندیلیں شب کی بجھ گئیں اور کھلکھلاتی فجر چوٹی پہ دھندلے کوہ کی پنجوں کے بل ہے جلوہ گر......''

جارج نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ اتنا ہی بہت ہے۔''

احمد خاموش ہو کر دانتوں سے نچلا ہونٹ کچلنے لگا۔ جارج کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے اندر روشنی پھیلنے لگی۔ کیا وہ اس کے ہنر کو پہچان گیا تھا؟ کیا وہ اس کا ایجنٹ بننے پر راضی ہو جائے گا۔ بمشکل خود پر قابو پا کر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ جارج نے میز پر پڑے ہوئے پیڈ میں سے ایک کاغذ کھینچا، اس پر کچھ لکھنے کے بعد اسے تہ کیا اور کاغذ احمد کی طرف بڑھا دیا۔

''اس تاریخ کو مجھے ملنا۔''

''میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ تم عظیم شخص ہو۔ تم میرے محسن ہو۔'' لرزتے ہاتھوں میں کاغذ کا پرزہ تھام کر وہ جانے کے لیے مڑا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکا اور گھوم کر واپس آیا۔

''یہ کیا ہے؟ تم نے پندرہ سال بعد کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔''

''اتنے عرصے تک مجھے بالکل امید نہیں کہ مجھ پر اتنا برا وقت آ جائے گا کہ میں تم جیسے گھٹیا اور نقلی فنکار کی نمائندگی کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ تم ایک mocking bird (نقال پرندہ) سے زیادہ کچھ نہیں۔''

ٹرے میں کافی کی پیالیاں سجائے آتی ہوئی کیتھی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''Actors West بھی تم جیسے غلیظ لوگ چلاتے ہیں۔ وہ بھی صرف پروفیشنل ایکٹرز کو قبول کرتے ہیں، کتیا۔''

وہ اسے سختی سے ایک طرف دھکیل کر چلا گیا تھا۔

بہت دیر سے Men's room میں آئینے کے سامنے کھڑا وہ اپنے منتشر حواس قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنے پہلو میں اسے کھچڑی بالوں والا فربہی مائل مرد نظر آیا۔ وہ ان ہی دو آدمیوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ جارج فلپ کے آفس میں دیکھ چکا تھا۔''

''تم میں صلاحیت ہے۔ یہ بات شبے سے بالاتر ہے، لیکن تم ان بڑے ناموں والی ایجنسیوں میں وقت گنوانے کے بجائے نچلی صفوں سے کوشش شروع کرو۔''

اس نے کچھ غیر معروف ایجنٹوں کے نام گنوائے۔

''لیکن میں نے ان میں سے کوئی بھی نام پہلے نہیں سنا ہوا۔''

''اس کا بھی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے کسی نے تمہارا نام پہلے سے سن رکھا ہو۔ کوئی بھی زینہ پار کرنے کے لیے نچلے قدمچوں سے ہی آغاز کیا جاتا ہے۔''

''کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟ تم کون ہو؟'' اچانک خیال آنے پر اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''نہیں۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔ میں کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتا۔''

احمد نے دل میں اس کے اصولوں پر لعنت بھیجی تھی۔

''اور تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔ دوسروں کی نقالی کرنے کے بجائے اپنا الگ انداز اپناؤ۔ دوسروں کی تقلید میں بھاگنے سے تمہاری انفرادیت سامنے نہیں آ سکے گی۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر بولا تھا۔

⌘ ⌘ ⌘

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے رائن سدرلینڈ سے بات کرنے کا سوچا۔ وہ بلڈنگ کے مشترکہ کچن میں ہاٹ پلیٹ پر اپنی گیلی جرابیں رکھے انہیں سینک رہا تھا۔

''تم کہہ رہے تھے تمہارا کام مووِیز سے متعلق ہے اور تمہارے خاصے کانٹیکٹ ہیں۔''

''مجھے معلوم تھا تمہیں میری ضرورت پڑے گی اور میں صحیح وقت کا منتظر تھا۔ میں نے تمام بڑے مووی اسٹوڈیوز میں کام کیا ہے۔ تم کسی کا بھی نام لو اور وہ میری فہرست میں موجود ہوگا۔ Paramount، Columbia، Fox، Universal، M.G.M.''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' احمد کو یقین نہیں آیا تھا۔

''تمہاری حیرانی کی وجہ میں سمجھتا ہوں۔تم سوچ رہے ہو گے کہ پھر میں سیلبرٹی -- کیوں نہیں ہوں۔ میں جب بھی بتاتا ہوں لوگ ایسے ہی حیران ہو جاتے ہیں۔ حیران لوگوں کی شکل دیکھنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔''اس نے بھنوؤں پر گرے ہوئے بالوں کو سر کی جنبش سے ذرا سا ہٹایا۔

''لیکن تم کام کیا کرتے ہو؟''

''میرا کام اس وقت ہوتا ہے جب شوٹنگ نہیں ہو رہی ہوتی۔ میں نے پچاس سے زائد فلموں میں کام کیا ہے، لیکن میں تمہیں کسی میں بھی نظر نہیں آؤں گا۔ دیکھا اور حیران ہو گئے تم۔ میں ایک Stand-in ہوں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''تو تم نہیں جانتے؟ ظاہر ہے تم ابھی نئے نئے یہاں آئے ہو۔ تمہیں یہاں کی زبان کیا سمجھ میں آئے گی۔ Stand-in دراصل لیڈز اور سیکنڈری لیڈز کو لائٹنگ کے طویل اور بیزار کن عمل کی کوفت سے بچانے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ جب ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی سیٹ پر لائٹنگ کی دیکھ ریکھ کرتا ہے تو اصل ایکٹرز کی جگہ Stand-ins سیٹ پر موجود رہتے ہیں۔ کبھی کبھی میں مارٹن کے Body double کے طور پر بھی کام کرتا ہوں۔ وہ بہت مصروف اداکار ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے اکثر کام مل جاتا ہے۔ لیکن تم یہ کام نہیں کر سکتے، کیونکہ Stand-in کا قد، جسامت، جلد کا رنگ اور بالوں کی رنگت اصل ایکٹر سے مطابقت رکھتی ہو گی تو ہی سیٹ کو درست طریقے سے لائٹ -- کیا جا سکتا ہے -- لاطینی یا ایشین ایکٹرز تو انڈسٹری میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔''

احمد ایسا کام کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو اپنی تذلیل کرنے کے مترادف تھا۔

''ایک اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر میرا جاننے والا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملواؤں گا۔ وہ کئی B-movies کے لیے بیک گراؤنڈ پرفارمرز (ایکسٹرا) مہیا کرتا ہے۔'' رائن نے جرابوں کو ناک کے قریب لا کر سونگھا اور پھر اطمینان کا اظہار کر کے انہیں کچن کاؤنٹر پر دھری ایک رکابی میں رکھ دیا۔''اس نے ایک بار مجھے باسکٹ بال میچ کے ناظر کا کردار دلایا تھا۔ میں پورے پانچ سیکنڈ ایک جھنڈا لہراتے ہوئے دکھائی دیتا ہوں، لیکن وہ کمینہ جھنڈا میرے منہ کے سامنے رہتا ہے۔''

احمد کو ایسے ادنیٰ شخص سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے رائن کی یاوہ گوئی ان سنی کرتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے رات کے اوقات کی کوئی عارضی جاب دلا دو، ورنہ اگلے ماہ کا کرایہ میں نہیں دے پاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں، لیکن آج رات تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔''

''کیسی مدد؟''

''آج گریس آ رہی ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''میرا مطلب ہے، تم کہیں اور سو جاؤ۔''

''مثلاً کہاں؟ کیا سڑک پر۔'' اسے غصہ آنے لگا۔

''میں تمہیں سڑک پر نہیں سونے دوں گا۔ میرے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ تم میری کار میں سو سکتے ہو اور جاتے ہوئے یاد سے کشن لے کر جانا۔ پچھلی سیٹ کا ایک سپرنگ نکلا ہوا ہے۔ وہ چبھے گا تو تمہیں اچھی نیند نہیں آ سکے گی۔''

✠ ✠ ✠

داغ دار فرنیچر اور بوسیدہ دفاتر والے بچے کھچے ایجنٹوں سے رابطہ کرنے پر احمد کو خلاف توقع ردعمل کا سامنا کرنا پڑا، ان

میں سے کوئی بھی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ ٹیلی فون پر اس سے بات تک کرنے پر تیار نہیں تھے۔ بے شمار بار رد کیے جانے کے بعد وہ جن ایک دو ایجنٹس سے ملنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ ان کا رویہ ناقابل برداشت حد تک حوصلہ شکن تھا۔

''تم سے بڑے چغد سے میں آج تک نہ ملا۔ لیڈنگ رولز کا نام بھی مت لو۔ وہ لوگ کسی مختلف مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ تم ایکسٹرا نہیں بننا چاہتے؟ کیا تم جان وائن اور شرلے ٹمپل سے زیادہ -- بڑی شے ہو۔ جب وہ ایکسٹرا کے طور پر کام کر سکتے ہیں تو تم۔ تم مجھے غصہ دلا رہے ہو۔''

✠ ✠ ✠

''کیا تمہارے پاس کوئی اسپیشلٹی ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''کیا تم۔ بیس بال کھیل سکتے ہو یا گھڑ سواری آتی ہے یا ڈانس کرنا جانتے ہو یا پھر سر کے بل چل سکتے ہو۔ کچھ بھی۔ کوئی مہارت ہے تم میں۔''

''لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ایکسٹرا بننے کے لیے کسی نہ کسی اسپیشلٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر تم کو کوئی بھی فلم میں ہائر نہیں کرے گا۔''

''میں ایکسٹرا کے طور پر کام نہیں کروں گا۔ اگر مجھے لیڈ نہیں مل سکتی تو میں کریکٹر رول کے لیے۔''

''احمقوں کی جنت میں رہنا چھوڑ دو۔ زیادہ سے زیادہ میں تمہیں کسی ٹیلی ویژن سوپ میں Bit Part دلوا سکتا ہوں۔ Bit Player کے پاس بولنے کے لیے کم از کم ایک لائن ہوتی ہے جبکہ ایکسٹرا کو کوئی مکالمہ نہیں دیا جاتا۔''

✠ ✠ ✠

اسٹوڈیو کے Guard's Gate پر موجود گارڈ نے اسے کار روکنے کا اشارہ کیا تھا۔

''میں اندر جانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے اس میں کوئی شک نہیں لیکن تم کس سے ملو گے؟ اپنا تعارف کرواؤ۔''

''میں ایڈم گرانٹ ہوں اور میں۔'' وہ تذبذب کا شکار ہوا، اسے کس کے ساتھ ملاقات کا بہانہ بنانا چاہیے تھا۔ کسی اسٹوڈیو ہیڈ کا نام لے، کسی ڈائریکٹر یا پھر کسی پروڈیوسر کا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد گارڈ کو ایک نام بتا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گارڈ اس کے جھوٹ کو سچ جان کر اسے اندر جانے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن وہ روسٹر کھول کر اس کے اوراق پلٹنے لگا تھا۔ احمد کے حلق سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ اس روسٹر میں نام لکھوانا کیسے اعزاز کی بات تھی۔ گارڈ کا جھکا ہوا سر اٹھنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے لوٹ گیا تھا۔

✠ ✠ ✠

Burbank میں آڈیشن کا اشتہار مقامی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک بڑے ادارے کی طرف سے منعقد کیا جا رہا تھا۔ انہیں ایکٹنگ کے شائق لڑکے لڑکیوں کی ضرورت تھی۔ احمد صبح سات بجے ہی وہاں پہنچ گیا تھا حالانکہ آڈیشن دس بجے شروع ہونے والے تھے وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی دوسرے امیدوار سے قبل وہاں پہنچ جائے۔

وہ تھیٹر کے Foyer میں داخل ہوا تو اس کے قدم زمین سے چپک کر رہ گئے۔ وہاں اتنے نوجوان موجود تھے کہ کھڑے ہونے کے لئے بھی بمشکل کچھ جگہ بچی تھی۔ اس کی باری دوسرے روز لنچ کے بعد آئی تھی اور ایک پارک میں بنچ پر بے خواب رات گزارنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجن زدہ اور لباس شکن آلود تھا۔

ان پانچ لوگوں میں سے وہ دو کو پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک کامیاب اسکرپٹ رائٹر تھا اور دوسرا اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ڈائریکٹر۔ اتنے مشہور لوگوں کو پہلی بار اپنے روبرو پا کر اس پر خفیف سی گھبراہٹ طاری ہوگئی لیکن اسے ان پر ثابت کرنا تھا کہ وہی ان کا صحیح انتخاب تھا۔ وہ گردن تان کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اعتماد سے مسکرایا۔

''تم واپس جاؤ''

اسے اندر داخل ہوئے دس سیکنڈ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اسے باہر نکلنے کے لئے کہا گیا۔

''لیکن کیوں؟ آپ لوگوں نے میرا آڈیشن تو ابھی۔''

''تم سفید فام نہیں ہو''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

چند افراد نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔

''صرف سفید فام۔ یہ ایک اصول ہے۔''

وہ غصے سے بھبک اٹھا تھا۔

''ایڈورٹائزمنٹ میں ایسا کچھ نہیں لکھا تھا' میرے پاس نیوز پیپر کلپنگ ہے۔'' وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی باتیں لکھی نہیں جاتیں۔ سمجھ لی جاتی ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔''

اس کے رنگ کی وجہ سے اسے پہلی بار مسترد کیا گیا تھا۔ لیکن ایسا آخری بار نہیں ہوا تھا۔ اس دن کے بعد بھی متعدد دفعہ اسے سفید فام نہ ہونے کی بنا پر ٹھکرایا گیا۔

لڑکپن میں بس میں سفر کرتے ہوئے کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ اسے سفید فام مسافروں کے لئے نشست چھوڑنا پڑتی اور تب وہ بس اتنا ہی سوچتا تھا کہ شاید سفید لوگ رنگ دار لوگوں سے زیادہ معزز ہوتے ہیں۔ ایک عرصے سے افریقین امریکن لوگ نسلی تعصب کے خلاف سول رائٹس کی تحریک لڑ رہے تھے۔ آئے روز قتل و غارت گری کے واقعات ہوتے تھے لیکن اس نے کبھی ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ تو ''باہر کی دنیا'' کے مسائل تھے۔ ہالی وڈ میں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اسے کسی طور یقین ہی نہ آتا تھا۔

انہی دنوں اس نے ''yellowface'' اور ''white washing'' جیسی اصطلاحات سننا شروع کیں۔ جب کسی کہانی میں مشرقی ایشیائی کرداروں کو دکھانا مقصود ہوتا تو جاپانی یا چینی اداکاروں کو کاسٹ کرنے کے بجائے caucasian ایکٹرز کو 'yellowface' میک اپ کے ذریعے ایشیائی خد و خال کا حامل دکھا دیا جاتا اور کبھی اسکرپٹ میں ہی رد و بدل کر کے رنگ دار

کرداروں کو سفید کرداروں سے بدل دیا جاتا۔ اس حکمت عملی کو صحافتی حلقوں میں 'white washing' کہا جاتا تھا۔
ہالی وڈ حقیقت میں ہرگز ویسا نہیں تھا، جیسا اس کے تخیل میں تھا۔ یہاں بھورے، زرد، سیاہ اداکاروں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔



وہ بوجھل قدموں سے پام کے درختوں کی دورویہ قطاروں میں سے گزر رہا تھا۔ تھکن کسی اژدھے کی مانند اس کے بدن کو شکنجے میں جکڑے ہوئے تھی۔ کہر میں دھواں مل کر اس کی آنکھوں کو جلاتا تھا۔
اس نے بھاری سر اُٹھا کر ماؤنٹ لی کو دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لاس اینجلس کی معروف دھند آسمان سے اتر کر Griffith Park پر چھا رہی تھی۔ ہالی وڈ سائن مٹ میلا اور نہایت بدوضع دکھائی دیتا تھا۔ لکڑی اور دھاتی پرتوں سے بنے وہ دیوہیکل حروف بے معنی تھے، ہالی وڈ کے پہلے "او" کا اوپری نصف ناپید تھا، اور تیسرا "او" مکمل نیست ہو چکا تھا۔ باقی ماندہ حروف کی حیثیت محض ایک مہمل لفظ کی تھی۔ جس کا کوئی مفہوم نہ تھا۔
اس مایہ روپی نگر نے اس کے ساتھ چھل کیا تھا۔ فلموں میں اس نے جو دیکھا تھا وہ سب فریب نظر تھا۔ وہ یہاں مشاہیر میں شامل ہونے آیا تھا اور ہالی وڈ نے اسے ایک گھٹیا بار میں رات بھر گندے گلاس دھونے اور فرش صاف کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔
اضمحلال اس کے بند بند میں گاڑھا سیال بن کر رینگتا تھا۔ وہ ایک گاتھک طرز کی الگ تھلگ عمارت کے گرد بے مقصد پاگلوں کی طرح چکرانے لگا۔ عمارت ویران تھی اور لان کے ایک گوشے میں بڑا سا پتھریلا سرمئی۔ پیالہ دھرا تھا، جس میں تین سفید جل پریاں منجمد تھیں۔ وہ ناٹی دیوار پھلانگ کر اندر اترا اور جل پریوں والے پیالے کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔
بہت عرصہ پہلے کہی ہوئی بورڈنگ ہاؤس کے مالک کی باتیں اسے یاد آئیں۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس انجام سے دوچار ہونے والا وہ تنہا نہیں تھا۔ اس جیسے بے شمار لوگ یہاں پیہم آتے تھے۔ پلکوں پر ستارے سجائے ہوئے اور ان ستاروں کو ریت ہوتے دیر نہیں لگتی تھی۔ پلکوں کی ایک جنبش سے وہ سارے چمکیلے خواب خاک ہو جاتے تھے۔
محشر خرام وقت اس کے وجود کو روند کر گزر رہا تھا۔ اتنی مدت بیت جانے کے بعد بھی وہ ایک لائن کا پارٹ تک حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ وہ کال جس کا انتظار کرتے کرتے اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے، کسی طور آ ہی نہ چکتی تھی۔ وہ ترقی کی نردبان کا اسفل ترین زینہ بھی چڑھ نہ سکا تھا۔ اسے اپنا خواب یاد آیا، جواب ایک مٹا ہوا عکس تھا، اور اس کا جی رونے کو چاہا۔
اسے سرخ قالین، آسکرز اور اخباروں کی شہ سرخیاں یاد آئیں اور اپنی گمنامی پر رونا آیا۔
ڈپلیکس اپارٹمنٹ پینٹ ہاؤس یاد آئے۔ Gucci اور Christian Dior کی مصنوعات یاد آئیں۔ لموزین اور فراری یاد آئیں اور اپنی مفلسی پر رونا آیا۔
وہ خوبصورت تھا۔ کسی کو اس وصف سے غرض نہ تھی۔
باصلاحیت تھا۔ کوئی اسے آزمانا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں آسمان کو چھونے کی جستجو تھی۔ وہ لوگ اس کے قدموں تلے سے زمین بھی چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ مال کاسد تھا۔ اس کی بازار میں کوئی مانگ نہ تھی۔



محبت نے گیت گھاتی ساگر پھول کی مانند اسے بے بس کیا تھا۔

''ساگر پھول۔ جو بظاہر خوشنما پھول اور درحقیقت زہریلا جانور ہوتا ہے۔ وہ گھات لگائے بیٹھتا ہے اور جب کوئی بے خبر جاندار اس کے پرکشش رنگوں سے کھنچ کر قریب جاتا ہے' اُسے اپنے زہریلے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے۔

وہ محبت کی مسموم گرفت سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ادھ موئی ہوئی جاتی تھی۔

اس نے مائع معمور یہ کے پیالے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو کر اپنے سامنے صلیب کا نشان بنایا۔

''میں اسے بھول جاؤں گی۔ بھولنا مشکل نہیں ہوگا۔ میرے منجی خدا صرف اتنا کر دے کہ میرا حافظہ چھین لے۔ مجھے کچھ بھی یاد نہ رہے۔''

Tabernacle کے سامنے جھک کر اس نے دایاں گھٹنا فرش پر ٹیک دیا اور جلتی ہوئی شمع کے مقدس شعلے پر نظریں جما دیں۔

''میں اسے دل سے نکال دوں گی۔ بالکل آسان ہے۔ بس دل کو نشتر سے چیرنا ہی تو پڑے گا۔''

بین الصفوف راستے میں سے گزر کر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ چوبی نشستوں کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے دائیں اور بائیں۔ آگے اور پیچھے بہت سے چہروں میں وہ ایک چہرہ تلاش کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔

''میں اسے کبھی نہیں دیکھوں گی۔ میں کسی اور کو بھی نہیں دیکھوں گی۔''

Priest اور Ministers کی جماعت گرجے میں داخل ہوئی اور مذبح کے چبوترے کی طرف قدم اٹھانے لگی۔

مطربوں کا گیت منبر کے قوسی سائبان سے ٹکرا کر چہار اطراف بکھر رہا تھا۔ قربان گاہ کی تعظیم کرنے کے بعد وہ اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے اگر ونے میں سے اٹھتی خوشبو کی لپٹیں اس کے نتھنوں سے ٹکرائیں تو وہ سوچنے لگی کہ گرانٹ کون سا کلون لگاتا تھا۔ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ پر شاید وہ کوئی بھی خوشبو نہیں لگاتا تھا۔ وہ اس کے بدن کی اپنی مہک تھی۔ Priest کی گمبھیر آواز گونجی۔

''باپ' بیٹے اور روح القدس کے نام میں۔''

اس نے صلیب کا نشان بنایا اور بولی ''آمین یسوع کا پیار میرے لہو میں ہے۔ میرے اور یسوع کے درمیان دنیا نہیں آسکتی۔ لیکن۔ میری دنیا چھ فٹ قامت کے سانچے میں کیسے سمٹ گئی۔ کسی کی دنیا اتنی مختصر بھی ہوتی ہے۔'' اس کا دھیان بار بار بھٹک رہا تھا۔

Priest مومنین کی جماعت کو 'توبہ کے عمل' کی دعوت دے رہا تھا۔

''اکٹھے خدا کے کنبے کے طور پر امید کے ساتھ باپ سے معافی کے خواستگار ہوں۔

اسے اپنا گناہ یاد کرنا تھا اور اسے وہ یاد آیا۔ اس کے ''گناہ'' کی آنکھیں اندھیری رات سے زیادہ کالی تھیں اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''میں عظمت والے خدا سے اعتراف کرتی ہوں اور تم سے۔۔۔ میرے بھائیو اور بہنو کہ میں نے اپنی غلطی سے گناہ کیا ہے۔ اپنی سوچوں میں اور اپنے لفظوں میں' اس میں جو میں نے کیا اور اس میں جو میں نہ کر سکی۔ اور میں مقدس کنواری سے فریاد کرتی ہوں اور تمام فرشتوں اور برگزیدہ لوگوں سے کہ میرے لئے خداوند خدا سے دعا کریں۔ میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک مرد سے محبت کرتی ہوں۔ صرف اتنی محبت کہ اسے نہ دیکھوں تو مجھے بینائی کی ضرورت نہیں اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے سماعت سے غرض نہیں۔ وہ مبہم سا مسکرا دے تو میری روح سینے سے کھنچ لیتا ہے۔ وہ جہاں چھولے' بدن کا وہی جز دل بن جاتا ہے۔ آنکھ کے ایک اشارے سے وہ میری نبض روکنے پر قادر ہے۔ اتنی سی محبت تو خدا مجھے معاف کر دے گا۔''

جھلستی ہوئی نمی اس کے گالوں کو بھگونے لگی۔

سب مل کر گا رہے تھے۔ ''خداوند رحم کر۔''
اس نے بھی اپنی آواز ملا دی۔ ''خداوند رحم کر۔''
''یسوع رحم کر۔''
''یسوع رحم کر۔''

پھر اسے پتہ بھی نہ چلا، کیسے عبادت کے تمام مراحل اس کے ہاتھ سے پھسل گئے۔ قدیم حمد 'Gloria' کا ایک حرف بھی اس نے نہ سنا۔ Lector نے کیا پڑھا، اسے یاد نہیں تھا۔ جوابی مزمور میں اس نے حصہ لیا تھا یا نہیں، وہ بے خبر تھی۔ Alleluia کے جواب میں تمجید کرنا اسے یاد نہیں تھا۔

وہ اس وقت چونکی جب ہڈیالے چہرے والی دبلی بڑھیا نے؛ جس نے سر کے بالوں کو نیلے اسکارف سے ڈھانپا ہوا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کندھے پر استخوانی ہاتھ رکھا۔ اس کی کھردری انگلیوں کا کرخت لمس پرنیاں کو گرجے میں واپس کھینچ لایا۔ یہ دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا کہ سب لوگ قطاریں بنا کر مقدس Communion لینے کو تیار کھڑے تھے۔ اس تمام وقت میں وہ کہاں رہی تھی؟ وہ قدم گھسیٹتے ہوئے نیلے اسکارف والی عورت کے پیچھے چل دی۔

''یسوع! میرے مضطرب دل پر اپنا مسیحا ہاتھ رکھ دے۔ تیرے معجزوں نے کوڑھیوں کو بھلا کیا ہے۔ میری بیمار روح کو ہر آلائش سے پاک کر دے۔'' وہ گڑگڑانے لگی۔

Priest کہہ رہا تھا۔ ''یسوع کا بدن۔''
پانے والے خوش نصیب نے کہا۔ ''Amen''
''یسوع کا خون۔''
''Amen''

دبلی بڑھیا کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ جامد رہی؛ وہ سب سے آخر میں کھڑی تھی اور کچھ لمحوں میں اس کی باری آنے والی تھی۔

''یسوع کا بدن''
''Amen''
''یسوع کا خون۔''

کسی عجیب سے احساس سے اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''میں یسوع کے بدن اور خون میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہوں۔'' مطربوں کے سازوں کی لمبی نلیاں گویا انگلیاں تھیں اور وہ اسی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

''میں اس قابل ہرگز نہیں ہوں۔ میں جھوٹی ہوں فریب کار ہوں۔'' اس نے ایک اور قدم پچھلی سمت میں اُٹھایا۔

محراب دار چھت پر کندہ فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''میں نے کب سوچا تھا کہ ایک عام انسان میرے اور یسوع کے بیچ آ جائے گا۔''

وہ آنکھ کی پتلی پر یوں جم گیا تھا کہ اسے دوسری طرف کا منظر نظر آنا بند ہو گیا تھا۔

وہ قدم بہ قدم پیچھے سرکتی رہی۔

مقدس شبیہیں خاموش نظروں سے اُسے گھور رہی تھیں۔

سب اس کے دل کا کھوٹ جانتے تھے۔



وہ کیمپس سے لوٹی تو ماحول میں عجیب نوع کی بے چینی تھی۔ گھر کے تینوں افراد لونگ روم میں جمع تھے اور کوئی بھی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ داؤد ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا اپنا فیورٹ سٹ کام دیکھ رہا تھا۔ یا شاید نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تو اسکرین پر تھیں مگر وہ جیسے خلا کے پار گھور رہا تھا۔ والیوم بھی جھنجھناہٹ سے ذرا ہی زیادہ تھا۔ چاچی بکھرے ہوئے فلور کشن سمیٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی اور چچا اخبار کو گول کر کے میز کی سطح سے ٹکراتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کی خاموشی غیر معمولی نہیں تھی مگر اس خاموشی کے پیچھے کوئی غیر معمولی بات ضرور پنہاں تھی۔ جانے کیوں پرنیاں کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی تھی پھر چچا نے بولنے میں پہل کی۔

''تم پاکستان بات کرلو۔ میں ابھی کال بک کروا دیتا ہوں۔'' اس کے اندر خدشات سنپولیوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔

''کیا ہوا ہے؟''

''پہلے تم وینس بھابھی سے بات کرلو۔'' وہ اٹھ کر ملحقہ کمرے میں ٹیلی فون کرنے چلے گئے تھے۔

''امی کا فون آیا تھا؟ کیا بات ہوئی ہے۔'' اس نے انیتا سے پوچھا۔

''تمہارے ابو کی طبیعت خراب ہے۔'' اسے چاچی کی آواز بھرائی ہوئی لگی۔

''ہم سب کو پاکستان جانا ہوگا۔ تم دل کو مضبوط رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

یکبارگی اس کا دل بیٹھ گیا۔

''کتنی خراب ہے۔ ان کی طبیعت؟''

''تم دعا کرو۔ خداوند مسیحائی کرے گا۔ اگر آئزک بھائی یہاں آنے پر رضامند ہو جاتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کی ٹانگ کاٹنا پڑے گی۔''

اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔

اس کا باپ پچھلے کئی برسوں سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس کے گردے اور بینائی بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ پچھلی مرتبہ وینس سے بات ہوئی تو وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ پرنیاں کے استفسار پر اس نے آئزک کے دالان میں بے ہوش ہو کر گرنے کا ذکر سرسری انداز میں کیا تھا۔

''چکر آ گیا تھا۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے آکر چیک کیا تو پتہ چلا ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اس کی ماں اسے پردیس میں دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی وہ جان بوجھ کر آئزک کی بیماری کے ذکر سے کنی کترا جاتی تھی۔

پرنیاں ٹیلی فون پر کبھی کبھی مذاق میں آئزک سے کہتی۔ ''مجھے ڈاکٹر بن کے آلینے دیں۔ میں آپ کو ٹھیک کر دوں گی۔'' اور اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہوتا۔

آئزک کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ کسی کے کچھ بتائے بنا بھی اسے معلوم تھا لیکن صورتحال اس درجہ خراب ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔

وینس اس کی آواز سنتے ہی رو پڑی تھی۔ وہ بڑی ہمت والی عورت تھی۔ پرنیاں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی اسے آنسو بہاتے نہیں دیکھا تھا۔

''پرنیاں! آنے میں دیر نہ کرنا۔ تمہارے ابو نے پوری رات تمہارا نام لیتے ہوئے گزاری ہے۔''

''آپ نے مجھ سے چھپایا کیوں؟ میں ہمیشہ پوچھتی تھی' اور آپ جھوٹی تسلیاں دیتی تھیں۔'' وہ خود بھی رونے لگی تھی۔

''تم اتنی دور بیٹھ کر کیا کر سکتی تھیں۔ بیماری انہیں گھن کی طرح اندر سے کھا گئی ہے۔''

''انہیں امریکہ لے آئیں۔ یہاں بہت جدید سہولتیں ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک۔''

''وہ کہتے ہیں میری مٹی خراب نہ کرو' مجھے سکون سے مرنے دو۔ ان کی ضد سے کون جیت سکتا ہے اور اب تو اتنا وقت بھی نہیں بچا۔''

''آپ ایسے نہ کہیں میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔'' اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔

''تم نے جو بھی شاپنگ کرنا ہو۔ ایک دو دن میں کر لینا۔ میں کوئی تیاری نہیں کر سکوں گی۔ وینس کی بے محل بات اسے بہت عجیب لگی تھی۔

''کیا مطلب؟ شاپنگ کس لئے۔''

''تمہاری شادی کے لئے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ مگر اب تو۔ میں بہت تھک چکی ہوں پرنیاں! مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ گونی رونے لگتا ہے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔ تمہیں بڑا یاد کرتا ہے۔''

اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس کے آنسو تھم گئے تھے۔

''میری شادی کا یہاں کیا ذکر ہے۔''

''تمہارے ابو کی بس یہی خواہش ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی تمہیں دلہن بنے ہوئے دیکھ لیں۔''

''انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت لمبا عرصہ جئیں گے لیکن میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔ ابھی تو میں نے اپنی پڑھائی شروع کی ہے۔''

''پڑھائی تم شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو۔''

''ابھی میں نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا۔ اتنی جلدی کیسے۔''

وینس نے اس بات کی پوری نہیں ہونے دی۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے پرنیاں! تم سے پوچھا نہیں۔'' اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''پاکستان آتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔ جو تھوڑا بہت انتظام کرنا ہے وہ تمہارے ماموں سنبھال لیں گے۔ تمہیں جو بھی ضروری سامان خریدنا ہے خرید لو۔ میں ہسپتال جا رہی ہوں۔ ابھی فون بند کر رہی ہوں۔''

پرنیاں کو ان الفاظ پر یقین کرنے میں بڑی دشواری ہوئی تھی۔

''آپ لوگ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔''

''دماغ کو حاضر کر کے سنو۔ تمہارا باپ مر رہا ہے۔ مرتے ہوئے لوگوں کی خواہش تو کبھی کبھی دشمن بھی پوری کر دیا کرتے ہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے ماموں باہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''امی ایسا مت کریں مجھے یوں مجبور نہ کریں۔''

''ہزاروں بکھیڑے ہیں' جن میں میری جان پھنسی ہے اور تم اپنا رونا لے کر بیٹھ گئی ہو۔ کیریئر' مناسب وقت' پسند ناپسند' یہ سب باتیں خوش باش فارغ لوگوں کو جچتی ہیں اور ہمارا سامنا موت سے ہے۔ میں تمہارا مسئلہ ضرور سنتی لیکن میں مجبور ہوں میں نے

انہیں بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

"میں ابو سے خود بات کروں گی۔ وہ میرا کہا مان جائیں گے۔"

"وہ پہلے ہی بہت اذیت میں ہیں۔ میں کسی کو بھی ان کی تکلیف میں اضافہ نہیں کرنے دوں گی۔ تم اتنا شور کیوں مچا رہی ہو؟ پہلے یہ تو پوچھ لو۔ تمہاری شادی کس سے ہو رہی ہے۔ خود ہی خاموش ہو جاؤ گی۔"

اسے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ صرف طریقہ وضع کرنا باقی تھا۔ دار، سورج مکھی چکر، برقی کرسی یا پھر صلیب۔

"داؤد اور اس کے ماں باپ نے دوسری بات نہیں کی۔ ان سے رشتہ داری کا حساب لگانے بیٹھوں تو دوسری یا تیسری نسل میں جا کر کہیں کوئی تعلق نکلے گا۔ تم سے زیادہ تو وہ میرا درد سمجھ رہے ہیں۔ تم تو میرا اپنا خون ہو۔ خود غرضی دکھانے کے لیے زندگی تمہیں اور مواقع دے گی۔ یقین کرو یہ وہ موقع ہرگز نہیں ہے۔"

رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ ریسیور ہاتھ میں لیے پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔

✠ ✠ ✠

"داؤد! تم میری بات سمجھ نہیں پائے۔ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تم ابھی فون پر یا پاکستان جانے کے بعد انکار کر دینا۔ تم کوئی بھی بہانہ بنا سکتے ہو۔ کہہ دینا کہ تم کہیں اور کمٹڈ ہو۔ کچھ بھی۔ ہم بچپن سے دوست ہیں۔ تم میرے لئے اتنا تو کر سکتے ہو۔"

داؤد اس کی متورم آنکھوں اور زرد رنگت کو بے تاثر چہرے کے ساتھ دیکھتے ہوئے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا تھا۔

"اس کی وجہ؟"

"وجہ کچھ بھی ہو لیکن تم میری مدد کرو۔" وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے وجہ میں گہری دلچسپی ہے کیونکہ یہ گفتگو میری شادی کے بارے میں ہو رہی ہے۔ شاید یہ پہلو تمہارے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔"

"مجھ پر طنز نہ کرو۔" وہ لجاجت سے بولی تھی۔ "کوئی نہیں ہے جس سے میں مدد مانگ سکوں۔ صرف تم مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہو۔"

"کبھی کبھی آخری ہیلپ لائن بھی مایوس کن ثابت ہوتی ہے۔" پرنیاں اٹھ کر اس کے قریب چلی گئی۔ وہ ہنوز آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

"اتنی بے حسی سے بات مت کرو۔ تم مجھے بہت دکھ دے رہے ہو۔" وہ خاموش رہا اور بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

پرنیاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"پلیز مجھے مایوس نہ کرو۔ میں بہت مجبور ہوں۔"

"تمہیں مجھ سے شادی پر کیا اعتراض ہے۔؟" وہ تیزی سے گھوما اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"تم بہت اچھے ہو داؤد! تم میں کوئی برائی نہیں۔ خرابی مجھ میں ہے۔"

تم مجھے ہر خرابی کے ساتھ قبول ہو۔"

"میں۔ محبت کرتی ہوں۔ کسی اور سے۔"

اسے اس محبت کا اعتراف سر جھکا کر کرنا پڑا تھا۔

''کس سے؟''

''نام جان لینے سے کیا ہوگا۔ بس تم اتنا سمجھ لو کہ میں اور تم ایک دوسرے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔''

''مجھے سب کچھ جاننے کا حق ہے' کیونکہ یہ میری زندگی ہے جس کے ساتھ تم یہ سب کر رہی ہو۔ تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں گوشت پوست سے بنا جیتا جاگتا انسان ہوں اور مجھے درد بھی ہوتا ہے۔''

داؤد نے اس کے سامنے سے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کی کنپٹی پر ابھری ہوئی رگ تیزی سے دھڑک رہی تھی۔

''وہ میری زندگی ہے داؤد! میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔''

''کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ سب کو زندہ رہنا پڑتا ہے۔''

''میں سب کو نہیں جانتی۔ میں تو اپنی بات کر رہی ہوں۔''

''یہ شادی تایا جان کی خواہش ہے۔''

''اور تمہاری خواہش کیا ہے؟''

''تمہیں میری خواہش سے غرض ہی کیا ہے۔''

داؤد کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ ''مجھے معلوم ہے تم کس کے لئے مجھے رد کر رہی ہو۔ اس معمولی شخص کے لئے جسے تم صحیح طرح سے جانتی تک نہیں ہو۔''

''اسے مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔''

''تمہیں امریکہ آئے ہوئے پانچ مہینے اور نو دن ہوئے ہیں۔ اگر ایئر پورٹ پر جہاز سے اترتے ہی تمہاری اس سے ملاقات ہوگئی تھی تو بھی اتنا عرصہ کسی انسان کو جاننے کے لئے بہت قلیل ہے۔ جو شخص ہپیوں جیسے کپڑے پہنتا ہو۔ باچھیں چیر کر قہقہے لگاتا ہو اور بات کرتے ہوئے پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلاتا ہو۔ وہ تمہاری محبت کیسے ہو سکتا ہے؟''

''جب پانچ مہینے نو دن کسی کو جاننے کے لئے ناکافی ہیں تو تم ایک ملاقات میں کیسے اسے پرکھ سکتے ہو۔''

''تم اس سے شادی کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔ وہ تمہاری infatuation ہے۔ وقتی ابال ہے۔''

''میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر رہی داؤد۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''اس کے ساتھ نہیں تو کسی اور کے ساتھ بھی نہیں۔''

''تم مجھے الجھا رہی ہو۔''

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی' پر مجھے رہنا ہوگا۔''

''تو پھر ہم شادی کر لیتے ہیں اور میں سمجھوں گا کہ ہمارے درمیان یہ گفتگو کبھی نہیں ہوئی۔''

''میں اس سے جدا ہو کر بس جسم رہ گئی ہوں۔ روح تو اس کے پاس ہے۔ روح کے بنا جسم کھنڈر ہوتا ہے۔ کھنڈر لے کر تم کیا کرو گے۔'' وہ دیوار پر ٹنگی سبز اوٹی پتلی کو یک ٹک گھور رہی تھی۔

''تمہیں اگر اس سے اتنی ہی محبت ہے تو اس کے ساتھ بھاگ کر کورٹ میرج کر لو۔ تایا جان کو آج ہی مر جانے دو۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔ تمہیں روکا کس نے ہے Go to hell۔'' وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا تھا۔

پرنیاں کی نگاہوں کا زاویہ نہیں بدلا۔ میں نے کہا نا میں اس سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ وہ مسلمان ہے۔''

داؤد کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اس کے پاس آیا اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی جانب گھما دیا۔

''تم اپنے حواسوں میں ہو؟''

''پتہ نہیں۔'' وہ اس کی قمیص کا کالر دیکھنے لگی تھی۔

"You have absolutely no idea what you are getting yourself into."

(تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے، تم خود کو کس چیز میں ملوث کر رہی ہو)

داؤد کی انگلیاں اس کی ٹھوڑی میں گڑی جا رہی تھیں۔ ''میری بات سنو، تمہاری شادی مجھ سے ہوگی اور میں یہ ہر قیمت پر کر کے رہوں گا۔ اب اگر وہ بلڈی باسٹرڈ تمہارے آس پاس مجھے نظر آ گیا تو "I am going to kill him and I mean it." (تو میں اسے قتل کر دوں گا اور ضرور کر دوں گا)

لہجے کی برودت اسے اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی رینگ گئی۔

✠ ✠ ✠

اس نے پردہ سرکا کر کھڑکی کے پٹ وا کیے۔

سرمائی ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ آسمان اجلے سپید پھولوں والا نیلا غالیچہ تھا جو کوئی دھو کر اس کے جھروکے میں سوکھنے کے لئے پھیلا گیا تھا۔ بانکا نگریز سورج کیسر گھلے سفید رنگ کے بادیے بھر بھر کے در و بام پر انڈیلتا تھا۔

اس نے سڑک کے پار قرمزی پتوں والے درختوں کے کنج سے ایک دراز قامت شخص کو نکلتے دیکھا۔ اس شخص کے ہاتھ بڑے بڑے تھے اور چلتے ہوئے وہ انہیں تیزی سے حرکت دے رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک لمبی سمرن جھول رہی تھی۔ پرنیاں کھڑکی کا پٹ تھامے اسے قریب آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب آنے والے کا چہرہ وضاحت سے نظر آنے لگا تو اس نے حلق کی پوری طاقت صرف کر کے اسے پکارا اور ہاتھ کے اشارے سے وہیں رکنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر کے مرکزی دروازے سے باہر آئی اور سست روی سے چلنے لگی۔ زمین پر پاؤں رکھنے سے اس کے سر میں دھمک سی اٹھتی تھی۔ تین دن سے اس نے ایک نوالہ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا اور وہ مر جانے کی حد تک نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ گرانٹ کے نزدیک پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ جس میں سرخ شگوفوں سے گندھی مالا تھی۔ سرد ہاتھوں میں تھام کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔ ایک گرم بوند اس کی پلکوں سے پھسل کر گرانٹ کی ہتھیلی پر گری۔ پھر سسکی نوا کر پرنیاں نے اس کی ہتھیلی پر لب رکھ دیئے تھے۔

''مجھ سے شادی کر لو۔'' اس کی آواز تھکن گزیدہ تھی۔

✠ ✠ ✠

اساڑھ کی پیلی دھوپ بنا چاپ کئے نقرہ پات ایسی ریت پر سے پھسلتی ہوئی برساتی نالے کے گدلے پانی میں اترتی اور لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی جھنڈو لے برگد کے گرد جمے پتوں اور جھولتی جٹاؤں کے نیچے پہنچ کر میلی بھوری دھجیوں میں بٹ جاتی۔ بائیں ہاتھ کھیت میں ٹریکٹر چلاتے ہوئے کسان کے پیچھے بہت سے سفید بگلے نیم کی سوکھی ڈنڈیوں سی ٹانگیں لچکاتے، پھدکتے پھر رہے تھے۔ ٹریکٹر آگے بڑھتا تو بگلوں کا غول چھوٹی سی اڑان بھر کر قریب ہو جاتا، تازہ ہل چلی ہوئی مٹی کو لمبی پیلی چونچوں سے کھدیڑ کر رزق کی جستجو کرتا۔

سارے میں دھان کی رس بھری پتیوں کی میٹھی مہک پھیلی تھی۔ گاؤں کی چکی کی لگاتار گھک ہک۔ گھک ہک۔ ٹریکٹر کے

انجن کے شور سے کبھی دب جاتی اور کبھی اوپر اٹھ کر بوڑھی ٹاہلیوں کی چوٹیوں پر لہرانے لگتی۔
وہ کچی باٹ پر قدم دھرتا مسجد کے پہلو میں پہنچا تو نمبرداروں کی حویلی سے موروں کی کہک کانوں میں پڑنے لگی۔
اس نے دور سے ہی حکیم بیگم کو دروازے کا کواڑ تھام کر کھڑے دیکھ لیا تھا اور نظر ملتے ہی وہ بے قرار ہو کر باہر آئی تھی۔
قریب پہنچ کر حکیم بیگم نے بازو پھیلائے اور اس کی چھاتی سے لگ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک نا قابلِ بیان تاثر تھا۔ وہ یوں ہانپتی تھی جیسے میلوں بھاگ کر آئی ہو۔
''السلام علیکم بے جی!''
بے جی نے سلام کا جواب نہیں دیا اور اس کا سر پکڑ کر اپنے چہرے کی جانب جھکایا۔ پھر بمشکل پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس کے کان میں دھیرے سے کچھ کہا آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ سن ہی نہیں پایا۔
''مجھے سمجھ نہیں آئی۔ تو نے کیا کہا بے جی!''
حکیم بیگم نے دوبارہ سرگوشی کی تھی۔ اس بار الفاظ واضح تھے لیکن جو وہ بیان کر رہی تھی' عمر کے لئے نا قابل یقین تھا۔ وہ حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔
آمنہ اور یوسف کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان پہنچے تھے اور گزشتہ رات حکیم بیگم سے ملنے آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع پیشگی نہیں دی تھی۔ اور جب حکیم بیگم ٹیلی فون پر عمر کو ان کی آمد کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ اس کی خوشی اور جوش کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی بہت خوش ہوا تھا مگر حکیم بیگم کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی جس کی کوئی توجیہہ وہ ڈھونڈ نہیں پایا۔ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتی تھی اور ضبط کر کے خود کو روکے ہوئے تھی۔
''آمنہ تے یوسف آئے ہیں۔ تو وی آجا۔ دو دیہاڑے (دن) چھٹی لے لینا۔ اللہ دا کرم۔'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ چند لمحے اس کی تیز سانسوں کی آواز ایئر پیس سے آتی رہی۔
''کیا بات ہے بے جی!''
''سوختے (جلدی) نکل پڑنا۔ میں لمی اڈیک (لمبا انتظار) نئیں کر سکدی۔''
اس نے واضح طور پر حکیم بیگم کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کیا تھا۔
''گھر دا ماحول بڑا بدل گیا ہے۔ ام کلثوم دی پوتری جیہڑی پرار رنڈی ہو گئی تھی (جو پچھلے سے پچھلے سال بیوہ ہو گئی تھی) اسے میں نے وڈا (بڑا) پکا کمرہ رہنے کے لئے دے دیا ہے۔ چھوورے دا منڈا ہے اس دا۔ بڑی رونق لگ گئی ہے۔ تے صالحہ دے ڈھور ویہڑے میں باندھ لیے ہیں۔ سیالی (جاڑے میں) ان کے لئے کوٹھڑی بنواؤں گی۔ ہور سن (اور سنو) کا کا! اپنی کندھ (دیوار) نال جو ٹاہلی ہے اس تے اک گالڑ (گلہری) نے آلنا (گھونسلہ) بنا لیا ہے۔ بڑے چراں پچھوں (مدت بعد) گالڑ نے ادھر وسوں (بسیرا) کی ہے تو گالڑوں کا بڑا ویری تھا۔ جے کوئی بھول بھلیکے ایدھر منہ کر لیتا تے غلولے مار کے ریکا دیتا (ڈرا دیتا) تے ہاں صالحہ نے کبوتر وی رکھے ہیں۔ بس تو چھیتی آجا۔ تیرے ویکھن لئی بہت کچھ ہے۔ تو بڑا حیران ہو گا۔ میں تجھے کنج (کیسے) سمجھاواں۔۔۔ چڑی چوکے (صبح سویرے) تے پینڈا شروع کر دینا۔'' اس نے گویا ایک بار پھر خود پر جبر کر کے کچھ چھپایا تھا۔
ان میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جو اسے حیران کر پاتی۔ نہ تو اسے کبوتروں اور گلہریوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی صالحہ اور اس کے بیٹے کے ادھر بسرام کرنے کی خبر اس کے لئے نئی تھی۔ پہلے بھی حکیم بیگم اس بارے میں تذکرہ کر چکی تھی۔ جہاں تک آمنہ کی آمد پر خوش ہونے کا تعلق تھا تو آج سے قبل کبھی بھی اس نے ایسی مسرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر کیا تھا جو وہ بتانے کے لئے بے چین تھی اور کہہ نہ پاتی تھی۔

وہ تمام سفر امکانات کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ اور اس کی الجھن تب دور ہوئی تھی جب مسجد والے کنوئیں کے پاس چھتنارے پیپل کی گھنی سبز چھاؤں تلے حکیم بیگم نے اس کے کان میں وہ فقرہ کہا تھا۔

''آمنہ دے بال (بچہ) ہونے والا ہے۔'' وہ چند لمحے کوئی ردعمل ظاہر نہ کرسکا۔

''ہاں کا کا! اسے تیجا (تیسرا) مہینہ لگا ہے۔''

''You are the coolest guy I have ever laid my eyes on''.

عمر! تمہیں کوئی حق نہیں ہے اتنا سمارٹ ہونے کا۔ ایک لڑکے کا اس قدر خوبصورت ہونا تو غیر اخلاقی حرکت ہے۔''

آمنہ دو سال بعد اسے مل رہی تھی۔ اس کے ملیح چہرے پر اتنی بڑی مسکراہٹ عمر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''آپ کو بہت مبارک ہو باجی! مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔'' عمر نے اسے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم ناراض تو نہیں ہو کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ خوشخبری کیوں سنائی۔'' یوسف بولا تو عمر نے ہنستے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

''دراصل ہمیں بھی یقین کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی تھی انیس سال ہوگئے ہمیں دردر دھکے کھاتے ہوئے۔''

عمر کی نظریں بے اختیار چھپر سے متصل کچی دیوار کی طرف اٹھیں جہاں حکیم بیگم کے ہاتھ سے کھنچی ہوئی گیروی لکیریں سالوں کے انتظار کی داستان سنا رہی تھیں وہ تعداد میں بیس تھیں۔ حکیم بیگم اور عمر ایک دوجے کو دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کسی سازش میں شریک ہوں۔ دونوں میں سے کسی نے یوسف کے حساب کی تصحیح نہیں کی تھی۔

''اتنے برسوں کی بے ثمر جدوجہد کے بعد جب ہم ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے تو اچانک۔''

بھاء جی! آپ کے لئے لسّی لے آؤں؟'' صالحہ نے اناج والی کوٹھڑی سے باہر آکر اسے سلام کیا تھا۔

''پچھن (پوچھنے) دی لوڑ نئیں۔ تو چھیتی لے کے آ۔ تیرا ویر گرمی چے سڑ کے آیا ہے۔''

اس کے بجائے حکیم بیگم نے جواب دیا تھا۔

بعد میں آمنہ اسے خاصی دیر اس طریقہ علاج کے بارے میں سمجھاتی رہی تھی جس کے ذریعے یہ معجزہ رونما ہوا تھا۔ عمر کو اس سرجری کی پیچیدگی اور جدید طب کی سحر آفرینی میں کوئی اسرار نظر نہ آیا۔ اسے رتی برابر بھی شک نہ تھا کہ حکیم بیگم کی دعاؤں کے سوا کوئی شے آمنہ کو بار آور کرنے کا باعث بنی تھی۔

یوسف اور آمنہ صرف دو دن حکیم بیگم کے گھر گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے اس کے بعد وہ یوسف کے والدین کے پاس نارووال شہر چلے جاتے۔

گاؤں میں قیام کے اختصار کی بہت ساری وجوہات تھیں۔ یہاں بات ہاتھ کے پنکھوں سے بڑھ کر پیڈسٹل فین اور ریڈیو سے چل کر ٹیلی ویژن تک ہی پہنچ پائی تھی۔ کنوئیں اور نلکوں کی جگہ بجلی کی موٹروں نے لے لی تھی مٹی، تام چینی اور پیتل کے باسن پلاسٹک ڈنر سیٹوں سے بدل گئے تھے۔ لیکن ایئر کنڈیشنر، منرل واٹر، انٹرنیٹ کی منزل ابھی دور تھی۔ ہائی جین hygiene جیسے اہم مسئلے سے دیہاتی لوگ تاحال انجان تھے۔ انسانوں اور مویشیوں کا ایک ہی احاطے میں اکٹھا رہنا بالکل فطری بات سمجھی جاتی تھی۔ صالحہ کی گائے یا صالحہ کا چھ سالہ ادھ ننگا بیٹا، جسے نزلہ ہوا تھا۔ چھینکتے تو آمنہ کی احتیاط کا درجہ دونوں صورتوں میں ایک جیسا ہی ہوتا۔ اسے اپنے ساتھ منرل واٹر کے کین، ڈسپوزیبل برتن اور ٹشو پیپر کے ڈھیر لے کے آنا پڑتے اور پھر یہ فکر الگ کہ صالحہ، مزمل یا حکیم بیگم میں سے کوئی ان چیزوں کو چھو نہ لے پھر بھیڑ کا نوزائیدہ میمنا اور کبوتروں کا جوڑا دن بھر پورے آنگن اور کمروں میں بے مہار پھرتے تھے اسے بہت چوکنا رہنا پڑتا۔ جب حکیم بیگم پنجیٹوں اور پاتھیوں کی آگ پر پکائے گئے پکوان انہیں کھلانے کی کوشش کرتی تو نوالہ نگلنے

کی تصور سے ہی ان میاں بیوی کو ابکائیاں آنے لگتیں۔ کم وبیش تمام کھانے کی چیزوں میں گوبر کی بو رچی ہوئی تھی۔ مجبوراً انہیں ڈبوں میں بند خشک خوراک اور پھلوں سے بھوک مٹانی پڑتی۔ مکھیوں مچھروں کی کثرت' کموڈز' سیلولرنیٹ ورک کی عدم دستیابی اور ایسے بہت سارے عناصر تھے جو ان کو زیادہ دیر گاؤں میں ٹھہرنے نہ دیتے تھے۔

وہ آمنہ اور یوسف کے ساتھ بکائن کے سائے میں کھاٹ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ حکیم بیگم گائے کا دودھ دوہنے سے پہلے ولٹوئی سے چلوؤں میں پانی بھر کر اس کے بھرے ہوئے تھنوں کو دھو رہی تھی اور صالحہ بسورتے مزمل کو کندھے سے چمٹائے صحن میں ٹہل ٹہل کر بہلانے میں مگن تھی کہ ام کلثوم ہاتھ میں حقہ لیے آ گئی۔

''لکھ لکھ مبارکاں حکیم بیگم! رب چاند جیسا دوہترا (نواسہ) تیری جھولی ڈالے۔ میں تو چھج (چھاج) بھر کے مٹھیائی کالوں گی۔'' اس نے حکیم بیگم کے قریب رک کر سلام دعا کی اور تنگاری میں سر گھسائے بھوسے ملے چارے پر منہ چلاتی ہوئی گائے کی گیلی تھوتھنی سہلاتی رہی۔ پھر وہ آمنہ کے سر پر پیار دینے کے لیے آگے بڑھی تو آمنہ نے جھرجھری لے کر کندھے اکڑا لیے اور پہلو بدلتے ہوئے اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔

''کیا حال ہے ماسی! ٹھیک تو ہو ناں۔'' آمنہ نے چھوماں کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ فطرت کے اصولوں کے عین مطابق تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس کو چند ثانیے قبل گائے نے اپنی زبان سے چاٹا تھا۔ لیکن چھوماں نے اس رویے کو اپنی توہین گردانا تھا اور ان سے پرے کبوتروں کی ڈھابلی کے پاس موڑھا بچھا کر بیٹھ گئی۔ مغرب کی اذان میں تھوڑا وقت رہ گیا تو عمر اٹھا، بکائن کی شاخ توڑی ٹوٹی ہوئی مٹھیا والی ڈونگچی میں نلکے سے پانی بھرا اور چھوماں کے قریب کھڑا ہو کر مسواک کرنے لگا۔ اسے آمنہ کا برتاؤ برا لگا تھا لیکن چھوماں سے اس کے کنبے کا حال احوال دریافت کرنے سے عمر کا مقصد اس کی دلجوئی کرنا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زہر اگلے بنا اس کا جی ہلکا نہیں ہوگا۔ ان لمحات میں وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

''ماسی! جب میری ماں ادھر تھی۔ تو اس سے ملنے کبھی کوئی آیا تھا؟'' اس نے حتی الوسع لہجے کو سرسری رکھنے کی کوشش کی۔

چھوماں نے چلم میں دہکتے کوئلوں کو تنکے سے کرید کر آگے پیچھے لڑھکایا پھر قمیص کے دامن میں لگی جیب سے بٹے ہوئے تمباکو کا ٹکڑا اور گڑ کی بھیلی نکالی، بھیلی کو دو حصوں میں توڑ کر ایک ٹکڑا چلم میں رکھا اس پر تمباکو دھر کے دوسرا ٹکڑا تمباکو کے اوپر رکھا اور کوئلوں کو پھر سے ہلا جلا کر ترتیب دیا۔ حدت پاتے ہی گڑ پگھل کر تمباکو سے چپک گیا تھا چھوماں نے عمر کی بات جیسے سنی ہی نہ تھی۔ وہ سوال دہرانے ہی والا تھا کہ چھوماں بول پڑی۔

''وہ سائی (عیسائی) تھی۔ پر حکیم بیگم پاکی پلیدی کا دھیان نہیں کرتی تھی جن بھانڈوں میں اسے کھلاتی تھی۔ انہی میں خود کھالیتی۔ سچ پوچھو تو میرا روح ہی نہیں کرتا تھا ادھر آنے کو۔''

چھوماں نے مہنال کو ہونٹوں میں دبا کر لمبی سانس کھینچی۔

''پر وہ چھ سات مہینے اس گھر میں رہی تھی۔ کسی نہ کسی سے تو رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ شاید بے جی نے تم سے کبھی ذکر کیا ہو؟''

''ایسی ادھلوں (گھر سے بھاگنے والی) کے پیچھے کون آتا ہے۔ عاشق چار دن دل خوش کر کے چھوڑ جاتے ہیں۔ اور وارث ڈھونڈ نکالیں تو گاٹا اتار دیتے ہیں۔'' آمنہ اور یوسف کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ چھوماں کی توجہ ان کی جانب منعطف ہوئی تو اس کے ماتھے کی جھریوں میں لہر سی پیدا ہوئی۔ حقے کی نگالی کو مٹھی میں بھینچ کر وہ بولی۔

''بدذات، کمین۔ بھکھی رجی تے کھے پئی اڈاوے۔ تم بتاؤ چڑی کے بوٹ سپنو لیے کھانے لگیں تو وہ الاں (چیلیں) بن جاتے ہیں؟ کمی کا اصل کبھی نہیں بدلتا۔ کالے منہ والی۔'' تمباکو ملے تھوک کے چھینٹے اس کے ہونٹوں سے اڑے۔ ''کھوتوں کے گٹے

جھاڑتی جوان ہوئی آمنہ اور آج مجھ سے حقارت کر رہی ہے۔ امریکہ چلی گئی تو خون بھی بدل گیا۔ میں غریب ہی سہی پر زمینداروں کی دمی ہوں اک اٹ میت (مسجد) کے منبر میں لگی اور اک گٹر کے فرش میں جڑی۔ دونوں کا رتبہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔"

ہوا کے تیز جھونکے نے گڑ اور تمباکو کی ملی جلی کڑوی مہک اس کے نتھنوں میں پھونکی۔ اب چھوماں سے کچھ پوچھنا عبث تھا۔ وہ خاموشی سے مسواک کرتا رہا۔

"ایک بات میں نے تمہیں کبھی نہیں بتائی۔" اس نے پیتل کی مہنال پر انگلی پھراتے ہوئے غور سے عمر کو دیکھا۔

"یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ حکیم بیگم دائی کا کام کرتی تھی اور کبھی کبھی کوئی کیس کرنے کے لیے مجھے بھی بلا لیتی تھی۔ تمہاری ماں جب یہاں آئی تھی تو وہ پیٹ گرانا چاہتی تھی۔"

مسواک کا پھونسڑا عمر کے حلق میں چلا گیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔

ہوش سنبھالتے ہی بہت سی ایسی باتیں اس کے کانوں میں پڑنے لگی تھیں جن کا مفہوم چاہے وہ سمجھ نہیں پاتا تھا مگر ذلت کا احساس ضرور ہوتا تھا بچپن سے لے کر اب تک وہ توہین آمیز لفظوں، طعن اور گالیوں کا سامنا کرتا آیا تھا پر اسے یاد نہیں تھا کبھی کسی ایک جملے سے اسے اتنی تکلیف پہنچی ہو۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ لوٹا تو راوی کی طرف سے نم آلود ہوا چلنے لگی تھی اور اکا دکا بادل بھٹکے ہوئے مسافروں کی طرح بدحواس سے یہاں وہاں بکھرے تھے وہ اور یوسف چہل قدمی کے لیے نکلے اور ٹہلتے ہوئے بیٔس کے کنارے تک چلے گئے۔

"عمر! تم کچھ وقت نکال کر گھر کی الیکٹرک وائرنگ ہی ڈھنگ سے کروا دو۔ ریفریجریٹر اور برنر پہلی فرصت میں خرید کر لے آؤ۔ ہم پیسے بھجواتے کس لیے ہیں۔ آخر مامی ضرورت کی چیزوں پر کیوں استعمال نہیں کرتیں۔ چولہوں میں پھونکیں مارنے اور کنوئیں سے پانی بھرنے کا دور گزر گیا۔

"I don't know whats wrong with her. Some times she acts really weird."

(میں نہیں جانتا ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بعض اوقات ان کا رویہ بہت عجیب ہوتا ہے)

وہ میاں بیوی حکیم بیگم سے ایسے ہی نالاں رہتے تھے۔

"مٹی کے تیل والا چولہا تو میں نے بے جی کو پچھلے مہینے لا دیا تھا مگر وہ استعمال نہیں کرتی اور ریفریجریٹر کا پوچھا تو اس نے منع کر دیا بس ٹیلی فون کا کہہ رہی تھی کہ لگوا دوں اور میں نے اپلائی بھی کر دیا ہے۔"

یوسف نے گیلی ریت کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑایا۔ "مامی سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلیں لیکن وہ اس بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں۔ ہم سے زیادہ ان کا سگا کون ہے اور اب انہوں نے ایک نئی ذمہ داری اٹھا لی ہے۔ صالحہ اور اس کے بیٹے کو گھر میں رکھنے سے پہلے انہیں کسی سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اب اگر کچھ کہا جائے گا تو ان کا دل دکھے گا۔"

عمر اس سلسلے میں کیا بول سکتا تھا۔ وہ خود بھی تو ایسی ہی ایک ذمہ داری تھا جو حکیم بیگم نے کسی سے پوچھے بنا ہی اٹھا لی تھی۔

"خیر چھوڑو۔ تم نے امریکہ آنے کے بارے میں کیا سوچا؟ اس ملک کے تعلیمی ادارے یورپ اور امریکہ کے معیار تک پہنچنے میں کم از کم سو سال تو ضرور ہی لگا دیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی مامی کی طرح جذباتی ہو لیکن کوئی melodramatic response دینے سے پہلے یہ ضرور سوچنا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی اس فیصلے سے متاثر ہوں گی۔ تم ہامی بھرو تو میں تمہارے کاغذات تیار کرواتا ہوں۔ چند ماہ میں تمہارا سمسٹر بھی کمپلیٹ ہو جائے گا۔"

اگر کچھ عرصہ پہلے اس سے یہ بات پوچھی جاتی تو انکار کرنے کے لیے اسے ایک لمحہ بھی سوچنا نہ پڑتا لیکن اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس نے بیٔس کے گہرے بھورے پانی میں گھلتی رات کی سیاہی کو دیکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلا دیا تھا۔

اسے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی اور شاید ایک ٹھنڈے مارگریٹا کی بھی۔ اس نے چوتھی مرتبہ رسٹ واچ میں وقت دیکھا تھا۔ گرانٹ کے کمرے سے کوئی آہٹ نہ آتی تھی۔ وہ یا تو سو چکا تھا یا پھر سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ کچھ عرصے سے یوں بھی وہ دن کا بیشتر حصہ لیٹ کر گزارتا تھا۔ اس نے کہیں باہر جانا بھی ترک کر دیا تھا۔ وہ ہر دم کھانستا، ہونکتا، اونچی آواز میں بڑبڑاتا، اپنے کمرے کی چار دیواری میں بند رہتا۔ اس کی ہمہ وقت موجودگی نے صوفیہ کے گھر سے نکلنے کے امکانات محدود کر دیے تھے۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی اور جوتوں سمیت چادر اوڑھے بستر پر بیٹھی خاصی دیر سے ساتھ والے کمرے میں خاموشی چھانے کی منتظر تھی۔ بظاہر تو حالات اس کے لیے سازگار ہو چکے تھے۔ تاہم تصدیق کرنا ضروری تھا۔ اگر اس کے جانے کے بعد گرانٹ اس کے کمرے میں جھانک لیتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ صوفیہ کی واپسی پر وہ اسے اندر گھسنے نہ دیتا اور تمام رات اسے فٹ پاتھ پر گزارنا پڑتی۔ ہنگامہ اور گالی گلوچ اس کے سوا تھے۔

وہ گربہ پائی سے چل کر گرانٹ کے کمرے کے دروازے تک پہنچی اور دروازے سے کان چپکا دیا۔ پھر اس نے دروازے کی ناب کو دھیرے سے گھما کر ہاتھ کا ہلکا دباؤ ڈالا تو دروازہ مدھم چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ بے اختیار اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں عین اس کے سامنے ایک ہیولہ تھا اور وہ یوں جھول رہا تھا جیسے کھڑے کھڑے کھلی آنکھوں کے ساتھ سو گیا ہو۔ وہ الٹے قدموں واپس اپنے بستر پر چلی آئی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''کہاں جا رہی تھیں؟'' گرانٹ کی بلغم زدہ آواز پر صوفیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور اسے لگا جیسے وہ مدت بعد اسے دیکھ رہی ہو۔ وہ انتہائی دبلا لگ رہا تھا۔ اس کے ہڈیالے کندھے آگے اور نیچے کی سمت جھکے ہوئے تھے اور آنکھیں غیر معمولی حد تک بڑی نظر آ رہی تھیں۔

''میں چیز برگر لینے جا رہی تھی۔ کچن میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔''

''تم جھوٹ بولتی ہو۔'' وہ نقاہت بھری آواز میں گرجا۔ ''میں نے شام کو اسپگیٹی بنائی تھی......اور پرمی سان چیز اور ٹومیٹو ساس بھی ہے۔ اتنا عمدہ ڈنر تم کیوں نہیں کھا سکتیں؟''

''یہ پرسوں شام کی بات ہے۔''

وہ کچھ دیر کھوئی ہوئی کیفیت میں سوچتا رہا۔ ''تو شاید میں، میں بھول گیا ہوں' میں بھولنے لگا ہوں۔''

''میں تم سے یہی پوچھنے آئی تھی، تو کیا میں جاؤں؟''

''ہرگز نہیں، وقت کیا ہوا ہے؟''

صوفیہ نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ابھی تک دس بھی نہیں بجے۔''

''تم نے باہر قدم نکالا تو واپس نہ آنا۔''

اگر اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ایسا کرنے میں خوشی محسوس کرتی۔

''یہ میرا گھر ہے اور اس میں وہ ہوگا جو میں چاہوں گا۔ اس وقت صرف آوارہ لڑکیاں باہر نکلتی ہیں۔ میں نے تمہیں آوارگی کی اجازت دے دی تو تم اپنی ماں جیسی بن جاؤ گی۔''

صوفیہ نے ایک طویل سانس بھری اور ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹیلی ویژن آن کر دیا۔ اس کے بعد گرانٹ جو کچھ کہنے جا رہا تھا، وہ اسے ازبر تھا۔ کچھ دنوں سے وہ یہ تقریر سننے سے بچی ہوئی تھی۔ اور آج خود ہی اسے دعوت دے بیٹھی تھی۔ اب نہ چاہتے ہوئے

بھی اسے اس تمام کارروائی سے گزرنا تھا جو ایک عرصے سے ان کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔

''میں تمہیں آزاد چھوڑ دوں تو تمہارا انجام بھی اپنی ماں جیسا ہوگا۔ تم نے اتنے سال اس عورت کے سائے میں گزارے ہیں۔ تمہارا ذہن کچا تھا۔ لیکن صحبت کا اثر تو جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ جھوٹی تھی اور تم بھی جھوٹ بولتی ہو۔ اس نے میری دنیا برباد کر دی اور تم میری آخرت برباد کرنے پر تلی ہو۔''

صوفیہ نے ٹیلی ویژن کا والیوم بڑھا دیا تھا۔

''تم سمجھتی ہو میں تمہیں اس جیسا بن جانے دوں گا۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں مرتے دم تک ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تصور کرو، وہ جسم فروشی کرتی تھی۔ تم بھی یہ ہی کرو گی، اگر میں تمہیں نہ روکوں۔ خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے اور تمہارے جسم میں وہی گندہ خون ہے۔ وہ کسی آوارہ کتیا سے بھی بدتر تھی۔'' گرانٹ کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ٹیلی ویژن کا والیوم آخری حد تک اونچا کر دیا۔

''میں اس سے نہ ملا ہوتا تو میری زندگی مختلف ہوتی۔ اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ مجھے میری محبت سے محروم کر دیا۔ وہ لڑکی ڈیزی کا پھول تھی۔ خالص اور معصوم۔ البا نے مجھے اس سے دور کر دیا۔'' اس کے کانوں تک آواز پہنچانے کے لیے گرانٹ کو چیخنا پڑ رہا تھا۔ اچانک وہ خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے ٹیلی ویژن اسکرین کو گھورتے رہنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور سوئچ بینل پر ہاتھ مار کر برقی رو منقطع کر دی۔

''وہ کیسی شرمناک موت مری تھی۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔ ''اس کا عذاب تمام نہیں ہوا۔ وہ جل رہی ہوگی۔ تا ابد جلتی رہے گی۔ خدا نے بدکاروں کی یہ ہی سزا مقرر کی ہے۔ تمہیں جہنم سے خوف نہیں آتا صوفیہ! کیا تم بھی اپنی ماں کے پاس جہنم میں پہنچنا چاہتی ہو؟''

اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ جس جہنم میں وہ زندگی بسر کر رہی تھی کیا اس کے سوا کوئی اور جہنم بھی اس کا منتظر تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر گیم کھیلنے لگی۔

''خدا کے قہر کو آواز مت دو۔ جسم فروش عورتوں جیسا حلیہ بنا کر تم چوری چھپے گھر سے نکل رہی تھیں۔ میں تم پر نظر نہ رکھوں تو تم آوارہ لڑکوں کے ساتھ آزادانہ گھومو گی۔ پارٹیاں، رقص اور نائٹ کلبز، تمہارے گناہوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔''

وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے یوں جھکا ہوا تھا جیسے بے تحاشا تھک گیا ہو۔ اس کی آواز میں نقاہت بڑھ چکی تھی۔ ''تمہیں روکنے کے لیے مجھے جس بھی حد تک جانا پڑا، میں جاؤں گا، تم ہی میری نجات ہو، اگر ایک گناہ گار ماں کی اولاد کو میں گناہ سے بچا لوں تو خدا مجھے جنت......''

صوفیہ نے اس کے منہ سے سرخ بلبلے اڑتے ہوئے دیکھے۔ اس نے آستین سے اپنا منہ صاف کیا اور کف پر لگنے والے لال دھبے خون کے سوا کسی شے کے نہیں تھے۔ صوفیہ کو اس کے کان کی کچیا پر بناوہ نیلاہٹ زدہ گہرا سرخ ابھرا ہوا آبلہ بھی دکھائی دیا۔ ایسے ہی کچھ چھالے کچھ روز قبل اس کی پنڈلیوں کی پشت پر دیکھ چکی تھی۔ وہ روز بروز گھناؤنا ہوتا جا رہا تھا۔ صوفیہ اب اس کی چھوئی ہوئی اشیا استعمال کرنے سے کترانے لگی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واڈکا کی آدھی بوتل جو اس نے باتھ روم کیبنٹ سے نکال کر اپنے بیڈ کے گدے تلے چھپائی تھی، اسے واپس اسی جگہ رکھ دے۔ کیا خبر گرانٹ نے دہانے کو اپنا غلیظ منہ لگایا ہو۔

''تم گناہ سے باز رہو تو ہم دونوں آگ کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ تمہیں میری بات ماننا پڑے گی میں تمہیں مجبور کر دوں گا۔ میں کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ تم کوئی اسٹریٹ واکر یا اسٹرپ ٹیز ناچنے والی بن جاؤ۔ گناہ کی طرف بڑھنے والے قدم میں کاٹ ڈالوں گا۔''

وہ دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

صوفیہ گیم ہار گئی تھی۔ اس کا مہرہ پٹ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ کھیل شروع کیا۔

''تمہاری ماں کے گناہ ایسے رذیل ہیں کہ بیان کرتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔''

وہ اس کی ماں کے فریب کے بارے میں بتانے لگا۔ کیسے اس نے گرانٹ کو مکر جال میں پھنسایا تھا اور کیونکر اس کی محبت کو اس سے دور کر دیا۔ وہ کیسے مجبور ہوا تھا، کیسی اذیت سے گزرا۔

صوفیہ کو ایک ایک لفظ معلوم تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی اسے ذہن نشین ہو چکی تھی۔ گرانٹ سینکڑوں بار یہ سب دہرا چکا تھا۔

وہ دوسری بار بھی ہار گئی۔ اس کا اپنی میڈ مقابل اس پر حاوی رہا تھا۔ اس نے تیسری دفعہ کھیل کا آغاز کیا۔

گرانٹ کی آواز اب بڑبڑاہٹ سے مشابہہ ہو چلی تھی اور وہ قالین پر لمبے گھٹنے اٹھائے ٹیڑھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس سے بالکل لاتعلق ہو کر سیل فون میں مگن رہی۔ جب بولتے بولتے گرانٹ کا گلا بیٹھ گیا اور وہ آٹھویں مرتبہ بھی کھیل جیتنے میں ناکام ہو چکی تھی تو گرانٹ آہستگی سے اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے سیل فون کو بیڈ پر زور سے پٹخ دیا۔ اب تک اس نے جوتے نہیں اتارے تھے۔ اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہو سکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ دبے قدموں گھر سے نکل رہی تھی تو گرانٹ کے نیند میں بڑبڑانے کی آواز دروازے سے باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوکین اور بوز میں لت پت ہو کر جانے کس سے معافی مانگے جا رہا تھا۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی صوفیہ کو دور سے بیساکھی کے بل اچک اچک کر بے ہنگم چال چلتا میبل دکھائی دیا۔ وہ رک کر اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ میبل اس کے پاس ٹھہرنے کے بجائے سر جھکائے ہوئے خاموشی سے گزرنے لگا تو صوفیہ نے بازو سے تھام کر اسے روک لیا۔

''وقت نہیں ہے۔'' اس نے کندھا ہلا کر بازو چھڑوا لیا۔

''کس کے پاس وقت نہیں ہے۔'' اس نے میبل کا کالر زور سے مٹھی میں جکڑ لیا۔

''وہ ناراض ہوگا۔ میں واپس گیراج جاؤں گا۔ کچھ کاغذ لینے ہیں گھر سے، انکل انتھونی غصے میں تھا۔''

''اگر اتنی جلدی تھی تو وہ خود کیوں نہیں آ گیا۔ تم جیسے ''تیز رفتار'' آدمی کو کیوں بھیج دیا؟''

میبل پھر سے جانے کے لیے کسمسایا۔ ''جانے دو، مجھے دیر ہو گئی ہے۔''

''تمہیں میری بات سننا ہوگی۔ میں تمہیں اس کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ میں بہت اداس ہوں۔'' صوفیہ نے کالر کو جھٹکا دے کر اسے جھکا دیا۔

''تم اداس ہو، رونا مت، میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا بھدا ہاتھ پتلون سے رگڑ کر صاف کیا اور پھر تشویش بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے بال سہلانے لگا۔

صوفیہ نے کالر چھوڑ کر اس کا ہاتھ سختی سے ہٹا دیا تھا۔

''میں رو نہیں رہی ہوں۔ مورون۔ اپنے گندے ہاتھ مجھ سے دور رکھو۔''

''ٹھیک ہے تم اداس نہیں ہو۔ میں بھی نہیں ہوں۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''تم گیراج میں کرتے کیا ہو؟''

''کیش رجسٹر میرے پاس ہوتا ہے۔ میں سارا حساب کرتا ہوں۔''

''تو پھر تمہارے ہاتھوں پر گریس کیوں لگی ہے۔'' صوفیہ نے اپنے بالوں پر انگلیاں رگڑ کر ہاتھ کو سونگھتے ہوئے پوچھا۔

''میں دوسرے کام بھی کرتا ہوں۔''

''انھونی تمہیں کتنی تنخواہ دیتا ہے؟''

''مجھے پتا نہیں۔''

''کیا مطلب، تمہیں پتا نہیں؟''

''وہ خود اپنے پاس رکھتا ہے۔''

''کیوں؟''

''اسے پتا ہے۔'' میبل نے سر کو زور سے ہلایا تھا۔

''وہ کمینہ ہے، کاغذات میں وہ تمہیں اپنا تنخواہ دار ملازم ظاہر کرتا ہے۔ تمہیں تنخواہ بھی نہیں دیتا اور ٹیکس کے چند ڈالر بھی بچا لیتا ہے۔''

''وہ میرا خیال رکھتا ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ اچھا سنو، تمہیں کیا لگتا ہے کارل میکارتھی مجھ سے پیار کرتا ہے یا نہیں؟''

میبل خاموش کھڑا پلکیں جھپکانے لگا۔

''میں اس کی سب گرل فرینڈز سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں اور میں ان سب سے بڑھ کر طرح دار بھی ہوں۔ بس ایک چھوٹی سی مصیبت ہے، خدا نے اس کے دل میں میرے لیے پیار نہیں ڈالا۔ خدا نے دنیا کے کسی بھی شخص کے دل میں میرے لیے پیار نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ اس نے میری سگی ماں کو بھی اس خصوصیت کے بغیر بنایا۔ وہ میرے لیے اس دھات کی طرح تھی۔'' اس نے میبل کی بیساکھی پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''ٹھوس اور ٹھنڈی، وہ مجھے اس جنونی آدمی کے حوالے کر گئی جو مجھے...... لیکن خدا سے میں کچھ نہیں مانگوں گی۔ نتیجہ مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ وہ نہیں دے گا، اس نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا۔''

میبل نے پورا منہ کھول کر جماہی لی اور غنودہ آواز میں بولا۔ ''بہت تھک گیا ہوں، مجھے نیند آرہی ہے۔'' شاید وہ بھول چکا تھا کہ اسے گیراج واپس پہنچنا تھا۔

صوفیہ نے اس کے گھنگھریالے بال مٹھی میں لے کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''میری بات غور سے سنتے رہو، آنکھیں مت بند کرو، کیا کارل اس مدقوق شکل والی لنڈا سے دوبارہ ملنے لگا ہوگا۔ پمپلز نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی۔ اس نے مجھے ایک فون بھی نہیں کیا۔ وہ اپنے ایک سو پچاس bucks کے لیے ہی رابطہ کر لیتا۔ ایک آخری فون کال، اور وہ کہتا میں تمہیں ڈمپ کر رہا ہوں۔ تم میری محبت کے قابل نہیں ہو۔ تم نے مجھ سے ڈیٹ پر جانے کی قیمت کیوں وصول کی۔ میں تمہیں واقعی پسند کرنے لگا تھا، لیکن تم نے میرے جذبے کو پہچانا ہی نہیں۔ تم بہت بڑی احمق ہو اور میں کہتی......''

میبل آنکھیں موند کر بیساکھی کے سہارے جھولنے لگا تھا۔

صوفیہ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''تمہیں میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تم اتنے بے وقوف کیوں ہو۔ جانور بھی تم سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔'' اس نے ایک اور تھپڑ میبل کے گال پر مارا۔ اس نے انگوٹھی پہن رکھی تھی، جس کا نوکیلا سرا لگنے سے میبل کی آنکھ کے نیچے والی جلد پھٹ گئی اور خون کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا تھا۔

''مجھے نہ مارو، مجھے درد ہوتا ہے۔'' وہ سہم کر چند قدم دور ہٹ گیا۔

''تمہیں درد کی سمجھ آتی ہے۔ درد کی سمجھ سب کو آتی ہے، تمہیں پتا ہے رات کے اس پہر تم میرے سامنے کھڑے بے چاروں کی طرح کیوں رو رہے ہو۔ یہ خدا کی مرضی ہے، وہ چاہتا ہے کہ تمہیں درد ہو۔ وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے تمہیں سفید فاموں کی دنیا میں کالا بنایا۔ تمہاری اس دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں تھی، پھر بھی خدا نے تمہیں بچی کھچی مٹی سے بنایا اور تمہیں یہاں بھیج دیا، صرف تمہارا تماشا دیکھنے کے لیے۔ تم اتنے بدصورت ہو کہ کسی بھی نفیس سفید فام کو تمہاری صورت دیکھ کر متلی ہوسکتی ہے۔ اس نے تم سے تمہارے ماں، باپ اور بہن، بھائی چھین لیے اور تمہیں معذور کر دیا تاکہ تم زمین پر رینگتے پھرو، مسز میک گریگور کا Landseer (ایک بڑا جھبرا کتا) بھی تم سے بہتر زندگی گزارتا ہے۔ اس کی مالکن کم از کم انتھونی جیسی بے حس نہیں ہے۔ وہ اس کو شیمپو سے نہلاتی ہے۔ اس کی پشم میں کنگھی کرتی ہے اور اس کے پسندیدہ بسکٹ اسے کھلاتی ہے۔ لیکن تمہیں تو انتھونی نے کبھی پچکارا تک نہیں اور یہ سب خدا کی چاہت ہے میبل۔''

وہ اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

''وہ مرنے کے بعد بھی تمہارے درد میں کمی نہیں ہونے دے گا۔ اس نے تمہارے لیے جہنم دہکا رکھا ہے۔ جب تم نے جہنم میں ہی جانا ہے تو تم گناہ کیوں نہیں کرتے، کچھ ایسا کر جاؤ کہ تمہیں جہنم میں جلنے پر پچھتاوا نہ ہو۔ کسی کو جان سے مار ڈالنے کے بارے میں کیا خیال ہے انتھونی کو یا پھر مجھے۔ ایک ہی بار بھڑک کر بھسم ہو جاؤ۔ موم کی طرح کیوں سلگتے ہو۔''

بلکتا ہوا میبل مڑ کر جانے لگا تو صوفیہ نے اس کی واحد پنڈلی پر زور سے ٹھوکر ماری۔

''چلے جاؤ ننگڑا اور کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے۔'' وہ چلا کر بولی تھی۔

✠ ✠ ✠

اس رات وہ تین بجے کے بعد بار سے لوٹا تو تھکن سے چور تھا۔ وہ Bar back کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی آخری شفٹ میں تھی۔ لاسٹ کال کے بعد جس کا وقت رات دو بجے مقرر تھا اور جس کے اعلان پر آخری گاہک کو بھی رخصت کر دیا جاتا، وہ بارٹینڈر کے ساتھ مل کر ٹوٹی ہوئی بوتلیں، گلاسوں کا کانچ اور تلف کیے جانے کے لائق گارنشز کو پلاسٹک کے تھیلوں میں جمع کر کے ڈمپسٹر میں ڈالتا، استعمال شدہ گلاسوں کو دھو کر ہوا میں خشک ہونے کے لیے ہینگروں میں معلق کر دیتا۔ فرش پر بچھے ربر میٹ جو بیئر اور کاک ٹیلز گرنے سے چیپ دار اور متعفن ہو جاتے تھے، انہیں دھونے کے بعد فرش کی صفائی کرتا اور آخر میں بار کی سطح اور میزیں صاف کر کے اگلے دن پہلی شفٹ کے لیے تنظیم قائم کر دیتا۔

اس بے زار کر دینے والی مشقت سے روز ہی اس کا بدن اور ذہن کلی انکار کرتے تھے، مگر آج معمول سے بڑھ کر کچھ ہوا تھا۔

اس کی شفٹ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ دو نوجوان لڑکوں نے، جو شاید آزمودہ کار نہ تھے، ایک پنٹ کے دو دو گلاس Tequilla پینے کے بعد میز اور فرش پر قے کر دی تھی۔ اس سے قبل بھی اسے فرش پر سے بلغم ملے تھوک اور قے کے گھناؤنے تالاب پانی میں بہانا پڑے تھے لیکن ایسا ہمیشہ بار خالی ہونے کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اس نے لوگوں کی بھیڑ میں کبھی یہ رزیل کام نہ کیا تھا۔ لیکن آج وہ مجبور ہو گیا تھا۔ ساتھ والی میزوں پر بیٹھے لوگ اٹھ کر گوشوں میں سمٹ گئے تھے اور چند افراد بار سے باہر جانے والی راہ بھی اپنا رہے تھے۔ اسے سب کی موجودگی میں گھٹنوں کے بل جھک کر، سر کندھوں پر گرا کر وہ غلاظت صاف کرنا پڑی تھی۔ وہاں کسی نے بھی اس کی کیفیات کو محسوس نہ کیا ہوگا، مگر وہ ان لمحات میں خود کو دنیا کا سب سے حقیر آدمی سمجھ رہا تھا۔

اپارٹمنٹ کے دروازے پر لگی کال بیل بجانے کے بعد ایک لمحے کا توقف کیے بغیر وہ دروازے کو ہتھیلی سے پیٹنے لگا تھا۔

اس کے پاس دروازے کی چابی تھی لیکن رائن نے اندر سے بولٹ چڑھایا ہوا تھا۔ پانچ منٹ تک مسلسل دروازہ بجانے پر بھی جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے دروازے کو ٹھوکر مارنے کے لیے پاؤں اٹھایا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بند دروازے کو توڑ کر اندر گھس جائے۔ اس کا پاؤں ہوا میں ہی تھا کہ رائن نے آنکھیں مچکاتے ہوئے دروازے کا پٹ ذرا سا وا کیا۔ اس نے رائن سے کچھ بھی کہے بنا اندر جانے کی کوشش کی تھی، کیونکہ وہ زبان کھولتا تو سوائے گالی کے کچھ برآمد نہ ہوتا۔

''رکو۔ تم اندر نہیں آسکتے۔ میری بات تو سن لو، یہیں رکو۔'' رائن غنودہ آواز میں بولا اور بازو موڑ کر اس کی چھاتی پر رکھتے ہوئے اسے اندر جانے سے روک دیا۔

''رائن! میں تمہیں سنجیدگی سے بتا رہا ہوں کہ اس وقت میرے ساتھ الجھنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا، میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔'' اس نے رائن کو دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔

''وہ سوزن آئی ہوئی ہے، وہ تمہاری صحبت کو بالکل پسند نہیں کرے گی۔ بہت نفیس طبیعت کی ہے۔ تم سے بُو آرہی ہے۔ تم کار میں کیوں نہیں سو جاتے۔'' رائن سوئی جاگی کیفیت میں بول رہا تھا۔

احمد کا جی چاہا کہ وہ رائن کا دم گھونٹ کر اسے مار ڈالے اور اس نازک طبع سوزن کا سر کلینگ سلوشن سے بھیگے ہوئے اپنے بھاری جوتوں سے کچلنے کے بعد عقبی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اس اذیت ناک زندگی کا اختتام کر دے۔

اس نے مٹھی بھینچ کر رائن کے ماتھے پر ضرب لگائی اور چیخ کر بولا۔

''مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری ماں کوئی بدکردار عورت تھی۔ کتیا کے بچے! میں کسی روز تمہیں جان سے مار دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتا، میرا سامان باہر نکال دو، میں ابھی کہیں اور چلا جاؤں گا۔''

رائن چند لمحے اپنا ماتھا سہلاتا رہا، پھر سابقہ نیند بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

''بار بیک ہونے کا یہ ہی ایک فائدہ ہے کہ مفت ڈرنکس ملتی ہیں۔ میں نے برا نہیں مانا۔ مجھے معلوم ہے تم نشے میں ہو۔ تمہاری ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کار کی چابی تو تمہارے پاس ہے نا۔ صبح جلدی اٹھ جانا۔ مجھے دس بجے وارنر برادرز اسٹوڈیوز جانا ہے اور میرے لکی موزے نہیں مل رہے۔ شام سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم نے تو نہیں دیکھے؟ وہ رائل بلو رنگ کے ہیں۔'' سر کھجاتے ہوئے مڑ کر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر احمد اکھڑے ہوئے، روغن والے بند دروازے کو جلتی آنکھوں سے گھورتا رہا اور پھر دروازے پر لگاتار ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ سامنے والے اپارٹمنٹ سے خمیدہ کمر والا ڈونلڈ آنکھیں ملتا ہوا نکلا تھا اور کچھ گالیاں بکنے کے بعد دوبارہ اندر غائب ہو گیا تھا۔

عمارت کے پارکنگ لاٹ کی گھٹن زدہ فضا میں اسے سخت گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کار کو باہر سڑک پر نکال لایا اور سمت کا تعین کیے بنا روانہ ہو گیا۔ رائن کے ان دھلے رائل بلو ''لکی'' موزے اسے پسنجر سیٹ کی گدی پر ایک میسن جار میں گھسیڑے ہوئے مل گئے تھے۔ اس نے جار سمیت انہیں کھڑکی سے باہر فٹ پاتھ پر اچھال دیا تھا۔

رائن کے ساتھ مزید ایک دن بھی گزارنا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ غلیظ، لاپروا، بے حس اور ڈھٹائی کی حد تک بے شرم تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو بار احمد کو ضرور ہی کار میں رات بسر کرنا پڑتی تھی۔

وجہ وہی اس کی نام نہاد گرل فرینڈز جوڈی، گریس، مارلن، سوزن...... اب تو اسے ان کے نام اور شمار یاد رکھنے میں بھی دقت ہونے لگی تھی۔ وہ سب hookers تھیں جنہیں وہ سن سیٹ اسٹرپ سے منتخب کر کے ساتھ لے آتا تھا۔ ان کے نام بھی رائن خود ہی تجویز کرتا تھا۔ ان کی کسی مخصوص عادت یا شباہت جو رائن کے بقول کسی خاص فلم ہیروئن سے ملتی تھی، اسی کی بنیاد بنا کر رائن نے

ان کے نام رکھے ہوئے تھے۔ شہد جیسی رنگت کے بالوں اور نیلی آنکھوں والی معصوم صورت hooker، جس کی عمر بمشکل تیرہ سال تھی، وہ رائن کی 'جوڈی فوسٹر' تھی، کیونکہ اداکارہ نے 'Taxi driver' میں بارہ سالہ طوائف کا کردار نبھایا تھا۔ باریک نقوش والی، دبلی اور نہایت کم گو، 'گریس کیلی' تھی۔ چوڑے کولہوں اور مضبوط جثے والی دراز قد اطالوی نژاد 'صوفیہ لارین' تھی۔

وہ رائن کے طرز بود سے نہایت عاجز آ چکا تھا اور کب کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر جا چکا ہوتا اگر اس کے پاس کوئی بھی معقول متبادل ہوتا۔ پھر رائن کی کار استعمال کرنے کی سہولت سے دستبردار ہونا بھی ایک مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ رہائش سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ اپنی قلیل آمدنی میں سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر رہا تھا اور اسے امید تھی کہ آٹھ، دس ماہ تک ایک سیکنڈ ہینڈ Volkswagon Beetle خریدنے کے قابل ہو جائے گا اور شاید اس دوران کسی فلم، کمرشل یا ٹیلی ویژن سیریل میں کوئی رول مل جائے اور بار کی نوکری کو ترک کرنا...... سوچتے ہوئے اس نے خود کو ٹوک دیا تھا۔ وہ پھر سے ناممکن کو ممکن شمار کر رہا تھا۔ اس کی خوش فہمیوں کی عمر تمام ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی۔ پر امید جانے کیوں ایسی سخت جان تھی، کسی طرح دم توڑتی ہی نہ تھی۔ سلگتی، کبھی مدھم جلتی، کبھی بھڑک اٹھتی لیکن بجھنے کا نام نہ لیتی۔

اپنی سوچوں میں گم ایک چوراہے سے کار موڑتے ہوئے اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشوں سے ان گنت ننھے شرارے پھوٹے ہوں۔ اس نے شدید دھماکہ سنا اور جسم کو لگنے والے دھچکے سے بے ساختہ اچھل کر اسٹیئرنگ وہیل کے اوپر چھاتی کے بل گرا۔ نشست سے جدا ہوتے ہوئے اس کا سر اور کندھوں کی پشت دھاتی چھت سے ٹکرائی تھی۔ خاصی دیر وہ کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت اسی حالت میں پڑا رہا۔ جب ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو اسے دھیرے دھیرے سمجھ میں آ گیا کہ کسی گاڑی نے اس کی کار کو عقبی سمت سے ٹکر ماری تھی اور کار جو نہایت سست روی سے چل رہی تھی، سڑک سے اتر کر ایک درخت کے تنے سے ٹکرانے کے بعد رک چکی تھی۔ وہ آہستگی سے سیدھا ہو کر بیٹھا اور جسم کو ٹٹولتے ہوئے چوٹوں کا جائزہ لینے لگا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی لگ رہا تھا۔ ماتھے اور ہاتھوں پر ہلکی خراشیں تھیں۔ پسلیوں، گردن اور گھٹنوں میں درد کا احساس تھا مگر وہ برداشت کی حد سے متجاوز نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین اور ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ پچھلی نشست بھی ایک طرف سے قدرے پچکی ہوئی نظر آتی تھی۔

پھر دھیان اس کی جانب منتقل ہوا جو اس حادثے کا باعث بنا تھا۔ اس کا ذہن واضح نہیں تھا کہ غلطی کس کی تھی، لیکن بہر حال اسے عقب سے دھکیلا گیا تھا تو غالب امکان یہی تھا کہ غفلت دوسرے فریق نے دکھائی تھی۔

وہ نیچے اترا، کار کو لاک کیا اور کسی قدر لنگڑا کر چلنے لگا۔ کچھ دور فٹ پاتھ پر پرانے ماڈل کی گہرے سرخ رنگ کی کار آڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا اگلا فینڈر اور ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ کر جھولنے لگی تھی۔ بونٹ کا کونہ بھی اندر دب گیا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکا اور شیشے پر انگلیوں سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے ڈور ہینڈل پکڑ کر باہر کی جانب کھینچا تھا۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سرخ بالوں والی لڑکی سر جھکائے خاموشی سے ساکت بیٹھی تھی اور کار میں وہ اکیلی تھی۔ احمد نے پہلے آواز دے کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن شاید وہ اب تک صدمے کی کیفیت میں تھی۔ کئی بار بلند آواز میں پکارنے پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ پھر جب اس نے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا ہلایا تو وہ یوں متحرک ہو گئی جیسے اسی بات کی منتظر تھی۔ وہ اچانک چیختے ہوئے اپنے نکیلے ناخنوں سے احمد کے بازوؤں کو بری طرح کھسوٹنے لگی تھی اور اگر وہ فوراً دور نہ ہٹتا تو اس کی کلائیاں لہولہان ہو چکی ہوتیں۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ تمہیں احساس ہے تم نے کیا کیا ہے اور بجائے معذرت کرنے کے تم مجھے مزید چوٹ پہنچا رہی ہو۔ اگر میری کار درخت سے بھڑ کر رکتی نہیں اور الٹ جاتی تو شاید میں مر ہی گیا ہوتا۔ تم نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں

چھوڑی۔"

وہ سخت طیش کی حالت میں اسے برا بھلا کہنے لگا تھا اور جواب میں اس کی کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سن کر ساکت ہو گیا۔

وہ گاڑی سے اترنے کے لیے کسی مخمور کی طرح ڈول کر اٹھی، پہلے ایک ٹانگ باہر نکالی اور دو تین بار زمین کو پاؤں سے چھونے کے بعد جھجکتے ہوئے نیچے اتری۔

اس نے سرخ ہاٹ پینٹس کے ساتھ سیاہ کروپ ٹاپ پہن رکھا تھا۔ وہ stockings نہیں پہنے ہوئے تھی اور مختصر ہاٹ پینٹس کے نیچے اس کے برہنہ گھٹنے بار بار آپس میں ٹکرا جاتے تھے۔ stiletto ہیل والے سرخ جوتوں میں اسے سیدھا کھڑا ہونے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ ایک زرد رو دراز قامت لڑکی تھی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر لگی گہری سرخ لپ اسٹک بکھری ہوئی تھی اور ہونٹوں کے گوشے گیلے سے لگتے تھے۔ احمد کو اندازہ کرنے میں محض چند لمحے لگے تھے کہ وہ کسی شرابی جیسی حرکتیں نہیں کر رہی تھی بلکہ درحقیقت الکوحل کے زیر اثر تھی۔

"مدد کرو...... مدد کرو...... میری کار کا حادثہ ہو گیا ہے...... مجھے ہسپتال لے جاؤ۔"

نقوش سے وہ اسپینش لگتی تھی۔ اسے بولتے ہوئے سن کر احمد کے اندازے پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ اس کی انگلش بہت بری تھی اور رہی سہی کسر مدہوشی نے پوری کر دی تھی۔

"cops کو مت بلانا۔ مجھے ان سے نفرت ہے...... نفرت نہیں، ڈر لگتا ہے پولیس کار کو دیکھا تو...... تو میں بھاگ پڑی۔ وہ مجھے breth-reath-breth-liser...... میں سانس لینے کو کہتے تو پتہ چل جاتا...... وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔" اس کی باتیں بے ربط اور آواز لڑکھڑاہٹ زدہ تھی۔ 'breathalyzer' کہنے کے لیے اسے بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

"بربن ہمیشہ میرے ساتھ یہی کرتی ہے۔ مجھ سے...... میرے ہاتھ تو نہیں کانپ رہے؟...... دیکھنا ذرا، غور سے دیکھو لیکن وہ بربن نہیں تھی، شاید جن...... نہیں جن بھی نہیں رم...... رررم...... پر وہ مفت تھی۔ بالکل مفت۔ ایک بھی سینٹ خرچ نہیں ہوا۔" وہ ہنسنے لگی اور ڈگمگاتی ہوئی احمد کے پاس آ گئی۔

"مجھے نیند آئی ہے، تمہیں پکڑ کر سوؤں گی، ورنہ گر سکتی ہوں۔"

وہ اپنا بدبودار منہ اس کی گردن میں گھسا کر اس سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے بپھر کر لڑکی کو پرے دھکیل دیا تھا۔

"میں تمہیں خود پولیس اسٹیشن لے چلتا ہوں۔ تمہارا نشہ وہ لوگ ایک منٹ میں اتار دیں گے۔ تم جیسے لوگوں کو جیلوں میں ہونا چاہیے۔ سڑکوں پر آزاد گھومنے کے لائق نہیں ہو تم۔"

اسے مسلسل ہنستے پا کر احمد نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اس لڑکی سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بات کو صحیح مفہوم کے ساتھ سمجھنے سے قاصر تھی اور احمد سوچ رہا تھا کہ اس معاملے سے کیسے نمٹے۔

اسے اپنے جسم اور کپڑوں سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس کی آستینیں اور ٹراؤزر کے پائنچے تیز مہک والے سستے صابن کے محلول سے سنے ہوئے تھے۔ وہ ایک بھرپور غسل کی شدید خواہش محسوس کر رہا تھا۔ بے خوابی کے درد سے اس کی آنکھیں جھلستی تھیں۔ اس کا مضمحل بدن ایک آرام دہ بستر مانگ رہا تھا اور ایسے میں پولیس آفیسرز کی کڑی نگاہوں اور چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا اسے نہایت ناپسندیدہ خیال لگ رہا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر ہمیشہ ہی پولیس سے کترایا کرتا تھا اور اس ذہنی و جسمانی کیفیت میں تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

"تمہارا پرس کہاں ہے؟" احمد نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کتنی رقم ہے؟ میں تمہیں

صرف اس صورت میں جانے دوں گا کہ تم مجھے گاڑی کا ورکشاپ کا خرچ فراہم کردو۔ ورنہ دوسرا راستہ سیدھا پولیس اسٹیشن کو جاتا ہے۔ بلکہ جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ میں cops کو یہیں بلا لیتا ہوں۔''

اس نے لڑکی کو خوفزدہ کرنے کی خاطر اس کے منہ پر ایک تھپڑ بھی مار دیا تھا۔

''مجھے بیوقوف سمجھتے ہو؟ الکوحل میرے دماغ کو بند نہیں کرتا۔ میرے شعور کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ زیادہ چالاک مت بنو۔ میں سوبر ہوں۔ دیکھو میں ایک ٹانگ پر کھڑی ہو سکتی ہوں۔''

وہ احمد کا کندھا پکڑ کر اچکتے ہوئے ایک پاؤں اٹھانے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم بھی پاؤں اٹھاؤ، اس سے میری حوصلہ افزائی ہوگی۔ کہتے ہیں دو پاؤں اٹھا کر کوئی کھڑا نہیں رہ سکتا...... سب جھوٹ ہے۔ چلو کوئی بات نہیں، میں تمہیں دوسرا ٹیسٹ پاس کر کے دکھاتی ہوں۔ یہ لو...... میں اپنی آنکھیں بند کر کے ناک کو انگلی لگا سکتی ہوں۔ آسان ہے......''

اس نے احمد کی جانب جھکتے ہوئے اس کی ناک کی پھننگ انگوٹھے اور انگلی کی چٹکی میں پکڑ لی۔ غالباً وہ پہلے کبھی مدہوشی کی حالت میں ڈرائیو کرتے ہوئے cops کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ تب ہی اس کے خوابیدہ شعور میں Field Sobriety Test کی آزمائشوں کا خاکہ چل رہا تھا جن سے ایسے مواقع پر ڈرائیور کو گزرنا پڑتا تھا۔

تمہاری ناک...... نہیں میری ناک تمہارے منہ پر کیوں ہے؟ تمہاری ناک کدھر گئی؟ تم ناک کے بغیر کیا کرو گے؟''

تھپڑ کا اس پر تل برابر اثر نہ ہوا تھا اور وہ مسلسل اول فول بکے جا رہی تھی۔ جھنجلا کر احمد نے اسے زور سے دھکا دیا۔

''میں تمہارے پرس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے نقصان کی قیمت چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ تم رہنے دو، میں خود ہی لے لیتا ہوں۔'' اس نے ڈرائیور سائیڈ کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں cops کو بلاؤں گی۔ تم ظالم ہو۔ میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس منسوخ کروا دوں گی۔ ایک پولیس آفیسر میرا دوست ہے پر شاید...... ایسا فلم میں تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا۔''

وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی اس کے پیچھے آنے لگی۔

''میرے پرس میں بڑی مزے دار چیزیں ہیں۔ میں تمہیں بھی دوں گی۔ تم دکھی ہو، تمہیں غم بھولنے کی ضرورت ہے۔ ڈرو مت...... میں تمہیں دوں گی، جادو کی چیزیں۔''

اس نے احمد کے پیروں کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے بازو لمبا کر کے ڈرائیور سیٹ کے نیچے سے ایک لیڈیز بیگ نکالا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک درمیانے حجم کی بوتل، جو کسی قسم کے لیبل سے عاری تھی، نکال کر احمد کو تھما دی تھی۔

''پیو۔ یہ تمہاری ہمدرد ہے۔ دوست ہے...... سب کی دوست ہے۔''

احمد نے چند لمحے سوچنے کے بعد بوتل کا ڈھکن ہٹایا اور دھانے کو ناک سے قریب کرتے ہوئے سونگھا۔ شاید وہ وہسکی تھی البتہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اسکاچ تھی یا بربن۔ وہ کبھی کبھار کاک ٹیلز تیار کرنے میں بارٹینڈر ایلون کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ لیکن ایلون کی طرح محض رنگ، کثافت اور بو سے شرابوں میں تمیز کرنے کی قابلیت اس میں نہیں تھی۔ کاک ٹیلز میں سے وہ صرف مارٹینی پیا کرتا تھا۔ اس انتخاب کی وجہ کیری گرانٹ تھا۔ مارٹینی، کیری گرانٹ کا پسندیدہ کاک ٹیل تھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے بوتل میں سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ ذائقہ نہایت تلخ تھا۔ اسے حلق میں شدید جلن محسوس ہوئی۔ لیکن وہ اسے پینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اپنے شکستہ اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے اسے آسرا درکار تھا۔

اس نے ہاتھ پکڑ کر سرخ بالوں والی کو کھینچا اور گاڑی کے اندر دھکیل کر خود پسنجرز سائیڈ کے دروازے سے داخل ہو کر نشست پر نیم دراز ہو گیا۔

دوسرا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے ونڈ اسکرین سے باہر آسمان کی جانب دیکھا۔ پو پھٹنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ آسمان کی سیاہی مدھم پڑ کر نیلگوں سرمئی ہو چلی تھی۔ اس نے گاڑھی شراب کو تالو پر سے زبان کے ساتھ چاٹا اور تیسرا گھونٹ حلق سے نیچے دھکیلا۔

لڑکی ہسپانوی میں مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی لیکن احمد نے اس کی آواز پر دھیان دینا بند کر دیا تھا۔ ایک دھندسی تھی جو اس کے حواس پر غلاف کی طرح لپٹ رہی تھی۔ نصف بوتل اپنے اندر انڈیلنے کے بعد اس کا سر چکرانے لگا اور زوردار ابکائی آئی۔ اسے لگا، اس کے معدے میں موجود ہر شے باہر ابل پڑے گی۔ شرمپس جو اس نے گمبو سوپ کے ساتھ کھائے تھے اور براؤنیز کا ٹکڑا بھی۔ اسے اپنے مہنگے ڈنر کے ضائع ہونے کا افسوس ہونے لگا۔ لیکن اسے قے نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑا سا وقفہ دے کر اس نے ایک اور گھونٹ لیا تھا۔ اچانک اسے ہنسی آ گئی۔

''تم نے رائن کی کار توڑ دی۔ اچھا کیا۔ میرا دل بھی یہی کرتا تھا۔ توڑ دی...... تم نے توڑ دی...... توڑ دی...... سب کچھ توڑ ڈالو۔''

یہ کوئی ہنسنے والی بات نہیں تھی۔ لیکن جانے کیوں اسے ہنسی آ رہی تھی۔ پھر اسے ایک خیال سوجھا اور وہ اسے دلچسپ لگا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر ٹانگیں پسار کر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر میں دھپ مار کر وہ اسے گالیاں دینے لگا تھا۔ وہ جواب میں کچھ بولی تھی پر اس نے سنا نہیں۔

ان سب لوگوں کے نام، جن کی طرف سے اسے استرداد کی ذلت سہنا پڑی تھی، یاد کر کے وہ انہیں گالیاں دینے لگا۔ وہ کسی ایک کا نام پکارتا، حلق کی پوری طاقت سے چلاتے ہوئے اسے غلیظ گالیاں دیتا اور پھر کوئی دوسرا نام یاد کرنے کے لیے دماغ کو کھنگالنے لگتا۔ حیرت کی بات تھی کہ ایسا کرتے ہوئے اسے مزہ آ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک بے عنوان خوشی پھیل رہی تھی۔

ہسپانوی لڑکی نے پرس میں سے پلاسٹک کی چھوٹی سی شفاف تھیلی برآمد کی تھی جس میں زردی مائل سبز اور مدھم بھورے رنگ کی پتیاں، ڈنٹھل اور تنکے بھرے تھے۔ احمد نے آنکھیں پھیلا کر تھیلی کو نزدیک سے دیکھا۔ وہ خشک گھاس نما ان پتوں کو پہچانتا تھا۔ وہ 'ماری جوانا' کا پیکٹ تھا۔ اس نے جیل میں بعض بااثر قیدیوں کو ماری جوانا کے 'جوائنٹ' پیتے یا 'بونگ' کے ذریعے اسے استعمال کرتے دیکھا تھا۔

اب وہ رولنگ پیپر کے دو پرزوں کو گھٹنوں پر رکھ کر سگریٹ کا تمبا کو اور تھیلی کے اجزاء کو ان پر ڈھیر کر رہی تھی۔ حتی الوسع احتیاط سے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے رولنگ پیپر کو گولائی میں لپیٹ کر دو جوائنٹ تیار کیے اور احمد سے لائٹر مانگا۔ اسے لائٹر ڈھونڈنے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ کوشش کے باوجود اس کا ہاتھ اپنی جیب میں نہیں گھس رہا تھا اور بار بار پھسل جاتا تھا۔ اس بات پر بھی اسے بہت ہنسی آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گاڑی کی فضا میں ماری جوانا کی گندھ پھیلتی محسوس کی تھی۔ لڑکی نے ایک سلگتا ہوا جوائنٹ اس کے ہونٹوں کے پاس لا کر اسے منہ کھولنے کو کہا۔ وہ انکار کرنا چاہتا تھا لیکن ہنسی سے اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ بوتل میں الکوحل کے سوا جانے کیا تھا کہ اس کا سر گھومنے لگا تھا اور جوتوں میں مقید پیروں کے انگوٹھوں میں سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ اس نے لڑکی سے کہنا چاہا کہ اسے نیند آئی ہے اور وہ لیٹنا چاہتا ہے لیکن اس سے کہا ہی نہیں گیا۔ وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس سے زبان بھی ہلائی نہ جاتی تھی۔ وہ لڑکی تو ہسپانوی بولے جا رہی تھی اور احمد کو اس زبان سے خاص واقفیت نہیں تھی۔ اس سے کچھ کہنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔

''بس میں خاموش رہوں گا اور میں مسکرات بھی نہیں لیتا۔'' یہ بتانا بہت ضروری تھا۔ اس نے بمشکل جبڑوں کو کھینچ کر کچھ کہا تھا۔ وہ اتنا عجیب جملہ تھا کہ اسے سن کر احمد کو پھر ہنسی آنے لگی حالانکہ وہ اپنی ہنسی سے اکتا چکا تھا پر وہ جملہ ہی ایسا مضحکہ خیز تھا'' وہ حشیش کیوں پئیں جرمونا لڑکی!''

یہ جرمونا کیا ہوا؟ اسے یہ مزے دار نام سوجھا کیسے؟'' جرمونا...... جیری مونا...... موری جانا......'' کہتے ہوئے اس کے منہ سے دھواں اٹھا تھا۔ آس پاس کتنا دھواں تھا۔ کیف آور دھواں۔ شاید 'smog' کار کے اندر گھس آئی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر دھوئیں کو باہر نکالنے کا ارادہ کیا لیکن اسے اپنا ہاتھ ہی نہیں ملا۔ خوف کے ساتھ اس پر منکشف ہوا کہ گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں بھی نہیں تھیں۔ البتہ پیر موجود تھے۔ کوئی بات نہیں، وہ چل تو سکتا تھا نا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے لڑکی کی گود میں لیٹنا چاہا لیکن اس کی گود میں پہلے ہی ایک الجھے ہوئے سرخ بالوں والا سر دھرا تھا۔ وہ کہیں جا رہا تھا۔ شاید کہیں دور اور پتہ اس سے کھو گیا تھا۔

''میں وہاں پہنچوں گا کیسے؟ کہیں میں گم نہ ہو جاؤں۔ مجھے دیر ہو گئی تو وہ کردار کسی اور کو مل جائے گا لیکن میں ایکسٹرا نہیں ہوں۔'' وہ متفکر ہوا۔ سورج اس کی آنکھوں کے بالکل پاس تھا۔ اس نے ہاتھ رکھ کر آنکھوں کو ڈھانپنا چاہا۔ کسی نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ اسے کھینچ کر کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ وہ جیل میں قدم نہیں رکھے گا...... وہاں اسپیگٹی نہیں ملتی تھی...... کوئی بچہ روئے جا رہا تھا...... وہ چپ کیوں نہیں ہوتا تھا۔ اب تو روشنی بھی آنکھوں میں نہیں چبھ رہی تھی۔ شاید شام ہو گئی تھی...... وہ اسٹریٹ واکر اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی...... اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ جب تک اس نے کار نہ خریدی، وہ hookers پر رقم ضائع نہیں کرے گا...... اس لڑکی کی ٹانگیں کس قدر لمبی تھیں؟...... اتنی لمبی ٹانگوں والی لڑکی رائن کی swinger میں کیسے بیٹھے گی...... اور وہ کیسی لاپرواہ تھی، اسے بچے کو تو خاموش کروانا چاہیے تھا۔



اس کی آنکھوں پر اتنا بوجھ تھا کہ پپوٹے کھولنے کے لیے اسے سخت مشقت کرنا پڑی تھی۔ پلکیں ذرا سی جدا ہونے پر اس نے دوبارہ آنکھیں میچ لی تھیں۔ روشنی کسی تیز دھار چاقو کی انی تھی جو اس کی پتلیوں کو چیر رہی تھی۔ اس کی کنپٹیاں درد سے بھری تھیں۔ زبان میں بھی اکڑن تھی اور اس پر لسلسا، ریتلا سواد چپکا تھا۔ کانٹوں سے اٹے ہوئے حلق کو تر کرنے کی خاطر اس نے تھوک کا گھونٹ نگلا تو کسیلے ذائقے سے اسے کراہت آئی۔ پیٹ کے نچلے حصے میں سخت کساوٹ تھی اور وہاں کوئی بدمزہ شے کلبلا رہی تھی۔

یکدم اٹھ کر اس نے بستر سے نیچے اترنا چاہا اور لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے الٹی آ رہی تھی قے کرتے ہوئے بدن کے سارے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ کا لمس اپنے بالوں میں محسوس کیا تھا۔ وہ سرخ بالوں والی ہسپانوی لڑکی تھی۔ اسے رات کی روداد یاد آنے لگی۔ لڑکی کا ایک ہاتھ اس کی کمر پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن کی پشت کو دبوچے وہ اسے اٹھنے پر آمادہ کر رہی تھی۔ وہ اتنی اونچی آواز میں بول رہی تھی کہ احمد کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

وہ اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا ایک ادھ کھلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پاؤں بے حد وزنی تھے اور انہیں اٹھا کر زمین پر دھرنا ایک صبر آزما کام تھا۔ وہ کمرہ دراصل باتھ روم تھا۔ نلوں سے گرتا ہوا پانی نہایت پرشور آواز کے ساتھ باتھ ٹب کے داغدار پیندے سے ٹکرا کر چھینٹے اڑا رہا تھا۔

لڑکی نے قوت کے ساتھ اسے دھکیلتے ہوئے اس کا سر ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار تلے دبا دیا تھا۔ اس کا سانس الٹنے

لگا۔ اس نے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے اعضاء میں مزاحمت کی سکت ہی نہیں تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے کھولتے ہوئے گرم پانی کو اپنے سر پر بہتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنا سر پانی کے نیچے سے نکالنے کی ایک اور سعی کی۔ کچھ پانی اس کے کھلے ہوئے منہ اور ناک کے ذریعے حلق میں بھی چلا گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے گردن اور سر پر سے ہاتھوں کا دباؤ ہٹتے ہوئے پایا تھا۔

لڑکی نے تولیے سے اسے خشک کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہا تھا تو اس نے جواب میں کہا ''خاصا بہتر۔''

بیڈ پر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھنے تک واقعی اعصاب کے بوجھل پن میں کمی ہو چکی تھی۔ کنپٹیوں میں ہونے والا درد تقریباً عنقا ہو گیا تھا اور پپوٹے پہلے جیسے بھاری نہ رہے تھے۔ گردن ڈھلکا کر اس نے آس پاس نظریں گھمائیں۔

وہ ایک مختصر اور بے ترتیب کمرہ تھا۔ کھڑکی کے ذرا سے ہٹے ہوئے پردے کی اوٹ سے اس نے باہر اترتی شام کو دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ کتنا وقت سویا رہا تھا؟ یا مدہوش رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا۔ رائن کو آج وارنر برادرز اسٹوڈیوز جانا تھا۔ اس کے اور swinger کے یوں غائب ہو جانے پر وہ سخت کوفت میں مبتلا رہا ہوگا۔

جانے وہ لڑکی اسے کہاں لے آئی تھی اور اس حالت میں اس نے ڈرائیونگ کیسے کی ہوگی؟

ایک آواز سن کر اس کی توجہ کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ رکھے کاٹ کی طرف منعطف ہوئی۔ ایک بچہ کاٹ میں لیٹا ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل ڈیڑھ دو ماہ ہوگی اور شاید وہ لڑکی تھی۔ اس کے نقوش سے ایسا ہی تاثر ابھرتا تھا۔ تو وہ اس کے رونے کی آواز تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی۔

پھر احمد نے ہسپانوی لڑکی کو دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کانچ کا گلاس تھا۔ جس میں اس کے بالوں کی رنگت سے ملتا جلتا سیال بھرا ہوا تھا۔

''اسے پی لو۔''

احمد نے ہاتھ بڑھا کر گلاس لے لیا تھا۔ ''کیا ہے یہ؟''

''بلڈی میری (واڈکا اور ٹماٹر کے رس پر مبنی ایک کاک ٹیل) سو چومت۔ ہینگ اوور (کثرت شراب نوشی کے بعد پیدا ہونے والی نفسیاتی و جسمانی کیفیات) میں اس سے بڑا افاقہ ہوتا ہے۔ تم بس خاموشی سے پی جاؤ۔ تمہیں اچھا لگے گا۔''

الکوحل چکھنے کے تصور سے ہی احمد کو نفرت ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے اور معدے میں آگ سی دہکی ہوئی تھی۔ جی کڑا کر کے اس نے گھونٹ گھونٹ تیز ذائقے والا مشروب اپنے اندر اتار لیا تھا۔

''ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوا، میرا اس میں کوئی ارادہ شامل نہیں تھا۔ اگر میرا ذہن صحیح کام کر رہا ہوتا تو میں یہ کبھی نہ ہونے دیتا۔''

اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

مونا اسٹوکر کے بعد اس نے کسی بھی لڑکی کے ''نزدیک'' آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

لڑکی یہ بات سن کر ہنسی اور یوں ہاتھ ہلایا جیسے اس نے کوئی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو۔

''تم میرے لیے desconocido نہیں ہو۔''

''میں کیا نہیں ہوں؟''

''تم اجنبی نہیں ہو۔ میں نے پچھلے سال تمہیں سانتا کلاز پریڈ میں دیکھا تھا۔ اور تب میرے سر پر Eros (محبت کا یونانی دیوتا) کا مجسمہ معلق تھا، میں اس کے محبت بھرے پروں کے سائے میں تھی۔ اس نے موہ کا بان مجھ پر آزمایا۔ میں تب ہی تمہاری محبت

میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس وقت سے تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ میں نے تمہیں ہالی وڈ بلیورڈ اور سن سیٹ بلیورڈ کے آس پاس کے علاقوں میں بہت تلاش کیا لیکن تم ملے ہی نہیں اور آج قسمت نے ہمیں خود ملا دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔''

چاہے احمد اس وقت بھی بلڈی میری کے دیئے ہوئے خمار میں تھا لیکن اسے بالکل بھی شبہ نہیں تھا کہ لڑکی کی بات سچ ہو سکتی تھی۔

''میں پچھلے سال کرسمس پریڈ میں نہیں گیا تھا۔'' اس نے تردید کی۔

''تو اس سے پچھلے سال گئے ہو گے۔ محبت میں وقت کا حساب رکھنا ممکن ہی کہاں ہے۔'' اس نے اپنی ابھری ہوئی ہنسلی کی ہڈی کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے کہا تھا۔

''میں کبھی بھی اس پریڈ میں شریک نہیں ہوا۔ کسی بھی سال نہیں۔''

''تو پھر وہ تمہارے جیسا کوئی ہو گا لیکن......'' اس نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ ''تمہارے جیسا کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ تم تو صرف ایک ہی ہو۔ اور تم میرے ہو۔''

احمد کو لگا جیسے وہ لڑکی اب بھی نشے میں تھی۔

وہ البا مارسیلو تھی۔ کچھ سالوں قبل پامپلونا سے لاس اینجلس آئی تھی۔ احمد کی طرح اسے بھی اداکاری اور شہرت کا شوق یہاں کھینچ لایا تھا۔ وہ چند غیر اہم فلموں میں ایکسٹرا کے طور پر کام کر چکی تھی اور اس کی جز وقتی ملازمت ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس میں ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور کے لیے ماڈلنگ کرنے کی تھی۔ لیکن کچھ ماہ پہلے کسی معمولی کوتاہی کو بنیاد بنا کر اسے ماڈل کی حیثیت سے محروم کر دیا گیا تھا اور ان دنوں وہ صرف اپنے ایکٹنگ کیریئر پر دھیان دے رہی تھی۔ وہ بچی صوفیہ البا کی بہن کی بیٹی تھی جس کی پیدائش کے محض دو ہفتے بعد ہی اس کے ماں باپ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اور اب اس کی ذمہ داری البا کے سپرد تھی۔

احمد نے سوچا تھا کہ البا اور اس کی مڈبھیڑ one-night stand ثابت ہو گی مگر اس کا قیاس درست نہیں تھا۔ اگلی رات دو بجے بارٹینڈر ایلون کے جانے کے بعد جب وہ اکیلا ہی صفائی کا کام نبٹانے میں مگن تھا تو گارنشز میں سے باسی پھل علیحدہ کرتے ہوئے اسے فرش پر گونجتی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک سنائی دی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور البا اسے بار کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کے لیے جھکتی ہوئی نظر آئی۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ ساکت ہو گیا تھا۔

''تمہیں یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟''

البا نے باؤل میں سے چیری کا خوشہ اٹھا کر منہ میں ڈالا اور اسے چبائے بغیر زبان کی مدد سے گال میں گھماتے ہوئے بولی۔

''تمہارا ڈرائیونگ لائسنس تمہارا آئی ڈی...... تمہاری بار کا تشہیری کارڈ، سب کچھ تو تمہاری جیبوں میں تھا۔ پھر بھی پوچھ رہے ہو۔''

کہنیاں بار کی سطح پر رکھ کر وہ آگے جھکی اور تب احمد نے عین اوپر جلتے ہوئے گلوب کی تیز روشنی میں دیکھا کہ البا کے بالوں کی اصل رنگت سرخ نہیں تھی۔ اس کی پیشانی کے قریب چند لٹیں بھوری تھیں۔ اس نے بالوں کو رنگا ہوا تھا۔

''مجھے ایک ''بلڈی میری'' مل جائے گا۔ کاک ٹیلز میں سے سب سے زیادہ پسند ہے مجھے۔ لیکن میں اس کی قیمت ادا نہیں کروں گی۔ یہ ہاؤس کی طرف سے ہو گا۔''

✠ ✠ ✠

اس رات کے بعد بلاناغہ ہر رات البا بار میں آنے لگی۔ وہ ''لاسٹ کال'' تک کسی میز پر بیٹھی اس کے فارغ ہونے کی

منتظر رہتی۔ احمد ڈرنکس سرو کرنے کے لیے جس طرف بھی رخ کرتا، البا کی نظروں کو خود پر جمے ہوئے پاتا۔ چاہے اس کے پاس رکنے یا اسے مخاطب کرنے کے لیے احمد کو ایک لمحہ بھی میسر نہ ہوتا، وہ بنا کسی کوفت کے گھنٹوں تحمل کے ساتھ اس کا انتظار کرتی۔ یہاں سے وہاں جاتے ہوئے جب کبھی احمد کی نظر اس پر پڑتی، وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگتی یا ہاتھ ہلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی یا پھر کوئی رنگین اشارہ اچھال دیتی۔ احمد کو اس ارتکاز سے بعض اوقات الجھن ہونے لگتی تھی۔ اسے البا ناپسند نہیں تھی تاہم وہ اس کے ساتھ کوئی دیرپا تعلق قائم کرنے کا بھی خواہاں نہیں تھا۔

تمام کسٹمرز کے جانے کے بعد احمد اور ایلون صفائی کے لیے کمر کستے تو البا بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ منع کرنے کے باوجود وہ احمد کے حصے کا تقریباً تمام کام اپنے ذمے لے لیتی۔ پھر وہ دونوں خالی ہال میں بیٹھ کر چند ایک ڈرنکس پیتے اور باتیں کرتے۔ البا پوری رات اس کے ساتھ بتا دیتی اور احمد کو شک گزرتا کہ اس سے ملنے کے سوا البا کو دنیا میں کوئی کام تھا ہی نہیں۔ جب کبھی وہ البا سے استفسار کرتا کہ وہ رات بھر کے لیے صوفیہ کو کس کی نگرانی میں چھوڑ آتی ہے تو وہ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے موضوع ہی بدل ڈالتی۔ اس نے زیادہ تجسس بھی ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ سراسر البا کا ذاتی معاملہ تھا۔

ابتدا میں احمد نے اس کی حوصلہ شکنی کرنے اور پہلوتہی برتنے کی اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی پر البا نے ذرا سا بھی اثر قبول کیے بنا پیش قدمی جاری رکھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احمد کو بھی اس کا ساتھ نسبتاً کم ناگوار لگنے لگا۔ اتنا عرصہ اپنے خول میں بند ہو کر جینے کے بعد اسے سنانے کے لیے کوئی سامع درکار تھا اور البا کے ساتھ فروعی نوعیت کی باتیں کرنے سے اس کے اندر کی گھٹن کم ہو جاتی تھی جیسے کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگل کر اندرونی فضا کو شانت کر دیتی ہیں۔

البا سے ملتے ہوئے اسے قریباً ایک ماہ بیت چکا تھا اور اس دوران کسی ایک رات بھی البا نے بار میں آنے والے معمول کو توڑا نہ تھا۔ جب ایک بار وہ بار کے بند ہونے تک بھی نہ آئی تو احمد کے علاوہ ایلون نے بھی اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

''تمہاری ''بلڈی میری'' کہاں ہے؟'' ایلون نے تیسری بار اس سے پوچھا تھا۔ البا کے پسندیدہ کاک ٹیل اور اس کے بالوں کی رنگت میں مماثلت کی بنا پر ایلون نے اس کا نام بلڈی میری رکھ چھوڑا تھا۔

''مجھے کیا معلوم۔'' اس نے بے نیازی ظاہر کی۔

''تو کسے معلوم ہے؟''

''وہ کل آئے گی تو اس سے ہی پوچھ لینا۔''

''تو وہ کل آ رہی ہے؟''

''یہ تو وہی جانتی ہے۔''

''تم کچھ نہیں جانتے؟''

''کیا تم دیکھ نہیں رہے، میں مصروف ہوں۔'' احمد نے ان دھلے گلاس سنک میں ڈھیر کیے۔

''کیا تم دونوں کے بیچ کوئی ناراضی ہو گئی ہے؟''

''جو میں کر رہا ہوں، مجھے ختم کرنے دو۔''

''یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ تم اگر پریشان ہو تو اسے فون کر لو۔'' وہ کسے ہوئے جبڑوں کے ساتھ گلاس دھونے میں جتا رہا۔

''تم اگر پہلے سے فون کر چکے ہو تو مجھے بتا دو۔ ویسے زیادہ دیر تم سے ناراض رہ ہی نہیں سکتی۔ وہ تمہاری محبت میں سرتاپا ڈوبی ہوئی ہے۔ مانو تم تو اس کے لیے ایسے ہی ہو جیسے ''بلڈی میری'' میں ٹماٹر کا رس، تمہارے بغیر وہ نہ تو bloody (لہو ایسی لال)

رہ سکتی ہے اور نہ ہی merry (مسرور)۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ احمد نے جان بوجھ کر ایک گلاس سنک کے کنارے سے ٹکرا کر توڑ ڈالا تھا۔ ایلون کے سوالات بند کرنے کا اسے اور کوئی طریقہ نہیں سوجھا تھا۔ بعد میں وہ اپنے ردعمل پر متعجب بھی ہوا۔ اس قدر طیش میں آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ شاید وہ اس لیے جھنجلا رہا تھا کہ البا کے نہ آنے سے اسے بار کی ابتری سمیٹنے کا فرض خود نبھانا پڑا تھا۔

دوسری رات اور پھر تیسری رات بھی وہ نہ آئی تو احمد کو تشویش ہوئی۔ اس نے البا کو ٹیلی فون کرنے کا بھی سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاید وہ کسی مصروفیت میں پھنسی ہو گی یا بیمار ہو اور ممکن تھا وہ اکتا گئی ہو اور مزید اس سے ملنا نہ چاہتی ہو۔ اس آخری توجیہہ کو تسلیم کرنے سے اس کا دل صاف انکار کرتا تھا۔ احمد سے اکتا جانا ایک معمولی شخصیت والی لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔

چوتھی رات جب وہ بار سے واپس آیا تو اپارٹمنٹ کے دروازے کو اندر سے بند پا کر دھک سے رہ گیا۔ رائن گزشتہ دو دن سے نیویارک گیا ہوا تھا۔ وہاں مارٹن آرتھر کی ایک فلم کے کچھ مناظر مین ہٹن کے علاقہ میں آن لوکیشن فلم بند ہونا تھے۔ اور رائن، مارٹن کا اسٹینڈ ان تھا۔ آج دوپہر کو اس نے فون پر احمد کو بتایا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد لوٹنے والا تھا۔ تو پھر اپارٹمنٹ میں کون تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے کال بیل بجائی اور تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جس نے اطلاعی گھنٹی کا جواب دیا، اسے وہاں دیکھنے کی احمد کو ہرگز توقع نہ تھی۔

''البا! تم اندر کیسے داخل ہوئیں؟'' اس نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، تم میری کمی کو اتنی شدت سے محسوس کرو گے۔ میں روزانہ ایلون کو فون پر پوچھتی تھی اور اس نے بتایا کہ تم میرے بغیر کتنے اداس ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم بہت چڑچڑے ہو گئے ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی، میں کتنی خوش ہوں۔ میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں۔''

''تم نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کیسے کھولا؟'' احمد نے سوال دہرایا تھا۔ ''میں نے ایلون کے ساتھ مل کر تم سے چھوٹا سا مذاق کیا۔ میرا مقصد ہرگز تمہیں دکھ دینا نہیں تھا۔ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟''

''تمہارے پاس چابی کہاں سے آئی؟ شام کو میں خود دروازہ لاک کر کے گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''کچھ دنوں پہلے میں تمہارا والٹ دیکھ رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ تمہارے اپارٹمنٹ کی چابی کی ایک نقل بنوا لینی چاہیے۔ بس یونہی کیا خبر کب ضرورت پیش آ جائے۔ تمہیں دوبارہ بھی تو ہنگ اوور ہو سکتا ہے اور دیکھو اگر میں ایسا نہ کرتی تو میرے اچانک سامنے آنے پر جو خوشی تمہیں ملی ہے۔ اس کی شدت ایسی زیادہ تو کبھی نہ ہوتی۔ اچھا دیکھو میں اس بیل باٹم میں زیادہ دبلی تو نہیں لگ رہی؟''

تب پہلی بار احمد کو اس لڑکی سے خوف آیا تھا۔



شیو بناتے ہوئے اس نے رائن کی پکار سنی اور باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھولتے ہوئے باہر جھانکا۔

رائن ہاتھ میں ٹیلی فون کا ریسیور پکڑے اسے باہر نکلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''تمہارے لیے فون ہے۔ نہیں، وہ تمہاری ہسپانوی دوست نہیں ہے جس سے تم نے ابھی تک مجھے نہیں ملوایا۔ یہ تو ایڈی بلیک ول ہے۔ بہت ہی غیر معروف اور ناکارہ قسم کا ایجنٹ ہے۔

''میں پچھلے دو منٹ سے اسے سمجھا رہا ہوں کہ میرا دوست کسی غیر اہم کردار سے اپنے کیریئر کا آغاز نہیں کرنا چاہتا چاہے اسے جتنا عرصہ بھی انتظار کرنا پڑ جائے لیکن وہ بضد......''

احمد نے جھاگ میں ملفوف ہاتھ اپنی شرٹ سے رگڑتے ہوئے رائن کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا تھا۔
ایڈی بلیک ول کوئی بھی رسمی جملہ ادا کرنے کی زحمت گوارا کیے بنا مطلب کی بات پر آ گیا۔
''ایک انڈیپنڈنٹ پروڈکشن ہے۔ بجٹ بہت قلیل ہے۔ پروجیکٹ سے جڑے سب ہی لوگ غیر معروف ہیں۔ بالکل تمہاری اور میری طرح۔'' یقیناً ایڈی نے رائن کی ہرزہ سرائی سن لی تھی۔ ''میرا وعدہ ہے کہ آئندہ تمہارے لیے یقیناً اس سے کچھ بہتر کروں گا۔ تم میں مجھے وہ جنون نظر آتا ہے جو آج کل کے نوجوانوں میں ناپید ہوتا جا رہا ہے۔'' احمد دم سادھے سنتا رہا۔
''خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ تمہیں ایک part speaking (مکالمے والا کردار) کے لیے بلا رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے آفس میں تم ایکسٹرا بننے کا ذکر سنتے ہی بھڑک اٹھے تھے۔''
ریسیور پر جمی اس کی نم ہتھیلی اور بھی مرطوب ہو گئی۔ اس کا ذہن اس ایک جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ ''وہ تمہیں ایک سپیکنگ پارٹ کے لیے بلا رہے ہیں۔''



اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے جو سطر پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اطالوی میں تھی۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے اجنبی الفاظ پر نظریں دوڑائیں اور بے بسی سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو دیکھنے لگا۔
''تمہیں اطالوی پڑھنا نہیں آتی۔'' احمد کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے پوچھا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کی اٹالین مقامی ریستورانوں کی فہرستوں میں لکھے اطالوی کھانوں کے ناموں تک ہی محدود تھی۔ اور یہ کہ پڑھنے کے علاوہ اسے اطالوی بولنا بھی نہیں آتی تھی۔ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والے اگلے فقرے کی بنت کرنے لگا۔
''تم نے میرا وقت برباد کیا ہے۔'' یا پھر ''ایڈی میں پیشہ ورانہ روّیے کا فقدان ہے۔ کیا سوچ کر اس نے تمہیں میرے پاس بھیج دیا۔''
وہ گھٹنے سختی سے آپس میں ملائے پیروں کو اضطراری کیفیت میں جنبش دے رہا تھا۔
''ایڈی نے خاص طور پر تمہارا نام تجویز کیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم کسی بھی مردانہ آواز اور لہجے کی ہو بہو نقل اتار سکتے ہو۔''
اس کے پیروں کی حرکت موقوف ہوئی۔
''اس نے درست کہا ہے۔''
''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ میں تمہیں ایک ٹیپ شدہ آواز سنوا رہا ہوں۔ مجھے اس کی نقل کر کے سناؤ اور پھر مجھے طے کرنے دو۔''
''ٹھیک ہے۔''
وہ ایک درمیانی عمر کے مرد کی آواز تھی جس میں خرخراہٹ کا خفیف عنصر تھا۔ جوں ہی ان چند جملوں کی گونج تھمی۔ احمد نے آواز و انداز میں کسی تحریف کے بنا من وعن انہیں دوہرا دیا۔
اگر سامنے بیٹھا شخص متاثر ہوا بھی تھا تو اس نے اپنے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔
''اچھا اب میرے پیچھے اس اطالوی جملے کو دوہراؤ۔ لیکن آواز مورگن کی طرح ہی رکھنا۔'' تو آواز کے مالک کا نام مورگن تھا۔
وہ مختصر اور آسان سا فقرہ تھا۔ احمد کو مورگن کے لب و لہجے میں اسے ادا کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اسسٹنٹ

ڈائریکٹر نے گردن کو خم دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ پھر وہ احمد کو اس کا کردار سمجھانے لگا جو ایک قاتل کا تھا۔ وہ مجسم سماعت بن گیا۔

وہ ایک بہت ہی عجیب سا کردار تھا اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس قدر کفایت لفظی سے کام لیا تھا کہ اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ احمد نے ایک دفعہ اسے ٹوکتے ہوئے کچھ چیزوں کی وضاحت مانگی اور ایک مشورہ دیا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ اس نے اتنی کرختگی سے احمد کو جھاڑا کہ دوبارہ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ بس وہ اتنا سمجھ سکا کہ وہ کردار ہیروئن کو قتل کر دیتا ہے، اس کردار کو نبھانے کے لیے اسے ایک کمونو در کار تھا جو اسے خود مہیا کرنا تھا اور اس کا چہرہ پردے پر نہیں دکھایا جائے گا۔ اسے مایوسی تو ہوئی لیکن جو بھی مل رہا تھا، غنیمت تھا۔ کم از کم کریڈٹس میں اس کا نام تو شامل کیا جائے گا۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے ایک mimeographed ورق اس کے حوالے کیا اس پر اطالوی زبان میں واحد سطر رقم تھی۔

''منگل کے دن صبح دس بجے سیٹ پر پہنچ جانا۔''

''کیا ہم ریہرسل کریں گے؟''

اسے نفی میں جواب ملا تھا۔ ''اس ایک لائن کو بولنے کے لیے تمہیں ریہرسل کی ضرورت ہے؟''

''کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو ایسے ہی......'' وہ بوکھلاہٹ زدہ آواز میں بولا۔

''کیا مجھے فلم کا پورا اسکرپٹ مل جائے گا پڑھنے کے لیے۔ میں اپنے کردار کی اصل روح کو سمجھ کر اسے ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی صحت کے بارے میں مشکوک ہو گیا ہو۔

''تم پاگل تو نہیں ہو؟ ایک لمحے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

احمد کے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے اور جواب پانے کے لیے اسے کوئی اور راہ ڈھونڈنی تھی۔ وہ اکتایا ہوا شخص جو اپنے کام میں بالکل اناڑی لگتا تھا، اسے مزید برہم کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

اسے ہر حال میں فلم کا پورا اسکرپٹ پڑھنا تھا، جب تک اسے معلوم ہی نہ ہو کہ قاتل کا دوسرے کرداروں کے ساتھ کیا رشتہ تھا اور اس کے اعمال کے پیچھے کون سی ذہنی روش کار فرما تھی، وہ کیونکر ایک سطر کے اس مکالمے کو اس کے درست معانی کے ساتھ ادا کر پائے۔

وہ اپنا پہلا قدم مضبوطی سے جما کر رکھنا چاہتا تھا۔ منگل صرف دو دن کی دوری پر تھا اور اتنی تھوڑی مہلت میں اسے ڈھیروں کام کرنا تھے۔ اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دو گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ فلم کی کہانی ایک ناول سے لی گئی تھی۔ یہ پتہ چلانا کہ اسکرین پلے لکھتے وقت ناول کے متن کو کس حد تک تبدیل کیا گیا تھا، اس کے لیے ممکن نہ تھا مگر مکمل اندھیرے میں رہنے سے کئی گنا بہتر تھا کہ وہ اس ناول کا مطالعہ کر لے۔

ہالی وڈ بلیوارڈ پر pickwick بک اسٹور سے اسے temptation (ترغیب) نامی وہ ناول مل گیا تھا۔ وہ تیسرے درجے کا رومانی تھرلر تھا اور کہانی بے سروپا ہونے کے ساتھ ساتھ سستی جذباتیت سے اٹی پڑی تھی۔ احمد کو اس کے ادبی معیار سے سروکار نہ تھا، اس کا مطمع نظر تو محض اپنے کردار کی گتھی سلجھانا تھا۔ ''مے فلاور'' کافی شاپ میں بیٹھے بیٹھے اس نے وہ ناول پڑھ لیا تھا اور کہانی ذہن نشین کر لی تھی۔ پھر وہ ریمزے کے bistro کی جانب روانہ ہوا جہاں اینجلو janitor کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اطالوی اینجلو ایلون کا دوست تھا اور کبھی کبھار بار میں اسے ملنے کے لیے آ جایا کرتا تھا۔ احمد کی بھی اس سے رسمی جان پہچان تھی۔

اس نے اینجلو کو وہ mimeographed ورق دکھایا اور اسے وہ جملہ بولنے کو کہا۔ اینجلو کو سنجیدگی اپنانے پر مجبور کرنے کے لیے اسے قریباً دس منٹ صرف کرنا پڑے تھے۔

''اس طرح نہیں اینجلو! ایسا انداز مت اپناؤ جیسے تم کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہو۔ کاغذ کی طرف مت دیکھو۔ اسے بھول جاؤ۔ تمہارے لہجے میں استحقاق ہونا چاہیے۔ حق جتا کر بولو۔ جیسے تمہیں یقین ہو کہ جب تم اسے پارک میں ملاقات کے لیے کہو گے تو وہ ہر صورت وہاں پہنچے گی۔ محسوس کر کے بولو۔''

اینجلو کوڑھ مغز اور بدمذاق تھا۔ خاصی دیر اسے زچ کرنے کے بعد اس نے جملے کو نسبتاً بہتر انداز میں ادا کیا۔ احمد نے متعدد بار اس کے سامنے الفاظ کو دہرا کر اپنے اطالوی تلفظ کی درستی کا اطمینان کیا تھا۔

اس کی اگلی منزل استعمال شدہ ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ رات کی تاریکی گہری ہونے لگی تھی۔ جب اسے ایک فرسودہ کمونو کرائے پر دستیاب ہو سکا۔ پہلی نظر میں ہی احمد نے بھڑکدار رنگوں والے اس کمونو کو ناپسند کیا تھا۔ مگر اس پر سمجھوتے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس نے ناول میں بیان کردہ خاکے سے ملتا جلتا مکھوٹا بھی حاصل کیا اور آخر میں فلورسٹ کے پاس پہنچا۔

قاتل کو کون سا پھول ہیروئن کو دینا چاہیے تھا، ایسی صورت میں جب وہ مکھوٹے سے منہ ڈھاپ کر خود کو اس کا محبوب ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے انتخاب کے لیے پھولوں پر نظریں دوڑائیں۔ ہر پھول کی اپنی ایک زبان تھی۔ آئرس جو دیوتاؤں کا پیامبر تھا۔ بسنتی گلاب...... میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا، گلابی کارنیشن...... میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اس نے کاسنی gloxinia کو منتخب کیا۔ وہ پھول پہلی نظر میں محبت کی تجسیم تھا۔

اس نے چہار اطراف جلتے بجھتے روشنیوں کے جگنوؤں کو رات کی سیاہ پوشاک پر چمکتے ہوئے دیکھا اور ایک طویل سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کی۔

وہ آئندہ صبح ریہرسل کرنے کی تمام تیاری مکمل کر چکا تھا۔

بار کی طرف جاتے ہوئے اسے ایک بک اسٹور، جہاں پرانے 'play boy' فروخت ہوتے تھے، کی کانچ کی دیوار پر مارلن منرو کا نیوڈ پوسٹر چپکا ہوا دکھائی دیا اور اسے وہ خواب یاد آیا جس نے اسے ہالی وڈ آنے پر مجبور کیا تھا۔ شاید اس خواب کی تعبیر کا وقت شروع ہو چکا تھا۔



اگلے روز علی الصبح اس نے رائن کو جگا کر مطلع کیا کہ وہ اس کی کار لے کر جا رہا ہے۔ رائن نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسے خود کہیں جانا تھا لہٰذا اس نے احمد کو بس کے ذریعے سفر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجبوراً اسے البا کو ٹیلی فون کرنا پڑا۔ وہ اب تک سو رہی تھی لیکن احمد کی آواز سنتے ہی حسب توقع اس پر چھائی کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر اپارٹمنٹ کے دروازے پر آموجود ہوئی اور آتے ہوئے وہ اس کے لیے بیکن اور سنگترے کے رس کا ناشتہ بھی لیتی آئی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ رائن کی موجودگی میں آئی تھی۔ اس سے قبل رائن نے اس کا ذکر ضرور سنا تھا مگر ملاقات نہ ہو پائی تھی۔

''میں بیکن نہیں کھاتا۔'' احمد نے عجلت میں سنگترے کا رس پیتے ہوئے البا کو بتایا تھا۔

''مگر کیوں؟ یہ بہت خستہ بنے ہوئے ہیں۔''

''یہ پورک بیلی سے بنتے ہیں اور میں مسلم ہوں۔ میرے لیے پورک ممنوع ہے۔''

''مجھے معاف کر دینا مجھے معلوم نہیں تھا۔''

رائن نے مداخلت کی "تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں میں کھا لیتا ہوں، مجھے کسی قسم کے گوشت کی ممانعت نہیں ہے۔ ویسے میں نے تمہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔ مجھے تمہاری صورت بالکل بھی انجان نہیں لگ رہی۔"

"مجھے یقین ہے، میں تم سے پہلے کبھی نہیں ملی۔" البا نے قطعیت سے کہا تھا۔

"میری یادداشت تو بہت شاندار ہے۔ مجھے کبھی بھی دھوکہ نہیں دیتی۔ جانے کیوں مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں تمہیں کہاں دیکھ چکا ہوں۔" اس نے روئے سخن احمد کی جانب موڑا۔ "تمہاری دوست کی شکل مجھے مانوس لگ رہی ہے۔ یقین کرو یہ میرا وہم نہیں ہے۔"

احمد کو اس کی بات سننے کی فرصت ہوتی تو بھی وہ دھیان نہ دیتا، ان لمحات میں تو یوں بھی اس کے اعصاب پر اپنا کردار اور آنے والا منگل چھایا ہوا تھا۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے البا کے ہمراہ باہر نکل آیا تھا۔

مطلوبہ پارک کے سامنے پہنچ کر احمد نے اپنی ٹی شرٹ اور جینز کے اوپر کمونو پہنا اور رنگین چیپوں والا مکھوٹا چہرے پر لگا لیا۔ راستے میں وہ البا کو وہاں آنے کا مقصد مختصراً بتا چکا تھا اس لیے اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

"مجھے بارہ بجے لینے کے لیے آ جانا پھر ہم اکٹھے ہی دوپہر کا کھانا کھائیں گے لیکن اس وقت سے پہلے تم پارک میں نہیں گھسو گی کیونکہ تمہاری موجودگی سے میری توجہ بٹی رہے گی۔ مجھے مکمل یکسوئی چاہیے۔" پارک کے داخلی راستے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے ہدایت کی تھی۔

اندر آتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بہت جلدی آ گیا تھا۔ پارک تقریباً ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ روشوں پر بے مقصد ٹہلنے لگا۔ ہفتہ واری تعطیل اور خوش گوار موسم کی وجہ سے اسے امید تھی کہ جلد ہی لوگوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ سب سے پہلے دو بوڑھی عورتوں اور چار نوعمر لڑکوں کی آمد ہوئی جو شکل و شباہت سے ایک ہی خاندان کے افراد لگتے تھے۔ ان کے بعد درمیانی عمر کے دو مرد اور پھر ایک یورپی بوڑھا جو پرام دھکیلتا ہوا سبک قدموں سے چل رہا تھا۔

جس کی بھی اس پر نظر پڑی، وہ ایک لمحے کو ضرور ٹھٹکا۔ اس کا حلیہ یقیناً چونکا دینے والا اور بلاشبہ مضحکہ خیز تھا۔ لیکن احمد کو اس بات کی پروا ہی کب تھی۔ اسے کسی نوجوان دوشیزہ کے پارک میں آنے کا انتظار تھا تا کہ وہ ریہرسل کا آغاز کر سکے۔ گیارہ بجے تک بھی کوئی جوان لڑکی اسے نہیں مل سکی۔

گیارہ بج کر چالیس منٹ پر چار خواتین کا گروہ اس کے پاس سے گزرا۔ وہ سب پختہ عمر کی عورتیں تھیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی 'Temptation' کی میٹلڈا کی طرح خوب صورت اور نوخیز نہیں تھی۔ گیارہ بج کر پچپن منٹ پر جب وہ اگلے دن دوبارہ پارک میں آنے کا تہیہ کر کے وہاں سے جانے لگا تو اسے ارغوانی پھولوں کے تختے سے خم کھا کر نکلتی روش پر پگ پگ چلتی وہ لڑکی دکھائی دی تھی۔ اس کی پشت احمد کی جانب تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ میٹلڈا جیسی حسین تھی یا نہیں لیکن اس کے مل جانے سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس کا دن رائیگاں جانے سے محفوظ ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے پلیٹ فارم جوتوں کو رانوں کی طاقت کے ساتھ پتھریلی روش سے ٹکراتے ہوئے دھمک اٹھانے والی چال اختیار کی اور لڑکی کے نزدیک پہنچ کر اسے پکارا۔

"cara!"

وہ ایک خوبصورت اور کھوئی ہوئی سی لڑکی تھی جو چہرے مہرے سے جنوبی ایشیائی لگتی تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب ہو گیا اور ہاتھ میں تھاما ہوا کاسنی پھول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"cara mia! vieni al parco di domani."

چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد لڑکی نے پھول لے لیا تھا۔ احمد کو یقین تھا کہ وہ جملے کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ پھول اسے دینے کے بعد وہ رکے بغیر آرائشی پودوں کی قطار کی جانب قدم اٹھانے لگا تھا۔ پیچھے دیکھے بنا بھی اسے احساس تھا کہ لڑکی اسی مقام پر رک کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

پیر کے دن وہ بس کے ذریعے اسی پارک میں آیا اور وہ دن نکلنے کے بعد آیا تھا۔ الباس کے ارادے سے باخبر تھی۔ وہ دو بجے اسے واپس لے جانے کے لیے آنے والی تھی۔

اس روز صورت حال گزشتہ دن سے یکسر برعکس تھی۔ دوپہر ہونے تک اس نے کموتو میں موجود پانچوں پھول وہی مخصوص جملہ بولتے ہوئے مختلف لڑکیوں کو دیے تھے۔ ایک پیلے چہرے والی بے زار لڑکی نے اسے گالی بھی دی تھی لیکن اس نے کوئی احتجاج کیے بنا اگلی لڑکی کی تلاش شروع کر دی تھی۔

جب وہ اپنی مشق سے مطمئن ہونے کے بعد خاموشی سے کھڑا البا کی آمد کا انتظار کر رہا تھا تو پاکستان سے آئی ہوئی پرنیاں آئزک نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اسی سے ملنے پارک میں آئی تھی۔ احمد حیران رہ گیا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ ماضی میں ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔ پھر پرنیاں کی باتوں سے اسے معلوم ہوا کہ گزشتہ دن جس لڑکی کو اس نے gloxinia کا پھول تھمایا تھا، وہ پرنیاں ہی تھی۔ اسے یہ اتفاق خوب لگا تھا۔ پیڑوں کے سبز سائے میں نرم گھاس پر بیٹھ کر اس نے پرنیاں کے ساتھ بہت ساری باتیں کی تھیں۔

احمد نے کئی حسین لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں مگر پرنیاں میں کوئی ایسی خاصیت تھی جو ان سب لڑکیوں میں عنقا تھی۔ وہ ہاتھی دانت سے ترشے ہوئے بت کی طرح بے داغ اور دلکش تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گل گندم کی پتیوں کے رنگ کی تھیں۔ جب آنکھوں کی سطح پر تیرتی نمی دھوپ کے عکس سے چمکتی تو گمان ہوتا گویا نیلگوں سنگریزے اتھلے پانی میں ڈوبے ہوں۔ ہنسنے کی خاطر مرطوب ہونٹوں کو کھولتی تو نارنگی کی پھانک سادہانہ وا ہو جاتا۔ ماتھا چندر ماں، ابرو محراب دار، گردن راج ہنسنی سی، ہاتھ کنول روپی، ہر ادا کے سنگ وہ نیا بہروپ بھرتی، کسی دم برفانی صبح ایسی سپید، کبھی شہد آشام کے شگوفوں جیسی، تو کبھی پگھلا ہوا سونا۔ احمد نے کسی ایک جسم کو اتنے رنگ بدلتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن خوبروئی کے ساتھ جو تفاخر ملزوم ہوتا ہے، وہ پرنیاں میں ناپید تھا۔ وہ جیسے اپنے حسن سے کلی طور پر بے خبر تھی۔



وہ سادگی اور دھیمے پن سے کلام کرتی تھی۔ اس کی باتوں میں پیچیدگی تھی اور نہ آواز میں بناوٹ۔ وہ سمندر کے ان چھوٹے پانیوں کے مثل تھی جہاں سے کسی جہاں راں کا گزر نہ ہوا تھا۔

اس کی معیت میں وقت بیتنے کا احساس تک نہ ہوا، پھر البا نے آ کر جلدی مچا دی، رخصت ہوتے سمے اسے پرنیاں کا ٹیلی فون نمبر اور پتا معلوم کرنا یاد نہ رہا۔ بعد میں وہ اس غفلت پر بہت پچھتایا تھا۔ اگر اس کا ذہن آنے والے کل میں الجھا ہوا نہ ہوتا تو وہ کبھی یہ بات فراموش نہ کرتا۔ غنیمت تھا کہ باتوں باتوں میں اس نے پرنیاں کی ہتھیلی پر قلم سے اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیا تھا۔ وہ پرامید تھا کہ پرنیاں اس سے رابطہ ضرور کرے گی۔

پیر کی تمام رات اس نے جاگتے ہوئے، کروٹیں بدل کر اور بے چینی کے لذت بھرے احساس کے ساتھ گزاری۔ صبح بستر سے اٹھ کر طبیعت کے بوجھل پن کو زائل کرنے کی خاطر اس نے بلیک کافی پی اور رائن سے کار لے جانے کی اجازت مانگی۔

''ٹھیک ہے لے جاؤ'' اس نے جماہی لے کر بانہیں پھیلائیں۔

''لیکن مجھے کتنا وقت لگے گا، کوئی اندازہ نہیں ہے، چھ سے آٹھ گھنٹے بھی صرف ہو سکتے ہیں، تم تو اچھی طرح سمجھتے ہو۔''

رائن جانے کس سوچ میں گم تھا۔ خلاف عادت اس نے کچھ بھی کہے بنا محض سر ہلا کر کروٹ بدل لی۔

ساؤنڈ اسٹیج نمبر پانچ پر پہنچ کر اسے کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے بقول اسے اپنا مکالمہ ہیلووین پارٹی کے موقع پر ادا کرنا تھا اور سیٹ اس وقت ہیلووین پارٹی کے لیے سجے ہوئے ایک ڈرائنگ روم کا منظر ہی پیش کر رہا تھا۔ مگر کچھ لوگ تیزی سے اس منظر کو بگاڑنے میں مصروف تھے۔ بڑی موم بتیاں، Jack o Lanterns آرائشی جھالریں، ہیبت ناک مکھوٹے، سب چیزیں سرعت سے سمیٹی جا رہی تھیں اور اس ڈرائنگ روم کو اسپتال کے ایک کمرے میں ڈھالنے کی تیاریاں تھیں۔

کیا اسے آنے میں تاخیر ہو گئی تھی؟ گھڑی کی سوئیوں نے تردید کر دی۔ ابھی دس بجنے میں پچیس منٹ باقی تھے۔ وہ بے یقینی سے سیٹ کی ہیئت کو بدلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے ایک لائٹنگ ٹیکنیشن کے ساتھ بگڑے تیوروں سے بات کرتا ہوا ملا تھا۔ اسے متوجہ کرنے کی خاطر احمد کو کافی تردد کرنا پڑا۔

''میں ایڈم گرانٹ ہوں۔''

''تو؟'' اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نہ تھی۔

''تم نے مجھے دس بجے آنے کے لیے کہا تھا...... قاتل کے کردار کے لیے۔''

وہ ذرا سا چونکا، یقیناً اسے یاد آ گیا تھا۔ لیکن جواب دینے کے بجائے وہ دوبارہ ٹیکنیشن سے الجھنے لگا۔

''کیا شیڈول تبدیل ہو گیا ہے؟'' اس نے کسی آس کے تحت پوچھا۔

''میں مصروف ہوں، پریشان مت کرو۔'' اسے دیکھے بغیر وہ بولا۔

''اگر شیڈول میں کوئی ردوبدل ہوا ہے تو مجھے مطلع کرنا تمہاری ذمہ داری تھی۔'' اس نے حتی المقدور لہجے کو مہذب رکھنے کی

سعی کی۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر جسم کا بوجھ ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کرتے ہوئے اس کی جانب مڑا۔ ''میری ذمہ داریوں کے متعلق مجھے مت بتاؤ۔ میں نے ایڈی کو بتا دیا تھا۔''

احمد کو خیال آیا کہ ان کے ٹیلی فون کا تار ایک مقام پر خاصا مخدوش تھا اور اکثر اس کے یا رائن کے پیروں میں الجھ کر ٹوٹ جاتا تھا۔ شاید رات کو بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ایڈی بلیک ول نے اسے اطلاع دینے کی ناکام کوشش کی ہوگی۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرے اپارٹمنٹ کا ٹیلی فون خراب ہے...... تو اب میں دوبارہ کب آؤں؟''

''اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔''

اس کا دل ڈوب کر ابھرا اور گلا سوکھنے لگا۔

''لیکن میں اس کردار کے لیے موزوں ہوں۔ میں نے اپنے طور پر بہت مشق کی ہے۔''

''ہم نے معمولی سی تبدیلی کا فیصلہ کیا ہے۔ قاتل کا کردار کہانی سے نکال دیا گیا ہے۔'' وہ پھر سے ٹیکنیشن پر برسنے لگا۔

احمد کا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔

✠ ✠ ✠

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہی اسے شبہ ہوا کہ وہ کسی غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ سب سے پہلے اسے جس شے کی عدم موجودگی کا احساس ہوا، وہ رائن کا بیڈ تھا۔ پھر اس نے ٹیلی ویژن سیٹ کو بھی غائب پایا۔ داغ دار میز جس کی درازیں اٹکتی تھیں، جھولنے والی کرسی، کالا چرمی کاؤچ، ہرے لیمپ شیڈ والا لیمپ جسے وہ رات کو سوتے وقت جلاتے تھے۔ وارڈ روب کے پہلو میں لگی فریم شدہ سیاہ و سفید تصویر، جس میں رائن کاؤبوائے آؤٹ فٹ میں ہائی اسکول کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ griffin (آدھا شیر، آدھا ہما) کے دیوہیکل مجسمے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ سب معدوم ہو چکا تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ بجز ٹیلی فون اور عقبی کھڑکی سے ذرا ہٹ کر بچھے ہوئے احمد کے میٹرس کے۔ وہ وارڈ روب کے پٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ رائن کے تمام کپڑے سمیت اسکے درجن بھر موزوں کے اب وہاں نہیں تھے۔ لیکن اس کے اپنے کپڑے موجود تھے۔ باتھ روم کا بھی یہ ہی احوال تھا۔ رائن کی تمام اشیاء وہاں سے ہٹائی جا چکی تھیں۔ شاید رائن کو اچانک کہیں جانا پڑا تھا، لیکن اسے تمام سامان ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ اس کے نام کوئی پیغام بھی چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ ایسی کیا آفت آن پڑی تھی۔ اس کے اسٹوڈیوز جانے اور وہاں سے واپس آنے میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہی تو لگے تھے۔

وہ خود سے الجھتا ہوا زیریں منزل پر آیا اور لینڈ لیڈی اوما کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی۔ اندر آنے کی دعوت پر اس نے اوما سے معذرت کی اور اپنا مدعا بیان کیا۔

''رائن نے کہا تھا کہ وہ Seattle جا رہا ہے۔ تم سے ناراض ہے، اس لیے تمہیں بتا کر نہیں جا رہا۔''

''اور کچھ؟'' اس نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔ رائن سدرلینڈ جیسے شخص کی طرف سے یہ عمل کچھ ایسا انوکھا نہ تھا۔

''اس کے ساتھ ایک بارہ، تیرہ سال کی بچی بھی تھی۔ کہتا تھا اس کی بھتیجی ہے اور ہائی اسکول میں پڑھتی ہے۔ وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ اس نے بڑی عمر کی عورتوں کی طرح میک اپ کر رکھا تھا، تم جانتے ہو اسے؟''

اسے رائن کی شناسا سب سے کم عمر hooker جوڈی کا خیال آیا، لیکن اس نے اوما کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ ''مجھے بھی رائن نے کبھی نہیں ملوایا تھا۔ ٹھیک ہے تم آرام کرو۔'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں مڑنے لگا تو اوما نے روک دیا۔

''اب تو تم اکیلے ہی رہو گے تو...... پچھلے چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا ہے۔ میں ابھی تقاضہ نہ کرتی، مگر کیا کروں، اخراجات

بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ میرا بڑا بیٹا اب کالج میں داخلہ لینے والا ہے۔ چھوٹے دونوں بھی سینئر ہائی اسکول......''
اس نے اوما کی بات کاٹ دی۔ ''میں تو ہر ماہ باقاعدگی سے رائن کو کرایے کی رقم دیتا رہا ہوں۔''
''اس نے مجھ سے چھپایا نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ اسی بات پر تم دونوں کے بیچ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ رقم اس نے تم سے پوچھے بنا اپنی ضروریات پر استعمال کر لی تھی۔ وہ ایسا ہی لاپروا ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں پہنچ کر تمہارا قرض لوٹا دے گا۔ اگر اسے جلدی جانے کی اس قدر مجبوری نہ ہوتی تو میں کرایے کی رقم کا تصفیہ کیے بغیر اسے کبھی جانے نہ دیتی۔ اس کی ماں کو ہڈیوں کا کینسر ہے اور اس بے چاری کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہیں۔''

احمد کو علم تھا کہ رائن کی ماں کچھ سال قبل Hells Kitchen میں اسی فارم ہاؤس میں مری تھی، جہاں اس کے دونوں بڑے بھائی کام کرتے تھے اور اس کی ہلاکت کی وجہ نمونیا تھا، لیکن رائن سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ اوما کچھ دیر کے لیے اندر غائب ہوئی اور ایک نارنجی Persimmon (لیس دار گودے والا ترش و شیریں پھل) لا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اب تک منہ کھولے وہیں کھڑا تھا۔

''یہ تمہارے لیے، میں تمہیں رائن کی نسبت زیادہ پسند کرتی ہوں۔ تم میں احساس ذمہ داری ہے، تو میں امید رکھوں کہ تم جلد ہی کرایہ ادا کر دو گے۔''

وہ خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ اس سے ایک معمہ حل نہیں ہو پا رہا تھا۔ اگر رائن کسی دوسری ریاست میں مستقل رہائش کے ارادے سے گیا تھا تو وہ اپنی کار اس کے پاس کیوں چھوڑ گیا تھا۔ کچھ خیال آنے پر وہ تیز قدموں سے اپارٹمنٹ میں واپس آیا اور باتھ روم میں گھس کر لکڑی کی کیبنٹ کھولی۔ کیبنٹ کے پتلے چوبی تختے میں دیمک لگنے سے ایک دراڑ پڑ گئی تھی، جس کے راستے کیبنٹ کے تختے اور دیوار کے درمیانی خلا میں باآسانی دو انگلیاں داخل کی جا سکتی تھیں۔ اس شگاف میں انگلیاں ڈال کر اندر رکھی ہوئی پولی تھین کی تھیلی باہر کھینچنے سے پہلے ہی احمد کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسے کیا پیش آنے والا تھا۔ جس تھیلی میں وہ پچھلے اٹھارہ ماہ سے رقم جمع کر رہا تھا، جسے گزرے ہوئے اتوار کو اس نے دانت برش کرنے کے دوران یہیں کھڑے ہو کر گنا تھا تو اس کی مالیت چھ سو ستاون ڈالر تھی اور جو اس نے سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کے لیے چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر اکٹھی کی تھی، وہ اپنی کاہلی کی وجہ سے اس رقم کو بینک میں رکھوانے کے بجائے اس تاریک سوراخ میں رکھتا رہا تھا۔ اس وقت پولی تھین کی اسی تھیلی میں ایک رقعے کے سوا کچھ نہ تھا۔
اس نے کانپتے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ تھام کر دھندلی آنکھوں سے اسے پڑھنے کی کوشش کی۔
''مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ مجھے سچی محبت ہو گئی ہے۔ میں اپنی جوڈی فوسٹر کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات کرنے میکسیکن بارڈر کے پار جا رہا ہوں۔ وہاں قوانین اتنے سخت نہیں ہیں۔ کیلی فورنیا میں جوڈی سے شادی کرنے کے لیے مجھے کم از کم پانچ، چھ سال اور انتظار کرنا پڑتا۔ محبت کا ایک ایک پل قیمتی ہوتا ہے۔ اسے واہیات قوانین کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ میں اپنی Swinger تمہارے ہاتھ بیچ رہا ہوں۔ تمہیں اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ تم میرے بہت ہی عزیز دوست ہو، مجھے تمہارے مسائل کا پورا احساس ہے۔ میں میکسیکو جا کر وہاں سے تمہیں اپنی اور جوڈی کی خیریت سے آگاہ کروں گا۔ نیچے جوڈی میری منتظر ہے۔ آج اس نے میکسی پہن رکھی ہے اور کیا قیامت ڈھا رہی ہے، بیان سے باہر ہے۔''
تمہاری کامیابیوں کے لیے ہمیشہ دعا گو۔
تمہارا روم میٹ آر۔ سدرلینڈ۔
احمد کو ہتھیلی اور انگلیوں میں چپچپاہٹ کا احساس ہوا تو اس نے چونک کر اپنا ہاتھ دیکھا۔ مٹھی میں دبے Persimmon کی نارنجی کھال پھٹ گئی تھی اور چیپ دار گودا رسنے لگا تھا۔

✠ ✠ ✠

''اس نے ہمیشہ میرے ساتھ برا کیا۔ میں برداشت کرتا رہا، شاید اس لیے کہ برداشت کرنے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا یا شاید اس لیے کہ میں اسے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ قریباً سات سال ہو گئے، ہمیں اکٹھے رہتے ہوئے۔ اتنا عرصہ بہت ہوتا ہے ایک چھت کے نیچے رہنے والے دو انسانوں میں ہمدردی اور انسیت کا تعلق قائم کرنے کے لیے، پر وہ انسان تھا ہی کب filthy pig ناپاک سور۔''

احمد کے پاؤں البا کی گود میں دھرے تھے اور صوفے کے ہتھے پر سے گردن ڈھلکائے وہ پچھلی دیوار کو نیچے سے اوپر کی سمت گھور رہا تھا۔ خاصی دیر سے سر لٹکانے کے باعث اس کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی در آئی تھی۔ البا اس کے پیروں کی انگلیوں کو نرمی سے سہلا رہی تھی۔ وہ کل سے البا کی طرف ہی تھا۔

''وہ شروع سے ہی میرا استحصال کرتا آ رہا تھا۔ میں نے کیوں اسے اجازت دی۔ سب میری غلطی ہے۔ مجھے لوگوں کی پہچان نہیں ہے۔ میں ہر کسی پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ میں الو کا پٹھا ہوں۔ اس کی کار...... جواب میری کار ہے۔'' وہ تمسخر سے ہنسا۔ ''لوہے کا ناکارہ پنجر ہے۔ سال میں چھ مہینے تو ورک شاپ میں رہتی ہے۔ اس کا میں کیا کروں۔ جانے کب سے مجھے دھوکہ دینے کا منصوبہ اس کے شاطر دماغ میں چل رہا تھا۔ اس وقت وہ ہنس رہا ہوگا مجھ پر اور میں یہاں اپنی بے بسی کا رونا رو رہا ہوں۔ لعنت ہے میری بے چارگی پر۔ بلز کی ادائیگی میں کہاں سے کروں۔ چھ ماہ کے کرایے کے لیے رقم کہاں سے لاؤں۔ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ میں کوئی اچھا سریع الاثر زہر خرید کر کھا سکوں۔ مجھے بار کی ملازمت سے نفرت ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے، مجھے زندگی سے نفرت ہے۔''

البا کی انگلیاں اس کے پنجوں کے درمیانی خلا میں آہستگی سے حرکت کر رہی تھیں۔ ''کاش میں تمہیں کچھ رقم دے سکتی، لیکن میں نے......''

احمد نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تمہیں سنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔''

''اجنبیوں جیسی بات مت کرو۔ تم مجھے چوٹ پہنچا رہے ہو۔ میرا جو کچھ ہے سب تمہارا ہے۔ دراصل میں نے وانس میں ایک اپارٹمنٹ خریدا ہے اور جتنی بھی رقم میرے پاس جمع تھی وہ ڈاؤن پے منٹ میں چلی گئی۔ چھوٹا سا اپارٹمنٹ ہے دو کمروں کا۔ اسے خریدنے کی متحمل نہیں تھی میں، لیکن تم سے مل کر اپنے گھر کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں اس میں منتقل ہو جائیں گے تو مسائل کچھ کم ہو جائیں گے۔''

صوفیہ نیند سے جاگ کر رونے لگی تھی۔ احمد نے اس کے cot کی جانب دیکھنے کی کوشش کی تھی، مگر اس زاویے سے پچھلی دیوار، اس کے ایک گوشے میں نصب باتھ روم کا دروازہ اور چھت کے کچھ حصے کے سوا باقی کمرہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

''میں اس میں کیوں رہوں؟ وہ تمہارا اپارٹمنٹ ہے، تمہارا اور صوفیہ کا۔''

''تم اس میں نہیں آؤ گے تو وہ اپارٹمنٹ ہوگا۔ تمہارے آنے سے وہ گھر بن جائے گا۔'' اس نے پیروں کے انگوٹھوں پر البا کے بالوں کا لمس محسوس کیا۔

''میں نے گھر خریدا ہے، اپارٹمنٹ نہیں۔ میرے رہنے کے لیے تو یہ کمرہ ہی کافی ہے۔''

''وانس میں کیوں لیا؟''

''اور جگہوں پر بھی کوشش کی تھی، پر وہ پہنچ سے باہر تھیں۔ وہ اتنی بھی بری جگہ نہیں ہے جتنی میڈیا نے بنا دی ہے۔''

واٹس میں سیاہ فام آبادی کی اکثریت تھی اور جرائم کی شرح اس قدر زیادہ تھی کہ اس علاقے کا نام سنتے ہی یغما گری، قتل، عصمت دری جیسی سنگین وارداتیں ذہن میں لہرانے لگی تھیں۔ میڈیا میں واٹس کو ایک مثالی حیثیت حاصل تھی، لیکن لاس اینجلس کے بیشتر neighborhoods کے مقابلے میں یہاں رہائش اور ضروریات زندگی کی قیمت خاصی کم تھی۔

صوفیہ کے رونے میں شدت آ رہی تھی۔ وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کر کے چلا رہی تھی۔

''شاید اسے بھوک لگی ہے۔ اتنی بری طرح کیوں رو رہی ہے؟ دیکھو اسے۔''

''اس کے رونے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔ اس کا جب جی چاہے رونے لگتی ہے۔ تم پریشان مت ہو، وہ ٹھیک ہے، تمہارا دل نہیں مانتا تو میں ایلون کو فون کر کے تمہاری طرف سے معذرت کر لیتی ہوں۔ آج رات تم بار مت جاؤ۔ میں تمہارے لیے خود کھانا پکاؤں گی، جو بھی تمہیں پسند ہو۔''

اس نے البا کے سرد ہونٹوں کو اپنے تلوؤں پر سے سرکتے ہوئے پایا۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ لیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ البا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے، تم میری زندگی میں پیش آنے والا واحد اچھا واقعہ ہو۔ میں تمہیں کبھی کھونا نہیں چاہتی۔''

صوفیہ کی باریک کانوں میں گھستی ہوئی چیخیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی کے قریب پڑے cot کی طرف دیکھا، جہاں ایک میلے کپڑے پر لیٹی صوفیہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بنائے انہیں اپنے گالوں سے ٹکراتے ہوئے منہ کی طرف لے جانے میں کوشاں تھی۔ اس کا رنگ غیر معمولی حد تک سرخ ہو رہا تھا اور ہونٹ کسی قدر نیلگوں لگتے تھے۔

''مجھے معلوم نہیں تھا اتنے چھوٹے بچے بھی آنسوؤں کے ساتھ رو سکتے ہیں۔ مجھے تو صوفیہ بیمار نظر آتی ہے۔ وہ کتنی تیزی سے سانس لے رہی ہے۔''

البا نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''تمہارے مسائل کا ایک فوری حل ہے، تمہیں لورکا سے ملوا دوں تو وہ یقیناً تمہیں پسند کرے گا۔ وہ ان دنوں ہالی ووڈ آیا ہوا ہے۔ ہم کل ہی اس سے ملنے چلیں گے۔''

''لورکا کون ہے؟''

''وہ فوٹو گرافر ہے۔ ایک میگزین کے لیے کام کرتا ہے۔ وہ اپنے ماڈلز کو اچھا معاوضہ دیتا ہے۔ تم کہو تو میں ابھی ٹیلی فون پر اس سے ملاقات کا وقت طے کر لیتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

احمد کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

✠ ✠ ✠

لورکا کو دیکھ کر احمد کو لگا کہ وہ چہرہ کسی عورت کے شانوں پر ہونا چاہیے تھا۔ اس کی دو ٹھوڑیاں تھیں اور کنپٹیاں اندر کو دبی ہوئی تھیں۔ ناشپاتی کی مانند ماتھے سے گالوں کی سمت چہرہ پھیلتا چلا جاتا تھا۔

ان کا استقبال کرتے ہوئے اٹھ کر اس نے البا کے دونوں گال چومے اور گلے سے لگایا۔ احمد کو بھی وہ اسی طریقے سے ملا تھا۔

''میری پیاری ہیلنا! کتنے دنوں بعد تم نے شکل دکھائی۔ میں تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔'' البا کو ہیلنا کہنے پر احمد نے الجھن زدہ نظروں سے ان دونوں کو باری باری دیکھا تھا۔

''یہ میرا اسکرین کا نام ہے۔'' البا نے وضاحت کی۔

''کیا پیو گے؟ تمہاری پسند تو مجھے معلوم ہے۔ تمہارے دوست کے لیے کیا منگواؤں؟'' اس کی ٹھوڑی تلے اضافی گوشت بیل کے گلتھے کی مانند لٹکا تھا اور بات کرتے ہوئے وہ جھولنے لگتا تھا۔

پہلے تو احمد نے رسماً انکار کیا، لیکن پھر لورکا کے اصرار پر مارٹینی کا آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کے گلاس سامنے آ گئے تو وہ مشروب کے گھونٹ لیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ لورکا کی چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسلسل احمد پر جمی تھیں۔

''تم نے صحیح کہا تھا۔ تمہارا دوست بہت خوب صورت ہے ہیلنا۔ میرا تجربہ مجھے بتا رہا ہے کہ میں اس آدمی سے مل رہا ہوں جو مستقبل قریب میں میرا پسندیدہ ماڈل بننے والا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیمرہ بھی مجھ سے متفق ہے یا نہیں۔''

احمد کو ایک بوجھ اپنے کندھوں سے ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ لورکا سے ملاقات سے قبل وہ اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے اپنے فوٹو جینک ہونے کے متعلق کوئی شک نہیں تھا۔ بس یہ فکر لاحق تھی کہ اس کا چہرہ لورکا کی مانگ سے مطابقت رکھتا ہو۔

''ہیلنا نے جب سے فلموں میں کام شروع کیا ہے، اپنے لورکا کو تو بھول ہی گئی ہے۔ مانتا ہوں، ہم اتنا معاوضہ نہیں دیتے جتنا فلموں میں ملتا ہے۔ مگر اپنے پرانے دوستوں کو فراموش کرنا شریف لوگوں کا شیوہ نہیں۔''

''تمہیں تو علم ہے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب تم بلاؤ گے تو میں ضرور آؤں گی۔'' البا نے اس کے لجلجے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت بے وقوف ہو تم۔ اپنے ساتھ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ وہ تمہاری بیٹی کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

احمد مارٹینی کا آخری گھونٹ پی کر بولا۔ ''تمہارے میگزین کا نام کیا ہے؟ اب تک مجھے پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔''

خالی گلاس اس کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے لورکا نے اسے میگزین کا نام بتا دیا تھا۔ اسے وہ نام نامانوس اور ایک فیشن میگزین کے لیے ناموزوں لگا تھا۔

''لاس اینجلس سے شائع ہونے والے سب ہی چھوٹے بڑے فیشن میگزین میں نے دیکھ رکھے ہیں۔ تمہارا میگزین کبھی نظر سے نہیں گزرا اور معذرت کے ساتھ یہ نام کچھ عجیب نوعیت کا نہیں ہے۔'' وہ اپنی رائے کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکا۔

''فیشن میگزین۔'' لورکا ہنسا اور بیل کا گلتھا پوری شدت سے ہلنے لگا۔ ''ہاں یہ بھی فیشن کی ایک قسم ہے، پورنو میگزین کا نام ووگ، وینٹی فیئر وغیرہ ہونے سے تو رہا۔''

احمد کو آنتوں میں گرہیں بندھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''پورنو میگزین؟'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''میری کوئین آف پورن ہیلنا نے تمہیں بتایا نہیں؟''

احمد نے البا کی سمت حیرت بھری نگاہ اٹھائی۔ وہ swizzle اسٹک کا سرا دانتوں سے چباتے ہوئے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ حیرانی کی جگہ قہر نے لے لی۔

''مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے ملنے کبھی نہ آتا۔ میں کسی پورنوگرافک میگزین کے لیے ہرگز ماڈلنگ نہیں کروں گا۔''

''کیوں نہیں کرو گے؟'' ''کس بات پر اعتراض ہے تمہیں؟''

''کسی کاسٹنگ ڈائریکٹر کے علم میں یہ بات آ گئی تو مجھے black ball کر دیا جائے گا میں اس موضوع پر بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہوا تو لورکا اور البا بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئے۔ ''اب تک تم کتنی فلموں میں اداکاری کے جوہر

دکھا چکے ہو۔"

لورکا کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔شاید البا نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

"black ball ہونے کے لیے کسی جماعت کا حصہ ہونا ضروری ہے۔جب تم ان میں شامل ہی نہیں ہو تو وہ تمہیں الگ کیسے کریں گے۔تمہارے پاس کچھ سال ہی باقی ہیں، پھر تمہارا جسم تمہیں نفع پہنچانے کے قابل نہیں رہے گا۔جب تک کوئی جائیداد پاس ہو اس کی سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔سوچ کر مجھے بتانا۔"لورکا نے ایک کارڈ اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا تو وہ ایک جھٹکے سے دور ہٹ گیا۔لورکا نے البا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور اس کی گردن کے جھولتے ہوئے گوشت میں کریہہ جنبش پیدا ہوئی۔

احمد ان دونوں کو چھوڑ کر تیزی سے باہر آ گیا تھا۔

تمام راستے میں البا اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتی رہی اور وہ شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے خاموش بیٹھا رہا۔

"مجھے میرے اپارٹمنٹ پر اتار دو۔"بالآخر اس کے لبوں سے مختصر جملہ برآمد ہوا۔

"میں تو تمہاری مدد کرنا چاہ رہی تھی۔تم اتنے ناراض ہو گئے ہو کہ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے۔تمہیں لورکا کے لیے کام نہیں کرنا تو کوئی بات نہیں۔تمہیں کوئی مجبور تو نہیں کر رہا۔"

"تم ایک پورن آرٹسٹ ہو اور تم نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم ایسا نیچ کام کر سکتی ہو۔"

"کوئی بھی کام نیچ یا اعلا نہیں ہوتا۔اس کے لیے ملنے والا معاوضہ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔میں نے بھی بہت جدوجہد کی، مرکزی دھارے میں ملنے کی، مگر وہ نئے آنے والوں کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، تم سے بہتر کون سمجھتا ہے۔یہ اتنی بھی بری چیز نہیں ہے۔لوگ مصوروں کیلیے نیوڈ پوز کرتے ہیں۔کلبوں میں strippers ناچتے ہیں۔اسے تو کوئی بھی پورنوگرافی نہیں کہتا۔اگر وہ آرٹ ہے تو یہ بھی آرٹ ہے۔لورکا صرف چند اسٹلز کے دو سو ڈالر دے رہا ہے۔زیادہ سے زیادہ دو دن کا کام ہے۔Van Nuys میں اس کا اسٹوڈیو ہے۔mileage اور وہاں قیام کا خرچ بھی وہ دے گا۔یہ کوئی برا سودا نہیں ہے۔تم کچھ دیر تنہائی میں غور تو کرو۔میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔میں کبھی تمہارا برا چاہ سکتی ہوں؟ اپنے دل سے پوچھو۔"البا نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔احمد نے حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"پورن اسٹار ہیلنا! آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔تم قابل نفرت ہو۔اس دن پر خدا کی لعنت ہو، جب میری ملاقات تم سے ہوئی تھی۔پورن اسٹار...... پورن اسٹار، مجھے تم سے نفرت ہے۔"

کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اس کی جیب سے لورکا کا کارڈ نکل کر فرش پر گرا تھا۔اس نے جھک کر کارڈ اٹھایا، مٹھی میں بھینچ کر مسلا اور کچرے کی ٹوکری میں اچھال دیا۔وہ کار البا کے اپارٹمنٹ پر ہی چھوڑ آیا تھا۔وہاں سے لورکا سے ملنے کے لیے وہ دونوں البا کی کار میں گئے تھے۔بس کے ذریعے بار جانے کے ارادے سے وہ نیچے آیا تو البا اب تک وہیں ان کے انتظار میں موجود تھی۔اسے کار میں بیٹھنے پر آمادہ کرنے کی خاطر البا کچھ دور تک اس کے قریب آہستہ رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی منت سماجت کرتی رہی، مگر اس کے مسلسل دھتکارنے اور انتہائی سخت الفاظ میں انکار کے بعد البا نے اس کا تعاقب ترک کر دیا تھا۔

وہ کئی بلاک بنا کچھ سوچے سمجھے پیدل چلتا رہا اور جب اس کا گزر ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے سامنے سے ہوا تو تھکن سے شل ہوتی ٹانگوں سے عاجز آ کر اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو بار کا پتا بتایا اور پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ٹیکسی میں سفر کرنا بس کی نسبت خاصا مہنگا تھا، مگر پینی پینی بچانے سے کیا حاصل تھا۔

بار میں عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ بھیڑ تھی۔ وہ بے دلی سے معمول کی کارروائی سے گزرنے لگا۔ کاک ٹیلز، بیئر اور وائن کے گلاس بار سے میزوں کی طرف، وہاں سے واپس بار تک، ایلون کے سامنے دھری گلاسوں کی نئی کھیپ لے کر پھر سے میزوں تک، گاہکوں کی عجلت بھری فرمائشیں، بے ہنگم چیخیں، بھونڈی ہنسی، بیہودہ مذاق، بہکی ہوئی باتیں، آنکھوں میں گھستی ہوئی تیز روشنی، الکوحل کی گندھ، کندھوں پر رکھا بھاری پتھر سا سر...... بے زاری، کوفت، تھکن، وہ ان سب سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ دل کسی ایسی جگہ چھپ کر بیٹھنے پر مائل تھا جہاں کوئی آواز، کوئی روشنی اور کوئی بو اسے چھو نہ پائے۔ ایلون نے اس کی بے توجہی اور سست روی پر شاید چوتھی یا پانچویں دفعہ اسے ٹوکا تھا کہ وہ پھٹ پڑا۔

''میرے بس میں جو ہے، وہ میں کر رہا ہوں۔ سرخ وائن مانگنے والے کو سفید وائن دینا کوئی سنگین جرم نہیں ہے۔ میں انسان ہوں اور مجھ سے بھول ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ چند ڈالر دے کر تم نے مجھے خرید نہیں لیا ہے۔ آئندہ میرے ساتھ اس لہجے میں بات کرنے کی جرأت نہ کرنا۔''

ایلون نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ ٹرے اٹھا کر احمد کو دیتے ہوئے اس نے کونے والی میز کی سمت اشارہ کیا اور ان دو لڑکیوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو مسلسل پین کلر، پین کلر (رم والا ایک کاک ٹیل) کی گردان کرتے ہوئے شور مچا رہی تھیں۔

ایک ایک پل گزارنا اس کے لیے دشوار تھا۔ بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور گھڑی کی سوئیاں تھیں کہ ایک ہی نقطے پر جمی تھرتھرائے جاتی تھیں۔ بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے کہ بار کے قریب اسٹول پر بیٹھا ہوا نوجوان اپنا گلاس پھینک کر نیچے لڑھک گیا اور پہلو کے بل لیٹتے ہوئے مکروہ آواز کے ساتھ قے کرنے لگا۔ احمد اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ ایلون نے اسے فرش صاف کرنے کو کہا۔ اس نے سر ہلایا۔ لڑکے کے نزدیک جا کر ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھاما، وہ زمین پر ہتھیلیاں جما کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، دوسرے ہاتھ سے اس کا سر پکڑ کر احمد نے ایک جھٹکے سے نیچے جھکایا اور اس کا چہرہ فرش پر رگڑ ڈالا۔ نہ جانے کس ذہنی رو میں اس سے یہ عمل سرزد ہوا تھا۔ اس کے بعد ایلون کو اس کی نوکری کے خاتمے کا اعلان زبان سے کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

وہ چپ چاپ وہاں سے نکل آیا تھا۔ اپارٹمنٹ میں واپس پہنچ کر اس نے کوئی بھی دوسرا کام کرنے سے قبل ڈسٹ بن کو فرش پر الٹایا، کچرے میں سے وہ مڑا تڑا کارڈ تلاش کیا، انگلیوں سے دبا کر اس کی شکنیں نکالتے ہوئے ٹیلی فون سیٹ قریب کھسکایا اور نمبر ملانے لگا۔ تھوڑی دیر گھنٹی بجنے کے بعد ایک مرد کی غنودہ آواز، جس میں نسوانیت والی بندش تھی، دوسرے سرے پر سنائی دی۔

''لورکا بول رہا ہوں۔''



Van Nuys میں سہ روزہ قیام کے دوران البا اور صوفیہ بھی اس کے ہمراہ تھیں۔ وکٹری بلیورڈ پر ایک سابقہ ویئر ہاؤس اور موجودہ اسٹوڈیو میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد جب وہ واپس ہالی ووڈ آیا تو شوبز کا اولین قدم اٹھنے کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ قدم شوبز نے اس کے جسم پر رکھا تھا اور ویسا ہی نشان چھوڑا تھا جیسا فلمی ستارے Grauman's چائنیز تھیٹر کے سیمنٹ فور کورٹ میں چھوڑتے تھے۔ کبھی نہ مٹنے والے نقش۔ وہ اس کریڈٹ کو بھلے اپنے پورٹ فولیو کے پہلے ورق پر درج نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کی جیب میں جو دو سو ڈالر تھے انہیں خرچ کرنے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ تھی۔

وہ میٹرس پر چت لیٹا چھت کو ساکت پلکوں کے ساتھ گھور رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ وہ نظروں کا زاویہ تبدیل کیے بنا اسی طرح بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اگر کسی کو اندر آنا ہوا تو وہ خود ہی آ جائے گا۔ قدموں کی چاپ سے وہ پہچان گیا تھا کہ آنے والی البا تھی۔ وہ کسی بھی شناسا چہرے پر نظر ڈالنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔

''تم کیسے بیماروں کی طرح لیٹے ہو؟''

''میں بیمار ہوں۔''

''نہیں...... تمہیں کچھ نہیں ہوا، تم بالکل ٹھیک ہو۔''

''میرے پاس تمہیں یقین دلانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

''جو کر لیا ہے، اس پر پچھتا کر خود کو اذیت مت دو۔ اگر تمہیں یہ پریشانی ہے کہ mainstream سینما سے متعلق کوئی شخص اس میگزین میں تمہیں پہچان لے گا تو یہ فکر بے بنیاد ہے۔ اس میگزین کی اشاعت بہت ہی محدود ہے۔ ہو سکتا Van Nuys سے باہر اس کا ایک بھی ایشو فروخت......''

''مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مجھے کبھی کوئی نہیں پہچانے گا۔ تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

''میں نے Bugsy malone کے دو ٹکٹ خریدے تھے۔ بہت عرصہ ہو گیا، ہمیں اکٹھے پکچر دیکھے ہوئے۔ بہت اچھی کاسٹ ہے۔ تم اٹھ جاؤ بستر سے۔''

''میں نے کہا نا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ کیا یہ اتنی مشکل خواہش ہے جو تم پوری نہیں کر سکتیں۔ میں کل تمہیں ملنے آؤں گا، لیکن اس وقت تم چلی جاؤ۔''

کچھ دیر البا کی طرف سے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ لجاجت سے بولی۔ ''میں ٹکٹ یہیں چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ اگر تمہارا ارادہ بدل جائے تو مجھے فون کر دینا۔ خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا۔ میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔''

اس کے لوٹتے قدموں کی آہٹ پا کر احمد نے پلکوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور اسے پکارا۔

''تمہارے پاس...... ماری جوانا ہو گا؟ مجھے بس ایک جوائنٹ چاہیے۔ بار، بار استعمال سے اس کی عادت تو نہیں پڑتی؟''

البا نے رک کر نفی میں سر ہلایا اور شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگی۔ باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ایک گہرا کش لیا اور کڑوے دھوئیں کو چند سیکنڈ سینے میں روک کر رکھا۔ اس کے گلے اور پھیپھڑوں میں کاٹ دار جلن پیدا ہوئی۔ اسے لگا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ ایک اور کش کھینچ کر اس نے دھواں نتھنوں سے خارج کیا اور ٹیلی فون کے خاموش ہو جانے پر اطمینان محسوس کیا۔ یہ سکوت وقتی ثابت ہوا۔ کچھ وقفے سے گھنٹی کی آواز پھر سے خاموشی کو تاراج کرنے لگی تھی۔ اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے جوائنٹ کو بجھا کر آئینے تلے پھیلے ہوئے چھجے پر رکھا اور باہر آ کر ریسیور اٹھا لیا۔

ایک لمحہ لگا تھا دوسری طرف سے آتی آواز کو شناخت کرنے میں۔ اسے بالکل خبر نہ تھی کسی کی آواز اسے اتنی خوشی پہنچانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس پر چھائی مایوسی ایسے اڑ گئی جیسے ہوا کی مدھم ٹھوکر سے زرگل بکھر جاتا ہے۔

''مجھے پہچانا؟ تم اور میں پارک میں ملے تھے۔''

وہ پرنیان آئزک تھی۔ احمد کا دل ایسے ڈھب سے کبھی نہیں دھڑکا تھا۔

''مجھے سوچنے دو۔ آواز سے تو تم جوان اور خوب صورت لگتی ہو۔''

''تم نے میری ہتھیلی پر اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیا تھا۔ تمہاری دوست بھی وہیں تھی، وہ سرخ بالوں والی ہسپانوی لڑکی۔''

''یہ کب کی بات ہے؟ مجھے یاد نہیں آ رہا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔

بات کرتے ہوئے اس کا پیر تار کے گچھے میں اٹکا اور ٹیلی فون مردہ ہو گیا۔ اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھ کر سرعت سے تار کی مرمت کرنے لگا۔ اب اسے اپنے طرزِ کلام پر تشویش ہو رہی تھی۔ پرنیاں نے اس کے روّیے کو اجتناب پر محمول کرتے ہوئے دوبارہ رابطہ نہ کیا تو؟ یہ سوچ اس کے اندر کڑواہٹ کیوں گھول رہی تھی۔ پھر اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ وہ ٹیلی فون سے منسلک

آنسرنگ مشین پر پیغامات چیک کرنے لگا اور وہ سب پرنیاں آئزک کی جانب سے موصول ہوئے تھے۔ ڈائل گھماتے ہوئے اس نے میٹرس کے آخری سرے پر پڑے ہوئے ٹکٹوں کو دیکھا تھا۔ وہ Bugsy Malone کو دیکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

✠ ✠ ✠

رائن جس خاموشی سے گیا تھا، اسی طرح ایک روز لوٹ کر آ گیا۔ احمد کھلے ہوئے دروازے سے یہ سوچ کر اندر آیا تھا کہ شاید البا آئی ہوئی تھی۔

اس نے رائن کو کاؤبوائے آؤٹ فٹ والی بلیک اینڈ وائٹ تصویر وارڈ روب کے ساتھ دیوار پر سابقہ جگہ ٹانگتے ہوئے دیکھا۔ اپنا تمام سامان وہ پہلے والی ترتیب میں رکھ چکا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے گردن گھماتے ہوئے پیچھے دیکھا اور اسٹول سے نیچے اتر آیا۔

''تمہاری نئی زندگی کی شروعات میں یہ بوسیدہ اپارٹمنٹ کہاں سے آ گیا؟ ابھی تو وہ شروعات بھی شروع ہی ہوئی ہیں۔ اپنی محبت کے قیمتی پل تم یہاں کیوں ضائع کر رہے ہو؟'' احمد نے زہر خند لہجے میں کہا۔ رائن نے بھنوؤں پر گرے ہوئے مکئی کے بھٹے والے ملائم ریشوں کو سر کی جنبش سے ذرا سا ہٹایا اور آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گیا۔

''اس نے مجھے دھوکہ دیا۔ جان بوجھ کر اس نے مجھے میکسیکو جانے پر اکسایا۔ وہاں Ciudad Juárez میں اس کا Latino بوائے فرینڈ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میری ساری رقم لے کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس لڑکے کو غیر قانونی immigrant ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے یہاں سے ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ جوڈی نے اسی کے مشورے پر مجھے بے وقوف بنانے کا منصوبہ بنایا۔ ورنہ وہ خود تو ایسی شاطر نہ تھی۔ تیرہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ایسی چالاکیاں اسے وہ جرائم پیشہ اجڈ میکسیکن سکھاتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہے گی۔ اس کا سچا پیار میں ہوں اور یہ اس کا دل اسے بتائے گا۔ وہ مجھے کبھی بھول نہیں پائے گی۔''

اس کے ٹوکنے پر بھی رائن نے اپنی کہانی جاری رکھی تھی۔

''اب میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم میرے لیے کچھ نہیں کرو گے۔ اب میری باری ہے، تمہارے واسطے کچھ کرنے کی۔ تم نے سالومن موریل کا نام سنا ہے؟''

یہ سوال بے معنی تھا۔ امریکن فلم انڈسٹری سے ذرا بھی واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص سالومن موریل کے نام سے انجان نہیں تھا۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ بڑا آدمی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وہ ہالی ووڈ کا شہنشاہ ہے۔ اس کی کسی فلم میں کام کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کیا مطلب؟'' احمد نے تعجب سے پوچھا۔

''اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر میرا دوست ہے۔ مجھے اس نے ایکسٹرا کے طور پر رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور میں نے اسے راضی کر لیا ہے کہ میرے کچھ دوستوں کو بھی کام دے۔ اسے بہت سارے بیک گراؤنڈ پرفارمرز درکار ہیں۔ تم اپنے آپ کو سالومن کی فلم کا حصہ سمجھو۔ اور وہ تمہاری دوست پامپلونا کی البا وہ بھی کام کی تلاش میں تھی۔ وہ ابھی فارغ ہے تو اسے بھی بلا لو۔ میں کل تم دونوں کو

لے جاؤں گا۔ یونیورسل میں شوٹنگ ہو گی۔"

احمد نے اسے فوراً اپارٹمنٹ سے نکالنے کا فیصلہ کچھ وقت کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔



سالومن موریل کا خاندان بیس کی دہائی میں پولینڈ سے لاس اینجلس منتقل ہوا تھا۔ وہ نسلاً یہودی تھا اور اس کا شمار ہالی ووڈ کے بانیوں میں ہوتا تھا۔ لکھاری، ہدایت کار، پیش کار، ان سب ہی حیثیتوں میں وہ خود کو منوا چکا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک اکادمی کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی کئی فلمیں کلاسیکی شاہکاروں میں گنی جاتی تھیں۔ جس بھی ادارے کے نصاب میں فلم کا مضمون شامل تھا، وہاں سالومن کی فلمیں ضرور دکھائی جاتی تھیں۔ ظاہری شخصیت کے حوالے سے وہ بالکل بے ضرر اور غیر اہم نظر آنے والا آدمی تھا۔ اس کا قد بمشکل پانچ فٹ تھا۔ بال سفید موم جیسے، بجھے ہوئے نیلے رنگ کی آنکھیں، کنپٹیوں کے قریب نیلگوں رگوں کا جال اور ڈھلکے ہوئے گلابی ہونٹ۔ جب پہلی بار احمد نے سالومن کو دیکھا تو اسے ایسٹر کیک پر بنا ہوا بھیڑ کا بچہ یاد آ گیا۔ اس چھوٹے اور معصوم آدمی سے جن کا واسطہ پڑتا تھا وہ جلد ہی واقف ہو جاتے کہ سالومن گربہ مسکین تھا۔ بظاہر معصوم اور باطن میں گرگ باراں دیدہ۔ یوں تو اس کی ذات سے منسوب بہت سی چھوٹی بڑی کہانیاں فلمی حلقوں میں گردش کرتی تھیں، جیسا کہ سب ہی مشاہیر کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ مگر ایک لفظ جو سالومن کے نام کے ساتھ بکثرت استعمال ہوتا تھا، وہ تھا کاملیت پسند۔ مرکزی خیال کی بنت سے لے کر مارکیٹنگ تک وہ فلم کے تمام تخلیقی مراحل کو اپنی نگرانی میں مکمل کرواتا، کوئی سین خواہ وہ کتنی ہی معمولی نوعیت کا کیوں نہ ہو، سالومن ذاتی شمولیت کے بنا اسے فلم بند کرنے پر راضی نہ ہوتا۔ اسے مطمئن کرنا ہمیشہ کاسٹ اور کریو کے لیے کڑی آزمائش ثابت ہوتا تھا۔ یہ ہی بے چینی اور عدم اطمینان سالومن کی کامیابی کے پیچھے کارفرما قوتیں تھیں۔ اس کی سرکردگی میں کام کرنا شوبز کی صفوں میں باعث افتخار گردانا جاتا تھا۔

ان تینوں کو ایک کاک ٹیل پارٹی کے طویل سین کے لیے ایکسٹرا لیا گیا تھا۔ البا کاک ٹیل ویٹرس تھی، رائن دربان جبکہ احمد کو ایک پیانو کے سامنے بیٹھنا تھا۔ پانچ دن کے لیے انہیں اسی سیٹ پر آٹھ گھنٹے روزانہ کی شفٹ میں کام کرنا تھا اور کچھ مناظر فلم کے سیکنڈ یونٹ کے ساتھ کسی دوسری جگہ پر فلم بند کیے جانے تھے۔

جب رائن کے دوست اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر نے انہیں سائن کر لیا تو سالومن نے خود ان سب سے ملاقات کی تھی۔

احمد نے تمام وقت اسے ہونٹوں کو زبان سے گیلا کرتے اور ننھے ہاتھوں کو کھولتے بند کرتے ہوئے پایا۔ وہ کسی ایسے شخص کی طرح گھبرایا ہوا لگتا تھا جس میں اعتماد کا فقدان ہو۔ اس سے بات کرنے کی شدید خواہش احمد کے دل میں مچلتی تھی۔ اس نے اخباروں میں سالومن کے متعلق اتنا کچھ پڑھ رکھا تھا کہ اسے روبرو پا کر وہ سب باتیں گمان باطل لگنے لگی تھیں۔ وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر تھا۔ اس کی حیثیت ایسی ادنیٰ تھی کہ اسے اپنی مرضی سے کسی کو مخاطب کرنے کے حقوق حاصل نہ تھے۔

جب کیمرے roll کر رہے ہوتے تو ساؤنڈ اسٹیج پر یا اس کے آس پاس بولنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ جب کبھی وقفہ ہوتا یا ان لوگوں کی سیٹ پر ضرورت نہ ہوتی تو انہیں ساؤنڈ اسٹیج سے محفوظ فاصلے پر ہولڈنگ اسپیس میں بھجوا دیا جاتا، بلا ضرورت کوئی بھی آپس میں بات کرنے کا مجاز نہ تھا اور ایکسٹراز تو ضرورت کے وقت بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھے۔ انہیں خود سے کسی ایکٹر یا کریو کے کسی فرد سے بات چیت شروع کرنے کی اجازت نہ تھی۔

سیٹ پر پہلا دن بغیر کسی ہنگامے کے تمام ہوا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا خود ترسی میں مبتلا رہا۔ وہ بہت سے عظیم لوگوں کے بیچ ان کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی ان سے کوئی تعلق جوڑنے سے محروم تھا۔ اس کی حیثیت بھی سیٹ پر موجود props اور طویل آبنوسی میز پر سجے برتنوں جیسی تھی۔ ان سب اشیا کی طرح منظر میں اس کی ضرورت تو تھی، مگر انفرادی اہمیت کچھ نہ تھی۔

دوسرے دن چائے کے وقفے کے دوران اسٹوڈیو commissary میں اس نے سالومن کو دیکھا تھا۔ گزشتہ روز اس نے چائے اور لنچ اپنی گرل فرینڈ سمون فاکس مین، جو ایک منجھی ہوئی اداکارہ تھی، کے پرائیویٹ trailer میں منگوایا تھا۔ سمون بھی اس فلم میں ایک اہم کردار نبھا رہی تھی۔

وہ احمد سے صرف چند قدم کی دوری پر موجود تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ سالومن کے پاس جا کر کچھ کہے۔ کچھ بھی، بھلے وہ اتنا معمولی فقرہ ہی کیوں نہ ہو کہ ''مسٹر موریل نان یونین ایکسٹراز کو رجسٹرڈ ایکسٹراز کے مقابلے میں بہت کم مراعات حاصل ہیں۔ کیا تم مجھ سے متفق ہو۔'' وہ کسی حیلے سے اس Polish ہدایت کار سے ہم کلام ہونا چاہتا تھا۔ اپنی تڑپ اور جنون کی تپش کو اس تک پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ سالومن کا رد یہ مثبت ہی ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ خفا ہو کر وہ اسے اپنی فلم میں ایکسٹرا بھی نہ رہنے دے۔ اس کی طرح اور بھی بہت سے مبتدی سالومن کا التفات پانے کو ترستے ہوں گے۔ کیا وہ سب کا خیر مقدم کرتا ہوگا؟ یہ تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن فاصلہ دو فٹ سے بھی کم تھا۔ اس کے پاؤں اسے اکسا رہے تھے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں کھویا تھا کہ رائن طباق میں دو bagels اور کافی کے مگ دھرے آ گیا۔

''مجھے یاد آ گیا ہے۔'' bagel کو دانتوں سے کترتے ہوئے وہ حسب عادت اونچی آواز میں بولا۔ ''میں ہمیشہ کہتا ہوں، میری یادداشت خوب ہے، مجھے کوئی بات بھول ہی نہیں سکتی۔'' اسے کچھ بتانے کی بہت جلدی تھی۔ ''تمہاری البا مارسیلو کوئی سنو وائٹ (بے قصور) نہیں ہے۔ مجھے یاد آ گیا ہے، میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔''

اس کی آواز اور بھی بلند ہو گئی۔

تھیٹر میں ایک پورنو flick میں۔ وہ پورن آرٹسٹ ہے۔ تمہیں کوئی اندازہ ہے؟ فلم میں اس کے بال سرخ نہیں تھے۔ یہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اسی لیے تو وہ میں مخمصے میں پڑ گیا تھا۔'' اس نے کافی کی سطح پر تیرتی کریم کی پھین میں انگلی ڈبو کر اسے چوما اور فاتحانہ نظروں سے احمد کو دیکھنے لگا۔ اپنی دانست میں اس نے دھا کہ کیا تھا۔ احمد نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ pussy cat'' اس کے لیے یہ خبر انکشاف نہ رہی تھی۔ لیکن رائن کے جوش و خروش نے آس پاس موجود بہت سے لوگوں کو متاثر کیا تھا اور سب ہی خاموش ہو کر ان دونوں کو گھورنے لگے تھے۔ احمد نے کسی کو بھی دیکھنے سے احتراز برتتے ہوئے bagel اٹھایا اور اسے منہ کے پاس لایا۔ جبڑے کھولتے ہوئے اس کی نظر بلا ارادہ سالومن کی طرف اٹھی تھی۔ وہ ادھر ہی متوجہ تھا۔ اس کی پتلی سرخ زبان بے چینی سے ہونٹوں کو تر کر رہی تھی اور بجھی ہوئی راکھ سی آنکھوں میں دھواں بل کھاتا تھا۔

اس واقعے کے بعد ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں البا کو فارغ کر دیا گیا۔ سالومن نے سب کی موجودگی میں بوکھلائے ہوئے انداز مگر واشگاف الفاظ میں اسے نکالنے کی وجہ بیان کی تھی اور انہیں ہائر کرنے والے اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر کو اس امر کے یقینی بنانے کی ہدایت کی تھی کہ آئندہ البا اس کی کسی بھی فلم میں کسی بھی حیثیت سے کام نہ کر سکے۔

''پورنوگرافی اور اس سے جڑے ہوئے لوگ لائق نفرین ہیں اور وہ ہیں۔'' گھٹنا ہدایت کار کسی موزوں لفظ کی تلاش میں اٹکا۔ ''وہ ہیں...... رستے ہوئے ناسور، کوئی گروہ انہیں کلاکار مانتا ہے، تو میں، ان سے متفق نہیں ہوں، میری رائے مختلف ہے۔''

اس کے الفاظ زہر میں بجھی سوئیاں بن کر احمد کے وجود میں گڑ گئے۔ اپنا چہرہ دیکھے بغیر بھی اسے احساس تھا کہ وہ بے رنگ ہو چکا تھا۔ آستین سے اس نے ماتھے پر چمکتا ہوا پسینہ پونچھا تھا۔

البا کا ردعمل بڑا سرسری تھا۔ ''مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ رائن کی بے احتیاطی نے مجھے کچھ گھنٹوں کے لیے تم سے دور کر دیا ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے سالومن کے ہاتھوں ہونے والی ہتک کا ذکر تک نہ کیا تھا۔

وہ اس سیٹ پر رائن کا بھی آخری دن تھا۔ اس رات وہ احمد کے ساتھ گاڑی میں جانے کی بجائے اکیلا ہی اسٹوڈیوز سے

روانہ ہوا تھا۔ پوری رات وہ اپارٹمنٹ میں نہیں آیا۔ احمد نے خاص توجہ نہ دی۔ اس کا خیال تھا کہ رائن کسی دوست کے ساتھ تفریح کرنے کہیں گیا ہوگا۔ یوں بھی وہ احمد کو اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں بتانے کا پابند نہیں تھا۔ اگلے روز وہ سیٹ پر بھی نہیں آیا تو اس کی جگہ ایک اور ایکسٹرا کو بھرتی کر لیا گیا۔ تب احمد کے لیے اس کی گمشدگی سے لاتعلق رہنا مشکل ہو گیا۔ رائن جیسا حقیر آدمی اتنی بڑی پروڈکشن کے ساتھ ایسی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، تو پھر وہ کہاں تھا؟

یہ عقدہ جلد ہی کھل گیا۔ شام کو اپارٹمنٹ میں واپس آنے پر مقامی اسپتال کی طرف سے ایک پیغام احمد کا منتظر تھا۔ وہ اور البا اسپتال پہنچے تو پٹیوں میں لپٹے لہو سے نچڑے چہرے والے رائن نے انہیں دیکھ کر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''وہ ایک hit and run (حادثہ کر کے جائے وقوعہ سے بھاگ جانا) تھا۔ cops کہہ رہے تھے کہ مجھے ٹکر مارنے والی گاڑی کی نمبر پلیٹ پڑھی نہیں جا سکی۔ یا شاید وہ نمبر پلیٹ کے بغیر تھی۔ ایک گواہ کے مطابق ڈرائیور کوئی عورت ہو سکتی ہے۔ اس گواہ کی دور کی نظر کمزور ہے۔ وہ گاڑی کا صحیح رنگ اور میک بھی نہیں بتا سکتا کہتا ہے کسی گہرے رنگ کی کار تھی۔''

''کیا تمہیں کچھ نظر نہیں آیا؟'' احمد نے پوچھا تھا۔

''ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میری آنکھوں میں پڑی۔ بس ایک لمحے بعد گاڑی نے مجھے اٹھا کر پھینک دیا۔''

''وہ عورت ہی ہوگی۔'' البا نے کہا۔ ''عورتیں جلدی بدحواس ہو جاتی ہیں، کل مجھ سے ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔''

احمد بولا۔ ''تم جا کہاں رہے تھے؟ میں نے تم سے پوچھا بھی تھا، لیکن تم جلدی میں تھے۔''

''میں بھی یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا ہوں۔ اسٹوڈیوز کے گیٹ پر مجھے ایک بچے نے آ کر رقعہ دیا جو کسی ماگدا نامی لڑکی کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ وہ مجھے paramount اسٹوڈیوز میں مل چکی ہے اور تب سے مجھے پسند کرتی ہے۔ اس نے جگہ اور وقت لکھ کر مجھے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے کچھ ماہ پہلے پیراماؤنٹ میں کام کیا ہے، لیکن مجھے ماگدا نام کی کسی لڑکی سے ملاقات یاد نہیں ہے۔ پھر بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں چلا گیا۔ میں نے وہ رقعہ cops کے حوالے کر دیا ہے۔''

''حیرت ہے۔ یہ تو کسی سازش جیسا ہے، ماگدا شاید رشین نام ہے۔''

''ہاں یہ ماگدلین کا مخفف ہے۔ ایک عام روسی نام ہے۔'' البا نے احمد کی تائید کی تھی۔

رائن کی ہنسلی ٹوٹ گئی تھی۔ گھٹنے اور دونوں ہاتھوں میں فریکچر تھے۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہروں پر چوٹ آئی تھی۔ تین سے چار ماہ اسپتال میں گزارنا اس کا مقدر بن چکا تھا۔

اسپتال سے لوٹتے ہوئے وہ دونوں رائن کے بارے میں بات کر رہے تھے تو البا بولی۔

''اس کی حالت افسوسناک ہے، پر میں اسے معاف نہیں کر سکتی۔ وہ اچھا انسان نہیں ہے، اس نے پہلے تمہیں دھوکہ دیا اور پھر مجھے تمہاری نظر سے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے تم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تم مجھے گھٹیا جاننے لگو۔ کاش زخمی ہونے کے بجائے وہ مر گیا ہوتا۔ میرے اور تمہارے بیچ جو بھی آئے، اُسے تباہ ہو جانا چاہیے۔''

اسے البا کی بات بڑی عجیب لگی تھی۔ جو عورت رائن سے اس درجہ خار کھائے بیٹھی تھی، پرنیاں کے لیے اس کے جذبات کیا ہوں گے۔ یہ اندازہ کرنا بالکل آسان تھا۔ مگر وہ اس معاملے میں خود کو حق پر سمجھتا تھا۔ اس نے پرنیاں کے بارے میں اپنے محسوسات البا سے چھپائے نہیں تھے۔ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا اور وہ اندھی نہیں تھی، البتہ اس کی آنکھوں پر پٹی تھی، جسے باندھنے والا خود البا کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

✠ ✠ ✠

اس نے کامیابی کے افق کو چھوا تو اپنی کسی اداکارانہ صلاحیت کی بنا پر نہیں، مگر ایک بدحواس لڑکے، ایک ٹوٹے ہوئے بوسیدہ آئینے اور ایک فیک پینٹنگ کی وجہ سے۔

سیٹ جو کسی عالی شان مینشن کے ڈائننگ ہال کی طرح مرتب کیا گیا تھا، کے ایک گوشے میں ملمع دار چوکھٹے والا پرانا سا آئینہ ٹنگا تھا۔ باقی سب قیمتی دکھائی دینے والی اشیا کے مقابل وہ آئینہ بھدا اور بے محل نظر آتا تھا۔ سیٹ پر اس کا چوتھا دن تھا کہ ایک ایکسٹرا جو اسی روز آیا تھا اور جس کا کام آئینے کے سامنے کھڑے رہ کر اسے گھورتے رہنا تھا، وہ سیکنڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ہدایت پر الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے پھسل کر آئینے سے ٹکرایا اور ہاتھوں سے اسے تھام کر سنبھلنے کی جدوجہد کرتے ہوئے آئینہ نیچے گرا دیا۔

احمد کی اس جانب پشت تھی اور سیکنڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوئس کی غصہ بھری آواز نے اسے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔

سالومن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس مقام تک گیا اور ٹوٹے ہوئے آئینے کو دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔

''اس نے ہمارا Macguffin توڑ دیا۔''

اگر لوئس ہونق شکل بنا کر اسے نہ دیکھتا تو شاید سالومن کو پتا ہی نہ چلتا کہ وہ Macguffin کے بارے میں لاعلم تھا۔

''لوئس! تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

''میں اسے بدلوا دیتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں بالکل اسی جیسا دوسرا مل جائے۔'' لوئس نے ہکلا کر کہا۔

''نہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں۔ Macguffin کیا ہوتا ہے۔ میں نے آئینے کو اس نام سے کیوں پکارا ہے۔ اس کا مطلب سمجھاؤ مجھے۔'' لوئس خاموشی سے کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔

''اتنی عام سی بات تمہیں نہیں معلوم؟ یہ باعث حیرانی ہے۔'' احمد سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ اسٹول سے اٹھ کر اس نے سالومن کو متوجہ کیا۔

''Macguffin پلاٹ کا ایک عنصر ہوتا ہے، جو ناظر کی دلچسپی کو اپنی طرف کھینچے رکھتا ہے۔ کہانی کے بڑے کردار Macguffin کو پانے کے لیے کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور ضروری نہیں کہ Macguffin کوئی اہم شے ہی ہو۔ وہ کوئی معمولی اور غیر واضح چیز بھی ہو سکتا ہے اور کہانی کے آخر تک عموماً Macguffin اپنی افادیت کھو دیتا ہے۔ بعض اوقات اختتام پر ناظرین کو اس کے متعلق یاد تک نہیں رہتا۔ مثلاً جاسوسوں کی کہانیوں میں ہمیشہ دستاویزات کا حصول مطمع نظر ہوتا ہے یا پھر خفیہ حکومتی منصوبوں کا پردہ چاک کرنا، کوئی مجسمہ، بریف کیس، نیکلس، کوئی راستہ یا محض دولت کی تمنا، کچھ بھی Macguffin ہو سکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس اصطلاح اور تکنیک کو شہرہ دلانے کے پیچھے الفرڈ ہچکاک کا ہاتھ ہے۔''

لوئس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ طیش سے مغلوب آواز میں اس نے احمد کو ٹوکا تھا۔ ''سیٹ پر ایک اصول رائج ہے کہ جب تک کسی ایکسٹرا کو مخاطب نہ کیا جائے وہ خود سے گفتگو شروع نہیں کرے گا۔ تمہیں پہلی اور آخری بار خبردار کر رہا ہوں۔ اس اصول کی خلاف ورزی ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔''

سالومن کچھ کہے بنا سر جھکائے ہوئے مڑ کر چل دیا اور اس کے قریب سے گزرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''تمہاری وضاحت جامع نہیں تھی، لیکن تمہارا انداز قائل کرنے والا تھا۔''

✠ ✠ ✠

سالومن کے ساتھ اس کا آخری دن تھا اور اسے یونیورسل اسٹوڈیوز کے ایک ساؤنڈ اسٹیج پر تعمیر کردہ اس شان دار سیٹ کو چھوڑ کر جانے کے خیال سے افسوس ہو رہا تھا۔

اس کے سامنے ایک خوب صورت گرھنت کا پیانو دھرا تھا، جس کا سیاہ خول اور اجلی زرد کنجیاں یکساں چمکتی تھیں۔ پیانو کے اوپر دیوار پر فرانسسکو گویا کی مشہور پینٹنگ Saturn devouring his son کی نقل آویزاں تھی۔ اس روغنی تصویر میں دیوتا Saturn کو ایک انسانی جسم کو پھاڑ کھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ رومن دیومالا کے مطابق دیوتا Saturn نے اس خوف سے کہ اس کے بیٹے جوان ہونے پر اس کی سلطنت چھین لیں گے، ان کی پیدائش پر انہیں کھا لیا تھا۔ بے سر کے دھڑ سے بہتے لال لہو اور Saturn کی پھٹی ہوئی آنکھوں کی غیر معمولی سفیدی کے سوا باقی تصویر دھوئیں اور راکھ کے ماتمی رنگوں پر مبنی تھی۔ Saturn کی مٹھیاں گوشت کی بے جان لوتھ میں حیوانی طاقت سے گڑی تھیں اور اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں، خون آلود دریدہ دہن سے دیوانگی مترشح تھی، وہ تصویر نہایت وحشت انگیز تھی۔ اسے کچھ دیر غور سے دیکھتے رہنے پر دل میں کراہیت امڈنے لگتی تھی۔ احمد کی مجبوری یہ تھی کہ اس کا انداز نشست کچھ اس طریق پر تھا کہ پیانو اور اس تصویر کو دیکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب پیانو کی چمکدار سیاہ خمیدہ جلد اور زرد کنجیوں پر مسلسل نگاہیں جمائے رکھنے سے اس کی آنکھیں دکھنے لگتیں تو خود بخود ہی Goya کی پینٹنگ پر اس کی نظریں رینگنے لگتیں۔ اس منظر کی صوری ہولناکی کے علاوہ بھی کچھ تھا جو احمد کو الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ ابراہیم کی بیماری کے دنوں میں اسے باقاعدگی سے بک شاپ جانا پڑتا تھا اور برف باری کے دنوں میں جب وہ کتابوں کے ساتھ بالکل تنہا ہوتا تھا تو مطالعہ کر کے وقت بتاتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس کی دلچسپی بالخصوص فنون لطیفہ پر لکھی گئی کتب میں تھی اور اس نے Saturn devouring his son کے بارے میں بھی کہیں پڑھ رکھا تھا۔ کوئی بات اس تصاویر کے حوالے سے اس کے ذہن میں اٹکی تھی لیکن باوجود کوشش کے وہ شعوری سطح پر نہ آتی تھی۔ وہ اسی بات کو سوچ رہا تھا کہ لنچ کا وقفہ ہو گیا۔

سالومن اور سمون ایک باڈی گارڈ۔ جو سیٹ پر ہمیشہ سمون کے آس پاس نظر آتا تھا، کے ساتھ سمون کے پرائیویٹ trailer کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ commissary کی طرف جانے کے بجائے وہیں ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگا۔

سمون قیامت خیز حسن کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پیدائشی اداکارہ بھی تھی، فلمی نقاد ابتدا ہی سے اس کے کام کو سراہتے آرہے تھے۔ اس کی شخصیت میں وہ فسوں پایا جاتا تھا جسے کیرزما (سحر انگیز) کہا جاتا ہے۔ وہ پردے پر عام سا جملہ کہتی تو ناظر کے تخیل میں کئی معانی منعکس ہوتے۔ وہ آنکھوں اور اعضاء سے باتیں کرنے پر قادر تھی۔ اس معاملے میں بھی سالومن نے کمالیت پسندوالی خصوصیت کو پورا کیا تھا۔ سمون اس کے پہلو میں چلنے کی صحیح حقدار تھی۔ ان کے trailer میں داخل ہونے سے چند ثانیے قبل احمد کو وہ بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے ان کے عقب میں پہنچا تو باڈی گارڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید آگے آنے سے روک دیا۔

''مسٹر موریل! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ نہایت اہم ہے۔'' احمد نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

ایسٹر کیک کے بھیڑ کے بچے جیسے چہرے والا ناٹا یہودی اور محشر ادا سمون بیک وقت پلٹے۔

''میری بات کا تعلق پیانو کے اوپر لگی ہوئی پینٹنگ سے ہے۔''

سالومن نے ہونٹ چباتے ہوئے گارڈ کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

''کہو...... تم وہی ہو Macguffin والے؟'' سالومن نے سمون کی اجلی پیشانی پر بنتی ناگواری کی شکنوں کو نظر انداز کیا۔

''میں ایکسٹرا ہوں۔ لہٰذا مجھے فلم کے اسکرپٹ تک رسائی حاصل نہیں لیکن پانچ دن اس سیٹ پر گزارنے سے مجھے اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارا Protagonist (ہیرو) امیرزادہ ہر معاملے میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود سے جڑی کسی بھی شے میں قباحت یا سقم برداشت نہیں کرتا۔ وہ نقاشی اور فن موسیقی کا دلدادہ ہے۔ ان موضوعات پر اس کی معلومات بے بہا ہیں۔''

''براہ مہربانی تم اس تقریر کو مختصر بناؤ۔ ہم لوگ تھکے ہوئے ہیں۔'' سمون نے بے زاری سے کہا۔

احمد اس آخری دن کا وہ آخری موقعہ گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سمون کی اکتاہٹ کو کیا کرتا۔ ''ایک ایسا شخص جو کاملیت پسند ہے۔ بالکل تمہاری طرح وہ ایک فیک پینٹنگ کو اپنے مینشن کے سب سے اہم کمرے میں، جہاں وہ احباب کی ضیافت کا اہتمام کرتا ہے، کیونکر آویزاں کرے گا۔''

سالومن متواتر ہونٹوں کو زبان سے چاٹ رہا تھا اور منہ سے کچھ نہ بولا تھا۔ ''اسپینش مصور فرانسسکو گویا نے وہ آئل پینٹنگ، جس کا عنوان اس کی وفات کے بعد تجویز کیا گیا۔ Quinta del sordo نامی مکان میں رہائش کے دوران تقریباً تہتر سال کی عمر میں اس گھر کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر براہ راست بنائی تھی۔ اور Goya کے مرنے کے کئی سال بعد کچھ دوسری پینٹنگز کے ساتھ اسے کینوس پر منتقل کیا گیا اور اب وہ پینٹنگ Madrid کے، پراڈو میوزیم، میں زیر نمائش ہے۔'' اسے لگا سالومن کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ وہ اپنے موم رنگ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مضطرب سا کھڑا تھا۔ سمون اس دوران وہاں سے جا چکی تھی۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ کی معمولی شد بد رکھنے والا کوئی بھی شخص جان لے گا کہ تمہاری فلم میں دکھائی جانے والی پینٹنگ فیک ہے۔ اگر وہ کوئی گمنام قسم کی پینٹنگ ہوتی تو بھی کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس سے تو ایک عالم واقف ہے۔'' وہ مایوس ہونے لگا۔ ''شاید یہ بات اتنی بھی اہم نہیں جتنی میں نے سوچی تھی۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہ رہا تھا کہ تمہارا امیر زادہ ادھورے پن اور نقائص سے متنفر ہے۔ ایک نقل تصویر کا اس کے دعوت خانے میں ہونا اس کے کردار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔''

احمد خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ اور نہیں تھا۔ شاید اسے چلے جانا چاہیے۔ سالومن کو متاثر کرنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ سالومن اضطراری کیفیت میں ابرو کے بال نوچ رہا تھا۔ مجروح انا کے ساتھ اس نے جانے کے لیے قدم اٹھایا اور ٹھٹک کر رکا۔ ہدایت کار کے حلق سے پھنسی ہوئی دھیمی آواز برآمد ہوئی تھی۔

''اپنی قمیص کی آستینیں اوپر چڑھاؤ۔''

وہ اس انوکھی فرمائش پر حیران رہ گیا۔ مگر اس نے تعمیل کی تھی۔

''اور اوپر۔ کندھوں تک۔''

وہ تنگ آستینیں اس کی کہنیوں سے آگے نہیں جاتی تھیں۔

''اتار دو۔ اپنی قمیص اسے اتار دو۔''

اس نے اچنبھے سے سالومن کو دیکھا اور قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے اسے بدن سے علیحدہ کر دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اب پہن لو۔'' چند لمحوں بعد سالومن نے ہدایت کی۔ ''تمہارے بازو کسانوں جیسے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ کل شام پانچ بجے مجھے میرے گھر پر ملنے آنا۔ Brentwood والے گھر کا پتہ تو معلوم ہوگا تمہیں۔''

✠ ✠ ✠

سالومن موریل کے جارجین گھر کے قابل رشک آرائش کے حامل کمرے میں ہونے والی اس ملاقات میں سمون فاکس مین بھی شامل تھی اور اس کے بشرے سے عیاں تھا کہ وہ کیا محسوس کرتی تھی۔ ناپسندیدگی اس کے دلکش نقوش پر جگہ جگہ تحریر تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ احمد نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے اپنی سننے اور دیکھنے کی حسیات کو سالومن پر مرکوز کر رکھا تھا اس ملاقات کا جو بھی نتیجہ برآمد ہونے والا تھا۔ اس کا انحصار معمولی نظر آنے والے اس چھوٹے آدمی پر تھا۔

''ادبی نقادوں کی اکثریت کی رائے میں 'وار اینڈ پیس' وہ کام ہے جو عظیم ٹالسٹائی کی سب تحریروں میں وہ حیثیت رکھتا

ہے۔ جسے کہا جاتا ہے۔" سالومن اٹک گیا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے اس نے پیشانی مسلی۔ "جو کسی تخلیق کار کا بہترین کام ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے؟"

احمد نے اس کی مشکل حل کر دی Magnumopus۔ تم شاید یہی کہنا چاہتے ہو۔"

سالومن نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا۔ "ہاں، وار اینڈ پیس' کو لیو ٹالسٹائی کا Magnumopus مانا جاتا ہے پر چیزوں اور معاملات کے بارے میں میری اپنی ایک رائے ہے۔ سب کی ہوتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ آنا کارنینا Anna Karenina اس زرخیز دماغ والے رشین کا سب سے اعلا شاہکار ہے۔"

احمد اس خیال سے سو فیصد متفق تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے آنا کارنینا، پڑھا ہوا تھا اور اس پر بننے والی ایک کامیاب فلم، جس میں گریٹا گاربو نے آنا کارنینا کا کردار نبھایا تھا، بھی دیکھی تھی جبکہ، وار اینڈ پیس اپنے بے حد سنجیدہ موضوع کی وجہ سے اس کی توجہ کھینچ نہیں پایا تھا۔ اگر سالومن، ٹالسٹائی کے اس ناول پر کوئی ادبی گفتگو کرنے والا تھا۔ تو وہ کسی حد تک اسے سمجھنے اور جواب میں اظہار کرنے کے لائق تھا۔ ان گھڑیوں میں اس کی زندگی کی اولین ترجیح سالومن کو متاثر کرنا تھا اور قسمت راہ ہموار کر رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔ اگر اس ناول کی کہانی پر فلم بنائی جائے تو سب سے مضبوط کردار کون سا ہے۔ مردوں میں؟"

"ورونسکی۔ آنا کا محبوب۔" اس نے بنا جھجکے جواب دیا۔ "ورونسکی کی ذات میں بغاوت ہے، نوجوانی کا جنون ہے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت کی محبت، معاشرے کی مخالفت اور اپنے اندرونی خلفشار کے مابین تنی ہوئی رسی کی مانند اینٹھا ہے۔ وہ بظاہر گورخر جیسا منہ زور ہے مگر اندر سے کسی ننھے خرگوش کی طرح سہا ہوا۔ ورونسکی کے کردار کو اس کی سادگی و پرکاری کے ساتھ ادا کرنا جوکھم سے بھری مہم ہے۔"

سالومن نے دوسرا سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبایا "تم نے صحیح کہا۔ ورونسکی واقعی سب مرد کرداروں میں سے زیادہ متنوع ہے۔ تو تم کیا کہتے ہو اگر اس ناول کی کہانی کو فلمایا جائے تو تجربہ کیسا رہے گا۔ کمرشل حوالے سے؟"

احمد تھوڑی دیر کے لیے متذبذب ہوا۔ کیا اسے بے لاگ تبصرہ کرنا چاہیے۔ یا محض سالومن کو خوش کرنے کے لیے کچھ کہے۔"

"جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو یہ اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس کہانی پر دنیا کے کئی خطوں میں فلمیں بنائی جا چکی ہیں۔ اس میں سینما جانے والوں کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔"

سمون پہلی بار گفتگو میں شریک ہوئی۔ وہ مسکرائی اور اس کے خم دار ہونٹوں کے گوشوں میں ذومعنی شکن پیدا ہوئے۔

"تمہاری بصیرت قابل داد ہے۔ 'رومیو جولٹ' سوان لیک، بیوٹی اینڈ دی بیسٹ، وغیرہ کے سلسلے میں تمہاری نادر آراء کیا ہے؟ یہ سب گھسی پٹی کہانیاں براڈوے، ٹیلی ویژن، اوپیرا، سینما میں لگاتار، آزمائی جا رہی ہیں اور حیرت ہے کہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر عاجز ہی نہیں آتے۔"

"تم نے بہت سی جہتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ جن کہانیوں کا ذکر تم نے کیا ہے، ان کا موازنہ آپس میں بھی نہیں کیا جا سکتا کجا کہ ٹالسٹائی کے ناول سے۔"

"اوہ کیا واقعی؟ میں سننے کے لیے بے تاب ہوں۔"

"رومیو جولیٹ، المیہ سوانگ ہے اور راقم نے ناٹک کے روپ میں پیش کیے جانے کے لیے ہی قلمبند کیا۔ 'سوان لیک' ballet (بیلے) ہے جس میں ناچ اور بھاؤ کے ذریعے کتھا بیان کی جاتی ہے جبکہ سنڈریلا، بیوٹی اینڈ دی بیسٹ، وغیرہ فیری ٹیلز ہیں اور فیری ٹیلز کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔"

''میں نے سنڈریلا کا نام نہیں لیا تھا'' سمون تڑخ کر بولی۔ ''مجھے معلوم ہے یہ سب۔ اس میں کوئی نیا پہلو نہیں تم یہ بتاؤ کہ 'آنا کارنینا' ان سے مختلف کیسے ہے؟''

احمد نے تحمل سے اس کی بات سنی اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا ''وہ حقیقت نگاری کا اعلا نمونہ ہے۔ وہ ایک ٹھوس، حقیقی اور زمینی کہانی ہے۔ وہ ایک لازوال کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن ناول کی صورت میں، بار بار متحرک کرداروں میں ڈھال کر ناظر کے صبر کو آزمانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔''

سمون ہنکارا بھرتے ہوئے رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

''میں تو اسی کہانی پر اسکرین پلے تحریر کر چکا ہوں۔ ساری کاسٹ فائنل ہو چکی ہے۔'' سالومن صوفے میں اچکتے ہوئے آگے کھسک آیا۔ ''مرکزی کردار میں سمون کو لیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو سمون میں وہ اہلیت ہے۔ وہ جو درکار ہے ٹالسٹائی کی ہیروئن کو پردے پر زندہ کرنے کے واسطے؟''

احمد سوچ میں پڑ گیا اسے بہت احتیاط سے مہرہ بڑھانا تھا۔ سالومن کیا سن کر مطمئن ہوگا اور سمون کو ناراض کرنا یا اس کی خوشنودی حاصل کرنا سالومن کی نظر میں کتنا اہم تھا یہ ایک اندھی چال تھی۔ سمون کی نظریں کھڑکی سے باہر کی دنیا سے واپس کمرے میں لوٹ آئی تھیں۔

''مس فاکس مین کی شخصیت کے جادو میں کوئی کلام نہیں۔ جب بھی اس نے کوئی کردار نبھایا، دیکھنے والوں نے نقش ثانی کو نقش اول سے برتر پایا۔ لیکن۔'' اس نے جملہ ترتیب دینے کے لیے کچھ پل توقف کیا۔ ''آنا کارنینا کے لیے مس فاکس مین موزوں نہیں ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ کردار مس فاکس مین کے لیے مناسب نہیں رہے گا۔ عمر کا فرق ایک کلیدی وجہ ہے۔ کارنینا میں جو متانت اور گہرائی ہے۔ وہ کسی کم سن لڑکی میں ہو ہی نہیں سکتی اور مس فاکس مین کی خوبصورتی میں جو شہوانی عنصر ہے وہ اس کے ظاہری خدوخال بالخصوص ہونٹوں کا مرہون منت ہے مگر کارنینا کا حسن اس کے اندر سے پھوٹتا ہے۔ اس کی ملول روح ہے جو اس کے نقوش میں جاذبیت بھرتی ہے۔ شاید گریٹا گاربو ہی وہ اداکارہ ہے جس نے کارنینا کو اس کی قریب ترین سچائی کے ساتھ پیش کیا۔''

سالومن نے مٹھی بھینچ کر جوش سے ہاتھ ہلایا۔ وہ خوش تھا یا شاید احمد کو ایسا لگا تھا۔ سمون اس کی جرأت پر حیران نظر آتی تھی۔

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ ٹھیک کہا۔ بالکل ٹھیک۔ کارنینا کے روپ میں سمون یکسر بے تاثر رہے گی۔ میں نے ایک نئے زاویے سے، مختلف، نئے پہلو سے اس کہانی کو فلمانے کا سوچا ہے۔ ناول میں کیٹی اور لیوین کی کہانی بھی تو ہے۔ ان کرداروں پر ماضی میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ نوعمر کیٹی جو کاؤنٹ ورونسکی کی پیش قدمی کو محبت تصور کرتی ہے اور بعد میں کوستیا یعنی لیوین اس کی دنیا میں شامل ہوتا ہے۔ کیٹی کا شوہر لیوین جو دیہی زندگی کی سادگی کو اپنائے ہوئے ہے۔'' اس نے سالومن کے گلابی ہونٹوں پر چھوٹے بچوں کی طرح بلبلے بنتے دیکھے، ''لیوین جو اندر باہر سے کسان ہے۔ میری فلم کی کیٹی میرے پہلو میں ہے اور اپنے لیوین کو بھی میں نے تلاش کر لیا ہے۔ وہ میرے سامنے بیٹھا ہے۔''

اس بات کا مفہوم سمجھنے میں احمد کو بڑی دیر لگی تھی۔



اس کا اسکرین ٹیسٹ سالومن نے اپنے زیر نگرانی کروایا تھا۔ وہ خدشوں میں گھرا پسینے سے بھیگی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے ان تمام ناموں کو ذہن میں دہرایا جن کی آواز اور لہجے کی نقل وہ بچپن سے کرتا چلا آیا تھا۔ کیری

گرانٹ، ہمفرے بوگارٹ، کلارک گیبل اور ایک لمبی فہرست جو مکالمے اسے چند لمحوں بعد ادا کرنے تھے وہ کس کے انداز میں ادا کیے جائیں تو پراثر ہوں گے۔ کون سی آواز سالومن کو سب سے بڑھ کر بھائے گی۔ روشنی کی حدت اسے پگھلا رہی تھی۔ اس نے حتمی فیصلہ کرنے کی کوشش کی۔

''ایکشن۔'' ایک آواز نے کہا۔

اس نے اپنے گرد چکراتی تیز روشنیوں کو دیکھا اور گہرا سانس لیا۔ ''دوسروں کی نقالی کرنے کے بجائے اپنا انداز اپناؤ۔ دوسروں کی تقلید کرنے سے تمہاری انفرادیت سامنے نہیں آسکے گی۔''

برسوں پہلے ایک اجنبی کی کہی ہوئی باتیں اس کے کانوں میں گونجیں۔ کیا اس کا اپنا بھی کوئی انداز تھا؟ ان سارے عظیم ناموں سے کٹ کر وہ کیا رہ جائے گا۔ شاید ایک صفر۔ اس نے ایک آخری بار اپنی گنوں والی تھیلی کو چھنکار کر درست سکہ منتخب کرنا چاہا۔

''تم ایک mocking bird سے زیادہ کچھ نہیں۔ نقلی۔ گھٹیا۔'' مغرور ایجنٹ جارج فلپ کی آواز اس کے اعصاب پر تازیانہ بن کر پڑی۔ اس نے کیمرے سے آنکھیں ملاتے ہوئے بولنا شروع کیا اور وہ لب ولہجہ خود اس کے لیے نیا تھا۔ اسے شبہ گزرا کہ اس کی آواز کانپ رہی تھی خوف سے وہ سن ہو گیا۔

''کٹ۔ کٹ۔'' ڈائریکٹر چلا رہا تھا۔

''اب پھر سے کرتے ہیں۔ گھنٹی بجا دینا۔ ایکشن۔ گڈ۔ کٹ اینڈ پرنٹ۔''

✠ ✠ ✠

''میں نے رشز دیکھے ہیں۔''

سالومن کے الفاظ پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا۔

''تمہیں کیسے لگے؟ کیا میں تمہاری توقع پر پورا اترا ہوں؟''

سالومن نے ہونٹوں کو چاٹ کر زبان دانتوں تلے دبائی۔ خرابی ہے تم میں۔ ایک بہت بڑی۔ وہ ہے۔''

''احمد نے اپنی سانس روک لی تھی۔

''وہ جو ہوتی ہے۔ جو لوگ بار بار کرتے ہیں۔ عادت۔ ہاں وہ ہے۔ تم میں۔ تم ہاتھ بہت ہلاتے ہو۔''

✠ ✠ ✠

فوٹو گرافر نے اسے اپنے ساتھی مرد کے نزدیک ہونے کو کہا۔ اس نے نظر اٹھا کر پہلو میں ایستادہ خوشی سے دمکتے چہرے والے بے حد وجیہہ مرد کو دیکھا جو اب اس کا شوہر تھا اور ایک قدم اٹھاتے ہوئے اس کے شانے سے جڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کیمرے کی طرف اٹھتے ہوئے ان کی نگاہیں ایک پل کے لیے ملیں اور وہ بیک وقت مسکرائے۔ تصویر کھینچنے سے پہلے فوٹو گرافر کو کوئی خیال آیا تو اس نے کیمرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا اور لڑکی سے پوچھا۔

''تمہاری ویڈنگ رنگ کہاں ہے؟ اسے پہن لو۔''

وہ جھینپ گئی تھی۔ اس کے بجائے اس کے شوہر نے جواب دیا۔ ''یہ ایک بہت ہی ہنگامی نوعیت کی شادی ہے۔ کل میری بیوی پاکستان جا رہی ہے اور اسے ڈر تھا کہ میں اس کے جاتے ہی کسی دوسری لڑکی کو پرپوز کر دوں گا۔ اس لیے وہ مجھ پر اپنا نام لکھ کر جا رہی ہے جیسا کہ لوگ اپنی املاک پر لکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی اور ان پر حق نہ جتا سکے اس افراتفری میں بہت سے دوسرے ضروری کاموں

کی طرح ہم ویڈنگ رنگ بھی بھول گئے۔''

وہ سینڈل میں اپنے پیر کی انگلیوں اور اپنے شوہر کے گھسے ہوئے چمڑے کے بھورے جوتوں کو دیکھنے لگی۔ اس تیسرے آدمی سے اسے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

فوٹو گرافر، جو ایک ادھیڑ عمر، خوش مزاج آدمی تھا۔ کیمرے کو اسٹول پر رکھ کر آگے آیا اور اپنی قمیص کا اوپر والا بٹن کھولتے ہوئے گردن میں لٹکتا لاکٹ اتار لیا۔ باریک زنجیر میں معمولی دھات کا گول چھلا پرویا ہوا تھا۔ وہ اس نے زنجیر سے نکال کر شوہر کی مٹھی میں دیتے ہوئے اس سے فرمائش کی کہ وہ اپنی بیوی کو پہنا دے۔ وہ چھلا اس کی رنگ فنگر میں ڈالنے پر پتہ چلا کہ اس انگلی کے لیے وہ بہت کشادہ تھا۔ اس کے شوہر نے باری باری ساری انگلیوں کی آزمائش کی۔ ان دونوں کو بے طرح ہنسی آ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں وہ ڈھلا ہوا دھاتی تار باقی تمام انگلیوں کی نسبت ذرا کم کھلا تھا۔ تاہم اسے پھسلنے سے روکنے کے لیے اسے انگوٹھے کی اوپری پور کو خم دینا پڑا تھا۔

فوٹو گرافر نے اسے اپنے شوہر کے دائیں پہلو میں آنے کی ہدایت کی اور اس کا 'شادی کی انگوٹھی' سے مزین ہاتھ پکڑ کر شوہر کی چھاتی پر سے گزارتے ہوئے اس کے بائیں کندھے پر رکھوا دیا۔ اس ڈھب پر اس کا جسم ترچھا ہو گیا تھا۔ اور شوہر کی ٹھوڑی اس کی پیشانی کو چھونے لگی تھی۔ اس نے تازہ بنائے گئے شیو والی جلد کے خفیف کھردرے پن کو ماتھے کی کھال پر محسوس کیا اور اس کی گردن سے اٹھتی خوشبو کو گہری سانس بھر کر سونگھا۔

فوٹو گرافر اسے سامنے دیکھنے کو کہہ رہا تھا۔

''یہ پاکستان کہاں ہے؟'' اس نے دوبارہ کیمرہ سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''دور سے بھی دور۔ بہت دور۔'' اس کے سینے سے ہوک اٹھی۔

اس کے شوہر نے کیا جواب دیا تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی۔ فوٹو گرافر کو ان سے تصویر کے لیے مسکرانے کی فرمائش نہیں کرنا پڑی تھی۔ ان دونوں کے ہونٹ مسلسل مسکرا رہے تھے۔

''چیٹی چوکور وضع کے پولرائڈ کیمرے کی فلیش گن سے روشنی کا کوندا لپکا اور ان دونوں پر چھا گیا۔ محض ایک ساعت کے لیے۔ ان کی پہلی تصویر بن گئی تھی۔

فوٹو گرافر انہیں اگلی تصویر کے لیے مختلف انداز اپنانے کی ہدایات دینے لگا۔

✠ ✠ ✠

''گرانٹ! مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ صبح سے کچھ چیزیں خریدنے کا کہہ کر نکلی ہوں اور اب دوپہر بھی ڈھل رہی ہے۔'' پرنیاں نے اسے چچا کے گھر سے مخالف سمت میں گاڑی موڑتے دیکھ کر لجاجت سے کہا۔

''کیا تمہیں کزن داؤد کی ناراضی کا خدشہ ہے؟''

اسے گرانٹ کا طنز برا نہیں لگا۔ داؤد کے لیے اس کے لہجے میں چبھن ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

''نہیں وہ تو سان فرانسسکو میں ہے۔ آج رات کو آئے گا۔ وہ گھر میں ہوتا تو شاید آج کے دن مجھے باہر آنے ہی نہ دیتا۔'' وہ چند ثانیے خاموشی سے گرانٹ کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ''وہاں جا کر حالات کیا ہو جائیں گے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ممکن ہے میرے گھر والے ہمارے نکاح کو سرے سے مانیں ہی نہ اور زبردستی میری شادی کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ مجھے مجبور کر دیں تو میں مدد کے لیے تمہارے سوا کسی سے توقع نہیں رکھ سکتی۔ تمہارا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر میں نے خود کو ساری دنیا سے الگ کر لیا ہے۔ تم

سمجھ رہے ہو گرانٹ؟ یہاں کی شخصی خودمختاری اور وہاں کا عائلی نظام زندگی بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ ہوسکتا ہے اور ہوگا بھی یہی کہ وہ کسی بھی بات کو تسلیم نہیں کریں گے اور شاید مجھے واپس لاس اینجلس نہ آنے دیا جائے۔ ایسا ہوا تو تم پاکستان آ جاؤ گے ناں۔ حالات میرے بس سے باہر ہو جائیں اور میں تمہیں بلاؤں تو تم جیسے بھی بن پڑے، میرے پاس آ جانا۔ تمہارے ساتھ ہونے سے میں ہر مشکل کا سامنا کرلوں گی۔ پھر کوئی مجھے روک نہ پائے گا۔ وہ لڑیں گے، ناراض ہوں گے، مجھے اور تمہیں برا بھلا کہیں گے مگر کچھ کر نہیں سکیں گے۔ تم آ ؤ گے ناں۔ دیکھو تمہیں آنا پڑے گا۔ میں تو چاہ رہی تھی تم ابھی پاکستان چلتے میرے ساتھ۔ اکیلے جاتے ہوئے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا میں نے اتنا بڑا اقدم کیسے اٹھایا۔ مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی۔ یہ پچھتاوا نہیں ہے۔ میں خوفزدہ ہوں۔ دیکھو میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہیں۔ بالکل برف جیسے۔ تم آ جانا۔ چاہے کیسی بھی مجبوری نے تمہیں باندھا ہو۔''

گرانٹ نے کار کا انجن بند کرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ گرفت میں لیے اور انہیں اپنی جیکٹ کی اندرونی طرف سینے پر رکھ لیا۔ ''تم کچھ خوف نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میری فلم کا پری پروڈکشن کا کام تیزی سے جاری ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں پرنسپل فوٹوگرافی شروع ہو جائے گی۔ سالومن اس فلم کے بارے میں بہت پرجوش ہے اور ظاہری بات ہے میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ وہ اپنی تمام تر توانائیاں اس میں جھونک رہا ہے۔ فی الحال تو مجھے اسٹیٹ چھوڑنے کی ممانعت ہے لیکن اگر کوئی مشکل آن پڑی تو میں سالومن کو سمجھالوں گا۔ وہ میرا کہا نہیں ٹالے گا۔ وہ مجھے بہت پسند کرتا ہے میں پہلی فرصت میں آ ؤں گا اور تمہارے گھر والوں سے بات کر کے تمہیں ساتھ لے آ ؤں گا۔ بس یہ ایسا سادہ معاملہ ہے اور تم بلاوجہ اس خوش ذائقہ دوپہر کو بدمزہ بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

اس نے کھڑکی سے باہر پیڑوں کی ڈالیوں میں مچلتی ہوا کو دیکھا اس کے جسم کو بادلوں کی گیلی چاپوں نے چھوا۔ ونڈ اسکرین پر نمی کی مدھم لکیریں بن اور مٹ رہی تھیں۔

اس نے ہینڈ بیگ سے ایک کاغذ نکال کر گرانٹ کو دیا۔ ''یہ میرا پتہ اور فون نمبر ہے۔ پاکستان کا۔''

گرانٹ نے کاغذ لے کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

''یہ کہیں کھو نہ جائے۔ اسے کسی نوٹ بک وغیرہ میں نقل کر لینا، کہیں ادھر ادھر نہ ہو جائے۔''

گرانٹ نے اپنی جیب کو تھپتھپا کر اسے تسلی دی تھی۔ ''اب ہی تو سب صحیح ہونا شروع ہوا ہے، اب کچھ غلط نہیں ہوگا۔ اس پتے اور فون نمبر کا میں اپنے جسم پر ٹیٹو گدوالوں گا پھر تو کھونے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ تم نیچے اترو۔'' اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔

''لیکن کس سے؟''

''تم باہر تو آ ؤ۔ سوال بعد میں پوچھ لینا۔''

''بوندیں گر رہی ہیں۔ تیز بارش نہ شروع ہو جائے۔''

''تو کیا ہوا؟''

''میں بھیگ جاؤں گی۔''

''تو بھیگ جاؤ۔''

''سردیوں کی بارش ہے۔''

لاس اینجلس کی سردی اتنی بھی سرد نہیں ہوتی۔ اور ابھی نومبر بھی ختم نہیں ہوا۔'' اس نے اپنی astronaut جیکٹ اتار کر سیٹ پر پھینک دی تھی۔

''ہم پاکستانی لوگ صرف ساون میں بھیگتے ہیں۔'' وہ کار سے باہر آتے ہوئے بولی۔
''تم لوگ مون سون کو ساون کیوں کہتے ہو؟''
''کیونکہ ساون کو مون سون نہیں کہا جا سکتا۔ ساون کو کسی بھی اور نام سے پکارا نہیں جا سکتا۔ بس وہ ساون ہوتا ہے۔''
''اچھا تو تمہارا ساون کیسا ہوتا ہے؟'' گرانٹ نے اس کے بالوں میں اٹکنے والے خشک پتے کو نکالتے ہوئے پوچھا۔
''اس میں کیچڑ ہوتی ہے پتنگے اور مینڈک۔ کچھ آدھے اور کچھ پورے ننگے بچے اور گیت ہوتے ہیں۔ پھول اور حبس اور جھولے ہوتے ہیں۔''
''کیا یہ کوئی برا وقت ہوتا ہے؟''
گرانٹ کے سوال پر وہ مبہم سا مسکرائی ''نہیں وہ سال کا سب سے خوبصورت وقت ہوتا ہے۔''
''تو میں ساون کے آگے آتا ہوں۔'' اس نے اردو میں کہا تھا۔ وہ اسے خوش کرنے کے واسطے کبھی کبھی شکستہ اردو میں کوئی چھوٹا موٹا جملہ بولا کرتا تھا۔ شاید اس کا مطلب تھا کہ ''میں ساون سے پہلے آؤں گا۔''
''ساون میں بڑے دن ہیں۔ میں تو ہر ایک پل کو انگلیوں کی پوروں پر گنوں گی۔''
جل پریوں والی عمارت کے سامنے پہنچ کر اس کے قدم تھم گئے۔ ''مجھے لگ رہا ہے بارش تیز ہو جائے گی ہم واپس کار میں چلتے ہیں۔ مجھے ٹھنڈ لگے گی۔''
''لگنے دو۔'' وہ دیوارالانگ گیا۔
تینوں جل زادیاں سرمئی رنگ سے اٹی ہوا کے لمس سے بدن چرائے ہوئے تھیں۔ انہیں اپنے اجلے جسموں کے میلے ہونے کا خوف تھا۔ سنگی طشت کے گرداگرد عنکبوت رو گلابی پھولوں والی جھاڑیاں زمین پر بچھی تھیں۔ نم ہوا میں سوسن (للی) کی سفید کلیاں مغلئی پوشاکوں کی طرح سبز ڈنٹھلوں پر جھولتی تھیں۔
گرانٹ نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ لائٹر کے شعلے کو ہاتھ کی آڑ بنا کر ہوا سے بچاتے ہوئے کئی کوششوں کے بعد وہ سگریٹ سلگانے میں کامیاب ہوا۔
''مجھے دیر ہو رہی ہے۔''
''ہونے دو۔'' وہ سرگوشی بوجھل اور مرطوب تھی۔
آسمان جولاہے کے کرگھے پر چڑھا ہوا قالین تھا۔ وہ جولاہا ساحر تھا، اس کے پاس فرشتوں کے پروں سے کاتا ہوا سوت تھا۔ اودا، نیلا، سیاہ، سفید، انوکھے رنگوں کا سوت۔ ہر تانے اور ہر بانے کے ساتھ ایک نیا نقش ابھر آتا۔ جولاہے کا کرگھا چلتا رہا اور قالین کی ہیئت بدلتی رہی پھر وہ بافندہ باف گہرے سرمئی سوت سے بے مثل نمونے بننے لگا اور وہ رنگ باقی رنگوں کو نگل گیا۔
اسے سردی نہیں لگ رہی تھی اور وہ کانپتی تھی۔
اس کا اندیشہ سچ نکلا تھا۔ بارش کی پھواریں لگاتار برسنے لگی تھیں۔
''میں نے کہا بھی تھا۔ اب چلتے ہی۔ یہاں میرے کپڑوں پر کیچڑ لگ جائے گی۔''
''لگ جانے دو۔''
گرانٹ کے نیم وا گیلے ہونٹوں سے نیلگوں دھوئیں کا مرغولہ نکلا اور بوندوں سے ٹکرا کر بجھ گیا۔ اس نے لبوں کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے بجھا ہوا سگریٹ گرا دیا۔
''یہاں ہمیں کوئی دیکھ لے گا۔''

''دیکھنے دو۔''

پن دیویاں بھیگتے ہوئے گنگنا رہی تھیں۔ سفید بل کھائے ہوئے دھڑوں پر فلوس ماہی میں بوندیں اٹک اٹک کر پھسلتی تھیں۔ پتھریلی ناند کے کناروں سے پانی چھلکنے لگا تھا۔

سوسن کی لبوتری کلیوں پر بارش یوں اترتی تھی۔ جیسے ہجرابیض سے تراشیدہ جاموں میں شراب کی دھار گرتی ہو۔ اس کی پنڈلیوں اور تلوؤں کی ننگی کھال پر گلابی مکڑیاں سرسرانے لگی تھیں۔

اس نے خود پر جھکے ہوئے چہرے کو پھیلتے دیکھا۔ وہ اتنا قریب تھا کہ اسے نقوش شناخت کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اور وہ پھیلتا چلا جاتا تھا۔ وہ اس قدر پھیل گیا کہ آسماں اور اس سے برستی بارش اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ سمٹ رہی تھی۔ وہ اس چھائے ہوئے وجود کے مقابل یوں تھی جیسے گلیور کے سامنے کوئی بالشتیا۔

گھاس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی باس، تمباکو کی مہک، کلون کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ وہ آنکھیں موند کر سوچنے لگی کہ اس کی سماعت میں اترنے والی آواز بارش کی تھی یا کہیں دور گھنٹیاں بج رہی تھیں اور اسے لگا کہ وہ چرچ کے جرس کی آواز تھی پر دور دور تک کوئی چرچ نہ تھا۔ پھر وہ چرچ کی گھنٹیاں کیسے ہو سکتی تھیں۔ ہاں وہ جل پریوں کا آسمانی گیت تھا۔

✠ ✠ ✠

ایئرپورٹ پر اس کی نظریں مسلسل گرانٹ کی تلاش میں یہاں سے وہاں بھٹکتی رہیں۔ اس نے خود ہی گرانٹ کو وہاں آنے سے منع کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے آس تھی کہ وہ آئے گا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا رہا۔ وہ آس تناور ہوتی گئی۔ ''کیا خبر وہ کسی گوشے میں موجود مجھے الوداع کہنے کے لیے میری نظر پڑنے کا منتظر ہو۔ میں نے اسے روکا تھا پر کیا اس کا دل مانا ہوگا'' جہاز میں سوار ہونے سے پہلے ایک آخری بار ان کا ایک دوسرے کو دیکھنا کتنا ضروری تھا۔'' آخر مجھے یہ الفاظ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر داؤد اسے دیکھ بھی لیتا تو یہاں اتنے لوگوں کے بیچ کوئی ہنگامہ کرنے سے پہلے سو بار سوچتا اور جو بات اسے کچھ مدت بعد پتہ چلنے والی تھی، وہ ابھی معلوم ہو جاتی تو کیا فرق پڑتا تھا۔ گرانٹ کو میرا منع کرنا کس قدر برا لگا ہوگا۔ لیکن شاید وہ پروانہ کرے اور آ ہی جائے۔ خود اس کا دل بھی تو یہی چاہتا ہوگا۔''

محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات کہی گئی بات کا مفہوم وہ نہیں ہوتا جو الفاظ ادا کرتے ہیں۔

وہ آخری لمحے تک لوگوں کے ہجوم میں اسے کھوجتی رہی۔ جب روانگی کا وقت آ گیا اور وہ لوگ ویٹنگ لاؤنج سے اٹھ کر چلے تو بھی پرنیاں گردن موڑے پیچھے دیکھنے میں محو رہی۔

ڈیپارچر لاؤنج کی سمت قدم اٹھاتے ہوئے اس کے محسوسات اس شخص جیسے تھے، جسے صبح گاہ، پابجولاں، پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

✠ ✠ ✠

ہسپتال میں اپنے باپ کو دیکھ کر اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وینس نے اسے جو بتایا تھا۔ حقیقت اس سے کہیں بڑھ کر خوفناک تھی۔ سفید چادر پر لیٹا ہوا سوجن زدہ چہرے والا آئزک جس کے تن میں سوئیاں اور نلکیاں پروئی ہوئی تھیں۔ اتنا زرد تھا کہ پرنیاں کو شک ہوا۔ اس کی کھال پر کوئی روغن ملا گیا تھا۔ کوئی زندہ انسان اتنا زرد کیسے ہو سکتا تھا۔

وینس نے بہت سمجھایا تھا کہ ''ان کے سامنے جا کر رونا نہیں۔ ان کا حوصلہ پست ہوگا۔''

وہ سب ہدایتیں بھول گئی۔ وہ ایسے آئزک سے کہاں واقف تھی جو آنکھوں کے پپوٹوں کو تیزی سے جنبش دینے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو، جس کی آواز سننے کے لیے کان اس کے ہونٹوں کے پاس لے جانا پڑتا ہو۔ جو درد اور لاچاری کی تصویر ہو۔ وہ تو کوئی اجنبی تھا جس آئزک کو وہ جانتی تھی۔ وہ ایسے زوردار قہقہے لگایا کرتا تھا کہ اس کا فربہ چہرہ اور پر گوشت جسم اس ہنسی کی توانائی سے لرزنے لگتے۔ پرنیاں کو اس کی ہنسی اور موٹاپے پر ہمیشہ ہی اعتراض ہوا کرتا تھا۔

''آپ ایسے کیوں ہنستے ہیں۔ میری سہیلی آپ کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔'' وہ چھ سال کی تھی جب اس نے بسورتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

آئزک اور بھی شدت سے ہنسنے لگا تھا۔

وہ مذاق کرنے پر آتا تو مقابل کو عاجز کر دیتا۔ اس کا ہدف اکثر پرنیاں اور وینس ہی بنا کرتیں۔ گونی پر جب بھی وہ حس مزاح آزمانے کی کوشش کرتا، گونی رونے لگتا تھا اور روتے ہوئے گونی کو بہلانا ایسا کٹھن تھا کہ وینس اور آئزک میں اس بات پر کبھی کبھی جھگڑا ہو جاتا۔

''آپ کو رلانا آتا ہے تو چپ کروانا بھی سیکھ لیں۔ آپ کو پتہ بھی ہے، اس کا ذہن کتنا سادہ ہے۔ وہ مذاق کو سچ ہی سمجھتا ہے۔''

اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی گونی والا حربہ اختیار کر کے آئزک کے مذاق سے جان چھڑا لیا کرے لیکن وقت پڑنے پر لاکھ کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے اور آئزک اسے زچ کیے جاتا۔

''وہ جو سامنے مزار پر فقیرنی بیٹھتی ہے۔ بڑے دانتوں والی۔ اس سے ہم نے تمہیں لیا تھا ایک سیر گیہوں اور شکر کی پڑیا کے بدلے۔ وہ اب تمہیں واپس مانگ رہی ہے۔ کہتی ہیں میں دو سیر گیہوں دے دوں گی۔ اب مہنگائی جو بڑھ گئی ہے۔''

اور جب اس نے وینس سے ضد کر کے اپنے بال ایک ہم جماعت لڑکی کی طرح کٹوائے اس طرز پر کہ ترشی ہوئی چند لٹیں ماتھے پر گری رہتی تھیں تو آئزک کا تبصرہ تھا۔

''میرے ایک جاننے والے کے پاس مشٹنڈا سا خچر ہے۔ اس کا ہیر اسٹائل ہو بہو تمہارے جیسا ہے بس اس کے کان تھوڑے لمبے ہیں، تبھی اس پر زیادہ جچتا ہے۔ تم نے بال کٹوا لیے، کانوں کا کچھ سوچا نہیں۔''

اور جب وہ اپنی جماعت میں اول آئی تو ''وینس! ہماری بیٹی کی جماعت میں پانچ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ایک کو کن پیڑے نکل آئے تو اس سال امتحان میں نہ بیٹھ سکی۔ ایک اور کے بڑے بھائی صاحب کی شادی انہی دنوں میں تھی تو اس نے بھی امتحانوں کو خیر باد کہا۔ دو جنیاں پرچے میں نقل کرتی ہوئی پکڑی گئیں اور باقی رہ گئی ہماری بیٹی تو وہ اول قرار دی گئی، مبارک ہو۔''

وہ لاکھ احتجاج کرتی، منہ تھتھا کر روٹھنے والے آثار بناتی پر آئزک اسے چڑائے جاتا۔ وہ آئزک......اب اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ بولنے کے لیے گھگیاتا تھا اور آواز نہ نکلتی تھی۔ پھولے ہوئے پپوٹوں والی آنکھوں سے پانی کی پتلی لکیریں کنپٹیوں کی جانب رینگتی تھیں۔

وہ داؤد، چچا اور ماموں دانیال کے ساتھ ڈاکٹر سے مل کر آ رہی تھی۔ داؤد کے اسی شعبے سے منسلک ہونے کے باعث ڈاکٹر نے کھل کر ان سے آئزک کی حالت بیان کی تھی۔ اس کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے تھے۔ خون گاڑھا ہونے سے شریانیں تنگ پڑ گئی تھیں۔ ایک پاؤں میں necrosis (خلیوں اور زندہ پٹھوں کی موت کا عمل) نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ پاؤں اور پنڈلی کا کچھ حصہ amputate کرنے کے سوا کوئی صورت نہ بچی تھی اور پھر اتلاف عضو سے بننے والے زخم کا اندمال بھی ایک مسئلہ تھا۔ زیادہ وزنی ہونے اور مسلسل بستر پر ہلے جلے بنا لیٹے رہنے سے نچلے دھڑ پر bed sores بن گئے تھے جو ٹھیک ہونے کے بجائے روز بروز بدتر

ہو رہے تھے۔اس کا بدن سڑنے لگا تھا۔

وہ آئزک کے سینے سے چمٹ کر رونے لگی تھی۔اس کے بیمار تن سے اینٹی بائیوٹکس کی دل کو پژمردگی اوڑھانے والی بو پھوٹتی تھی۔انیتا اور وینس کے سنبھالتے سنبھالتے بھی اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔آئزک نے اسے واضح طور پر دیکھنے کے لیے وینس سے مانگ کر نظر کا چشمہ لگایا اور انگلی کا خفیف اشارہ کر کے اسے رونے سے منع کیا۔پھر اس نے پرنیاں کو اپنے ہونٹوں کے قریب کان لانے کو کہا تھا۔

"ہونے والے دولہا کے سامنے اس طرح روؤ گی تو وہ سمجھے گا تم اس شادی پر راضی نہیں ہو۔کیوں ریں ریں کر کے اپنی آنے والی ازدواجی زندگی خراب کر رہی ہو؟" اس کی آواز نحیف اور بھرائی ہوئی تھی۔"میں بڑا ڈھیٹ ہوں۔اس کرسمس سے پہلے نہیں مروں گا۔مرنے سے قبل تمہیں دلہن بنے ہوئے بھی تو دیکھنا ہے۔جو بھی خریدنے کا دل چاہے، خرید لینا، تمہاری ماں کنجوس ہے، پر تم پروا نہ کرنا۔میں نے بھی تو کبھی نہیں کی۔یہ اناڑی ڈاکٹر مجھ پر کچھ تجربے وغیرہ کر کے دل کی بھڑاس نکال لیں تو میں تم لوگوں کے ساتھ گھر چلوں گا۔ساری رسمیں ہوں گی، ہم عجلت میں کچھ نہیں کریں گے۔ایک ہی بار تو شادی ہونی ہے تمہاری۔"

پرنیاں کے آنسو تھم گئے۔جو کچھ وہ کر آئی تھی، اس کی سنگینی اب اس پر طلوع ہو رہی تھی۔کیا وہ اس شخص کو جو اس کا باپ تھا، جو اسی ایک آس کی ڈور کو تھامے موت سے لڑ رہا تھا، کبھی بھی وہ بات بتانے کے قابل ہو سکے گی؟ وہ کونسے الفاظ تھے جن میں وہ اپنی خود سری اور بے رحمی کی داستان سنائے۔اس شخص کی بجھتی ہوئی آنکھوں سے نور کی آخری بوند بھی چھین لینے کی طاقت وہ کہاں سے اپنے اندر لائے گی؟



رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ کرسی پر بیٹھ کر اونگھتے ہوئے اس نے اپنے بازو پر ایک جھلتے ہوئے بھاری ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔اس نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔آئزک اس کا بازو تھام کر ہلا رہا تھا۔

ساتھ والے بستر پر داؤد اور دانیال ماموں کا بڑا بیٹا پال آڑے ترچھے اکٹھے لیٹے تھے۔رات کو وہ تینوں آئزک کے پاس ٹھہر گئے تھے اور وہ آئزک کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبا رہی تھی کہ نیند کا غلبہ ہونے پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔آئزک کو شاید کسی شے کی ضرورت تھی، تبھی اس نے پرنیاں کو جگانے کے لیے اس کا بازو پکڑا تھا۔

"جی ابو!" اس نے آئزک کے اوپر جھکتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں نیند کی کوئی رمق نہ تھی۔

"آپ کو نیند نہیں آ رہی؟ کہاں درد ہے؟"

"یہ نہیں پتا کہاں ہو رہا ہے، پر...... ہو رہا ہے۔"

"میں ڈاکٹر کو بلا لاتی ہوں۔"

"نہیں۔" آئزک نے اس کے کندھے پر انگلیوں سے دباؤ ڈالا۔"آدھی رات کے وقت میں کوئی بے زار صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔سارا دن مجہول ڈاکٹر اور کالی پیلی نرسیں دیکھ کر آنکھیں پک جاتی ہیں۔شکر ہے میری بینائی گھٹ گئی اور وہ سب مجھے دھندلے سے دکھائی دیتے ہیں۔میرا دل گھبرا رہا ہے، تم ذرا وہ کھڑکی تو کھول دو۔"

"لیکن باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔" وہ ہچکچائی۔

"کمرے میں حبس ہے، تھوڑی دیر کھول کر بھلے بند کر دینا۔"

اس نے کھڑکی کھولنے سے قبل آئزک کے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹ دیا تھا۔ اس کے پاس آتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھی تو آئزک آنکھیں سکیڑے کھڑکی کی جانب گھور رہا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی کی جالی سے رات کی گھور تاریکی جھانکتی تھی۔
آئزک بولا۔ ''یہ سیاہ کوئی رنگ تو نہیں ہوتا۔ وہ سائنس میں کیا پڑھاتے ہیں کہ جب کوئی سطح روشنی کے ساتوں رنگوں کو جذب کر لیتی ہے اور ہماری آنکھوں میں کوئی رنگ نہیں لوٹتا تو ہمیں سیاہی دکھائی دیتی ہے۔ پھر اسے رنگ تو نہیں گننا چاہیے۔ یہ تو رنگوں کی عدم موجودگی کا نام ہے۔ ہم انسان موت کے بارے میں جب سوچتے ہیں تو اسے کوئی مجسم روپ دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کوئی ٹھوس شکل تخیل میں نہیں آتی۔ بس ایسا لگتا ہے کہ موت بھی سیاہ ہوتی ہوگی۔ رات کے رنگ جیسی۔ لو میں پھر سیاہ کو رنگ کہہ رہا ہوں۔''

آئزک کی نظریں اس تاریک چوکھٹے پر جمی تھیں اور پرنیاں کو ان نظروں سے خوف آیا تھا۔

''اچھا مجھے وہ تو سناؤ، وہ داؤد کا مشکیل (زبور) جو تم نے گرجے کے میر مغنی سے سیکھا تھا۔''

یہ فرمائش قطعی غیر متوقع تھی۔

''رات کے اس وقت؟'' اس نے آئزک کو ٹالنا چاہا۔

''خدا کو یاد کرنے کا کوئی وقت بھی مقرر ہوتا ہے؟ اپنے پادری چچا جیسی بات مت کرو۔''

''مجھے وہ صحیح طرح سے یاد نہیں رہا۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔''

''ایسے کیسے بھول سکتا ہے۔ تم نے ہفتم جماعت میں اسے یاد کیا تھا اور کتنے ہی مواقع پر سنا چکی ہو۔ چلو جتنا یاد ہے، وہی سنا دو۔''

''داؤد اور پال جاگ جائیں گے، ابھی سوئے ہیں۔''

''ہونے والے شوہر کے آرام کا ابھی سے اتنا خیال ہے؟ اچھی بات ہے، ہم اسے نہیں جگائیں گے۔ تم میرے کان میں آہستہ آواز میں بولنا۔''

وہ اس کے ہر عذر کو ناکام بنا رہا تھا۔

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

آئزک نے کمبل اتار کر پرے پھینک دیا تھا۔ شاید وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے مدقوق چہرے پر پسینے کی بوندیں یوں چمکتی تھیں جیسے کسی ان دیکھی آگ کی تپش اسے اندر سے پگھلا رہی ہو۔

''احمق نے اپنے دل میں کہا کہ......'' آئزک نے خود ہی مشکیل کا آغاز کیا۔ پرنیاں کے سوکھے ہونٹوں سے گھٹی ہوئی سرگوشی نکلی۔

''احمق نے اپنے دل میں کہا کہ کوئی خدا نہیں۔''

''وہ بگڑ گئے۔ انہوں نے نفرت انگیز بدی کی ہے۔''

اسے الفاظ یاد تھے، لیکن وہ آواز میں تقدس کہاں سے لاتی۔ وہ خلوص کیسے پیدا کرتی جو خدا کا نام لیتے ہوئے دل میں موجزن ہونا چاہیے۔ اس نے بہ دقت خود کو الفاظ دہرانے پر مائل کیا۔

''کوئی نیکوکار نہیں۔

خدا نے آسمان پر سے بنی آدم پر نگاہ کی۔

تاکہ دیکھے کہ کوئی دانش مند۔

''کوئی خدا کا طالب ہے یا نہیں۔''

گلے میں بے شمار آنسو آن بیٹھے تھے۔اس کی آواز کانپنے لگی۔

''وہ سب کے سب پھر گئے ہیں۔وہ باہم نجس ہو گئے۔''

کسی ہاتھ نے اسے حلق سے دبوچ لیا تھا۔آواز نکلنے نہ پاتی تھی۔

''وہ باہم نجس ہو گئے۔''

''کوئی نیکو کار نہیں،ایک بھی نہیں۔''اس نے آئزک کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔اس کا پورا بدن ان آنسوؤں کی تندی سے ہلتا تھا۔

اوائل دسمبر کی وہ خنک رات جب آسمان پر چاند کا نشان تک نہ تھا اور ہوا بنا آہٹ کے بہتی تھی،اس باپ اور اس بیٹی نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ان دونوں کے جاگنے کی وجہیں بھلے مختلف تھیں،مگر وہ ایک ہی مقام پر تھے۔ایک دوجے کے بہت قریب۔

اسپتال کے اس کمرے کی کھڑکی رات بھر کھلی رہی اور تاریکی انہیں دیکھ کر پلکیں جھپکاتی رہی۔

✠ ✠ ✠

ٹیلی فون کی گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی وار پھر ٹیپ شدہ پیغام نشر ہونے لگا۔

''ہیلو۔میں ایڈم گرانٹ ہوں۔معذرت خواہ ہوں کہ اس وقت گھر پر نہیں ہوں۔اگر تم اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر دے دو گے تو میں جب لوٹوں گا تمہیں کال کروں گا۔براہ مہربانی سگنل سننے تک انتظار کرو،شکریہ۔''پھر ایک تیز بیپ سنائی دی تھی۔وہ تھوڑی دیر تذبذب کا شکار رہی اور پھر عجلت میں بولنے لگی۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہونے والا ہے۔میں کسی کو کچھ نہیں بتا پا رہی۔داؤد نے بھی کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مجھے لگتا ہے میرا دل پھٹ جائے گا۔اگر میں جلد ہی نہ بولی تو۔میں اپنے ماموں دانیال کے گھر......''

فون کٹ گیا تھا۔وہ ٹیپ کی طوالت سے زیادہ دیر بولی تھی۔

✠ ✠ ✠

ریکارڈ کیے گئے پیغام کے اختتام پر وہ بولی۔''میں اپنے ماموں دانیال کے گھر ہوں۔ان کے گھر سے اسپتال آنا جانا آسان ہے۔میں ان کا فون نمبر اور پتا بتا رہی ہوں۔تم آ جاؤ جیسے بھی ہو سکے۔تمہارے بغیر میں......''جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے ٹیلی فون نمبر اور پتا دہرانا شروع کیا۔

✠ ✠ ✠

فون کسی نے اٹھایا تھا۔اس نے اپنی گرفت ریسیور پر سخت ہوتے محسوس کی۔

''ہیلو۔میں پرنیاں بات کر رہی ہوں۔''

دوسری جانب خاموشی تھی۔

''کیا تمہیں میری آواز آ رہی ہے؟ ہیلو جواب دو۔''

سائیں سائیں کے سوا کچھ بھی سنائی نہ دیا۔

''مجھ سے بات کرو۔خدا کے لیے جواب دو۔تم مجھے سن رہے ہو۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔گرانٹ !تم مجھے فون کیوں نہیں کرتے؟ ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا۔ پر شاید تم نے کیا ہوگا۔ میرا زیادہ وقت اسپتال میں گزرتا ہے۔آنسرنگ مشین میں وہ وقت ریکارڈ کر دینا جس پر میں فون کروں تو تم گھر پر ملو گے۔ہیلو۔تم سن تو رہے ہو نا؟ فون بند مت کرنا۔میری بات سننے کی کوشش کرو۔ میں بے بس ہوں۔سب کچھ میرے قابو سے باہر ہوا جا رہا ہے۔اگر تم نہ آئے تو میری شادی کر دی جائے گی۔تم کب تک آ رہے ہو؟'' وہ چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

✠ ✠ ✠

وہ ایک بار پھر آنسرنگ مشین کی میکانکی آواز سے مخاطب تھی۔

''تم میرے کسی پیغام کا جواب نہیں دیتے۔آخر تم کہاں ہو؟ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے اور نہ آزماؤ۔اپنی تکلیف بیان کرنے کے لیے میرے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ میں قطرہ قطرہ مر رہی ہوں۔تم آ جاؤ ورنہ میں...... بڑی دیر ہو جائے گی۔ میں تمہیں دو دن کی مہلت دیتی...'' رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔

''ایڈم گرانٹ بول رہا ہوں۔''
کئی لمحے تو اسے اعتبار ہی نہ آیا کہ وہ مشینی آواز نہیں تھی۔
''تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کوئی ایسے بھی کیا کرتا ہے؟ تمہارا دل پتھر کا کیسے بن گیا؟ تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم نے مجھے اتنی تکلیف کیوں دی۔ ایک ٹیلی فون..... صرف ایک فون کرنے کی بھی فرصت نہ نکال سکے تم میرے لیے، میں تو تمہاری روشنی ہوں۔ میں تمہاری اچھی قسمت ہوں، مجھے کیسے بھول گئے تم؟'' آنسوؤں کے ہیجان سے اس کی آواز غیر متوازن ہو رہی تھی۔
''تم نے بھی یہ ہی کیا۔ ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا۔'' گرانٹ کی ناراض سی آواز سن کر اسے جھٹکا لگا تھا۔
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تمہیں اتنے فون کیے کہ مجھے گنتی بھی یاد نہیں۔ تم نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔''
''لیکن اگر میں اپارٹمنٹ میں نہیں تھا تو تم آنسرنگ مشین پر پیغام تو چھوڑ سکتی تھیں۔'' اس نے بے یقینی سے گرانٹ کا شکوہ سنا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے کوئی پیغام نہیں چھوڑا۔ میں نے جب بھی فون کیا، تم سے..... تمہارے لیے، بات کی، میں نے تمہیں اپنے ماموں کے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی دیا، کیونکہ ان دنوں ہم وہیں رہ رہے ہیں۔ میں نے اسپتال کا نمبر بھی چھوڑا۔ تم نے کسی بھی جگہ پر رابطہ نہیں کیا۔''
''حیرت ہے۔ میں تو باقاعدگی سے آنسرنگ مشین کے پیغامات کی پڑتال کرتا رہا اور مجھے تمہارا ایک بھی پیغام نہیں ملا۔ یہ کیسے ممکن ہے، ان دنوں تو رائن بھی اپارٹمنٹ میں نہیں ہے، ورنہ میں سمجھتا کہ اس نے لاپروائی سے......''
''گرانٹ! تم پاکستان آ جاؤ۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ میرے پاس بالکل مہلت نہیں بچی۔ شادی کی سب تیاریاں مکمل ہیں۔ چند روز میں ہم لوگ ابو کو لے کر گھر چلے جائیں گے۔ ابو اسپتال میں رہنے پر بالکل راضی نہیں ہیں۔ سب ان کو سمجھا کر عاجز آ چکے ہیں، لیکن ان کی بس ایک ہی ضد ہے کہ..... ان کی آنکھوں کے سامنے میں اپنے گھر سے دلہن بن کر نکلوں۔ میرا یقین کرو میں نے بہت کوشش کی انہیں بتانے کی، مگر میری زبان کھلتی ہی نہیں۔ امی پہلے ہی اتنی پریشان ہیں۔ میں انہیں اس نازک وقت میں یہ صدمہ کیسے دوں۔ داؤد میرے ساتھ بات نہیں کرتا، لیکن اس نے کسی اور سے بھی کچھ نہیں کہا۔ تم کب تک آ سکتے ہو، نہیں اب تو، میں اور نہیں سہہ سکتی۔ تم کل ہی آ جاؤ، آج..... پہنچو۔ ابھی میرے پاس آؤ، میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہیں چھونا چاہتی ہوں۔ ابھی آ جاؤ گرانٹ ابھی۔''
''تم شادی شدہ ہو پرنیاں! تمہاری کہیں اور شادی ہو جائے گی، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے، ہم میاں، بیوی ہیں۔ کسی کے چاہنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی، تم ہمت سے کام لو اور بالکل مت ڈرو۔ جن لوگوں کو دکھ پہنچانے سے تم ہچکچا رہی ہو، وہ تو تمہاری خوشیاں چھینتے ہوئے ذرا بھی نہیں سوچ رہے۔''
''یہ پاکستان ہے گرانٹ! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، یہاں ایسا نہیں ہوتا۔''

''دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو، محبت کے اصول ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اس میں سب جائز ہے۔ مرنا بھی اور مارنا بھی۔ اس سے بڑھ کر خود غرض جذبہ کوئی نہیں ہوتا۔ تم بھول جاؤ کہ تم خاندانی روایات کی اسیر کوئی پسماندہ اور مجبور لڑکی ہو۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ اب میں ہوں۔ میری محبت میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے آسرے تم کسی سے بھی ٹکرا سکتی ہو۔ کسی کی مخالفت اور ناراضی تمہیں اس محبت سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میرے آنے سے قبل تمہیں ہر حال میں سب کو بتانا ہوگا کہ میرے اور تمہارے بیچ کیا رشتہ ہے۔ اگر تم نے کچھ بھی ظاہر نہ کیا اور میں اچانک تمہارے گھر پہنچ گیا تو ان لوگوں کا ردعمل بہت زیادہ شدید ہوگا۔ ان کے ذہنوں کو اس بات کے لیے تیار کرو اور دیر ہرگز نہ کرو۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اس کام کو کر گزرو۔ تم ایک انٹرنیشنل سلیبریٹی کی بیوی ہو۔ تمہاری سوچ اور ارادے تو خود بخود بلند ہو جانے چاہئیں۔'' گرانٹ کا لہجہ اور انداز یکسر بدل گیا تھا۔ لائن میں اتنا شور تھا کہ اس کی آواز وضاحت سے سننے کے لیے پرنیاں سانس بھی آہستگی سے لے رہی تھی۔

''میری فلم کے ریلیز ہونے کے بعد تمہیں لاس اینجلس ٹائمز، نیویارک ٹائمز جیسے اخباروں کے نمائندوں کے سوالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ٹیلی ویژن پر میرے ساتھ ٹاک شوز میں شرکت کرنا ہوگی۔ ایسے ہی گھبراتی رہوگی تو کام کیسے چلے گا۔ اچھا تمہاری واپسی پر میں تمہیں شادی کی شاپنگ Rodeo Drive سے کرواؤں گا۔ مجھے یاد ہے تم کو ایک Armani اسکارف کس قدر پسند آیا تھا۔ ہم اپنے ہنی مون کے لیے کہاں......''

''تم نے ابھی کیا کہا تھا۔'' اچانک پرنیاں نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

''کیا آواز صاف نہیں سنائی دے رہی ہے؟ میں Rodeo Drive سے شاپنگ کی۔''

''تم آ رہے ہو گرانٹ؟ تم نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے گھر والوں کو بتا دوں، کچھ دیر پہلے تم نے یہ ہی کہا تھا، کب آ رہے ہو؟''

''میں نے سالومن سے بات کی تھی۔ وہ یقیناً رضامند ہو جائے گا۔ پرنسپل فوٹوگرافی شروع ہونے سے قبل مجھے کچھ دنوں کے لیے پاکستان آنے کی اجازت مل جائے گی۔ تم انتظار کرو، میں اگلے فون پہ تمہیں اپنی آمد کی تاریخ بتاؤں گا۔ اور ہاں...... تمہارا دیا ہوا پتا مجھ سے گم ہو گیا تھا، وہ لکھوا دو مجھے۔''

وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے پتا بتانے لگی تھی۔ لاس اینجلس سے آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب مسکراہٹ نے پرنیاں کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔



دھند کی مہین چادر کے پار مدھم لو والا سورج جلتا تھا اور اس کی لانبی زرد انگلیاں سفید چونے سے تازہ پتی ہوئی دیواروں کے کورے بدنوں پر سنہری تحریریں رقم کر رہی تھیں۔

وہ برآمدے میں اونچے پایوں والے پلنگ پر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی تھی۔

دیوار کی برودت اونی شال میں سے گزر کر اس کے کندھوں اور ریڑھ کی ہڈی میں اترتی تھی۔ اسے وہ لمس ناگوار لگ رہا تھا۔ مگر وہ اس قدر تھک چکی تھی کہ دیوار کا سہارا لیے بنا بیٹھنا اب محال تھا۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں سے وہ اسی جگہ، اسی حالت میں خاموشی سے بیٹھی تھی۔ اس کی گردن اور کندھوں میں سخت اکڑن تھی اور آنکھوں کی رگیں دکھ رہی تھیں۔ کتنی ہی بار ونیس کسی کام کے سلسلے میں وہاں سے گزرتے ہوئے اسے اٹھ کر اندر جانے کو کہہ چکی تھی۔

''اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ بیمار ہو جاؤ گی۔ تمہارے ابو صبح سے تمہیں بلا رہے ہیں۔ کل پوری رات نہیں

سوئے۔ داؤد نے چیک کیا تھا۔ انہیں تیز بخار ہے۔ بچوں والی ضد ہے۔ بھلا اسپتال جیسی احتیاط یہاں گھر پہ کیسے ممکن ہے۔ تمہاری شادی کے بعد ایک منٹ انہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ چاہے وہ جتنا بھی شور مچالیں۔ اچھا تم ان کے پاس چل کر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔ پتا نہیں صبح تم نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں۔ مجھے تو اپنا ہی ہوش نہیں ہے۔ گونی نے ٹب میں ہاتھ مار، مار کر پوری جرسی بھگو ڈالی تھی۔ صبح سے دوسری بار اس کے کپڑے بدلوا چکی ہوں۔ انگیٹھی نہیں جلا کر رکھی کہ کہیں لحاف کو آگ نہ لگا لے۔ اس کی نگرانی پر کون بیٹھے اور نکتا بھی تو نہیں ہے کہیں۔ تم نے اگر نہیں اٹھنا تو کم از کم کمبل ہی اوڑھ لو۔ آج ہوا میں غضب کی کاٹ ہے۔'' ونیس نے ہاتھوں کو بغلوں میں دبا کر گرم کرنے کی کوشش کی۔

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ پرنیان اسے بتا نہیں پائی کہ وہ جس تکون میں گھری تھی، اس کی حدوں سے باہر جانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس تکون کا ایک سرا لکڑی کا پھاٹک تھا۔ جس کا ایک کواڑ نیم وا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ہوئے بھید بھری آہٹیں جگاتا تھا، دوسرا سرا برآمدے کے مشرقی گوشے میں لگی جافری کے پاس رکھا ٹیلی فون سیٹ تھا جو صبح سے بالکل چپ تھا۔ اور تیسرا سرا اس دیوار گیر گھڑی سے بندھا تھا، جس کے بھورے خول پر چونے کی چھینٹیں تھیں اور جس کا لٹکن دھندلے شیشے کے چوکور ٹکڑے میں سے جھولتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یہ مختصر تکون اس کی کل کائنات تھی۔ اس سے باہر نکل کر وہ کہاں جاتی۔

اس نے بے شمار دفعہ لاس اینجلس سے جہاز کی روانگی کے وقت سے لے کر اب تک کی مدت کو گنا تھا۔ انگلیوں کی پوروں پر پلنگ کی ادوائن کے تانوں پر چوبی پھاٹک پر گدی ڈالیوں پر، چھت کی کڑیوں پر، وقت شمار کرنے کے اس نے کئی پیمانے آزمائے۔ اس نے دنوں میں گنتی کی، پہروں میں اور گھنٹوں میں۔ ہر بار اس کے حساب نے یہ ہی بتایا کہ گرانٹ کو گزرے ہوئے بدھ کی دوپہر اور سہ پہر کے درمیان کسی وقت پہنچ جانا چاہیے تھا تو پھر ہفتہ کیسے آ گیا تھا؟ گرانٹ کی آمد والا بدھ کہاں رہ گیا تھا؟ اگر اسے دو ہفتوں کے لیے پاکستان آنے کی اجازت مل گئی تھی اور وہ پرنیاں کو اپنی روانگی کا حتمی وقت بھی بتا چکا تھا تو پھر کس شے نے اسے روک لیا تھا۔ فلائٹ کے معمول میں تبدیلی ہوگئی تھی یا کوئی مصروفیت آڑے آ گئی تھی۔ تو اس نے اطلاع کیوں نہیں دی تھی؟

پرنیاں اس تمام عرصے میں ایک پل کے لیے بھی ٹیلی فون کی جانب سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ خود اس نے جب بھی کوشش کی، گرانٹ کے اپارٹمنٹ والا ٹیلی فون بند ملا تھا۔ شاید وہ خراب ہو گیا تھا۔ لیکن گرانٹ کہاں تھا؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے باقاعدگی سے اخبار کا مطالعہ کیا تھا۔ ریڈیو پر خبریں سنتی رہی تھی اور کسی بھی طیارے کو پیش آنے والے کسی حادثے کا ذکر نہیں تھا۔ تو کیا وہ پاکستان آ گیا تھا اور ایئرپورٹ سے یہاں تک آتے ہوئے راستہ بھول بیٹھا تھا۔ اگر ایسا بھی ہوا تھا تو وہ فون کر کے بتا سکتا تھا۔ شاید فلم کے شیڈول میں کسی ردوبدل کی بنا پر اسے اچانک کسی دوسری جگہ جانا پڑا تھا۔ لیکن بات اسی نکتے پر آ کر رکتی تھی۔ اس نے رابطہ کیوں توڑ ڈالا تھا۔ یا وہ بیمار تھا۔ ایئرپورٹ جانے کے لیے عجلت میں بھاگتے ہوئے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ کسی اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ مگر وہ جہاں بھی تھا اور جس بھی حال میں تھا، ایک بات میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ زندہ تھا، کیونکہ پرنیاں کی نبضیں جاری تھیں۔

ونیس چائے لے کر آ گئی۔ ''ساتھ کچھ کھانے کو دوں؟ ویسے ہانڈی بھی تقریباً تیار ہے۔'' آتزک درد آلود آواز میں اسے پکار رہا تھا۔ اکڑے ہوئے گھٹنوں کو بہ دقت سیدھا کرتے ہوئے اس نے پلنگ سے ٹانگیں لٹکائیں اور کچھ دیر یخ بستہ فرش کی ٹھنڈک کو تلوؤں میں اترتے ہوئے محسوس کرتی رہی۔ آتزک نے اسے اپنے بستر پر بیٹھنے کو کہا تھا۔ باہر کی نم آلود خنکی سے ہیٹر کی حدت والی فضا میں آنے سے اسے چند چھینکیں آئی تھیں۔

''اپنی شادی کے روز بہتی ناک والی دلہن کیا خوب لگے گی۔ ابھی بنفشے کا کاڑھا پیو، ورنہ ناک سے رومال جدا نہیں ہو

پائے گا۔ ہماری شادی سے ایک دن پہلے تمہاری ماں کے منہ پر پیلے بھڑوں نے کاٹ لیا تھا۔ جامن گرانے کو پیڑ پر پتھر اچھالا تھا اور وہ بھڑوں کے چھتے پر جا لگا۔ کچھ نہ پوچھو ساری رسموں میں اس کا سوجا ہوا منہ لوگوں سے چھپانے کے لیے کیا کیا جتن نہ ہوئے۔ اسی لیے تو جامن اس کا ناپسندیدہ پھل ہے۔'' وہ بولتے ہوئے کراہ رہا تھا اور اس کی سانسیں غیر ہموار تھیں۔

''مجھے درد ہو رہا ہے۔ بڑی جلن ہے اور مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ ذرا دیکھو تو۔'' اس نے ٹانگ کی طرف اشارہ کیا تو پرنیاں نے اندازے سے اس کا گھٹنا دھیرے سے چھوا۔

''کیا یہاں؟''

''نہیں اس سے نیچے۔''

''اس جگہ پر؟'' اس کا ہاتھ سرکا۔

''نہیں، اور آگے۔''

''یہاں درد ہے؟'' وہ اس کی پنڈلی کو انگلیوں سے ٹٹول کر بولی۔

''نہیں۔ اس جگہ نہیں، اس سے نیچے، تمہیں سمجھ کیوں نہیں آ رہا۔'' پرنیاں کا ہاتھ پنڈلی کے کٹے ہوئے سرے سے آگے رینگ کر ہوا میں تیر گیا۔ جس جگہ کچھ عرصہ قبل آئزک کا پاؤں تھا۔ اب وہاں خلا تھا۔ اس کٹی ہوئی ٹانگ سے آگے کچھ نہیں تھا اور آئزک کے درد کا منبع ابھی تک نہ مل سکا تھا۔

''تھوڑا اور نیچے دیکھو، ناقابل برداشت درد ہے۔ چیخوں کو روکنے کے لیے میں نے ہونٹ کو کاٹ کر لہو نکال لیا ہے۔ دیکھو کیوں درد ہو رہا ہے۔''

آئزک غیر موجود عضو کی تکلیف سے دہرا ہوا جاتا تھا۔

وہ بستر کی چادر پر ہاتھ رکھے خاموشی سے آئزک کا درد سے مسخ چہرہ دیکھتی رہی۔

ٹیلی فون کی گھنٹے بجنے لگی تھی۔ وہ سرپٹ دوڑتی ہوئی برآمدے میں آئی۔ جافری کے سوراخوں میں سے اس نے داؤد کو ریسیور اٹھاتے دیکھا۔ اس نے بمشکل اٹھتے قدموں کو روکا تھا۔ ''ہیلو۔ کون بات کر رہا ہے۔ ہیلو، آواز نہیں آ رہی، ہیلو، ہیلو۔'' داؤد نے کندھے اچکاتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

وہ وہیں ٹھہر کر گھنٹی کے دوبارہ بجنے کا انتظار کرتی رہی، پھر مایوس ہو کر پلنگ پر سابقہ ڈھب سے بیٹھ گئی تھی۔ چائے کا کپ ایک سرے پر دھرا تھا۔

''چائے پی لو۔ اب تو ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔'' ونیس نے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے جھانک کر کہا تھا۔

اس نے کپ قریب کھسکا لیا اور چائے کی سطح پر بننے والی باریک جھلی کو انگلی سے ہٹانے لگی۔ اس کی ممانی سائرہ پاس آ بیٹھی اور گتے کا ڈبہ اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

''کھول کر دیکھو۔ یہ میری طرف سے تمہاری شادی کا خاص تحفہ ہے۔'' اس نے خود ہی ڈھکن ہٹا کر اندر موجود جوتے نکالے اور پلنگ پر اس کے پیروں کے قریب رکھ دیے۔ ''یہ میں نے تلہ گنگ سے منگوائی ہیں۔ سونے چاندی کے تار لگے ہیں۔ پہن کر دکھاؤ تو۔ ناپ کی بڑے تاکید کی تھی تمہارے ماموں کو۔''

وہ گلابی گرگابیاں تھیں جن پر کلابتونی پھول بنے تھے۔

پرنیاں نے غیر محسوس طریقے سے پاؤں سمیٹ لیے تھے۔

''انیس، بیس کا فرق ہو تو ہو، میں نے دو جوڑیاں منگائی ہیں۔ ایک سیما کے لیے ہے، یہ پوری نہ آئے تو تم سیما والی لے

لینا۔اس کا پاؤں تم سے ذرا بڑا ہے۔لاؤ میں پہنا دوں۔" کھٹکے پر اس کی نگاہ دائیں سمت اٹھی اور گونی کو ٹیلی فون سیٹ سے کھیلتے پا کر وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرنے لگی۔کئی کوششوں پر بھی گونی متوجہ نہ ہوا تو جھنجلا کر پلنگ سے اترنے کے لیے اٹھی اور اس کا ہاتھ لگنے سے چائے کا کپ الٹ گیا۔کچھ چائے اس کے ہاتھ پر چھلکی تھی اور کچھ گرگابیوں پر بہہ گئی تھی۔

سائرہ کی آہ نکل گئی۔"ہائے میں مرگئی۔ایسی بڑھیا جوتی، چائے نے ناس مار دیا۔لوکا لگے بدنظروں کو۔" وہ دوپٹے سے گرگابیوں کو پونچھتے ہوئے تاسف سے کہہ رہی تھی۔ وینس باورچی خانے سے باہر نکل آئی اور سائرہ سے پوچھنے لگی کہ کیا ہوا تھا۔پرنیاں کے رونے پر دونوں فکرمند ہوئیں۔

"کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟" وینس نے اس کا کندھا ہلایا۔

اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا اور اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے رندھی آواز میں بولی۔

"میرے ہاتھ پر چائے گر گئی، میں جل گئی ہوں۔"

وینس نے اچنبھے سے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا تھا۔

اسے چائے کا کپ وہاں رکھے ہوئے آدھا گھنٹہ بیت چکا تھا۔ٹھنڈی چائے نے پرنیاں کا ہاتھ کیسے جلا دیا تھا؟

✠ ✠ ✠

بھور سمے سے بارش ہو رہی تھی۔نرم پھواریں جن کے دھرتی کو چھونے کی آہٹیں سکوت کو توڑ نہ پاتی تھیں۔مشک فام رانی، رات اپنے مہامنڈل سے اتر آئی تھی اور اس کی قبا بارش کی بوندوں سے بھیگ کر بوجھل ہو چلی تھی۔اس بارش میں اکتا دینے والا تواتر تھا۔

جاڑے کی بارش کسی بن بیاہی لڑکی جیسی ہوتی ہے، جس کی بیاہ کی عمر نکلی جاتی ہو اور بر نہ ملتا ہو، ہر آن نم آنکھوں والی، اندر ہی اندر بس گھولتی ہوئی، نہ کھل کر برسے کہ جل تھل ہو جائے، نہ تھمنے کا نام ہی لے۔

برآمدے کی دیوار پر سجے گل جاموں میں جلتے برقی قمقموں کی روشنی میں پھوئیاں دم بھر جھلملاتیں اور زمین کو چوم کر کیچڑ میں مل جاتیں۔

بادل سے کیچڑ بننے کا سفر بس ایک لمحے کا تھا۔

پرنیاں سے زیادہ بہتر یہ بات کون سمجھ سکتا تھا۔

اس نے گیلی سیلی شال سے خود کو ڈھانپ کر کپکپی روکنے کی کوشش کی تھی۔سردی اور بڑھی تھی، کپکپاہٹ میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ہوا بر فانی قاشوں سے بنی انگلیوں سے اس کا تن ٹٹولتی تھی۔

اندر بڑے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے افغان مغنی کی پرسوز آواز اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔گراموفون کے بھونپو سے فارسی غزل کے اشعار نرت کے ساتھ پھوٹ رہے تھے۔یقیناً وہ ریکارڈ گونی بجا رہا تھا۔وہ فارسی شاعری تو کیا، کوئی بھی آواز سننے کے قابل نہیں تھا۔وہ ماں کے پیٹ سے بہرا تھا اور جیسا پیدائشی بہروں کے ساتھ ہوتا ہے، وہ گونگا بھی تھا۔اسے بس گراموفون کی چکراتی ہوئی سوئی بھلی لگتی تھی اور سوئی کے چکروں کے ساتھ گھومتا ہوا خوش ہوتا تھا۔وہ پرنیاں سے دو برس چھوٹا تھا، لیکن اس کا دماغ کسی سات سالہ بچے کی شعوری منزل پر پہنچ کر تھم گیا تھا۔

فارسی اور اردو غزلوں کے ونائل ریکارڈ پرنیاں اور آئزک کی مشترکہ پسند کا شاخسانہ تھے۔

خبرم رسیدامشب کہ نگار خواہی آمد۔(مژدہ سنا ہے کہ آج رات تو آئے گا۔)

سرمن فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد۔ (میرا سر ان راہوں میں قربان ہو جن سے تیری سواری گزرے گی۔)

گندھرپ فراق کے درد میں ڈوبا ہوا گا رہا تھا۔

جافری کے پار برآمدے کے آخری کونے میں لگے ہوئے دروازے کے پیچھے اس وقت کیا ہو رہا تھا؟ وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی، پر اس کے چاہنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وینس شاید داؤد کی منت کر رہی ہوگی۔ اس کے سامنے گڑگڑا رہی ہوگی۔ اس کو راضی کرنے کے لیے واسطے دیتی ہوگی۔

جو کچھ اس نے تھوڑی دیر قبل وینس کو بتایا تھا، اسے سننے کے بعد کوئی بھی ماں یہ ہی کر سکتی تھی۔ وہ خود داؤد سمیت دنیا کے کسی بھی ایسے آدمی کے پیروں میں گر کر ناک رگڑ سکتی تھی جو اس شادی کو روکنے پر اختیار رکھتا ہو۔ وینس بھی ناک ہی رگڑ رہی ہوگی۔ بس وہ کسی بھی حال میں اس شادی کو کروانا چاہتی تھی۔

اس کے پیروں کی انگلیاں سردی اور تھکن سے اکڑ کر درد کرنے لگی تھیں۔ برآمدے کے ستون کا سہارا لے کر اس نے خود کو کھڑے رہنے پر مجبور کیا، کیونکہ بیٹھنا اسے زیادہ ذلت آمیز لگ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ برآمدے کے فرش پر گونجنے لگی۔ وینس، داؤد کے کمرے سے نکل کر اس کے پاس آ رہی تھی۔ اس کا سامنا کیسے کرنا چاہیے تھا۔ سر اٹھا کر یا گردن جھکا کر، بعض باتوں کو کہنے کے لیے کوئی بھی انداز اپنایا جائے، وہ ایک جیسی ہی شرمناک رہتی ہیں۔ گراموفون بین کر رہا تھا۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم (میری جان لبوں پر آ گئی ہے، تو آ کے میں زندہ ہو جاؤں۔)

پس ازاں کہ من نمانم بہ چہ کار خواہی آمد۔ (میرے مرنے کے بعد تو آیا تو تیرا آنا کس کام کا۔)

اسے اپنی پسلیوں میں ٹیسیں پھیلتی محسوس ہوئیں۔

برآمدے کی آخری سلوں پر گرتے قطرے اچھل کر بکھر رہے تھے۔ خود کو گیلا ہونے سے بچانے کے لیے وہ ستون کے ساتھ گھوم کر چھینٹوں کی دسترس سے ذرا دور ہو گئی۔ قدموں کی آہٹ اس کے قریب آ کر رک گئی تھی۔ اس نے فرش کی بادامی پتھریلی سلوں پر کھلی چپلوں میں دو گدگدے گورے پیروں کو دیکھا۔ وینس کبھی بھی جرابیں اور گرم جوتے نہیں پہنتی تھی۔ اس کے پاؤں جلنے لگتے تھے۔ دائیں پیر کے ٹخنے کے نزدیک زخم کا موہوم سا نشان تھا۔ چپل کی تنی سے ہلدی کے ذرات چمٹے تھے جو شاید باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے گرے ہوں گے۔ گل جاموں کے کانچ سے پھوٹنے والی روشنی تیز تھی اور ہر منظر کو وضاحت سے دکھاتی تھی۔ وہ ان پیروں پر سر رکھ کر انہیں چومنا چاہتی تھی۔ پر اس خواہش پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔

''پرنیاں! میں سمجھی تھی تم نے داؤد کو اپنی شادی کا بتا دیا ہے۔ کہیں اس کے سامنے میرے منہ سے نکل جاتا تو کیا ہوتا۔ اسے بس تمہارے اس مسلمان لڑکے سے ملنے جلنے کی خبر ہے۔ وہ اس بات کو بھولنے پر آمادہ ہے۔ وہ شادی کے بعد تمہیں طعنہ نہیں دے گا۔ وہ سمجھتا ہے تم بے وقوف ہو۔''

وینس کی امید اب تک نہ ٹوٹی تھی۔ وہ اب بھی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''وہ بھول جائے گا، میں نہیں بھول سکتی۔ میرا نکاح ہوا ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں، میرا شوہر آ رہا ہے، وہ آنے ہی والا ہے۔''

''یار من بیا...... یار من بیا۔'' (میرے یار آ...... تو آ جا۔)

مغنی کے دل کی رگیں اور گلے کی رگیں باہم مل گئی تھیں۔ اس کے الحان میں اس کا دل دھڑکتا تھا۔

''تم مسیحی ہو۔ وہ یسوع کا دشمن ہے۔ تمہارا اس سے نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔''

''اس بات سے زیادہ کوئی بات اہم نہیں۔''

''تمہاری شادی میں دو دن رہ گئے ہیں پرنیاں! مجھے چوراہے میں بٹھا کر میرے سر میں جوتے مارلو، پر میرے ساتھ یہ نہ کرو۔ میں نے کون سی برائی کی تمہارے ساتھ، جس کا تم بدلہ لے رہی ہو۔''

وینس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اگر اس میں مزید رونے کی ہمت ہوتی تو وہ اب بھی اس کے سامنے روتی، مگر شاید وہ تھک چکی تھی۔

پرنیاں خاموش رہی اور اسی طرح سر جھکائے ہوئے مڑ کر چلنے لگی۔ قدم اٹھانے پر اسے احساس ہوا کہ پیروں کے ساتھ اس کی پنڈلیاں بھی اکڑ گئی تھیں۔

وینس اس کے پیچھے آتے ہوئے منت بھرے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔ جب بھی لوگ فقیروں کا دست سوال جھٹک دیتے ہیں تو فقیر اسی طرح پیچھا کر کے فریادیں دہراتے ہیں۔ کسی کے سن لینے کے خوف سے وہ سرگوشیوں میں گھگیاتی تھی۔

''یار من بیا...... یار من بیا۔''

گراموفون کی آواز وینس کی آواز پر غالب تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے الماری کھولی اور نچلے خانے میں رکھے بیگ کی زپ کھول کر کچھ چیزیں نکالیں۔

شدت گریہ سے سرخ آنکھوں والی بھکارن وینس دروازے کے ساتھ جلتی انگیٹھی کے قریب کھڑی اسے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

''میری بات کیوں نہیں سنتی ہو؟ مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔ شاید مجھے بخار ہو رہا ہے، میرے گلے میں درد ہے۔''

بھکارن نے کشکول پھیلا کر التجا کی۔

اس نے بیگ سے نکالے ہوئے کاغذ کے پرزے لا کر وینس کے ہاتھ میں دے دیے۔ کچھ دیر اس کی چندھیائی ہوئی نظریں ان پر گڑی رہیں اور پھر اس نے ان سب کو جلتی ہوئی انگیٹھی میں پھینک دیا۔

وہ پولرائیڈ کیمرے سے کھینچی ہوئی ان کی شادی کی تصاویر تھیں۔ ایک لمحے میں کاغذ نے آگ پکڑ لی تھی۔ پرنیاں کو امید نہیں تھی، وہ ایسا کرے گی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جلتی تصویروں کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔

''آپ نے انہیں جلا دیا؟ یہ کیا کر دیا؟''

''انہیں جلانا ہی بہتر تھا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ کوئی نہیں جانتا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ میں کسی کو پتا نہیں لگنے دوں گی۔ ہر ثبوت کو نیست کر دوں گی۔ اس کی جو بھی نشانی ہے، وہ مجھے دو، میں اسے جلا کر ختم کر دیتی ہوں، اس کی ہر شے جلا دو۔''

''یہ آنکھیں بھی اس کی ہیں۔ انہیں بھی جلا دوں۔ یہ ہونٹ اس کے ہیں۔ انہیں بھی جلا دوں۔ یہ پورا جسم اس کا ہے۔ اسے بھی۔ سب کچھ جلا دوں۔'' وہ ہذیان بکنے لگی تھی۔

وینس نے دروازے کے کواڑ بھڑا کر اس کی آواز کو باہر جانے سے روکا۔

''جب آئزک تمہیں یسوع کی بھیڑ کہتا تھا، تم کیسے خوش ہوتی تھیں۔ میں ڈرتی تھی۔ مجھے خوف تھا تم کہیں نن نہ بن جاؤ۔ اور آج تم یسوع کے نام سے ہی پھر گئی ہو۔ تم اگر نن بن جاتیں تو مجھے ایسی تکلیف کبھی نہ ہوتی۔''

وینس آگے بڑھی اور اس کی گردن میں لٹکتا صلیب والا لاکٹ مٹھی میں دبا کر اتارنا چاہا۔ پرنیاں بدک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''تم دھوکے باز ہو۔ اس مقدس صلیب پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ اسے اتار دو تا کہ تمہارا کھوٹ سب کو نظر آ سکے۔ اسے پہن کر سب کی آنکھوں میں دھول نہ جھونکو۔''

شاید ہی کسی گالی میں اس سے بڑھ کر چوٹ پہنچانے کی صلاحیت ہو گی۔ پرنیاں کے دل کو کسی نے پاؤں تلے کچل دیا تھا۔

''میں نے تم پر کبھی سختی نہیں کی۔ کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ گونی کی شکل میں خدا نے مجھے جو محرومی دی میں اس کا مداوا تمہاری ذات سے کرتی رہی۔ مجھے نہیں یاد پڑتا میں نے کبھی تمہاری کوئی خواہش رد کی ہو۔ میں کوئی احسان نہیں جتا رہی، صرف تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اب میں تم پر سختی کروں گی۔ ہاتھ اٹھانا پڑا تو ہاتھ بھی اٹھاؤں گی۔ تمہاری جان لینا پڑی تو ایسا بھی کروں گی۔''

وہ تھکے ہوئے انداز میں دروازے کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

پرنیاں کی نظریں انگیٹھی کی راکھ پر جمی تھیں۔

بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد وینس بولی ''اچھا سنو، تمہیں اپنے باپ پر ذرا ترس نہیں آیا۔ تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ وہ مر رہا ہے۔ بس ایسے ہی پوچھ رہی ہوں تم جواب نہیں دینا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔''

پرنیاں کی ٹانگیں تھکن سے شل تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کھڑے رہنا چاہیے یا کرسی پر بیٹھ جائے۔ شاید کرسی پر بیٹھنا عجیب لگے گا۔ اسے بھی وینس کی طرح فرش پر بیٹھ جانا چاہیے پر وہ کھڑی رہی۔ اسی طرح سر گرائے ہوئے۔ اسی طرح نظریں نیچی کیے ہوئے۔

''مرتے ہوئے لوگوں پر بیگانے بھی رحم کھاتے ہیں۔ وہ تو تمہارا اپنا باپ ہے۔ تمہیں رحم نہیں آیا پرنیاں! ہاں نہیں آیا ہو گا۔'' وینس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ ''اولاد کا دل اور طرح کا ہوتا ہے۔ گونی جب کبھی غصے میں آتا ہے تو مجھ پر تھوک دیتا ہے یا میرے منہ پر طمانچے مارتا ہے۔ میں سمجھتی تھی وہ نا سمجھ ہے لیکن نا سمجھ تو میں ہوں۔ وہ تو بس اولاد ہے۔ اچھا تم سو جاؤ۔ صبح بہت سارے کام ہیں۔ وقت جانے کیا ہو گیا ہے۔ انگیٹھی جل رہی ہے تو کھڑکی کھلی رہنے دینا۔''

وہ دیوار کا آسرا لے کر اٹھی اور اس کے پاس آتے ہوئے کندھوں سے پکڑ کر اسے بستر کی طرف لے گئی۔ اسے لٹا کر کمبل اوڑھاتے ہوئے وینس نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔

''تمہارے ابو کئی راتوں سے کہہ رہے ہیں کہ میں سوؤں گا نہیں۔ میں سو گیا تو میری موت آ کر مجھے دبوچ لے گی۔ وہ بڑی ڈراؤنی ہے۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے نظر آنے لگتی ہے۔ سن کر میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔ میں سوچتی تھی موت کے بھیانک جبڑے ہوں گے۔ انگارہ آنکھیں ہوں گی۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے پنجے ہوں گے۔ عجیب عجیب صورتیں مجھے رات بھر ڈراتی رہتی تھیں۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ میں بے جا ڈرتی رہی۔ تم تو بڑی خوبصورت ہو۔ آئزک کی موت اتنی خوبصورت ہو گی۔ میرے گمان میں نہیں تھا۔''

اس نے اپنے ماتھے پر ایک قطرہ گرتے ہوئے محسوس کیا۔

کمبل اس کے کندھوں تک لپیٹ کر وینس بستر سے دور ہو گئی تھی۔

وہ وینس کو پورا سچ نہیں بتا سکی تھی۔ ایک بات کئی بار اس کی زبان پر آ کر دم توڑ گئی تھی۔ وہ حاملہ تھی۔

رات کے آخری پہر، اس نے گھر چھوڑا تو بارش تب بھی برس رہی تھی۔ چند قدم چلنے پر ہی اس کے پاؤں کیچڑ میں دھنسنے لگے تھے۔ اس کی بغل میں دبے مختصر سفری بیگ میں سب سے قیمتی متاع سنو وائٹ کا تابوت تھا۔ اب اسے اپنی کہانی میں اس تابوت کا مقام سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے محبت کا زہریلا سیب چکھ لیا تھا اور اسے شہزادے کا انتظار تھا جو اپنے لمس سے اسے زندہ کر دیتا۔

یار من بیا...... یار من بیا...... یار من بیا۔ گراموفون کی سوئی جیسے ایک ہی نکتے پر اٹک گئی تھی۔

✠ ✠ ✠

گلیارے کا موڑ مڑتے ہی وہ رکا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس ڈالر کا نوٹ نکال لیا۔ نکٹائی لگائے ہوئے کھچڑی داڑھی والے امریکی صدر کی تصویر کو چومتے ہوئے اس نے نوٹ کو تہہ لگائی اور احتیاط سے langdon (بے آستین کا اونی لبادہ) تلے جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑا ہو کر اپنے دل کو کنپٹیوں میں بجتے ہوئے سنتا رہا۔ اسے یقین ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کی قسمت اتنی اچھی ہو سکتی تھی۔ کیا کوئی مانے گا کہ یہ grant (پچاس ڈالر کا bill) اسے کچرا کریدتے ہوئے ملا تھا۔ لیکن اسے کسی کو بتانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ اس کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ وہ اپنے دماغ میں ان اشیاء کی فہرست مرتب کرنے لگا جو اس رقم سے خریدی جا سکتی تھیں۔ اسے اپنی ترجیحات طے کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بہت ساری چیزیں تھیں جنہیں پانے کے لیے وہ مچلتا تھا لیکن ان میں سے اسے زیادہ مرغوب کون سی تھیں۔ اس پر اچانک ملنے والی خوشی کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جیب سے نوٹ نکال کر اسے غور سے دیکھا اور اسے اپنی انگلیوں میں مسل کر پرکھنے لگا۔ وہ اصلی تھا۔ یہ بات شبے سے بالاتر تھی۔ وہ گنگنانے لگا۔

cucú canta ba la rana
(ٹرٹر! مینڈک گاتا تھا)
cucú debajo de agua
(آب تلے چلاتا تھا)
cucú paso un caballero
(ٹرٹر! آیا مانس ایک)
cucú con capa y sombrero
(کسے انگرکھا۔ پہنے ہیٹ)
نوٹ کو سونگھ کر اس نے پھر سے جیب میں منتقل کیا۔
cucú paso un marninero
(ٹرٹر، گزرا ایک ملاح)
cucú vendiendo romero
(بیچے پتی باس بھری)
cucú le pidio una ramito
(ٹرٹر، ننھا مینڈک گایا، مانگی اس سے ایک پھلنگ۔"
ایک پھلنگ۔"

وہ puerto rican بچہ شالم تھا۔ اس کی عمر دس سال مگر بودھ (فہم) بیس سال والا تھا وہ طرار اور کھوج لگانے کا شائق تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت گلیوں میں آوارہ گھومتے ہوئے گزارتا تھا اور گلیوں نے ہی اس کی سوجھ بوجھ کو اس کی جسمانی عمر سے دگنا بنا دیا تھا۔ اس کا محبوب مشغلہ dumpster diving (کوڑا دان میں گھس کر قابل استعمال چیزیں اکٹھی کرنا) تھا۔ دن کا سب سے اچھا وقت وہ تھا، جو شالم کوڑے دان میں گزارتا تھا۔ کتنی ہی کارآمد اشیاء ہاتھ آتی تھیں۔ بس ذرا جستجو کرنی پڑتی تھی۔ سپر اسٹورز اور گروسری والے خوراک جو ابھی باسی بھی نہ ہوئی ہوتی تھی، کچرے دانوں میں پھینک دیتے تھے۔ کئی بیچنے کے لائق چیزیں بھی کوڑے میں مل جاتی تھیں جیسے دھات کے ٹکڑے، کانچ کی خالی بوتلیں، استعمال شدہ کپڑے، ناکارہ گھڑیاں اور پرانے کمپیوٹرز کے حصے

بجرے۔ کسی دن وہ زیادہ محنت کرتا تو اسی طرح کی بیسیوں چیزوں کو فروخت کر کے دس ڈالر تک کما لیتا تھا۔ اس نے جو ہری اور کالی دھاریوں والا langdon پہن رکھا تھا، وہ بھی اس نے ایک ایسی ہی مہم کے دوران پایا تھا۔ اگر چہ وہ اس کے جسم پر ذرا کھلا تھا۔ مگر بہت خوش نما تھا۔ وہ langdon شالم کو اتنا پسند تھا کہ کبھی کبھار سخت دھوپ میں بھی اسے پہن لیا کرتا تھا۔

اس کی ماں سلویا۔ اس کی اس عادت سے سخت نالاں تھی۔ اور کئی بار اسے پیٹ چکی تھی۔ اس کے کپڑوں سے پھوٹتی بوسونگھ کر وہ جان لیتی تھی کہ اس کا دن کیسے گزرا تھا۔ ابتدا میں تعفن سے شالم کا جی بھی متلاتا تھا مگر ڈھیرے ڈھیرے بدبو ایسے غائب ہوگئی جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ سلویا کی سختی سے گھبرا کر کچھ عرصے کے لیے اس نے اپنے شوق تیاگ دیا تھا اور کچھ ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ شہر سے باہر گالف گراؤنڈز میں جانے لگا تھا۔ وہ لوگ کھوئی ہوئی گیندیں ڈھونڈتے اور انعامی رقم پاتے۔ مگر ایک تو گالف کورس بہت دور تھا۔ آنے جانے میں بڑا وقت خرچ ہوتا تھا۔ دوسرے گیندیں تلاش کرنے کا کام مشقت طلب اور اکتاہٹ بھرا تھا۔ بدلے میں ملنے والی رقم بھی نہایت قلیل تھی۔ وہ جلد ہی اوب گیا اور دوبارہ سابقہ روش کو لوٹ گیا تھا۔ لیکن اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ کسی dumpster میں گھسنے سے پہلے وہ ایک بوسیدہ برساتی، جو اسے کوڑے میں سے ہی ملی تھی، پہن لیتا۔ اس طرح اس کے کپڑے اور جوتے چپکنے والی اور باس چھوڑتی چیزوں سے بچ جاتے تھے۔ سلویا دیر سے گھر جانے پر جتنی بھی باز پرس کر لیتی۔ وہ مان کر ہی نہ دیتا۔ بالآخر تنگ آ کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

اس کا باپ پیدرو بھی ایک، جنک مین، (کوڑے میں سے قابل کار چیزیں نکال کر بیچنے والا تھا)۔ ایک سال پہلے جب یہ لوگ، San Juan میں رہا کرتے تھے تو پیدرو عمارتوں کی کھڑکیاں صاف کیا کرتا تھا۔ پھر پتہ نہیں اس نے کیا کیا کہ پولیس والے اسے پکڑنے کے لیے ان کے گھر آ گئے۔ پیدرو ان کی گاڑی رکتے دیکھ کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا اور پھر کئی ہفتوں تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بعد میں اس نے سلویا کو پیغام بھجوایا اور وہ ان سب بہن بھائیوں کو لے کر اس نئی جگہ پر آ گئی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے پیدرو کو کچرے کا بیوپار کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدمزاج ہو گیا تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان سب کو گالیاں دینے لگتا تھا۔ سلویا بھی چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ان سب بہن بھائیوں کو مارنا اور برا بھلا کہنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ ان دنوں سلویا اور پیدرو کا جب بھی سامنا ہوتا وہ جھگڑنے لگتے۔ ان کی لڑائی کی وجہ شالم کو معلوم تھی۔ اس کا نیا بھائی یا بہن آنے والی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ لوٹ کر گھر ہی نہ جاتا چیخنے اور کوسنے کی آوازیں سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے۔

کچرے سے وابستگی نے اسے کئی پرلطف واقعات سے روشناس کروایا تھا مگر کچھ دیر قبل جو بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی نوع کی ایک ہی تھی۔

وہ گلی کے نکڑ پر گروسری اسٹور کے عقب میں رکھے ہوئے بڑے dumpster میں گھسا کوڑا کھد یڑ رہا تھا اور کوئی بھی کام کی چیز ہاتھ نہ لگنے پر تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے نے اسے چونکا دیا۔ پہلے تو وہ اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ گلی بالکل ویران تھی اور اس میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر کرنے والا وہ شخص خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ شالم نے برنج کی نوکیلی پتری مٹھی میں لے کر ہاتھ کمر کے پیچھے چھپا لیا تھا تاکہ کسی خطرے کی صورت میں اپنا دفاع کر سکے۔ وہ لڑکا کسی ایشیائی ملک کا باسی تھا۔ اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے شالم کو احساس ہوا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ خاصا بے وقوف اور عجیب سا نوجوان تھا۔ شالم نے اپنی ٹوٹی ہوئی انگلش میں کچرا کر یدنے کے حوالے سے ایک جھوٹی کہانی سنائی جسے سن کر خدا جانے اس اجنبی کو کیا ہوا کہ اس نے پچاس ڈالر کا bill (نوٹ) اسے دے ڈالا تھا۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ اس رقم کے عوض وہ کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔

شالم نے آہٹ سن کر ایک قدم پیچھے لیا اور گلی میں جھانک کر دیکھا۔ وہ نوجوان dumpster سے کافی آگے گلی کے درمیان میں خاموش کھڑا تھا شالم کو عجیب محسوس ہوا۔ وہ اب تک کیوں موجود تھا۔ چلا کیوں نہیں گیا تھا۔ نوجوان نے شاید دیوار سے نکلا

ہوا اس کا سر دیکھ لیا تھا اور وہ چلنے لگا تھا۔ اسی سمت میں، جس میں شالم جا رہا تھا۔ وہ مڑا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کیا وہ لڑکا اس کے پیچھے آ رہا تھا لیکن یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے اس کو اسی گلی میں سے گزر کر کہیں جانا ہو تو پھر وہ فوراً کیوں نہیں گیا تھا۔ اب تک کس لیے منتظر تھا؟ قدموں کی رفتار بڑھاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکا لمبے ڈگ بھرتا اس کے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اس کا جی چاہا کہ بھاگنے لگے مگر وہ خود کو ڈرا ہوا ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''شالم! رکو۔'' اس لڑکے کی پکار سن کر شالم کے بدترین شکوک کی تصدیق ہوگئی۔

کیا وہ کوئی بیمار ذہن والا آدمی تھا اور اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا تھا۔ لیکن دن کی روشنی میں وہ اسے کوئی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ گھبرانے والی کوئی بات نہیں تھی۔

''Si mano'' (ہاں بھائی) اس نے رکے بغیر جواب دیا۔

''وہ نوٹ مجھے واپس دے دو۔ میری بات سنو۔''

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے شالم بھاگ پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر جیب والی جگہ سختی سے جما تھا۔ وہ لڑکا اسے آوازیں دے رہا تھا لیکن ان سنی کر کے وہ ناک کی سیدھ میں دوڑتا رہا۔ وہ خود کلامی کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ بہت گھبرایا ہوا ہوتا تھا تو خود سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

Te tumbaste eso (کیا تم نے چرایا ہے؟) اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور دائیں بائیں سر مارنے لگا۔

''No te Panikees'' (ہولنے کی ضرورت نہیں)۔''

اس لڑکے کے دوڑتے قدموں کی گونج اسے عقب میں سنائی دے رہی تھی۔

''Que bruto'' (کیسا چغد ہے)'' وہ اسے گالیاں دینے لگا۔

''charlatan'' (مسخرہ)''

اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ وہ ایک تنگ گلی میں مڑ گیا اور آخری حد تک قوت لگا کر رفتار بڑھائی۔ وہ نوٹ لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ واہیات آدمی اسے کوئی بے ہودہ کرتب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا تو اسے مایوسی ہونے والی تھی۔ شالم کے بارے میں اندازہ لگانے میں اسے غلطی ہوئی تھی۔ وہ کوئی تر نوالہ نہیں تھا۔

اس لڑکے نے اب تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور وہ زور زور سے کچھ بول رہا تھا۔ لیکن شالم اس کی آواز پر کان ہی نہ دھرتا تھا۔ موڑ کاٹ کر وہ باہر آیا تو سامنے دو گلیاں تھیں۔ یوں تو وہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا لیکن رہائشی علاقوں کی ان گلیوں کے بارے میں اس کی معلومات ناقص تھیں۔ وہ ایک پل کے لیے ہچکچاہٹ کا شکار ہوا اور پھر نزدیک نظر آنے والی گلی میں گھس گیا۔ گردن گھما کر دیکھنے پر وہ ذلیل آدمی کافی قریب دکھائی دیا۔ وہ اسے بھگا بھگا کر تھکا دے گا اسے دوڑنے کی خاصی مشق تھی۔ وہ لڑکا دراز قد تھا اور اس کے قدم بھی بڑے تھے لیکن رفتار میں شالم کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ گلی دائیں رخ گھوم رہی تھی اور اس کے بعد شاید شاہراہ آنے والی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ میں وہ لڑکا اس کا تعاقب چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس امید نے شالم کے پیروں میں بجلی سی بھر دی۔ لیکن گلی کے خم کے بعد اس نے جو دیکھا، وہ حواس گم کرنے والا منظر تھا۔

گلی کا آخری سرا بند تھا۔

وہ ایک ویران بند گلی میں گھر گیا تھا۔ مزید بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ لڑکا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ایک دم طیش نے شالم کا خون کھولانا شروع کر دیا۔ اسے اپنی خوشی کا دم گھونٹنے والے اس آدمی سے نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے جیب میں انگلیاں گھسا کر وہ نوٹ باہر کھینچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نوٹ کو درمیان سے پھاڑ ڈالا۔

''جہنم میں جاؤ Sanamagan'' (حرامی)

نوٹ کے ٹکڑوں کو ہوا میں اچھالتے ہوئے، اس نے غصے سے چلا کر کہا۔

وہ لڑکا رک کر اپنی سانسیں بحال کر رہا تھا۔ گلی سے باہر نکلنے کے لیے شالم کو اس کے قریب سے گزر کر جانا تھا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ وہ شخص اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا؟ وہ بالکل تنہا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔ شور مچانے پر شاید کوئی اس کی مدد کو آ جاتا لیکن یہ ایک قیاس تھا۔

بے قابو تنفس کے دوران وہ ہکلایا ''peldon sae'' (مجھے افسوس ہے)

✠ ✠ ✠

حکیم بیگم نے گندھی ہوئی مٹی کا لوتھڑا چاک پر رکھا اور مزمل کو بھاگ کر بھیڑ کے قریب جاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ادھ جلی موٹی چھڑی تھی جو اس نے بجھے ہوئے چولہے میں سے نکالی تھی۔ اس کی ماں صالحہ ساتھ والے گاؤں میں ہونے والی ایک شادی کی تقریب میں شریک ہونے گئی تھی اور مزمل اپنی عمر کے تقاضوں کے مطابق کمروں اور صحن میں ننگے پاؤں بھاگتا پھر رہا تھا۔

اس نے چھڑی اپنے سر سے اوپر اٹھائی اور پوری قوت سے بیٹھ کر جگالی کرتی ہوئی بھیڑ کی پیٹھ پر ماری۔ بھیڑ بدک کر اٹھی اور کھونٹے سے دور جانے کے لیے بے چین ہو گئی۔

چھپر تلے بیٹھی حکیم بیگم نے دہائی دی۔

''ناوے پترنا، بھیڈ (بھیڑ) نوں نہ مار۔ تیری میری طرح اس چے وی جان ہے۔ تیری مار نال اس کو پیڑ (درد) ہوتی ہے۔ کھیڑا چھڈ دے (پیچھا چھوڑ دے)۔ ناستا د چاری کو۔ میرے کول (پاس) آ کے بیٹھ، میں تجھے مٹی دے دیوے (دیئے) بنا کے دوں۔ شامی ان میں سروں (سرسوں) دا تیل پا کے (ڈال کے) مسیت دی کندھ تے بال کے رکھیں گے۔ بالکل کوڈی ٹانے (جگنو) ورگے جگمگ کریں گے۔ یہ سوٹی چھڈ دے۔''

مزمل اس کے بہلاووں میں نہ آیا اور چھڑی کو پہلے سے زیادہ بلند اٹھا کر بھیڑ کی پچھلی ٹانگوں پر ضرب لگائی۔

''ہائے وہ پتر! اینج نہ کیتا کر۔ (ایسا نہ کیا کر)۔ پیڑ نال کرلا اٹھی ہے بھیڈ۔ میں تجھے نبی پاکؐ دی گل سناتی ہوں۔ جیہڑی (جو) اک اٹھ (اونٹ) بارے ہے۔ اس دا مالک ظالم تھا۔''

مزمل نے ذرا دیر کو اپنا مشغلہ ترک کیا۔

''ہمارے گھر میں اٹھ کیوں نئیں ہے؟ وہ کوٹھے جتنا اچا (اونچا) ہوتا ہے۔ وہ دھریک کے سارے پتے کھا جائے گا۔''

وہ پھر سے کھونٹے کے گرد چکر کاٹتی ہوئی بھیڑ کے پیچھے چھڑی لہرانے لگا۔ حکیم بیگم نے تھانولے کے پانی میں ہاتھ ڈبو کر چادر سے پونچھے اور اٹھ کر مزمل کی ہاتھ سے چھڑی لے لی۔ وہ رونے لگا تھا، پیر پٹخ پٹخ کر حکیم بیگم کو دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے بدن کا سارا زور لگا رہا تھا۔ وہ بہت غصہ ور اور ضدی تھا۔ حکیم بیگم نے چھڑی کو دور اچھالتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''مجھ پر غصے نہ ہو۔ بھیڈ وی روتی ہے جد (جب) تو مارتا ہے اس نوں۔''

''جھوٹ نہ مار۔'' مزمل نے خود کو چھڑا کر ننھے ہاتھوں سے اسے ایک اور دھکا دیا۔ ''وہ کوئی نئیں روتی۔ اس کے ہنجو (آنسو) کدھر ہیں؟''

حکیم بیگم نے لمبا ہوکا بھرا۔

''تجھے کس آکھیا (کہا) کہ کوئی روئے تے اتھر کیرن دی لوڑ ہوتی ہے (تو آنسو بہانے کی ضرورت ہوتی ہے)۔ کئی

رونے ایسے ہیں جن کو ہنجوؤں کی محتاجگی نئیں ۔''

مزمل کو اس پر اعتبار نہ آیا۔ اپنے رخساروں کو چھو کر وہ بولا۔

''جھوٹی، جھوٹی، ہنجو میرے نکل رہے ہیں۔ روتا تو میں ہوں۔'' اس نے اپنی نم انگلیاں حکیم بیگم کی کلائی سے لگاتے ہوئے ثبوت پیش کیا۔ ''بھیڈ نئیں روتی۔ اس کے ڈیلے سکے ہیں (آنکھیں سوکھی ہیں)۔''

حکیم بیگم اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

''آنکھیں تو میری وی سکی ہیں۔''

مزمل کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ دانت پیستا ہوا بھیڑ کی طرف بھاگا۔ بھیڑ کا کان مٹھی میں جکڑ کر اس نے سر جھکایا اور منہ کھولا۔ وہ اس کے کان میں دانت گاڑنا چاہتا تھا۔ حکیم بیگم نے عجلت میں آگے بڑھ کر بمشکل اسے قابو کیا تھا۔ اب وہ حکیم بیگم کی کلائی پر کاٹنے کے لیے مچلنے لگا۔

''کھنڈ دے سودے، لیلن وی جتیاں تے سکے ٹکراں دے مل (میٹھی سوغاتیں نائیلون کی جوتیوں اور باسی روٹیوں کے عوض)۔ مٹھے لچھے کھالو۔''

پھیری والے کی صدا کانوں میں پڑتے ہی مزمل نے جدوجہد موقوف کردی اور حکیم بیگم سے پیسے مانگنے لگا۔

اسے لچھا خرید کردینے کے بعد وہ چاک کے سامنے آ بیٹھی۔ کچھ دیر تو امن رہا، پھر مزمل نے کبوتروں کی دھابلی پر دھاوا بول دیا۔ سفید لکھیارے کبوتر کو دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبوچے وہ ایک پاؤں پر اچھلتے ہوئے منہ سے بے معنی آوازیں نکالنے لگا۔

حکیم بیگم کی التجاؤں کو جب اس نے قابل غور نہ جانا تو اسے دوبارہ اٹھ کر آنا پڑا۔

''میرا اکڈا (کتنا) سوہنا پتر ہے۔ کبوتر دا ساہ (سانس) نہ بند ہو جائے۔ ملوکڑی جند ہے (نازک جان ہے)۔ گھر ماٹ (پنکھ) ٹٹ جائے گی۔ کھروا ہتھ نہ لا بیبا! (سخت ہاتھ نہ لگا)۔''

حکیم بیگم چند گھڑی کے تعاقب سے ہانپنے لگی تھی۔ اسے آمنہ کی نومولود بیٹی کا خیال آیا۔ آمنہ کے ہاں بیٹی کی پیدائش قبل از وقت ہوئی تھی اور بچی سخت بیمار تھی۔ اس کے پیدا ہوتے ہی ڈاکٹروں نے اسے شیشے کے ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ تو اس کبوتر سے بھی زیادہ نازک تھی۔

''میرے اللہ! اس توں سختی ٹال دے۔ اس نوں حیاتی دے۔ میرے مالک! تیرا فضل چاہی دا اے (چاہیے)۔'' وہ زیر لب دعا مانگنے لگی۔

مزمل کو دروازے کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہ حتی الوسع تیزی سے اس کے تعاقب میں گئی۔ جب تک وہ کبوتر کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو سکی، اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ مزمل کا دھیان بٹانے کو وہ کہنے لگی۔

''چل میں تیرے نال کھیڈتی (کھیلتی) ہوں۔ میں تیری دھون (گردن) تے گل جنڈرہ باندھ کے، تیرے پیروں میں پا بھی پوا کے (پہنا کے) تجھے بابو بنا دیتی ہوں۔ فیر تو انگریزی بولنا تے مجھ پہ رعب ڈال کے کہناں ان پڑھ، بڈھی عورت تجھے شہر والا کوئی سلیقہ نئیں۔ میں لاہور سے آیا ہوں، میں ہوں بابو جنٹر مین (جنٹل مین)۔ اے بڑا سوادی (مزے دار) کھیڈ ہے۔''

مزمل کو یہ تجویز دلچسپ لگی تھی۔ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد آمادگی ظاہر کردی تھی۔

حکیم بیگم نے شنگرفی کناری والا بڑا سفید رومال مزمل کے گلے میں لپیٹ کر مخصوص ڈھب کی گانٹھ دی اور کالے بوٹ اس کے پیروں میں پہناتے ہوئے بولی۔

''گل جنڈرے نال پورا شہر دا بابو لگ رہا ہے۔ میرا عمر وی ایسا ہی سوہنا لگتا تھا۔ جد وہ نکا بال (چھوٹا بچہ) تھا تے اے والا

کھیڈ اس نوں بڑا دل پسند تھا۔ پر ہن (اب) وہ بال نئیں رہا۔ کوئی وی کھیڈ اس کو جہاز چڑھن توں ہٹا نئیں سکدا۔"

اس کے دل کو کسی نے کھارے پانی والے کنوئیں میں ڈبو دیا۔ اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اسے خبر تھی کہ عمر دل سے امریکہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس یہاں سے دور بھاگ رہا تھا۔ وہ لوٹ کر کب آئے گا؟ اس کے جانے سے پہلے ہی حکیم بیگم نے اس کے واپس آنے کا انتظار شروع کر دیا تھا۔

"جے او مڑ کے نہ آیا (اگر وہ نہ لوٹا) جیویں (جیسے) آمنہ تے یوسف نے اوتھے ای وسوں کر لی ہے (وہیں بس گئے ہیں)۔ جے میرا عمر وی اس بگانے ملک دا ہو گیا تے میں...... ربا! مجھے حوصلہ دے، میں بڑی کمزور ہوں۔ تھڑ دلی ہوں۔ میرے دل نوں طاقت دے۔"

چاک گھوم رہا تھا۔ حکیم بیگم نڈولا بنانے کے ارادے سے ہاتھوں کو حرکت دینے لگی۔ مزمل چھپر کی اولتی تلے ٹہل ٹہل کر کسی سکول ماسٹر کی طرح اسے بے مفہوم باتیں سمجھا رہا تھا اور جواباً وہ یوں سر ہلاتی جا رہی تھی جیسے سب سمجھ رہی ہو۔ وہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے بیچ مٹی کی پتلی دیوار کو اوپر اور باہر کی سمت پھیلا رہی تھی۔ پھر اس نے مزمل کو رومال گردن سے نکال کر پھینکتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ اکتا گیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا انار کے بوٹے کے نیچے پہنچا اور اچک کر ایک ڈالی تھام لی۔ وہ اس کے ساتھ لٹک کر جھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وے مزمل! سدائی (سودائی) نہ بن۔ کچی ڈنڈی ہے۔ ٹٹ جائے گی، تجھے سٹ (چوٹ) لگ جائے گی۔ نا میرا سوہنا شہری باؤ! آ مجھ سے وہ سبق سن لے جو تو نے پڑھایا ہے۔"

مزمل کو پچکارتے ہوئے اس کی توجہ تقسیم ہو گئی تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا، کب اس نے برتن کی کگر پر انگوٹھے رکھے اور دونوں ہاتھوں کی چاروں انگلیوں کو ملا کر اندر کی جانب دبا دیا۔ جب اس کا دھیان چاک پر لوٹا تو ایک ٹیڑھے کنارے والی بدوضع کلسی اس کے سامنے تھی۔ وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

وہ تو نڈولا بنا رہی تھی۔ پھر یہ ٹیا کیسے بن گئی اس کی نیت تو کچھ اور تھی۔ جو اس نے بنانا چاہا تھا، وہ کیوں نہیں بنا تھا۔ وہ بے ہنر تھی، مگر بے دھیان تو نہ بنتی۔ اس نے سوچا کہ مزمل کی بھاگ دوڑ سے اس کا ذہن بٹا تھا، اسی لیے یہ چوک ہوئی تھی، لیکن پھر اس نے یہ خیال جھٹک دیا۔ کسی اور کو الزام دینے سے اس کا قصور کم نہیں ہوتا تھا۔

"میرے اللہ! میری ہر تقصیر نوں معاف کر دے۔ مجھ پہ پکڑ نہ کرنا۔ میرے سب قصوراں تے درگزر کر......"



آپا کی سرگرمی سے عمر نے یہی اخذ کیا تھا کہ وہ کہیں جا رہی تھی۔ اس کی بے چینی اور دبا دبا جوش گواہ تھا کہ وہ کوئی وقت ضائع کیے بنا کہیں روانہ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اور شاید یہ ارادہ اچانک ہی باندھا گیا تھا۔ رات کے کھانے پر اور صبح کے ناشتے کے دوران بھی آپا نے اس قسم کا کوئی اشارہ نہ دیا تھا۔ دس منٹ قبل اسے ایک فون موصول ہوا تھا، جسے سن کر اس کے اندر ایک توانائی سی بھر گئی تھی اور وہ عجلت میں اپنے کام نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

عمر نے ناشتے میں استعمال ہونے والے برتن دھوئے، صحن میں جھاڑو دی اور اپنے ان دھلے کپڑے سرف کے محلول میں بھگو کر رکھنے کے بعد کمرے کے دروازے کے قریب کرسی بچھا کر اخبار پڑھنے لگا۔ وہ منتظر تھا کہ آپا اسے اپنی منزل کے بارے میں بتائے گی۔ اچانک جانے کی وجہ بیان کرے گی اور شاید اسے بھی ساتھ چلنے کو کہے گی، لیکن یہ آخری بات قرین از قیاس نہ لگتی تھی۔ اگر وہ اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتی تو اب تک اسے تیار ہونے کی ہدایت کر چکی ہوتی۔ اس کی عجلت زدہ حرکات سے صاف ظاہر تھا

کہ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عمر نے دو، چار بار اسے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کر دیکھی۔ مگر وہ اتنی مگن تھی کہ ہاں، اچھا، نہیں جیسے یک لفظی جوابوں سے زیادہ کچھ نہ بولی اور شاید وہ کہیں دور جا رہی تھی۔ اسے پرانے سفری بیگ پر سے گرد جھاڑتے اور گیلے کپڑے سے صاف کرتے دیکھ کر ایسا ہی تاثر ملتا تھا۔

عمر نے اخبار تہہ کر کے قریب پڑی تپائی پر پھینکا اور پیروں کو چپلوں سے نکالتے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر انگڑائی لی۔ اسے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ آپا سے اپنے امریکہ جانے کے بارے میں بات چھیڑ دے، حالانکہ اس موضوع پر بات کرنے کا یہ کوئی موزوں وقت نہیں تھا، لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ کوئی دوسرا وقت بھی موزوں نہیں تھا۔ اس نے جتنی بار بھی اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی، ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ آپا کسی اور بات یا کسی اچانک یاد آ جانے والے کام کا آسرا لے کر اس موضوع سے کنی کترا جاتی تھی۔

اس نے اتنا بھی نہ پوچھا تھا کہ عمر کا ویزہ کتنی مدت کا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ آپا کو اس معاملے سے کوئی دلچسپی تھی، مگر جانے کیوں وہ اس کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ چاہے وہ مخالفت ہی کرتی یا ناراضی کا اظہار کرتی کہ اسے یہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔

اتنے اہم معاملات کیا اپنی مرضی سے ہی طے کر لیے جاتے ہیں۔ بھلے وہ اتنا ہی کہہ دیتی کہ ''میں تمہارے واپس آنے کا انتظار کروں گی۔'' لیکن وہ تو یوں خاموش تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور یہ وہ خاموشی نہیں تھی جو لوگ ناراض ہونے پر اپنایا کرتے ہیں۔

کئی بار عمر کو لگتا کہ آپا اس کے جانے کے خیال سے مطمئن تھی۔ شاید وہ بے جی کے گھر سے اسے لے کر آنے کے فیصلے پر پچھتاوے کا شکار تھی اور اپنی زبان سے اسے واپس جانے کا کہہ نہیں پاتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو قسمت نے یاوری کی تھی۔ اس کی متوقع امریکہ یاترا نے یہ مسئلہ خود ہی حل کر دیا تھا۔ بھلے آپا کی رائے اور محسوسات عمر کے ارادوں پر کوئی اثر نہ رکھتے ہوں، لیکن وہ حیران تھا کہ وہ آپا کی زبان سے اظہار سننے کا اس قدر خواہش مند کیوں تھا۔''

''آپا!'' اس نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔ ''میرے امریکہ جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔''

''اچھا......تو؟''

کیسا لاتعلق انداز تھا۔ اگر اس نے بازار میں کسی شے کے نرخ بڑھنے کا تذکرہ کیا ہوتا تو بھی یقیناً ''اچھا......تو؟'' سے زیادہ کچھ سننے کو ملتا۔

آپا بستر پر چند ملبوس پھیلائے شاید ان میں سے انتخاب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

عمر کو کچھ اور نہ سوجھا، جب کوئی اپنی ماں پر دنیا کے دوسرے کونے میں جانے کا ارادہ ظاہر کرے اور جواب میں ''اچھا......تو؟'' سنے تو آگے کیا کہا جاتا ہے۔

''کچھ دنوں میں ٹکٹ بھی کنفرم ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' آپا نے ایک سوٹ اٹھا کر ہینگر میں لٹکایا اور دائیں رخ بڑھ کر عمر کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔

اس نے لوہے کی الماری کے پٹ کھلنے اور چند لمحوں بعد بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے آپا کے کمرے کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ آپا کے الماری سے پلٹ کر دوبارہ بستر کے پاس آنے کے وقفے میں وہ خاموش رہا۔ اب وہ باقی بچے ہوئے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر جانچ رہی تھی۔ اس کے انداز میں عدم اطمینان اور ناپسندیدگی تھی۔

''یوسف بھائی اور آمنہ باجی آپ کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ اگر ہو سکے تو آپ ان سے بات کر لیجیے گا۔ میں نے بتایا تھا کہ ان کی بیٹی پری میچور پیدا ہوئی ہے۔ اس کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ شادی کے بیس سال بعد اولاد ہوئی ہے۔''

''میں کرلوں گی بات۔'' آپا نے ایک اور سوٹ کا گولا بنا کر اسے بستر کی پائنتی کی جانب اچھال دیا۔ وہ جھنجلائی ہوئی لگتی تھی۔

عمر کوئی اور فقرہ گھڑنے کی سرتوڑ جدوجہد کررہا تھا۔ خاموشی اس کی بے چینی میں اضافہ کررہی تھی۔

''میں سوچ رہا تھا کہ مجھے وہاں جانے کے لیے کپڑے، جوتے اور جو دوسری چیزیں درکار ہیں، وہ ایک، دو دن میں خرید لاؤں۔ مجھے خود سے خریداری کرنے میں ہمیشہ دشواری ہوتی ہے۔ آپ کے پاس جب وقت ہو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں آپ کو ساتھ لے کر بازار جاؤں گا۔''

آپا نے آخری لباس کو بھی ہاتھ سے پرے ہٹایا اور گویا خود کلامی کی۔

''معلوم نہیں اسلام آباد کا موسم کیسا ہوگا۔ میں تو کبھی وہاں نہیں گئی۔ مری، نتھیا گلی وغیرہ وہاں سے بالکل قریب ہیں اور ان علاقوں میں برف باری کا آغاز ہو چکا ہے۔ عین ممکن ہے، اسلام آباد میں بھی سردی بڑھ گئی ہو۔ میں سردی بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں سن ہو جاتی ہیں۔ پچھلے موسم کے گرم کپڑوں میں سے کوئی ایک بھی اس قابل نہیں کہ اسے پہن کر گھر سے نکلا جائے۔ عمر! تم اس طرح کرو کہ عائشہ درزن کے گھر جا کر میرے سوٹ کا پتا کرو۔ اس نے آج دوپہر کا وعدہ کیا تھا، لیکن شاید سی ہی لیا ہو۔ اسے کہنا کہ ایک گھنٹے تک تیار کر سکتی ہے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ تم نے اس کا گھر تو دیکھ رکھا ہے نا! ساتھ والی گلی میں ہے۔ دروازے کے سامنے بجلی کا کھمبا لگا ہے۔ اگر نہ ملے تو کسی سے پوچھ لینا، جلدی چلے جاؤ۔''

عمر کرسی سے اٹھ گیا، لیکن اس کے قدم وہیں جمے رہے۔ ''آپ اسلام آباد جا رہی ہیں؟''

''ہاں۔ بس کل رات یا زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک واپس آ جاؤں گی۔''

''لیکن آپ اکیلی کیوں جا رہی ہیں۔ میں فارغ ہوں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''میں نے کب کہا، میں اکیلی جا رہی ہوں؟''

''تو؟''

''شوکت صاحب کے ساتھ جاؤں گی۔''

عمر کی پیٹھ پر کسی نے خاردار کوڑا اچھالا تھا۔ جسم کو کاٹتی ہوئی جلن اس کے روم روم میں بھر گئی۔

''کس سلسلے میں؟'' اس نے اتنی اونچی آواز میں پوچھنے کا ارادہ ہرگز نہیں کیا تھا۔

آپا نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''کیا اسکول کا کوئی کام ہے؟ کوئی تفریحی ٹرپ وغیرہ۔'' اپنے لہجے کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے اضافہ کیا تھا۔

''نہیں۔ ایک خالصتاً نجی نوعیت کا کام ہے۔ میں آ کر تمہیں تفصیل بتاؤں گی۔'' اسے لگا کہ ایسا کہتے ہوئے آپا مسکرائی تھی۔

''ابھی بالکل وقت نہیں ہے۔ شوکت صاحب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ تم عائشہ کی طرف چلے جاؤ۔ پہلے چوبارے والا مکان ہے اور دروازے پر بڑی سی تختی لگی ہے عزم الحق عجمی کے نام کی اور سلائی کے پیسے بھی لیتے جاؤ۔''

عمر اپنی جگہ سے ایک قدم نہیں سرکا۔ ''آپ اور شوکت صاحب اکیلے جا رہے ہیں؟''

اس بار آپا کی مسکراہٹ واضح تھی۔ ''جب ہم دونوں اکٹھے جا رہے ہیں تو اکیلے کیسے ہوئے؟'' وہ مذاق بھی کر سکتی تھی۔ عمر کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا۔

''میں یہاں اکیلا کیا کروں گا؟ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں۔تم ساتھ نہیں جاؤ گے، میں کب لمبی مدت کے لیے جا رہی ہوں،صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔'' آپا کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

''تم اب چلے بھی جاؤ۔وہ عائشہ کہیں گھر سے نہ نکل جائے اور تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا مجھے سویٹر اور دستانے ساتھ لے جانے چاہئیں؟ کیا خبر وہاں ٹھنڈ زیادہ ہو، مجھے سردی سے نفرت ہے۔''

✠ ✠ ✠

بھیگے پنکھوں والے راج ہنس جیسا دن تھا۔اجلا، سفید اور سیلا سا۔رات بھر مینہ کا جھکا لگا رہا تھا۔صبح کے قریب آسمان پر سے بادلوں کے آخری ٹکڑے تک غائب ہو گئے تھے اور نتھرا نیلا آسمان کسی تازہ دھلے ہوئے پارچے کی مانند پھیلا تھا۔یہ بارش جاڑے کے آغاز کا پیغام ثابت ہوئی تھی۔ایک رات میں ہی موسم کے تیور بدل گئے تھے۔

خنک ہوا کا جھونکا عمر کے تن سے لپٹ کر گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہ آدھی آستینوں والی قمیص موسم کے نئے چلن کے لیے موزوں نہیں رہی تھی۔اس نے اپنے ماتھے اور پپوٹوں پر انگلیاں پھرائیں۔اسے اپنی جلد غیر معمولی حد تک گرم لگی تھی۔اسے بخار ہو رہا تھا۔حلق کی کڑواہٹ اور سردی کا بڑھا ہوا احساس اس بات کی نشاندہی کرتے تھے۔

وہ کسلمندی سے اٹھ کر آپا کے کمرے میں آیا اور ٹی وی ٹرالی کی دراز میں رکھی ہوئی چھوٹی ڈائری نکال کر وہ نمبر ڈھونڈنے لگا جو آپا جاتے ہوئے کسی ورق پر لکھ گئی تھی۔

نصرت چوہدری، نام کے نیچے اسلام آباد کے ڈائلنگ کوڈ کے ساتھ لکھا ہوا نمبر اسے تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گیا تھا۔وہ شوکت صاحب کے بھائی کی رہائش گاہ کا ٹیلی فون نمبر تھا جو آبپارہ ٹاؤن میں واقع تھی۔اگر آپا ایک اور رات وہاں رہنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی تو اب تک اسے لوٹ آنا چاہیے تھا یا کم از کم واپسی کے لیے روانہ ہو چکی ہوگی۔عمر وہاں ٹیلی فون نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن مزید انتظار اس کے بس کی بات نہ تھی۔

فون کسی لڑکی نے اٹھایا تھا۔

''یہ نصرت چوہدری صاحب کا گھر ہے؟'' عمر نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

''جی۔آپ کون؟''

''شوکت صاحب اور میری آنٹی آپ کے گھر آئی ہوئی ہیں۔کیا وہ ابھی ادھر ہی موجود ہیں۔''

''نہیں۔شوکت چاچو اور ان کے ساتھ آنے والی آنٹی تو کل شام کو ہی چلے گئے تھے۔''

''کل شام کو؟'' عمر نے تھوک نگل کر کہا۔''کیا وہ واپس لاہور چلے گئے ہیں؟''

''نہیں۔وہ مری گئے ہیں۔''

''مری کیوں گئے ہیں۔وہاں تو بہت سردی ہوتی ہے؟'' عمر کو پتا بھی نہ چلا اور اس کی زبان سے پھسل گیا۔

''کیا مطلب؟'' لڑکی کے انداز میں الجھن تھی۔

''وہ کس لیے مری گئے ہیں؟''

''اگر آپ میرے ابو سے بات کرنا چاہتے ہیں تو میں انہیں بلا دیتی ہوں۔آپ کا نام کیا ہے؟''

عمر نے کچھ کہے بنا فون بند کر دیا تھا۔اس کے بدن میں ہونے والا خفیف درد اچانک شدت پکڑ گیا تھا۔اس کے حلق میں ایسا کڑواپن تھا، جیسے اس نے دھتورے کی پھانک نگل لی ہو۔کنپٹیوں میں دھڑکتی ہوئی رگیں اسے کراہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

شام ڈھلنے تک اس کا بخار اتنا تیز ہو چکا تھا کہ نتھنوں میں سے گزرتی ہوئی سانس کھولتی بھاپ ایسی گرم ہو گئی۔ شدید پیاس کے باوجود اس نے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیا۔ اس لیے نہیں کہ بخار کی دی ہوئی نقاہت نے اس سے ہلنے جلنے کی سکت چھین لی تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ پانی پینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب بھی وہ حکیم بیگم سے روٹھ جاتا تھا تو کھانا پینا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اب تو وہ زندگی سے ہی روٹھا ہوا تھا۔

رات جانے کتنی بیتی تھی اور وہ سوتی کھیس میں ٹھٹھر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹتا ہوا آپا کے کمرے تک آیا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ریسیور اتنا ٹھنڈا تھا کہ اسے چھوتے ہوئے عمر کو جھرجھری آ گئی۔

''عمر! میں کل شام تک آ جاؤں گی۔ میں اس وقت مری میں ہوں۔ یہاں مسلسل برف باری ہو رہی ہے۔ میں نے نو بجے والے خبرنامے میں سنا ہے کہ لاہور میں بھی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ کیا وہاں بھی ٹھنڈ ہو گئی ہے؟''

''ہاں ہو گئی ہے۔'' عمر نے بدقت خود کو جواب دینے پر مائل کیا۔ ''آپ کو تو ٹھنڈ سے نفرت ہے۔''

اگر آپا نے سنا تھا تو بھی اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

''مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ سردیوں کا کوئی بھی بستر ابھی تک نہیں نکالا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایک ہی دن میں موسم یک دم تبدیل ہو جائے گا۔ اچھا تم ایسا کرو کہ اسٹور میں پیٹی کے اوپر جو بڑا ٹرنک پڑا ہے اس میں ایک گرم چادر رکھی ہے، تم وہ نکال لو، ٹرنک کے تالے کی چابی سلائی مشین کے گلے میں ہو گی۔''

آپا نے کوئی بھی جواب لیے بنا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''میں سردی بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں سن ہو جاتی ہیں۔''

آپا کی آواز ملگجے اندھیرے میں کسی بھٹکے ہوئے پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہی تھی، جب اسے سردی سے نفرت تھی تو وہ برف باری کے دوران مری کیسے چلی گئی؟ وہ تو سویٹر اور دستانے بھی ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ پھر ایسی ٹھنڈ کو برداشت کرنے کی ہمت اس کے اندر کہاں سے آ گئی؟

کھلے دروازے سے آتی سرد ہوا نے عمر کے نقاہت زدہ جھلستے ہوئے بدن میں پھریری دوڑا دی۔ وہ اتنی بری طرح کانپ رہا تھا کہ اسے سیدھا کھڑا ہونے میں دشواری ہو رہی تھی۔

اس کی پسلیوں میں ہونے والے درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ سردی اور پیاس سے مزید مزاحم ہونا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں آیا اور نل کھول کر پانی کا گھونٹ بھرا۔ اسے لگا کسی نے اس کی چھاتی میں لوہے کی سلاخ سے ضرب لگائی ہو۔ اس نے نل کے نیچے سے منہ ہٹا کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ پگھلی ہوئی برف جیسے پانی نے اس کی سانس الٹادی تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کھڑا ہاتھ سے سینے کو مسلتا رہا، پھر جی کڑا کر کے بہتے ہوئے پانی پر چہرہ جھکایا۔

''تمہاری ماں جب ادھر آئی تو وہ پیٹ گرانا چاہتی تھی۔''

ماسی چھو ماں کے ہونٹوں سے اڑنے والے تمباکو ملے تھوک کے چھینٹے عمر کے منہ پر گرے۔

اس کے کھلے ہونٹوں اور دانتوں سے ٹکرا کر اچھلتی ہوئی پانی کی بوندیں کنکروں کی مانند اس کے چہرے پر گر رہی تھیں۔

پانی پینے کے بعد اس کی کپکپی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ باہر آسمان سے پھر پھوار برسنے لگی تھی۔

''کیا مری میں اس وقت بھی برف باری ہو رہی ہو گی؟''

''خالصتاً نجی نوعیت کا کام ہے۔ جب ہم دونوں جا رہے ہیں تو اکیلے کیسے ہوئے۔'' آپا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

اس نے کبھی آپا کو کھل کر ہنستے نہیں دیکھا تھا، لیکن تصور میں اس کی گونجتی ہوئی ہنسی ایسی وضاحت سے در آئی تھی، جیسے وہ

سینکڑوں بار اس منظر کو دیکھ چکا ہو۔ خود کو بارش سے بچاتے ہوئے حتی المقدور تیزی کے ساتھ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اسٹور بالائی منزل پر تھا اور چھت پر لے جانے والی سیڑھی کے آٹھ قدمچے تھے۔ سیڑھیاں چھت سے ڈھکی ہوئی نہیں تھیں اور یہاں بھی وہ بارش کی دسترس سے محفوظ نہیں تھا۔

''آپا کسی کمرے کی کھڑکی سے برف باری کو دیکھتی ہو گی یا کھلے آسمان تلے گھومتے ہوئے اس تجربے سے گزر رہی ہو گی۔ برف گرتی کیسے ہے؟'' اس نے خود سے پوچھا۔

''دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی صورت یا بھر بھرے سفوف کی طرح، کیا آپا کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں سن ہو گئی ہوں گی؟''

اس نے برف باری کے مناظر صرف ٹیلی ویژن پر دیکھ رکھے تھے، عمر نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

''شوکت کی تو اسے دیکھ کر رال ٹپکتی ہے۔ گھناؤنا کردار ہے۔''

کچھ عرصہ پہلے آپا کے اسکول کے فی میل اسٹاف روم میں دو عورتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو جو اس نے کمرے کے کھلے دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے سنی تھی، اسے یاد آنے لگی، وہ اسے بھولا ہی کب تھا۔ وہ تو بس بھرے زنبور تھے، جو ہر دم اس کے کانوں میں بھنکتے تھے۔ بوندوں سے بچنے کے لیے اس نے تیزی سے اگلا قدم اٹھایا۔ شاید بارش سے بچنا اتنا ضروری نہیں تھا، جتنا ان آوازوں سے بھاگنا۔

''دونوں آفس میں گھسے کھڑکیاں دروازے بند کر کے گھنٹوں کیا کرتے رہتے ہیں۔''

بھڑوں کے زہریلے پروں کی تھرتھراہٹ اس کے کانوں میں گھسی جاتی تھی۔ اس نے تیسرے زینے پر پاؤں دھرا۔

''مجھ سے جب ماسی حنیفاں پوچھتی ہے باجی جی! صفائی ٹھیک ہوئی ہے تو میں کہتی ہوں کیا خاک ٹھیک ہوئی ہے، گند سے تو اسکول بھرا پڑا ہے۔''

چوتھا زینہ اس کے پاؤں تلے آ گیا۔

''ایک بار وہ شوکت سے ملنے اسکول آئی اور بغیر دستک دیے آفس کا دروازہ کھول دیا۔ جانے اندر کیا دیکھا کہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔ یہ موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے بہتے تھے۔''

اس کا پیر پانچویں سیڑھی کو چھو رہا تھا۔

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں، شگفتہ نے اسی وجہ سے زہر پھانک لیا۔''

عمر اتنی سی مشقت سے نڈھال ہو گیا تھا۔ اس نے منوں وزنی پاؤں گھسیٹ کر چھٹے زینے پر رکھا۔

''یہ حرامی ہے۔ اس کی ماں نے منہ کالا کیا، پر اس کا منہ تو گورا ہے۔''

اس کا اسکول ماسٹر نسوار کا بیڑا گال میں دبائے گھٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ جماعت کے سب لڑکوں کو بتا رہا تھا۔

ساتویں زینے پر پاؤں دھرے بنا اس نے آخری قدمچے پر چڑھنے کی کوشش کی۔ اسے زوردار ٹھوکر لگی تھی۔ بمشکل اس نے خود کو گرنے سے بچایا۔

''ایسی ادھلوں کے پیچھے کون آتا ہے۔ عاشق چار دن دل خوش کر کے چھوڑ جاتے ہیں اور وارث ڈھونڈ لیں تو گاٹا اتار دیتے ہیں۔''

ماسی چھوماں کے حقے کی چلم الٹ گئی تھی اور سارے کوئلے اس پر آن گرے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

اسٹور میں گھپ اندھیرا تھا۔اس نے اندازے سے دیوار کوٹٹولتے ہوئے سوئچ تلاش کر کے بلب جلایا۔سلائی مشین، پیٹی کے اوپر ٹرنک کے ساتھ ہی رکھی تھی۔ کچھ تردد کے بعد ٹرنک کی چابی دستیاب ہوگئی تھی۔تالا کھول کر وہ گرم چادر تلاش کرنے لگا۔وہ نئے پرانے کپڑوں کے ساتھ ایک گوشے میں ٹھنسی ہوئی مل گئی تھی۔

چادر نکالنے پر اس کی نظران ویڈیو کیسٹس پر پڑی جو چادر کے نیچے ہونے کے باعث پہلے پوشیدہ تھے۔اس نے ایک کیسٹ کے ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔وہ ایک انگلش فلم تھی اور عنوان سے ہی ظاہر تھا کہ وہ کس نوعیت کی ہوگی۔اس نے ایک ایک کر کے سب کیسٹس کے نام دیکھے تھے۔ان میں سے اکثریت ایکس ریٹڈ (کم سنوں کے دیکھنے کے لیے ناموزوں) فلموں کی تھی۔

اسے وہ دوپہر یاد آئی جب ایسی ہی ایک فلم ڈھونڈنے کی خاطر آپا شام تک لاہور کی سڑکوں پر خوار ہوتی پھری تھی۔ آنکھوں میں ہوتی جلن نمی بن کر اس کی بینائی کو دھندلا رہی تھی۔پلکیں جھپک کر اس نے آنکھوں میں جمع ہونے والے پانی کو بہہ جانے دیا۔

ویڈیو کیسٹس ہٹاتے ہوئے اس کا ہاتھ کسی سرد اور ٹھوس دھات سے ٹکرایا تھا۔انگلیوں سے محسوس کرتے ہوئے عمر نے اس شے کو باہر نکال لیا۔وہ کانچ سے بنی ہوئی ایک شش پہلو صندوقچی تھی، جس میں کچھ سامان تھا۔صندوقچی کے اوپر ایک خط کا لفافہ رکھا تھا جو صندوقچی کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔اس نے وہ لفافہ صندوقچی کی چھت سے علیحدہ کیا تو کانچ پر لکھے ہوئے حروف اس کی نظروں کی زد میں آ گئے۔

''سنو وائٹ، جو ایک بادشاہ کی بیٹی تھی۔''

عمر نے بلوریں ڈبیہ ایک طرف رکھ دی اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔لفافے پر ایک پتا درج تھا اور اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔اس نے اندر ہاتھ ڈال کر تہہ شدہ کاغذ باہر کھینچ لیا۔کاغذ کی تہیں کھول کر وہ تحریر پر نظر دوڑانے لگا۔وہ آپا کا تحریر کردہ خط تھا، لیکن عمر کو جو امید دکھائی دی تھی کہ وہ اس کے باپ کے نام لکھا گیا ہوگا، باطل ثابت ہوئی تھی۔خط کا مخاطب کوئی اور شخص تھا اور آپا کا اس سے گہرا ربط تھا۔خط کا مضمون اس بات کا گواہ تھا۔

''مجھے بات کس طرح شروع کرنی چاہیے۔میں نہیں جانتی، اپنے مکروہ جرموں کا احوال بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ کے چناؤ میں تھوڑی بہت دقت ہونا تو قدرتی سی بات ہے۔

میں تم سے یا کسی اور سے معافی نہیں مانگوں گی۔ معافی میرا علاج ہرگز نہیں ہے، میرا مرض جس نوعیت کا ہے، اس میں دھتکار، گالیوں اور بددعاؤں سے ہی راحت ملتی ہے۔اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو میرے لیے بددعا کرنا۔ مجھے ہر اس برے نام سے پکارنا جو تمہارے علم میں ہو اور میری ماں سے کہنا وہ بھی ایسا ہی کرے۔

اگر تمہیں یہ جان کر کچھ تسکین محسوس ہو تو میں بتا دیتی ہوں کہ جس شخص کے لیے میں نے تم لوگوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔اس نے میرے منہ پر تھوک دیا،نہیں تھوکا نہیں تھا، مجھے ایسا لگا تھا کہ میرے منہ پر تھوکا گیا ہے۔ مجھے لمحہ بھر بھی اس کا ساتھ نہیں ملا۔ مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ میرا باپ مر چکا ہے۔ظاہر ہے میں ہی تو اس کی موت ہوں۔ مجھے کیوں معلوم نہیں ہوگا۔

جس رات میں نے گھر چھوڑا، شاید مجھے لکھنا چاہیے کہ گھر سے بھاگی، لیکن میں ابھی تک اپنے لیے ہمدردی رکھتی ہوں۔ کیا کروں برے لفظ خود سے جوڑتے ہوئے شرم آتی ہے۔تم میری اس ریاکاری کو برداشت کرنے کی کوشش کرنا۔ ہاں تو اس رات میں اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کا گلا گھونٹ کر نکلی تھی، پھر بھی تصدیق کی خاطر میں کچھ عرصہ بعد اپنے محلے میں گئی تھی اور میں منہ چھپا کر گئی تھی۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ میری شکل اب بھی اس لائق ہے کہ وہ کسی کو دکھائی جا سکے؟ تم ہمیشہ کہتے تھے کہ میں بڑی خوب صورت

ہوں۔ میری آنکھیں ایسی ہیں، میرے ہونٹ ویسے ہیں، میری رنگت، میری ناک، میرے بال، میری گردن، تم تعریف کرنے لگتے تو تمہیں رکنا ہی بھول جاتا تھا۔

تمہیں سن کر مجھے لگتا کہ تم مبالغہ کر رہے ہو، لیکن مجھے اچھا لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تم بولتے ہی جاؤ، مجھے سراہتے ہی رہو۔

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں اب آئینہ دیکھتی ہوں تو گھن آتی ہے، میں نے اتنا بھیانک چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ میں بتا رہی تھی کہ میں چہرہ ڈھانپ کر اپنے محلے میں گئی تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ میرا باپ سچ مچ مر گیا ہے اور میری ماں وہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔

وہ شاید دانیال ماموں کے گھر گئی ہوں گی یا پھر تایا ابو کے گاؤں، وہ جہاں بھی ہیں، میں کبھی ان کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ اگر ہو سکے تو مجھے اتنا بتا دینا کہ کیا وہ زندہ ہیں اور مجھے ڈھونڈنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ گندگی دبی رہے تو اچھا ہے۔ اسے کرید کر نکالیں تو تعفن کے سوا کیا ملے گا؟

میں یہ خط تمہیں کسی دوسرے شہر سے پوسٹ کروں گی۔ اور جانے پوسٹ کروں گی بھی یا نہیں۔ اگر میں یہ خط تمہیں بھیج پائی تو بعد میں کبھی فون کروں گی۔

پہلے خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ فون پر ان میں سے کوئی بھی بات میری زبان سے ادا نہ ہو سکے گی۔ میں کچھ اور بھی لکھنا چاہتی ہوں، لیکن کیا؟ مجھے سمجھ نہیں آتا۔''

ان چند سطروں کے بعد باقی ورق خالی تھا۔ ایک کونے میں لکھی ہوئی تاریخ دس سال پہلے کی تھی۔ عمر نے کاغذ کو دوبارہ تہہ لگائی اور کچھ سوچ کر لفافے سمیت اس خط کو ٹراؤزر کی جیب میں ڈال لیا۔

پھر وہ اس کانچ کے ڈبے کی طرف متوجہ ہوا، اس کا ڈھکن کھولنے پر ایک مانوس بو ناک سے ٹکرائی۔ ایسی بو جیسی مزاروں پر یا قبرستانوں میں آیا کرتی ہے۔ باسی پھولوں کی بو، جس میں مرنے والوں کی موت کا غم اور یاسیت رچی ہوتی ہے۔ ایک پھولا ہوا زرد لفافہ جس کی لمبائی ڈبے کی بالشت بھر طوالت سے زیادہ تھی، توڑ مروڑ کر اندر گھسیڑ اگیا تھا۔ عمر نے وہ پلندہ کھینچتے ہوئے ڈبے سے جدا کیا تو اسے زرد لفافے کے نیچے ایک ریشمی پارچے میں لپٹی کچھ پتیاں اور تنکے دکھائی دیے جو چھونے پر راکھ کی طرح بکھر گئے تھے۔ یقیناً ان ہی کی موجودگی نے بند ڈبے کو اس باس سے معمور کر رکھا تھا۔ اس نے زرد لفافے کے اندر بھرے ہوئے کاغذات باہر نکال لیے۔ کچھ لمحوں کے لیے اسے اعتبار ہی نہ آیا کہ وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بنا دیکھتا رہا۔ وہ کسی بت کی مانند ساکت کھڑا تھا۔ جانے اور کتنی دیر وہ اس جگہ سے ہل نہ پاتا، اگر باہر چھت سے آنے والی بلی کی تیز غراہٹ اسے چونکا نہ دیتی۔ شاید دو بلیاں آپس میں لڑ رہی تھیں اور ان کے اچانک غرانے کی آواز نے عمر کو ڈرا دیا تھا۔ جسم کو لگنے والے خفیف جھٹکے کو وہ روک نہیں پایا تھا۔ دیواروں پر سرسراتی نم آلود ہوا کے ساتھ اسے اپنے سانس لینے کی اونچی آواز سنائی دیتی تھی۔

اس نے وہ پورنوگرافک رسالہ واپس لفافے میں ڈالا اور لفافے کو شیشے کی صندوقچی میں بند کرنے کے بعد ٹرنک میں اس کی سابقہ جگہ پر رکھ دیا۔ اس کی پسلیوں کو جیسے کسی گیلی رسی سے کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ درد کی ٹیس اٹھتی تھی۔ مزید کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ سوکھے پتے کی طرح کانپتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

کیا یہ ہی وہ قیامت تھی جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا۔ ہر کسی کی اپنی اپنی قیامت ہوتی ہے۔ جب گھاس کے تنکے پر بارش کی ایک بوند گرتی ہے تو تنکے پر بیٹھی ہوئی چیونٹی یہ ہی سمجھتی ہو گی کہ کائنات فنا ہونے لگی ہے۔ وہ ایک بوند اس چیونٹی کی قیامت ہوتی ہے۔

نتھنوں سے پھیپھڑوں میں پہنچنے والی ہوا اسے ناکافی لگ رہی تھی۔ وہ منہ کھول کر لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔

اس کے پیٹ کے نچلے حصے سے کوئی بھاری بدمزہ شے اٹھی اور اس کی چھاتی میں ٹھہر گئی۔ اس شے میں درد تھا اور گھٹن۔ اس

کا سانس بند ہونے لگا۔ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر اس اٹکی ہوئی شے کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ وہ دردناک شے کلبلاتی ہوئی اس کے حلق کی جانب بڑھی۔ اس کا ذائقہ بے حد کڑوا تھا۔ عمر نے تھوک نگلنے کے لیے گھونٹ بھرا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے بہت اذیت ہوئی تھی۔ اس شے نے ساری راہیں مسدود کر دی تھیں اور وہ باہر نہ آتی تھی۔ اس کے گلے میں پنجے گاڑ کر جم گئی تھی۔ اس کا نچلا جبڑا بے اختیار کانپنے لگا۔ اس کی حرکت روکنے کی خاطر عمر نے منہ بند کرنا چاہا مگر گھٹتی ہوئی سانس نے اسے پھر سے منہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا؟ جب میرے ہونے سے اس دنیا میں کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تو میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جاتا۔ جب میری ماں......''

اس عورت کے لیے وہ لفظ استعمال کرتے ہوئے عمر کے دل میں ایسی کراہت پیدا ہوئی کہ وہ خود بھی اس کی شدت پر حیران رہ گیا۔

''جب وہ میری پیدائش سے پہلے مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی تو، تو نے بے جی کے دل میں یہ بات کیوں نہ ڈالی کہ وہ اس کی مرضی مان جاتی۔ تو نے میرے لیے اتنی تکلیف بھری زندگی کیوں منتخب کی؟ تیرے قہر کو بلانے کے لیے میں نے کیا کیا؟ میں نے کیا خطا کی۔ جس پر تو اتنا ناراض ہے۔ میں نے تیری رضا کے لیے، تیری خوشی کی خاطر وہ سب کیا جو میرے بس میں تھا، تیری ناراضی سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہا، پھر میری کس غلطی پر تو روٹھ گیا ہے؟ تو نے میرے لیے ایسی ذلت کو کیوں چنا؟ تو نے اس عورت کو میری ماں کا درجہ دیا جو اپنے منہ زور نفس کے ہاتھوں پاگل ہو رہی ہے اور اپنے پاگل پن میں مجھے اتنی چوٹ پہنچا رہی ہے جو میری برداشت سے باہر ہے۔ تو مجھے یتیم پیدا کر دیتا، پر دنیا میں بے عزت نہ کرتا۔ تو نے مجھے کوڑے کا ڈھیر بنا دیا جس پر غلاظت پھینکنا سب کا حق ہوتا ہے۔''

درد کے خمیر سے بنی وہ مہیب شے گلے کی رگوں کے گرد پھندہ کسے ہوئے تھی۔

سانس لینے میں دقت کے باعث اس کے تالو اور زبان میں اکڑن پیدا ہو گئی تھی۔

''تیری رضا کیا ہے؟ تیری چاہت مجھے سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میرے اللہ! یہ حواس چھین لینے والا درد ہے۔ یہ مجھے یوں کاٹتا ہے جیسے کسی رستے ہوئے زخم میں کیڑے پڑ گئے ہوں۔ اس کو سہہ جانے کی ہمت میں کہاں سے لاؤں؟ مجھ پر رحم کر، میں اس درد سے عاجز ہوں، مجھے نجات دے۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔ اس نے بازو لمبا کر کے پٹی کے کنارے سے لٹکی ہوئی اونی چادر گھسیٹ کر خود کو اس سے ڈھانپ لیا اور وہیں فرش پر بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے گھٹنوں پر سر گرا دیا۔

کسی کے قدموں کی چاپ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ شاید آپا واپس آ گئی تھی۔ اس نے چہرے پر سے چادر ہٹا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ دن کی روشنی در و دیوار پر قابض ہو چکی تھی۔ اتنا وقت اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں گزارا تھا۔ آنے والی سسٹر سوزین تھی اور دروازے کے بیچ کھڑی آنکھوں میں حیرانی سموئے اسے دیکھ رہی تھی۔

''عمر! تم کب سے یہاں ہو؟ کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، تم یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

وہ خاموش رہا اور فرش پر ہتھیلیاں جماتے ہوئے اٹھ کر اپنے کپڑوں اور چادر پر لگی گرد جھاڑنے لگا۔ اس کا جسم اب بھی دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور شاید سسٹر سوزین نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ وہ تیزی سے آگے آتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''تمہاری آنٹی کہاں ہیں؟ میں ان ہی سے ملنے آئی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور دستک کا کوئی جواب بھی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے میں پریشان ہو کر خود ہی اندر آ گئی۔ سارا گھر خالی اور سب دروازے چوپٹ دیکھ کر میرا تو سر چکرانے لگا تھا۔ مایوس ہو کر میں لوٹنے ہی

والی تھی کہ مجھے سیڑھیوں کے اوپر اسٹور کا دروازہ کھلا ہوا نظر آ گیا۔ تم نے دروازہ کیوں کھلا چھوڑا بیٹا! یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''میرے پاس ایسا کیا ہے جس کے کھو جانے کا ڈر ہو۔''

اس کی تلخ بڑبڑاہٹ پر سسٹر سوزین نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔ کیسا اترا ہوا چہرہ ہے۔'' نزدیک آ کر اس نے عمر کی پیشانی چھوئی اور پریشان ہوگئی۔

''کتنا تیز بخار ہے تمہیں، جسم جل رہا ہے، تم کیوں اس طرح فرش پر بیٹھے تھے، کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''کوئی جاننے کے لائق بات نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سسٹر سوزین اسے سہارا دیتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب لے جانے لگی۔

''بس رات کو مجھے ٹھنڈ لگی تو میں گرم بستر ڈھونڈنے کی خاطر اسٹور میں آیا اور یہاں مجھے چکر آ گیا یا شاید پاؤں پھسل گیا تھا، ٹھیک سے یاد نہیں۔''

''اور تمہاری آنٹی کہاں ہیں؟''

عمر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

'جاتے ہوئے یہ دروازہ بند کر کے جایئے گا۔ مجھے روشنی اچھی نہیں لگ رہی۔''

''اگر تم خود چل کر کلینک تک نہیں جا سکتے تو میں ڈاکٹر کو یہاں بلا لیتی ہوں۔ اور ناشتے میں کیا لو گے۔ جو بھی جی چاہ رہا ہو مجھے بتا دو، میں بنا دوں گی۔''

عمر نے آنکھیں نہیں کھولیں اور کروٹ بدل لی۔

''مجھے ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بخار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ چلی جائیں، میں ٹھیک ہوں۔''

اور وہ صحیح کہہ رہا تھا، وہ بخار نہیں تھا جو اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔

اس کے لاکھ انکار کرنے پر بھی سسٹر سوزین، ڈاکٹر کو بلا لائی تھی اور اس کے لیے ناشتا تیار کرنے کے بعد گئی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد عمر آہستگی سے اٹھا اور چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھا خلا میں گھورتا رہا اور پھر وہ سب باتیں اسے پوری شدت سے یاد آنے لگیں جنہیں بھول جانے سے بڑی راحت دنیا میں کوئی نہیں تھی۔ وہ کون سا منتر تھا جسے پھونک کر ان سب یادوں کو جلایا جا سکتا تھا۔ کاش سنگسار ہونے والے کو معلوم ہوتا کہ کس اسم کو پڑھنے سے پتھر مارنے والے ہاتھ رک جائیں گے۔ مگر سنگسار ہونے والے کی زبان میں ہلنے کی طاقت ہی کہاں ہوتی ہے۔

کچھ جذبے اس کے دل میں سینده لگا کر در آئے تھے اور سینده لگا کر آنے والے کی نیت کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ وہ دکھتے ہوئے سر کے ساتھ بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھ کر گھر میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

باورچی خانے میں سے ایک استعمال شدہ پلاسٹک کا گیلن مل گیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چل کر بازار گیا اور گیلن میں پیٹرول بھروا کر واپس آیا، اب اسے آپا کے لوٹنے کا انتظار تھا۔

آسمان کی کوکھ سے اجالے کا جنم ہوئے ابھی زیادہ سمے نہ بیتا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیاں نیند بھری آنکھیں تھیں، جواب تک مندی ہوئی تھیں۔ ان بند آنکھوں کے پیچھے مکین اب تک بستروں کے گداز میں دھنسے ہوئے تھے۔ ان آسودہ بدنوں میں نیند کسی کیف آور مشروب کی مانند گھلی ہوئی تھی۔

سرمئی سنگریزوں سے گندھی سڑک ابھی انسانی قدموں اور گاڑیوں کے پہیوں کی آہٹوں سے دامن بچائے سکوت کے ان لمحات سے تلذذ اٹھا رہی تھی، جو اسے بہت کم میسر آتے تھے۔ وہ کسی بے شکن سرمئی قالین کی طرح بچھی تھی۔ اور ان خوابیدہ گھڑیوں میں میگنولیا کے فلک بوس پیڑ تلے پراگندہ حلیے والا ایک بوڑھا شخص سر نیہوڑائے کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ حقیقت میں اس کی عمر پچاس کے قریب تھی مگر ظاہری ہیئت کی بنا پر اندازہ لگایا جاتا تو وہ ستر یا اسی سال کا بھی نظر آ سکتا تھا۔

وقت سب کو ایک طرز پر نہیں برتتا۔ کسی کو تو وہ ہتھیلی پر بٹھا کر سفر کی منازل طے کرا دیتا ہے اور کچھ کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا، زندگی کی شاہراہ پر گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے۔ اس بوڑھے کا شمار دوسری قسم کے لوگوں میں تھا۔

وقت نے اسے پامال کیا تھا اور جی بھر کر کیا تھا۔ اس کی کھال پر جھریوں کی تعداد تو اتنی زیادہ نہیں تھی، مگر چمگادڑ کے مہیب پروں جیسے سائے جن کی تاریکی نے اس کی آنکھوں اور چہرے کو دھندلا رکھا تھا، اسے بے حد بوڑھا دکھاتے تھے۔

اس کا نام ایڈم گرانٹ تھا اور غنیمت تھا کہ اس وقت اسے اپنا نام یاد تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ بہت سی چیزیں بھولنے لگا تھا، جیسے گزشتہ روز یا شاید اس سے پچھلے دن وہ اپنا گھر بھول گیا تھا اور کئی گھنٹے فٹ پاتھ پر کھڑا راہ گیروں اور گزرتی ہوئی گاڑیوں کو امید بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا کہ شاید کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے جائے تو اس سے معلوم کرے کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ وہ گھر جس میں وہ پچھلے انیس بیس سالوں سے رہتا آ رہا تھا۔ اس کا پتا اسے کیسے بھول گیا تھا؟ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو اس کی بے بسی اور خوف آخری حد سے تجاوز کرنے لگے۔ وہ ایک ہی جگہ پر ٹھہرا انہونی کی دہشت سے کانپ رہا تھا۔ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس ڈر سے کہ کسی بالکل ہی اجنبی علاقے میں نہ جا نکلے۔

اپنے قیام کی جگہ کے بارے میں کم از کم اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ پہلے بھی وہاں آتا رہا تھا۔ وہ راستہ اور گرد و پیش کے مناظر اسے دیکھے بھالے محسوس ہوتے تھے۔

اس نے ایک، دو لوگوں کو روک کر ان سے دریافت کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن وہ شاید اسے پاگل سمجھے تھے، تب ہی کوئی توجہ دیے بنا چلے گئے تھے۔ اس نے ایک جانے پہچانے مکان کے دروازے پر دستک بھی دی تھی، مگر دس منٹ تک کال بیل بجانے کے بعد اس کا دھیان اس تشہیری بورڈ کی جانب مبذول ہوا، جس پر لکھا تھا کہ وہ مکان برائے فروخت تھا۔ وہ واپس اسی جگہ جا کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا کہ اس کی نگاہ بائیک چلاتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے پر پڑی۔ اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ جس سے اس کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود گرانٹ نے اس کے گزر جانے سے قبل اسے پہچان لیا تھا۔ وہ مارک تھا جو اس کے گھر سے چند گلیاں چھوڑ کر رہائش پذیر تھا اور کبھی کبھار سر راہ ان کے

درمیان چھوٹے موٹے رسمی فقروں کا تبادلہ ہو جایا کرتا تھا۔ گرانٹ نے چیخ کر اسے رکنے پر مجبور کیا اور اس کے قریب جاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔

''مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں کہاں رہتا ہوں، مجھے میرے گھر پہنچا دو۔''

مارک نے پہلے تو اس کی بات کو مذاق سمجھا تھا، پھر اس کی بے چارگی کو محسوس کر کے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، لیکن اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ تو کر سکتے تھے، کیا تم اسے بھی کہیں بھول آئے ہو؟''

مارک کے کہنے پر گرانٹ کو جھٹکا لگا تھا۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ اس کا سیل فون اس کی جیب میں موجود تھا، لیکن ایک بار بھی اسے اس کا خیال نہیں آیا تھا، اور بھی کئی طریقے تھے جن سے وہ با آسانی اپنا گھر ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس کے شناختی کاغذات اس کے پاس تھے۔ ان پر لکھا ہوا پتا وہ پڑھ سکتا تھا اور اگر کاغذات نہ بھی ہوتے تو وہ کسی پولیس والے کو اپنا نام، تاریخ پیدائش اور سوشل سیکورٹی نمبر وغیرہ بتا کر یہ مسئلہ حل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ سب اسے اب سجھائی دے رہا تھا۔ جب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے کچھ روز پہلے کا قصہ تھا کہ وہ فلم کے سیٹ پر کچھ بھول گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے بہت تذلیل کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن وہ کیا بھولا، تھا اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک ایکسٹرا تھا۔ ڈیڑھ، دو گھنٹے دورانیے کی فلم میں لمحہ بھر یا اس سے کچھ زیادہ وقت کے لیے کیمرے کی آنکھ اسے پردے پر مرتسم کر دیتی تھی۔ کبھی کانفرنس میز پر بیٹھا ہوا ایک ڈاکٹر، کسی آفس کی لابی پار کرتا ہوا ایک بزنس مین۔ یا فلم کے کسی ایکٹر کے پیچھے جہاز سے اترتا ہوا مسافر۔ کبھی وہ فٹ بال اسٹیڈیم میں ہونے والی گریجویشن کی تقریب میں شریک سو لوگوں میں سے ایک ہوتا تو کبھی تھیٹر میں بیٹھے ہوئے پانچ سو سے زائد لوگوں کے مجمع میں نظر آتا اور بعض اوقات تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔

وہ کئی سالوں سے ہالی ووڈ میں اسی حیثیت سے کام کرتا آ رہا تھا۔ اسی غیر مستقل آمدنی پر اس کی گزر اوقات ہو رہی تھی۔ وہ اس کام سے متنفر تھا، مگر اسے کیے چلے جانے پر مجبور تھا۔

جب وہ اسپرنگ فیلڈ سے ہالی ووڈ آیا تھا تو اس کی آنکھیں خوابوں سے بھری تھیں اور بدن کمان کی تانت سا تنا ہوا تھا۔ اب اتنے سال لاحاصل جہد کی نذر کرنے کے بعد اس کے جسم کے کسی عضو میں موزونیت باقی نہ رہی تھی اور بینائی دھندلانے لگی تھی۔ وہ آئینہ دیکھنے سے حتی المقدور گریز کرتا تھا اور جو شخص آئینہ دیکھنے سے کتراتا ہو، وہ خواب نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی نیندوں میں کابوس ہوتے ہیں۔ گرانٹ کی زندگی بھی ایک غیر مختتم ڈراؤنا خواب تھی۔

میگنولیا کی شاخ سے جدا ہو کر ایک بڑا سفید پھول۔

پٹ سے سڑک پر گرا، جیسے کوئی تارا آسمان سے ٹوٹا ہو۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ سورج کی اولین کرنیں درختوں کی اوپری شاخوں کو نرمی سے چوم رہی تھیں اور پتوں میں سے چھن کر آتی روشنی سفید اور ٹھنڈی تھی۔ وہ ایک بے حد اجلی صبح تھی۔ عموماً اس وقت وہ سو رہا ہوتا تھا۔ آج جانے کیسے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اپنے کمرے کی گھٹن زدہ فضا سے گھبرا کر باہر سڑک پر نکل آیا تھا۔ روشنی اب درختوں کے تنوں سے نیچے رینگ رہی تھی اور اس کے شکن آلود لباس پر روشنی کی آڑی ترچھی لکیریں بننے مٹنے لگی تھیں۔ اس نے گردن اٹھا کر میگنولیا کی اونچی ڈالیوں پر کھلے ہوئے دودھیا سفید شگوفوں اور ان پر اترتے ہوئے ملائم اجالے کو دیکھا۔ روشنی کی شعاعیں اس کے پپوٹوں سے پھسل کر آنکھوں کی پتلیوں میں گھسنے لگیں تو اس نے آنکھیں نیم وا کر لیں۔ اسی عالم میں اسے سڑک کے پار مرغول دار چھجوں والے مکان کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی کا پردہ ہٹتا ہوا دکھائی دیا۔ کالے بالوں والی نوخیز لڑکی کی محض ایک جھلک آنکھوں تک آئی تھی، پھر وہ نظر سے اوجھل ہو گئی۔ گرانٹ کچھ دیر تک بند کھڑکی کو بلا مقصد تکتا رہا تھا۔ پھر اس کا دھیان چمکیلی نورانی صبح

کی جانب لوٹا۔اسے بڑی شدت سے کوئی یاد آیا تھا۔اس صبح اور اس لڑکی میں ایسی مماثلت تھی جیسی دو توام بہنوں میں ہوتی ہے۔اس کا تن بھی اس صبح کی طرح اجلا تھا۔وہ چاند کے نور سے بنی ہوئی مورت تھی۔کاش وہ اسے بھی بھول گیا ہوتا جیسے وہ کئی دوسری باتیں بھول جاتا تھا۔لیکن وہ تو آنکھ میں پڑ جانے والا ریت کا ذرہ تھی جو نمی سے گھلتا نہیں اور جتنی بار آنکھ ملو، پہلے سے بڑھ کر دردناک ہوتا چلا جاتا ہے، جو بے چین رکھتا ہے اور جس کی اذیت بھلائے نہیں بھولتی۔اس کا خیال آنے پر گرانٹ کے اندر ایک ٹیس اٹھی تھی جو رگوں کو کاٹتی ہوئی سارے بدن میں پھیل گئی تھی۔

وہ بوجھل قدموں سے چل کر اپنے گھر میں لوٹ آیا تھا۔اسے اس لڑکی کے نام خط لکھنا تھا۔وہ کئی سالوں سے خطوط لکھتا آ رہا تھا۔اسے کسی ایک خط کا بھی جواب نہیں ملا تھا اور شاید کوئی ایک خط بھی اس تک پہنچ نہ پایا ہو، لیکن اس کے باوجود وہ رکے بغیر، اکتائے بغیر خط لکھے چلا جاتا تھا۔اپنے کمرے میں آ کر اس نے رائٹنگ ٹیبل کی اوپر والی دراز باہر کھینچی، لیٹر پیڈ، قلم اور ایک ضخیم لغت نکالی اور خاصی دیر سوچتے رہنے کے بعد خط کا آغاز کیا۔اس نے ذہن میں جو فقرہ منتخب کیا تھا اس کے ایک، ایک لفظ کا ترجمہ لغت میں تلاش کرنے اور اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں اسے کم و بیش دس منٹ لگے تھے۔

خط کو وہ جس زبان میں تحریر کر رہا تھا، کئی سالوں کی مشق کے بعد بھی وہ اسے روانی سے لکھنے پر قادر نہیں ہو پایا تھا۔

بعض اوقات ایک خط لکھنے میں کئی گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔خاص طور پر ابتدائی دنوں میں اسے بہت دقت ہوا کرتی تھی۔کچھ الفاظ جو وہ لکھنا چاہتا تھا، ان کے متبادل اس دوسری زبان میں ملتے ہی نہ تھے اور وہ جھنجلا جایا کرتا تھا۔اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ایک جملہ لکھتے ہوئے وہ بیچ میں اٹک گیا تھا۔ایک لفظ کا ترجمہ وہ ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔یا تو وہ اس زبان میں موجود ہی نہیں تھا یا اگر تھا تو اس لغت میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

لغت کے اوراق کو بے بسی سے الٹتے پلٹتے ہوئے اسے اپنی دائیں بغل میں درد کا احساس ہوا۔قمیص کے اوپری دو بٹن کھول کر اس نے بازو اٹھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بغل کی جلد کو ٹٹولا اور ایک ابھری ہوئی جگہ کو انگلیوں سے دبایا۔جلتے ہوئے درد نے اس کے اعصاب کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔اس نے قمیص کے بٹن بند کیے اور ایک کورا کاغذ لے کر خط کو نئے سرے سے لکھنے لگا۔

کچھ مدت قبل اگر اسے بغل میں ایسے درد آلود ابھار کے وجود کا علم ہوتا تو وہ ڈر اور تجسس میں مبتلا ہو کر اس کی تحقیق میں پڑ جاتا۔لیکن اس وقت اسے محسوس کر کے گرانٹ کو ڈر ضرور لگا تھا۔مگر تجسس ہرگز پیدا نہیں ہوا تھا۔ایسے ہی گھناؤنے چھالے اس کے بدن کے کئی حصوں پر تیزی سے نمودار ہو رہے تھے۔اس کا نچلا دھڑ تو ان نیلگوں سرخ آبلوں سے اس حد تک پر ہو چکا تھا کہ وہ نہاتے ہوئے صرف اس لیے آنکھیں بند رکھتا تھا کہ اسے اپنی ٹانگیں نہ دیکھنی پڑیں۔عام طور پر ان میں درد نہیں ہوتا تھا البتہ کبھی کبھار اتفاقاً دباؤ پڑنے سے یا کسی ٹھوس سطح کے ساتھ رگڑ کھانے پر ان میں دکھن ہونے لگتی تھی۔چند روز پہلے اس نے اپنے کان پر ویسا ہی آبلہ دیکھا تھا اور اسی رات کو گردن کی پشت پر بھی اسے محسوس کیا تھا۔اگر وہ اس کے چہرے پر بننے لگے تو کیا ہوگا؟ گرانٹ ان سے بے حد خوفزدہ تھا۔کئی بار اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے ارادے باندھے تھے مگر جانے کیوں ہر دفعہ ذہن سے محو ہو جاتا تھا۔اس کا ایک دوست، جس سے اس کی ملاقات ہوئے دو، تین سال بیت چکے تھے، بے حد اچھا ڈاکٹر تھا۔اور گرانٹ سوچ رہا تھا کہ آج شام کو اس سے ملنے ضرور جائے گا۔بھول جانے کے ڈر سے اس نے ایک نوٹ لکھا اور میز پر رکھ دیا۔اس کا ارادہ تھا کہ خط مکمل کرنے کے بعد وہ اسے کمرے کے دروازے پر چسپاں کر دے گا، تاکہ نظر پڑنے پر یاد دہانی ہو جائے۔پھر وہ لکھنے میں مگن ہو گیا۔ایک گھنٹے بعد اس نے اختتامی جملہ تحریر کیا اور کاغذ کو تہہ کر کے دراز میں رکھتے ہوئے دراز بند کر دی۔ابھی اسے خط میں رکھنے کے لیے کوئی پھول بھی چننا تھا۔

میز کے کنارے پر ایک اور کاغذ بھی دھرا تھا جس میں کسی ڈاکٹر کا نام لکھا تھا۔اور نیچے ایک مختصر جملہ تھا۔''آج شام کو ملنا ہے'' وہ اس کی اپنی تحریر تھی۔لیکن اس نے کب لکھا تھا اور لکھنے کا مقصد کیا تھا۔ذہن پر بہت زور دینے کے بعد بھی اسے یاد نہ آ سکا۔

تنگ آ کر اس نے وہ کاغذ ایک طرف اچھال دیا۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کے حلق یا شاید تالو میں کوئی شے پھٹ گئی ہو۔ اس کے منہ میں کسیلے ذائقے والا سیال بھرنے لگا۔ بدحواس ہو کر اس نے منہ کھول دیا اور سر کو فرش کی جانب جھکا دیا۔ اس کی ٹھوڑی پر سے بہتا ہوا مائع بوند بوند فرش پر ٹپکنے لگا۔ کچھ مواد اس کی گردن پر بھی رینگ گیا تھا۔ وہ تھوک ملے خون کو فرش پر رینگتے اور ایک دائرے میں جمع ہوتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر باتھ روم میں آئینے کے سامنے پہنچ گیا۔ غالباً اس کے منہ میں کوئی زخم تھا جو ٹھیس لگنے پر رسنے لگا تھا۔ خاصی دیر جبڑے کھول کر آئینے میں کھوجنے پر بھی اسے خون کا منبع نہیں ملا تھا لیکن ہونٹوں اور ٹھوڑی پر لگے خون کو دیکھتے ہوئے اسے ایک دم وہ بات یاد آ گئی تھی جو کچھ دنوں پہلے فلم کے سیٹ پر اس کی بے عزتی کا باعث بنی تھی۔

دراصل اسسٹنٹ ڈائریکٹر اسپیشل افیکٹ پر مبنی ایک منظر فلما رہا تھا۔ ایک ایکٹر کو گولی لگنے اور اس سے پیدا ہونے والے زخم کا دکھایا جانا مقصود تھا اور گرانٹ کا کام یہ تھا کہ وہ اس ایکٹر کے جسم پر لگنے والے گھاؤ کی جگہ پر ہتھیلی رکھ کر خون روکنے کی اضطراری کوشش کرے۔ کیمرہ 'رول' کرنے لگا اور squib کے ذریعے مصنوعی لہو کی تھیلی پھاڑ دی گئی تو بجائے آگے بڑھ کر ابلتے ہوئے لہو پر ہاتھ رکھنے کے گرانٹ بت بنا اپنی جگہ پر جما رہا۔ ہدایت کار کے کئی بار چلانے پر بھی وہ متوجہ نہ ہوا تھا۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ ایک خلا اس کے چہار اطراف پھیلا تھا۔ کوئی بھی محرک اس کے دماغ کو اکسا نہ پاتا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس کی اس قدر توہین کی تھی کہ بس مار پیٹ کرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ اس بھولنے والی بیماری کا جلد ہی کوئی تدارک نہ ہوا تو اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور وہ کریہہ المنظر آبلے بھی تو تھے جو بارش کے بعد راتوں رات اگنے والی کھمبیوں کی طرح اس کے پورے جسم کو داغ دار بنا رہے تھے۔

''مجھے آج ہی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں اور دیر نہیں کی جا سکتی۔'' اس نے مصمم ارادہ کیا تھا۔ اس کا ایک جاننے والا ڈاکٹر تھا۔ وہ اس کی مدد کر سکتا تھا۔ ''میں آج ہی اس سے ملوں گا۔'' گردن پر جما خون دھوتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

اسے ساتھ والے کمرے سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے باتھ روم کا دوسری طرف والا دروازہ کھول کر کمرے میں جھانکا۔ وہ جاگ چکی تھی اور بستر کے کنارے آنکھیں موندے بیٹھی جھول رہی تھی۔ شاید اسے باتھ روم جانا تھا اور وہ اس کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس گھر کی دوسری مکین تھی۔ اس کی ماں کی زندگی میں ہی گرانٹ نے اس کی تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس کی ماں ایک بے حد غلیظ اور گھناؤنے کردار کی مالک عورت تھی۔ اس کے گناہوں نے ہی گرانٹ کا دھیان اس کی بیٹی کی جانب مبذول کروایا تھا۔ گناہ کی گندگی میں لت پت عورت کی بیٹی کو وہ گناہ سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو خدا کی ناراضی کم ہو سکتی تھی۔

گرانٹ سے کئی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اور خدا کا غضب اس کی پشت پر تھا۔ وہ لڑکی اس کے گناہوں کا کفارہ بننے والی تھی۔ اسے عذاب سے نجات دلانے والی تھی۔ اس کی پرورش کرتے ہوئے گرانٹ نے اس پر ہر طرح کی سختی کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اس کی نفرت، برداشت کر سکتا تھا۔ مگر خدا کی ناراضی برداشت کرنا اس کے بس میں کہاں تھا؟ اچھا ہی ہوا تھا جو اس کی ماں مر گئی تھی۔ اگر وہ عورت اب تک اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتی تو یقیناً اسے گناہ کی راہ پر دھکیل چکی ہوتی۔

گرانٹ نے اسے نیند میں جھولے کھاتے دیکھا اور کہنا چاہا کہ باتھ روم فارغ ہے۔ تم اب اسے استعمال کر سکتی ہو۔ مگر ایک ایسی بات ہوئی کہ اس کی آواز ہی نہ نکل سکی۔ وہ اس لڑکی کا نام بھول گیا تھا۔



اگر گھر چھوڑنے سے پہلے اسے کچھ پیش بندی کرنے کا موقع ملا ہوتا تو شاید وہ اتنی خوف زدہ نہ ہوتی۔ جس عجلت میں اس سے یہ عمل سرزد ہوا تھا، اس کی بوکھلاہٹ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ آخر وقت تک وہ آنکھیں بند کیے یہ ہی سوچتی رہی کہ کسی بھی لمحے گرانٹ آ پہنچے گا اور سب درست ہو جائے گا۔

اس نے کسی دیگر امکان کو ارادی کوشش سے شعوری سطح تک رسائی پانے ہی نہ دی تھی۔ اسی بدحواسی کا نتیجہ تھا کہ گھر سے باہر رکھے گئے اولین قدم پر ہی وہ پچھتانے لگی اسے ان تمام باتوں کا اچانک ہی ادراک ہو گیا تھا، جو اب تک اس کی نظر سے اوجھل تھیں۔ اسے خبر نہ تھی کہ گرانٹ سے رابطہ جڑنے میں کتنی مدت لگ جائے گی۔ یہ عرصہ گزارنے کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس جو نقدی تھی، وہ بمشکل چند دن چل سکتی تھی۔

زیورات یا دوسری قیمتی اشیاء کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے ایسی شرم آئی تھی کہ وہ اس ارادے پر عمل نہ کر پائی، حالانکہ سب سے زیادہ شرمناک کام تو وہ کر گزری تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں جتنی بھی رقم پڑی تھی، وہ چند روز قبل وینس نے شادی کے اخراجات کے لیے نکلوالی تھی۔ اور اس وقت وہ تقریباً خالی ہاتھ تھی۔

اپنے سامان میں سے اسے اپنا پاسپورٹ نہیں ملا تھا۔ جانے وہ بے دھیانی میں کہیں آگے پیچھے ہو گیا تھا یا کسی نے جان بوجھ کر نکال لیا تھا۔ اور اگر وہ ارادتاً نکال گیا تھا تو وینس کے سوا ایسا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

پرنیاں کے علاوہ الماری کی چابی صرف وینس کے پاس تھی شاید اس کے دل میں یہ خدشہ موجود ہو کہ اس کی بیٹی گھر سے جانے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ پہلے سے ایسا سوچ رہی تھی تو اب اپنے خدشات کو سچ ہوتا پا کر اس پر کیا گزری ہوگی۔ اس وقت وہ رو رہی ہوگی، مگر آواز کو اونچا ہونے سے روکتی ہوگی، اس ڈر سے کہ گھر کا کوئی اور فرد نہ سن پائے اور جب آئزک اپنے بستر سے پکارے گا۔

''پرنیاں کہاں ہے؟ اب تک میرے پاس کیوں نہیں آئی تو......'' اور گونی......وہ ایک بار رونا شروع کرتا تو کئی گھنٹے روتا ہی چلا جاتا تھا، کسی حیلے سے بہلتا ہی نہ تھا۔ اسے کون سمجھائے گا کہ پرنیاں اچانک کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اس کی شادی کے لیے بننے والے ملبوسات دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا اور جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ داؤد متوقع دولہا تھا تو داؤد کے سامنے آنے پر بے طرح گھبرا جاتا اور چھپنے کو کونے کھدرے تلاشنے لگتا تھا۔ اور داؤد وہ کیا محسوس کر رہا ہوگا؟

قریب سے گزرتی عورت کی حیران نظروں کو خود پر جمے پا کر پرنیاں کو احساس ہوا کہ وہ بلند آواز میں خود کلامی کر رہی تھی، اس نے عورت کو رکنے کا کہا اور اس سے اس مکان کی بابت معلوم کیا جو وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ان گلیوں میں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس سے قبل وہ دو اور لوگوں سے پتا پوچھ چکی تھی۔ اس بار اسے کامیابی ہوئی۔ اس عورت نے گلی کے موڑ کی جانب انگلی سیدھی کی۔

''وہ ہرے دروازے والا آخری مکان، وہاں رہتے ہیں قربان صاحب۔''

''قربان صاحب؟'' وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ رک گئی۔ اسے بروقت خیال آیا تھا کہ مریم کے والد صاحب کا نام قربان ہی تھا۔

''جی اچھا، شکریہ۔'' وہ تیز قدموں سے گلی پار کر گئی۔

مریم اسکول کے ابتدائی دور سے اس کی دوست تھی۔ میٹرک تک وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھی تھیں اور اس تمام عرصے میں شاید ہی کوئی دن ایسا آیا ہو جب وہ اکٹھی نہ دیکھی گئی ہوں۔ اسکول کے بعد بھی ان کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے ربط جاری رہا تھا۔ چند ماہ پہلے جب پرنیاں تعلیم کے سلسلے میں امریکہ جانے لگی تو اس نے مریم کے نام خط لکھا تھا، جس میں لاس

اینجلس والا پتا بھی بھیجا تھا۔ مگر مریم کا کوئی جوابی خط اسے امریکہ میں نہیں ملا۔ واپس آنے پر اسے معلوم ہوا کہ مریم کے دونوں بھائیوں کو کسی جاننے والے کے توسط سے دوسرے شہر میں ملازمت مل گئی تھی۔ جس کے باعث انہیں گھر تبدیل کرنا پڑا۔ اپنے نئے پتے سے مریم نے اسے چند خطوط بھی ارسال کیے تھے۔ جو ونیس نے بنا کھولے رکھ چھوڑے تھے۔ ان ہی خطوط سے پرنیاں کو مریم کے گھر والوں کی دوسرے شہر منتقلی کے متعلق معلوم ہوا تھا اور گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں جو واحد نام آیا تھا وہ مریم کا تھا۔

ہرے روغن والا اونچا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بنا دستک دیے اندر چلی گئی۔ رات بھر برسنے والی بارش نے صحن کی پختہ اینٹوں کو دھو کر نکھار دیا تھا اور چھت کے جالی دار پردے سے جھانکتی سرما کی زرد دھوپ کے قتلے گیلے فرش پر ترتیب سے دھرے تھے۔ اس کے جوتوں پر لگی کیچڑ جو سوکھ کر بھربھری ہو گئی تھی، گیلے فرش پر بدنما نشان چھوڑ رہی تھی۔ برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے مریم باہر آئی۔ وہ آٹا گوندھتے ہوئے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ سفید آمیزے سے لتھڑے تھے۔

''ہائے اللہ پرنیاں تم؟ تم کیسے آ گئیں یہاں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، میرے خطوں کا جواب بھی تو نہیں دیا تم نے، نہ خیر، نہ خبر، بڑے دنوں سے چھت پر کوا بول رہا تھا۔ دل کہتا تھا کوئی مہمان آنے والا ہے، پر تم آؤ گی، میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔''

اس نے آٹے سے بھرے ہاتھ پرنیاں کے کندھوں سے گزار کر اسے گلے سے لپٹایا اور بلند آواز میں قہقہہ لگایا، پھر جھجک کر پیچھے ہٹی اور اس کا قہقہہ کہیں کھو گیا۔

''تم اکیلی آئی ہو؟''

''ہاں......'' پرنیاں نے کندھے سے لٹکتا بیگ جس کے بوجھ سے اس کا بازو شل ہو گیا تھا، اتار کر فرش پر رکھ دیا۔

''میں سمجھی نہیں، تم اکیلی کیسے آ سکتی ہو۔ مطلب؟''

''میں اکیلی ہی آئی ہوں۔''

''وہ ہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اکیلی کیسے آ گئیں، کوئی ساتھ کیوں نہیں آیا؟''

''میں کسی کو بتا کر نہیں آئی، میں گھر سے چوری چھپے نکلی ہوں۔''

مریم کے ہونٹ وا ہوئے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

''پرنیاں! تم کیا کہہ رہی ہو؟ چوری چھپے کیوں نکلی ہو، کیا ہوا ہے؟''

پرنیاں نے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی خاطر سارے صحن اور برآمدے میں نگاہ گھمائی۔ تھکن سے دکھتا ہوا جسم اسے مزید ایک لمحہ بھی کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر مریم کو پوری بات بتائے بغیر کہیں بیٹھ جانا شاید ممکن نہیں تھا۔ وہ نقاہت زدہ آواز میں اسے بتانے لگی تھی۔

مریم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ وہ اتنا پھیکا ہو گیا کہ صحن میں بکھری دھوپ اس کے مقابلے میں زیادہ رنگین لگنے لگی۔ پرنیاں کے خاموش ہو جانے کے بہت دیر بعد تک وہ کچھ نہیں بولی۔ اپنے ہاتھوں پر لگے آمیزے کو دیکھتی رہی، پھر خاموشی سے فرش پر پھیلے ان دھبوں کو گھورنے لگی جو پرنیاں کے قدموں سے بنے تھے۔

''میری حیثیت کیا ہے؟ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں، کیا سوچ کر تم میرے پاس آ گئی ہو؟''

پرنیاں خاموش رہی، اگر اس نے سوچا ہوتا تو وہ ایسا کرتی ہی کیوں۔

''میں ایک عزت دار آدمی کی بیٹی ہوں۔ ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے، مگر ہم یہاں گمنام نہیں ہیں، لوگ میرے باپ کا نام عزت سے لیتے ہیں، جب تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچیں گے تو تم ہی بتاؤ اس کے بعد لوگ ہمیں اس محلے میں جینے دیں گے۔''

مریم پر جوں جوں پرنیاں کی آمد سے پیدا ہونے والے متوقع حالات عیاں ہو رہے تھے، اس کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

''وہ لوگ یہاں نہیں آئیں گے۔''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو، وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ سب سے پہلے یہیں آئیں گے اور ممکن ہے۔ کچھ ہی دیر میں پہنچنے والے ہوں۔'' مریم نے بلاارادہ بیرونی دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

''انہیں یہاں کا پتا معلوم نہیں ہے۔ وہ مجھے نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم، میں نے تمہیں اسی پتے سے خط بھجوائے، تم تو امریکہ میں تھیں، وہ خط تمہاری امی نے ہی وصول کیے ہوں گے۔''

''لیکن انہوں نے وہ خطوط دیکھے بغیر ہی سنبھال لیے تھے۔ پتے وغیرہ کی طرف انہوں نے بالکل دھیان نہیں دیا ہوگا اور میں وہ خط ساتھ ہی لے آئی ہوں۔''

پرنیاں نے بوجھل جوتوں میں پیروں کے پنجوں کو بے چینی سے حرکت دی۔ اس کے پیروں میں اتنا درد تھا کہ وہ ان کے علاوہ کچھ بھی اور سوچ نہیں پا رہی تھی۔

''یہ بس تمہارا قیاس ہے اور اگر یہ درست بھی ہے تو وہ ہمارے پرانے گھر سے جا کر معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ گھر ڈھونڈنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا۔''

''وہ تمہارے پرانے گھر کے بارے میں کب جانتے ہیں۔ وہاں تو میں بھی کبھی نہیں آئی۔ امی، ابو کو تو تمہارے مثعلق یاد تک نہیں ہوگا۔ میری پیچھے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

مریم جو کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہی تھی، چند لمحے سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے ہاتھوں پر لگا آٹا نیم خشک ہو کر جھڑنے لگا تھا۔

''مریم! میں بیٹھنا چاہتی ہوں، ہم اندر چل کر بیٹھ جائیں، میں بہت تھک گئی ہوں۔''

''میری ایک بات مانو پرنیاں! تم واپس چلی جاؤ۔''

''کہاں واپس چلی جاؤں؟''

''اپنے گھر چلی جاؤ۔'' ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر آٹے کا آمیزہ اتارتے ہوئے وہ ایک قدم آگے آ گئی۔ ''وہ تمہارے گھر والے ہیں، وہ تمہارے سب سے بڑھ کر سگے ہیں۔ تم واپس جا کر ان سے معافی مانگ لو، وہ ناراض ہوں گے، لیکن مان جائیں گے۔ تمہارے اس طرح گھر چھوڑ آنے کی وجہ سے ان کو بڑا دھچکا لگا ہوگا۔ اب اگر تم واپس چلی جاؤ تو وہ تم پر پہلے کی طرح سختی نہیں کریں گے۔ تمہاری مرضی کے بغیر تمہاری شادی نہیں کریں گے۔''

پرنیاں نے بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ''میں پریگنیٹ ہوں۔ میرا شوہر مسلمان ہے، کوئی ماننے والی بات ہوتی تو وہ مان بھی جاتے۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

مریم کے ہاتھوں کی جنبش رک گئی۔ ''تم پریگنیٹ ہو؟ یہ تم نے کیا کر دیا۔''

وہ اس درجہ ساکت تھی کہ اس کے ہاتھوں سے جھڑنے والے آٹے کے ذرات چگتی ہوئی چڑیا کو اس کے قریب آتے ہوئے ڈر نہیں لگا۔

''جو بھی ہے، تم چلی جاؤ۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں، تم واپس چلی جاؤ، وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ وہ تمہیں دکھ نہیں

دیں گے۔تم تو پورا پورا دن مجھے انکل آئزک کی محبت کے قصے سنایا کرتی تھیں۔میرا دماغ چاٹ جاتی تھیں۔وہ محبت اب کہاں چلی گئی؟ تم انہیں ایک موقع تو دو۔وہ تمہارے ساتھ کچھ بھی برا نہیں کریں گے۔''

پرنیاں کو لگا کہ مریم رو دے گی۔وہ نظریں پھیر کر فرش پر پھدکتی گوریا کو دیکھنے لگی۔

''کسی نے کچھ برا نہیں کیا۔غلطی میں نے کی ہے اور مجھے ہی اس کو بھگتنا ہے۔میرا جیسے ہی اپنے شوہر سے رابطہ ہو گیا، میں تمہارے گھر سے چلی جاؤں گی لیکن تب تک میرے پاس کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''میں تمہاری لیے کچھ کر سکتی تو کبھی انکار نہ کرتی مگر میں بے بس ہوں۔میں اپنے گھر والوں کو کیا جواب دوں گی۔انہیں کیا بتاؤں گی کہ تم کون ہو اور اچانک یہاں رہنے کیوں آ گئی ہو۔میرے ابا اور اماں دونوں کراچی گئے ہیں بڑی آپا کے پاس۔شکر ہے کہ اس وقت وہ گھر میں نہیں ہیں ورنہ تو...... لیکن میرے بھائی شام کو فیکٹری سے لوٹیں گے۔میں انہیں کیسے مطمئن کروں گی۔'' مریم نے فوراً جواب دیا۔

''مریم! مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔مجھے کہیں بیٹھ جانے دو، مجھے لگتا ہے میں گر جاؤں گی۔''

مریم نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔''تمہارا شوہر تمہیں کیسے ڈھونڈے گا؟ وہ تمہیں لینے تمہارے گھر چلا گیا اور وہاں تم نہ ملیں تو شاید وہ واپس چلا جائے۔اسے کیسے خبر ہو گی کہ تم کہاں ہو؟''

بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح اس سوال کا جواب بھی پرنیاں کے پاس نہیں تھا مگر وہ یہ بات مریم سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

''نہیں۔وہ پاکستان آیا ہی نہیں۔کسی وجہ سے اسے رکنا پڑا ہو گا۔میں اسے فون کروں گی۔وہ آ کر مجھے لے جائے گا۔مجھے زیادہ دن یہاں رکنا نہیں پڑے گا۔کیا تمہارے گھر ٹیلی فون ہے؟''

''نہیں۔ہمارے مالک مکان کے گھر میں ہے۔لیکن وہ استعمال کرنے دیں یا نہیں پتا نہیں۔روکھے سے لوگ ہیں۔شام کو علی آ جائے تو اس کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی، وہ تمہیں فون کروا لائے گا کسی کے سامنے یہ بات منہ سے نہ نکالنا کہ تم اکیلی آئی ہو۔میں تمہارے ساتھ ہوں پرنیاں، تم میری اکلوتی سہیلی ہو۔مجھے بہت عزیز ہو تم، میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں مگر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میرے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے۔''

وہ تیز قدموں سے بیرونی دروازے تک گئی۔

''تم اندر چل کر بڑے کمرے میں بیٹھو۔میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں، پر پتی تو ہے نہیں۔پرسوں سے کہہ رہی ہوں علی سے کہ پتی ختم ہو گئی۔وہ خود چائے نہیں پیتا نا، تب ہی کان نہیں دھرے۔تم پہلی بار میرے گھر آئی ہو اور ایسے اچانک وہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا، تمہاری کیا خاطر کروں۔مجھے پتا ہوتا تو کوئی اچھی چیز ہی پکا لیتی۔چاہے پالک کا ساگ تمہیں پسند بھی آئے یا نہیں۔''

کواڑ بند کر کے کنڈا لگانے کے بعد وہ پلٹی تو پرنیاں نے اسے شدت سے روتے ہوئے دیکھا۔



جان کنی کے کرب میں مبتلا جاڑے کی شام درد بھری آنکھوں سے سرمئی آسمان کو تکتی تھی۔ایڑیاں رگڑتی ہوئی اس شام پر مشکی بدن والی رات جھکتی چلی آ رہی تھی۔رات اس حد تک جھک آئی کہ اس کے پروں کے نیچے شام کا وجود چھپ گیا۔رات نے جھک کر اس کے ہونٹوں پر اپنے سرد لب رکھ دیے اور ایک سانس میں اس کی روح کھینچ لی۔اس بوسے میں شام کا بدن تحلیل ہو گیا تھا، وہ

فنا ہوئی تھی یا رات میں مدغم ہو کر امر ہو گئی۔ کوئی بھی اس بھید کو پا نہ سکا۔ پرنیاں باورچی خانے کے دروازے کی اوٹ میں گھٹنوں پر گردن گرائے پیڑھی پر بیٹھی تھی اور مریم مٹی کے تیل والے چولہے پر بیسنی روٹیاں پکا رہی تھی۔ چولہے کی ستلیوں سے اٹھتے دھوئیں کی کڑواہٹ بھری بو، بھنتے ہوئے بیسن کی مہک، سرسوں کے تیل کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ مریم کے دونوں بھائی عبدالعلی اور ابوسعد اندر کمرے میں لحافوں میں لپٹے ریڈیو پر خبرنامہ سن رہے تھے۔ ریڈیو سے شور کے ساتھ نشر ہوتی آواز کے ساتھ ان دونوں کے باتیں کرنے کی غیر واضح آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔

اسے مریم کے گھر آئے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران اس نے جتنی بار بھی گرانٹ کے اپارٹمنٹ والے نمبر پر ٹیلی فون کیا تھا، وہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ جانے کوئی تکنیکی خرابی تھی یا اب وہاں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔ اس کے قیام کی طوالت بڑھنے کے ساتھ ساتھ مریم کے اندر تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ پرنیاں اس معاملے میں اسے ہرگز قصوروار نہیں ٹھہراتی تھی۔ وہ اتنی ہی بے بس اور بے یار و مددگار تھی جتنی خود پرنیاں۔ اگر کسی کو پرنیاں کی حقیقت کی بھنک بھی پڑ جاتی تو مریم کی حیثیت کیا ہو جائے گی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

اس نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ پرنیاں اس کی اسکول کے زمانے کی دوست تھی جس کی شادی کچھ مدت قبل اپنے خالہ زاد سے ہوئی تھی جو امریکہ میں کسی ادارے میں ملازم تھا۔ ساس، نند، جیٹھ، دیور سب وہیں مقیم تھے۔ صرف شادی کی غرض سے وہ لوگ پاکستان آئے تھے اور ارادہ تھا کہ اس کے کاغذات بن جائیں تو اسے بھی ساتھ لیتے جائیں مگر دفتری معاملات میں کسی الجھن کے سبب ایسا ہونے میں تاخیر در پیش تھی۔ ان لوگوں کو واپس پہنچنا تھا کہ پرنیاں کے میاں کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اسے ساتھ لے جا نہ سکتے تھے اور میکے چھوڑنا یوں ممکن نہ تھا کہ میکے میں ایک اندھی نانی کے سوا کوئی تھا ہی نہیں اور وہ بھی پچھلے سال چل بسی تھیں۔

اس مسئلے کا اور کوئی حل نہ نکلا تو پرنیاں نے سمجھایا کہ اسے کچھ دن اس کی پرانی سہیلی کے ہاں رہنے دیا جائے۔ وہ برسوں سے نہیں ملی تھیں اور اب تقدیر نے خود ہی راہ نکالی تھی۔ سسرال والوں نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ تجویز مان لی تھی اور پرنیاں کا شوہر اپنی ماں اور بڑی بہن کے ساتھ اسے یہاں چھوڑنے آیا تھا۔ اسی رات ان لوگوں کو جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس لیے عبدالعلی اور ابوسعد کے لوٹ آنے تک رک نہ پائے تھے۔

اس بودی کہانی پر اس لیے اعتبار کر لیا گیا کہ مریم نے اپنی سابقہ زندگی میں گھر والوں کو کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ اگر پہلے ان لوگوں نے مریم کے ہاتھوں فریب کھایا ہوتا تو شاید وہ اس کہانی کے جھول ہضم نہ کر پاتے۔

محلے سے کوئی عورت آ جاتی تو مریم اسے پیش منظر سے اوجھل کر دیتی اور اگر سامنا ناگزیر ہو جاتا تو خود سے کچھ بتانے کے بجائے صرف ان ہی سوالوں کے مختصر جواب دیے جاتے جن کے جواب نہ دینے سے شکوک پیدا ہونے کا احتمال ہوتا۔ ہر دم یہی فکر اسے گھلاتی رہتی کہ پرنیاں کی اصلیت ظاہر ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اس اعصاب شکن معمول نے مریم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ پرنیاں کے سامنے اپنی ناگواری چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کرتی تھی۔

''آج ابا کی چٹھی آئی ہے کراچی سے، سعدی بھیا کے نام۔ فیکٹری والے پتے پر بھجوائی تھی انہوں نے۔ لکھا ہے کہ اماں کو کراچی کا موسم راس نہیں آیا۔ جوڑوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے اور پیٹ بھی ٹھیک نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے ایک دو ہفتے میں وہ لوگ لوٹ آئیں۔ ان کے آنے تک اگر تم یہیں ہوئیں تو ہمارا جھوٹ اور نہیں چلے گا۔ اماں بھائیوں جیسی بھولی نہیں کہ جو کہا جائے گا۔ آنکھ بند کر کے ایمان لے آئیں گی۔ تمہیں دیکھتے ہی وہ بھانپ جائیں گی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔''

مریم نے بیسن کی روٹی پر گھی کی پتلی دھار گراتے ہوئے کہا۔

''بس کچھ اور مریم! تھوڑے دن اور مجھے یہاں رہنے دو۔''

''کتنے دن؟ اور کتنے دن؟ اگر تمہارے شوہر کے آنے کی کوئی تاریخ مقرر ہوتی تو ہم انتظار بھی کرتے مگر اس کی تو کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا تمہیں کوشش کرتے ہوئے۔ وہ ٹیلی فون نمبر تو شاید کسی کے استعمال میں ہی نہیں ہے۔ ہر دوسرے دن تم فون ملاتی ہو، کبھی کوئی جواب ملا؟ تم اس کی امید چھوڑ دو، اب کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈو۔''

کوئی دوسرا راستہ تھا ہی کب؟ وہ جس دھند بھری راہ پر چل رہی تھی۔ وہاں اسے اپنے قدموں تلے کی زمین دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور اب تو محسوس ہونا بھی بند ہو گئی تھی۔ کئی بار وہ سوچنے لگتی کہ اس کے پیروں کے نیچے زمین ہے بھی یا نہیں۔

اندھیرا رینگتا ہوا آتا اور باورچی خانے کے دروازے میں لیٹی پیلی روشنی کو چھو کر بدکتا اور پسپا ہو جاتا۔ پرنیاں پلکیں جھپکائے بنا باہر پھیلی رات کو گھورتی رہی، پھر کڑوے دھوئیں نے آنکھوں میں گھس کر اسے پلکیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

''گلی محلوں میں بنے گھر ایک دوسرے کے اندر گھسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں فاصلہ نہیں ہوتا۔ دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے۔ کھڑکی سے کھڑکی جڑی ہوتی ہے۔ ایک چھت پر چڑھ کر سب صحنوں کے اندر جھانکا جا سکتا ہے۔ یہاں کسی راز کو راز رکھنا بڑا مشکل ہے۔ پرسوں جب تم حلیمہ کی ماں کے سامنے دو مرتبہ الٹی کرنے لیٹرین میں گئیں تو وہ پوچھنے لگی ''تمہاری سہیلی پیٹ سے ہے کیا؟'' شکر ہے، میں نے اس سے تمہارے شادی شدہ ہونے کی بات پہلے ہی کر دی تھی۔ اگر میں نے کچھ اور کہانی سنائی ہوتی تو بات سنبھلنی تھی بھلا۔ اس جھوٹ کو میں کتنا کھینچوں، کتنی بار مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اب تو مجھے یہ بھی بھولنے لگا ہے کہ کس سے میں نے کیا جھوٹ بولا تھا۔''

مریم نے اپنی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی کر لی۔ عبدالعلی اور ابو سعد کے کمرے سے ریڈیو کی آواز آنا بند ہو گئی تھی اور ابو سعد اسے کھانا دینے کے لیے پکار رہا تھا۔

''ابھی آ رہی ہوں بھیا! بس دو گھڑی اور رکو۔'' روٹی کو توے سے اتار کر ناڑ کی چنگیری میں رکھتے ہوئے وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی۔ ''خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں بیٹھ کر اپنے شوہر کا انتظار کرنا تمہارا پاگل پن ہے۔ جب اسے خبر ہی نہیں کہ تم کہاں ہو تو اس کا پاکستان آنا نہ آنا ایک برابر ہے۔ تمہارے گھر سے کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آ گیا تو میں...... میرے لیے خودکشی کرنے کے علاوہ کوئی رستہ نہیں بچے گا۔ میرے اماں، ابا کے لوٹنے سے پہلے تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ یا کہیں بھی اور چلی جاؤ مگر مجھے اور نہ آزماؤ۔ میری پاس صرف ایک عزت ہی تو ہے۔ وہ بھی نہ رہی تو میں زندہ کیسے رہوں گی۔''

وہ پیڑھی سے اٹھی اور گل میخ سے ٹنگی لالٹین اتار کر باہر نکل گئی۔ دہلیز پر جھجک کر رکا ہوا اندھیرا بھاگ کر باورچی خانے کے اندر گھس آیا اور کچھ اندھیرا مریم کے پیچھے دبے قدموں برآمدے کی اور سرکنے لگا۔ چولہے میں جلتے مٹی کے تیل کا کڑوا دھواں اس کی پتلیوں کو کاٹتا رہا اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں کی جلن کو مدھم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

مریم واپس آئی تو ریڈیو ایک بار پھر بجنے لگا تھا۔ اختری بائی فیض آبادی کی سحر طراز آواز ہر سو بکھر گئی تھی۔

''آئے بلم، کرم مورے جاگے۔''

آگ کی لپٹیں توے کے سروں سے باہر پھیل کر لہرا رہی تھیں۔ بیسن کے جلے ہوئے ٹکڑوں سے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر سرکنڈوں کی چھت سے ٹکراتے اور پھیل جاتے۔ ٹھمری کے بول ناچتے ٹھمکتے ہوئے کوٹھڑی میں گھستے اور اس کے سر پہ ٹنگی ہوئی لالٹین کے روشن زرد شیشے کے گرد پروانوں کی طرح جمگھٹ بنا لیتے۔

''آئے بلم۔ آئے بلم۔
کرم مورے جاگے۔ کرم مورے جاگے۔
آئے بلم، کرم مورے۔''

''پرنیاں! میرے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔ مجھ میں اور برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ تمہارے شوہر کے مل جانے کی ذراسی بھی امید ہوتی تو میں تمہیں کچھ دن اور یہاں رکھنے پر آمادہ ہو جاتی۔ تمہارے رخصت ہونے کا کوئی وقت مقرر ہوتا۔ میں انتظار کر لیتی۔ مگر کچھ بھی واضح نہیں ہے۔ تمہارے ایک ہفتہ اور یہاں رکنے سے بات بن جائے گی؟ کیا دس دن کافی رہیں گے؟ مہینہ؟ دو مہینے؟ سال؟ نہیں پرنیاں! ایسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم جتنی بھی دیر سر چھپا کر یہاں پڑی رہو۔ آخر تمہیں سچائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کل صبح جب علی اور سعدی بھیا فیکٹری کے لیے نکل جائیں تو تم خاموشی سے اپنے گھر روانہ ہو جانا۔ مجھے معلوم ہے، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گی۔ کرایے کے پیسے......''

پرنیاں نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔ ''بس تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ''

''خاموشی سے میری بات سنو۔ تم اپنے ماں باپ کے پیروں میں گر کر ان سے معافی مانگ لینا۔ وہ مان جائیں گے۔ مجھ پر یقین کرو، وہ تمہیں قبول کر لیں گے۔ وہ لوگ تم سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہارے اس طرح روپوش ہو جانے سے وہ کتنے دکھی ہوں گے۔ تم سامنے جاؤ گی تو سارے شکوے خود ہی ڈھل جائیں گے لیکن اور دیر نہ کرو۔ اپنے لیے اور میرے لیے مزید مشکلات پیدا نہ کرو۔ سمجھو کہ میں اس گھر کی مالک نہیں ہوں۔ ایک خود مختار فرد نہیں ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔''

وہ کچھ بولنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ مریم نے ٹوک دیا۔ ''تم پریگننٹ ہو۔ یہی کہنے والی ہو ناں تم۔ تم نے یہ سب کرنے سے پہلے ایک لمحہ بھی نہیں سوچا۔ یا تو تم حد سے زیادہ بے وقوف ہو یا کردار کی اس قدر ہلکی ہو کہ تمہیں اپنے آپ پر قابو ہی نہیں ہے۔ میں اتنے سالوں سے تمہیں جانتی ہوں۔ مگر مجھے تمہارے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔''

مریم کے الفاظ آنکھوں کو کاٹتے ہوئے دھوئیں سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ پرنیاں کے لیے وہاں بیٹھے رہنا دو بھر ہو گیا۔

''تمہیں میری بات سے تکلیف ہوئی ہے ناں۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف تمہیں تب ہو گی جب تم اس بچے کو پیدا کرو گی اور لوگ تم سے اس کی ولدیت کے بارے میں سوال کریں گے۔ تب تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ نہ تمہارے آنسو کسی پر اثر کریں گے اور نہ ہی تمہاری خاموشی کسی کو مطمئن کرے گی۔ سنجیدگی سے سوچو، تم کہاں کھڑی ہو۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تمہاری ہمدرد ہوں۔ کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گی تمہیں۔ اس بگڑی ہوئی بات کو سدھارا جا سکتا ہے اگر تم چاہو اور تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' مریم نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''تم اسے ختم کر دو۔''

پرنیاں نے چیخ کر ''نہیں'' کہنا چاہا لیکن وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

''تم کسی ڈاکٹر کے پاس اس کام کے لیے نہیں جا سکتیں۔ جانے وہ کتنے روپے مانگ لے اور ممکن ہے وہ پولیس کو ملوث کرے۔ یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ میں نے تم سے پہلے ذکر نہیں کیا لیکن اس پہلو پر بہت سوچا ہے میں نے۔ تمہیں آمنہ یاد ہے؟ ہم سے ایک جماعت آگے تھی۔''

پرنیاں نے نفی میں سر ہلایا۔

''پکا رنگ تھا۔ ہڈ کاٹھ کھلے تھے اور کمہاروں کے خاندان سے تھی۔ اس وجہ سے اسکول کی لڑکیوں نے اس کا نام ''خچری'' رکھ دیا تھا۔ پڑھائی میں بڑی تیز تھی۔ تقریری مقابلے میں بھی ہمیشہ اول انعام لیتی تھی۔ آئی ذہن میں وہ؟ میری کافی اچھی دوستی تھی اس سے۔''

پرنیاں کے ذہن میں آمنہ نامی اس گہری سانولی لڑکی کا دھندلا سا عکس آ رہا تھا۔ لیکن اس بے موقع تذکرے کا مقصد کیا تھا۔

''پچھلے سال ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔ میں گئی تھی اماں اور علی کے ساتھ۔ اس کی اپنی پھپھو کے بیٹے سے شادی ہوئی

ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گیا ہے، وہیں ملازمت کرتا ہے۔ بڑی اچھی قسمت پائی ہے اس نے۔ اسکول میں سب لڑکیاں کالی اور کمی ہونے کی وجہ سے حقارت سے دیکھتی تھیں۔ خیر اللہ خوش رکھے اسے۔ اس کا ذکر اس لیے کر رہی ہوں کہ تمہیں اس کی ماں کے بارے میں بتانا تھا۔ دو تین بار ملی ہوں آمنہ کی ماں سے بہت ہی نیک عورت ہے۔ بڑا بھلا سا نام ہے۔ جانے کیوں ذہن سے نکل گیا۔ شاید۔ حلیماں یا۔ حکیم۔ ہاں بالکل یہی نام ہے۔ حکیم بیگم، بڑی پیار محبت والی سادہ سی عورت ہے۔ وہ دائی کا کام بھی کرتی ہے۔ اگر تم اس کے پاس جاؤ اور آمنہ کا حوالہ دو کہ تم آمنہ کے ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی ہو تو وہ لازماً تمہاری مدد کرے گی۔ اور جیسی طبیعت ہے اس کی۔ اس بات کا چرچا بھی نہیں کرے گی۔ مجھے یقین ہے، وہ اس کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگے گی لیکن تم میرا ذکر ہرگز نہ کرنا۔ تم وہاں خاموشی سے اس بچے سے چھٹکارا پا سکتی ہو۔ پھر تم اپنے گھر چلی جانا اور جیسے بھی بن پڑے انہیں منا لینا۔ وقت پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا ہے۔ تم نے اور انتظار کیا تو یہ حل بھی قابل عمل نہیں رہے گا۔ تم کہو تو میں علی سے بات کروں۔ میں کوئی بہانا بنا کر اسے تمہارے ساتھ بھیجنے پر رضامند کرتی ہوں۔ وہ تمہیں بئیں کے کنارے تک چھوڑ آئے گا۔ وہاں سے تمہیں بیڑی مل جائے گی بئیں کے پار جانے کے لیے۔ گاؤں کی مسجد سے تین چار مکان چھوڑ کر آمنہ کا گھر ہے۔ تم آسانی سے ڈھونڈ لوگی۔ میری بات مان لو۔ یہ سب کے حق میں اچھا ہوگا۔"

پرنیاں بولی تو اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ مریم نے اس کے لہجے میں سختی محسوس کی۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جس کے ثبوت مٹانے کی ضرورت پیش آئے۔ میرے پیٹ میں جو پل رہا ہے۔ وہ میری محبت کا نتیجہ ہے۔ میں محبت پر شرمندہ نہیں ہوں۔ ایڈم گرانٹ کسی اجنبی کا نہیں میرے شوہر کا نام ہے، کل کو آکر وہ مجھ سے سوال کرے گا کہ پرنیاں تم چند دن بھی میرا انتظار نہ کر سکیں تو میرے پاس کیا جواب ہوگا۔ میں نہیں چاہتی، مجھے اس کے سامنے شرم سے سر جھکانا پڑے۔ میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم تو کچھ بھی سوچ نہیں سکتیں۔" مریم نے غصے سے کہا۔ "تم خود کو اور اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کرنے پر تلی ہو۔ میں تمہارے لیے جتنا کر چکی ہوں اسے بہت سمجھو۔ اس سے زیادہ کرنے کی میری اوقات نہیں ہے۔ میرے حال پر رحم کھاؤ۔"

اس نے مریم کے چہرے سے نظر ہٹالی۔

ریڈیو کی آواز اونچی کر دی گئی تھی۔ اب مغنیہ بھوج پوری کجری گا رہی تھی۔

"جلم بھیو نندی۔ سیاں نہیں آئے۔

سیاں نہیں آئے۔ پیا نہیں آئے۔

جلم بھیو۔

ٹھنڈی سانسوں والی ماگھ کی رات اس سے لپٹ کر آہیں بھر رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

دوسری طرف سے آتی آواز سن کر اس کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔

"ہیلو رائن سدرلینڈ۔ تم کو کس سے بات کرنا ہے؟ لیکن ٹھہرو۔ یہ سوال غیر ضروری ہے۔ میرے اپارٹمنٹ میں فون کیا ہے تو ظاہر ہے مجھ سے ہی بات کرنا ہوگی۔ خیر اپنا نام بتاؤ۔" وہ مایوس ہو کر فون بند کرنے لگی تھی کہ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس باتونی لڑکے رائن کے ساتھ وہ پہلے بھی دو چار مرتبہ فون پر بات کر چکی تھی وہ گرانٹ کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور ان کی شادی سے چند روز قبل سڑک پر پیش آنے والے ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا جس کے بارے میں اسے گرانٹ نے بتایا تھا۔

پرنیاں کی اس سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ البتہ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی۔

''رائن! میں پرنیاں بات کر رہی ہوں پاکستان سے، گرانٹ کی بیوی۔ تم جانتے ہو ناں مجھے۔'' اتنے دنوں بعد اس نے گرانٹ سے متعلق کسی شخص کی آواز سنی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی مریم کے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔

''اوہ پرنیاں! تم پاکستان کب گئیں۔ میں کل ہی ہسپتال سے فارغ ہو کر اپارٹمنٹ میں آیا ہوں اور سب سے پہلا فون تمہارا ہی آیا ہے۔ مجھے تم سے شکایت ہے۔ تم ایک بار بھی ہسپتال میں مجھے دیکھنے نہیں آئیں۔ چاہے میں کبھی تم سے ملا نہیں۔ اپنے دل میں تمہیں دوست ہی سمجھتا ہوں۔ تمہارے اور گرانٹ کے درمیان جو بھی اختلافات ہوں، مجھ سے تو تمہاری کوئی ناراضی نہیں تھی۔ مجھے دیکھنے تمہیں ضرور آنا چاہیے تھا۔ میں تو تقریباً مر ہی چکا تھا۔ خدا کی پناہ! بہت برا حادثہ تھا۔''

وہ جانے کیا کہے جا رہا تھا۔ پرنیاں کو اس کی بات سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''پہلے میری بات سنو رائن! میری گرانٹ سے بات کرواؤ۔ ابھی۔''

''تو تمہیں اس کا خیال آ ہی گیا۔ تم پچھتا رہی ہو ناں۔ مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ تم ضرور پچھتاؤ گی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو۔ گرانٹ کہاں ہے۔ جلدی بلاؤ اسے۔''

''تمہیں اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ بہت شاندار لڑکا ہے۔ میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گا، کل کو وہ مشہور اداکار بن جائے گا تو اس کے توسط سے مجھے بھی کام ملے گا۔ میں ابھی سے مستقبل......''

''رائن! میری بات سمجھو۔ میں پاکستان سے فون کر رہی ہوں۔ یہاں سے امریکہ بات کرنے میں بہت زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے۔ تم فوراً گرانٹ سے میری بات کرواؤ۔''

وہ رائن سے کئی باتوں کی وضاحت چاہتی تھی مگر گرانٹ سے بات کرنے سے پہلے کچھ اور نہیں کر سکتی تھی۔

''یہ اپارٹمنٹ تو خالی پڑا تھا۔ ٹیلی فون سیٹ بھی اتار کر وارڈروب کے نچلے خانے میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر اسے چالو کیا ہے۔ گرانٹ اب یہاں نہیں رہتا۔''

''تو کہاں ہے وہ؟''

''اس کے ڈائریکٹر سالومن موریل نے اسے Brentwood میں ایک بہت خوب صورت فلیٹ دلوا دیا ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے، اپنی ہسپانوی گرل فرینڈ کے ساتھ۔ تم جانتی ہو البا کو؟''

پرنیاں کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

''میں نے تو کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا گرانٹ سے۔ مجھے البا بالکل پسند نہیں۔ بہت مصنوعی قسم کی لڑکی ہے۔ میں تمہیں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ تم اور گرانٹ پھر سے اکٹھے ہو جاؤ تو مجھے اچھا لگے گا۔ تم جیسے ہی لاس اینجلس آؤ، مجھے ضرور ملنا۔ تمہیں بڑی خوشی ہو گی۔ مجھ سے مل کر۔''

''مجھے گرانٹ کا نیا ٹیلی فون نمبر چاہیے۔ مجھے لکھوا دو۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ دوستوں کی مدد کے لیے میں ہر دم تیار رہتا ہوں۔ تم کہو تو میں اپنے طور پر گرانٹ سے بات بھی کروں گا۔'' رائن نے خاصی دیر بولتے رہنے کے بعد اسے Brentwood والے فلیٹ کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ رائن کے بتائے ہوئے نمبر پر بات کر رہی تھی۔ جو آواز سنائی دی۔ اسے سننے کی پرنیاں کو ہرگز تمنا نہ تھی، البا نے ریسیور اٹھا کر اس کے خدشات میں اضافہ کر دیا تھا۔

''تم کو یہ نمبر کہاں سے معلوم ہوا؟'' البا نے فوراً ہی اس کی آواز پہچان لی تھی۔

''میں گرانٹ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ خاموش ہو کر ماؤتھ پیس میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

''اسے بلا دو البا!''

''کسے؟'' البا نے یوں چونک کر کہا جیسے کسی گہری سوچ سے نکلی ہو۔

''گرانٹ سے بات کرواؤ میری۔''

''کیا بات کرنا چاہتی ہو تم؟''

''یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں۔ تم وقت ضائع نہ کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''تم مجھے کیوں نہیں بتا سکتیں۔ کیا کوئی زیادہ ذاتی نوعیت کی بات ہے ویسے میرے پاس کچھ فرصت ہے، تم چاہو تو میں تمہاری بات سن لوں گی۔'' اس کا انداز چڑانے والا تھا۔

''البا! تم مجھے ناپسند کرتی ہو، مجھے معلوم ہے۔ تمہیں میرا اور گرانٹ کا ایک ہونا اچھا نہیں لگا۔ لیکن قسمت میں ایسا ہونا طے تھا۔ میرے یا تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''قسمت خدا لکھتا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں، تم خدا نہیں ہو۔ تو پھر میری قسمت تم نے کیوں لکھی؟''

''اس طرح سے بات نہ کرو۔ تمہارے اندر میرے لیے جتنا بھی غصہ ہے۔ اس وقت اسے بھول کر ایک بار میری بات اس سے کروا دو۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں، میرا اس سے بات کرنا بے حد ضروری ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ اتنا ضروری ہے۔ جتنا تم کہہ رہی ہو۔ ویسے وہ میرے سامنے ہی بیٹھا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس وقت میں فون پر کس سے بات کر رہی ہوں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے بالکل محسوس نہیں ہو رہا کہ وہ تم سے بات کرنے میں کچھ دلچسپی رکھتا ہے۔ کیا کہا تم نے گرانٹ فون بند کر دوں؟ نہیں۔ ایسا مت کہو۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آخر وہ......''

''اسے فون دو۔ وہ سامنے بیٹھا ہے تو بات کیوں نہیں کرتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

البا کی بے مہر ہنسی سنائی دی۔ ''تم تو رونے لگی ہو پرنیاں! میں تو روئی نہیں تھی جب مجھے تمہاری اور گرانٹ کی شادی کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ میں بچپن سے ہی بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔ بڑی سے بڑی بات سہہ جاتی ہوں۔ مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر جب گرانٹ نے مجھ سے معافی مانگی اور وضاحت کی کہ پرنیاں نامی مذہبی جنونی سے شادی کرنا تو محض ایک ضد کی تکمیل کے لیے تھا تو میں نے اپنا دل صاف کر لیا۔ مجھے جو اذیت پہنچی۔ اس کی تلافی گرانٹ نے اس انداز سے کی کہ میں تمہیں تفصیل بتاؤں تو تم یقین ہی نہیں کرو گی۔'' وہ دوبارہ ہنسی۔

پرنیاں کو لگ رہا تھا، اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ وہ حلق کے بل چیخی۔

''گرانٹ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اگر وہ تمہارے پاس موجود ہوتا تو تمہاری باتوں کے جواب میں تمہارا منہ توڑ دیتا۔ خاموش بیٹھا نہ رہتا۔''

''اگر یہ بات ہے تو میں فون بند کر رہی ہوں۔ جب تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہیں تو پھر اس بات چیت کا فائدہ۔''

''فون بند مت کرنا۔ مجھے جتنی بھی گالیاں دینا چاہتی ہو دے لو مگر ایک بار مجھے گرانٹ سے بات کر لینے دو۔ خدا کے لیے اسے فون دو۔'' وہ گھگھیا کر بولی۔

''میں نے تم سے کچھ چھین لیا ہوتا تو تم کو شکایت کرنے کا حق تھا مگر تم بھول رہی ہو کہ میں گرانٹ کی پہلی محبت ہوں۔ میں

تم دونوں کے بیچ نہیں آئی بلکہ تم ہم دونوں کے درمیان آ گئیں۔ اور اس طرح گھس آنے والوں کو کیا کہتے ہیں۔ معذرت چاہتی ہوں انگریزی پر مجھے زیادہ عبور نہیں اور اسپینش تم نہیں سمجھ سکتیں۔ وہ ایک اچھا سا لفظ ہے انگریزی زبان میں کیا ہے وہ گرانٹ؟ ہاں مجھے یاد آ گیا۔ intruder، تم intruder ہو پرنیاں اور میں گھر کی مالک۔ اپنے اور میرے مقام کو پہچانو۔ گرانٹ کو تم سے ذرہ بھر بھی دلچسپی ہوتی تو وہ تمہیں تمہاری مشکلات سے نکالنے پاکستان کیوں نہ آ جاتا۔ تم سے شادی محض اس لیے کی کہ ہر مرد میں ایک فاتح ہوتا ہے، وہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کرنا چاہتا ہے ورنہ اس کی انا بے مزہ ہوتی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں۔ شادی کے بغیر تم گرانٹ کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہی تھیں تو اس نے سوچا کہ چلو دوسرا طریقہ ہی سہی۔ وہ بہت ہی پیارا لڑکا ہے، اس وقت مسکراتے ہوئے وہ کسی فرشتے کی مانند معصوم نظر آ رہا ہے۔"

پرنیاں کچھ دیر گہرے گہرے سانس بھر کر اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں یہ باتیں خود گرانٹ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔ تم قیامت کے دن تک مجھے یہ سب بتاتی رہو۔ میں نہیں مانوں گی۔ مجھے یقین نہیں آئے گا۔ تم نے جو بھی کہا ہے، اس کا ایک ایک لفظ جھوٹ ہے۔"

"میں پہلے ہی امید کر رہی تھی کہ تم ایسا ضرور کہو گی۔ ویسے میں گرانٹ کو پریشان کرنا چاہتی تو نہیں تھی۔ مگر تمہاری ضد ہے تو کیا کیا جائے۔ اور ہاں کیا میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ گرانٹ اور میں ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے، ایک ہی کمرے میں۔ اس کمرے کی سجاوٹ میں نے خود کی ہے۔ ایک ایک چیز اپنی پسند سے منتخب کی ہے اور اس کمرے میں بیڈ ایک ہی ہے۔" اس نے "ایک ہی" کو لمبا کھینچا تھا۔

"گرانٹ سے کہو، مجھ سے بات کرے۔"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ اسے لگا ساری کائنات دم سادھ کر کسی خاص لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید وہ خواہش کر رہی تھی کہ گرانٹ ٹیلی فون پر نہ آئے۔ اپنی کیفیت کو وہ خود سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پھر گرانٹ کی آواز اس کے کانوں میں اتری۔

"اس نے سچ کہا ہے۔" پرنیاں نے جان لیا کہ تیزاب سے جھلسنے والا جسم کیا محسوس کرتا ہوگا۔ پانچ لفظوں نے اس کی تقدیر بدل ڈالی تھی۔ "اس نے سچ کہا ہے۔" پانچ لفظوں سے بنا ایک جملہ اور وہ تخت سے اتار کر دار پر چڑھا دی گئی تھی۔

"سنو گرانٹ! تم نے مجھے برباد نہیں کیا۔ کوئی انسان کسی انسان کا مقدر نہیں بدل سکتا۔ مجھے خدا نے برباد کیا ہے۔ میں نے ایک انسان کو خدا کے مقابل لانے کی کوشش کی تھی اور خدا نے مجھے میری اوقات یاد کروا دی۔ میرے لیے زمین اور آسمان کے بیچ کہیں پناہ نہیں ہے۔ میری بربادی کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ یہ میں تمہیں اس لیے نہیں بتا رہی کہ مجھے اب بھی تم سے کوئی امید ہے بلکہ اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم جان لو، خدا جب منہ کے بل گراتا ہے تو ٹھوکر کھانے کے لیے کسی رکاوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

گرانٹ نے اور کچھ نہیں کہا تھا۔ کچھ اور کہنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔

☩ ☩ ☩

وہ چوکھٹے میں جڑی تصویر کی مانند ساکت تھی۔ ان لمحات میں مریم کو اس کے زندہ ہونے پر شبہ ہوا تھا۔

"مریم! جب میں چھوٹی تھی تو ایک دن ابو کے ساتھ کہیں باہر گئی۔ ابو کو شاید کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ وہ ایک دکان دار سے باتیں کر رہے تھے اور میں ان کی انگلی پکڑے سامنے والی گلی میں ایک کتے کے پلے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک لاغر سا پلا تھا مگر بے حد پیارا

تھا۔ کالا سفید چتکبرا سا، اس کی تھوتھنی پر ایک گلابی دھبہ تھا۔ وہ سڑک کے دوسری جانب تھا اور سڑک پار کرنے کے لیے بار بار آگے بڑھتا تھا اور کسی تیز رفتار گاڑی کو آتا دیکھ کر جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ پھر ایک موقع دیکھ کر وہ دوڑ پڑا لیکن وہ سڑک کے دوسرے کنارے تک نہیں پہنچا۔ اس کے پیچھے گلی سے نکلنے والی ایک موٹر کار نے اسے کچل دیا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ اس کا پچھلا دھڑ پچک گیا تھا۔ اس کی آنتیں پیٹ سے باہر آ گئی تھیں، اس کے گوشت کے گلابی چیتھڑے سڑک سے چپکے ہوئے تھے۔ درد سے اس کے جبڑے جڑ گئے تھے۔ لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ اس کا ریشہ ریشہ ادھڑ گیا تھا، بوٹی بوٹی اکھڑ گئی تھی۔ پر وہ مرتا ہی نہ تھا۔ میں رونے لگی اور ابو سے کہا کہ اسے ٹھیک کر دیں۔ اسے بہت درد ہو رہا ہے تو وہ بولے کہ جب وہ مر جائے گا تو درد رک جائے گا۔ میں اس جگہ سے جانا نہیں چاہتی تھی پر ابو زبردستی مجھے وہاں سے لے آئے۔ میں تب تک گردن موڑے اسے دیکھتی رہی جب تک وہ مجھے نظر آتا رہا۔ جانے اس کی جان کیوں نہ نکلتی تھی۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک نہ مرا ہوگا۔ کب تک اُس نے وہ عذاب سہا ہوگا؟ کاش ابو مجھے وہیں رکنے دیتے تو میں اسے مرتے ہوئے دیکھ سکتی۔ مجھے یہ اطمینان تو ہو جاتا کہ درد رک گیا ہے۔ آج مجھے وہ کتے کا پلا بہت یاد آ رہا ہے۔

''تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ تو اچھا ہے، رات بہت بیت گئی ہے۔''

''خدا نے مجھے اس کے دل سے نکال دیا۔ یا میں کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ جس جگہ آپ موجود ہی نہ ہوں، وہاں سے نکلا کیسے جاتا ہے؟''

''گھڑی بھر آنکھیں بند کر کے لیٹو۔ تمہیں سکون محسوس ہوگا۔''

''ستمبر کی آٹھ تاریخ تھی جب پہلی بار میں اس سے ملی تھی اور آخری بار سترہ نومبر کو۔ کتنے دن ہوئے؟ تمہیں گننے کی ضرورت نہیں ہے میں کئی بار گن چکی ہوں۔ دو مہینے اور گیارہ دن۔ اکہتر دن۔ میں بیس سال اپنے ماں باپ کے ساتھ رہی، میں نے اکہتر دنوں کو بیس سالوں پر ترجیح دی۔ بیس سالوں میں تو اتنے دن ہیں کہ مجھ سے گنے بھی نہیں جاتے۔ میرے ماں باپ نے مجھے طب پڑھانے کے لیے ملک سے باہر بھجوایا۔ انہیں چاہیے تھا مجھے ریاضی پڑھنے بھیجتے مجھے تو حساب کرنا ہی نہیں آتا جو بیس سالوں پر اکہتر دنوں کو برتری دے۔ تم ہی بتاؤ اسے حساب سیکھنے کی کس قدر ضرورت ہے۔'' مریم اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤ گی۔ اس سے کیا ہوگا؟''

''اپنے نکاح والے دن جب میں اس سے مل کر لوٹی تو میرے لباس پر کیچڑ لگی تھی۔ میں نے وہ لباس محفوظ کر لیا۔ تم بتاؤ کوئی کیچڑ بھی سنبھال کر رکھتا ہے، میں نے کیچڑ کے عوض اپنا آپ بیچ دیا۔ گھٹیا سے گھٹیا شے کے بھی بازار میں اس سے بہتر دام ملتے ہیں۔ دنیا میں کسی نے ایسا گھاٹے کا سودا بھی کیا ہوگا؟''

''خاموش ہو جاؤ۔ کچھ مت بولو اور کچھ نہ سوچو۔''

''تم نے کبھی کسی گونگے کو روتے سنا ہے۔ انہیں روتے ہوئے سننا بڑا اذیت ناک ہوتا ہے، وہ اپنا دکھ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے تو بولنے والوں سے زیادہ شدت سے روتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی جانور کو کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ گونگے کے رونے کی آواز بڑی غیر انسانی ہوتی ہے۔ میرا بھائی گونی۔ ایک ہی بھائی ہے میرا۔ وہ بھی گونگا ہے۔ وہ روتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا، کانوں پر ہاتھ رکھ لوں لیکن اب لگتا ہے کانوں پر ہاتھ رکھنے سے بھی آواز آنا بند نہیں ہوگی۔''

مریم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''تم رو لو۔ تھوڑے آنسو بہیں گے تو جی ہلکا ہو جائے گا۔ رونا آ رہا ہے تو خود کو مت روکو۔''

پرنیاں کی خشک آنکھوں اور جامد خطوط میں حیرت امڈی۔

''کوئی اپنی موت پر بھی روتا ہے کیا۔ میں اپنے مرنے پر خود کیسے رو سکتی ہوں؟''

مریم کے ہونٹ بھنچ گئے۔ شدید بے بسی محسوس کرتے ہوئے وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

رات کے آخری پہر تک پرنیاں کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اسے نیند آتی تھی اور وہ خود پر جبر کر کے سونے سے باز رہتی تھی، اس رات سونے کے تصور سے اسے خوف آ رہا تھا۔ گجر بجے اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور اس نے وہی خواب دیکھا جو لاس اینجلس کے ایک پارک میں گرانٹ سے ملنے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ فلک بوس پیڑوں سے گھری ایک پیالہ رو جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ زمین پر گھنی سبز دوب کے الجھے ہوئے ڈھیر تھے جن میں اس کے پاؤں دھنسے جاتے تھے۔ فضا انوکھے طرب سے معمور تھی۔ جیسے ان گنت مجیرے بج رہے ہوں۔ جھیل کے نیلگوں پانی کی سطح پر ایک راج ہنس تیر رہا تھا، وہ اتنا سفید تھا کہ اس پر نظر ٹھہرنا مشکل تھا۔ راج ہنس کے الوہی پروں کو چھونے کی شدید خواہش سے بے قرار ہو کر وہ جھیل کے سرد پانی میں اتر گئی۔ ذرا سا آگے سرکنے پر کسی عجیب سے احساس نے اس کے دل میں سہم پیدا کر دیا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا جیسے نیلے آسمان پر کسی نے سیاہ روشنائی کی شیشی الٹ دی ہو۔ وہ ٹھٹک کر تھم گئی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کو کچھ چیزیں چھو کر گزر رہی تھیں۔ اگلے ہی پل اسے معلوم ہو گیا کہ وہ چیزیں آسمان سے اترتی ہوئی مردہ تتلیاں تھیں۔ وہ اتنی تعداد میں گر رہی تھیں کہ آسمان سے زمین تک ان کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر کہیں سے دو بڑے بڑے ہاتھ آگے آئے اور اس کی گردن گرفت میں کس لی۔ ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس نے قاتل کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چہرے سے رنگین مکھوٹا سرکا ہوا تھا۔ وہ اسے پہچان گئی۔ وہ ایڈم گرانٹ تھا۔ وہ جاگی تو اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا، وہ ایک بار پھر نیند میں چلی گئی۔ دن چڑھے تک وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بے سدھ پڑی رہی۔

اس کی بند پلکوں کے پیچھے نساچری (ڈائن) نیند ان گلیوں میں چکراتی پھری جہاں خوابوں کے مکان تھے۔ سرخ، زرد، اور سیاہ گنڈوں پر منتر پھونکتی ہوئی، خوابوں کے کلیجے نوچتی ہوئی، ہر در پر آسیبی دستکیں چسپاں کرتی رہی۔

وہ دوبارہ جاگی تو سورج کی لشک سے آنگن بھرا ہوا تھا۔ پچھل پائی نیند اس کے پپوٹوں پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اتری اور رکت چندن کی سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مریم کسی کام سے اندر آئی تو اس نے پرنیاں کو آئینے میں اپنے عکس کو گھورتے ہوئے پایا۔

''مریم!'' اس نے آئینے سے نظر ہٹائے بنا آواز دی۔

''میں آج آمنہ کی ماں کے پاس جاؤں گی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس بچے کو پیدا ہونا چاہیے۔''

✠ ✠ ✠

غیر مقفل دروازے نے اسے باور کروا دیا کہ البا اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ رائن ہسپتال میں تھا اور ان دونوں کے علاوہ البا ہی تھی جس کے پاس اپارٹمنٹ کی چابی تھی۔ وہ دل میں سوچتا ہوا اندر آیا کہ اسے البا سے فاصلہ بڑھانے کے لیے کوئی مناسب حکمت عملی اپنانی چاہیے۔ پہلے معاملات کس ڈگر پر جا رہے تھے۔ اس نے کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا تھا۔ مگر اب بات اور تھی۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب اس نے پرنیاں کو بیوی کی حیثیت سے اپنی زندگی میں شریک کر لیا تھا۔ اب تک آخری ملاقات کی سرشاری اس کے بند بند میں تیز شراب کی مانند دہک رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ البا کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کوئی پیچیدگی پیدا ہو۔ البا سے میل ملاقات ترک کرنے میں ہی اسے عافیت نظر آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپارٹمنٹ میں اس کی آمد روکنے کی خاطر اسے دروازے کا لاک تبدیل کروانا پڑا تو وہ ایسا ہی کرے گا۔

اندر آنے کے بعد اسے البا کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ باتھ روم کے دروازے کے پیچھے سے آتے ہوئے شور سے اندازہ ہوا کہ کوئی نل کھلا ہوا تھا۔ شاید البا باتھ روم میں تھی اور اس نے تنہا ہونے کی بنا پر دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ خاصی دیر کاؤچ پر بیٹھا اس کے

باہر آنے کا انتظار کرتا رہا اور اسے چند آوازیں بھی دے ڈالیں۔ مگر نہ کوئی جواب موصول ہوا اور نہ ہی نل سے گرتے پانی کا شور بند ہوا۔ بالآخر وہ اٹھ کر باتھ روم کے دروازے کے قریب گیا اور بلند آواز میں اس کا نام پکار کر دستک دی کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ حیران ہوتے ہوئے اس نے دروازے سے اندر جھانکا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ صوفیہ گہرے پیندے والے بڑے ٹب میں بیٹھی تھی اس کے اوپر لگے نل سے متواتر ٹب میں پانی گر رہا تھا۔ وہ سیاہ آنکھوں سے پانی کی دھار کو گھورتے ہوئے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وہ بمشکل چھ ماہ کی تھی اور ابھی اس نے ٹھیک طرح سے بیٹھنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ٹب کا حجم اتنا تھا کہ صوفیہ آسانی سے اس میں ڈوب سکتی تھی۔ اور اگر احمد نے کچھ دیر اور انتظار کیا ہوتا تو شاید وہ ڈوب ہی گئی ہوتی۔

اس نے عجلت میں آگے بڑھ کر صوفیہ کو گود میں اٹھالیا اور نل کو بند کرتے ہوئے اونچی آواز میں البا کو غلیظ گالی دی۔ جانے وہ خود کہاں تھی۔ اس نے تولیے سے صوفیہ کو اچھی طرح خشک کیا۔ اور اسے کمبل میں لپیٹ کر کاؤچ پر لٹا دیا۔ کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے حشیش کی بو محسوس ہوئی تھی۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ البا ٹیرس پر تھی۔ اس کا خیال درست تھا۔ وہ ٹیرس کے جنگلے سے لگی حشیش سونگھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خمار کے سبب نیم وا تھیں اور چہرے پر غیر فطری پتھریلا پن طاری تھا۔

''کیا شے ہو تم؟ کیا تم اسے جان سے مارنا چاہتی تھیں۔'' احمد نے طیش سے مغلوب آواز میں چیخ کر کہا۔

''میرے چاہنے سے کچھ ہوتا گرانٹ! تو کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوتا لیکن یہی تو مصیبت ہے میں جو چاہوں۔ وہ ہوتا ہی نہیں۔'' اس کی آواز میں لہک سی تھی۔

''نکل جاؤ یہاں سے، دفع ہو جاؤ۔ تم میں انسانیت ہے ہی نہیں۔ ذرا غور کرو۔ وہ صرف چھ ماہ کی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ مجھے آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ مر گئی ہوتی۔ تم نے جان بوجھ کر اسے مار ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میں شروع سے تمہارا چلن دیکھتا آ رہا ہوں۔ صوفیہ تمہارے ساتھ محفوظ نہیں ہے۔ تم اسے نہیں رکھنا چاہتیں تو اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دو۔''

البا نے کوئی جواب نہ دیا اور رخ بدل کر نیچے سڑک کو دیکھنے لگی۔

''میں نے کہا ہے، یہاں سے چلی جاؤ۔ میں تمہیں اس اپارٹمنٹ میں برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ خاموش کھڑی رہی۔

''اگر تم نہ گئیں تو میں تمہیں گھسیٹ کر دروازے سے باہر پھینک دوں گا۔'' وہ غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس کے قریب گیا اور کندھے سے پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''میں بھول گئی تھی، تم بھی تو بھول جاتے ہو۔ ہم سب کبھی نہ کبھی کچھ بھول ہی جاتے ہیں۔''

''میں تمہاری کوئی وضاحت نہیں سنوں گا۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ آئندہ میں تم سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔'' اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''میری ٹانگیں سن ہو گئی ہیں، ابھی چلوں گی تو گر جاؤں گی۔ مجھے تھوڑی دیر یہیں رہنے دو۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

وہ چند لمحے کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا پھر جھٹکے سے مڑ کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ صوفیہ منہ میں ہاتھ کا انگوٹھا لیے اسے چوس رہی تھی اور اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔

احمد فرش پر یہاں وہاں بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے میں مشغول ہو گیا۔ کافی دنوں سے اس نے کمرے کی صفائی نہیں کی تھی اور ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ صفائی سے فراغت پانے کے بعد اس کا پاکستان ٹیلی فون کرنے کا ارادہ تھا۔ وارڈ روب کے پٹ کھولتے ہوئے اس نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ پرنیاں اب تک اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی۔ تمام کپڑے ترتیب سے کھونٹیوں پر لٹکاتے ہوئے اس نے اپنی جیکٹ کو ہاتھ میں لیا تو اس سے آتی مہک سے اسے لگا کہ وہ تازہ دھلی ہوئی تھی۔

اسے تشویش محسوس ہوئی۔ اپنی شادی کے روز اس نے یہی جیکٹ پہنی تھی اور پرنیاں کا دیا ہوا پتا اور ٹیلی فون نمبر والا کاغذ اسی جیکٹ کی جیب میں رکھا تھا۔ وہ جیکٹ کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ تمام جیبیں خالی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر ساری جیبیں کھنگال ڈالیں۔ اسے وہ کاغذ نہیں مل سکا تھا۔ اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ پا کر اس نے گردن گھمائی۔ البا کچھ تصویریں ہاتھ میں لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

''کیا انہیں ڈھونڈ رہے ہو تم؟''

اس نے ایک ہی نظر میں جان لیا کہ وہ اس کی اور پرنیاں کی تصویریں تھیں جو انہوں نے شادی والے دن ایک فوٹو گرافر سے بنوائی تھیں۔

''میں کہہ رہی تھی ناں۔ تم بھول جاتے ہو، تم مجھے اپنی شادی کے بارے میں بتانا بھول گئے۔ کیسی عجیب بات ہے۔''

''یہ تمہیں کہاں سے ملیں؟''

''اسی جیکٹ کی جیب میں رکھی تھیں۔ میں نے اسے دھونے سے پہلے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر۔''

''کیا؟ تم نے اسے دھویا ہے لیکن کس لیے؟ کس نے کہا تھا تم سے؟''

''اس پر بارش کے قطروں سے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تمہارے کپڑوں پر مٹی بھی لگی تھی۔ لگتا ہے تم نے بارش کا خوب لطف لیا۔''

''اس کی جیب میں ایک کاغذ تھا، وہ کہاں ہے؟'' اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا کاغذ؟'' البا نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''مجھے تو کوئی کاغذ نہیں ملا۔ تم اس تصویر میں کتنے اچھے لگ رہے ہو۔ تم ہمیشہ ہی اچھے لگتے ہو۔'' اس نے ایک تصویر احمد کی آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

اس تصویر میں وہ اور پرنیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ احمد نے تصویر چھین کر ایک طرف اچھال دی۔

''میں تم سے جو پوچھ رہا ہوں۔ صرف اس کا جواب دو۔''

''کیا پوچھ رہے ہو تم؟''

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر چیخا۔ ''ملعون عورت! میرے ساتھ کھیل مت کھیلو۔ تم نے اس کاغذ کا کیا کیا ہے؟ مجھے وہ چاہیے۔ ابھی۔''

البا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ''میرا ذہن ہی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا۔ مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ ایسا کوئی کاغذ میں نے دیکھا ہے۔ وہ اتنا اہم تھا، میں اسے گم کیسے کر سکتی ہوں۔ مجھے وہ ملا ہی نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔''

احمد کے لیے اپنے غصے پر مزید قابو رکھنا ناممکن ہو رہا تھا۔ ''میں تم پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے تم دفع ہو جاؤ۔ آئندہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اپارٹمنٹ میں موجود ہوں یا نہیں۔ تم یہاں پاؤں رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔''

البا خاموش ہو گئی اور خالی خالی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ احمد نے چند لمحے اس کے جانے کا انتظار کیا اور جب ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو بازو سے پکڑ کر اسے دروازے کی سمت دھکیل دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ البا نے جان بوجھ کر وہ کاغذ ضائع کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی واہیات عورت تھی، اب پرنیاں سے بات کرنا کیسے ممکن ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی بہت ڈری ہوئی تھی اگر اس نے فون نہ کیا تو اور پریشان ہو جائے گی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ٹیلی فون نمبر اس سے گم ہوا تھا۔ پرنیاں کے پاس تو موجود تھا وہ کچھ دن انتظار کر کے خود ہی اپارٹمنٹ کے نمبر پر اسے فون کرے گی۔ یہ سوچ کر اس کی تشویش میں خاطر خواہ کمی ہو گئی۔ وہ وارڈروب کے باقی ماندہ خانوں

کی ترتیب درست کرنے لگا۔ اچانک اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑا اور کاؤچ پر لیٹی صوفیہ کو دیکھ کر بے اختیار اس کے ہونٹوں سے البا کے لیے ایک غلیظ گالی برآمد ہوئی۔

وہ عورت اسے زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ بے دھیانی میں صوفیہ کو ساتھ لے جانا بھول گئی ہو۔ اس نے جھپٹ کر صوفیہ کو اٹھایا اور اپارٹمنٹ سے باہر آ کر سیڑھیوں کی سمت بھاگا۔ اسے پوری امید تھی کہ البا ابھی بمشکل پارکنگ تک ہی پہنچی ہوگی۔ چند سیڑھیوں کے بعد اسے رک جانا پڑا تھا۔ البا ایک زینے پر بیٹھی گردن اٹھائے اسے نیچے اترتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ کپڑے جھاڑتی ہوئی وہ اٹھی اور متوازن آواز میں بولی۔

''میں اپنا کچھ اسٹف تمہارے کمرے میں چھوڑ آئی ہوں۔''

''اسٹف'' سے اس کی مراد یقیناً منشیات سے تھی۔

''تم اجازت دو تو میں تمہاری چند تصاویر رکھ لوں۔ یونہی یادگار کے طور پر۔''

بری طرح روتی ہوئی صوفیہ پر ذرا بھی دھیان دیئے بنا وہ احمد کے قریب سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔

✠ ✠ ✠

Polish ہدایت کار کو جانتے ہوئے اسے کچھ دن ہی بیتے تھے مگر وہ کام سے اس کی لگن کا دل سے قائل ہو چکا تھا۔ وہ معمولی سے معمولی باتوں کو بھی نظرانداز نہیں کرتا تھا۔ احمد اور سمون فاکس مین میں ذہنی ہم آہنگی بڑھانے کی غرض سے اس نے کچھ اس قسم کا معمول مرتب کیا تھا کہ دن میں ایک وقت کا کھانا وہ دونوں اکٹھے کھاتے تھے۔ اگرچہ ان ملاقاتوں میں سمون کا رویہ سرد اور کسی حد تک ہتک آمیز رہتا تھا لیکن احمد ان چھوٹی چھوٹی مصیبتوں سے بددل ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ جب سمون کے ساتھ ہوتا تو خود کو 'لیوین' کے سانچے میں ڈھال لیتا، وہ بس ایک جسم ہوتا جس کے اندر ایک نئی روح حلول کر جاتی۔ سمون اس کی نظر میں سمون نہ رہتی، وہ 'لیوین' کی 'کیٹی' بن جاتی۔

سالومن موریل نے ماضی میں اپنی فلموں میں اچھوتا پن لانے کے لیے بہت سے تجربات کیے تھے لیکن احمد جیسے گم نام کو مرکزی کردار میں لینے جیسا بڑا جوا اس نے پہلے نہیں کھیلا تھا۔ اس کے کئی خیراندیشوں نے اسے اس اقدام سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا، ان خیرخواہوں میں سب سے بڑھ کر اسے متنبہ کرنے والی سمون فاکس مین تھی۔ اگر موریل کا نام اس فلم سے جڑا ہوا نہ ہوتا تو یقیناً سمون کبھی بھی اس میں کام کرنے کی حامی نہ بھرتی۔ سالومن کا ارادہ البتہ متزلزل نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنی بصیرت پر پورا اعتماد تھا اور یہ بازی کھیلنے میں جو خطرات درپیش تھے، وہ اس کے لطف کو دوچند کر رہے تھے۔

اپنی توانائی کا سب سے بڑا حصہ وہ احمد پر صرف کر رہا تھا کیونکہ 'لیوین' اس کی فلم کا protagonist (ہیرو) تھا۔ اس کے تخیل میں لیوین کی ایک مخصوص شبیہ تھی۔ وہ احمد کی کردار نگاری میں وہی رنگ بھر پاتا تو کامیابی یقینی تھی۔ احمد کے لہجے میں دیہاتی اکھڑپن اور سادگی کا تاثر لانے کے لیے وہ اسے دیہی علاقوں میں بھجوانے اور وہاں کے لوگوں میں گھلنے ملنے کے مواقع فراہم کرتا۔ جسمانی تربیت کے دو ماہرین مقرر کیے گئے تھے تاکہ اس کا بدن دہقانوں کی مانند مشقت کوش دکھائی دے۔ گھڑسواری اور نشانہ بازی کی مشقیں اس کے معمول میں شامل کی گئی تھیں۔

احمد ابراہیم سے ایڈم گرانٹ بننے کے سفر میں یہ پہلا موقع تھا جب احمد کو منزل پا لینے کا مکمل یقین تھا۔ اس کی خوشی میں کوئی رخنہ نہیں تھا۔ وہ مہنگے ریستورانوں میں کھاتا تھا۔ سفر کرنے کے لیے اس کے پاس پچیس سو ڈالر مالیت کی Chevy Nova کار تھی۔ سالومن نے اسے برنٹ وڈ کے علاقے میں ایک فرنشڈ فلیٹ کی چابی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم فی الحال وہ کہیں اور منتقل نہیں ہونا

چاہتا تھا کیونکہ اپنے اپارٹمنٹ والے ٹیلی فون کے سوا اس کے اور پرنیاں کے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ پرنیاں کی جانب سے خاموشی پر وہ حیران بھی تھا۔ وہ روزانہ اپنی آنسرنگ مشین کے پیغامات سنتا صرف اس امید پر کہ پرنیاں کی آواز سن پائے گا۔ شاید وہ پاکستان جا کر بہت زیادہ مصروفیت بھرے دن گزار رہی تھی۔ خود بھی وہ تو اتنا مصروف تھا کہ اس معاملے پر پریشان ہونے کے لیے اسے وقت ہی میسر نہیں تھا۔

اپنی فلموں کی تشہیر کے سلسلے میں سالومن نے کچھ اصول وضع کر رکھے تھے۔ جب تک پروجیکٹ پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا، اس کے بارے میں کوئی معلومات وہ اخبارات کو فراہم نہیں کرتا تھا۔ اس کی کاسٹ اور کریو کو الیکٹرونک یا پرنٹ میڈیا سے رابطہ کرنے کی سخت سے ممانعت تھی۔ احمد پر بھی یہ ہی اصول لاگو ہوتا تھا۔ اس نے سالومن کی فلم اور اپنے کردار کے متعلق منہ سے بھاپ تک نہ نکالی تھی مگر فلم نگری بانس کے جنگل کی مانند گھٹن زدہ اور فعال جگہ تھی۔ یہاں ایک پتی سے چمٹا کوئی بینا چلاتا تو پورا جنگل جھنجھنا اٹھتا۔ خبروں کے سفر کرنے کے یہاں کئی چور ذرائع تھے۔ شاید ایسے ہی کسی ذریعے سے احمد کے بارے میں کچھ باتیں غیر متعلق لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں۔

ایک روز رات گئے وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسیور اٹھاتے وقت اس کے گمان میں کہیں یہ بات نہ تھی کہ دوسری طرف ہالی وڈ کے سب سے نامور ایجنٹ کی پیشکش اس کی منتظر ہوگی۔ فون کرنے والی جارج فلپ کی سیکریٹری کیتھی تھی وہی جارج فلپ جس نے کئی برس قبل احمد کو اپنے دفتر سے دھتکار کر نکال دیا تھا۔ کیتھی نے جونہی خود کو متعارف کروایا۔ اس دن کی اذیت تمام جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔

''شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔ میں سمجھ رہی تھی۔ تمہیں اپنے بارے میں یاد کروانے کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑے گی۔'' کیتھی نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں اور تمہارے باس کو میں کبھی نہیں بھلا پایا۔ ہالی وڈ آنے کے بعد جب میں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تو سب سے پہلا سفر جارج فلپ کے آفس تک ہی کیا تھا۔ میں چالیس میل سے زائد فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچا تھا اور میرے پاس کار بھی نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں طنز کی عدم موجودگی نے کیتھی کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

''میں مسٹر فلپ کی جانب سے تمہیں تمہاری کامیابی پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ تم نے وہ کر دکھایا ہے جس پر ہالی وڈ کا بڑے سے بڑا نام بھی رشک کرنے پر مجبور ہوگا۔''

احمد کو اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ پر جوش لگا۔

''شکریہ تمہاری ستائش مجھے خوشی پہنچا رہی ہے۔ کیا تم نے صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے۔''

''تم اتنے ذہین ہو۔ یقیناً سمجھ گئے ہو گے کہ میرا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ دراصل جارج فلپ بطور ایجنٹ تمہاری نمائندگی کرنے کا خواہش مند ہے۔ اگر ہمیں ملنے والی معلومات صحیح ہیں تو اب تک تم نے کسی کو اپنا ایجنٹ مقرر نہیں کیا۔''

بے اختیار احمد کو ہنسی آ گئی، اس کا جی قہقہہ لگا کر ہنسنے کو چاہا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو ایسا کرنے سے روکے رکھا۔ بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا۔

''جارج فلپ جیسے عظیم ایجنٹ کی یادداشت اتنی کمزور کیسے ہوسکتی ہے۔ اس نے جب مجھے اپنے آفس سے بے عزت کر کے نکالا تھا تو مجھے ایک تاریخ لکھ کر دی تھی اور کہا تھا کہ اس تاریخ کو مجھے ملنا۔ کیونکہ اس تاریخ سے پہلے اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس پر اتنا برا وقت آ جائے گا کہ وہ مجھ جیسے گھٹیا اور نقلی فنکار کی نمائندگی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ میں نے اس کا دیا ہوا کاغذ کا پرزہ آج تک

سنبھال کر رکھا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس تاریخ کے آنے میں ابھی تقریباً آٹھ سال باقی ہیں پھر اتنی جلد بازی کیا معنی رکھتی ہے۔ جارج سے کہنا میں اس کی دی ہوئی تاریخ پر ضرور اس سے ملوں گا۔ بس خدا سے دعا ہے کہ تب تک وہ زندہ رہے۔ سنا ہے ان دنوں اس کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں رہتی۔''

وہ جانتا تھا کہ کیتھی اس کے پیغام میں توہین کے عنصر کو جتنا بھی مدھم بنا کر پیش کرے، جارج فلپ کے لیے وہ ایک زناٹے دار تھپڑ کی طرح ہوگا۔

ایک اور شام کا ذکر ہے کہ وہ گھڑسواری کے تربیتی سبق کے بعد اپارٹمنٹ جانے کے لیے روانہ ہوا تو تمام راستہ ایک شخص کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے پایا، کچھ دیر تو وہ اس کی حرکات سے پریشان ہوتا رہا اور ارادہ کیا کہ cops کو اس کی بابت مطلع کرے لیکن جب اسے احساس ہوا کہ وہ شخص اس کی بے خبری میں اس کی تصاویر بنانا چاہتا تھا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک paparazzo (ایسا فوٹو جرنلسٹ جو مشہور لوگوں کی نجی زندگی کے لمحات کو تصاویر کی صورت میں میڈیا کو فراہم کرتا ہے) تھا۔ احمد نے اس کے کیمرے کی زد سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے یہ بات بے حد خوشی پہنچا رہی تھی کہ ایک paparazzo اس کا پیچھا کر رہا تھا اور paparazzi کسی عام آدمی کا تعاقب نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک طرح سے اس کے سیلبریٹی ہونے کا ثبوت تھا۔ تفاخر کی طاقتور لہر نے اس کے دل و دماغ میں سنسنی سی دوڑا دی۔ جس مقام کو پانے کی خاطر وہ اتنے برسوں سے ترس رہا تھا، اس کے قدموں تلے بچھنے کو دوڑا چلا آ رہا تھا۔

کھیل کے اس دور میں اس کی حریف ''زندگی'' نے اس کے ساتھ ملی بھگت کر لی تھی۔ اس نے اپنے ''پتے'' احمد کو دکھا دیے تھے۔ وہ ہر حال میں اسے جتانا چاہتی تھی۔ ایک بات اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ وہ ''کمینی'' ترپ کا پتا اپنے پنجے میں پوشیدہ رکھتی ہے اور ایسے وقت میں اسے ظاہر کرتی ہے جب مقابل کو اپنی فتح پر کامل ایمان آ جاتا ہے۔



پرنیاں کو پاکستان گئے ہوئے تقریباً تین ہفتے بیت گئے تھے جب ایک روز اس کا ٹیلی فون آ گیا۔

احمد یہ جان کر ششدر رہ گیا تھا کہ وہ اس سے قبل ان گنت بار اس کی آنسرنگ مشین پر پیغامات ریکارڈ کروا چکی تھی۔ پھر وہ اسے کیوں نہیں ملے تھے۔ اس معاملے میں اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کیوں، کا حتمی جواب البا ہی دے سکتی تھی۔ اگرچہ اس کے سختی سے منع کرنے کے بعد البا اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ مگر اس کی غیر موجودگی میں وہ اپارٹمنٹ میں نہیں آئی ہوگی، یہ بات ماننے والی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ البا نے پرنیاں کے پیغامات کو اس تک پہنچنے نہیں دیا تھا۔ البا سے باز پرس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، وہ صاف انکار کر دیتی۔ اسے اپنی غفلت پر غصہ آ رہا تھا جب اس نے دروازے کا لاک بدلوانے کا ارادہ کیا تھا تو اب تک اس پر عمل کیوں نہیں کیا تھا۔ بس اپنے مصروف معمول میں وہ فراموش کر بیٹھا تھا لیکن اب پہلا کام اسے یہی کرنا تھا۔

پرنیاں بہت پریشان لگتی تھی اور اسے پاکستان آنے کو کہہ رہی تھی۔ اسے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ تنہا ان معاملات سے نمٹ نہیں پائے گی۔ وہ سالومن کو اپنی ہنگامی شادی اور پرنیاں کے حالات کے متعلق بتا چکا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اسے اچانک پاکستان جانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اگلے روز اس نے سالومن کے سامنے اپنی بات دہرائی تو اس کا جواب ناں میں تھا۔ یہ تو طے تھا کہ سالومن کی نظر میں اس کی نجی زندگی سے زیادہ اہم وہ فلم تھی۔ احمد نے بدمزگی کے ڈر سے اصرار نہیں کیا اور مقرر کردہ معمول کے مطابق دن گزارتا رہا۔

چند دن بعد سالومن نے ذکر کیا کہ وہ لوکیشن اسکاؤٹ کی منتخب کی ہوئی لوکیشنز کا معائنہ کرنے برٹش کولمبیا روانہ ہو رہا ہے تو

اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک بار پھر اس سے درخواست کی کسی قدر پس وپیش کے بعد وہ مان گیا تھا اور اسے دو ہفتوں کے لیے پاکستان جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ پرنیاں سے دوری کو وہ کس طرح سہہ رہا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ سالومن کی آمادگی نے اس کے اندر ویسی ہی بے چینی بھر دی تھی جیسی اس نے چودہ سال کی عمر میں خواب میں خود کو ہالی وڈ میں دیکھنے پر محسوس کی تھی، اس رات ابراہیم کا مفلوج بدن اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ لاشعوری طور پر اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اب بھی کوئی رکاوٹ اس کے پیروں میں الجھ نہ جائے۔ وہ بنا کوئی وقت گنوائے تیزی سے انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اس دوران چند ایک دفعہ البا نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ کبھی وہ رہائشی عمارت کی سیڑھیوں میں کھڑی ملتی اور کبھی پارکنگ میں اپنی کار کے اندر بیٹھی ہوئی منتظر ہوتی۔ احمد نے ہر بار سامنے ہونے پر اسے سختی سے دھتکارا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو لینے پاکستان جا رہا ہے۔ لہٰذا وہ ان دونوں کے بیچ نہ آئے اور ان کی زندگی میں مداخلت نہ کرے۔ البا نے اس کے لہجے اور الفاظ کا کتنا اثر لیا تھا، یہ تو وہ نہیں جانتا تھا مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس نے احمد کو مخاطب کرنا ترک کر دیا تھا۔ راہ میں کہیں ملتی بھی تو خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ احمد نے اسے بھی غنیمت جانا تھا اور اسے بالکل نظر انداز کر کے گزر جایا کرتا تھا۔

جس روز اس کی فلائٹ تھی۔ وہ علی الصبح اٹھا اور عجلت میں ناشتہ کر کے اپنے کپڑے اور دیگر سامان بیگ میں رکھنے لگا۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز گونجی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنی صبح کون تھا جو اس کے دروازے پر آن کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے پر جونہی اس کی نظر البا پر پڑی، اس نے کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دینا چاہا لیکن البا شاید پہلے ہی اس بات کی توقع کر رہی تھی۔ پھرتی کے ساتھ اسے دھکیلتے ہوئے وہ اندر آ گئی تھی۔

''میری بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ میری زندگی سے نکل جاؤ۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تم ہی تو میری زندگی ہو۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔''

البا کی ڈھٹائی پر اس کا جی چاہا کہ دیوار سے اس کا سر ٹکرا کر اسے مار ڈالے۔

''ٹھیک ہے، تم میری زندگی سے نہیں جا سکتیں۔ فی الحال اس اپارٹمنٹ سے تو جا سکتی ہو۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو۔''

''میں خود بہت پریشان ہوں۔ کئی راتوں سے میں سوئی نہیں ہوں۔ تم کیوں مجھ سے دور ہونا چاہتے ہو؟ وہ خوبصورت دن جو ہم نے ساتھ بتائے، کیا ان کا ایک پل بھی تمہیں یاد نہیں؟''

احمد نے بے زاری سے ہاتھ جھٹک کر اسے خاموش ہونے کو کہا۔ ''میں بہت جلدی میں ہوں۔ مجھے کہیں پہنچنا ہے۔ ہم پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔''

''تم مجھے بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟ میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آئی ہوں۔ کافی اور اوٹ میل۔'' اس نے ہاتھ میں تھاما پیپر بیگ احمد کے سامنے کیا۔ ''میں Bacons خریدنے لگی تھی اور پھر مجھے یاد آیا کہ تم پورک تو کھاتے ہی نہیں۔ میں تمہاری ایک ایک عادت سے واقف ہوں۔''

احمد اس پر ہاتھ اٹھانے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے دوبارہ سفری بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ البا مسلسل بول رہی تھی اور وہ لاتعلق بنا اپنا کام کر رہا تھا۔

''تم کہیں جا رہے ہو؟ میں جانتی ہوں تم کہاں جا رہے ہو۔ میرا مشورہ مانو تو ارادہ بدل ڈالو۔''

''تمہاری رائے کس نے مانگی ہے؟'' اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ایک قہر بھری نگاہ البا پر ڈالی۔

''تمہارے جانے سے بڑی گڑ بڑ ہو جائے گی۔ میری بات مانو۔ میں نے کبھی تمہیں غلط صلاح نہیں دی۔ تم چلے گئے تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ سالومن موریل تم سے ناراض ہو جائے گا۔''

اس کے انداز میں چونکانے والی کوئی بات تھی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں سالومن کی اجازت سے جا رہا ہوں۔ جس چیز کے متعلق جانتی نہیں، اس کے بارے میں اپنا منہ کھولنے کی زحمت نہ کرو۔''

''میں بہت سے جھوٹ بولتی ہوں۔ کبھی ضرورت کے تحت اور کبھی عادتاً مگر میں نے تم سے ایک سچ بولا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میری زندگی میں پیش آنے والا واحد اچھا واقعہ ہو۔ میں تمہیں کبھی کھونا نہیں چاہتی۔ تمہارے لیے میں مر بھی سکتی ہوں اور مار بھی سکتی ہوں۔''

احمد نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف جلتی نظروں سے دیکھا تھا۔ ''ٹھیک ہے میں نے سن لیا ہے۔ اب تم جاؤ۔''

''تم نے سنا تو ہے۔ سمجھے نہیں۔''

''مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے۔ تم باہر نکلو تاکہ میں دروازے کو تالا لگا سکوں۔''

''جانے سے پہلے اگر تم اسے دیکھ لو تو شاید تمہاری سوچ بدل جائے۔'' البا نے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک میگزین نکالا اور اس کے سامنے بستر پر رکھ دیا۔

وہ یکدم ساکت ہو گیا۔

''تم اس میگزین کو بھولے تو نہیں ہو گے۔ یاد ہے ناں۔ میں نے اپنے دوست لورکا سے تمہیں ملوایا تھا۔''

''یہ تم مجھے کیوں دکھا رہی ہو؟'' احمد کو اپنی آواز ڈھونڈتے میں بڑی دقت ہوئی۔

''سب واقف ہیں، پورنوگرافی کے بارے میں سالومن کے خیالات کیا ہیں۔ میں اس کی فلم کا کتنا معمولی حصہ تھی۔ تقریباً نہ ہونے کے برابر، محض ایک کاک ٹیل ویٹرس۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں پورنو فلم میں کام کر چکی ہوں تو اس نے مجھے یوں الگ کر دیا جیسے میں اس کی فلم میں رہی تو خدا کا قہر اس پر نازل ہو جائے گا۔ وہ لبرل ہونے کی باتیں تو کرتا ہے لیکن اندر سے کٹر یہودی ہے۔ کیا وہ برداشت کر سکے گا کہ اس کی فلم میں لیڈ رول کرنے والا ایک پورن آرٹسٹ ہو، مجھے تو نہیں لگتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو؟''

یہ ایک بے معنی سوال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

''میں زیادہ دیر اپنی بے وقوفانہ باتوں سے تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔ تمہاری صورت پر میرے لیے بے زاری ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ تم پرنیاں کے پاس پاکستان گئے تو میں یہ میگزین لے جا کر مسٹر موریل کو دکھا دوں گی۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہ کرنا۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں، تم پاکستان چلے جاؤ اور فلم کیریر کو بھول جاؤ یا تم پرنیاں کو چھوڑ دو اور ہالی وڈ کا عظیم ترین نام بن جاؤ۔''

احمد کا منہ کھل گیا۔ اسے اپنی سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔

کسی پرندے سے پوچھا جائے کہ تمہارے پر کاٹنا زیادہ مناسب ہو گا یا تمہیں پنجرے میں بند کرنا تو کون سا انتخاب بہتر ہو گا۔

وہ یک ٹک البا کو گھورے جا رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے غور نہیں کیا تھا مگر آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ البا کے چہرے کی

بناوٹ میں ایک مخصوص قسم کی سفا کی تھی۔ اس کے باریک ہونٹ اور جبڑے کی مسطح ہڈی اسے اذیت پسند ظاہر کرتی تھی۔ وہ اپنے کہے پر عمل کرنے کا کس حد تک ارادہ رکھتی تھی۔ یہ جاننے کے لیے احمد کو کوئی ضمانت درکار نہ تھی۔

''ایک تیسرا حل بھی موجود ہے۔''

اسے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ کیا تھا۔

البا نے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''مجھے مار ڈالو۔''

وہ پیچھے ہٹ گیا اور دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایئر پورٹ پہنچنے کے لیے بہت تھوڑا وقت باقی تھا۔

''مجھے یقین ہے، تم پرنیاں کی خاطر اپنی اور میری زندگی برباد نہیں کرو گے۔''

وہ Jesus freak (مذہبی انتہا پسند) تمہارے قابل ہی کہاں ہے۔ تمہیں اس میں کیا نظر آیا کہ تم نے اسے مجھ پر ترجیح دی میں تو تمہاری اپنی ہوں۔ تمہیں میرے پاس ہی لوٹنا ہے۔''

وہ آگے آتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ آواز میں بولنے لگی۔ ''ہم دونوں کے درمیان کوئی نہیں آ سکتا۔ ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ چاہے کوئی کچھ بھی کر لے، ہم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔''

احمد نے ایک جھرجھری لے کر اسے دھکا دیا۔

''تم psychopath ہو۔ مجھے پہلے کیوں اندازہ نہیں ہوا کہ تم سے میل جول رکھنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم سمجھتی ہو، تم مجھے دھمکی دو گی اور میں ڈر جاؤں گا۔ جو تمہارے بس میں ہو، وہ کر دیکھو۔ میں ہر قسم کے نتائج بھگتنے کو تیار ہوں۔''

البا نے یوں سر ہلایا جیسے اسے مایوسی ہوئی ہو۔

''تمہیں کس بارے میں شبہ ہے؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ میگزین دیکھنے کے بعد سالومن کا ردعمل وہ نہیں ہوگا جس کی میں توقع کر رہی ہوں یا تم سمجھ رہے ہو کہ میں ایسا کروں گی ہی نہیں۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں میں تمہیں ایک قصہ سناتی ہوں۔ شاید اسے سن کر تمہیں اعتبار آ جائے۔ کچھ عرصہ پہلے تمہارا دوست رائن سدرلینڈ ایک ہٹ اینڈ رن کا شکار ہوا تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ اسے ماگدا نامی کسی لڑکی نے رقعہ بھجوا کر ملنے کے لیے بلایا تھا اور بقول رائن کے وہ اس نام کی کسی لڑکی سے واقف نہیں تھا۔ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ جب میں نے پہلی بار پورنو فلم میں کام کیا تو میرے کردار کا نام بھی ماگدا ہی تھا۔ وہ ایک جنونی لڑکی تھی جو اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتی تھی۔''

احمد نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا، وہ جمع دو چار کرنے میں اسے چند گھڑیاں لگی تھیں۔

''تم نے رائن کو..... تم نے اس کی جان لینے کی کوشش کی صرف اس وجہ سے کہ سیٹ پر اس کے منہ سے وہ بات نکل گئی۔ تم جنونی ہو۔ تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔''

البا نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''تم مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہاری بات کا کبھی برا نہیں مانتی۔ تم اس وقت میری زندگی میں آئے جب میں خودکشی کا پختہ ارادہ کر چکی تھی، تم تو میری زندگی ہو گرانٹ! آج میں زندہ ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے اور تمہارے لیے۔ مجھے پہلی نظر میں تم سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے زندگی میں بہت سی مشکلات دیکھی ہیں۔ صوفیہ کی پیدائش سے پہلے اس کا باپ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وہ بہت ہی کمینہ شخص تھا، وہ مجھے......''

''تم تو ہمیشہ کہتی رہی ہو کہ صوفیہ تمہاری بھانجی ہے؟''

''میں نے کہا ناں، میں سچ کبھی کبھار ہی بولتی ہوں۔ مارسیلو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ہونے والے بچے کو مل کر پالیں

گے لیکن ایک دن میں سو کر اٹھی تو وہ نہیں تھا۔ حاملہ ہونے کی وجہ سے میرا بدن بھدا ہو گیا، میں جس ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں بطور ماڈل کام کرتی تھی وہاں سے مجھے فارغ کر دیا گیا۔ کئی مہینوں تک میں بے روزگار رہی۔ میں اتنی تنہا تھی کہ زندہ رہنے سے عاجز آ گئی تھی۔ تم نے ہی تو میرے اندر امید پیدا کی۔ اب تم بھی مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں کیسے جانے دے سکتی ہوں؟''

احمد کی نظر گھڑی کی سمت رینگی۔ اب بھی اگر وہ روانہ نہ ہوتا تو وقت پر ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

''مجھے تمہاری دکھ بھری کہانی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ راستہ چھوڑو۔'' وہ بیگ اٹھا کر جارحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

البا کے باریک ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے وہ بولی۔

''تم اجازت دو تو میں تمہارا فون استعمال کر لوں۔ بڑی دقت سے سالومن کا رابطہ نمبر حاصل کیا ہے۔ دو دن سے وہ برنٹ وڈ والی رہائش گاہ پر نہیں ہے۔ شاید برٹش کولمبیا میں اپنی آنے والی فلم کے لیے کچھ لوکیشنز وغیرہ دیکھنے گیا ہوا ہے۔''

احمد کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔

''تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟ دوٹوک بات کرو۔''

''میں صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔ پورا دن، چوبیس گھنٹے۔ میں تم سے ایک لمحے کی دوری بھی نہیں سہہ سکتی۔ چوبیس گھنٹے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ وہ تمہیں معلوم ہے۔''

اس نے ایک بار پھر گھڑی کو دیکھا۔ سوئیاں تیزی سے آگے سرک رہی تھیں۔ فیصلے میں مزید تاخیر ممکن نہیں تھی۔

سالومن اسے رد کر دیتا تو آئندہ ایسا موقع ملنے کے امکانات ناپید تھے۔ وہ ایکسٹرا بن کر رہتا۔ باربیک بن جاتا یا پورن آرٹسٹ بن کر زندگی گزارتا۔

اور پرنیاں۔ اس کے بغیر زندگی ''زندگی'' ہی رہے گی؟ اسے چناؤ کرنا تھا۔ ہوا یا پانی؟ کس کے بغیر جیتے رہنا ممکن ہوگا۔ کمرے کی خاموشی، سناٹے میں ڈھل گئی تھی۔ البا کی منتظر آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ بیگ کے تسمے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کب اس کی مٹھی کھلی اور تسمہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

البا کی آواز کہیں دور سے اس کے کانوں میں آئی ''مجھے تمہارا پاسپورٹ چاہیے۔''

✠ ✠ ✠

البا یوں اس پر مسلط ہو گئی تھی جیسے سندباد جہازران کے کندھوں پر جزیرے کا شیطان بوڑھا سوار ہوا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی۔ لمحہ بھر بھی اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتی اور وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ البا نے اس کے اپارٹمنٹ والا ٹیلی فون سیٹ اتار کر کہیں چھپا دیا تھا۔ لاکھ سمجھانے بجھانے پر بھی وہ اس اقدام سے باز نہ آئی۔ مجبوراً اسے برنٹ وڈ والے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا کیونکہ اس کا سالومن سے رابطے میں رہنا نہایت ضروری تھا۔ وہاں کا ٹیلی فون نمبر چونکہ پرنیاں کو معلوم نہیں تھا۔ اس لیے البا کو اس تبدیلی سے خاصا اطمینان ہوا تھا۔ وہ مستقل اس کے ساتھ رہنے لگی۔ بڑی مشکل سے احمد نے اسے آمادہ کیا کہ وہ سالومن کے سامنے آنے سے گریز کرے گی۔

سالومن غیر معمولی حافظے کا مالک تھا اور قوی امکان تھا کہ البا کو دیکھنے پر اسے سیٹ پر ہونے والا قصہ یاد آ جائے گا۔ ایک پورن آرٹسٹ سے تعلقات رکھنے کی بنا پر وہ اس کی طرف سے بدظن ہو سکتا تھا۔ احمد اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا مگر خود کو باور کراتا تھا کہ اسے اشتعال میں آ کر بنا بنایا کھیل نہیں بگاڑنا اور البا کے ساتھ کچھ وقت خوش اسلوبی سے گزارنا ہے۔

وقتی طور پر البا کی من مانی برداشت کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ پرنیاں اگر خود اس سے رابطہ نہیں کر پائے گی تو اس مسئلے کا دوسرا حل موجود تھا۔ وہ البا کی لاعلمی میں پاکستان فون کر سکتا تھا۔ وہ اس کی جتنی بھی نگرانی کر لیتی لیکن آخر انسان تھی اور انسانوں کے ساتھ بہت سی مجبوریاں لگی ہوتی ہیں۔

اس نے دو دفعہ البا کی نظروں کی زد سے بچتے ہوئے فون کیا بھی تھا۔ کہ پرنیاں کو پاکستان نہ آسکنے کے بارے میں کوئی معقول وضاحت دے سکے۔ ایک دفعہ گھر کے کسی اور فرد نے فون اٹھایا تھا مگر لائن اس قدر پرشور تھی کہ اس کی آواز دوسری جانب سنی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ دوسری مرتبہ بس گھنٹیاں بجتی رہیں اور کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

پاکستان اور امریکہ میں وقت کا تفاوت بھی ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔ جب یہاں بیدار ہونے کی گھڑیاں آتیں تو وہاں سونے کے اوقات شروع ہو جاتے۔ بہرحال وہ مطمئن تھا کہ جلد یا بدیر پرنیاں سے بات کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور رہی بات سالومن موریل کی پورنو گرافی سے نفرت کی تو یہ بھی کوئی لاینحل معاملہ نہیں تھا۔ فلم ایک بار تکمیل کے مراحل میں داخل ہو جاتی تو سالومن چاہ کر بھی اسے علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اسے البا کے اشاروں پر ناچنے کی حاجت نہ رہے گی۔ مناسب وقت آنے پر وہ البا کو منہ توڑ جواب دینے والا تھا۔ کھیل ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ کھیل تو اب شروع ہوا تھا۔

سالومن ابھی کینیڈا میں ہی تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ احمد نے پاکستان جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا تو اس نے اسے وینکوور آنے کو کہا۔ حسب توقع البا بھی اس کے ساتھ جانے پر بضد ہو گئی۔ فی الحال وہ اسے ناراض کرنے کا متحمل نہیں تھا۔ سو اسے یہ ضد بھی ماننا پڑی۔ وینکوور میں چند روزہ قیام کے دوران وہ بے حد مصروف رہا۔ کسی بھی کام کو وہ پورے دل سے نہ کر پایا۔ اس کا دھیان مسلسل پرنیاں میں اٹکا تھا۔ اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی اور تنہا اتنا دباؤ سہنے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔ اس نے متعدد دفعہ کوشش کی مگر فون لائنز میں کسی خرابی کے باعث پاکستان بات کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ جس روز اسے واپس لاس اینجلس جانا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر کوشش کی۔

اس بار اس کا فون مل گیا تھا۔ وہ پرنیاں کے کزن داؤد سے مخاطب تھا ایک دفعہ اس کی داؤد سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ اسی ملاقات کا حوالہ دے کر جب اس نے اپنا تعارف کروایا تو داؤد کے جوابی الفاظ نے اسے ششدر کر دیا۔ وہ اسے رکیک گالیاں دے رہا تھا۔ شاید پرنیاں نے گھر میں اپنی شادی کا اعلان کر دیا تھا اور یہ اسی کا ردعمل تھا۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے اس نے داؤد کی گالیاں تحمل سے سنیں اور اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

"میرے خیال میں تم کافی کہہ چکے ہو۔ مجھے پرنیاں سے بات کرنے دو۔"

"کتیا کے بچے! اس طرح انجان بن کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا تم نہیں جانتے وہ یہاں نہیں ہے۔ تمہیں یہاں فون کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ تم نے پرنیاں کو کیا کرنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں اس کا باپ اس وقت کس حالت......"

احمد نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "کیا کیا ہے اس نے؟ کہاں ہے وہ؟"

"تمہارے علاوہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ گھر سے بھاگنے سے قبل اس نے تمہارے ساتھ کوئی پروگرام تو طے کیا ہوگا۔"

وہ ہکا بکا سنتا رہا۔

"مجھے بالکل خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے تو اس سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اس نے گھر چھوڑ دیا ہے تو وہ

کہاں گئی؟''

''مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تمہارے ناپاک منہ سے یہ مکاری بھری باتیں سن سکوں۔ میں وہاں آ کر تمہیں ملوں گا۔ میرا انتظار کرو۔'' داؤد نے غرا کر کہا۔

''کیا واقعی وہ گھر سے جا چکی ہے یا تم میری اس سے بات نہیں کروانا چاہتے۔ دیکھو، آرام سے بات کرو۔''

''بات انسانوں سے کی جاتی ہے اور میں تمہیں وہ نہیں سمجھتا۔''

لائن بے جان ہو گئی تھی۔



وہ کتنی ہی دیر سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ داؤد کے لہجے اور انداز نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ تو پھر پرنیاں کہاں تھی؟ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ وہ اس معمے کو حل کرنے کی تدبیر سوچتا رہا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ ایک سادہ سوال کے پیچیدہ حل تلاش کر رہا تھا۔ سیدھی سی بات تھی کہ اگر پرنیاں نے اس کی خاطر گھر چھوڑا تھا تو پھر وہ اس کے پاس آ رہی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ وہ لاس اینجلس پہنچ چکی ہو اور اگر اب تک نہیں پہنچی تھی تو جلد ہی پہنچنے والی ہوگی۔ اب وہ نئے خطوط پر غور کرنے لگا کہ اس کی آمد کے بعد البا کو سنبھالنا کیونکر ممکن ہوگا۔

خود سے الجھتا ہوا وہ لاس اینجلس واپس آ گیا۔ آتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنی لینڈ لیڈی اوما کو ٹیلی فون کیا اور پرنیاں کے متعلق تفصیل سے سمجھانے کے ساتھ ساتھ اپنا برنٹ وڈ والا پتہ بھی لکھوا دیا تاکہ پرنیاں اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں تک آئے تو خالی اپارٹمنٹ دیکھ کر مایوس ہو کر لوٹ نہ جائے۔

ایک پورا دن گزر گیا اور اوما کی طرف سے کوئی اطلاع وصول نہیں ہوئی۔ دوسرے روز شام کو اس نے خود اوما کو فون کر کے پوچھا۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ تیسرا دن بھی بے ثمر بیت گیا۔ چوتھا دن، پانچواں، ایک ہفتہ......

دسویں دن اس نے ایک بار پھر پاکستان فون کیا۔ جس عورت نے ریسیور اٹھایا، اس کی باتوں سے احمد کو اندازہ ہوا کہ وہ پرنیاں کی ماں تھی، داؤد کی طرح اس نے احمد کو گالی تو نہیں دی تھی، البتہ وہ بھی ان ہی باتوں کو دوہرا رہی تھی جو وہ داؤد کی زبانی سن چکا تھا۔ وہ متواتر اس کی منت کرتی رہی کہ وہ پرنیاں کو واپس گھر بھجوا دے۔ وہ اس کی کوئی بات سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ تنگ آ کر اس نے فون بند کر دیا۔ آخر پرنیاں کہاں رہ گئی تھی؟ شاید اسے امریکہ کا ٹکٹ خریدنے کے لیے رقم کی فراہمی میں مشکل درپیش ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسے یہی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

وہ پرنیاں کے چچا کے گھر بھی گیا، اسے وہاں سے کوئی مدد ملنے کی امید نہیں تھی اور داؤد سے سامنے ہونے کی صورت میں بدمزگی کا بھی اندیشہ تھا۔ پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ لوگ ابھی پاکستان سے نہیں لوٹے تھے۔ وہ خود کو بے بسی کی انتہا پر پاتا تھا۔ پرنیاں کے ساتھ جوڑنے والی ڈوری کا آخری سرا بھی اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا اور اتنی بڑی دنیا میں وہ کہیں کھو گئی تھی۔

فلم کا پری پروڈکشن کا کام تقریباً مکمل تھا اور پرنسپل فوٹوگرافی کے آغاز میں بہت کم وقت باقی تھا۔ اس کی مصروفیات میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ سالومن نے اسے فرنچ سکھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا تھا وہ کسی بھی معاملے میں سالومن کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس کی ہر ہدایت پر بے چون و چرا عمل کر رہا تھا۔

اسے برنٹ وڈ والے فلیٹ میں رہتے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ بیت چکا تھا کہ ایک روز کہیں باہر سے لوٹنے پر اسے البا فون پر کسی سے بات کرتی دکھائی دی۔ اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور بیٹھ کر جوتوں کے تسمے ڈھیلے کرنے لگا۔

''اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے بالکل محسوس نہیں ہو رہا کہ وہ تم سے بات کرنے میں کچھ دلچسپی رکھتا ہے، کیا کہا تم نے گرانٹ؟ فون بند کر دوں؟ نہیں ایسا مت کہو۔''

وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ ایک لمحے میں اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ پرنیاں سے مخاطب تھی اس نے اضطراری کیفیت میں ہاتھ پھیلا کر ریسیور لینا چاہا۔ البا تنبیہی انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور البا کو بازو سے دبوچ کر کھینچا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر اترا اور اس کا سر دوبارہ دائیں بائیں ہلنے لگا۔ وہ رک گیا۔ اس کے اور البا کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی احمد کو بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ وقتی جوش نے اس حقیقت کو کچھ ساعتوں کے لیے دھندلا دیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔

البا کی ہنسی اس کے اعصاب پر چابک بن کر پڑی۔ وہ چاہتا تو زبردستی اس سے ریسیور چھین سکتا تھا۔ مگر نتائج کے خوف نے اس کے ہاتھ پاؤں سن کر دیے تھے۔ وہ جو کچھ پرنیاں سے کہہ رہی تھی، اسے سن کر وہ اس قدر تلملا تا تھا تو پرنیاں کی حالت کیا ہو رہی ہوگی۔ شاید اسے کمرے سے چلے جانا چاہیے تھا۔ پاؤں مفلوج تھے ورنہ وہ ایسا ہی کرتا۔ کسی بے عزت غلام کی طرح سر جھکائے وہ سب کچھ سنتا رہا۔ ان لمحات میں اسے البا سے زیادہ اپنی بزدلی سے نفرت ہو رہی تھی۔

البا نے ریسیور کان سے ہٹا کر ماؤتھ پیس پر ہتھیلی پھیلائی اور بولی۔ ''تمہیں میری باتوں کی تائید کرنا ہوگی۔''

''میں تمہارے لیے پہلے ہی بہت کچھ کر چکا ہوں۔ تم نے سب ختم کر دیا ہے۔ اب تائید یا تردید سے کیا فرق پڑے گا۔''

''کیا تمہارا مجھ سے تکرار کرنا مناسب ہے؟ مجھے ناخوش کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔'' اس کا انداز تحکم بھرا تھا۔ ''سالومن کا گھر یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟ دو بلاک یا شاید اس سے بھی کم۔ وہاں جانے کے لیے کسی سواری کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ صرف چار دن بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ میں تمہیں بہت ذہین سمجھتی ہوں، تم کبھی کوئی بے وقوفی کا کام نہیں کرتے۔ تم نے میری مرضی کے خلاف کچھ کیا تو میں کتنی دکھی ہو جاؤں گی اور دکھ میں تقریباً پاگل ہو جاتی ہوں میں کیا تم چاہتے ہو کہ میں پاگل ہو جاؤں اور اپنے پاگل پن میں سالومن کے سامنے کوئی غیر مہذب بات کہہ بیٹھوں۔ وہ کس قدر نفیس ذوق کا مالک ہے۔''

احمد نے نچلے ہونٹ کو اتنے زور سے دانتوں تلے دبا رکھا تھا کہ اس سے خون رسنے لگا تھا۔ اس کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ البا سے بحث کر سکتا۔ اس نے البا کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ کیا معلوم اس فون کے بعد پرنیاں کا دوبارہ کوئی سراغ نہ ملے۔

''میں پاکستان جاؤں گا جیسے ہی حالات میرے قابو میں آئے میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ صرف اس وقت کسی بھی طرح مجھے اس معاملے کو نمٹانا ہے۔'' اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ کیا کہنے سے پرنیاں کو کم سے کم چوٹ پہنچے گی۔ اسے اپنے گلے میں ویسا درد محسوس ہوا جیسا لڑکپن میں پہلی بار سگریٹ پینے پر ہوا تھا۔

''اس نے سچ کہا ہے۔'' اس نے ایک جملہ گھڑ لیا اور زبان سے ادا کرتے ہی خود پر لعنت بھیجی۔ وہ اس سے کم تکلیف دہ جملے بھی سوچ سکتا تھا جیسے ''میں شرمندہ ہوں'' یا ''مجھے معاف کر دو۔''

پرنیاں جو کچھ کہہ رہی تھی اس سے زیادہ اذیت دینے والے الفاظ اس نے تمام زندگی میں نہیں سنے تھے۔ ٹوٹے ہوئے کانچ کی کرخت دھار نے دل کی رگوں کو کاٹ ڈالا تھا۔

البا نے ریسیور پر ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا اور فون بند کر دیا۔

''وہ۔ پریگنٹ ہے۔ میرا بچہ......''

احمد کسی لقوہ زدہ کی طرح اٹک کر بولتا تھا۔



گلابی، سٹے دار پھولوں کی فصل کے بیچ کچی باٹ پر گھوڑے کی ٹاپوں سے دھمک اٹھ رہی تھی۔ آسمان پر بکھری نیلی، سیاہ، سرمئی، اودی بدلیاں رنگی ہوئی روئی کی گانٹھیں تھیں، سورج کی لاٹ سے جن کا رنگ لحظہ بہ لحظہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ کھیتوں کے آخری

کنارے، جہاں کچھ متروک شدہ کانوں کے آثار شروع ہو رہے تھے، ایک پون پنکھا لگا تھا جس کے چوبی پنکھ ہولے ہولے گھوم رہے تھے۔ دائیں رخ کھیتوں کے عین درمیان گرہ دار ٹانگوں والا اونچا سا بجا (ہوّا) گڑا تھا۔

اس نے paddock جوتے اور جودھ پوری پتلون پہن رکھی تھی۔ اس ملبوس میں وہ چست اور پھرتیلا نظر آتا تھا۔ وہ ایک کمیت یابو پر سوار تھا۔ خوش قامت گھوڑے کا مضبوط بدن اس کی رانوں تلے توانائی سے تھرتھراتا تھا۔ سائیس اسے دلکی اور پویا چالوں کی مشق کروا رہا تھا۔

فلم کا یونٹ اپنی تمام تر تیاری کی ساتھ موجود تھا۔ صرف دو لوگوں کی آمد کا انتظار تھا۔ سالومن اور سمون ہوٹل کے سویٹ سے اکٹھے ہی آنے والے تھے۔ ان کے آتے ہی شوٹنگ کا آغاز ہو جاتا۔ بادل ایک دو جے سے پرے جا رہے تھے۔ سورج بے حد چمک دار ہو گیا تھا۔ کیسا خوبصورت دن تھا۔ ہر لحاظ سے مکمل...... احمد نے گھوڑے کی چال کے ساتھ جسم کی حرکت کو متوازی بناتے ہوئے سوچا۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں آگے پیچھے سرکتی چمڑے کی طنابوں کا لمس اسے بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

عقب میں ایک گاڑی کے انجن کی آواز گونجی۔ سائیس نے اسے گھوڑا موڑنے کو کہا۔ شاید سالومن اور سمون آ چکے تھے۔ چوڑی پختہ سڑک کے کنارے ایک خاکستری جیپ رکی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک دبلا پتلا شخص باہر آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔ جانے اس نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ ہر طرف اضطراب کی لہر سی دوڑ گئی۔ احمد کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ حالانکہ اس خوبصورت دن میں کسی بری بات کا وقوع پذیر ہونا بعید از قیاس تھا۔ وہ شخص کوئی ایسی خبر لے کر آیا تھا جو سرسراتی ہوئی سارے یونٹ میں ابتری پھیلا رہی تھی۔ پھر وہ احمد تک بھی آن پہنچی۔

سالومن موزیل رات کے کسی پہر ہارٹ اٹیک سے مر گیا تھا۔ اسے اتنی مہلت بھی نہ ملی تھی کہ وہ اپنے ساتھ موجود سمون کو مدد کے لیے آواز دے پاتا اور صدمے سے بے ہوش سمون فاکس مین اس وقت ہسپتال میں تھی۔ احمد نے غیر ارادی طور پر لگامیں پیچھے کھینچ لیں اور گھوڑے کے شکم میں paddock جوتوں کی نکیلی ایڑیاں زور سے چبھو دیں۔ گھوڑے نے اگلے سم اونچے اٹھا کر زمین سے ٹکرائے اور ایک دم گردن نیچے جھکا دی۔ دھچکا لگنے سے احمد کا توازن بگڑا اور وہ آگے کے رخ گر گیا۔ گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان سے اسے زمین بہت نزدیک نظر آئی تھی۔



سالومن کی موت نے سب کچھ بدل ڈالا تھا۔ فلم بندی روک دی گئی۔ فلم یونٹ واپس لاس اینجلس آ گیا۔ بہت سے دن یونہی گزر گئے۔ پھر نئے ڈائریکٹر کا تقرر ہوا۔ نئے سرے سے شیڈول ترتیب دیا گیا۔ نئے ہدایت کار نے کاسٹ میں کچھ رد و بدل کیا، اسکرین پلے میں چند تبدیلیاں کیں۔ احمد کو جو خوف لاحق تھا کہ وہ بھی ان تبدیلیوں کی نذر نہ ہو جائے۔ باطل ثابت ہوا تھا۔

ڈائریکٹر برینڈن اس سے مطمئن تھا۔ اسے البا کی جانب سے پہلے جیسے خدشات نہیں رہے تھے، پھر بھی وہ اسے ناراض کرنے اور اکسانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے ایک پورنو میگزین کے لیے کام کیا تھا اور اسٹوڈیوز کو اس بات سے لاعلم رکھا تھا، یہ راز کھل جاتا تو اس کا بلیک بال ہونا یقینی تھا۔

سالومن کا مرنا اتنا بھی برا ثابت نہیں ہوا تھا جتنا وہ قیاس کر رہا تھا۔ اسے صرف ایک پریشانی تھی اور وہ بھی ایسی سنگین نوعیت کی نہ تھی۔ سالومن کی زندگی میں ہی سمون کا رویہ اس کے ساتھ ہتک آمیز تھا۔ اب تو وہ اس سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتی تھی۔ اگر اس کا اسٹوڈیوز کے ساتھ معاہدہ نہ ہوا ہوتا تو شاید وہ اس فلم کو لات مار کر چلی جاتی۔ اس کی رائے میں یہ فلم ہالی وڈ کی تاریخ کی عظیم ترین box office bombs (ناکام) کی فہرست میں شامل ہونے والی تھی اور اس کی وجہ صرف احمد تھا۔ بہرحال سمون کی بدمزاجی برداشت کرنا ایسی قیمت نہیں تھی۔ جو وہ اتنے بڑے مقصد کو پانے کے لیے ادا نہ کر پاتا۔

ایک صبح وہ سیٹ پر آیا تو خلاف معمول سمون پہلے سے وہاں موجود تھی۔ عام طور پر وہ سب سے آخر میں آیا کرتی تھی۔ اسے لوگوں کی نظروں میں کچھ عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے سے قبل سمون اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز قدموں سے چل کر اس کے پاس آئی۔ احمد نے اس کی پیشانی پر پڑی سلوٹوں کو گہرا ہوتے دیکھا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے کھڑی اسے گھورتی رہی پھر اچانک ہاتھ اٹھا کر تہہ کیا ہوا اخبار اس کے منہ پر اچھال دیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اتنی ذلت کو سہنے کا حوصلہ وہ اپنے اندر نہیں پا رہا تھا لیکن بدن میں گھستی ہوئی لوگوں کی نگاہوں کے بیچ آنکھیں جھکائے کھڑا رہا۔

''اسے اٹھاؤ اور پڑھو۔ اپنے بارے میں کچھ ضروری معلومات فراہم کرنا تم بھول گئے ہو۔'' اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی پسلیوں کو توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار کپکپانے لگے تھے۔ کیا کسی نیوز رپورٹر نے اسے اس پورنو گرافک رسالے میں شناخت کر لیا تھا اور اس حوالے سے خبر چھاپ دی تھی۔ اس کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ جس پر سمون اس درجہ بھڑکی ہوئی تھی۔ جھک کر اس نے اخبار اٹھایا اور وہ خبر تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں وہ بار بار صفحات کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ سمون نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ مطلوبہ خبر پر انگلی رکھتے ہوئے وہ بولی۔

''یہ الفاظ تمہاری توجہ کے طالب ہیں۔ غور سے پڑھو اور اپنی ماہرانہ رائے بھی دو۔ ہر چیز کے بارے میں تمہارا ایک منفرد اور دوٹوک نکتۂ نظر ہے۔''

احمد نے وہ خبر دیکھ لی۔ اس کے ساتھ وہ mug shots شائع ہوئے تھے جو تیرہ سال قبل اسپرنگ فیلڈ کے ایک پولیس اسٹیشن میں لیے گئے تھے ان میں سے فرنٹ ویو والے شاٹ میں وہ مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ mugshots کے لیے مسکرانا کس قدر معیوب لگ سکتا ہے۔ یہ اسے اس روز معلوم ہوا تھا۔ اس نے سمون اور وہاں موجود دوسرے لوگوں کو بتانا چاہا کہ تصویر میں نظر آنے والی مسکراہٹ غیر ارادی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا تھا۔ خبر کو پڑھ لینے کے بعد اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سب نظریں اس پر ٹکی تھیں، اس کا کہیں چھپ جانے کو جی چاہا لیکن بعض اوقات چھپنے سے بات نہیں بنتی۔

اخبار کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ واپس سمون کو تھما دے یا نیچے پھینک دے۔ وہ اس کی دو انگلیوں میں اٹکا کسی پھریرے کی مانند جھول رہا تھا۔ پھر اس کا دھیان اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں پر گیا۔ ان کی کپکپی روکنے کے لیے اس نے انہیں بغلوں میں دبا لیا۔

''تم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ خبر یقیناً جھوٹی ہوگی، تمہاری نیک نامی کو گزند پہنچانے کی ایک سازش۔''

اس نے سمون کو چیختے سنا۔ ''تمہیں دیکھتے ہی میری چھٹی حس پکارنے لگی تھی کہ تم کسی گندے جوہڑ کے کیڑے ہو۔ خدا کی لعنت ہو تم پر۔''

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر اس کی آواز نہ نکلی۔ اس کے ہونٹ ذرا سا کھل کر بند ہو گئے، آخر وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی خاموشی اس کے قصوروار ہونے پر تصدیق کی مہر لگا رہی تھی مگر وہ الفاظ کہاں سے لاتا۔

''میں اس فلم میں کام نہیں کروں گی۔ میرا کنٹریکٹ terminate (ختم) کر دیا جائے، چاہے سارے مووی اسٹوڈیوز میرا بائیکاٹ کر دیں۔ میں کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار ہوں مگر تم اس فلم کا حصہ رہے تو میرا سفر یہیں ختم ہوتا ہے۔ تم rapist ہو۔ قاتل ہو۔ اور نہ جانے کیا کیا ہو جس کا ہمیں ابھی پتہ نہیں۔'' سمون نے اس سے زیادہ ڈائریکٹر برینڈن کو سناتے ہوئے کہا جو ابھی سیٹ پر آیا تھا، وہ ابھی تک اخبار میں شائع ہونے والے قصے سے لاعلم تھا۔ اس کے استفسار پر سمون نے احمد کے بے جان ہاتھ میں معلق اخبار کھینچ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس خبر کو دیکھ کر برینڈن کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔

''کیا یہ خبر سچ ہے؟ تم کسی مونا اسٹوکر سے واقف ہو؟''

وہ چپ رہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ اسے لے کر ایک تنہا گوشے میں آ گیا۔

''یہ منحوس صحافی بھی کیسی کیسی جگہیں کھود ڈالتے ہیں۔ گرانٹ! تم نے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم پر ایک نن پر مجرمانہ حملے کا الزام تھا۔''

''وہ نن نہیں تھی۔ وہ تو بس ارادہ رکھتی تھی۔'' احمد نے لجاجت سے کہا۔

''اور تمہارے ہاتھوں ایک پولیس آفیسر کا خون ہوا؟''

''میں نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میں تو صرف اسے دھمکا رہا تھا۔ مجھے تو ٹھیک سے ریوالور پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔''

اس کی آنکھ سے ایک آنسو بہہ کر گال پر پھسلنے لگا۔ ''عدالت نے میرا ریکارڈ سیل کر دیا تھا۔ میں تب نابالغ تھا۔ جج کو مجھ سے بہت ہمدردی تھی۔ اس نے مجھے صرف پانچ سال کی قید سنائی تھی اور ڈیڑھ سال پروبیشن۔ اگر میں ایسا ہی گھناؤنا مجرم ہوتا جیسا اس رپورٹر نے مجھے دکھانے کی کوشش کی ہے تو مجھے اتنی کم سزا کیوں ملتی۔ میں اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا۔''

''تو تمہیں convict کر دیا گیا تھا؟ تم ان جرائم میں سزا بھی بھگت چکے ہو۔ او میرے خدا! تم کتنے بڑے دھوکے باز ہو۔''

''یہ سب میرے خلاف سازش ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری بات سنو، میں بالکل قصوروار نہیں ہوں۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔

وہ ایک ایسے بحری جہاز میں سوار تھا جس کے پیندے میں سوراخ ہو چکا تھا اور اس شگاف سے اندر آتے ہوئے ہلاکت خیز پانی کو روکنے کے لیے اس کے پاس ہتھیلیوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

✠ ✠ ✠

اس کے قدموں تلے سے محض سرخ قالین نہیں کھینچے گئے تھے، ان کے ساتھ زمین بھی کھینچ لی گئی تھی۔ پام کے درخت اس پر جھکے نہیں تھے، اس پر گر گئے تھے۔

مارلن منرو کا وہ گیت جو برسوں اس کے کانوں میں رس گھولتا رہا تھا، اس کی حقیقت اب اس پر واضح ہوئی تھی۔ وہ تو دیومالائی پن دیویوں کا زہریلا نغمہ تھا جسے وہ مسافروں کو بھٹکانے اور انہیں فنا کرنے کے لیے گاتی تھیں۔

اسٹوڈیوز نے احمد کا معاہدہ منسوخ کیا تو اسے قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے کانوں میں پرنیاں کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔

''خدا جب منہ کے بل گراتا ہے تو ٹھوکر کھانے کے لیے رکاوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

اس کا رستہ روکنے والا کسی مقامی اخبار کا کوئی صحافی نہیں تھا۔ وہ سمون بھی نہیں تھی۔ وہ کوئی اسٹوڈیوز بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہ خدا نے پہلے سے طے کر رکھا تھا۔ بے کار اس نے اتنے ہاتھ پاؤں مارے، بے جا خود کو تھکا کر ادھ موا کر لیا۔ وہ کچھ بھی کر لیتا۔ خدا کی مرضی ہی نہیں تھی تو نتیجہ مختلف کیسے نکلتا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ البا اسے روکتی یا نہ روکتی۔

سالومن موریل اس کے پورنوگرافک میگزین میں کام کرنے پر معترض ہوتا یا نہیں۔ اس کی موت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہونا وہی تھا جو اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔

اسے درد ہو رہا تھا، آج سے پہلے کبھی اس نے ایسی تکلیف محسوس نہیں کی تھی۔ جب ابراہیم اسے چمڑے کی بیلٹ سے پیٹتا اور اس مار سے اس کی پیٹھ پر بدھیاں پڑ جاتیں، تب بھی ایسا درد نہیں ہوتا تھا، جس رات مونا اسٹوکر اس کے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔ تب بھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ جب جج نے اسے پانچ سالوں کے لیے جیل میں بند کرنے کا حکم دیا تھا، اس وقت بھی نہیں۔ جب اسے Van Nuys کے اسٹوڈیو میں لورکا کے لیے کام کرنا پڑا تھا، تب بھی نہیں۔ کسی بھی موقع پر اس نے ایسی اذیت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ درد کی ایسی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کس طرح اسے روکتا؟ ماری جوانا، شراب، نیند کی گولیاں......کون سا حربہ کارگر ثابت ہوگا؟ ہر علاج اس درد کے سامنے بے بس تھا۔ بڑے دنوں بعد اسے ابراہیم یاد آ رہا تھا۔

''یہ قرآن کا دل ہے۔ جب کوئی جان کنی کی تکلیف میں ہو تو اسے پڑھنے کی ہدایت ہے اور میں دیکھ رہا ہوں، تم بہت تکلیف اٹھانے والے ہو۔ تمہیں اس کی بہت ضرورت پیش آئے گی۔''

سب زندہ انسانوں کی طرح وہ بھی لاعلم تھا کہ جان کنی کی تکلیف کیا ہے۔ پر وہ جس تکلیف میں مبتلا تھا، وہ جان نکلنے کے درد سے بھی زیادہ دردناک تھی۔ اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

ابراہیم نے چھ ماہ میں اسے وہ سورۃ یاد کروائی تھی۔ تقریباً ہر روز وہ ابراہیم کے ہاتھوں مار کھایا کرتا تھا۔ مگر ایک دن میں ایک پوری آیت بھی یاد نہیں کر پاتا تھا۔ ابراہیم نے کہا تھا کہ اسے مستقبل میں اس کی ضرورت پیش آنے والی ہے۔ اور آج وہ دن آ گیا تھا۔ ابراہیم کی پیش گوئی سچ ہو گئی تھی۔ اسے ابراہیم اتنا یاد کیوں آ رہا تھا؟ یا شاید وہ ابراہیم نہیں تھا جو اسے یاد آ تا تھا......اسے خدا یاد آ رہا تھا۔ خدا کے ان الفاظ کو دہرا کر ہی وہ اس درد سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔

وہ باتھ روم میں گیا اور وضو کرنے کے ارادے سے نل کھولا۔ ہاتھ دھوتے ہوئے اسے احساس ہو گیا کہ اسے وضو کا درست طریقہ یاد نہیں تھا۔ پہلے چہرہ دھویا جاتا ہے یا بازو؟ وہ متذبذب ہو کر بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگا۔ خاصی دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے ہاتھوں کے ساتھ کہنیوں تک بازو دھو لیے اور منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔

''لیکن منہ دھونے سے پہلے ناک میں بھی تو پانی ڈالا جاتا ہے اور کلی بھی کی جاتی ہے اور پتا نہیں ترتیب میں ان کاموں کی جگہ کہاں ہوتی ہے؟'' بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے وہ پھر ساکت ہو گیا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ وضو کے دوران گیلے ہاتھوں کو سر کے بالوں پر پھیرا جاتا ہے۔ اس نے مسجد میں سب لوگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا تھا۔ خود بخود اس کے ہاتھ سر کے بالوں پر حرکت کرنے لگے۔

''کیا ترتیب کو نظر انداز کرنے سے وضو ہو جاتا ہے؟''

اسے اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا۔ زور سے اپنے ہاتھ واش بیسن سے ٹکراتے ہوئے وہ رونے لگا۔ اسے شک تھا کہ اس نے کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑ دیا تھا اور وضو پورا نہیں ہوا تھا۔ باتھ روم کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی نگاہ پیروں کی جانب گئی اور وہ الٹے قدموں واپس اندر چلا گیا۔

''ہاں پاؤں بھی دھوئے جاتے ہیں۔'' اسے یقین تھا کہ پیروں پر پانی بہانا وضو کا حصہ ہے۔

اپارٹمنٹ کے ایک کونے میں گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے سورۃ کا آغاز کرنا چاہا۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا، ذہن پر زور دے کر اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اس کا حافظہ غیر معمولی حد تک مضبوط تھا۔ کرداروں کے مکالمے یاد کرنے کے لیے اسے کسی فلم کو دوسری دفعہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآن کی جو سورۃ ذہن نشین کرنے میں اس نے چھ ماہ لگائے تھے اس کے چند الفاظ بھی اس کی یادداشت میں نہ رہے ہوں، وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا، اسے ایک آیت تو کیا، ایک لفظ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس سورۃ کا نام بھی اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ خدا کا

کلام ہی اس کی تکلیف کو کم کر سکتا تھا، پر وہ اسے بھول کیسے گیا تھا؟ اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ کار کی چابی اٹھا کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہالی وڈ سٹی یا اس کے آس پاس کوئی مسجد تھی یا نہیں۔ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ پہلے اس نے کوئی مسجد تلاش کرنے کا ارادہ کیا مگر اس تکلیف کو سہنے کی اس میں ذرا بھی سکت باقی نہ تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ شدید تر ہوئی جاتی تھی اور مسجد ڈھونڈنے میں جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ اس نے قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔ ایک بڑی بک شاپ کے سامنے گاڑی روک کر وہ بھاگتا ہوا شاپ کے اندر داخل ہوا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں بولا۔

''تمہارے پاس قرآن ہے؟ خدا کی کتاب۔'' اس کے گالوں پر جمے ہوئے خشک آنسوؤں کے دھبے تھے اور مسلسل رونے سے اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔

لڑکی نے حیرت سے اسے روتے ہوئے دیکھا تھا، ''میں معذرت چاہتی ہوں جناب ہمارے اسٹاک میں موجود نہیں ہے۔''

وہ مڑ کر اسی رفتار سے باہر نکل گیا۔ اگلے دو گھنٹوں میں اس نے کئی کتابوں کی دکانیں دیکھ ڈالی تھیں۔ کہیں بھی اسے اپنی مطلوبہ کتاب نہیں ملی تھی۔ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چھٹی یا شاید ساتویں دکان کے بوڑھے میکسیکن مالک نے اسے ہاں میں جواب دیا تھا، اس کا جی چاہا کہ میکسیکن بوڑھے کے ہاتھ چوم لے۔

قرآن اس کے ہاتھوں سے تقریباً چھینتے ہوئے وہ گاڑی تک آیا تھا اور گاڑی کی اندرونی بتیاں روشن کر کے قرآن کو درمیان سے کھولتے ہوئے سامنے پھیلا لیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی بینائی چلی گئی ہو۔ وہ اندھوں کی طرح قرآن کے صفحوں کو ٹٹولنے لگا۔

قرآن کا وہ نسخہ اسپینش میں تھا اور احمد اسپینش زبان پڑھنا نہیں جانتا تھا۔



وہ میبل کو ساتھ لیے بازار میں بے مقصد گھوم رہی تھی کہ جوتوں کی اس مخصوص دکان کے سامنے حسب عادت رک گئی۔ بے اختیار اسے دھچکا لگا تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار ایک سیلز بوائے قرمزی رنگ کے Monolo Blahnik جوتوں کے جوڑے کو اس کی مخصوص جگہ سے نکال رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک خوش رو blonde چمک دار نیلی آنکھوں میں اشتیاق لیے کھڑی تھی۔ یقیناً اس کی نظر انتخاب ان جوتوں پر ٹھہر گئی تھی۔ اور وہ آزمائش کے لیے انہیں نکلوا رہی تھی۔ صوفیہ اس جگہ سے ہل نہ سکی۔ اس کی نظریں دکان کے اندر مقید ہو گئی تھیں۔ وہ سیلز بوائے اور بلونڈ کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔ سیلز بوائے نے نیچے جھکتے ہوئے لڑکی کو جوتے پہننے میں مدد دی۔ اب وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے ان کی پرکھ کر رہی تھی۔ لکڑی کا قد آدم ریک درمیان میں آنے کے باعث وہ چند ساعتوں کے لیے صوفیہ کی نظر سے اوجھل ہوئی تو اس نے شدید بے چینی محسوس کی۔ دائیں رخ دو قدم لے کر آگے جھکتے ہوئے اس نے لڑکی کے پیروں کو زیادہ وضاحت سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل میں شدید چاہ تھی کہ وہ لڑکی ان جوتوں کو رد کر دے مگر اسے یہ خیال احمقانہ لگتا تھا۔ وہ جوتے اس قدر شاندار تھے کہ کوئی بھی انہیں ناپسند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود وہ بکنے سے کیسے محفوظ رہے تھے۔ لڑکی کے انداز سے اطمینان اور خوشی ظاہر ہوتی تھی۔ اس نے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے جوتوں کو پیروں سے الگ کیا اور پرس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی جسے اس نے سیلز بوائے کے حوالے کر دیا تھا۔ شاید وہ کریڈٹ کارڈ تھا۔ صوفیہ کے لیے مزید اس منظر کو دیکھنا محال ہو گیا۔ اس لڑکی کی آسودہ ہنسی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ حالانکہ اسے ایسی کوئی امید نہیں تھی کہ وہ خود کبھی ان جوتوں کو خریدنے کے قابل ہو سکے گی، پھر بھی انہیں آرائشی الماری میں سجے ہوئے دیکھنے سے اس کی ڈھارس بندھی رہتی تھی کہ وہ اور لوگوں کی پہنچ سے بھی دور تھے۔ اگر اس کے پاس تین سو ڈالر نہیں تھے تو جن کے پاس تھے، ان میں

جوتوں کے ایک جوڑے پر اتنی رقم خرچ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ لڑکی اب یوں ہی وقت گزاری کی خاطر باقی شوکیسوں کا سرسری جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے ساتھ کھڑے میبل نے اس کی قمیص کی آستین پکڑ کر کھینچی تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اسے میبل کی یہ عادت بہت ناگوار لگتی تھی کہ جب وہ اس کے قریب موجود ہوتا تو اسے مخاطب کرنے کے لیے زبان ہلانے کے بجائے ہاتھوں کو استعمال کرتا، کبھی وہ اس کا دامن پکڑ کر جھٹکا دیتا تو کبھی آستین کھینچنے لگتا۔ بسا اوقات اسے شک گزرتا کہ میبل اسے چھونے کی غرض سے ایسا کرتا تھا۔

''کیا چیز تمہیں تکلیف پہنچا رہی ہے؟'' اس نے کرختگی سے کہتے ہوئے ایک کڑی نگاہ میبل پر ڈالی۔

وہ اسی شاپ کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں اب وہ لڑکی ایک خوبصورت شاپنگ بیگ ہاتھ میں لٹکائے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔

''وہ لے کر جا رہی ہے۔'' اس نے اپنی بھدی انگلی سے اشارہ کیا۔

''تو کیا کروں؟ اب وہ اس کی ملکیت ہیں۔ اسے لے جانے سے روک تو نہیں سکتی۔ کیا تم روک سکتے ہو؟ ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔'' اس نے تمسخر اڑایا۔

''وہ تمہیں اچھے لگتے ہیں۔ مجھے برا لگ رہا ہے۔''

''وہ لڑکی انہیں لے کر جا رہی ہے۔ وہ نہیں رہے۔ بات ختم۔ مجھے وہ کیسے لگتے تھے۔ اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کی کوئی بھی اچھی چیز میرے لیے نہیں ہے۔ تم جب کچھ کر نہیں سکتے تو مجھے بے زار بھی نہ کرو۔ تم انتھونی کی دراز سے کچھ نقدی چرا لیتے تو آج مجھے یہ برداشت نہ کرنا پڑتا۔''

میبل کو اس کی بات مضحکہ خیز لگی تھی۔ وہ ہنسنے لگا اور اس کے ہونٹوں پر چھوٹے بچوں کی طرح بلبلے پھوٹتے دکھائی دیئے۔

''تمہارے غلیظ منہ سے رکیک چھینٹے اڑ رہے ہیں۔ ہنسنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے دور ہٹ جایا کرو۔''

اس کی گھرکی نے میبل کو بدمزہ نہ کیا۔

''میں بات کرتا ہوں، مجھے کوشش کرنے دو۔ میں اسے جانتا ہوں۔'' اس نے پھر سے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی زرد بالوں والی لڑکی کے رخ بازو لہرایا۔

لڑکی کی ڈھیلی ڈھالی چال بتا رہی تھی کہ اسے فرصت میسر تھی۔ ہر دو قدم پر رک کر وہ کسی نمائشی الماری میں کھو جاتی تھی۔

''اشارہ مت کرو۔ لوگ متوجہ ہوں گے اور تم اس سے کیا بات کرو گے۔ کیسے جانتے ہو تم اسے؟'' میبل بیساکھی سنبھالتا ہوا چل دیا اور جاتے ہوئے گردن گھما کر بولا۔

''میں ٹیٹو پہچانتا ہوں۔ وہ انتھونی کے گیراج میں آتی ہے۔''

صوفیہ نے غور کیا تو واقعی لڑکی کی گردن پر پارے کی رنگت کی چمکیلی مچھلی گدی ہوئی تھی۔ اس نے میبل کو رکنے کا کہا مگر ان سنی کر کے وہ لڑکی کے قریب جا کر کچھ کہنے لگا۔

''moron''۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ ایک بڑے ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ کسی تماشے کا حصہ بننے سے بچنے کے لیے لازم تھا کہ وہ میبل سے کوئی تعلق ظاہر نہ ہونے دے۔ اسی لیے اس نے خود کو پوشیدہ کر لیا تھا۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ میبل کو وہیں چھوڑ کر چلی جائے۔ لیکن پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں ٹھہر کر اس لڑکی کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ ان دونوں کی درمیان کیا بات ہو رہی تھی۔

لڑکی خوف زدہ نظر آتی تھی اور اس کے تیوروں سے لگتا تھا کہ وہ کسی بھی آن چلانا شروع کر دے گی۔ میبل کی ہیئت بھی اس نوع کی تھی کہ اسے اپنے قریب پا کر کسی بھی نفیس طبع انسان کا کبیدہ خاطر ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ اس وقت تو یوں بھی دھمکی آمیز طریقے سے ہاتھ ہلاتا ہوا وہ بے حد خطرناک ظاہر ہوتا تھا۔

وہ لڑکی بدحواسی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے میبل سے چھٹکارا پانے کے لیے مدد درکار تھی۔ میبل ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن کر اس کا راستہ بند کیے کھڑا تھا اور منہ سے کف اڑاتے ہوئے تیز تیز کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے میبل کو لڑکی کے شاپنگ بیگ والے ہاتھ پر جھپٹتے دیکھا۔ وہ اس سے جوتوں والا لفافہ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھبرائی ہوئی لڑکی نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

صوفیہ اس صورت حال سے محظوظ ہونے لگی تھی۔ زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی آوازیں وضاحت سے نہیں سن سکتی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قریب جا کر ان کی تکرار سنے جو یقیناً دلچسپ ہوگی، مگر وہ اتنی غیر محتاط نہیں تھی۔ اس لیے جو دستیاب تھا اسی پر اکتفا کر کے اپنے قیام کی جگہ سے سب معاملہ دیکھتی رہی۔ لڑکی کے واویلے پر چند لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان لوگوں میں اس دکان کا سیلز بوائے بھی شامل تھا، جہاں سے کچھ دیر قبل وہ خریداری کر کے نکلی تھی اور اپنی معزز گاہک کا دفاع کرنے میں پیش پیش دکھائی دیتا تھا۔ میبل نے اتنے لوگوں کو اپنے مقابل پا کر فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی تھی۔ خیر گزری کہ اس لڑکی یا ان راہ گیروں میں سے کسی نے پولیس کو بلانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ خاصی دیر میبل ادھر ادھر تلاش کرتا رہا اور اسے ڈھونڈ نہ سکا۔ جب اس نے لوگوں کے مختصر گروہ کو منتشر ہوتے دیکھا تو ستون کے عقب سے نکل کر میبل کے سامنے آ گئی۔

''تمہیں کیا لگا تھا وہ بھیک میں اپنی تین سو ڈالر کی خریداری تمہارے حوالے کر دے گی۔ چغد کہیں کے۔'' اس نے کہا تو میبل کا چکنائی زدہ گھنگھریالے بالوں والا سر جھک گیا۔

''وہ نہیں مانی، وہ ایک بے وقوف لڑکی ہے۔''

''یہ بتاؤ، تم نے اس سے جوتے چھین کیوں نہیں لیے۔ کیا اس کی گرفت تم سے زیادہ مضبوط تھی۔ تم کسی لاچار بڑھیا کی طرح اس سے زور آزمائی کر رہے تھے۔''

''نہیں۔ وہ میں لے سکتا تھا، ایسا نہیں ہے...... میں بھاگتا کیسے؟'' اس نے شرمندگی بھرے لہجے میں کہا۔

جاتے ہوئے اس کی توجہ اس دکان کی جانب منعطف ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ان جوتوں کی جگہ اب بھڑکدار عنابی رنگ کے جوتوں کا جوڑا دھرا تھا۔ نمائشی الماری کا وہ حصہ، جو اس کا پسندیدہ ہوا کرتا تھا، اب کس قدر بے کشش دکھائی دے رہا تھا۔ اسے وہ جوتے بھونڈے اور بدوضع لگے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ آئندہ اسے اس دکان پر توجہ دینے کی حاجت نہ رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

سیاہ پشم والی بلی جیسی رات روشن دان میں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ اگلے پنجوں کو چھاتی سے چمٹائے کمر اٹھا کر وہ حملہ کرنے کو تیار تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں جلتے ٹیبل لیمپ کی سہمی ہوئی روشنی ایک زرد چوہیا تھی جو اس دشمن کی نیت سے انجان تھی۔ وہ کالی بلی اس زرد چوہیا پر کسی بھی پل جھپٹنے والی تھی۔ بس وہ موزوں لمحے کی تاک میں تھی۔

وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ بستر پر پہلو کے بل لیٹی تھی اور پوربی دیوار کی جڑ میں لگے lenoleum کے نمونے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سمت پسے ہوئے کوئلے جیسا جھرجھرا اندھیرا پھیلا تھا اور دیوار کا وہ حصہ صاف ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ گھسے ہوئے lenoleum میں گہری بھوری اور اودی مثلثیں بنی تھیں، پھر بھی پچھلے کئی منٹ سے نیم تاریک فضا میں وہ ان رنگوں کو شناخت کرنے میں کوشاں تھی۔

کھڑکی کے شیشے کو اس نے انگلی سے ٹھکورا۔ اس نے بستر سے اترتے ہوئے پردہ ہٹایا تو میبل پر نظر پڑی۔ اسٹریٹ لائٹوں کی روشنی میں وہ ایک سیاہ بت کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کے حلیے میں کوئی ایسی بات تھی جو پہلی نظر میں صوفیہ کو سمجھ نہ آ سکی۔ وہ الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور پھر اس پر عیاں ہوا کہ میبل نے البا کا وہ کاسٹیوم پہن رکھا تھا جو کچھ دن پہلے وہ اس سے مانگ کر لے گیا تھا۔ درمیانی جسامت کی کسی عورت کو تو وہ لباس با آسانی پورا آ سکتا تھا مگر میبل جیسے دیوہیکل کے جسم پر وہ یوں نظر آتا تھا جیسے اس نے بدن پر کسی گڑیا کی پوشاک چڑھا رکھی ہو۔ کئی جگہ سے سلائیاں ادھڑی ہوئی تھیں اور اس کا سیاہ گوشت ان مقامات سے جھانک رہا تھا۔

''کیا مسخروں جیسا حلیہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے دماغ میں ایسے واہیات خیال آتے کہاں سے ہیں؟''

''میں کیسا لگ رہا ہوں؟'' اس نے جھینپ کر پوچھا۔

''یہ پوچھنے کی ضرورت تمہیں کیوں پیش آئی۔ کیا آئینہ دیکھ کر نہیں نکلے گھر سے۔ ویسے تم اتنی خصوصی تیاری کے ساتھ اس وقت میرے پاس کیوں آئے ہو۔ کیا مجھے ڈیٹ پر لے جانے والے ہو؟''

میبل کے موٹے ہونٹ جن پر خشکی سے جھریاں پڑی تھیں، ذرا سے کھل گئے۔ اس کو دیکھے بنا وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''تم چلو گی۔''

''کہاں؟'' اس نے ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

''میں تم سے کہوں، میرے ساتھ ڈیٹ پر چلو، تو تم چلی جاؤ گی؟''

''ہاں میں راضی ہو سکتی ہوں، لیکن تم نے تو کہا ہی نہیں۔''

''میں کہہ رہا ہوں۔'' میبل کی آواز اتنی اونچی ہو گئی کہ صوفیہ کو ہاتھ رکھ کر اس کا منہ بند کرنا پڑا۔

''تم مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟''

وہ چند لمحے آنکھوں کے ڈیلے گھماتا رہا، پھر کندھے اچکا دیے۔ ''پتا نہیں۔''

''اس سے پہلے کبھی ڈیٹ پر گئے ہو؟''

''پتا نہیں۔''

''تو اب کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''پتا نہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈیٹ پر کیوں جاتے ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' اس کی سوئی 'پتا نہیں' پر اٹک گئی تھی۔

''تمہیں اتنی ساری باتوں کا پتا نہیں۔ کیا تمہیں اس بات سے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟......اب اگر اس کے جواب میں تم نے پتا نہیں کہا تو میں تمہارا جبڑا توڑ دوں گی۔''

میبل جو کھلکھلاتے ہوئے شاید ایک بار پھر 'پتا نہیں' کہنے والا تھا، خاموش ہو کر سر ہلانے لگا۔

''اچھا اتنا تو معلوم ہو گا کہ ڈیٹ پر جانے سے پہلے مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر زور سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں باہر آنا ہو گا۔''

صوفیہ نے ایک طویل سانس بھری۔ ''صحیح کہا۔ میں باہر آتی ہوں۔ گرانٹ آج دوپہر سے اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ لگتا ہے اس نے کوکین کی ضرورت سے زیادہ مقدار استعمال کر لی ہے۔ تم دوسری طرف سے آؤ اور دروازے کے باہر ٹھہر کر میرا انتظار کرو،

میں جوتے پہن کر آ رہی ہوں۔"

وہ کھڑکی بند کر کے پلٹنے لگی تو میبل شیشے کو ہتھیلی سے بجانے لگا۔ وہ مڑ کر دوبارہ کھڑکی تک آئی تھی۔

"کیا ہے؟"

"تم کھڑکی سے باہر آ جاؤ۔ مجھے انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا، میں تھک جاتا ہوں۔"

"تم بہت سی باتیں نہیں جانتے۔ کچھ چیزوں کو جاننے کے لیے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔"

صوفیہ نے کہا تو میبل عجیب سی شکل بنا کر پلکیں جھپکنے لگا۔

"تم ایسا کرو کہ اس کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

"ہم ڈیٹ پر نہیں جا رہے؟" وہ مایوس ہو گیا۔

"اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ پہلے تم اندر آؤ۔"

وہ جھجکتا ہوا آگے آیا اور ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیساکھی اسے تھما دی۔

"میں نہیں کر سکتا، میں گر جاؤں گا۔"

"کوشش تو کرو۔"

گھبرائے ہوئے میبل نے جوں ہی کھڑکی میں پھیلی گھنی بیل کے پتوں پر ہاتھ رکھ کر بدن کا دباؤ ڈالا، اس کے حلق سے بے اختیار سسکاری نکل گئی۔ اس نے چھپکلی کی طرح دیوار سے چمٹتے ہوئے فوراً ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

"اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کھڑکی کے راستے باہر کیوں نہیں آ سکتی۔" صوفیہ نے بیل کے پتوں کے کچھ گچھے ہٹا کر کھڑکی کا نچلا سرا نمایاں کیا تو کنکریٹ کی چوڑی دیوار میں پروئے ہوئے کانچ کے ٹکڑے، بڑی میخیں خاردار تار کے لچھے اور آہنی گوکھرو نظروں کے سامنے آ گئے۔

"تم سے پہلے گرانٹ نے یہ بات سوچ لی کہ میں اس کھڑکی کے ذریعے گناہ کرنے باہر جا سکتی ہوں۔ یہ کیلیں اتنی مضبوط ہیں کہ سخت سے سخت جوتے کا سول آسانی سے پھاڑ سکتی ہیں۔ یوں بھی مجھے کھڑکیاں پسند نہیں۔ آنے جانے کے لیے دروازے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ان کو دونوں طرف سے کھولا جا سکتا ہے۔ لیکن کھڑکیاں صرف اندر سے کھلتی ہیں۔ تم دروازے پر آؤ۔ میں تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرواؤں گی۔" بیساکھی اسے لوٹاتے ہوئے صوفیہ نے کہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں سنسان سڑک پر سمت کا تعین کیے بغیر نہایت سست روی سے چلے جا رہے تھے۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور صنوبر کے اونچے درخت سڑک کے جانب صفیں باندھے دم سادھے کھڑے تھے۔

زعفرانی چاند اون کے کھلتے ہوئے گولے کی مانند ایک سمت لڑھکتا چلا جاتا تھا۔ اکا دکا گزرتی ہوئی گاڑیوں کی لمحاتی مداخلت کے سوا مکمل سکوت طاری تھا۔

"تمہارا پسندیدہ بیوریج کون سا ہے؟"

"صرف Jim Beam۔" میبل نے بلا توقف جواب دیا۔

"وہ کیوں؟"

"اس کا نام اچھا ہے۔"

"کسی مشروب کا نام اچھا ہونے سے وہ تمہارا پسندیدہ کیسے ہو گیا۔ کوئی اور وجہ بھی تو ہو گی۔ جیسے ذائقہ یا اس کو پینے سے پیدا ہونے والی کیفیت......؟"

''اور اس لیے بھی کہ وہ سستا ہے۔'' میبل نے بے تاثر آواز میں بتایا۔
''تمہیں میں کیوں پسند ہوں؟''
''تم ہنستی ہو تو تمہارے منہ سے تھوک نہیں اڑتا، اس لیے۔'' اس بار بھی اس نے تامل کیے بغیر کہا تھا۔
''تمہارے پاس چیزوں کو پسند یا ناپسند کرنے کے لیے کتنی سادہ وجوہات ہیں۔ کبھی کبھی مجھے تم پر رشک آتا......''
ان سے کچھ فاصلے پر جہاں سڑک بل کھا کر جنوب کو مڑ جاتی تھی، مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار گاڑی نے چند سیکنڈ کے لیے رفتار دھیمی کی، انہوں نے پسنجرز سائیڈ کا دروازہ کھلتے اور ایک انسان کو جو اپنی وضع سے عورت معلوم ہوتی تھی، باہر سڑک پر گرتے دیکھا۔ آنکھوں کو چندھیا دینے والی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ان پر پڑی اور گاڑی ریورس گیئر میں بھاگ پڑی۔ شاید اس عورت کو باہر دھکیلنے سے قبل ڈرائیور کی ان پر نظر نہیں پڑی تھی اور سڑک کو ویران جانتے ہوئے اس نے اس جگہ کو منتخب کیا تھا۔ درحقیقت رات کے ان اوقات میں رہائشی آبادی کا یہ حصہ آمد و رفت سے عاری رہتا تھا۔ اگر اتفاقاً وہ دونوں اس جگہ موجود نہ ہوتے تو وہ جو کوئی بھی تھا اپنا کام کسی کی نظروں میں آئے بنا پورا کر سکتا تھا۔
جتنی دیر میں وہ اس صورت حال کو شعوری طور پر قبول کر پائے تب تک وہ گاڑی ان کی بینائی کی حد سے باہر جا چکی تھی۔ سڑک پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی عورت اگر مردہ نہیں تھی تو بھی بے ہوش ضرور تھی، کیونکہ اس کے جسم میں کسی حرکت کے آثار ظاہر نہ ہوئے تھے۔ ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی اور میبل چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس عورت کے پاس چلا گیا۔ صوفیہ وہیں جمی اس کی طرف سے کسی ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ میبل زمین پر گھٹنا ٹیکتے ہوئے نیچے بیٹھ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔
''یہ وہ ہی ہے، جلدی یہاں آؤ۔'' اچانک وہ جوش سے چلایا۔ ''تمہارے جوتے اس کے پاس ہیں، ادھر آ کر دیکھو، وہ ہی جوتے ہیں، تمہارے پسندیدہ، بھاگ کر یہاں آؤ۔''
میبل کی لایعنی باتیں سن کر وہ الجھ گئی اور بلا ارادہ اس سمت چل دی۔ قریب جانے پر میبل کے بے ربط جملوں کا مفہوم واضح ہو گیا تھا۔ سڑک پر بے سدھ لیٹی ہوئی لڑکی وہ ہی تھی، جسے محض دو دن پہلے اس نے بازار میں اپنے پسندیدہ جوتے خریدتے دیکھا تھا۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔
اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی گردن پر گدی ہوئی بڑی سی مچھلی اصلی پارے کی مانند چمک رہی تھی اور وہ قرمزی جوتے بھی اس وقت اس کے پیروں میں موجود تھے۔ اس کے سر یا شاید ماتھے پر کہیں چوٹ لگی تھی، کیونکہ سر کے بال چپچپے اور جڑے ہوئے تھے اور پیشانی خون آلود تھی۔ اس کے علاوہ کوئی زخم تھا تو وہ جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر نہیں تھا۔ بہر حال وہ زندہ تھی۔ وہ دقت سے نتھنے کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے پوری طرح بند نہیں تھے اور پتلیاں الٹ کر حلقوں میں گھسی تھیں۔
''میری مدد کرو، میں اکیلا نہیں کر سکتا۔''
میبل کی آواز سن کر وہ چونکی۔ وہ ایک ہاتھ سے بیساکھی سنبھالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے لڑکی کے جوتے کا اسٹریپ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''کیا کر رہے ہو؟ پاگل مت بنو۔''
''یہ جوتے تمہارے ہو جائیں گے، اس کو پتا نہیں چلے گا۔''
وہ اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ گھسا کر ٹٹولنے لگی۔ ''ہمیں پولیس کو اطلاع دینا ہو گی۔ یہ کسی جرم کا معاملہ لگتا ہے۔ خاموشی ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔''
اس نے بیگ میں تلاش موقوف کر دی۔ اس کا سیل فون اس میں نہیں تھا اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے

اسے سیل فون لے آنا یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے بدستور میبل کو لڑکی کے جوتوں کے ساتھ زور آزمائی کرتے دیکھا تو چیخ پڑی۔

''میں نے تم سے کہا کہ اس سے دور رہو۔ بالکل نہ چھوؤ اسے۔''

میبل نے ایک نظر اس کی برہم صورت دیکھی اور پھر بیساکھی کو سڑک پر گراتے ہوئے آرام سے نیچے بیٹھ گیا۔ ''تمہیں مجھ سے خفا نہیں ہونا چاہیے، میں یہ تمہارے لیے کر رہا ہوں، تمہیں یہ جوتے بہت پسند ہیں۔ ایک ہاتھ سے بکل نہیں کھل رہا تھا۔'' وہ لڑکی کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے منمنایا۔

لڑکی کے تنفس میں غیر معمولی حد تک تیزی آ گئی تھی اور اس کے بدن کو خفیف سے جھٹکے لگ رہے تھے۔

صوفیہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں چیخی۔ ''لعنت ہو ان جوتوں پر۔ تم فوراً اٹھو اور ہم یہاں سے چلتے ہیں۔ میں کہیں سے فون پر پولیس کو اس کے بارے میں بتا دوں گی۔''

میبل سر جھکائے اپنے کام میں مگن رہا۔ وہ ایک جوتا اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسرے پاؤں کو پکڑنے کے لیے وہ جھکا تو اچانک لڑکی کا اوپری دھڑ ایسے سمٹا جیسے وہ اٹھ کر بیٹھنے والی ہو۔ ایسا بس ایک ساعت کے لیے ہوا تھا۔ پھر وہ بے حس و حرکت ہو گئی تھی۔

اس نے میبل کو زوردار سسکی لیتے سنا۔ وہ دیکھنے کی خاطر آگے جھکی تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی نے اپنے ہاتھ کے لمبے ناخن میبل کی کلائی میں سختی سے گاڑ رکھے تھے۔ تب ہی اسے دور سے ایک پولیس پٹرول کار آتے ہوئے دکھائی دی۔

میبل کے جھٹکا دینے پر اس کی کلائی لڑکی کی گرفت سے نکل گئی تھی، اب صوفیہ کو لڑکی کے جسم میں تنفس کے عمل سے پیدا ہونے والا زیروبم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''میبل! میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں کہ اٹھو اور تمہارے اندر جتنی بھی سکت ہے اسے استعمال کر کے اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور ہو جاؤ، cops اسی طرف آ رہے ہیں اور یہ لڑکی اگر مر چکی ہے، جس کا مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے تو ہمارے پاس ان کے سوالوں کے جو جواب ہیں، یقین کرو۔ وہ بالکل مناسب نہیں ہیں۔''

پولیس کار اب خاصی نزدیک آ چکی تھی۔ صوفیہ استطاعت کی آخری حد تک تیز دوڑتے ہوئے فٹ پاتھ سے اتر کر درختوں کی اوٹ میں کچی سڑک پر آ گئی۔ اسے اپنی پشت پر روشنی کا دھارا چمکتا دکھائی دیا، ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے سرچ لائٹس کی مدد سے اس کی نشان دہی کر لی گئی تھی۔ کچھ دیر وہ جھک کر کھڑی سن گن لیتی رہی اور پھر اطمینان ہونے پر گھر کی سمت سرپٹ دوڑ پڑی۔

اسے ایک فی صد بھی امید نہیں تھی کہ میبل ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا ہوگا۔ وہ اس کے لیے متفکر بھی نہیں تھی، اسے بس کسی بھی طرح پولیس آفیسرز کے الٹے سیدھے سوالوں کا سامنا کرنے سے بچنا تھا۔ اس نے البا کے stiletto جوتے پہن رکھے تھے جو بھاگنے میں بے حد غیر معاون ثابت ہو رہے تھے۔ اس کی ایڑیوں اور پنڈلیوں میں درد ہونے لگا تھا لیکن وہ رک کر انہیں اتارنے میں وقت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کے سامنے پہنچنے میں اسے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگے ہوں گے لیکن بے حد تیز رفتاری سے دوڑنے کے باعث وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، اس کی عادت تھی کہ رات کو چوری چھپے گھر سے نکلتے ہوئے اگر اس کا ارادہ البا کے جوتوں میں سے کوئی استعمال کرنے کا ہوتا جو کہ سب کے سب نوک دار اونچی ایڑیوں سے مزین تھے، تو وہ جوتے دروازے سے باہر آ کر پہنا کرتی تھی تاکہ باریک ایڑیوں سے ابھرنے والی آواز گرانٹ کو چوکنا نہ کر دے اور اسی طرح جب وہ کہیں سے واپس آتی تو دروازہ عبور کرنے سے قبل جوتے اتار دیا کرتی تھی۔

اس وقت بھی اس نے یہ عادت دہرائی تھی۔ گھر سے کچھ دور ہی اس نے گرد سے اٹے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔

تلوؤں اور پیروں کی انگلیوں میں اسے پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ بستر میں گھسنے سے پہلے اس نے اپنے پاؤں دھوئے تھے۔ کمبل سر تک اوڑھ کر لیٹے ہوئے جب اسے خاصی دیر بیت گئی تو اس کے تنے ہوئے اعصاب رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے۔

وہ سوچنے لگی کہ شاید بے پناہ ہراس کے زیر اثر میبل cops کو اس کے متعلق بتا ہی نہیں پایا ہوگا، ضروری نہیں تھا کہ واقعات کا تسلسل وہی رہے جو اس نے ذہن میں طے کر رکھا تھا۔ اچانک اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اس کے حواس کو جھنجھوڑ دیا۔ خاموشی سے لیٹی انتظار کرتی رہی۔ گھنٹی دوبارہ بجی اور پھر تیسری دفعہ بجی تو مسلسل بجتی چلی گئی۔

اسے گرانٹ کے کمرے سے کھٹر پٹر سنائی دی۔ وہ جاگ گیا تھا اور اب کھانستا ہوا دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ سنی اور کسی کے تیز تیز بولنے کی آوازیں اس کے کانوں تک آئیں۔

اس نے اندازہ لگایا کہ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔

''کون ہے وہ لڑکا؟ وہ کچھ بھی کہے گا اور تم مان لوگے؟'' اس نے گرانٹ کو احتجاج کرتے سنا۔ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا تھا۔ باوجود پورا دھیان دینے کے، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''اچھا وہ! اسے میں جانتا ہوں وہ تو retard (ذہنی طور پر معذور) ہے، اس کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔''

''وہ کیوں اس کے ساتھ ہوگی رات کے اس وقت؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بارہ بجنے والے ہیں۔ یہ اس کے curfew hours ہیں۔''

جواب میں شاید کسی نے بالغ ہونے کے متعلق کوئی بات کی تھی۔

''نہیں۔ وہ نابالغ نہیں ہے لیکن وہ میری بیٹی ہے۔ وہ عام نوجوان لڑکیوں کی طرح بے لگام اور ضرورت سے زیادہ خود مختار نہیں ہے۔ اسے میری جانب سے ممانعت ہے وہ نو بجے رات کے بعد گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔'' گرانٹ کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ میں بہت بیمار ہوں، اس طرح رات گئے مجھے بے آرام کرنا تم لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔''

''تو تم نہیں مانو گے۔ ٹھیک ہے تم سے بحث تو نہیں کی جا سکتی۔ میں اسے بلاتا ہوں، لیکن جو بھی سوالات ہوں، وہ میری موجودگی میں پوچھے جائیں گے۔''

اس نے بکتے جھکتے گرانٹ کو اپنے کمرے کی سمت پاؤں گھسیٹ کر آتے سنا۔

''صوفیہ! اٹھ کر باہر آؤ۔''

وہ ذہنی طور پر تیار تھی، اس لیے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ گرانٹ کے متعدد بار پکارنے اور دروازہ پیٹنے کے بعد اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اس کی زبان سے پولیس کی آمد کا سن کر بے ربط باتیں کرنے لگی۔ جیسے گہری نیند سے اٹھائے جانے کے بعد عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں۔ پولیس آفیسرز کے سامنے آنے تک اس نے سر کے بال بے ترتیب کر دیے اور چہرے پر غنودگی والی کیفیت طاری کر لی۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ ان میں سے دو دروازے پر کھڑے تھے اور ایک آفیسر کچھ فاصلے پر رکی ہوئی پولیس کار کے اندر پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ میبل بھی موجود تھا اور دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

اس پر نظر پڑتے ہی میبل کے جسم میں شدید ہلچل ہونے لگی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکرانے کی کوشش کر رہا تھا اگر cops نے اس لڑکی کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے لیے اسے روک رکھا تھا تو پھر اسے ہتھکڑی کیوں لگائی گئی تھی۔ غالب امکان یہی تھا

کہ میبل ان کو کوئی تسلی بخش وضاحت نہیں دے سکا تھا اور وہ اسے ہی ذمہ دار گردان رہے تھے۔
دونوں آفیسرز اسے جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہے تھے۔ اس نے اپنی تمام حسیات ان پر مرکوز کرلیں۔
''تم ہی صوفیہ مارسیلو ہو؟''
''ہاں۔''
''تم میبل نامی لڑکے سے واقف ہو؟''
سوال اس کی توقع کے عین مطابق آیا تھا۔
''ہاں۔ وہ یہاں قریب ہی رہتا ہے۔ اس سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟''
اس کا استفسار نظر انداز کردیا گیا۔
''کیا تم ابھی کہیں باہر سے لوٹی ہو؟''
اس سوال کا جواب بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو اپنے کمرے میں تھی۔''
اگلا سوال بھی حسب امید تھا۔ ''سوچ کر جواب دو۔ کیا چند منٹ پہلے تم میبل کے ساتھ تھیں؟''
جواب دینے سے قبل اس نے میبل کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے اور پولیس کار کے اندر نا کافی روشنی کی وجہ سے اس کا چہرہ ایک بڑا سا کالا دھبہ دکھائی دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ میبل اس سے کوئی ایسی چیز مانگ رہا تھا جس کی اسے واقعی ضرورت تھی۔
''چند منٹ پہلے۔ کیوں؟'' پولیس آفیسرز کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ارادتاً ہکلائی۔ ''میں تو دس بجے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ میبل سے آخری بار تو میں کل صبح ملی تھی۔ اس نے گزرتے ہوئے مجھے ہیلو کہا تھا۔ میں تب دودھ کی بوتل اٹھانے دروازے پر آئی تھی۔''
کچھ اور سوالات پوچھے گئے۔ اسے اگلے روز پولیس اسٹیشن آنے کی ہدایت دی گئی اور وہ لوگ لوٹنے والے تھے کہ ان میں سے ایک آفیسر جو دروازے کے سامنے بنے مختصر چبوترے پر کھڑا تھا از راہ اخلاق بولا۔
''معذرت خواہ ہوں۔ میرے مٹی بھرے جوتوں سے تمہارے فرش پر دھبے بن گئے۔ یہ بہت ہی بدنما لگ رہے ہیں۔''
ایک پل کے لیے صوفیہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اگر اس نے عادتاً سڑک پر جوتے اتارے نہ ہوتے تو اس کے جوتوں پر لگی مٹی سے اس ہلکے رنگ کے فرش پر بننے والے نشان صاف نظر آ جاتے۔
''تم نے ابھی ابھی پاؤں دھوئے ہیں؟''
وہ بے اختیار نفی کرنے لگی تھی کہ جملے کا باقی حصہ سن کر خود کو بروقت روک لیا۔ ''تمہارے پائنچے گیلے ہیں۔''
کس قدر خلاف توقع سوال تھا۔ اس کی ساری ذہنی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔
''میرا پیٹ درست نہیں ہے۔ مجھے بستر میں جانے کے بعد دو تین مرتبہ ٹوائلٹ جانا پڑا۔'' اس نے سرتوڑ جدوجہد کر کے آواز کو بے تاثر بنایا۔ وہ مطمئن ہوئے تھے یا نہیں لیکن اس بات کو مزید کریدا نہیں گیا۔
کچھ مزید ہدایات دینے کے بعد وہ لوگ کار میں سوار ہو گئے تھے، ان کے بیچ مچلتا ہوا میبل اتنا بے قرار لگتا تھا جیسے جال میں آئی ہوئی مچھلی۔
میبل کو دیکھنے پر اسے ہمیشہ نوٹرے ڈیم کا کبڑا یاد آیا کرتا تھا۔ آج اسے ادراک ہوا تھا کہ میبل اور وکٹر ہیوگو کے تخلیق کردہ

اس کردار میں کیا پہلو مماثل تھا۔کوز پشت Quasimodo کلیسا کے جرس کی اونچی آواز سے بہرا ہو گیا تھا اور میبل ٹانگ سے محروم تھا۔ Quasimodo اور خانہ بدوش رقاصہ Esmeralda کے درمیان ایسا ہی عجیب رشتہ تھا جیسا خود اس کے اور میبل کے درمیان تھا۔ میبل اس سے محبت کرتا تھا لیکن شعوری سطح پر اس امر کو پہچانتا نہیں تھا۔ وہ Quasimodo کی طرح بدصورت اور تنہا تھا لیکن وہ صوفیہ تھی Esmeralda نہیں وہ بیسوی صدی کے اس Quasimodo کی خاطر کچھ بھی کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

گرانٹ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھا کہ میبل نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔

رات کا بقیہ حصہ اس نے جاگ کر گزارا۔ میبل کی اس کی زندگی میں اتنی اہمیت نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے بے خواب رہتی۔ تنہائی اور خاموشی اسے یوں کاٹتی تھی کہ ایک ایک پل گزارنا محال تھا۔ وہ کبھی اوندھی لیٹتی، کبھی سیدھی، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور کبھی فرش پر ٹہلنے لگتی۔ وہ کہیں دور جانا چاہتی تھی لیکن کہاں؟ اسے معلوم نہیں تھا۔ کسی سے بات کرنے کی شدید خواہش اس کے اندر شور مچا رہی تھی اور در و بام کے سوا کوئی سننے والا نہ تھا۔ اسے کارل میکارتھی کا خیال آیا۔ پروم پارٹی کے بعد اس نے اسکول جانا ترک کر دیا تھا اور تب سے آج تک اس کی ملاقات کارل سے نہ ہوئی تھی۔ اس نے خود بھی صوفیہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے خاصی دیر سوچنے کے بعد اپنا سیل فون اٹھایا اور کارل کا سیل نمبر ملانے لگی۔ دوسرے سرے پر ایک لڑکی کی غنودہ آواز سنائی دی تھی۔

''کارل! تم نے اپنا سیل یہاں میرے سرہانے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ یہ تیسری کال ریسیور کر رہی ہوں میں۔ بہت تھکی ہوئی ہوں۔ یہ لو پکڑو۔ ذرا پرے تو کھسکو، میں بستر سے گرنے والی ہوں۔''

اس نے کال کاٹ دی۔ وہ اور بھی زیادہ اضطراب محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے بتی جلا دی اور کرسی پر بیٹھ کر سامنے والی دیوار کے lenoleum کی مثلثوں کو گھورنے لگی۔ گزرے ہوئے ماہ و سال نے اس کے بھورے، اودے رنگوں اور سیاہ حاشیے کو بے حد مدھم بنا دیا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بنا آنکھوں کو زبردستی پھیلائے اس سمت دیکھتی رہی۔ اس کا مقصد آنکھوں کو تھکانا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھوں میں درد ہونے لگا اور ان میں پانی جمع ہو گیا۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں موند کر بیٹھے بیٹھے سو جانا چاہا مگر بے سود...... آنکھیں بند کرتے ہی ان کی تھکن دور ہو گئی اور وہ پہلے کی طرح ہی نیند سے عاری ہو گئیں۔ سر جھٹکتے ہوئے اس نے پھر سے ایک مثلث پر نظر جما دی۔

صبح کی نیلگوں روشنی کھڑکی سے کمرے میں آ رہی تھی جب اس پر ہلکی سی غنودگی چھانے لگی۔ وہ بستر پر جانے کے لیے اٹھی تو باہر سڑک پر سے گزرتی ہوئی دیوانی بڑھیا کا گیت سنائی دیا۔

"Not last night but the night before
twenty four robbers came knocking at my door."

وہ کان لگا کر سننے لگی۔

بہت عرصے سے روزانہ صبح کے اوقات میں وہ بڑھیا کھڑکی کے قریب سے یہی rhyme گاتی ہوئی گزرتی تھی۔ اسے بڑھیا کی آواز بے حد بھلی لگتی تھی وہ اکثر اسی آواز کو سن کر بیدار ہوا کرتی تھی۔ اس نے کبھی بڑھیا کو دیکھا نہیں تھا۔ آج جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ بڑھیا کا چہرہ دیکھے۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر گردن باہر نکالی اور حیرت سے گنگ ہو گئی وہ ''بڑھیا'' جو بمشکل پینتیس سال کی ہو گی۔ اس وقت اس کے گھر سے ذرا ہی دور تھی اور دھیمے قدموں سے اسی رخ چلی آ رہی تھی۔

وہ ایک نہایت خوش وضع، میانہ قامت عورت تھی اس کے بائیں ہاتھ میں بید کی ٹوکری تھی جس میں کاسنی اور نارنجی مائل زرد تازہ۔ چنے ہوئے پھول، ہولی کے سبز پتوں کے ساتھ رکھے تھے، اس کی ظاہری ہیئت سے دیوانگی کے آثار معدوم تھے۔ نفاست سے سنوارے ہوئے بالوں پر اس نے جالی دار اونی اسکارف پہن رکھا تھا اور ہاتھ سفید دستانوں سے ڈھکے تھے۔ گیت کے بول

دہراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک الوہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس نے اس کے پورے وجود کو جگمگا رکھا تھا۔

صوفیہ نے محض اس کی آواز سے دماغ میں اس کا خاکہ بنا رکھا تھا۔ اونچے سُروں میں گاتے ہوئے اس کی آواز میں واضح کپکپاہٹ در آتی تھی، جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھی تھی اور چونکہ وہ روزانہ باقاعدگی سے ایک ہی گیت گایا کرتی تھی، اس بات سے اسے لگا کہ وہ دیوانی ہوگی، لیکن اس کے دونوں ہی قیاس غلط نکلے۔

اب وہ کھڑکی کے سامنے سے اس پر کوئی دھیان دیے بغیر گزر رہی تھی۔ اس نے تجسس دور کرنے کو اسے پکار لیا۔

''میں روز تمہاری آواز سنتی ہوں، دراصل یہ میرا بیڈروم ہے۔ کیا تم کہیں پاس ہی رہتی ہو؟''

وہ رک گئی اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''نہیں، میں بہت دور سے آتی ہوں اور اگر میرے گانے سے تم بے آرام ہوئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''تم روزانہ اس وقت کہاں جاتی ہو؟''

''میں قبرستان جاتی ہوں۔ میرے تین بچے وہاں دفن ہیں۔ تینوں لڑکے تھے۔ آٹھ، چھ اور پانچ سال عمریں تھیں۔ میں ان کی قبروں پر یہ پھول چڑھانے جاتی ہوں۔ بہت ہی پیارے اور کھلنڈرے لڑکے تھے، تم ان سے ملی ہوتیں تو پہلی نظر میں ہی ان کی محبت میں مبتلا ہو جاتیں۔ میرے پاس ان کی تصویر ہے۔ تم دیکھو گی؟''

اس نے ٹوکری میں پھولوں کے نیچے سے ایک فریم شدہ تصویر نکالی اور چند قدم آگے آتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ تصویر میں تین خوبصورت لڑکے نظر آ رہے تھے، جن کی شکلیں اس عورت سے ملتی تھیں۔

''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟''

''صوفیہ......''

''شکریہ اور میرا نام اینا ہے۔'' اس نے تصویر کو واپس ٹوکری میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس سارے وقت میں ایک لمحے کے لیے بھی اینا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی تھی۔ صوفیہ کو یہ بات عجیب لگی۔ تین مردہ بیٹوں کی ماں ان کی قبروں کی طرف جاتے ہوئے اتنی خوش کیسے ہو سکتی تھی۔ شاید اسے مجنون خیال کرنے میں صوفیہ نے غلطی نہیں کی تھی۔

''میں اب جاؤں گی۔ خدا تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے جیسے اس نے مجھ پر انہیں اتارا۔''

خدا نے اس پر کون سی رحمت نازل کی تھی جس پر وہ شکر گزار تھی۔ کیا وہ طنز کر رہی تھی، چہرے کے مسکراتے ہوئے خطوط اس بات کی تائید نہ کرتے تھے۔

اسے جانے کے لیے مڑتے دیکھ کر صوفیہ کو اچانک خیال آیا۔

''تم یہ رائم کیوں گاتی ہو؟ روزانہ ایک ہی رائم''

''میرے بیٹے گھر کے باہر سڑک پر باری باری رسہ پھلانگنے کا کھیل کھیل رہے تھے اور میں بالکونی میں بیٹھی انہیں کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ تب وہ تینوں مل کر یہی رائم گا رہے تھے۔ والٹر، میرا بڑا بیٹا اس کی باری پھلانگنے کی تھی۔ جبکہ دونوں چھوٹے رسے کو بل دیتے ہوئے گھما رہے تھے۔ والٹر اونچی اونچی چھلانگیں لگا رہا تھا۔ اس کا قد اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں کی نسبت قدرے لمبا تھا۔ جوں جوں رسے کے چکر تیز ہوتے جاتے تھے۔ ان تینوں کے گانے میں بھی تیزی آتی جاتی تھی اور پھر ایک مدہوش ڈرائیور نے اپنی بے قابو گاڑی تلے تینوں کو کچل دیا، جب بھی میرے قدم قبرستان کی سمت اٹھتے ہیں تو یہ rhyme خود بخود میری زبان پر آ جاتی ہے۔ کیا تمہیں اپنی کھڑکی میں سجانے کے لیے کچھ پھول چاہئیں؟ یہ سرمائی داؤدی اور کیسو میں نے اپنے گھر کے باغیچے سے چنے ہیں۔''

اس نے پیشکش کی تو صوفیہ نے ہاتھ ہلا کر انکار کیا۔

''نہیں۔ مجھے نہیں چاہئیں، مجھے صرف ایک بات کا جواب دو۔ خدا نے تمہارے ساتھ کیا اچھا کیا جس پر تم اتنی خوش ہو۔''
وہ خود کو یہ سوال پوچھنے سے باز نہیں رکھ پائی تھی۔

اینا پھولوں والی ٹوکری کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کھل کر مسکرائی۔

''اس نے مجھے صبر دیا۔'' وہ سر کو خم دے کر آگے بڑھ گئی۔

''They called me out for th● world to see....''

اینا گاتے ہوئے دور جا رہی تھی۔

''and his is what they said to me
Spanish dancer, turn around
Spanish dancer, get out of town
Spanish dancer....''

اس کانپتی ہوئی آواز میں غم کی پرچھائیں تک نہ تھی۔

✠ ✠ ✠

''کچی دیوار پر اپلے ایک ترتیب سے لگے تھے اور شیشم کا کبڑا پیڑ کوتاہ قد دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔

اس نے دیوار پر سے اندر جھانکا تو ڈھلتی عمر کی دو عورتیں نظر آئیں جو ایک کھاٹ کے ان بُنے ڈھانچ کے اطراف میں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک، جس کی رنگت تانبے ایسی تھی اور بدن بانس کی چھڑی سا سیدھا اور دبلا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رنگین بان کا گولا تھا۔ جبکہ دوسری عورت جو نسبتاً صاف رنگت اور توانا جثے کی حامل تھی، آلتی پالتی مارے بیٹھ کر حقہ پی رہی تھی۔ ایک نیم چھتی تلے کچھ گدھے اور بکریاں بندھی تھیں۔ نرکلوں اور پھونس سے بنے چھپر کے نیچے مٹی کے برتن بنانے کا چاک فرش میں گڑا تھا۔ مغربی گوشے میں دیواروں کے اتصال والے مقام سے ذرا فاصلے پر انار کا بوٹا اور بکائن کا چھتری نما پیڑ تھا۔ سارے میں گوبر کی باس اور جانوروں کی پوستینوں سے اٹھتی بو پھیلی تھی۔

وہ آنگن میں آئی تو اس کے قدموں کی آہٹ پر دونوں عورتوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ حقے والی نے حقہ چھوڑ دیا اور بان والی نے گولا نیچے رکھ دیا جو لڑھک کر کچھ دور تک چلا گیا۔ اس پسماندہ گاؤں میں اس جیسے حلیے کی کسی لڑکی کا دیکھا جانا شاید ایک انوکھا واقعہ تھا۔ یہ بات ان دونوں دیہاتنوں کے چہروں پر صاف لکھی تھی۔ وہ ان کے قریب آئی تو وہ دونوں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

''میں حکیم بیگم سے ملنے آئی ہوں، آپ میں سے کون ہیں حکیم بیگم؟''

''تانبے کی رنگت والی آگے آئی اور اس کے کندھے سے بیگ اتروالیا۔ ''صحیح تھاں (جگہ) پہنچ گئی ہے تو، میرا ناں (نام) حکیم بیگم ہے۔ آبہ (بیٹھ) جا دھیے۔ میں تجھے ویہڑے میں موڑھا ڈاھ (بچھا) کے دیتی ہوں۔ اندر کوٹھیاں چے بڑا سیت ہے (کمروں میں بہت سردی ہے)۔''

حکیم بیگم موڑھا لانے چلی گئی جبکہ وہ دوسری عورت چپ چاپ کھڑی نظروں میں اسے تولتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے حکیم بیگم کو موڑھا اٹھائے عجلت میں آتے ہوئے دیکھا۔ وہ چلتے ہوئے موڑھے کی گرد آلود پوشش کو اپنے سر کی چادر سے صاف کر رہی تھی۔

''گٹھ گٹھ (بالشت) مٹی چڑھی ہے موڑھے تے۔ پرونی (مہمان) دے بیٹھنے لائق کوئی شے ای نئیں میرے کول (پاس)۔ میں ذری ستھرا کر دوں اس کو تیرے کپڑے نہ گندے ہوں کہیں۔''

اس نے حکیم بیگم کے ہاتھوں سے موڑھا لے لیا۔ ''میرے کپڑوں کی فکر نہ کریں۔ اتنے صاف نہیں ہیں کہ انہیں ذرا سی مٹی سے بچانے کی ضرورت پڑے۔''

اسے بٹھا کر وہ پھر چلی گئی۔ لوٹی تو دودھ والا مونہا منہ کٹورا لے کر آئی۔ ''کوسا (نیم گرم) ددھ پی کے تیرا تھکیواں (تھکاوٹ) اتر جائے گا۔ لے میری دھی! بسم اللہ کر۔''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''آپ کوئی زحمت نہ کریں۔ میں جس کام سے آپ کے پاس آئی ہوں، بس وہ سن لیں۔''

''گل بات وی ہو جائے گی۔ تو کوئی فکر نہ کر۔ جے میرے رب دا حکم ہوا تے تیرا کوئی کم (کام) نئیں رکے گا۔ تو اے ددھ پی۔ مہمان گھر دا رزق چکھے تے برکت ہوتی ہے۔'' حکیم بیگم نے اصرار کیا۔

''آپ شاید پسند نہ کریں کہ میں آپ کے برتنوں میں کچھ کھاؤں پیوں۔ میں عیسائی ہوں۔ آپ مسلمان لوگ اس بات کو مناسب نہیں جانتے۔''

حکیم بیگم مسکرانے لگی اور دوسری عورت نے جواب چارپائی کے ڈھانچ کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر حقہ پینے لگی تھی۔ ایسے جھرجھری لی جیسے اس پر چھپکلی گر گئی ہو۔ اس کے دنداسہ رنگے ہونٹ نیم وا ہوئے اور آنکھوں میں واضح معاندت اُمڈ آئی۔

حکیم بیگم نے کٹورا اسے تھماتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''ایسی گل نئیں کڑیے! اللہ جانے کیہڑے (کون سے) مسلماناں نال تیرا ٹاکرا ہوا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم دا اے طریقہ تھا کہ کتاب والیاں نوں (اہل کتاب سے) عزت نال ملتے تے۔ کھان پین لئی بھانڈے ورتن دی تے گل ای معمولی ہے (تو کھانے پینے کے برتن استعمال کرنا ایک معمولی بات ہے) تو کوئی وہم نہ کر۔''

دوسری عورت نے حقے کی چلم کو انگلی سے ٹھکورتے ہوئے زوردار ہنکارا ابھرا۔

''واہ حکیم بیگم! تیری عقل۔ ملوانی (ملانی) بن کے فتوے دیتی ہے۔ جو پلید ہے، تیرے کہہ دینے سے پاک نئیں بنے گا۔''

حکیم بیگم نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا تھا ''نی چھوماں! کوڑا بول کے تجھے کی سواد آتا ہے، جے تیرا مندا بول کسی دا کالجہ ساڑے تے تیرا اس وچ کی فیدا (کڑوا بول کر تجھے کیا مزہ ملتا ہے۔ اگر تیرا برا بول کسی کا کلیجہ جلائے تو تجھے اس سے کیا ملے گا)''

وہ دودھ کا پیالہ ہاتھوں میں پکڑے سامنے والی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ حکیم بیگم نے دوبارہ اسے دودھ پینے کو کہا اور پھر اس نے چھوماں کو کہتے سنا۔ ''خدمتیں کرتی رہتی رہنا پر ڈہنی کی۔ پہلے اس سے پوچھ تو سہی، آئی کدھر سے ہے؟ نام نشان، تھاں ٹھکانہ تو بتائے۔ کس کام سے آئی ہے تیرے پاس۔''

''ہالی نئیں۔ اسے جھٹ گھڑی ساہ کڈن دے۔ جد دن والا ویلا ہو گا وہ آپ گل کرے گی۔ کوئی کاہلی نئیں ہے۔'' (ابھی نہیں۔ اسے ذرا دم لینے دے۔ جب بتانے کا وقت ہو گا، وہ خود بولے گی، کوئی جلدی نہیں ہے)

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس نے پیالے سے ایک چھوٹا گھونٹ لیا۔ چھوماں سے پھر نہ رہا گیا، وہ بولی۔

''جوان کڑی ہے۔ کسی شہر سے آئی ہے۔ منہ متھے کی سوہنی ہے اور عیسائی ہے، کوئی سنگی ساتھ نئیں۔ کوئی اک بھی نیک نشانی ہے ان میں۔ گل قند کی شیشی نہ بن کہ کوئی تیرا گھونٹ بھر لے۔ منہ باندھ کے بیٹھی ہے۔ کچھ تو پوچھ اس سے۔''

حکیم بیگم کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ ''تیرے فکر کرنے دی لوڑ (ضرورت) نئیں۔ میرے مالک دے حکم نال سب خیر ہوگی۔ تو جا کے تندور چ بالن کو بج لگا دے (لکڑیاں جلا دے) پر ڈہنی دے روٹی ٹکر لئی ہل جل کر کوئی، سیال دے دناں چ سورج نیواں ہوتے سدھ نئیں لگتی (مہمان کی روٹی کے لیے کچھ کر، جاڑوں میں سورج ڈھلنے کی خبر ہی نہیں ہوتی)

یقیناً وہ سمجھ گئی تھی کہ آنے والی اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔ تب ہی وہ چھوماں کو وہاں سے ٹالنے کا حیلہ کر رہی

تھی۔ چھوماں بھی اس کی نیت تاڑ گئی۔

''او ہلے والی بات (چھپ کر کی جانے والی بات) میں بڑا رولا ہوتا ہے کسی گیڑے (چکر) میں نہ آ جانا۔ میں تیری گوانڈن (پڑوسن) ہی سہی، تیری دردی (ہمدرد) بھی ہوں۔ مجھ سے چھپا کر تو کیا نفع کمائے گی۔ میں بیٹھی ہوں یہاں۔ روٹیاں پکنے سے سہی رہتیں۔ بے فکر ہو جا۔''

حکیم بیگم جواب میں کچھ نہ بولی۔ اس نے پرنیاں کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور اسے ساتھ لے کر اناج والی کوٹھڑی میں آ گئی۔ کوٹھڑی کے اندر نیم تاریکی اور سیلن زدہ ٹھنڈک تھی۔ یہاں آ کر بھی حکیم بیگم نے اس سے کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ پرنیاں نے بات شروع کی تو اس نے پرنیاں کی طرف دیکھنا بھی ترک کر دیا۔

''میں آپ کو اپنا نام اور گھر والوں کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی۔ آپ پوچھیے گا بھی نہیں۔ آپ کے کسی جاننے والے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں اس کا نام بھی نہیں لوں گی۔ آپ کے لیے میرے بارے میں کچھ جاننا ضروری نہیں ہے کیونکہ شاید آئندہ زندگی میں ہماری کبھی ملاقات نہ ہو۔''

اس نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کی آمیزش کر کے اپنی کہانی بیان کر دی۔

''میں نے آپ کو پوری بات سچ نہیں بتائی لیکن ایک چیز کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔ میں نے اس بچے کے باپ سے نکاح کیا تھا۔ وہ قانونی طور پر میرا شوہر ہے۔ یہ بچہ ناجائز نہیں ہے مگر میں اسے پیدا نہیں کروں گی۔ اس کام کے عوض آپ کو دینے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں، یہاں تک آنے میں...... جو کرایہ خرچ ہوا ہے، وہ بھی میں کسی سے مانگ کر لائی تھی۔ میرے گلے میں ایک کنٹھی ہے اور کلائی میں دو کنگنیاں ہیں۔ آپ کسی سنار کو دکھا لیجیے گا۔ یہ اصلی سونے کے زیور ہیں۔ یہ میں آپ کو دے دوں گی۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں کہ میری مدد کیجیے لیکن اگر آپ کا جواب نہ میں ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی جو بھی آپ کی مرضی ہے، دو ٹوک کہہ دیں۔''

حکیم بیگم کچی دیوار سے کمر لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ بڑی دیر تک بوجھل خاموشی چھائی رہی۔ پھر حکیم بیگم نہایت دھیمی آواز میں بولی۔

''میں بہتی سیانی (زیادہ عقل مند) نہیں ہوں۔ سدھ سادہ پینڈن ہوں (سیدھی سادھی دیہاتی عورت ہوں) تو پڑھی لکھی ہے۔ عقل والی ہے۔ میرا تجھے مت دینا پھبدا نہیں (میرا تجھے دانائی کی بات بتانا سجتا نہیں) پر میں تیری ماواں بجا (ماں کی جگہ) ہوں۔ عمر تے تجربہ بڑی شے ہوتے ہیں۔ جے تو میری گل من لے (بات مان جائے) سارا کم سدھا ہو جائے تو جتھے (جہاں) کہے گی، میں تیرے نال جاؤں گی۔ تیرے ماپیاں اگے ہتھ جوڑ کے، نک نال لکیراں کڈ کے جیویں وی ہو سکا، ان کو راضی کر لوں گی۔ (تیرے ماں باپ کے آگے ہاتھ جوڑ کے، ناک سے لکیریں نکال کے جیسے بھی ہو سکا ان کو منا لوں گی) جب تک وہ من نہ جائیں گے میں دہلیز نہیں چھوڑوں گی۔ میرا یقین کر کڑیے! میں تیری رسائی (صلح) کرا دوں گی۔''

''میں وہیں جاؤں گی۔ والدین کے گھر کے سوا میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے، وہاں واپس جانے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے لیکن اس سے پہلے مجھے اس بچے سے نجات دلائیں۔ اسے ساتھ لے کر میں اپنے گھر نہیں جا سکتی۔ اسی رکاوٹ کو دور کرنے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔''

حکیم بیگم نے اسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی لیکن اسے فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہ کر سکی۔

''میرے مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔ میں سارے پہلوؤں سے غور کر چکی ہوں۔'' اس کے انداز میں قطعیت تھی۔

حکیم بیگم چند لمحے شہادت کی انگلی سے نچلے ہونٹ کو ٹٹولتی رہی پھر اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''رب آپ

سوہنا تے سوہنے کلبوت گھڑتا ہے۔ وہ تیرا مقدر وی سوہنا بنا دے گا۔ تو اس نال کدی سلسلہ نہ توڑ۔ تند جوڑ کے رکھ۔ میرے دماغ چے اک گل آئی ہے۔ رب کرے تجھے پسند آ جائے۔ تو اس بال نوں جانوں نہ مار۔ اے وڈا گناہ ہے۔ رب رُس جائے (روٹھ جائے) تے کوئی تدبیر کم نئیں آتی۔ تو پنج چھ مہینے میری مہمان ہو جا۔ خاص ویلا آن تک اتھے رہ۔ تیرا کھان پین، لیڑا کپڑا سارا خرچ میرے ذمے۔ مجھے تیرے گہنوں کی لوڑ نئیں۔ میرے تے اللہ دی بڑی رحمت ہے۔ تو بال پیدا کر تے میرے کول چھڈ (چھوڑ) جا، تو فارغ ہو کے اپنے گھر چلی جانا۔ نیانے نوں میں آپی سانبھ لوں گی (بچے کو میں خود سنبھال لوں گی) میرے ویہڑے چے رونق ہو جائے گی۔ میری اک ہی دھی ہے۔ آمنہ نام ہے اس دا۔ ویاہ دی میں نے پچھلی واڈھی کے دیہاڑوں میں (اس کی شادی کر دی۔ پچھلی بار گندم کی کٹائی کے دنوں میں) تے وہ باہر دے ملک چلی گئی اپنے بندے نال۔ میں کلی (اکیلی) جان ہوں۔ تیرے بچے نال میرا دل لگا رہے گا۔ ٹھیک ہے میری دھی؟ جے تجھے کوئی اعتراض ہے تے دس (بتا)۔" حکیم بیگم نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن میں اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ میں کس لیے انتظار کروں اور کیوں تکلیف برداشت کروں۔ اگر آپ میرا مسئلہ حل نہیں کر سکتیں تو صاف جواب دے دیں۔ ایسے گھما پھرا کر انکار نہ کریں۔ بہر حال میں سمجھ گئی ہوں۔ میں چلی جاتی ہوں۔"

وہ مڑنے لگی تو حکیم بیگم نے رستہ روک دیا۔ "کدھر جائے گی؟ تو جو وی کہے میں تجھے جانے نئیں دوں گی۔ فیصلہ کرن چے چھیتی نہ کر۔ اندر چل کے کمرے چے آرام نال بہ جا، بر کی ٹکر وی کھا، تے چنگی طرح سوچ لے اج راتی یا کل سویرے یا جد تیرا دل منے مجھے بتا دینا۔" (کہاں جائے گی؟ تو جو بھی کہے میں تجھے جانے نہیں دوں گی فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کر۔ اندر کمرے میں چل کر آرام سے بیٹھ جا۔ روٹی کھا اور اچھی طرح سوچ لے آج رات یا کل صبح جب تیرا دل مانے بتا دینا)

کوٹھڑی کے دروازے پر آہٹ سن کر ان دونوں نے ادھر نظر ڈالی تو چھو ماں کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ چھپ کر ان کی باتیں سنتی رہی ہے۔

"تو بن ملاپڑی (ملنسار) اور کر مجمانیاں (مدارات جب پلس (پولیس) کے سپاہی تیرے گلے میں رسہ ڈال کے تجھے کھنچیں گے تو یہی تیری پرونی تیرے خلاف بھگت جائے گی (بیان دے دے گی) یہ جو کرتوت گھول کے آئی ہے۔ اسے قبر کی مٹی نئیں چھپا سکتی، تو کچی کوٹھڑی کا سیونک کھایا دروازہ بند کر کے اسے کیسے چھپا لے گی۔ چن چڑھتا ہے تو سارا زمانہ دیکھتا ہے۔ جگ والے تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔ کیوں اپنے بڑھاپے کو لیک لگاتی ہے۔ ہوش کر اور اس کو دو دھکے مار کے گھر سے باہر نکال دے۔"

حکیم بیگم کے بشرے میں کوئی بدلاؤ نہ آیا "میں نے تیری صلاح (مشورہ) سن لی ہے۔ ہن (اب) میری صلاح سن۔ تیرے کناں تک جو گل اپڑ گئی اس کو اگے نہ پہنچانا۔ کسی دے کول منہ وچوں ہواڑ نہ نکالنا۔ جنا ڈر تجھے جگ والیاں دا ہے اس دا اک تولہ وی رب کولوں ڈر گئی تے ستے خیراں نیں۔" (جو بات تیرے کانوں تک پہنچ گئی ہے اس کو آگے نہ پہنچانا۔ کسی کے سامنے منہ سے بھاپ نہ نکالنا۔ جتنا ڈر تجھے جگ والوں کا ہے اس کا اک تولہ بھی رب سے ڈر گئی تو سب امن ہے)

وہ تنفر سے پرنیاں کو گھورتی رہی اور تلخی سے بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

شام کے سانولے ہاتھ خزاں زدہ پیڑوں کی پیلاہٹ اور سبزی پر گہرے سرمئی رنگ کی استر کاری کر رہے تھے جب پرنیاں نے حکیم بیگم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

"میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔ یہ بات تو ہے کہ مجھے گھر واپس جانے میں بہت دیر ہو جائے گی مگر دیر تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔ جہاں مجھے گھر سے نکلے دو ماہ کے قریب ہونے کو ہیں تو وہاں کچھ اور مہینے گزر جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ عورت کی گھر سے باہر گزاری ہوئی ایک رات یا ایک ہزار راتیں، دونوں برابر ہیں۔"

اس کے ہاتھ کی پشت پر کوئی بے وزن شے گری۔ پہلے تو اسے لگا کہ وہ دھریک کی شاخ سے ٹوٹا ہوا کوئی پتہ تھا مگر دھیان

دینے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک مری ہوئی تتلی تھی۔ اس نے کبھی اس نہج پر سوچا نہیں تھا لیکن اب اسے خیال آ رہا تھا کہ جاڑوں میں کبھی بھی تتلیاں نظر نہیں آتی تھیں اور اگر کبھی ملتیں تو مردہ حالت میں۔ شاید تتلیوں کو یہ موسم راس نہیں آتا تھا۔



وہ کھاٹ پر چت لیٹی تھی۔ اس کے بدن کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ کسی کھڑکی یا روزن سے عاری اس کمرے میں شدید گھٹن تھی۔ جو مٹھی بھر ہوا میسر تھی وہ گاڑھی اور کسیلی تھی۔ اس میں راکھ اور دھواں ملے ہوئے تھے۔ سانس لیتے ہوئے اس کے جسم میں پھریری سی اٹھتی تھی۔ چار پائی کی کھردری ادوائن میں چول کے قریب ایک موٹی گرہ پڑی تھی جو مجنوں (ایک طرح کا کھیس) تلے سے مسلسل اس کی پنڈلی کے گوشت میں چبھ رہی تھی۔ اس نے پاؤں سمیٹتے ہوئے وہاں سے ٹانگ ہٹانا چاہی مگر اس سے ٹانگ ہلائی ہی نہیں گئی۔

پوربی دیوار میں بنے طاقچے میں روشنی کا چومکھا ظرف جل رہا تھا۔ اس کے چاروں فتیلے روشن تھے اور پیلی آگ کے لرزاں شعلے چاروں اور پرچھائیاں بکھیر رہے تھے۔ روشنی کے پھیلے ہوئے زرد دھبوں میں گھری اندھیرے کی پتلیاں رہ رہ کر کانپتیں اور اک دوجے کے پیچھے سرک جاتیں۔ عجیب الخلقت ہیولے کہگل سے لپی چھت سے چمگادڑوں کی طرح الٹے لٹکے تھے۔

کہیں دور سے موروں کے جھنگارنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ مور چپ ہو جائیں۔ ان کی آوازیں کتنی پریشان کن تھیں۔ لگتا تھا جیسے بلیاں رو رہی ہوں یا شاید انسانی بچے۔ بعض لمحوں میں اسے پورا یقین ہو جاتا کہ وہ مور نہیں تھے بلکہ نومولود بچے تھے جو دردناک آوازوں میں چلاتے تھے۔ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر ان آوازوں سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی مگر اس کے بازو شل تھے۔ وہ کوشش کے باوجود انہیں ذرا سی حرکت بھی نہ دے پاتی تھی۔ ابروؤں کے بالوں سے نچڑتا ہوا نمک گھلا پسینہ اس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ اس نے دانتوں پر دانت جماتے ہوئے حلق سے ایک مہیب آواز نکالی اور اس کے اوپری دھڑ کو زوردار جھٹکا لگا۔ پھر گہری تاریکی چھانے لگی۔ اسے لگا کہ فتیل سوز (دیا) کی چاروں لوؤں کو کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا تھا۔ کوئی اس کا سر پکڑے جھنجھوڑ رہا تھا۔

''سونا ئیں کڑیئے۔ اکھاں کھول۔ بس تھوڑی ہمت ہور (اور) حوصلہ۔ میری دھی حوصلہ۔''

ایک بار پھر پیلاہٹ بھری جھلسی ہوئی روشنی آنکھوں کی پتلیوں میں گھسنے لگی اور پھر وہی جان لیوا درد لوٹ آیا جو لمحہ بھر تھم گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر اتنا بوجھ تھا کہ اسے لگتا تھا کسی بھی آن کڑ کڑ کی اونچی آواز آئے گی اور وہ دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔

دیواروں پر لمبے، پھیلے ہوئے اور کڈھب سایے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ان میں چند انسانی شبیہیں بھی تھیں۔ اس نے انہیں شناخت کرنے کی کوشش کی۔ جھک کر دہرا ہوتا ہوا گٹھڑی بنا سایہ حکیم بیگم کا تھا۔ ایک سایہ دیوار کی جڑ سے چھت تک چلا گیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کولہے پر رکھا تھا جس سے خم کھائی ہوئی کہنی کے اندر ایک ایسی تکون بن گئی تھی جس کے خطوط مسطر کے بنا کھینچے گئے تھے۔ اس سایے کا دوسرا بازو جو بے حد لمبا تھا کسی شے کو تھامے ہوئے تھا۔ وہ چھوماں تھی ان کے ساتھ ایک اور انسانی ہیولہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھدا سا سایہ عجب مضحکہ خیز حالت میں تھا۔ آدھا ہوا میں معلق اور آدھا چارپائی پر بچھا ہوا۔ اس کا سر اور گھٹنے آپس میں غیر فطری حد تک قریب تھے اور اس کے پاؤں نظر نہ آتے تھے۔ شاید اس کے پاؤں تھے ہی نہیں۔ کچھ دیر تو وہ اس تیسرے سایے کو پہچان ہی نہ پائی۔ پھر اچانک اسے یاد آ گیا کہ وہ اس کا اپنا سایہ تھا اسے کچھ خیال آیا جس سے وہ بری طرح سہم گئی۔ اس فرسودہ کمرے میں، اس چاروں سروں سے جلتے ہوئے عجب وضع کے برتن، ان بے شمار پرچھائیوں اور بچوں کی طرح رونے والے موروں کی آواز کے ساتھ اس کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ ان دو اجنبی گنوار عورتوں کے درمیان اس گھٹن زدہ جگہ پر وہ کیا کر رہی تھی؟ وہ کیسے اس مقام تک پہنچ گئی تھی۔ بھڑکتی آگ جیسا وہ درد اسے صحیح طرح سے کچھ بھی سوچنے نہ دیتا تھا۔ پسینے کی ایک بوند اس کی کنپٹی سے رینگتی ہوئی کان میں چلی گئی۔

ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اس کا پسینہ کیوں نہیں پونچھتی تھی؟ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

''سب بھلا ہوگا۔ حوصلے نال۔ دل تگڑا کر کے۔ کوئی غم نہ کر۔ رب نوں یاد کر۔''

اسے صلیب کا خیال آیا۔ صلیب کو مٹھی میں لے کر دعا مانگنے سے یقیناً یہ درد اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔ لیکن صلیب والا لاکٹ اس وقت جانے اس کی گردن میں تھا یا اس نے اتار کر کہیں رکھ چھوڑا تھا۔ اور یہ بات بھی تو تھی کہ جب بھی وہ چھوماں کے سامنے صلیب کو چھوتی یا اپنے سامنے ہاتھ سے مقدس صلیب کا نشان بناتی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی۔ توبہ توبہ کرنے لگتی اور یوں آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورتی جیسے وہ کوئی مکروہ چیز ہو۔

کسی کے ہاتھ اس کا تن ٹٹولتے تھے۔ وہ انہیں خود سے دور ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ ان کالمس اسے اتنا ناگوار لگ رہا تھا کہ وہ طیش سے چیخ پڑی وہ لگاتار چلانے لگی۔ کوئی مور کمرے کے اندر آ گیا تھا۔ اس کی چارپائی کے نیچے گھسا باریک تیکھی آواز میں کوکتا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

''بسم اللہ ماں صدقے۔ منڈا ہے جیویں (جیسے) روں دی پونی (روئی سی بنا ہوا) کوٹھے چے چانن ہوگیا۔ اکھ بھر کے دیکھ تے سہی نی چھوماں! ایتھے دیوا (دیا) لے کے آ۔ اس دی ماں ویکھ لے اس کو۔''

روشنی اس کے قریب آ گئی۔ اس نے بھاری پپوٹے کھول کر دیکھنا چاہا مگر آنکھوں میں گھستے کھارے پسینے نے اس کی بینائی دھندلا رکھی تھی۔ گرم گوشت کا ایک لوتھڑا اس کے بازو پر رکھ دیا گیا۔ وہ کلبلاتا تھا اور روئے جاتا تھا۔ حکیم بیگم ایک کپڑے سے اس کا منہ اور گردن پونچھ رہی تھی۔

''بڑے جگرے والی ہے میری دھی۔ جان نکلنے دی پیڑ تے بال جمن دی پیڑ چے کوئی فرق نئیں۔ بس اتنا کہ مرن والا کسی نوں دس نئیں سکدا۔'' (جان نکلنے کے درد اور بچے کو جنم دینے کے درد میں کوئی فرق نہیں۔ بس اتنا کہ مرنے والا کسی کو بتا نہیں سکتا۔)

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ ان پڑھ عورت کبھی کبھی بڑی گہری باتیں کہہ جاتی تھی۔

وہ تھکن سے نڈھال تھی اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔

''مجھے اب کوئی نہ جگائے۔ میں اب آنکھیں نہیں کھولوں گی، چاہے کچھ ہو جائے۔ میں مر چکی ہوں۔ مرے ہوؤں کو جگانے کا رواج تو ابھی دنیا میں نہیں پڑا ناں۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

✠ ✠ ✠

حکیم بیگم زمین پر اکڑوں بیٹھی اپلوں کی آگ پر کوئی دوا چھنکارتی تھی جب پرنیاں نے پشت پر آ کر اسے مخاطب کیا۔

''میں جا رہی ہوں۔''

حکیم بیگم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور اس کا بیگ کندھے پر لدا تھا۔ حکیم بیگم بجھ سی گئی۔

''تیرا چھلا (چلہ) رہتا ہے۔ ہالی تیرے ہڈ کچے ہیں کچھ دیہاڑے ہور آرام کر لے۔ تیرے جثے میں زری طاقت آ جائے فیر چلی جانا۔''

پرنیاں نے اس کے چہرے پر نظر جما دی۔ کیا وہ دل سے اسے روکنے کی خواہاں تھی؟

پچھلے چند ماہ میں اس کی وجہ سے حکیم بیگم کے ساتھ جو کچھ پیش آ چکا تھا۔ اس کے بعد کوئی صحیح الدماغ انسان ایسی خواہش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ اس گمان میں تھی کہ بچے کی پیدائش تک پرنیاں کا وہاں قیام کسی کی توجہ نہیں کھینچے گا تو یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔

بکریوں کے ریوڑ میں ہرن ملا دینے سے اس کی شناخت نہیں چھپ سکتی۔ جس کسی نے حکیم بیگم کے گھر کی نا ٹی دیواروں سے اُمس کر جھانکا، اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں کنوئیں پر پانی بھرنے، نہر کنارے کپڑے دھونے، بھٹی پر دانے بھنانے، بیڑیوں پر بنیں کے دونوں کناروں تک آنے جانے اور نمبرداروں کے ڈیرے پر ہونے والی بیٹھک جیسے بلا ناغہ منعقد ہونے والے اجتماعات ہوتے ہوں، وہاں کسی چٹخارے دار بات کو زبانوں سے کانوں تک کا سفر طے کرنے کے لیے پیر درکار نہیں ہوتے، وہ تو یوں اڑتی ہے جیسے کسی نے مٹھی بھر بھوسہ آندھی کے سپرد کر دیا ہو۔

اسے گھر میں ٹھہرا کر حکیم بیگم نے اپنے لیے بدنامی اور ملامت کا سامان کیا تھا۔ گاؤں کے عزت داروں کے بیچ اس کی حیثیت وہ ہو چکی تھی، جو برہمنوں میں کسی اچھوت کی ہوتی ہے۔ لوگ اسے گنہگار اور گمراہ گردان رہے تھے۔ مرد و زن یکساں طور پر اس سے متنفر تھے۔ کوئی اس سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا۔ کوئی عورت اس کے آنگن میں قدم نہ دھرتی اور اگر کوئی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ بھی جاتی تو اس کے گھر کے برتنوں میں کچھ کھانے پینے سے گریز کرتی۔ ایک قسم کا غیر اعلانیہ قطع تعلق کا رویہ تھا جو گاؤں والوں نے اس کے خلاف اجتماعی رضا سے اپنا رکھا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے امریکہ سے حکیم بیگم کے نام ایک خط آیا تھا اور چونکہ وہ ان پڑھ تھی اور چٹھی رساں، جو پہلے بھی اس کے لیے خطوط پڑھا اور لکھا کرتا تھا۔ اس روز عجلت میں تھا تو اس نے وہ خط پرنیاں سے پڑھنے کو کہا۔

حکیم بیگم کی بیٹی اور داماد کو کسی ذریعے سے سارے معاملے کی خبر ہو گئی تھی اور انہوں نے نہایت کرخت لفظوں میں اس کے اقدام پر غم و غصہ ظاہر کیا تھا، ان کی خواہش تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس برے کردار والی لڑکی کو گھر سے نکال باہر کیا جائے۔ ابھی وہ نصف تک بھی پڑھنے نہ پائی تھی کہ حکیم بیگم نے اس سے خط چھین لیا۔ کئی روز تک وہ یوں شرمسار پھرتی رہی جیسے وہ خط خود اسی نے لکھا ہو۔ اور ابھی کچھ ہی دنوں قبل ایک اور واقعہ ہوا تھا جس نے حکیم بیگم پر جانے کوئی اثر چھوڑا تھا یا نہیں لیکن پرنیاں کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

فضل الٰہی نامی مسجد کا بوڑھا خادم تھا جو روز صبح کنوئیں سے پکھال (بڑی مشک) بھر کر مسجد کے صحن میں چھڑکاؤ کرتا اور جھاڑو دیتا۔ اس کا ایک وقت کا کھانا حکیم بیگم نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد دیوار کے پاس آ کر اونچی آواز میں سلام کرتا اور حکیم بیگم گھر کے اندر سے ہی کھانے کے برتن اسے تھما دیتی۔ پرنیاں کی آمد کے بعد اس نے خود آنا ترک کر دیا تھا۔ حکیم بیگم مسجد کے عقب والے حجرے میں اسے کھانا پہنچانے لگی۔ چند دن پہلے فضل الٰہی اپنی سابقہ روش کے مطابق دیوار کے نزدیک آیا تو حکیم بیگم اسے کھانا دینے آگے بڑھی۔

''بسم اللہ میرا ویراج آ پی آ گیا۔ میں بس تیرے کول (پاس) آنے ہی والی تھی۔''

فضل الٰہی نے چنگیر نہ پکڑی۔

''ایمانی گل ہے جس دن سے تو نے اس بے دین زانی عورت کو گھر میں رکھا ہے۔ مجھ پر تیرا رزق حرام ہو گیا۔ میں تیرے گھر کی روٹی پنڈ کے کتوں کو ڈال دیتا تھا۔ قسم ہے پاک پروردگار کی۔ اک برکی (لقمہ) بھی چکھی ہو تو کلمہ نصیب نہ ہو۔''

''بھراوا (بھائی) مفت دا گناہ نہ کما۔ پاک دامن تے عیب نہ جوڑ۔ وہ نکاحی ہوئی ہے۔''

''نکاحیاں اپنے بچے مارنے کا حیلہ نہیں کرتیں۔ ان کو منہ نہیں چھپانا پڑتا۔ تیری گوانڈن چھوماں نے اپنے کانوں سے سنی ساری گل بات۔ وہ گواہ ہے کہ نہیں۔''

''اس نے جو کہا سچ ہو گا پر جو میں کہتی ہوں وہ بھی کوڑ (جھوٹ) نہیں۔ ایتھے نہ گل کر کوئی وی۔ وہ نمانی سنتی ہو گی۔ اس کا دل برا ہو گا۔ جو وی گلہ ہے تجھے میں صفائی دوں گی پر ایتھے نہ بول'' حکیم بیگم گھٹی گھٹی آواز میں اس کی منت کرنے لگی۔

فضل الٰہی کی آواز اور بھی اونچی ہوگئی۔ وہ طیش سے کانپ رہا تھا۔ ''تو باز آ جا۔ تیرا حیا مارتا ہے مجھے۔ نہیں تو میرا وس (بس) چلے میں تیرے گھر کو آگ لگا دوں۔ میں تجھے آخری وار (بار) بتا رہا ہوں اگر تو نے اس حرام کاری کرنے والی کو گھر سے نہ نکالا تو میں آپ جا کر تھانے دار سے تیری شکایت کروں گا۔ مولوی جی سے کہوں گا۔ جمعے کے خطبے میں تیری بابت فتویٰ دیں۔ حکیم بیگمے! تیرے دماغ میں فتور کیوں آیا؟ جن ہاتھوں سے تو کسب کرتی تھی۔ ان سے اب حرام کے بچے جنانے لگ پڑی۔ تجھے قبر کا عذاب بھول گیا۔''

پرنیاں نے ایک ایک لفظ سنا تھا اور اسے پورا یقین ہو چلا تھا کہ حکیم بیگم آج رات ہی اسے گھر سے جانے کو کہے گی مگر توقع کے برعکس وہ آ کر اس سے معافی مانگنے لگی۔

''تو کسی لئی (کسی کے لیے) بد دعا نہ کرنا میری دھی۔ میں تیرے اگے جواب دار ہوں۔ مجھ سے تیری پہرے داری ٹھیک نہ ہوئی پر تو دل نہ میلا کر۔ بس صبر کر۔ میرا رب تجھے اجر دے گا۔''

پرنیاں چند لمحے خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر آہستگی سے، خدا حافظ، کہہ کر دروازے کی سمت قدم اٹھانے لگی۔

''کھلو تے سہی (ذرا ٹھہر تو)'' حکیم بیگم اٹھ کر اس کے پاس آئی ''ٹھیک ہے۔ میں تجھے روکتی نئیں، پر دو گھڑی ٹھہر جا۔ مجھے تجھ سے کوئی بات کرنی ہے۔ فیر (پھر) اللہ جانے حیاتی چے تیرے نال میل ہونہ ہو۔''

وہ رک کر سننے لگی۔

''تیرے پتر کو میں پھلاں دی آب (پھولوں کی مانند) رکھوں گی۔ کسی شے دی تھوڑ (کمی) نئیں آنے دوں گی۔''

''اس یقین دہانی کی ضرورت نہیں۔ میری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ میں آپ سے کوئی ضمانت طلب کر سکوں۔ میں آپ کو کسی وعدے کا پابند نہیں بنا سکتی۔ آپ چاہے اسے جیسے بھی رکھیں، میں آپ سے کبھی کچھ نہیں پوچھوں گی۔''

''رب کرے تیرے ماپے (ماں باپ) تجھ سے راضی ہو جائیں۔ جے ہن وی تو کہے تے میں تیرے نال چلی جاتی ہوں تیرے گھر۔ میں ہتھ جوڑ کے ترلا (منت) کروں گی۔''

اس نے گردن کو دائیں بائیں جنبش دی ''میں اکیلی جاؤں گی۔''

''میں تیری مجبوری جانتی ہوں۔ پر جے کدی وی اپنے پتر کو ملنے دا دل کرے تے سنگ نہ کھانا (شرم نہ کرنا) تو ماں ہے اس دی۔ تیرا حق کدی ختم نئیں ہوگا۔'' (اگر کبھی بھی اپنے بیٹے سے ملنے کو دل چاہے تو شرم نہ کرنا۔ ماں ہے اس کی تیرا حق کبھی ختم نہیں ہوگا)

''مجھے ماں نہ کہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ مجھ پر طنز کر رہی ہوں۔ جس کے نقوش بھی ابھی صحیح طرح سے مجھے ذہن نشین نہیں ہوئے، اس کو آئندہ کبھی مل کر بھی میں کیا کروں گی۔ اب مجھے جانے دیجیے۔''

حکیم بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دبایا۔ ''کا کا میرے کول رہے گا۔ تے پکی گل ہے۔ مسلمان ہوگا پر تجھ سے پچھنا (پوچھنا) وی ضروری ہے ناں۔ ہالی میں نے اس دے کن وچ اذان نئیں دی۔ میں نے سوچا تیری اجازت مل جائے تے فیر۔'' (کا کا میرے ساتھ رہے گا تو پکی بات ہے کہ مسلمان ہوگا۔ پر تجھ سے پوچھنا بھی ضروری ہے نا۔ ابھی تک میں نے اس کے کانوں میں اذان نہیں دی۔ میں نے سوچا تیری اجازت مل جائے تو پھر......)

اس کے دل کو کچھ ہوا۔ شدت سے جی چاہا کہ حکیم بیگم کو ایسا کرنے سے روک دے لیکن اختلاف کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ بے اختیار آخری بار اسے دیکھنے کی خاطر اندر جانے لگی تھی کہ بروقت خود کو روک لیا اسے یاد آ گیا کہ وہ کسی تقریب میں جاتے ہوئے اپنے بچے کو امانتاً ایک دو دن کے لیے کسی کو سونپ کر نہیں جا رہی تھی۔ اس صحن سے باہر جانے والے قدم اسے اس بچے سے لاتعلق بنانے والے تھے۔ آنول تو اب کٹنے جا رہی تھی۔ اس پر نظر ڈالنے کا خیال پرنیاں کو شرمناک لگا۔

بئیس کے کنارے کی طرف جاتے ہوئے حکیم بیگم نے تیز چلنے پر اسے ٹوکا تھا۔ ''او بڑ کھابڑ تھاں تے تیزی نال ٹرنا تیرے لئی چنگا نئیں۔ ٹھیڈا نہ لگ جائے تجھے۔'' (اونچی نیچی جگہ تیزی سے چلنا تیرے لیے ٹھیک نہیں۔ ٹھوکر نہ لگ جائے تجھے۔)

کوئی دھیان دیے بنا وہ اسی رفتار سے چلتی رہی۔ ٹھوکر کھا کر گرنے میں صرف تین باتوں کا ڈر ہوتا ہے، کپڑوں پر گرد لگنے کا، چوٹ کھانے کا اور شرمندگی کا۔ پرنیاں کے دل سے ان تینوں چیزوں کا خوف نکل چکا تھا۔

اسے بیڑی (کشتی) میں بٹھا کر الوداع کہتے ہوئے حکیم بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا ''لے دس میں تے بھلی بیٹھی تھی۔ یہ ستھورا ہے سنٹھ (سونٹھ) تے میوے پا کے بنایا ہے میں نے۔''

اس نے بغل میں دبا ایک مرتبان پرنیاں کو دیتے ہوئے کہا۔ ''زچہ لئی بڑا کارگر ہوتا ہے۔ ہڈ پیر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اک طرح دی دوا ہے یہ۔''

خاصی دیر تک حکیم بیگم اسے وہیں کھڑی نظر آتی رہی۔ پرلے کنارے تک پہنچنے سے قبل اس نے ملاح کی نظر بچا کر ستھورے والا مرتبان بئیس کے پانی میں اچھال دیا۔ سب دوائیں بے فائدہ تھیں۔ وہ صنم گزیدہ تھی۔ اس زہر کا تریاق کسی مٹھ دھاری (جوگی) کسی وید، کسی سنیاسی کے پاس نہ تھا۔

اپنے محلے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جسم اور چہرے کو چادر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ تیزی سے جانی پہچانی گلیاں پار کرتے ہوئے وہ حتی الامکان کسی کی توجہ کا مرکز بننے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی کسی شناسا کی نظر میں آئے بنا اپنے گھر تک پہنچنا اس کے لیے اتنا ضروری تھا کہ بسوں کے اڈے سے گھر تک کافی زیادہ فاصلہ ہونے کے باوجود اس نے تانگہ نہیں لیا تھا۔ اکثر تانگے والے اسی آبادی کے رہائشی تھے اور وہاں کے سب مکینوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسے خوف تھا کہ کوئی کوچوان اس کے قد، بت یا چال ڈھال سے اسے پہچان نہ جائے۔

''میں ان سے کہوں گی کیا؟ کوئی بھی جملہ ایسا نہیں ہے جوان کے سامنے بولتے ہوئے میری زبان نہ اٹکے اور میں کسی کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتی۔ ان چہروں میں سے کسی پر نظر ڈالنے کے تصور سے میرا دل بند ہوا جاتا ہے۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔ میں کسی کو نہیں دیکھوں گی بس چپ چاپ جا کر برآمدے میں بڑے پلنگ پر بیٹھ جاؤں گی، آنکھیں بند کر کے، چاہے کچھ بھی کہا جائے، میں جواب نہیں دوں گی۔ مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میری یہ مجال کہ میں دوبارہ اس گھر کا رخ کروں۔''

اپنے گھر والی گلی میں مڑتے ہوئے اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ ایک ایک رگ سنسنا اٹھی۔ وہ الٹے قدموں واپس چل پڑی مگر پھر جی کڑا کر کے پلٹی۔ لکڑی کے بڑے پھاٹک پر قفل پڑا دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی مگر کہیں اندر ایک طمانیت بھی محسوس ہوئی۔

وہ کچھ اور مدت کے لیے ان سب کا سامنا کرنے سے بچ گئی تھی۔ اس نے نقاب تلے چہرے پر بہتا ہوا پسینہ پونچھا اور آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگی۔ شش و پنج کی کیفیت میں وہیں کھڑے کھڑے اسے کئی لمحے بیت گئے۔ سامنے والے گھر کے دروازے سے سولہ سترہ سال کی لڑکی نے باہر جھانکا۔ اس گھر کے مکینوں سے پرنیاں بخوبی واقف تھی۔ البتہ وہ لڑکی اس سے قبل کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید وہ اس گھر میں مہمان آئی ہوئی تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں دیر تک پیدل چلنے سے پرنیاں کا حلق خشک ہو رہا تھا اور بدن پر نقاہت طاری تھی۔ اس نے لڑکی سے ایک گلاس پانی مانگا تھا۔ وہ پانی لے کر آئی تو پرنیاں نے اس سے پوچھا۔

''اس گھر کے افراد کو تم جانتی ہو؟ میرا مطلب ہے آئزک صاحب کا خاندان۔ کیا تمہیں معلوم ہے، وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ دروازے پر تو تالا لگا ہے۔''

''باجی جی! آپ ان کی رشتے دار ہیں؟''

''نہیں۔ میں تو۔ میں کسی کام سے آئی تھی۔''

''اب تو وہ یہاں نہیں رہتے۔''

''تو کہاں چلے گئے؟''

''ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے ایک سال ہی ہوا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ہم نئے نئے یہاں آئے تھے تو ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی سے ایک دو دن پہلے وہ لڑکی بھاگ گئی اور تھوڑے دنوں بعد اس کا باپ بے چارہ مر گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ یہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ دروازے کے ساتھ ستون پر برائے فروخت کا اشتہار بھی لگا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔

پرنیاں کا گلاس والا ہاتھ اس بری طرح لرزا کہ پانی اس کے کپڑوں پر چھلک گیا۔ دیوار کو تھام کر وہ نیچے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

''ہائے اللہ باجی آپ کو کیا ہوا مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ابھی اپنی امی کو بلا کر لاتی ہوں۔''

وہ لڑکی گھبرا کر اندر بھاگ گئی۔

بسوں کے اڈے پر اسے جو پہلی بس روانگی کے لیے تیار ملی، وہ اسی پر سوار ہو گئی۔ اس نے یہ جاننے کا تردد نہیں کیا تھا کہ اس بس کی منزل کیا تھی جب کنڈکٹر نے آ کر اس سے کرایہ طلب کیا تو اس نے جھولی میں دھرے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہوئے حکیم بیگم کے دیے ہوئے روپوں میں سے ایک نوٹ نکال کر دیکھے بغیر کنڈکٹر کے حوالے کر دیا۔

''کہاں کا ٹکٹ کاٹ دوں؟''

''ان روپوں میں جہاں تک کا بنتا ہے کاٹ دو۔''

''بی بی! یہ کیا بات ہوئی؟ تم نے جانا کدھر ہے؟'' اس نے الجھ کر کہا۔

وہ خاموش رہی تو کنڈکٹر جھنجھلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ لاری لاہور تک جائے گی۔ لاہور کا ٹکٹ بنا دوں؟''

''کہیں کا بھی بنا دو۔ جب میرے دیے ہوئے روپے ختم ہو جائیں تو مجھے اتار دینا۔''

اگلی نشست پہ پیشانی ٹکاتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی۔

وینس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی ہوگی لیکن اب اسے ڈھونڈنے کی خواہش پرنیاں کے دل میں باقی نہ رہی تھی۔ ایک نافرمان بیٹی سے ملنے پر تو شاید وہ آمادہ ہو جاتی مگر اپنے محبوب شوہر کی قاتل سے ملنا اسے کیونکر گوارا ہوگا۔

✠ ✠ ✠

تیسری یا چوتھی بار دستک دینے کے ارادے سے اس نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اسی لمحے دروازہ کھل گیا۔ آنے والا داؤد تھا جو اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رکا تھا۔ احمد پر نظر پڑتے ہی اس کی رنگت متغیر ہوگئی تھی۔

''کیا پرنیاں بھی تمہارے ساتھ آئی ہے؟''

یہ جملہ سن کر احمد کے اندر جلتی ہوئی امید کی لو بجھ گئی۔ وہ تو اس آس پر وہاں آیا تھا کہ داؤد اور اس کے گھر والوں سے پرنیاں کی کوئی خبر مل جائے گی جبکہ داؤد کا سوال صاف بتا تا تھا کہ اس کی طرح وہ بھی لاعلم تھا۔

''میں سمجھا، تم کچھ جانتے ہوگے۔ کہاں چلی گئی ہے وہ؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟'' داؤد کی پیشانی پر گہری سلوٹیں نظر آنے لگیں اور اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

''اس بات کا جواب مجھے تم سے چاہیے۔ اس نے تمہارے کہنے پر گھر چھوڑا تو تمہارے سوا کون جان سکتا ہے وہ کہاں ہے۔''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو خود اسے تلاش کر رہا ہوں۔''

''میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتے ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ تمہاری یہ مجال کہ اتنا سب کرنے کے بعد تم میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہو۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم اپنے پیدا ہونے پر پچھتاؤ گے۔''

اچانک داؤد نے اسے کندھوں سے دبوچا اور دھکیلتا ہوا پورٹیکو کے سنگی ستون تک لے گیا۔ ''تم نے اسے ذلت کا راستہ اپنانے پر مجبور کیا اور معصوم بن کر کہتے ہو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے احمد کا گلا دباتے ہوئے مسلسل چلا رہا تھا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں کسی سے اتنی نفرت نہیں کی جتنی مجھے تم سے ہے۔ تم نے اچھا کیا بہت اچھا کیا کہ خود ہی میرے پاس آ گئے۔ تمہیں ڈھونڈنے میں مجھے اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرنا پڑیں۔ تم چل کر یہاں تک آ تو گئے ہو لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، واپسی کا سفر تم اپنے قدموں پر نہیں کر سکو گے۔''

دم گھٹنے کے سبب احمد کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگی تھیں۔ میانہ قامت داؤد جسمانی طاقت میں اس سے کہیں کم تھا۔ وہ چاہتا تو باآسانی اس کی گرفت سے گردن آزاد کروا سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوئی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مضبوط دراز بازوؤں کو پشت پر لے جا کر ستون کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ جب گھٹن اس کی برداشت سے باہر ہوگئی اور دماغ پر تاریکی چھانے لگی تو بلا ارادہ اس کے ہاتھ داؤد کے سینے پر جم گئے۔

شاید داؤد کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔ نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے اس نے احمد کی گردن چھوڑ دی۔ احمد کو اس کے پیچھے ہٹنے پر افسوس ہوا۔ کاش وہ جو کرنے جا رہا تھا۔ اسے ادھورا نہ چھوڑتا۔ گردن مسلتے ہوئے وہ بے تحاشا کھانس رہا تھا اور جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں جیسی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

''میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ اس بار میں نے خود کو روک لیا ہے۔ اگلی بار شاید خود پر قابو نہ پا سکوں۔ کوشش کرنا کہ دوبارہ کبھی میرے سامنے نہ آؤ۔'' داؤد نے تیز تنفس کے دوران کہا اور مڑ کر دروازے کی طرف چل دیا۔

''مجھے تھوڑا پانی مل جائے گا؟'' احمد بھی اس کی تقلید میں چلنے لگا، داؤد نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اسے اپنے پیچھے آنے سے منع بھی نہیں کیا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ داؤد نے پانی کا گلاس لا کر اس کے سامنے میز پر رکھا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ احمد کو گردن کی رگوں میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ پانی پیتے ہوئے اس کے ہونٹ کپکپاتے رہے اور کچھ پانی اس کی ٹھوڑی پر بہہ گیا۔

''شکریہ۔'' خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
کینچوؤں جیسی سست رو ساعتیں ان کے قدموں میں رینگنے لگیں۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھتے نہ تھے۔ پھر احمد نے بولنے میں پہل کی۔
''مجھے واقعی نہیں معلوم، وہ کہاں چلی گئی۔ اگر مجھے کوئی خبر ہوتی تو بھلا میں یہاں کیوں آتا؟ ذرا سوچو تو، تم سے ملنے میں مجھے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیے۔''
داؤد نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا گلاس اٹھالیا اور خاصی دیر تک گلاس کو گھورتے رہنے کے بعد بولا۔
''اس نے تم سے شادی کے بارے میں اپنی امی کو بتادیا تھا۔ انہوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ گھر سے چلی گئی تو ہمیں ساری بات پتا چلی۔ اس نے مجھ سے کہا ہوتا تو شاید میں شادی رکوا دیتا۔ اسے بے گھر ہونے سے بچالیتا۔ میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کے کہنے پر دنیا کا کوئی بھی کام کرنے پر آمادہ ہوجاتا۔ وہ ایک بار مجھے آزماتی تو سہی لیکن میں...... یہ باتیں تو میں اب سوچ رہا ہوں۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھ سے کہتی تو میں غصے سے پاگل ہوجاتا۔ پاگل تو میں اب بھی ہوگیا ہوں۔ جانے کیوں اس نے تمہارا انتخاب کیا؟ وہ کج فہم ہے، نادان ہے۔ نادان نہ ہوتی تو تمہارے جال میں کیوں پھنستی۔ تم نے اسے بہکایا اور وہ بہک گئی۔ اس کے جانے کے فقط آٹھ دن بعد اس کا باپ مرگیا۔ وہ آخر وقت تک ہم لوگوں کی منتیں کرتے رہے کہ کہیں سے پرنیاں کو ڈھونڈ کر لے آؤ۔''
''تم نے اسے تلاش تو کیا ہوگا؟ کسی رشتہ دار یا کسی دوست کی طرف ہی گئی ہوگی وہ۔''
داؤد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ کہیں نہیں ملی۔ ہم نے ہر جگہ سے پتا کروالیا۔ سب بے خبر ہیں۔ اس نے اپنے راز میں کسی کو شریک ہی نہیں کیا۔''
''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں پھر تم سے بات کروں گا اگر اس کا کوئی سراغ ملے تو مہربانی کرتے ہوئے مجھے ضرور بتادینا۔'' احمد صوفے سے اٹھ گیا لیکن اس کے قدم وہیں تھمے رہے۔
داؤد بدستور ہاتھ میں تھامے ہوئے گلاس کو دیکھ رہا تھا۔
''میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔'' کہتے ہوئے احمد کے گلے میں تیز درد اٹھا وہ صوفے کے ہتھے کو پکڑتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا۔ ''اس نے مجھے فون کیا تھا۔''
داؤد نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور اضطراب آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''تو کیا بتایا اس نے؟ کہاں ہے وہ؟''
''وہ چاہتی تھی کہ میں پاکستان جاکر اسے ساتھ لے آؤں۔''
''تو تم نے کیا کہا؟ کب لینے جارہے ہو اسے؟''
''میں نے۔'' وہ اٹکا ''میں نے انکار کردیا۔ میں پاکستان نہیں جاسکتا تھا۔''
''کتے! میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔'' داؤد اتنے زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ اس نے گلاس احمد کے ماتھے پر کھینچ مارا تھا۔ کاٹ دار جلن اس کی پیشانی اور سر میں پھیل گئی۔ اس نے اپنا ماتھا چھو کر دیکھا۔ اس کی انگلیوں نے خون کی چپچپاہٹ محسوس کی تھی۔
''تم کیسے مرد ہو؟ ایک عورت نے تمہاری خاطر اپنے سب رشتوں کو کاٹ کر پھینک دیا اور تم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنے مرد ہونے پر تمہیں شرم آنی چاہیے بزدل! جب تمہیں پیچھے ہٹنا تھا تو اسے امید دلائی ہی کیوں تھی؟ تمہیں وقت گزاری ہی کرنا تھی تو اس سے شادی کا ڈھونگ کیوں کیا؟''
''میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں مجبور تھا اس وقت۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔''

بعد میں کبھی پوری بات سناؤں گا۔''

''اس نے اتنا تو بتایا ہوگا کہ وہ کہاں سے فون کر رہی ہے۔''

''نہیں۔ اسے یہ بتانے کا موقع نہیں ملا اور وہ۔ وہ پریگننٹ ہے۔'' احمد نے اٹھتے ہوئے قمیص کی آستین سے رگڑ کر اپنی پیشانی صاف کی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

داؤد کی بیٹھی ہوئی سی آواز سنائی دی تھی۔ ''اگر وہ دوبارہ تم سے بات کرے تو مجھے بتا دینا۔ اپنا پتہ اور ٹیلی فون نمبر مجھے لکھواتے جاؤ۔''



البا کے نوکیلی ایڑیوں والے سرخ جوتے ٹک ٹک کرتے اس کے نزدیک آ رہے تھے۔ وہ ساکن پلکوں سے ان متحرک جوتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ نیم دائروں میں گھومتے ہوئے اس کی طرف سرک رہے تھے۔ ان کی اونچی ایڑیاں فرش کے چوبی پٹروں سے ٹکرا کر کانوں کو چبھنے والی آوازیں ابھار رہی تھیں۔ جب وہ بالکل پاس آ گئے تو ان کی حرکت تھم گئی۔ احمد کی آنکھیں مسلسل ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بھڑکیلے لال رنگ کے ان جوتوں نے کیا کچھ ملیامیٹ کر دیا تھا۔

اس نے البا کے ہاتھ کو اپنے سر کے بالوں میں پھرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ساکت و صامت رہا۔ پھر اس نے البا کو کہتے سنا تھا۔

''میرا دل غم سے پھٹ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم، تمہیں کیسے تسلی دینی چاہیے۔ اتنا صحیح ہوتے ہوتے کیسے سب کچھ غلط ہو گیا۔ اس stinky (بدبودار) صحافی کو یقیناً تم سے کوئی دشمنی رہی ہوگی۔ کہاں سے اس نے وہ فضول سی باتیں ڈھونڈ کر اخبار میں لکھ ڈالیں۔ حاشیہ آرائی اور مبالغہ ان رذیل صحافیوں کی سرشت میں ہوتا ہے۔ اور اس سے زیادہ غصہ مجھے اسٹوڈیوز کی انتظامیہ پر آ رہا ہے۔ انہیں تو گویا تمہیں الگ کرنے کا بہانہ درکار تھا۔ اتنی غیر اہم بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے تمہارا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ میرے اختیار میں ہو تو میں ان سب کو فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دوں۔ انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

البا کا ہاتھ اس کی گردن کی پشت کو سہلا رہا تھا۔ وہ اب بھی ساکت تھا۔

''مجھ سے بڑھ کر کسی کو تمہارے درد کا احساس نہیں ہو سکتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تمہیں تنہا یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ میں نے Watts والے اپارٹمنٹ کے لیے تھوڑا بہت فرنیچر خرید لیا ہے اور رنگ روغن کا کام بھی مکمل کروا دیا ہے۔ سائبان پر میں نے لکھوایا ہے ''گرانٹ اور البا کا Lovenest'' سرخ اور سنہری رنگوں میں۔ تم دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔

وہ گھر تمہارا منتظر ہے۔ چلو گرانٹ! ہم آج ہی وہاں چلتے ہیں۔ اور تم اس ناکامی پر ہرگز دل برداشتہ نہ ہونا۔ جب تک میں تمہاری فکر کرنے کے لیے موجود ہوں، کسی پریشانی کو تمہاری قریب نہیں آنے دوں گی۔ میں نے تمہارے لیے ایک کردار تلاش کر لیا ہے۔ یہ معمولی نوعیت کا کردار تمہارے شایان شان تو نہیں ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ بات پکی ہو چکی ہے۔

اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر بے حد مکروہ آدمی ہے، کسی سور جیسی لٹکی ہوئی تھوتھنی ہے اس کی۔ میں نے کیسے اسے راضی کیا، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ خیر تمہارے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔ تم ہو ہی اتنے خاص۔''

البا کا ہاتھ اس کے ماتھے پر رینگنے لگا۔

وہ اٹھ کر البا کے مقابل کھڑا ہو گیا اور اس کا سر پکڑ کر اسے پچھلی دیوار کی سمت دھکا دیا۔ وہ دور تک لڑکھڑاتی چلی گئی تھی۔ احمد بھاگ کر اس کے قریب پہنچا، مٹھی بند کر کے ہاتھ کی پشت سے اس کے جبڑے پر ضرب لگائی، پھر گدی سے دبوچ کر اسے فرش پر جھکا

دیا اور اس کی پنڈلیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی تھی۔ احمد نے اس کی گدی نہیں چھوڑی، ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اس کا منہ فرش کے بالکل نزدیک کرتے ہوئے وہ دوسرے ہاتھ اور دونوں پیروں سے اسے پیٹتا رہا۔ بے تحاشہ دباؤ کے باعث البا کے گھٹنے باہر کی سمت مڑ گئے اور وہ اوندھے منہ فرش پر گر گئی۔ احمد نے تب بھی اسے مارنا ترک نہیں کیا۔

پاگلوں کی طرح چلاتی ہوئی البا کو وہ تھپڑوں، مکوں اور ٹھڈوں سے تب تک مارتا رہا تھا جب تک اس کی ناک اور منہ سے خون جاری نہیں ہو گیا اس دوران احمد نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ جب مار کھاتے کھاتے الباادھ موئی ہو گئی اور اس میں ذرا سی بھی ہلنے کی سکت باقی نہ رہی تو احمد اسے وہیں چھوڑ کر اپنی سابقہ جگہ پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر البا بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ پھر اس نے آہستگی سے کروٹ لی اور کسی اپاہج کی مانند فرش پر گھسٹتے ہوئے اپنے شولڈر بیگ کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ بیگ میں سے ایک شیشی برآمد کر کے کانپتے ہاتھ سے بدقت اس کا ڈھکن ہٹایا اور دہانے میں انگلی گھسا کر باہر نکالی تو اس کی پور سے کچھ سفید ذرات چمٹے ہوئے تھے۔ پہلو کے بل لیٹے لیٹے البا انگلی منہ میں ڈال کر مسوڑوں پر وہ ذرات ملنے لگی اس کے حلق سے ایک طویل کراہ نکلی اور اس نے سر کو فرش پر گرا دیا۔

''میں نے تمہارے لیے کسی ایسی ویسی فلم میں کردار حاصل نہیں کیا۔ تمہیں لگا، میں پورنو فلم کی بات کر رہی ہوں؟'' اس نے حلقوں میں ڈھیلوں کو غیر فطری انداز میں گھماتے ہوئے سسکی بھر کر کہا۔

''مجھے اس کاسٹنگ ڈائریکٹر سے کب ملنا ہوگا؟ تمہارے پاس اس کا ٹیلی فون نمبر ہے تو وہ مجھے دے دو اور یہ کیا ہے اس شیشی میں؟''

''یہ coke (کوکین) ہے۔ شکر ہے یہ میرے پاس ہے ورنہ تو درد سے میری جان ہی نکل جاتی۔''

''تھوڑی سے مجھے بھی دو۔ اس سے درد کم ہو جاتا ہے کیا؟''

''ہاں شاید کم ہو جاتا۔ مجھے صحیح طرح سے معلوم نہیں۔ مجھے اور نہ مارنا۔ تم خود لے لو۔ ساری لے لو۔''

احمد نے شیشی میں سے ایک چٹکی سفوف ہتھیلی پر منتقل کیا اور اسے زبان سے چاٹ لیا۔ ذرا سے چبھتے ہوئے ذائقے والے سفوف نے اس کی زبان سُن کر دی۔ اس نے باقی ماندہ ذرات کو انگلی کی مدد سے اپنے مسوڑھوں پر مل دیا۔ اس کے مسوڑھے بھی بے حس ہونے لگے تھے۔ وہ پشت کے بل فرش پر لیٹ گیا اور منہ کو پورا کھول دیا۔ اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی اور حلق میں دھیرے دھیرے کچھ رس رہا تھا۔

البا بھونڈے پن سے ہنس رہی تھی۔ ''دیکھو میرا ایک ایئر رنگ تمہاری آستین کے کف میں اٹکا ہوا ہے اور میری تو لپ اسٹک بھی پھیل چکی ہوگی میں کیسی بے ہودہ نظر آ رہی ہوں گی۔ تمہیں زحمت نہ ہو تو میرے پرس سے آئینہ نکال کر مجھے دے دو۔ آہ مجھ سے تو اپنا ہاتھ بھی ہلایا نہیں جا رہا۔''

اس دن ان دونوں نے اپنا اپنا مقام طے کر لیا تھا۔ آنے والی زندگی میں انہیں کون سے کردار نبھانے تھے اس دن اس بات کا تعین ہو گیا تھا۔



ابتدا میں کچھ عرصہ اس نے بے گھر عورتوں کے لیے قائم کردہ ایک خیراتی ادارے میں گزارا پھر وہاں کی ناظمہ کے توسط سے ایک ہائی اسکول میں اسے ملازمت مل گئی۔ یہ ایک نجی تعلیمی ادارہ تھا اور پرنسپل شوکت چوہدری نے حال ہی میں اس کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ وہ ایک خلیق اور ہنسوڑ طبیعت کے بے ضرر سے آدمی تھے۔ اسکول کے تمام عملے اور بالخصوص پرنیاں کے ساتھ ان کا رویہ

ہمدردانہ تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو پرنیاں کی خاموشی اور رکھ رکھاؤ تھا اور کچھ یہ کہ اس کے بارے میں خودساختہ کتھائیں گھڑنے میں لوگ بہت ہی ولولہ دکھاتے تھے۔

پرنیاں نے ایک سادہ اور ٹھوس حکمت عملی وضع کر لی تھی۔ کوئی بھی سوال جو اس کے ماضی کو کریدنے کی خاطر کہا جاتا، اسے وہ سرے سے نظرانداز کر دیتی۔ اپنے طور پر کوئی جھوٹ یا سچ بتانے کی زحمت اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ ایک چپ کا غلاف تھا جو اس کے گرد اسرار کی دھند بن کر لپٹا تھا۔ ایسی صورت میں لوگوں کے پاس کیا چارہ رہ جاتا تھا۔ سوائے یہ کہ وہ خود ہی داستانیں تراش کر اس سے منسوب کر دیں۔

اس مشغلے کا لطف تو اپنی جگہ لیکن چند ہنرمند قصہ گو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے جھوٹ پر سچ کا گماں ہوتا ہے۔ پرنیاں کے سلسلے میں بھی ایسے ہی کچھ مشاق دماغوں کی صناعی کام آئی تھی اور بہت سے من گھڑت قصے سچ کی مہر لگا کر اس کی ذات سے منسوب کر دیے گئے تھے۔ اس کی طرف سے کسی تردید یا تائید نہ ہونے نے صورت حال کو اس قدر پرکشش بنا دیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی ذات اور معاملات پر بحث کرنا اسکول کی روزمرہ کارروائیوں کا ایک لازمی جزو ٹھہرا تھا۔

عین ممکن ہے، شوکت صاحب کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانے میں بھی ایسے ہی کسی قصے کا ہاتھ رہا ہو۔ بہرصورت ان کی حوصلہ شکنی نہ کرنے کی پرنیاں کے پاس ایک سادہ سی وجہ تھی۔ وہ سوال بہت کم پوچھتے تھے اور ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

جب اسے اسکول کی ملازمت کرتے ہوئے کچھ وقت بیت گیا اور اس کی قلیل ماہانہ آمدنی ایک رہائش گاہ کے اخراجات اٹھانے کی متحمل ہو گئی تو شوکت صاحب نے اندرون لاہور کے ایک قدیم محلے میں اسے دو کمروں کا بوسیدہ مکان کرائے پر دلوا دیا۔ اس محلے کے باسیوں نے بھی اس میں ویسی ہی دلچسپی دکھائی جیسی اسکول کی چار دیواری میں اس کے ساتھی اساتذہ اور دیگر انتظامی عملہ ظاہر کرتا تھا۔ چہ میگوئیاں ہوئیں، قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کھوجی جبلت نے محلے والوں کو بے چین کر دیا۔ یہاں بھی اس نے خاموشی اور لاتعلقی کا رویہ اپنائے رکھا۔

نتیجہ اس کی منشا کے مطابق برآمد ہوا۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وقت گزاری اور اپنے چھوٹے موٹے اخرجات پورے کرنے کی خاطر اس نے آس پڑوس میں بسنے والے چند بچوں کو معمولی معاوضے پر پڑھانا شروع کر دیا تو بعض نیک طبع لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وہ کب، آپا، کے نام سے پکاری جانے لگی، اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ بے نام ہو کر رہنے اور عدم وجود کا مرتبہ پا لینے کی اسے جو تمنا تھی وہ کسی حد تک پوری ہو رہی تھی۔

خدا سے اس کا تعلق محض گلے میں صلیب والا لاکٹ پہننے یا قریبی گرجا گھر میں جا کر معمول کی عبادات میں شامل ہونے تک محدود تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔ وہ مناجات کے دوران خاموش رہتی، کبھی مزامیر نہ گاتی۔ پریسٹ کے وعظ پر دھیان نہ دیتی۔ مقدس شبیہوں پر نظر نہ ڈالتی۔ بس کسی نشست پر سر جھکائے بیٹھی سروس کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی اور وہاں سے ایسے دبے قدموں اٹھ آتی، جیسے کوئی چور، جو گھر کے مالک کے خوف سے آہٹ پیدا کرنے سے گریز کرتا ہے۔

زندگی دردناک حد تک اکتا دینے والی آلکسی کے ساتھ قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی نہ برتن خالی رہتا تھا اور نہ بھر ہی پاتا تھا۔

ایک روز اس نے شوکت صاحب کے دفتر میں ایک امریکن فلمی رسالہ دیکھا اور یونہی اس کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ ایک ورق پر بہت سے دوسرے فلمی ناموں کے درمیان لکھے ہوئے ایک نام پر اس کی نظریں یوں ٹھہریں کہ آس پاس کی ہر شے جیسے، کسی ان دیکھے پردے کی اوٹ میں چھپ گئی۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخبارات کی بدولت اتنا تو اسے معلوم تھا کہ وہ فلم جس میں ایڈم گرانٹ کو مرکزی کردار میں کاسٹ کیا گیا تھا، بوجوہ نہیں بن سکی تھی لیکن ان دنوں وہ کن حالات میں زندگی بسر کر رہا تھا، اس سے وہ قطعی لاعلم

تھی۔

اسے اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ گرانٹ بی مووینر میں تیسرے درجے کے کردار ادا کرنے لگا تھا۔
وہ حیران تھی تو اس کا نام دیکھنے کے بعد اپنی کیفیت پر۔ اس کے اندر ایسا بھونچال اٹھا تھا کہ خود پر قابو پانا محال ہو رہا تھا۔
اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی وہ نام اس پر ایسا اثر ڈال سکتا تھا۔
کچھ عرصے سے تو اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ گرانٹ کے لیے اس کے دل میں کوئی محبت باقی نہیں بچی، اس گھڑی پرنیاں پر طلوع ہوا کہ ایسا سوچنا اس کی حماقت تھی۔ محبت وہ جنس ہے جسے کبھی موت نہیں آتی۔ یہ آب حیات کے چشمے میں کھلنے والا کنول ہے۔ بقا کا بھونرا اس کے روپ کا رسیا ہے۔ فنا سے اس کا ہرگز علاقہ نہیں۔
رسالے کے اس ورق پر کچھ گمنام مگر غیر معمولی اداکاروں کی فنی زندگی کا مختصر احوال بیان کیا گیا تھا۔ گرانٹ کے کریڈٹ پر موجود فلموں کے عنوان اس نے ایک کاغذ پر نقل کر لیے اور ان میں سے جو فلمیں اسے بازار میں دستیاب ہو سکیں، اسی شام خرید لائی۔ پھر اس کا معمول بن گیا کہ گاہے بگاہے فلمی جریدوں کو کھنگالتی رہتی اور اگر کسی فلم کی کاسٹ میں گرانٹ شامل ہوتا تو ہر قیمت پر وہ فلم حاصل کرتی۔ چاہے اسے کسی دوسرے شہر سے ہی خرید کر کیوں نہ لانا پڑے۔
اس نے اپنی تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کر کے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹیلی ویژن سیٹ اور پرانے ماڈل کا ویڈیو کیسٹ پلیئر خرید لیا تھا۔ وہ پہروں ان فلموں میں سے وہ مناظر ڈھونڈ کر دیکھتی رہتی جن میں گرانٹ شامل ہوتا۔ کبھی کبھی وہ پوری رات کسی کلوز اپ کو ساکت کر کے چھوڑ دیتی اور مسلسل ٹیلی ویژن اسکرین کو گھورتی رہتی۔
کچھ ایسے لمحات بھی آتے تھے جن میں وہ اپنی اس عادت سے متنفر ہو جاتی اور ہفتہ بھر یا اس سے کچھ زیادہ کے لیے اسی ترک کر ڈالتی، مگر اس سے مستقل پیچھا چھڑانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔
شوکت صاحب اس سے خاص انس رکھتے تھے اور اسے خوش رکھنے کی اپنی سی سعی کرتے رہتے تھے۔ اسے ہنسنے بولنے پر مائل کرنے کی خاطر روزمرہ گفتگو کو مزاح کے رنگ میں کرنا ان کا معمول تھا۔ اس کے کئی چھوٹے بڑے کام وہ بنا فرمائش کے ہی اپنے ذمے لے لیا کرتے تھے، جیسے کہ اس کے گھر میں ٹیلی فون کنکشن لگوانا، بجلی کے بل کی درستی کروانا۔ بالائی منزل پر بنے اسٹور روم کی برساتوں میں ٹپکنے والی چھت کی مرمت، فرنیچر جو دو چار پائیوں، ایک میز اور دو کرسیوں پر مشتمل تھا کو سال دو سال بعد پالش کروا دینا اور ایسے ہی کئی دوسرے مسائل حل کرنا۔
اس سب کے عوض وہ کچھ مانگتے نہیں تھے لہٰذا پرنیاں کو ان کی مدد لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ ان ہی کے اصرار پر کچھ سال قبل اس نے کوئی دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی، چند انعامی بانڈ خریدے تھے اور انہیں شوکت صاحب کے پاس ہی رکھوا دیا تھا۔ وہ ان کے متعلق یکسر بھول چکی تھی کہ ایک دن شوکت صاحب نے اطلاع دی کہ اس کا بیس لاکھ کا انعام نکلا تھا۔ اسے کوئی سنسنی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کا ٹھس سا ردعمل دیکھ کر شوکت صاحب چیخ اٹھے۔
''حد ہے بھئی۔ آپ پر کوئی اثر ہی نہیں، میں نے تو جب سے یہ خبر سنی ہے میری دھڑکن ہی معمول پر نہیں لوٹ رہی حالانکہ مجھے اس میں سے پھوٹی کوڑی تک ملنے کی امید نہیں ہے۔ آپ استانیاں جو ہوتی ہیں ناں، بڑی ہی کنجوس مخلوق ہوتی ہیں۔ یہ تو میری ایمانداری ہے کہ میں نے آپ کو خبر کر دی۔ آپ تو یقیناً بھول بھال چکی ہوں گی۔ پانچ سالوں سے میں نے یہ بانڈز سنبھال کر رکھے تھے اگر میں آپ کو نہ بتاتا تو ذرا سوچیے آپ کے فرشتوں کو بھی ہوا لگتی بھلا؟ آپ نے کب نمبر نوٹ کر کے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ کاش یہ انعام میرے کسی بانڈ پر نکل آتا تو مزا ہی آ جاتا اور میں تو چھلانگیں مارتا پھر رہا ہوتا۔ آپ کی طرح بے تاثر شکل لیے بیٹھا نہ ہوتا۔ ایمان سے بڑی پتھر دل ہیں آپ۔''

''آپ بے شک یہ رقم رکھ لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' پرنیاں نے بلا تامل کہا تھا۔

''اچھا؟ مذاق مت کریں، ایسے موقع پر مجھ جیسے کمزور دل لوگوں کا ہارٹ بھی فیل ہو جایا کرتا ہے مجھے بس سنجیدگی سے اتنا بتا دیں کہ آپ اس رقم کا کریں گی کیا اور اگر آپ کے دماغ میں کوئی نادر خیال نہیں آ رہا تو بھی مجھے بتا دیجیے۔ میرے پاس ایک نہایت اعلا تجویز ہے۔''

''میری کوئی بھی ایسی خواہش نہیں ہے جسے پورا کرنے میں اس رقم کی ضرورت پیش آئے۔ میں نہیں جانتی، مجھے اس کا کیا کرنا چاہیے۔ ویسے میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا ہے کہ آپ یہ ساری رقم خود رکھ لیں یا اس میں سے جتنی چاہے مجھے دے دیں اور باقی آپ لے لیں۔ جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔ آپ کی کچھ ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''میری ایسی کیا ضرورت ہے بھلا۔ سب تو معلوم ہے آپ کو۔ اولاد ہے نہیں۔ بیوی کی حالت ایسی کہ اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر۔ بہن بھائی سب اپنے گھروں میں خوش اور صاحب جائیداد ہیں۔ میرے پاس اپنا ذاتی گھر اور کار ہے۔ بینک بیلنس بھی ہے۔ بڑھاپے میں دردر ٹھوکریں کھانے کا بہت کم امکان ہے، آپ کے حالات البتہ کافی مخدوش ہیں۔ اڑتیس انتالیس سال کی ہو چکی ہیں اور اتنی عمر کو ہمارے ملک میں بڑھاپے کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنا بڑھاپا عافیت سے گزارنے کی کیا منصوبہ بندی کی ہے اب تک؟ بتائیے مجھے۔ کوئی جواب نہیں ہے ناں آپ کے پاس، تو ثابت یہ ہوا کہ اس رقم کا مصرف سوچنا سمجھ داری کا تقاضا ہے اور اس سلسلے میں بندہ عاجز جو کسی خدائی فوج دار سے کم نہیں، آپ کی مدد کرنے پر تیار ہے بلکہ میں نے تو سوچ بھی لیا ہے۔ اب سنیے ذرا کان کھول کر......''

وہ اسے اپنے آبائی مکان کے بارے میں بتانے لگے جو اندرون لاہور میں واقع تھا اور جوان کے والد کی وفات کے بعد شوکت صاحب، ان کے دو بھائیوں اور بہن کی مشترکہ ملکیت تھا۔ پچھلے دنوں اس سات مرلے کے دو منزلہ مکان کی بائیس لاکھ قیمت لگی تھی، لیکن وہ پرنیاں کی خاطر اس میں تخفیف پر آمادہ تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ پرنیاں وہ مکان خرید لے۔ پرنیاں نے اس تجویز میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ تاہم شوکت صاحب مصر رہے اور دو ہفتے بعد اسے وہ مکان دکھانے لے گئے۔

پرانی طرز پر تعمیر کیے گئے اس مکان کو رنگ وروغن اور مرمت کی سخت حاجت تھی۔ البتہ اسے خستہ حال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چھتیں اور دیواریں بجز کچھ چھوٹی دراڑوں کے مضبوط تھیں۔ کھڑکیوں، دروازوں کا کوئی طاقچہ ٹوٹا اکھڑا نہ تھا اور کہیں بھی گھن کے آثار نہ تھے۔ بالا خانے کے دونوں اطراف جھروکے بنے تھے۔ مختصر صحن میں پیپل کا درخت لگا تھا جو ہرا بھی تھا اور چھتنار بھی۔ مجموعی طور پر اسے وہ گھر اچھا لگا تھا۔ اس نے زیادہ سوچ بچار کا تردد کیے بنا اسے خریدنے کی ہامی بھر لی۔

''چلو، یہ تو طے ہو گیا کہ آپ اس مکان کی بلا شرکت غیرے مالکہ بنیں گی، مگر یہ بتائیں کہ آپ کے انتقال پُر ملال کے بعد اس کا وارث کون ہو گا، جیسے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھوا رکھا ہے کہ میرے بعد میری تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد میرے سب بہن، بھائیوں میں تقسیم کر دی جائے تو آپ کس کا نام تجویز کریں گی محترمہ؟''

مذاق میں کہی گئی اس عام سی بات نے اسے سوچ میں ڈال دیا۔ بہت دیر تک شش و پنج میں مبتلا رہنے کے بعد وہ بولی۔

''میرا ایک دور کا رشتہ دار ہے۔ ایک لڑکا، میں یہ مکان اس کے نام کر جاؤں گی۔''

''اس دور کے رشتہ دار سے آپ نے مجھے کبھی نہیں ملوایا۔'' شوکت صاحب متجسس ہوئے۔ اس کی زبان سے پہلی بار کسی رشتہ دار کا ذکر سنا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

''اچھا کتنی عمر ہے برخوردار کی؟ اور کرتا کیا ہے؟ کہاں ہوتا ہے؟''

''قریباً اٹھارہ سال کا ہے۔'' اس نے دل میں اپنے بیٹے کی عمر کا حساب لگایا۔

''پڑھتا ہوگا، میرا خیال ہے اس عمر کے لڑکے عام طور پر کالج میں آ جاتے ہیں۔''

''کیا مطلب پڑھتا ہوگا؟'' شوکت صاحب نے اعتراض کیا۔ ''یعنی آپ لاعلم ہیں کہ درحقیقت وہ کیا کرتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی بھئی؟''

''میں اس سے کافی سالوں سے نہیں ملی دراصل۔ اس لیے نہیں جانتی کہ وہ آج کل کیا کرتا ہے۔'' اس نے نظریں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت اعلا، کیا بھولا بسرا وارث ڈھونڈا ہے آپ نے۔'' شوکت صاحب نے کندھے اچکائے۔ ''والدین حیات ہیں اس کے یا گزر گئے؟''

''دونوں مر چکے ہیں، یتیم ہے وہ لڑکا۔''

''کیا ہوا جو وہ مر گئے۔ آپ تو زندہ ہیں نا، اس بے چارے لڑکے کا بھلا سوچنے کو۔''

اس گفتگو کے بعد حیرت انگیز طور پر پرنیاں کے اندر اس مکان کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوگئی۔

ایک روز وہ سسٹر سوزین اور کچھ دوسری راہباؤں کے ساتھ بیٹھی تھی کہ باتوں کے دوران سسٹر سوزین نے چرچ کے ایک ممبر کا ذکر چھیڑ دیا، جس کی جواں سال بیٹی نے ایک مسلمان مرد سے شادی کرنے کے لیے مسیحی مذہب کو ترک کر دیا تھا۔ سسٹر سوزین ننوں کی اقامت گاہ کی نگران تھی اور چرچ میں پرنیاں کی ان سے واقفیت ہوئی تھی۔ سسٹر سوزین نے اس واقعہ پر شدید تاسف کا اظہار کیا تھا۔

''یہ تو گمراہی کی انتہائی صورت ہے۔ مہربان چرواہا اپنے ریوڑ کو گناہ کی دھوپ سے بچانے کے لیے اپنے جوئے تلے چھپائے اور بھیڑیں اس کے دامن پر تھوتھنیاں چلانے لگیں۔ یسوع سے کھلی دشمنی کا اعلان کرنے والوں کے لیے روشنی کہاں ہے؟ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماریں گے اور جب گر کر چوٹ کھائیں گے تو بدن سہلانے کو انہیں اپنے ہاتھ نہ ملیں گے اور ذرا سوچو کہ اس بدقسمت لڑکی کی ہونے والی اولاد کا کیا ہوگا۔ جب وہ اندھی گپھا میں اپنے بچوں کو جنے گی تو وہ روشنی کہاں سے پائیں گے؟ وہ آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نابینا ہی رہیں گے۔ ان کی نقدی کو ان سے پوشیدہ رکھنے والا کون ہوگا؟ وہ جس نے تجوری کی چابی گم کر دی، ذمہ دار وہی ہے، جواب اسی سے لیا جائے گا۔''

اس محفل سے اٹھنے کے بعد پرنیاں نے چند دن اور چند راتیں بڑی بے چینی میں کاٹیں۔ اس نے اونی پونی بات بتا کر فادر آرون سے مشورہ لیا اور پھر اپنے بیٹے کو واپس لانے کا فیصلہ کر لیا۔ حکیم بیگم کے گھر جانے اور بیٹے کا سامنا کرنے میں برسوں کی جھجک مانع تھی۔ شرمندگی سے اس کا سانس رک رک جاتا تھا، لیکن ایک بار جب فیصلہ ہوگیا تو اس سے پھر جانا پرنیاں کے اختیار میں نہ رہا۔ اس کا دماغ آٹھوں پہر ایک ہی نکتہ سجھائے چلا جاتا۔ لاکھ دامن جھٹکنے پر بھی جب یہ خیال اس کا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ ہوا تو آخر کار اسے اپنے ارادے پر عمل کرنا پڑا۔

حکیم بیگم یا عمر میں سے کوئی بھی اس سے مزاحم نہ ہوا اور اس نے تصور میں خود کو پیش آنے والی جو مشکلات سوچ رکھی تھیں ان میں سے کوئی اس کے سامنے نہ آئی۔

عمر قد کاٹھ میں بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ ویسے ہی بڑے اور پُرشکوہ تھے، جیسے گرانٹ کے تھے، لیکن وہ اپنے باپ کے ہاتھوں کی طرح متحرک نہیں رہتے تھے۔ ان میں بے پناہ ٹھہراؤ تھا۔ وہ کبھی عمر کی گود میں ایک دوسرے کے اوپر دھرے رہتے اور کبھی میز پر پاس رکھے ہوتے اور دونوں انگوٹھوں کے ناخن آپس میں ملے ہوئے ہوتے یا کرسی کے ہتھوں پر موجود ہوتے اور

انگلیاں ذرا سی اندر کو مڑی ہوئی ہوتیں۔ وہ دیر تک عمر کے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی۔

ایسا کرنے سے اسے عمر کے چہرے پر براہ راست نظر نہ ڈالنے میں مدد ملتی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ میں ذرا سا خم تھا۔ ویسا ہی خم گرانٹ کے ہونٹ میں بھی موجود تھا۔ مسکراتے ہوئے اس کی ناک کے بانسے میں ہلکا سا تناؤ آ جاتا تو وہ ہو بہو گرانٹ کی طرح نظر آتا۔ یہ الگ بات کہ وہ پرنیاں کے سامنے شاذ ہی مسکراتا تھا۔ اس کی آنکھیں البتہ رنگ اور بناوٹ میں بالکل پرنیاں سے مشابہ تھیں۔ کوئی بھی اس کی آنکھوں سے پہچان سکتا تھا کہ وہ پرنیاں کا بیٹا ہے۔ اس کے باوجود پرنیاں لوگوں سے اسے اپنا بھانجا کہلوانے پر مصر تھی۔ کبھی کبھی اسے یہ حرکت احمقانہ لگتی تھی۔ سب لوگ اتنے بے وقوف کب ہوتے ہیں، جتنا وہ انہیں بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شاید اس کے اپنے علاوہ کوئی بھی بے وقوف نہیں تھا۔

باقی لوگوں کی طرح عمر بھی اسے آپا کہہ کر بلانے لگا تو اس نے ٹوکا نہیں۔ ٹوکنے کی صورت میں اسے کوئی متبادل لفظ بتانا پڑتا۔ کسی تعلق کا عنوان...... کوئی رشتہ ظاہر کرتا ہوا ایک نام، اور ایسا کوئی نام پرنیاں کے پاس کہاں تھا۔

عمر اس سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ زیادہ تر وقت وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں گزار دیتا۔ وہ خود سے پرنیاں کو مخاطب کرنے سے حتی الامکان گریز کرتا اور اگر وہ اس سے کوئی بات کرتی تو وہ ایک سطری جوابوں سے کام چلاتا۔ شاید وہ فطرتاً خاموش طبع بھی ہو، مگر اس کا رویہ پرنیاں کو انوکھا نہیں لگا۔ اپنی کوتاہی کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے زیادہ کی امید کیوں رکھتی۔ عمر کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا اور وہ تو اس کے ساتھ چلے آنے پر بھی جانے کیسے راضی ہو گیا تھا۔

عمر کے معمول سے اسے تاثر قائم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مذہب کی اس کی زندگی میں بہت اہمیت تھی۔ وہ اپنی تمام عبادات باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ اس کی کتابوں کی الماری میں سب سے اوپر والے خانے میں قرآن رکھا تھا۔ وہ روزانہ دو یا تین بار اس کی تلاوت کرتا تھا۔

ایسے اوقات میں کبھی کبھی پرنیاں کو اس کی شفاف آنکھوں میں نمی سی تیرتی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً اس کلام کی اثر انگیزی اس کے دل کو پگھلاتی ہوگی، لہٰذا جب اس نے عمر کو مسیحی دین اپنانے کو کہا تو اس کا انکار خلاف توقع نہیں تھا، لیکن وہ انکار اتنا بے لچک اور دوٹوک تھا کہ وہ ششدر رہ گئی۔

آج اگر عمر کرسچن نہیں تھا تو قصوروار سراسر وہ خود تھی۔ اپنے ساتھ ساتھ اس نے عمر کی راہ بھی کھوٹی کر ڈالی تھی۔ کیا حکیم بیگم جیسی عورت کے متعلق اسے ذرا بھی غلط فہمی تھی کہ وہ اس کے بیٹے کی پرورش ان خطوط پر نہیں کرے گی، جن کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ اس نے تو اپنا قول پورا کیا تھا۔ اگر اسے اپنے بیٹے کو پیدا کر کے کہیں چھوڑنا ہی تھا تو وہ اسے کسی چرچ کے حوالے بھی کر سکتی تھی۔ ایسی کوتاہی، ایسی ناقابل تلافی غفلت اس سے کیوں سرزد ہوئی؟

اس نے عمر کو عیسائیت سے متعارف کروانے کے لیے فادر آرون اور سسٹر سوزین کی خدمات حاصل کیں۔ کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کے اور عمر کے بیچ دوری کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بالکل اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا۔ پرنیاں کو احساس تھا کہ اس عمل نے ان کے درمیان حائل اجنبیت کی دیوار پر چند اینٹیں اور چن دی تھیں۔

دھیرے دھیرے وہ پسپائی اختیار کرنے لگی۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتی تھی۔ عمر کوئی پانچویں جماعت کا طالب علم نہیں تھا جس کا پرانا سلیبس منسوخ کر کے نیا سلیبس تھما دیا جاتا اور وہ کوئی احتجاج کیے بنا نئے کورس کی کتابیں رٹنے لگتا۔

ایک مقام پر اسے لگنے لگا کہ عمر کو اپنے ساتھ لے آنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔ اس نے طے کیا کہ زیادہ دن اسے اپنے پاس ٹھہرنے پر مجبور نہیں کرے گی۔ اس کی مرضی کے خلاف اسے باندھ کر رکھنے سے کیا حاصل تھا۔ شوکت صاحب کا آبائی مکان حاصل کرنے کی جدوجہد اس نے تیز کر دی، وہ عمر کی ماں کی طرف سے اس کے لیے پہلا اور آخری تحفہ ہوتا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ مکان

کے کاغذات عمر کے حوالے کر کے اسے واپس جانے کی اجازت دے دے گی، پھر اس کی اپنی رضا، وہ اس کے ساتھ رہنا چاہے یا چلا جائے۔

اس مکان کے حصول میں ایک رکاوٹ درپیش تھی۔ اسے بیعانہ دیے ہوئے بھی ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ بات یوں آگے نہ چلتی تھی کہ شوکت صاحب اور ان کے دونوں بھائی تو مکان بیچنے پر راضی تھے مگر ان کی اکلوتی بہن کو، جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کینیا میں رہتی تھی، اسے مکان کی فروخت پر اعتراض تھا۔

تینوں بھائیوں نے اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور وہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس مکان سے ان کے والدین کی یادیں وابستہ تھیں اور بیس بائیس لاکھ کوئی ایسی بڑی قیمت نہیں تھی، جس کے عوض ان انمول لمحات کو بیچ دیا جائے۔

اس کی ضد سے تنگ آ کر شوکت صاحب نے پرنیاں کو پیش کش کی تھی کہ وہ بیعانہ کی رقم کو دگنا کر کے لوٹانے پر تیار ہیں، لیکن پرنیاں پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اسے ہر حال میں وہ مکان چاہیے تھا۔ شوکت صاحب دونوں طرف سے پھنسے ہوئے تھے۔ بہن کے دستخط لیے بنا مکان کے ملکیتی حقوق منتقل نہ ہو سکتے تھے اور پرنیاں سے کیے ہوئے وعدے کا بھرم رکھنا بھی ضروری تھا۔ اکثر پرنیاں کی اس موضوع پر ان سے بات ہوتی رہتی تھی اور ہر بار وہ کچھ مہلت مانگ کر معاملے کو ٹال دیتے تھے۔

پھر یکا یک عمر نے امریکہ جانے کا اعلان کر دیا۔ پرنیاں کو بے پناہ صدمہ ہوا۔ وہ خود بھی ان محسوسات پر حیران رہ گئی۔ کہاں تو وہ اسے واپس بھجوانے کا عزم کیے بیٹھی تھی اور اب اس کے چند ماہ کے لیے ملک سے باہر جانے کا سن کر اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔

اس نے لفظوں میں اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کیا کہہ کر وہ عمر کو روک لیتی؟ اسے کیا حق تھا اس کی زندگی میں مداخلت کرنے کا۔ عمر نے جب جب وہ تکلیف دہ بات چھیڑی، اس نے خاموشی اور پہلو تہی کی ڈھال سے اسے روک لیا۔ ان ہی دنوں شوکت صاحب نے بتایا کہ ان کی بہن کینیا سے اپنے بچوں کے ساتھ پاکستان آئی ہے۔ وہ اسلام آباد میں شوکت صاحب کے بڑے بھائی نصرت چوہدری کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کی آمد کے پیچھے کاروباری اغراض تھیں اور فقط پانچ دن بعد اسے واپس کینیا چلے جانا تھا۔

''میں ایک، دو دن میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ثروت سے ملے ہوئے بھی کوئی تین سال ہو گئے۔ وہ تو بس پانچ دن رکے گی پاکستان میں، لاہور آنے کا وقت نہیں ہوگا اس کے پاس، میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں اسے منالوں گا۔ فون پر بات کرنے اور روبرو ملنے میں بڑا فرق ہے۔ اپنی باتوں سے ایسا ناک میں دم کروں گا کہ مانے بنا چارہ نہیں رہے گا۔ ایمان سے بڑا ڈھیٹ ہوں۔ جب تک دستخط نہیں کرے گی، جان نہیں چھوڑوں گا، اتنی مدت سے چکنا گھڑا بنی ہوئی ہے۔ سارا دم خم نکال دوں گا میں، آپ بے فکر ہو جائیں۔''

پرنیاں ان کی یقین دہانی سے مطمئن نہ ہوئی۔ ''ایسا تو آپ پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں۔''

''پہلے کی بات رہنے دیں۔ پہلے تو بس فون پہ ہی پانچ، دس منٹ بات ہوتی تھی۔ اتنا وقت تو کسی بات کی تمہید باندھنے میں ہی کٹ جاتا ہے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ عمر کے امریکہ روانہ ہونے سے قبل مکان کے کاغذات اسے دے دوں، میرے لیے یہ بہت ہی ضروری ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''ان شاء اللہ ہو جائے گا، ایک ہی بہن ہے ہماری اور سب کی لاڈلی بھی ہے۔ بس اسی وجہ سے نخرے سہے جا رہے ہیں، لیکن اب اسے اور ڈھیل نہیں ملے گی۔ آپ حوصلہ رکھیں، میں آپ کا کام پورا کر کے ہی لوٹوں گا، بلکہ یوں سمجھیے کہ اسلام آباد جانے کا اصل مقصد ہی یہ ہے۔ ثروت اور بھانجیوں سے ملاقات سے مقدم آپ کا مسئلہ ہے میری نظر میں، ایک سال سے میں نے آپ کو امید دلا کر لٹکا رکھا ہے۔ قسم سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس دفعہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔'' شوکت صاحب نے تسلی دی تھی۔

''مجھے آپ کی نیت پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ آپ یقیناً کوشش کر رہے ہیں۔ اچھا...... کیا یہ مناسب ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤں اور خود آپ کی بہن سے مل کر ان سے درخواست کروں، میرا دل کہتا ہے کہ مجھے اپنے سامنے پا کر وہ اپنے برتاؤ میں نرمی ضرور پیدا کریں گی اور پھر مجھے بھی یہ افسوس نہ رہے گا کہ میں نے پوری کوشش نہ کی۔''

شوکت صاحب نے اختلاف نہیں کیا تھا۔ جوں جوں وہ اس نہج پر سوچتی گئی اس کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ شوکت صاحب کی بہن کو منانے میں وہ لازماً کامیاب رہے گی۔ اس امید نے اس کے اندر خوشی بھر دی۔ اسلام آباد جاتے ہوئے وہ بہت پرجوش تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو کچھ دینے جا رہی تھی۔

نصرت چوہدری کی رہائش گاہ پر جا کر معلوم ہوا کہ ثروت اپنی بیٹیوں کے ساتھ برف باری دیکھنے مری چلی گئی تھی۔ حالانکہ شوکت صاحب اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دے چکے تھے۔ مگر ماں، بیٹیوں کو موسم کی اولین برف باری میں ایسی کشش محسوس ہوئی تھی کہ وہ انتظار کیے بنا ہی روانہ ہو گئیں۔

اگلے روز دوپہر تک ان کے لوٹنے کا انتظار کیا اور فون کرنے پر پتا چلا کہ ابھی وہ مزید وہیں ٹھہریں گی۔ پرنیاں کو ساری بات کھٹائی میں پڑتی محسوس ہوئی، پھر اس نے سوچا جب یہاں تک آ ہی گئی ہوں تو چند میل اور سفر کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس نے اصرار کر کے شوکت صاحب کو ثروت کے پیچھے مری جانے پر راضی کر لیا۔

سردی سے اسے ہمیشہ سے چڑ تھی۔ اور برف باری کا تو تصور ہی خوف زدہ کر دینے والا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ گرم کپڑے بھی ہمراہ نہ لائی تھی۔ لیکن نصرت چوہدری کے گھر مہمان بن کر رہنے کا خیال بھی اسے مناسب نہ لگتا تھا اور کیا خبر تھی کہ ثروت مری سے لوٹنے میں کتنے دن لگا دے گی۔ لہٰذا وہ شوکت صاحب کے ساتھ مری کے مال روڈ پر پہنچ گئی۔

وہ لوگ رات آٹھ بجے کے قریب پہنچے تھے۔ گزرگاہیں، مکانوں کی ڈھلوان چھتیں اور درختوں کی ڈالیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ خون کو منجمد کرتی ہوئی ہوا میں برف کے ذرات تیر رہے تھے۔ پرنیاں کے ساتھ وہ ہی ہوا، جس کا اسے ڈر تھا۔ بڑی شاہراہ سے ثروت کے موٹیل تک، جو ایک پہاڑی ڈھلان پر بنا تھا، فقط دو سو گز کا راستہ بھر بھری برف میں پاؤں دھنسا کر چلنے سے اس کے پیروں کی انگلیوں میں سوجن ہو گئی اور زکام والی کیفیت طاری ہو گئی۔ ثروت کے سامنے جب اس نے زکام کی جلن سے بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنا مدعا پیش کیا تو خدا جانے ثروت کو اس کی حالت پر ترس آ گیا یا وہ اس کی باتوں سے پسیج گئی۔

جب وہ لاہور روانہ ہوئی تو اس کے پاس اپنے بیٹے کو دینے کے لیے ایک تحفہ تھا۔ اس نے عمر کو ساری بات سے قطعی بے خبر رکھا تھا۔ تمام سفر میں وہ سوچتی رہی کہ عمر کا اولین تاثر کیا ہوگا۔ زیادہ امکان تو یہ ہی تھا کہ وہ مکان کی ملکیت قبول کرنے سے انکار کر دیتا، مگر ایک اور صورت بھی ہو سکتی تھی، جس کا پیش آنا اگرچہ مشکل تھا، لیکن اس کے تصور نے پرنیاں کی دھڑکن بے ترتیب کر دی۔

اگر وہ شکریہ کہہ دے اور ایسا کہتے ہوئے مسکرائے تو مسکراتے ہوئے عمر کو ایک نظر دیکھ لینا کیسا تجربہ ہوگا۔ گھر آنے تک وہ امید و بیم کے مابین معلق رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

عمر سیڑھیوں کے نچلے قدمچے پر بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور دہکتے ہوئے انگارے سی رنگت گواہ تھی کہ وہ بیمار تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر پرنیاں کے دل پر چوٹ سی لگی۔ صرف تین دنوں میں وہ اتنا ناتواں کیسے نظر آ سکتا تھا۔ بیگ کو برآمدے کے فرش پر رکھتے ہوئے وہ تیزی سے اس کے قریب گئی۔

''کیا ہوا عمر! تم ٹھیک تو ہو؟'' وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا گال چھونے لگی تو عمر نے چہرہ پرے ہٹا لیا۔

''مجھے دیکھنے تو دو، کہیں تمہیں بخار تو نہیں ہے، ٹھہرو، میں تھرمامیٹر لے کر آتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے کھسیانے انداز میں کہا۔ عمر کے اس طرح سمٹ جانے سے اسے بہت شرمندگی ہوئی تھی۔

''مجھے چھوڑیں، میں ٹھیک ہوں، آپ کا سفر کیسا رہا؟ کافی خوش لگ رہی ہیں۔ یقیناً خوش گوار رہا ہوگا۔''

''ہاں ٹھیک تھا۔ بس میں تھوڑی سی بیمار ہو گئی تھی۔ مگر...... تمہیں تیز بخار ہے۔ تمہاری حالت صاف بتا رہی ہے، مجھے لگتا ہے تمہیں ٹھنڈ لگ......''

''مری میں تو یہاں سے دگنی ٹھنڈ ہو گی یا اس سے بھی کچھ زیادہ۔ ہے نا؟''

''میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔ میں باہر گلی میں رکشا رکواتی ہوں، مجھے پتا ہوتا تو شوکت صاحب کو ہی روک......''

''شوکت صاحب اندر کیوں نہیں آئے؟ آپ نے اصرار تو کیا ہوگا انہیں روکنے کے لیے۔''

''وہ جلدی میں تھے۔ تمہیں باہر جانے سے پہلے کوئی گرم چادر اوڑھ لینا چاہیے۔ میں ابھی اسٹور سے......''

عمر نے مسلسل تیسری دفعہ اس کی بات کاٹی۔ ''آپ جس بھی کام سے گئی تھیں، امید ہے پورا ہو گیا ہوگا۔''

اسے لگا وہ طنز کر رہا تھا۔ شاید وہ اس بات پر غصے میں تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ بیمار پڑ گیا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹین ایجرز عموماً ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آ جایا کرتے ہیں، مگر اس کی آنکھوں میں پرنیاں کو جو نظر آتا تھا وہ ناراضی ہرگز نہیں تھی، وہ کھلی نفرت تھی۔

''کیا بات ہے عمر! تم غصے میں لگتے ہو، کسی بات پر خفا ہو؟''

''خفا؟ میں کیوں خفا ہوں گا؟ خفا تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے کوئی محبت کرتا ہو اور جن کے روٹھ جانے سے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔ میں تو ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا خفا ہونا تو بے وقوفی ہوگی۔ کیا میں آپ کو بے وقوف لگتا ہوں؟''

اس کے پپڑی دار ہونٹ ذرا سے کھنچ گئے اور بے اختیار پرنیاں کا جی چاہا کہ عمر کو اس طرح مسکرانے سے روک دے۔

''کیا آپ کو مجھ سے پیار ہے؟''

اس خلاف توقع سوال نے پرنیاں کو گڑبڑا دیا۔ کئی لمحوں تک اسے کوئی لفظ نہ مل سکا۔

''یہ کوئی پوچھنے کی بات تو نہیں ہے، سب ہی ماؤں کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ یہ تو قدرت کا دستور ہے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... لیکن کتنی ہے وہ محبت جو آپ مجھ سے کرتی ہیں، کم یا زیادہ، یا اوسط درجے کی۔''

''اس سوال کا میں کیا جواب دوں؟ محبت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ یہ بات ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔ ابھی تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔''

''آپ کے پاس میرے کسی بھی سوال کا جواب نہیں۔ میں نے بچپن میں بے جی کی ہمسائی ماسی چھوماں کی بلی ان سے

مانگ کر پال لی تھی۔ وہ خاکستری رنگ کی بھدے جسم والی عام سی بلی تھی۔ وہ بوڑھی اور سست تھی۔ میں اسے جو بھی کرتب سکھانے کی کوشش کرتا، وہ کبھی نہ سیکھ پاتی، اسے مجھ سے کوئی خاص لگاؤ بھی نہیں تھا۔ دودھ پینے کے وقت کے علاوہ وہ مجھ سے دور، دور رہتی تھی۔ اس غیر دلچسپ جانور سے مجھے جتنا پیار تھا وہ اس پیار سے کہیں زیادہ تھا جو آپ کو مجھ سے ہے۔ میں نے کسی ایک رات بھی اسے گھر سے باہر بھول کر دروازہ بند نہیں کیا، کسی ایک دن بھی اس کے برتن میں دودھ بھرنا نہیں بھولا، آپ تو مجھے جان بوجھ کر چھوڑ گئی تھیں۔ پھر بھی آپ کہتی ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے، مجھے حیرت ہے آپ کے بیان پر۔''

اس کا سر جھک گیا۔''عمر! میں نے...... مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں واپس تو آئی نا تمہیں لینے، میں تمہیں بھولی تو نہیں تھی۔''

''کوئی صابن کی ٹکیا کو پانی کے کھلے نل کے نیچے رکھ جائے اور واپس آنے پر امید رکھے کہ وہ اسے اصل حالت میں مل جائے گی، کیا ایسا ممکن ہے؟''

وہ عمر کے پیروں کو دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔

''آپ نے بے جی کو کبھی پیسے بھجوائے؟ میرے اخراجات برداشت کرنا تو آپ کی ذمہ داری تھی، اس سے تو انکار نہیں کر سکتیں آپ۔''

''ہاں، میں نے بھیجے تھے۔ ایک دفعہ پیسے بھیجے تھے، لیکن انہوں نے واپس بھجوا دیے اور خط میں لکھوایا کہ وہ تمہارا سارا خرچ بخوشی اٹھا رہی ہیں اور انہیں کسی مالی مدد کی ضرورت نہیں۔ اسی خط سے تو مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا نام انہوں نے عمر رکھا تھا۔ تم بے شک ان سے پوچھ سکتے ہو۔''

''اٹھارہ سالوں میں بس ایک ہی دفعہ؟ صرف میرا نام جان کر آپ کی تسلی ہوگئی۔ سال میں ایک اسٹیٹمنٹ تو بینک والے بھی اپنے کسٹمرز کو بھجوادیا کرتے ہیں، آپ سے اٹھارہ خط بھی نہ لکھے گئے؟''

اسے عمر کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی۔ اس نے ذرا سی نظر اٹھا کر عمر کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ چھ فٹ اونچے جوان مرد کو روتے ہوئے دیکھنے کے لیے اس کے قد سے اونچی ہمت درکار تھی۔ پرنیاں کی نظریں پھر سے اس کے پیروں پر جم گئیں۔

''کچھ سال پہلے بئیں اور بسنتر نالوں میں سیلاب آیا تھا۔ شکر گڑھ کے اکثر دیہات اس کی زد میں آئے تھے۔ تب تو آپ کو میری فکر ضرور ہوئی ہوگی۔ میری خیریت کی تصدیق کیسے کروائی تھی آپ نے؟ کچھ تو ضرور کیا ہوگا۔''

''میرا یقین مانو عمر! میں سیلاب کی خبریں سن کر بڑی پریشان ہوئی تھی۔ اخباروں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ساری صورت حال سے باخبر رہی۔ پھر جب معلوم ہوا کہ تمہاری طرف آنے والا سیلاب معمولی نوعیت کا تھا تو مجھے اطمینان ہوا۔''

اس نے عمر کو چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھا۔

''معمولی نوعیت کا تھا؟ آپ کی نظر میں غیر معمولی کیا ہے؟ ہم نالہ بئیں کے کنارے بستے تھے۔ پانی سب سے پہلے ہمارے گاؤں پر چڑھ دوڑا۔ تین دن اور تین راتیں ہم نے ایک ٹیلے پر گزاریں۔ حکیم اجمل کا بیٹا، بہو اور دو پوتیاں ڈوب گئیں۔ اخترے موچی کو سانپ نے کاٹ لیا۔ ماسی چھوماں کی بھینس اور اس کی بچھیا دیوار کے نیچے آ کر مر گئیں۔ نمبرداروں کی حویلی جو گاؤں کی سب سے مضبوط عمارت تھی، اس کی برجیاں ٹوٹ کر بہہ گئیں۔ کچے گھر تو گارے کے ڈھیر بن گئے تھے۔ معمولی سے اوپر کا درجہ پانے کے لیے سیلاب کو اور کیا کرنا چاہیے تھا؟''

رونے کے باعث عمر کی آواز گلے میں گھٹ رہی تھی۔

اس نے اپنے رخساروں کو بھیگتے ہوئے محسوس کیا۔ ہچکچاتے ہوئے آگے جھک کر اس نے عمر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اسے بھول گیا تھا کہ کچھ دیر قبل وہ اس کا ہاتھ جھٹک چکا تھا۔ اس بار بھی عمر نے یہ ہی کیا تھا۔ اپنا ہاتھ پرنیاں کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ آپ مجھے باپ کا نام نہ دے سکیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ اپنے نام کا لیبل میرے ماتھے پر چسپاں کر آئیں۔ ساری زندگی مجھے آپ کے حوالے سے پکارا گیا۔ کوئی آپ کو گالی دے یا مجھے، بات تو ایک ہی ہے نا، میں نے کسی گالی دینے والے کو کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ جواب میں کہنے کو میرے پاس تھا ہی کیا۔ جس شخص کے چھاتے میں سیکڑوں چھید ہوں۔ وہ برستی بارش میں کھلے آسمان تلے کھڑا ہو تو بھیگنے سے بچنے کی امید کیسے رکھ سکتا ہے؟''

پرنیاں کے آنسو اب تو اتر سے بہنے لگے تھے۔ اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔

''بچپن میں مجھے آپ کو دیکھنے کا بڑا تجسس ہوا کرتا تھا۔ بے جی سے آپ کے قصے سنتے سنتے میں تھکتا نہ تھا۔ جب یہاں آ کر آپ کا چہرہ غور سے دیکھا تو مجھے کراہت سے ابکائی آ گئی۔ میری آنتیں، میرے حلق میں آ گئیں، میں کس شے کی جستجو کرتا رہا؟''

پرنیاں کو لگا وہ خشک زمین تھی، جس میں ہل کی پھالیں چل رہی تھیں۔ وہ بلبلا کر اونچی آواز سے رونے لگی۔

''تمہارے اندر میرے لیے اتنی نفرت ہے؟ میرے بس میں ہوتا تو کبھی تمہیں خود سے علیحدہ نہ کرتی، میں بہت مجبور تھی۔''

''آپ کی سابقہ مجبوریوں کا حساب رکھنے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے تو ان مجبوریوں سے تکلیف ہے جو اب آپ کو بے قرار رکھتی ہیں، جو آپ کو یہاں سے وہاں بھگائے لیے پھرتی ہیں۔''

پرنیاں بالکل سمجھ نہ سکی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے پوچھنا چاہا، مگر آنسوؤں نے اس کی آواز نہ نکلنے دی۔

''آپ مجھے یہاں کیوں لائیں؟ جب آپ میں خود پر قابو پانے کی اہلیت نہیں ہے تو مجھے اس کھیل کا تماشائی بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے لیے یہاں رہنا صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ میں اندھا اور بہرہ ہوتا لیکن میں کیا کروں، یہ دونوں خوبیاں مجھ میں نہیں ہیں۔ میں جس بھی حال میں رہ رہا تھا آپ مجھے رہنے دیتیں، کیوں کیا آپ نے ایسا؟''

اس نے گردن اٹھا کر دھندلی آنکھوں سے عمر کا برہم چہرہ دیکھا۔ ''میں بالکل نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو۔ آج تم بول ہی پڑے ہو تو کچھ پوشیدہ مت رکھو، جو بھی تمہارے دل میں ہے، کہہ ڈالو۔''

''ریاکاری مت کریں، اپنے اعمال کی ذمہ داری تو قبول کریں، کم از کم میرے پاس اپنی ماں کے کردار میں فخر کرنے کے لائق کوئی ایک بات تو ہو، حیرت ہے جو مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے، وہ کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔''

اس کا منہ کھل گیا۔ وہ کسی دق کی ماری بڑھیا کی طرح ہانپ رہی تھی۔

عمر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔ پرنیاں نے آوازیں دیں، مگر وہ ان سنی کر کے تیزی سے زینے پھلانگتا رہا۔ وہ دوبارہ نیچے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔ پرنیاں کے قریب سے گزرتے ہوئے صحن کے وسط میں جا کر اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور گٹھڑی میں بھرا سارا سامان فرش پر ڈھیر کر دیا۔ وہ پرنیاں کی جمع کی ہوئی ویڈیو کیسٹس تھیں۔ ان کے ساتھ سنو وائٹ کا تابوت بھی تھا جو بلندی سے گرنے کے سبب کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا اور اس کے اندر موجود چیزیں بکھر گئی تھیں۔

پرنیاں کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس بت بنی کھڑی تھی۔ پھر اس نے عمر کو باورچی خانے میں سے گیلن اور ماچس کی ڈبیا اٹھا کر لاتے دیکھا۔ وہ ان چیزوں پر پیٹرول چھڑکتے ہوئے تیز تیز بول رہا تھا۔

''آپ میری ماں ہیں، میں آپ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ اللہ کو ناپسند ہے۔ میں خودکشی نہیں کر سکتا، یہ بھی اللہ کو ناپسند ہے، میں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں۔''

اس نے گیلن کا تمام پیٹرول ان چیزوں پر انڈیل دیا تھا۔ معاً پرنیاں کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی، وہ بھاگتی ہوئی صحن

میں آئی تھی۔

''انہیں نہ جلاؤ، تمہیں خدا کا واسطہ، ایسا نہ کرو، میں تمہیں ان کے متعلق سمجھا سکتی ہوں۔''

اس نے عمر کا ہاتھ پکڑ کر ماچس چھیننے کی کوشش کی تھی، مگر اس سے قبل وہ جلتی ہوئی دیا سلائی نیچے پھینک چکا تھا۔ پھر عمر نے ایک ایسا منظر دیکھا جو نا قابل فہم اور انتہائی نفرت انگیز تھا۔ اس کی ماں فرش پر دوزانو بیٹھی اپنے سر کی چادر کی مدد سے بھڑکتی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس حال میں دیوانہ وار روتے ہوئے وہ کسی جاہل فقیرنی جیسی بدصورت لگ رہی تھی۔ اس کے نقوش اس حد تک بگڑے ہوئے تھے کہ وہ پہچانی نہ جاتی تھی۔

جب آوا دہکانے میں حکیم بیگم سے اندازے کی غلطی ہو جاتی تھی تو برتن ضرورت سے زائد حدت ملنے پر جھلس کر بدوضع ہو جاتے تھے۔ اس وقت عمر کو وہ عورت ایک ایسا ہی مسخ شدہ برتن دکھائی دیتی تھی۔ اسے تراشنے میں کمہار نے جو محنت کی تھی، وہ سب رائیگاں چلی گئی تھی۔

آگ بجھانے کی جدوجہد میں پرنیاں کے ہاتھ جل گئے تھے۔ عمر نے اسے درد سے چلاتے سنا تھا۔

''آپ میرے جہنم کے لیے فکر مند تھیں۔ یہ آپ کا جہنم ہے جو آپ کے سامنے جل رہا ہے۔'' وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے میں آ کر اپنے کپڑے اور دیگر سامان بیگ میں رکھنے لگا۔ جب وہ بیگ اٹھائے ہوئے باہر نکلا تو پرنیاں کو ننگے سر اسی جگہ پر بیٹھے ہوئے پایا۔

''میں گاؤں جا رہا ہوں، اپنی کچھ چیزیں لے جا رہا ہوں، جو باقی سامان رہ گیا ہے وہ پھر کسی دن آ کر لے جاؤں گا۔''

پیچھے دیکھے بنا وہ دہلیز پار کر گیا تھا۔

✠ ✠ ✠

وہ کمرے میں ادھر سے ادھر گھومتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

''تیرے لیے کچھ مشکل تھا کہ عمر کو مجھ سے نفرت کرنے نہ دیتا؟ اس کا دل پھیر دیتا۔ میں زندگی میں ایک آخری بار خوش ہونا چاہتی تھی۔ میں جانتی ہوں، مجھے ایسی خواہش کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن میں خوش فہمی میں پڑ گئی تھی۔ میں نے سوچا اب تک تو مجھے معاف کر چکا ہوگا۔ میں سمجھی، میں نے اپنے حصے کی سزا کاٹ لی ہے۔ میں کب سے صلیب پر معلق رس رس کر مر رہی ہوں۔ میں کیا رہ گئی ہوں۔ ایک بے روح چمڑے کی پتلی کھوکھلی بالکل خالی، کیا تجھے اتنی سزا کافی نہیں لگی۔''

وہ دیواروں کے قریب سے گزرتے ہوئے ان پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں دبی ہوئی چیز پسینے سے بھیگ چکی تھی اور اس کی ہتھیلی میں چبھ رہی تھی۔ اس نے لحہ بھر رک کر مٹھی کھولتے ہوئے اس چیز کو دیکھا اور لمبی سانس بھرتے ہوئے دوبارہ ٹہلنے لگی۔

''میں نے گناہ کیا، میں مانتی ہوں اور میں ساری زندگی شرمسار رہی۔ پر تو، تو خداوند ہے۔ میری غلطی پر درگزر کرنے میں تجھے کیا عار تھی۔ معافی مانگتے مانگتے میرا منہ سوکھ گیا۔ تیری ناراضی پھر بھی دور نہ ہوئی۔ تو نے مجھے اس کے دل سے نکال دیا تو اسے میرے دل میں کیوں رہنے دیا؟ تو نے میری تکلیف کم کیوں نہ کی۔ اس لیے کہ میں نے نافرمانی کی تھی۔ اگر بچہ ماں سے ہاتھ چھڑا کر بھاگے تو کیا وہ اسے نظر سے اوجھل ہونے دیتی ہے؟ تو نے مجھ سے نظر کیوں ہٹالی؟''

اس نے مٹھی میں دبا ہوا بلیڈ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں پھنسا کر بائیں کلائی پر تیزی سے پھیر دیا۔ اس نے کٹی ہوئی جلد کے سفید کناروں کو دور ہٹتے اور ان میں سے خون ابلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بازو کو غیر ارادی جھٹکا لگا تھا۔ اس کا ہاتھ کارنس پر رکھی

گھڑی سے ٹکرایا اور گھڑی فرش پر گر گئی۔

اس نے بائیں ہاتھ کی سُن ہوتی ہوئی انگلیوں میں بلیڈ پکڑ کر دائیں کلائی کی نسیں بھی کاٹ ڈالیں۔ دونوں بانہیں پہلوؤں میں لٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس نے دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا، مگر جسم سے توانائی تیزی سے نچڑتی جا رہی تھی۔ جب نقاہت حد سے سوا ہو گئی تو اس نے اوپر کی سمت چہرہ اٹھایا اور بڑے درد سے چلائی۔

''الوہی الوہی لما شبقتنی۔'' (اے میرے خدا، اے میرے خدا، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ بائبل)



''گندا، چوہڑہ......'' حکیم بیگم نے لرزتا ہاتھ اٹھا کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔

عمر کو یاد نہیں تھا آج سے پہلے کبھی حکیم بیگم نے اس کو تھپڑ مارا ہو۔ اگر وہ اسے انتہائی عاجز کر دیتا تو زیادہ سے زیادہ وہ اس کا بازو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑتی اور وہ دو گالیاں بھی شدید طیش میں ہونے کے، علاوہ کبھی زبان پر نہیں لاتی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''وے کاکا! تیری جیبھ (زبان) سے زہر دے تبکے (قطرے) نکلے ہیں، تے میرا لوں لوں ساڑ دیا ہے (میرا رواں رواں جل گیا ہے)۔ تیری ماں وچ کوئی عیب ہوتا تے وہ تجھے گواہ بنان لئی اپنے کول کیوں رکھتی؟ میں نے تجھے کی (کیا) بنایا تے تو کی بن گیا، تو عیب لبھن والا (تلاش کرنے والا) کھوجی کنج (کیسے) بن گیا۔ لکی ہوئی ٹوم واسطے گودڑ پھرولنا چور دا کم ہے۔ (چھپے ہوئے زیور کے لیے میلے چیتھڑوں کو کھنگالنا چور کا کام ہے) تو چور کیوں بنا؟ گناہ گاراں دی منصفی کس نے تیرے حوالے کی، جیہڑا (جو) عیب رب نے کج دیا (چھپا دیا) تو نے اس دا پردہ اتارن والا کون ہے؟ اپنی ماں تے تہمت کیوں جوڑی تو نے، رب دا خوف کتھے گیا (کہاں گیا) تیرے دل وچوں؟ میری ساری سکھائی پڑھائی تو نے سواہ (راکھ) کر چھوڑی۔ ہنے (ابھی) واپس جاتے ہتھ جوڑ کے معافی منگ اپنی ماں سے، ظلم کیا ہے تو نے، جے اکھاں ویکھی......''

''بس کر بے جی! یہ سبق بہت پڑھے ہیں میں نے۔'' وہ زور سے چلایا تھا۔ ''تیری نظر میں، میں اور وہ عورت ایک برابر ہیں۔ دونوں کو تو نے پناہ دی۔ تو میری سگی ہوتی تو میری بات سن کر مجھے سینے سے لگا کر حوصلہ دیتی، پر تجھے تو صرف نیکی کمانے سے مطلب ہے، کوئی گھر سے بھاگی ہوئی عورت ہو یا کوئی لاوارث بچہ۔ تیرا سلوک سب کے ساتھ ایک جیسا ہے۔ تو نے میری ماں کو پناہ دی۔ وہ تجھے چھوڑ گئی، تو نے مجھے پاس رکھ لیا۔ پھر مجھے لاہور بھیج کر تو نے صالحہ اور مزمل کو گھر میں بسا لیا۔ تو اپنے دل کے آگے بے بس ہے، تجھ سے نیکیاں کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ میں تیری ایک نیکی ہوں اور بس۔''

حکیم بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ دکھ سے چور آواز میں اس نے پوچھا۔ ''میں تیری سکی (سگی) نئیں ہوں کاکا؟''

''نہیں، میرا اس پورے جہان میں کوئی سگا نہیں ہے، میں تیرا اپنا خون نہیں ہوں نا، میرے درد پر تجھے ویسی تکلیف نہیں ہوتی جیسی تجھے اپنی سگی اولاد کے درد پر ہوتی ہے۔ باجی آمنہ کے لیے تو کیسے اللہ کے سامنے گڑگڑاتی تھی۔ تو نے میرے لیے ویسے دعا کیوں نہ مانگی جیسے تو نے باجی آمنہ کے لیے مانگی، تو نے میرے لیے اللہ سے سکون کیوں نہ مانگا؟ تیری تو وہ سنتا ہے، اس سے اپنی بات منوانے کا ڈھنگ آتا ہے تجھے، تو نے میرے لیے کیوں نہ منایا اسے؟''

عمر کا گلا رندھ گیا تھا۔

بکائن تلے کھاٹ پر ڈھیر ہوتے ہوئے وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

''نہ فکر کر، میں ابھی تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا۔ تین، چار دن سے بخار ہے مجھے، اس لیے سارا جسم دکھ رہا ہے، جو اگلی بس

نکلے گی اڈے سے، اس پر بیٹھ جاؤں گا، اتنی دیر مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دے۔''
اس نے ماتھے پر ایک کھردری جلد والے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ حکیم بیگم گر بہ پائی سے چل کر آئی تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ وہ سن ہی نہ پایا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک طرف کھسکتے ہوئے حکیم بیگم کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔
''تیرا پنڈا گرم نئیں ہے۔ تاپ اتر گیا ہے۔ روٹی لے آؤں تیرے لئی۔ فیر آ کے بیٹھتی ہوں۔''
''مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''آپی (خود ہی) لگ جائے گی۔''
اس کا انکار سنے بغیر وہ کھانا لے آئی اور نوالہ بنا کر ہاتھ اس کے منہ کے قریب کیا۔ وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا، لیکن کافی دیر تک وہ کانپتا ہوا ہاتھ اس جگہ سے پیچھے نہ ہٹا تو اس نے آہستگی سے منہ کھولتے ہوئے نوالہ لے لیا۔ پھر وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانے لگا۔ حکیم بیگم نے بھی کوئی بات نہ کی۔ جب وہ آفتابے سے عمر کے ہاتھ دھلا رہی تھی تو لجاجت سے بولی۔
''چل معاف کر دے، مجھ سے غلطی ہو گئی، میں تجھے مار بیٹھی، بس غصہ آ گیا تھا۔ مسیت (مسجد) والے پیپل سے ودھ (زیادہ) بڈھی ہوں۔ دماغ ہی کم نئیں کرتا چنگی طرح۔''
رعشے کی بیماری نے ہاتھوں کے بعد اس کی گردن کے پٹھوں کو تسخیر کر لیا تھا۔ اس کا سر بلا ارادہ دھیرے دھیرے لرزتا تھا۔ وہ واقعی بہت بوڑھی ہو چکی تھی۔
عمر کئی ثانیے ساکن پلکوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ اس عورت کا کیا لگتا تھا؟ وہ عورت اس کی کیا نہ لگتی تھی؟
وہ منہ پھیر کر مخالف سمت میں دیکھنے لگا۔ اس نے حکیم بیگم کے جسم کے بوجھ سے چارپائی کے بان کو دبتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ عمر کے گال پر آ ٹھہرا اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے وہ بولی۔ ''ہن روسا چھڈ دے کاکا! (اب ناراضی جانے دے)۔ تو نے ہور بکواس کرنی ہے تے بے شک دی کر لے پر منہ تے جندرا (تالا) مار کے نہ بہ (بیٹھ)۔ تیری چپ سے اندر ڈولتا ہے میرا۔ آمنہ واری میرے کولوں کوتاہی ہوئی، پتا نئیں اس دی سنبھ پل (پرورش) چ کی گھاٹا (کمی) رہ گیا۔ وہ کی (کیا) بن گئی ہے۔ رب رسولؐ داناں نئیں سنا کدی اس دی زبان وچوں۔''
اس سے قبل حکیم بیگم کی زبان پر کبھی آمنہ کی شکایت نہیں آئی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔
''بیبا! تو میری کھٹی پوٹلی (جمع پونجی) ہے، میری کل کمائی، تو نہ ڈول۔ ازمائش تے کھرا ہو جا، تیرا دکھ مجھے فنا کر دے گا۔ میں نئیں سہہ سکدی کاکا! مَیں سہہ سکدی۔ گھمیار (کمہار) اپنے بھانڈوں کو بازار تک پہنچان واسطے لکھ کھکھیڑ (جتن) کرتا ہے۔ خاص نسل دی مٹی لے کے کٹ پیس کے باریک کرتا ہے، اس نوں گون توں پہلاں پک کرتا ہے (اسے گوندھنے سے قبل اطمینان کرتا ہے) کہ کوئی روڑ (پتھر) کوئی کنکری نہ رہ جائے۔ دھیان لگا کے بھانڈے گھڑتا ہے، من موہنیاں شکلاں جو گاہک دی اکھ چ کھب جائیں۔ حساب کتاب نال آوی بناتا ہے۔ سون بھدروں (ساون بھادوں) چ ہتھ روک رکھتا ہے کہ مینہ کنی نال بھانڈیاں دا نقصان نہ ہو فیر وی کئی نقص رہ جاتے ہیں۔ کسی دی گھڑائی ٹھیک نئیں ہوتی، کوئی پلا (کچا) رہ جاتا ہے، کوئی بہتا (زیادہ) پک جاتا ہے۔ جتھے (جہاں) مقدراں دی گل ہو اوتھے (وہاں) ساریاں تدبیراں بے کار۔ خرید کرن والے نوں بدرنگی ٹھوٹھی بھا جائے تے رب دی رضا۔ نصیب اگے کسی دی پیش نئیں جاندی (نصیب کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا)۔''
''بے جی! تقدیر سے میں منکر نہیں۔ مانتا ہوں آزمائش اللہ کی جانب سے ہے اور اس کی رضا پہ راضی رہنا چاہیے پر تو نہیں جانتی میں نے کیا سہا ہے۔ میں کہاں تک برداشت کروں اور تجھے پتہ ہے، اس نے مجھے مذہب بدلنے پر مجبور کیا؟''
اگر وہ امید کر رہا تھا کہ یہ بات سن کر حکیم بیگم اس کی ماں کے خلاف بھڑک جائے گی تو اسے مایوسی ہوئی، وہ ذرا سا مسکرائی

تھی۔

''اپنا قد دیکھا ہے تو نے، کندھ سے دو گٹھاں (دو بالشت) اچا ہے۔ تیری ماں غریبنی کلی عورت تجھے مجبور کر سکدی ہے بھلا؟ کوئی کرن والی گل کر۔''

عمر کو اس موقع پر اس کا مذاق کرنا اچھا نہ لگا۔

''اس نے مجھے ویسے ہی مجبور کیا جیسے تو نے مجبور کر دیا تھا، اس کے ساتھ لاہور جانے پر۔''

''مجھ سے تجھے پیار ہے، اس لئی مجبور ہو گیا تھا۔ اس نال وی پیار کرتا ہے کاکا؟''

''میرے لفظ نہ پکڑ بے جی!'' اس نے جھلا کر کہا۔ ''اس نے مجھ پر بڑا دباؤ ڈالا، مجھے عیسائی عالموں سے ملواتی رہی۔''

''فیر کی ہو گیا، تو من گیا اس دی بات؟ تیرے دل سے اک واج (آواز) وی آئی کہ تو مسلمان نہ رہے؟''

اس کا سر خود بخود انکار میں ہل گیا۔

''تے بس درگزر کر۔ اس نے اپنا کم کیا، تو اپنا کم کر، جواب دے دے؟ صاف بول کہ تجھے منظور نئیں پر اپنی ماں لئی دل چے گنڈھ نہ مارا (گرہ نہ دے)۔ تو نے اس کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے، تیرے اندر ورم بن گیا، تو نے آپی سوچ لیا کہ جو تجھے مسلمان رہنے نئیں دیتی وہ کوئی نیک عورت نئیں ہو سکدی۔ تو نے لیک ڈال دی (لکیر کھینچ دی) کہ وہ بد ہے۔''

''نہیں صرف یہ ہی ایک بات تو نہیں ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''اس عورت کے ساتھ رہنا ناممکن ہے، میں پھر کچھ کہوں گا تو تجھے غصہ آئے گا۔''

حکیم بیگم نے ٹھنڈا ہوکا بھرا تھا۔ ''آٹا ویکھ کے کہتا ہے چٹا دھوڑا ہے، نہ تو جانے نہ چکی دے پڑ جانیں کہ آٹا بنن لئی کنک دے دانے نے کی بھو گیا۔ (آٹا دیکھ کر کہتا ہے یہ تو سفید دھول ہے، نہ تو جانتا ہے نہ چکی کے پاٹ جانتے ہیں کہ آٹے میں ڈھلنے کی خاطر گندم کے دانے کو کیا بھگتنا پڑا)۔ ٹیوے (اندازے) نہ لگا۔ تجھے کی پتا کس دی کنی (کتنی) ازمائش ہوئی۔ کس تے کی گزر گئی۔ دعا منگ اپنی ماں لئی، دلوں منوں ہو کے منگ (صدق دل سے مانگ)۔ سب خیر ہو جائے گی، رب مشکل ٹال دے گا۔''

''جب اللہ نے سارے فیصلے پہلے ہی کر دیئے ہیں تو دعا مانگنے کی کیا حاجت ہے، میں کیوں دعا مانگوں؟ وہ میری ہر فرمائش سے واقف ہے، پھر زبان سے کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟''

حکیم بیگم کی آنکھوں میں اسے ناپسندیدگی نظر آئی تھی۔

''شاوا کاکا! بڑی سیانف (دانائی) والی گل کی ہے تو نے۔''

اس کے طنز نے عمر کو نادم کر دیا۔ ''کبھی کبھی میری عقل جواب دے جاتی ہے۔ کئی سوال ایسے ہیں جو کسی کلیے سے حل نہیں ہوتے۔''

''ہر سوال دا جواب ڈھونڈے گا تے سوالاں جوگا رہ جائے گا۔ اپنی عقل توں ودھ کے (سے زیادہ) نہ سوچا کر۔ ہر شے دا اک طریقہ مقرر ہے۔ تے اس طریقے تے چلنے وچ بھلائی ہے۔ کدی (کبھی) ایسا ہوا کہ پوہ ماہ (سردی کے مہینے) وچ کھمباں (کھمبیاں) نکل آن۔ سون بھدروں دے دیہاڑ ہوں گے، مینہ وسے گا، بھڑاس (حبس) ہو گی، فیر کھمب نکلے گی۔ اج تو کہتا ہے، میں دعائیں مانگتا، کل کہے گا میں روٹی دی برکی (نوالہ) توڑ کے منہ دے اندر کیوں رکھوں، آپی کیوں نہ پیٹ بھر جائے میرا؟ سدائیا! منگنا ادب وچ شامل ہے۔ مخلوق عاجز ہے خالق دے اگے۔ میرے منہ چے سواہ (راکھ) پڑے تو اپنے بنان والے دا ادب نئیں کرتا؟''

عمر نے شدید جھنجھلاہٹ محسوس کرتے ہوئے پہلو بدلا تھا۔

''میں اس عورت کے لیے کیا مانگوں؟ میرے دعا کرنے سے اس کی زندگی میں کیا بہتری آ سکتی ہے؟ میں کوئی پاگل تو نہیں ہوں جو ایک ناممکن چیز مانگوں۔''

''جو ہر ناممکن نوں ممکن کر سکدا اے، اس داناں ہی اللہ ہے۔ تو ہتھ اٹھاتے سہی، جھولی اڈتے سہی (جھولی پھیلا تو سہی)۔ یقین کرنا سکھ (سیکھ)، شک تے وسوسے کو اپنے نیڑے (پاس) نہ آنے دے۔ یہ تیرے دشمن ہیں۔ یہ دعا کو بے اثر کر دیتے ہیں۔ دعا فرشتے دے پروانگ کوری ہونی چاہی دی اے (دعا فرشتے کے پر کی طرح بے داغ ہونی چاہیے) شک دا اک تبکا (بوند) وی نہ ہو اس تے۔'' حکیم بیگم کھاٹ کے پائے پر ہاتھ سے وزن ڈالتے ہوئے اٹھ گئی۔ اور جاتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہنے لگی۔

''اج رات ایتھے (ادھر) رہ، آرام کر، کل تیری طبیعت بھلی ہو جائے تے لاہور چلے جانا۔ آوے دا سیک (تپش) سخت سہی، پر اس دے بنا اک چپنی (ہانڈی وغیرہ کا ڈھکن) دی نئیں بن سکدی۔ گارے تے پکے ہوئے باسن دا فرق سمجھ۔''

اگلے روز عصر کی نماز کے دوران اس کا دھیان بار بار بھٹک رہا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل مسجد سے باہر کی دنیا میں اٹکا ہوا تھا۔ حکیم بیگم نے پھر اسے جانے کو نہیں کہا تھا۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اسے جانا ہی پڑے گا۔ بھلے اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔

امام صاحب نے ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' کی صدا دی تو وہ چونک گیا۔ آخری رکعت تمام ہو گئی تھی اور اپنے تئیں وہ ابھی دوسری رکعت کے قعدہ میں تھا۔

''اللہ کے گھر میں بھی مجھے سکون نہیں تو پھر دنیا میں ایسی کون سی جگہ بچتی ہے جہاں جا کر میرا اضطراب تھم جائے۔''

وہ ذہنی پراگندگی کی انتہا پر تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے تصور میں آپا کا وجود آ گیا تو شاید حکیم بیگم کی باتوں کا اثر تھا کہ عمر نے اس کی خاطر دعا کرنے کی نیت کی۔ بہت دیر تک وہ کوئی موزوں الفاظ تلاش کرتا رہا، لیکن اسے کچھ نہ سوجھا۔

''اس کے لیے بھلا میں کیا مانگ سکتا ہوں، میرے دعا کرنے سے کیا ہوگا؟ وہ بدل جائے گی یا اس کے لیے میرا دل بدل جائے گا؟ بے جی تو عام انسانوں سے اوپر کے درجے کی باتیں کرتی ہے۔ اس کی اپنی ہی فلاسفی ہے۔ دلیل اور منطق کو وہ مانتی ہی نہیں۔ میں اس کی طرح دعا نہیں مانگ سکتا۔ جب کوئی بدلاؤ آنا ممکن ہی نہیں تو میں کیوں دعا کروں۔''

اس کے ہاتھ بے جان ہو کر ہوا میں تیر گئے۔ اس نے محراب کے اوپر نصب گھڑیال میں وقت دیکھا تھا۔

لاہور جانے والی بس کے اڈے سے نکلنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ گھر آ کر اس نے حکیم بیگم سے اجازت لی اور لاری اڈے کی جانب چل دیا۔

✠ ✠ ✠

بار ہا اطلاعی گھنٹی بجانے پر جب آپا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ تشویش میں گھر گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا تو صاف ظاہر تھا کہ آپا گھر میں ہی تھی۔ شاید وہ سو رہی ہوگی، لیکن آپا اتنی جلدی سونے کی عادی نہ تھی اور ایسی گہری نیند تو وہ کبھی نہ سوتی تھی اور ساری بتیاں کیوں بجھی ہوئی تھیں؟

سناٹا اور اندھیرا یکجا ہو جائیں تو کتنے معنی خیز اور پر ہول ہو جاتے ہیں۔

وہ ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹنے لگا۔ پھر بدحواسی میں بند کواڑوں کو اندر کے رخ دھکیلنے لگا۔ وہ بلند آواز میں آپا کو پکار رہا تھا۔

''دروازہ کھولیں آپا! میں کب سے باہر کھڑا ہوں، کیا آپ کو دستک کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ دروازہ کھول دیں آپا، آپا۔''

پھر اس نے سوچا کہ غالباً آپا غسل خانے میں ہوگی۔ تب ہی دروازہ کھلنے میں اتنی تاخیر ہو رہی تھی اور بھلا کیا وجہ ہو سکتی

تھی۔ یہ فرض کر کے اس نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا اور انتظار کرنے لگا۔

بہت وقت بیت جانے پر بھی جب گھر میں چھایا ہوا سکوت نہیں ٹوٹا تو اس کی تشویش اندیشوں میں بدلنے لگی۔ چند مزید آوازیں دینے کے بعد وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے دور ہو گیا اور پھر تیزی سے دوڑتے ہوئے جب دیوار کے نزدیک پہنچا تو ٹھوکر مارنے کے انداز میں ایک پاؤں دیوار پر مارا، اس کی مدد سے جسم کا بوجھ اوپر دھکیلا اور منڈیر پر ہاتھ جما دیے۔

نو فٹ اونچی دیوار سے جست لگا کر وہ صحن میں اتر گیا تھا۔ گاڑھی تاریکی میں اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے وہ برآمدے میں آیا۔ صحن اور برآمدے کی بتیاں جلائیں اور بے قراری سے آپا کے کمرے کی طرف نگاہ اٹھائی، دروازہ نصف سے زائد کھلا ہوا تھا۔

''کیا آپ سو رہی ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا آپا، آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

کمرے کی جانب اٹھتے ہوئے اس کے قدم جانے کیوں اتنے وزنی ہو گئے تھے۔ چلتے ہوئے وہ پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ کمرے کی بتی روشن کرنے پر جس پہلی چیز پہ اس کی نظر پڑی وہ آپا کے پاؤں کا تلوا تھا جو اتنا سفید تھا کہ سنگ مرمر کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا، پھر اسے خون کے چھینٹے دکھائی دیے تھے۔ اس کے اعضا بھر بھری ریت میں ڈھل گئے۔ بلب کی روشنی اسے ناکافی محسوس ہونے لگی تھی۔

آپا کارنس کے نیچے دیوار کی جڑ میں آڑی لیٹی تھی اور جا بجا منجمد خون کے لوتھڑے دیوار اور فرش سے چمٹے تھے۔ آپا کا چہرہ، جو انتہائی زرد تھا اور بعض جگہوں پر نیلگوں ہو رہا تھا، چھت کی سمت اٹھا ہوا تھا۔

عمر نے اسے آواز دینا چاہی اور گھگھیا کر رہ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ ایسی رنگت والے چہروں کو آوازوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جب گاؤں کے بہشتی کے بیٹے کا بازو گھاس کترنے والے ٹوکے میں آ کر کٹ گیا تھا تو اس کا چہرہ بھی ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں کھاٹ کے گرد جمع ہو کر کیسے گلے پھاڑ کر اسے پکارتی تھیں۔ ان کی چیخوں سے سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے مگر اس نیلاہٹ زدہ پیلے چہرے والے لڑکے پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی عمر نے آپا کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ ایسے موقعوں پر نبض محسوس کی جاتی ہے، دھڑکن اور سانس کی آمد و رفت پر دھیان دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے حواس قائم ہوتے تو شاید ان میں سے کوئی بات اسے سجھائی دے جاتی۔ وہ تو اتنا تعین بھی نہ کر پا رہا تھا کہ آپا کے بدن پر زخم کہاں کہاں آئے تھے۔

پھر جانے کیسے اسے ریسکیو سروس والوں کا خیال آ گیا۔ ٹیلی فون پر گھر کا پتا لکھواتے ہوئے اس نے آپریٹر سے جلدی ایمبولینس بھجوانے کی التجا کی تھی۔ آپا کے پاس فرش پر بیٹھ کر وہ ایمبولینس کا انتظار کرنے لگا۔

اپنی پوری زندگی میں اس نے کسی شے کا اتنی بے صبری سے انتظار نہیں کیا ہوگا۔ اس کے پیروں کے بیچ فرش پر وہ ٹائم پیس پڑا تھا جو عموماً کارنس پر دھرا رہتا تھا۔

اسے فون کیے ہوئے اندازاً پانچ منٹ گزر چکے تھے۔ اضطراری کیفیت میں ہاتھ بڑھا کر اس نے ٹائم پیس اٹھا لیا تھا۔

اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور سوئیاں ساکت تھیں۔ شاید وہ کارنس سے نیچے گرا تھا اور دھچکے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔

اسے واپس زمین پر رکھتے ہوئے عمر کی نظریں دوبارہ رکی ہوئی سوئیاں میں الجھی تھیں۔ چار بج کر چھ منٹ کا وقت اس گھڑی میں تھما ہوا تھا۔ اس کی سانس رک گئی۔

چند گھنٹوں قبل عین اسی وقت اس نے آپا کے لیے دعا کرنے کا ارادہ ترک کیا تھا۔ تب مسجد کے گھڑیال میں بالکل یہی وقت تھا۔ اسے لگا وہ خون آپا کے جسم سے نہیں اس کے اپنے جسم سے بہا تھا۔ اس سرد کمرے میں جہاں موسم کی خنکی کے ساتھ موت کی

ٹھنڈک بھی تھی، وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

یہ تصور کرنا مشکل نہیں تھا کہ ٹائم پیس آپا کا ہاتھ لگنے سے گرا ہوگا اور شاید ایسا تب ہوا ہوگا جب اس پر جان نکلنے کی تکلیف طاری ہوئی ہوگی۔

تو کیا اس کی دعا آپا کا مقدر بدل سکتی تھی؟

اگر وہ اللہ سے آپا کے لیے عافیت مانگتا تو کیا وہ دے دیتا؟

کیا اسے یہ منظر دیکھنے کو نہ ملتا جو وہ اب دیکھ رہا تھا؟

حکیم بیگم نے بیس سال آمنہ کی اولاد کے لیے دعا مانگی تھی اور ایک پل بھی بے یقین نہ ہوئی تھی کہ اس کی دعا قبول نہ ہوگی اور وہ بیس سیکنڈ بھی شک میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اسے تو ہاتھ اٹھانے سے قبل ہی اپنی دعا کے رد ہو جانے کا یقین تھا۔

آپا کے ٹھنڈے اور اکڑے ہوئے خون آلود ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ خلا میں گھورنے لگا تھا۔

✠ ✠ ✠

رات گئے گرانٹ گھر آیا تو صوفیہ ابھی جاگ رہی تھی۔ فرش پر بچھے گدیلے پر کہنی کے بل نیم دراز وہ خود فراموشی کے عالم میں تھی۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ اور گرانٹ کے قدموں کی چاپ نے بھی اسے چونکایا نہیں۔ اس کے سامنے ایک پلیٹ ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ایک چمچ بھی اٹکا تھا مگر شاید اس نے ابھی کھانا شروع نہیں کیا تھا۔

گرانٹ نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے صوفیہ اور اس کے قریب رکھی پلیٹ کو ایک نظر دیکھا تھا۔

''اب تک تمہیں سو جانا چاہیے تھا۔ دوپہر تک آنکھ نہیں کھلتی تمہاری۔ اپنی زندگی میں تھوڑی تنظیم لاؤ، کیوں جاگ رہی ہو؟''

''نیند نہیں آ رہی، تمہارے پاس سلیپنگ پلز ہیں تو مجھے دے دو، کئی راتوں سے مجھے بالکل نیند نہیں آتی۔'' صوفیہ نے یوں ہی لیٹے لیٹے کہا۔

''ہرگز نہیں، یہ تمہاری عمر ہے سلیپنگ پلز لینے کی، ایک بار ان خرافات میں پڑ جاؤ تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ سارا سارا دن ٹی وی پر الم غلم پروگرام مت دیکھا کرو، یہ میڈیا والے نوجوانوں میں مایوسی اور ذہنی انتشار بانٹ رہے ہیں، تم پر میری کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ چلو اٹھو یہاں سے، جا کر اپنے بستر پر لیٹو اور سونے کی کوشش کرو۔'' گرانٹ نے کوٹ کی طرح ٹائی بھی صوفے پر اچھال دی تھی۔

''اور تم اس وقت کیوں کھا رہی ہو؟'' اس کی توجہ ان چھوٹی پلیٹ پر مرکوز ہوئی۔

''کھانے کی صرف ایک ہی وجہ ہوتی ہے جو تمہیں بھی معلوم ہے۔'' صوفیہ نے پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے کسی کام کا کوئی معمول ہو تو تم پر یوں قنوطیت نہ چھائی رہا کرے، تمہارے شب و روز شدید بدنظمی میں گزر رہے ہیں۔ ٹھہرو ذرا ایک منٹ۔''

اسے ٹوکری میں پلیٹ اوندھاتے دیکھ کر گرانٹ تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔

''کہیں تم پورک تو نہیں کھانے والی تھیں؟ میرے آنے پر تم نے کھانا ضائع کیوں کر دیا جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں بھوک لگی ہے۔'' وہ ٹوکری اٹھا کر اس کے مشمولات کا بنظر غائر جائزہ لینے لگا۔

''مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔''

''تو پھر کھایا کیوں نہیں۔''

''میری بھوک کھائے بنا ہی ختم ہوگئی۔ شاید مجھے بھوک تھی ہی نہیں بس بھوک کا احساس ہوا تھا۔'' صوفیہ نے ٹوکری اس سے لے کر نیچے رکھ دی۔ ''میں پورک نہیں کھاتی، میں کسی بھی طرح کا گوشت نہیں کھاتی، تم خوب جانتے ہو میں ویجی ٹیرین ہوں۔''

گرانٹ کی آنکھوں میں خالی پن تیرنے لگا، وہ ہتھیلی سے ماتھے کی جلد کو رگڑ رہا تھا ''ہاں یہ بات تو مجھے معلوم ہے۔ جانے کیوں ذہن سے نکل گئی۔ ان دنوں میں بہت تھکا تھکا سا رہتا ہوں۔ میرے دماغ میں سوئیاں سی چبھتی ہیں۔ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ آج صبح مجھے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں یا...... پتا نہیں...... کچھ عجیب سی بات اٹکی تھی سوچ میں۔ کیا سوچ رہا تھا میں کہ رائٹنگ ٹیبل میرے بستر کے دائیں طرف رکھی ہے یا بائیں طرف اور مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ شاید یہی بات تھی یا کسی اور شے میں الجھ گیا تھا۔''

کچن سے باہر آتے ہوئے وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب تھا پھر اس کی نظر صوفیہ پر پڑی جو سنک میں پلیٹ دھو رہی تھی، تو بولا۔

''آج میں پولیس اسٹیشن گیا تھا حالانکہ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ اس معاملے میں تمہاری شمولیت خارج از امکان قرار دی جا چکی ہے، پھر بھی میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں خود ان لوگوں سے مل کر اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنی بڑی مصیبت ٹل گئی۔ ایک موقع پر تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ تمہیں ملوث کر کے چھوڑیں گے اور وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے اگر خدا انہیں روک نہ دیتا۔ میں نے تمہارے لیے دعا کی تھی۔ بعض مسائل کا دعا کے سوا کوئی حل نہیں ہوتا۔ خدا نے میری دعا قبول کر لی ورنہ ہم کیسی الجھن میں مبتلا ہو جاتے۔''

صوفیہ کو اس بات پر ایک فی صد بھی اعتبار نہیں تھا کہ گرانٹ کی کوئی دعا قبول ہو سکتی تھی۔ اس نے خود کوشش نہ کی ہوتی تو آج اس کا حال بھی میبل سے مختلف نہ ہوتا، لیکن اگر اس نے جھوٹ نہ بولا ہوتا اور سب ماجرا من و عن بیان کر دیا ہوتا تو کیا پھر بھی میبل اس گاڑھ (مشکل) میں پھنستا؟ اس کی حالت تو اس مکھی جیسی تھی جو مکڑی کے جالے میں الجھنے پر یہ نہیں جانتی کہ اسے پھڑ پھڑانے سے رہائی ملے گی یا ساکن رہنے سے۔

وہ جو کر چکی تھی، اسے لوٹانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ وہ میبل کے لیے کوئی مشکل کیوں اٹھاتی؟ صوفیہ کی نظر میں اس کا ہونا یا نہ ہونا ایک ہی بات تھی۔ اور وہ اس کے بارے میں سوچ بھی کیوں رہی تھی؟ وہ اتنا اہم کب تھا۔

اس نے سر جھٹکتے ہوئے گرانٹ کی آواز پر توجہ دینے کی کوشش کی۔

''آئندہ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میبل کی معذوری اور تنہائی کی وجہ سے تمہیں اس سے ہمدردی رہی ہوگی لیکن کون جانتا تھا کہ وہ اپنے اندر کس شر کو چھپائے پھر رہا تھا۔ اس لڑکی کی جگہ تم بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ تمہیں بھی قتل کر سکتا تھا۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ ہم لوگوں کے ظاہر سے ان کے باطن کو جانچ لیں۔''

''تمہاری خوش قسمتی ہے گرانٹ! کہ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے ورنہ میرے اندر چھپے ہوئے شر کو جان کر تم پچھتاتے کہ میں میبل کے ہاتھوں قتل کیوں نہ ہوئی۔'' اس نے گرانٹ کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

اب وہ صوفے پر بیٹھا جھک کر جوتوں کے تسمے ڈھیلے کر رہا تھا۔

صوفیہ نے دھلی ہوئی پلیٹ کیبنٹ میں رکھی، وہاں سے گلاس نکال کر نل سے پانی بھر کر پیا اور خالی گلاس کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عقب میں اسے گرانٹ کے بولنے کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہی۔ وہ اس کی بے توجہی پر ذرا بھی غور

نہیں کر رہا تھا۔ اندر سے وہ ایک باتصویر بروشر لے کر آئی تو گرانٹ بائیں پاؤں کا جوتا ہاتھ میں پکڑے باتیں کیے جا رہا تھا۔

''تم نے سنا میں نے کیا کہا؟ یقیناً نہیں سنا ہوگا۔ تم مجھے چڑانے کا کوئی موقع گنواتی نہیں ہو۔ جب میں بات کر رہا ہوں تو چلنے پھرنے سے گریز کیا کرو۔''

وہ خاموشی سے میز کے دوسری طرف کاؤچ پر بیٹھ گئی اور بروشر کو دیکھنے لگی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میبل نے سب کو معصومیت کا کیسا جھانسا دے رکھا تھا۔ کیا خبر وہ پہلے بھی ایسے جرائم کرتا رہا ہو۔ خیر اس کا بچ نکلنا اب قرین قیاس نہیں لگتا۔

وانس جیسے علاقے میں جہاں نسلی تعصب کو لوگوں نے ایک عام رواج کی طرح اپنا رکھا ہے ایک کالے آدمی کے ہاتھوں سفید فام لڑکی کا قتل۔ یوں سمجھو کہ میبل نے کھڑ کھڑیے سانپوں کی بانبی میں ہاتھ گھسیڑ دیا ہے۔ جانے کیلی فورنیا میں سزائے موت کا کیا طریقہ رائج ہے۔ میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ برقی کرسی یا پھر زہر کا انجکشن ہی ہوگا زیادہ تر ریاستوں میں تو یہی ہو رہا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ وہ لڑکی ایک گینگسٹر کی بہن تھی۔ ایسے لوگ بہت بارسوخ ہوتے ہیں۔ میں نے خبر سنی ہے کہ اس کیس کو لے کر نسلی فسادات شروع ہونے کا اندیشہ ہے۔''

گرانٹ نے بولتے ہوئے جوتا میز پر رکھ دیا تھا۔

یہ سب اسے معلوم تھا، اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بروشر گرانٹ کی جانب بڑھا دیا۔

''کیا ہے یہ؟'' وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''یہ ایک پزا پارلر ہے۔ میں یہاں ملازمت کرنا چاہتی ہوں بطور ویٹرس۔ تنخواہ معقول ہے اور کام کے اوقات بھی زیادہ برے نہیں۔''

گرانٹ نے اسے گھور کر دیکھا اور بروشر کو میز پر پٹخ دیا۔

''تمہیں اس گھر کے اندر سکون سے رہتے ہوئے کیا تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی خراب صحت کے باوجود اتنے جتن کیوں کرتا ہوں؟ صرف اس لیے کہ تمہیں باہر کی دنیا سے بچائے رکھوں۔ میرا صبر آزمانے کے نت نئے گر ایجاد نہ کیا کرو۔ اس ویٹرس کا یونیفارم دیکھا ہے تم نے؟ ٹینک ٹاپ اور رنرز شارٹس۔ آدھے سے زیادہ جسم ڈھکا ہوا نہیں ہے۔''

اس نے بروشر اٹھا کر صوفیہ کی آنکھوں کے قریب کیا جس کے ایک کونے میں خوبصورت مسکراہٹ اور دلکش ٹانگوں والی لڑکی پزا کی ٹرے اٹھائے کھڑی تھی۔

''خدا ایسا حلیہ پسند کرتا ہے کیا؟ یہ پزا پارلر کسی بروتھل سے کم نہیں۔ گاہکوں کو لبھانے کے لیے انہوں نے اپنی لڑکیوں کی وضع قطع ایسی بنا رکھی ہے کسی کو پزا کھلانے کے لیے آدھا ننگا ہونے کی کیا تک ہے؟ بتاؤ مجھے۔'' وہ مشتعل ہو گیا۔

''یہ موسم گرما کا یونیفارم ہے۔ میں صرف مارچ تک وہاں کام کروں گی میرا وقت آسانی سے گزر جائے گا۔ اب میں اسکول بھی تو نہیں جاتی۔''

''موسم کا اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے سارا مسئلہ تو ماحول کا ہے۔ تم وہاں بدتہذیب مردوں کو شراب پیش کیا کرو گی۔ تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے۔ میں اس بارے میں ایک لفظ نہیں سنوں گا۔''

گرانٹ کے اشتعال میں اضافہ ہوا تھا۔

''لیکن وہ ایک پزا پارلر ہے، کوئی بار تو نہیں۔''

''کون سا ایسا پزا پارلر ہے جہاں بیئر اور وائن مہیا نہیں ہوتی۔ کیا ان میں الکوحل نہیں ہوتا؟'' اس نے میز پر زور سے ہاتھ

مارا۔" مجھے تو تم پر بھی اعتبار نہیں کہ آزادی ملنے پر تم وہ سب نہیں کر گزرو گی جس سے میں نے اب تک تمہیں روک رکھا ہے۔ میں جانتا نہیں کیا کہ تمہاری عمر کی لڑکیوں کی رگوں میں خون کی جگہ شر بہتا ہے۔ ایسی راہیں تمہیں شیطان دکھا رہا ہے۔ اس کی آواز پر کان نہ دھرو۔"

لہجے کی سختی نے صوفیہ پر کوئی اثر نہ ڈالا۔

"تم اس تعارفی کتابچے کو پڑھ کر فیصلہ کرو کہ شرائط اور ضوابط کتنے مناسب اور قابل قبول ہیں۔ میں ایک دو روز میں وہاں انٹرویو دینے جاؤں گی۔"

گرانٹ نے بروشر کو دو لخت کر کے ہوا میں اچھال دیا۔

"میرے ساتھ بحث نہ کرو۔ مجھے اور غصہ مت دلاؤ۔ ورنہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہیں کھڑے کھڑے اس گھر سے بے دخل کرنے کا اختیار رکھتا ہوں اور کوئی بھی میرے اس اقدام کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ تمہاری ماں کے مرنے پر وصیت کی رو سے مجھے یہ اپارٹمنٹ ملا ہوتا تو تمہیں کورٹ سے رجوع کرنے پر شاید کچھ مل جاتا لیکن وہ اپنی زندگی میں اسے میرے نام کر گئی تھی۔ میں ایک لمحے میں تمہیں سڑک پر پہنچا دوں گا۔" اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے تنبیہ کی۔

صوفیہ نے زیر لب الیا کو گالی دی تھی، ایسے کتنے ہی "احسانات" وہ اس پر کر گئی تھی۔

"میں نے تمہارا آزار کیوں پالا ہوا ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ میں خدا کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔ ورنہ مجھے تم سے تل برابر دلچسپی نہیں بلکہ میں تم سے بیزار ہوں۔ پاک بازی کے سوا ایسی کیا خوبی ہے تم میں جو تم خدا کی نظر میں پسندیدہ ٹھہرو۔ تمہارے اندر ہر وہ برائی موجود ہے جو جہنم کا دروازہ کھولنے کے لیے درکار ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارے پاس وہ برائیاں کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ عذاب کا تم نے محض نام سنا ہے۔ جب وہ تم پر وارد ہو گا تو تم جان لو گی کہ وہ کس قدر بھیانک ہے۔ پھر تمہارا پچھتانا کسی کام نہیں آئے گا۔"

گرانٹ کی باتیں کبھی کبھی سے بہت محظوظ کرتی تھیں۔ جو شخص عذاب کی زندہ تجسیم تھا وہ کس برتے پر اسے عذاب سے محفوظ رہنے کے گر سمجھا رہا تھا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز گونجی تو گرانٹ متعجب نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے؟ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔"

وہ دروازے کی سمت چلا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے دائیں پاؤں میں اب تک جوتا پہن رکھا تھا۔

"اوہ میں نے اسے تو اتارا ہی نہیں۔"

وہ میز پر پڑے ہوئے جوتے کو دیکھ کر بڑبڑایا اور پھر اسی حال میں جا کر دروازہ کھول دیا۔

گرانٹ کی ڈری ہوئی چیخ سن کر صوفیہ نے بے اختیار گردن گھمائی۔ تب اسے وہ دو لوگ نظر آئے تھے جو گرانٹ کو زبردستی دھکیلتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ ان دونوں نے سیاہ balaclava ٹوپیاں اوڑھی ہوئی تھیں۔ جن میں آنکھوں اور ہونٹوں کے سوا باقی چہرہ مخفی تھا۔ ان میں سے ایک کے پاس بیس بال بیٹ تھا اور دوسرا شاٹ گن سے لیس تھا۔

شعوری سطح پر خطرے کو بھانپنے میں اسے چند گھڑیاں لگی تھیں۔ گن بردار نے گرانٹ کو فرش پر گرا کر بے بس کر دیا تھا جبکہ دوسرا آدمی صوفیہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ جواب تک بے حس و حرکت تھی، اچانک مڑی اور استطاعت کی آخری حد تک بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی، دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتے ہوئے اسے مقفل کیا اور اسی سرعت سے بھاگ کر باتھ روم کا دروازہ بھی بند کر دیا باتھ روم کا دوسرا دروازہ گرانٹ کے کمرے میں کھلتا تھا اگر وہ اپنی طرف کا دروازہ کھلا رہنے دیتی تو وہ لوگ باتھ روم سے

گزر کر اس تک پہنچ سکتے تھے۔ دونوں دروازوں سے دور ہٹ کر وہ دیوار سے چمٹ گئی تھی۔

گرانٹ کے چلانے اور گالیاں دینے کی آوازیں اس کے کانوں تک آ رہی تھیں البتہ آنے والوں میں سے کوئی بھی اب تک ایک لفظ نہ بولا تھا۔ پھر اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

زوردار ضربوں سے دروازہ بری طرح ہل رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے وقفے سے باتھ روم کے دروازے پر بھی چوٹیں پڑنے لگیں۔ وہ سمٹ کر انتہائی کونے میں دبک گئی اور ڈوبتے ہوئے دل سے امید کرنے لگی کہ وہ لوگ دروازہ کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے لیکن اندر سے بخوبی آگاہ تھی کہ جو لوگ اتنی تیاری کر کے آئے تھے، وہ ایک بند دروازے جیسی معمولی رکاوٹ کو اپنے رستے میں حائل نہیں ہونے دیں گے۔

گرانٹ کی چیخ و پکار اب معدوم ہو چکی تھی۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ حیرت کی بات تھی کہ وہ دونوں کچھ بھی بولتے نہ تھے۔ حتیٰ کہ اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لیے بھی منہ سے کوئی آواز نہ نکالتے تھے۔ دروازوں کو لگنے والے دھکوں کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی بھی لمحے وہ لوگ اندر آنے والے تھے۔ اس کا دل اتنی وحشت سے دھڑک رہا تھا کہ اسے لگا، وہ قے کر دے گی۔ سن ہوتے دماغ کے ساتھ وہ اس صورت حال سے بچ نکلنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگی۔ اس کا سیل فون اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ کھانا کھانے کے ارادے سے den میں بیٹھی تھی تو اس نے سیل فون وہیں کسی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ لینڈ لائن ٹیلی فون بھی اسی کمرے میں تھا۔ اس کے پاس پولیس کو اطلاع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور شاید پولیس کے آنے تک وہ لوگ اپنا کام ختم کر چکے ہوں گے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی باہر کے رخ بنی ہوئی تھی لیکن اس کے راستے باہر جانا ممکن نہ تھا۔ وہ کچھ بھی کر لیتی، چوکھٹ میں گڑے کانچ کے ٹکڑوں اور کیلوں سے زخم کھانے سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ ماضی میں دو تین مرتبہ اس نے میٹرس اور صوفے کی گدی وغیرہ کھڑکی میں رکھ کر باہر جانے کی کوشش کی تھی لیکن لمبی نوکیلی میخوں نے آسانی سے میٹرس کو پھاڑ ڈالا تھا۔ چوکھٹ کی چوڑائی خاصی زیادہ تھی اور بیرونی سرے پر گرہ دار ریشوں والی گھنی بیل پھیلی تھی۔ وہ کسی طرح اسے پھلانگ بھی نہ سکتی تھی۔ اگر وہ کھڑکی میں جا کر شور مچاتے ہوئے کسی سے مدد طلب کرتی تو نزدیک ترین گھر مسز میک گریگور کا تھا جو اپنے کنبے کے ساتھ پچھلے ہفتے سے کہیں گئی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ جتنے بھی گھر دور یا نزدیک بنے ہوئے تھے، وہ گلا پھاڑ کر بھی چلاتی تو ان میں سے کسی تک آواز نہ پہنچا پاتی۔ ہاں کوئی راہ گیر متوجہ ہو جاتا تو یہ محض اتفاق ہوتا۔ تاہم کھڑکی کے قریب جانے سے وہ براہ راست دروازے کی سیدھ میں آ جاتی۔ اور شور سن کر وہ اس کے قیام کی جگہ متعین کر کے گولی بھی چلا سکتے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شاٹ گن کے pellets (چھرّے) لکڑی کو چیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے یا نہیں۔ بہرکیف وہ یہ خطرہ مول لینے پر تیار نہیں تھی۔ تو پھر کیا طریقہ رہ جاتا تھا؟ اس کا ذہن اب قدرے وضاحت سے کام کر رہا تھا۔

باتھ روم کا دروازہ اکھڑنے کے قریب تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ مزید ٹھوکریں سہارنے کے قابل نہیں تھا۔ مہلت ختم ہو رہی تھی۔ وہ آنے والے وقت کے تصور سے کانپ رہی تھی۔ اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی جو وہ ان دونوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔ بے بسی کی انتہا کو چھوتے ہوئے وہ ہتھیلی کے گوشت کو دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، وہ کسی مجنون کی طرح چیخنے لگے اور یقیناً وہ ایسا ہی کرتی اگر عین آخری لمحوں میں اسے وہ ترکیب نہ سوجھتی۔ اس ترکیب کے کامیاب ہونے کے امکانات مخدوش تھے لیکن آخری چارہ کار کے طور پر صوفیہ نے اسی پہ اکتفا کرنے کی ٹھانی۔

کمرے میں چھپنے کی صرف ایک ہی جگہ تھی۔ اس کے بستر کا نچلا خلا۔ ظاہری بات تھی کہ وہ لوگ سب سے پہلے بستر کے نیچے ہی دیکھتے لیکن اگر کسی طور وہ انہیں یقین دلا دیتی کہ وہ کمرے میں موجود ہی نہیں تھی تو امید تھی کہ وہ کمرے کے اندر اسے تلاش کرنے کی زحمت نہ اٹھاتے۔

صرف وہ اور گرانٹ واقف تھے کہ کھڑکی کے راستے فرار ہونا ناممکن تھا۔ دروازوں پر زور آزمانے والے تو اس حقیقت سے لاعلم تھے۔ ان کی یہی لاعلمی صوفیہ کے بچاؤ کی راہ نکال سکتی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور جھک کر دوڑتی ہوئی بنا آہٹ کئے کھڑکی کے نزدیک چلی گئی۔

کھڑکی کا کانچ والا فریم اوپر دھکیل کر اپنا سلیپر چوکھٹ کے کونے میں ٹیڑھا کر کے رکھ دیا اور گلے میں لپٹا اسکارف اتار کر بیل کے پتوں میں ایسی جگہ اٹکا دیا کہ وہ دور سے دیکھنے پر بھی آسانی سے نظر آ جائے۔ پھر وہ فرش پر لیٹتے ہوئے بستر کے نیچے رینگ گئی تھی بستر اور فرش کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ اسے کسی چھپکلی کی مانند زمین سے چپکنا پڑا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح بستر کے نیچے گھسنے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے ان کو اندر آتے سنا۔

وہ دم سادھ کر لیٹ گئی۔ فرش پر اٹھتے گرتے جوتے اسے دکھائی دے رہے تھے۔ ان دونوں نے ربڑ کے سول والے نرم جوتے پہن رکھے تھے اور ان کے قدموں کی بے حد مدھم آہٹیں ابھرتی تھیں۔ ان میں سے ایک بستر کی سمت آ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں بیس بال بیٹ فرش پر گھسٹ رہا تھا جس کے سرے پر خون کے دھبے لگے تھے۔

اس بارے میں سوچنے کی ہرگز ضرورت نہ تھی کہ وہ خون کس کا تھا۔ وہ چلتا ہوا انتہائی نزدیک آ گیا۔ صوفیہ کو جو موہوم سی امید تھی وہ دم توڑنے لگی۔ شاید انہوں نے کھڑکی پر دھیان ہی نہیں دیا تھا اور کسی بھی پل وہ بستر کے نیچے جھانکنے والے تھے۔

''وہ کھڑکی سے باہر کود گئی ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ ہمیں عقب سے مکان کا جائزہ لے لینا چاہیے۔''

ان میں سے ایک بولا اور صوفیہ کو معلوم ہو گیا کہ اب تک وہ خاموش کیوں تھے۔



وہ کارل میکارتھی کی آواز تھی۔اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اس نے آواز پہچاننے میں غلطی کی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' دوسری آواز اجنبی تھی۔

''جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت مدد لے کر واپس آ سکتی ہے۔اب یہاں رکنا خطرناک ہے۔''

وہ کمرے میں توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ چیزوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''اگر آج وہ ہاتھ آ جاتی تو میں اس کی ایسی فلم تیار کرتا کہ پورے واٹس میں اس کی دھوم ہو جاتی۔اس کتیا کی مجال دیکھو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے تمہارے منہ سے گھٹیا تمباکو کی بو آ رہی ہے۔ پروم نائٹ پر بھی اس خبطی بوڑھے نے آ کر بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ورنہ تو اب تک وہ میرے پیروں کے تلوے چاٹ رہی ہوتی چلو، اس بوڑھے کو تو سب کے سامنے مجھے ذلیل کرنے کا صلہ مل گیا ہے۔''

''ہاں اس رات تو میں نے مکمل انتظام کیا تھا۔ لائٹنگ سے کیمرے تک، سب تیاری شاندار تھی۔ کمرشل معیار کی فوٹیج ہاتھ آ جاتی۔'' کارل کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے کونوں میں گھستی تاریکی بے حد گہری ہو گئی۔اس تنگ خلا میں اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔

''کہیں وہ بوڑھا مر ہی نہ جائے۔''

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔بس تم اپنی کوئی چیز یہاں مت چھوڑنا۔اب نکلو جلدی۔'' کینوس کے جوتے دوڑتے ہوئے دور جا رہے تھے۔ جب مکمل خاموشی چھا گئی تو اس نے بیڈ کا پایا پکڑتے ہوئے خود کو باہر کھینچ لیا۔اس کے ہاتھ اور کپڑے گرد سے اٹ گئے تھے۔

وہ کمرے سے باہر آئی اور گرانٹ کو فرش پر اوندھے منہ پڑے ہوئے دیکھا اس کے سر سے خون بہہ کر ایک چھوٹے سے تالاب کی صورت فرش پر جمع ہو رہا تھا، صوفیہ اس سے تھوڑی دور چپ چاپ کھڑی ہو کر اس کو دیکھنے لگی اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ گرانٹ بے ہوش نہیں تھا۔اس کے جسم میں حرکت کے آثار موجود تھے۔ پھر اس نے بمشکل گردن اٹھاتے ہوئے صوفیہ کی جانب بازو لمبا کیا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ کافی دیر وہ بولنے کی سر توڑ جدوجہد کرتا رہا۔ پھر ایک سرگوشی برآمد ہوئی۔

''خدا کے لیے میری مدد کرو۔''

صوفیہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی۔

''میں خدا کے لیے کبھی کچھ نہیں کرتی۔ خدا نے میرے ساتھ جو کیا ہے، اس کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گی۔''

وہ خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔

''میں مر رہا ہوں۔ کسی کو مدد کے لیے بلاؤ۔ کچھ کرو۔ میں مر جاؤں گا۔''

خون کے تالاب کا حجم رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ صوفیہ کو خیال آیا کہ کہیں وہ واقعی مر نہ جائے۔ وہ مر جاتا تو صوفیہ کی ایک خواہش تشنہ رہ جاتی۔ اسے اپنی خواہش کی موت گوارا نہیں تھی۔

اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور نو کے ہندسے پر انگلی رکھی۔ پھر اسے کچھ عرصہ پہلے کہی ہوئی پولیس آفیسر کی بات یاد آئی کہ سوائے ہنگامی صورتحال کے نائن ون ون پر کال نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے انگلی ہٹا لی۔ ایسی بھی ہنگامی حالت درپیش نہ تھی۔ قریب المرگ ہونے کی کوئی نشانی گرانٹ میں نظر نہ آتی تھی۔ ٹیلی فون اسٹینڈ کے نچلے خانے میں پڑی ہوئی ڈائری ہاتھ میں لے کر وہ آہستگی سے اس کے اوراق پلٹنے لگی۔

گرانٹ کے جاننے والے ڈاکٹر کا نمبر اس ڈائری میں کہیں درج تھا۔ صوفیہ بھی اسے جانتی تھی۔

وہ اسے ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر فرڈیننڈ۔ اسے مطلوبہ نمبر مل گیا۔

گرانٹ کا جسم اب دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور اس کے ہونٹوں کے گوشے سے رال بہنے لگی تھی۔ صوفیہ یوں رک رک کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کا نمبر ملانے لگی جیسی ماضی میں کبھی اسے ٹیلی فون استعمال کرنے کا تجربہ نہ ہوا ہو۔

✠ ✠ ✠

ڈاکٹر فرڈیننڈ نے آنکھیں موندے لیٹے ہوئے گرانٹ کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ایک اسٹول گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ گرانٹ کی آنکھیں اگرچہ بند تھیں لیکن وہ سو نہیں رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جب ڈاکٹر فرڈیننڈ اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ اس کی حالت کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا تو اس نے آنکھیں کھول کر متعدد بار ان دونوں کو دیکھا تھا۔ یقیناً وہ شدید نقاہت محسوس کر رہا ہوگا اور شاید خوف زدہ بھی ہو۔ اس نے بہت کڑی رات گزاری تھی۔ ممکنہ طور پر اس کے سر پہ کسی بھاری اور کند شے سے ضرب لگائی گئی تھی، غالباً کوئی چوبی لٹھ وغیرہ۔ خیر گزری کہ اس کی کھوپڑی چٹخنے سے بچ گئی تھی۔ وہ زخم باعث تشویش نہیں تھا، اسے مندمل ہونے میں چند ہی دن لگتے مگر اس سے ہٹ کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کی نظر مین کچھ ایسی بات آئی تھی کہ وہ گرانٹ کے لیے بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ اس کی کلائیوں، پنڈلیوں اور چھاتی پر بے شمار نیلاہٹ مائل سرخ ابھار ایک ڈاکٹر کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجانے کا قوی موجب تھے۔

گرانٹ اور اس کی برسوں سے آشنائی تھی۔ گو ان کے درمیان تعلقات کبھی بھی زیادہ دوستانہ نہیں رہے تھے، پھر بھی ان میں ایک خاص ربط تھا۔ اس کی گرانٹ سے آخری ملاقات ہوئے دو سے تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور اتنی مدت بعد گرانٹ کو دوبارہ دیکھنے پر اسے زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ غیر معمولی حد تک دبلا اور نحیف ہو چکا تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہ پایا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کو اس پر ترس آیا تھا۔

وہ کچھ وقت خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے دھیمی آواز میں گرانٹ کو مخاطب کیا ''تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

اس نے آنکھیں کھول کر ڈاکٹر فرڈیننڈ کو دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد ڈاکٹر فرڈیننڈ نے سوال دہرایا۔

''تمہیں کیسا لگ رہا ہے گرانٹ؟ کیا تم ابھی بات کرنا چاہتے ہو؟''

اس نے پھر سے آنکھیں کھول دیں اور کسمسا کر ذرا سا اچکنے کی کوشش کی۔

''آرام سے لیٹے رہو۔'' ڈاکٹر فرڈیننڈ نے روکا تھا۔ ''تمہارے سر پر ٹانکے لگے ہیں۔ اگر تم دماغ پر کسی بھی طرح کا بوجھ یا کوئی اور تکلیف محسوس کرتے ہو یا بولنے میں دشواری ہو رہی ہے تو بے شک بات مت کرو۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں لگی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن چونکہ سر کی چوٹ ہے تو احتیاط لازم ہے۔ cops تو رات کو ہی تمہارا بیان لینا چاہتے تھے، تم جانتے ہو فوجداری معاملات میں پولیس کو اپنے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ خیر ہم نے انہیں منع کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ آئیں گے۔ مجھے اس واقعہ پر افسوس ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں لاس اینجلس میں جرائم کی شرح اونچی ہوئی ہے۔ اور تم تو رہتے ہی Watts میں ہو۔ جو مجرموں کی جنت ہے۔ شکر ہے کہ تمہیں زیادہ نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔

گرانٹ اسے خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا۔

''بہت مدت ہوگئی ہمیں ملے ہوئے، تم نے بھی رابطہ نہیں کیا اور میں بھی اتنا مصروف رہا کہ تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ......''

گرانٹ نے اس کی بات قطع کر دی۔ ''کیا اس سے قبل میں تم سے مل چکا ہوں، کہاں؟''

ڈاکٹر فرڈیننڈ کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں رینگنے لگیں۔ ''تم مجھے نہیں پہچانتے گرانٹ۔''

''کیا مجھے پہچاننا چاہیے؟ مجھے یقین ہے کہ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ الجھن زدہ نظر آنے لگا۔

''ٹھیک ہے، پریشان مت ہو، سر کی چوٹ کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر فرڈیننڈ نے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ''کیا اس واقعے سے پہلے بھی کبھی تمہیں چیزیں بھولی ہیں؟''

''ہاں، میں کبھی کبھی بھول جاتا ہوں، چند روز پہلے کا قصہ ہے کہ میں کار ڈرائیو کرنا بھول گیا تھا۔ مجھے اس کو اسٹارٹ کرنے کا طریقہ ہی یاد نہیں آ رہا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے نا، لیکن اگر ہم ملتے رہے ہیں تو میں تمہیں کیوں فراموش کروں گا۔ غالباً ہماری ایک آدھ ملاقات ہی ہوئی ہوگی۔ تب ہی مجھے تمہارے متعلق یاد نہیں آ رہا، ایسی ہی بات ہے نا۔''

ڈاکٹر فرڈیننڈ نے تردید نہیں کی تھی۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، اس مسئلے کا علاج موجود ہے۔ کیا تم نے اس بارے میں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا ہے؟''

''نہیں۔ ابھی تک تو نہیں کیا۔ تم بھی ڈاکٹر ہو۔ میں تم سے مشورہ لیتا ہوں۔''

''ہم تمہارا سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی کریں گے۔ پھر ہی اس پر کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔ اچھا تو صوفیہ کیسی ہے؟ اسے یہاں تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے اطلاع دینے کے بعد اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ تم کہو تو میں اسے فون کر کے بلا لیتا ہوں۔ اس کے یہاں ہونے سے تمہیں اچھا لگے گا۔''

اس کے منہ سے صوفیہ کا ذکر سن کر گرانٹ کی الجھن بڑھ گئی ''تم صوفیہ کو کیسے جانتے ہو؟''

''مجھے کیوں معلوم نہیں ہوگا گرانٹ! میں تم سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہیں، صوفیہ اور رالیا کو بھی۔''

''تو پھر میں تم سے واقف کیوں نہیں ہوں؟...... صوفیہ نے میرے زخمی ہونے کی اطلاع دی تھی؟ مجھے دیکھنے کے لیے اسے اسپتال آنا چاہیے تھا۔ وہ بڑی لاپرواہ اور خودسر ہے۔''

گرانٹ کو خیال آیا کہ وہ کسی بات پر صوفیہ سے ناراض تھا لیکن وہ بات اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔

گرانٹ! تمہارے جسم پر یہ جو چھالے ہیں تم کہیں سے ان کا علاج کروا رہے ہو؟ آخری بار تم کب ڈاکٹر سے ملے تھے۔'' ڈاکٹر فرڈیننڈ نے پوچھا۔

''میں نے کسی معالج کو نہیں دکھایا۔ ڈاکٹروں کی فیس کون ادا کرے۔ میں ایک نادار آدمی ہوں، یہ تو معمولی نشانات ہیں،

مجھے ان سے کوئی خاص پریشانی نہیں ہے، کیا مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت ہے؟''

''تم اپنی صحت کی طرف سے بہت لاپروائی برت رہے ہو، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، میں ابھی اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں ریفر کردوں گا۔ اسکن بایوپسی اور کچھ دوسرے ٹیسٹ کیے جائیں گے، اس کے بعد ہی صورت حال واضح ہو گی۔ کیا تمہاری میڈیکل انشورنس ہوئی ہے؟''

اس سوال کا جواب بھی نفی میں آیا تھا۔''میں ان بکھیڑوں میں کبھی نہیں پڑا۔''

ڈاکٹر فرڈینینڈ چند ثانیے سوچتا رہا تھا''امریکہ میں علاج کی سہولیات بہت مہنگی ہیں، تم صحیح کہتے ہو، کئی لوگ تو صرف میڈیکل بلز کی وجہ سے دیوالیہ ہوگئے ہیں۔ میں چونکہ اس شعبے میں ہوں اس لیے میرے بہت سے ڈاکٹرز کے ساتھ نہایت اچھے مراسم ہیں۔ اس مشکل کا حل میں نکال لوں گا۔ تم اب کوئی غفلت نہ کرنا اور جلد صحت یاب ہو جاؤ۔''

ڈاکٹر فرڈینینڈ اس کے بازو کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے نرمی سے مسکرایا۔

''صوفیہ!'' اچانک گرانٹ زور سے بولا۔''صوفیہ کو ان لوگوں نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، وہ ٹھیک تو ہے؟'' شاید اب تک یہ پہلو اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

''اسے کچھ نہیں ہوا۔ میں نے خود فون پر اس سے بات کی تھی۔ وہ بالکل محفوظ ہے۔ ممکن ہے تھوڑی دیر تک cops تم سے رات والے واقعے کے بارے میں پوچھنے آئیں، تمہیں جو معلوم ہو انہیں بتا دینا۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ تمہیں زیادہ تنگ نہ کریں۔ ٹھیک ہے تم آرام کرو، میں اب چلتا ہوں، پھر تم سے ملنے آؤں گا۔''

ڈاکٹر فرڈینینڈ اٹھ کر جانے لگا تو گرانٹ نے اسے آواز دی۔''تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم کون ہو، مجھے یاد دلانے کی کوشش تو کرو، میں بڑی الجھن محسوس کر رہا ہوں۔''

تب ڈاکٹر فرڈینینڈ نے جو حوالہ دیا اسے سن کر گرانٹ کو یاد آ گیا کہ وہ کون تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور منہ دو، تین دفعہ یوں کھل کر بند ہوا جیسے اس کا گلا رندھ گیا ہو۔



جاڑے کی ناتواں دھوپ سکھ چین اور املتاس کے پتوں میں دبک کر بیٹھی تھی۔ اس کا عکس پتھریلی روشوں اور گھاس بھرے میدان پر اترتے ہوئے غیر شفاف ہو جاتا تھا۔ اس بیمار دھوپ نے اسپتال کے در و دیوار پر اداسی مل دی تھی۔ اسپتال کے برآمدوں میں بیٹھے ہوئے اور چلنے پھرنے والے لوگوں کے چہرے ملول تھے۔ ان میں سے بعض مریض تھے اور بعض مریضوں کے لواحقین یا تیماردار تھے۔ ہر ایک کسی نہ کسی طرح کی پریشانی کا شکار تھا۔

عمر کو ان لوگوں میں سے کوئی ایک بھی ویسی مصیبت میں مبتلا نظر نہیں آتا تھا جیسی خود اس پر وارد ہوئی تھی۔ مایوسی، شرمندگی، پچھتاوا، تاسف، بے کلی، کیا تھا جو وہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جلتی ہوئی آنکھوں پر انگلیوں کی پوریں پھیرتے ہوئے اس نے پاس بیٹھی حکیم بیگم کو دیکھا تھا۔ وہ سنگی بینچ کی پشت سے سر ٹیکے آنکھیں موند کر کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی آواز ایک مدھم بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اس لیے عمر اس کے الفاظ وضاحت سے سن نہیں پا رہا تھا۔

اس وقت وہ گھاس کے اس میدان میں موجود تھے جو اسپتال کی مرکزی عمارت کے دائیں پہلو میں کسی سبز غالیچے کی مانند بچھا تھا اور جس میں جا بجا سایہ دار درختوں تلے پتھریلی نشستیں نصب تھیں۔ تین دن سے پرنیاں اس اسپتال میں زیر علاج تھی۔ چند گھنٹے انٹینسو کیئر یونٹ میں رکھنے کے بعد اسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ کلائیوں کے زخموں کی جراحت ہو چکی تھی اور اب اس کی

زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔البتہ خون کی شدید کمی کے پیش نظر اسے خون فراہم کیا جا رہا تھا اور ایک، دو روز میں اسپتال سے فراغت کی امید تھی۔ چند منٹ قبل وارڈ میں معمول کی صفائی کا آغاز ہونے لگا تو مریضوں کے تیمارداروں کو وارڈ سے باہر جانے کی ہدایت کی گئی، لہٰذا وہ اور حکیم بیگم لان میں آ کر بیٹھے تھے۔

اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کر کے حکیم بیگم نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر نرم لہجے میں بولی۔

''کاکا! تو نے اک واروی اپنی ماں سے بات نئیں کی۔ اس دا حال نئیں پوچھا۔ تو دو لفظ معافی دے بول دے۔ اس دا روح راضی ہو جائے گا (وہ خوش ہو جائے گی) تیرا وی جی ہولا ہو گا۔ (تمہارا بھی دل ہلکا ہو گا) ہن چپ رہن دا ویلا نئیں۔ سینے دا ڈھکن کھول دے۔ اندر دی ہواڑ کو باہر نکلن دے۔''

''بے جی! میں آپا کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جاتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ مجھے بولنا کیا ہے۔ جانے کچھ بولنا بھی ہے یا نہیں۔'' اس نے شکستہ آواز میں کہا۔

''میرا اسدائی پتر۔ جے تو اس نوں مندے لفظ بول سکتا ہے تے چنگے بول کہنے میں کی (کیا) اوکھیائی ہے، تو ہمت تے کر، جے گرہ لگ جائے تے دھاگہ توڑن توں پہلاں گرہ کھولن دا چارہ ضرور کرنا چاہی دا اے۔''

(میرا پاگل بیٹا، جب تو اس سے سخت باتیں کہہ سکتا ہے تو اچھی باتیں کہنے میں کیا مشکل ہے۔ تو ہمت تو کر، جب دھاگا الجھ جائے تو اس کو توڑنے سے پہلے سلجھانے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے)

وہ جب سے لاہور آئی تھی، مسلسل عمر کو پرنیاں کی جانب پیش قدمی کرنے پر آمادہ کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کی تکرار سے اکتا کر دانستہ موضوع بدل دیا۔

''اگلے منگل کو میں امریکہ چلا جاؤں گا تو آپا اکیلی ہو گی۔ جب تک اس کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہ ہو تو اس کے پاس رہنا، شاید وہ تیری مدد لینے سے انکار کرے اور تجھے واپس گاؤں جانے کو کہے، پر تو پروا نہ کرنا۔ وہ چند دن اپنے دونوں ہاتھوں سے کوئی کام نہیں لے سکے گی۔ چھوٹی سے چھوٹی ضرورت پوری کرنے کے لیے اسے کسی دوسرے کی مدد درکار ہو گی تو اس کے ساتھ رہے گی تو مجھے اطمینان رہے گا۔''

اس کے امریکہ جانے کے ذکر پر ہمیشہ حکیم بیگم کبیدہ خاطر ہوتی تھی، اب بھی یہ تذکرہ اسے دکھی کر گیا۔

''تجھے اس دی فکر ہے تے امریکہ جاتا کیوں ہے؟ ارادہ توڑ دے۔ ایتھے (ادھر) رہ کے اس دی سیوا کر۔''

عمر نے اس کے چہرے سے نظر ہٹالی۔

''تو جانتی ہے میں پڑھائی کرنے امریکہ جا رہا ہوں، سب طے ہو چکا ہے۔ میں ارادہ بدل نہیں سکتا۔ میرا جانا ضروری ہے۔''

''جو زیادہ ضروری کم ہے وہ کرتا نئیں تو، پڑھائی دا بج نہ لا (بہانہ نہ بنا) مجھے بالڑی (بچی) نہ سمجھ، تو نس کے (بھاگ کر) جا رہا ہے۔ تیری لک جان دی صلاح ہے۔ اکھاں میٹ کے بھل جان دا ارادہ ہے۔ (تمہاری چھپنے کی نیت ہے، آنکھیں بند کر کے بھولنے کا ارادہ ہے۔)''

کچھ دیر تک عمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ خاموشی سے ہاتھوں کو کھولتا اور بند کرتا رہا، پھر اس نے حکیم بیگم کی طرف رخ کیے بغیر کہا۔

''میرا یہاں رکنا بے فائدہ ہو گا۔ میں آپا کی دیکھ بھال صحیح طرح سے کر ہی نہیں پاؤں گا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے

تیری موجودگی اس کے لیے زیادہ آرام دہ ہوگی۔ مجھ سے کوئی کام کہتے ہوئے وہ یقیناً جھجکے گی۔''
''وہ کوئی عورت نہیں ہے، تیری ماں ہے بیبا!'' حکیم بیگم کے لہجے میں ناراضی تھی۔
''بے جی! میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں، کچھ ہی مہینوں کی بات ہے، پھر تو مجھے لوٹ ہی آنا ہے۔''
''تو پرت کے (واپس) نہ آیا تے میں رو، رو کے مر جاؤں گی۔ میری ہاواں نال پنڈ دے سارے رکھ کملا جان گے۔ (میری آہوں سے گاؤں کے سب پیڑ کمہلا جائیں گے۔)''
اسے حکیم بیگم کی بھیگی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔
اس نے جواب میں کوئی تسلی نہیں دی تھی۔ اس وقت اندر پھیلے خلا میں لفظ ڈھونڈنا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔
وہ دونوں اٹھ کر اندر وارڈ میں جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ عمر نے شوکت صاحب کو بینچ کے نزدیک آتے ہوئے دیکھا۔ ذرا دور ٹھہر کر کھڑے کھڑے انہوں نے رسماً حال احوال دریافت کیا اور عمر کو اپنے ساتھ آنے کو کہا۔
''بیٹا! تم ذرا علیحدگی میں میری بات سن لو گے؟ میں کل رات بھی آیا تھا، مگر تم ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے ہوئے تھے تو ہماری بات نہ ہو سکی۔''
ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد عمر نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر ان کے ہمراہ لان کے ایک کم چہل پہل والے گوشے کی طرف چل پڑا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی اس پر نفرت کا ایسا طاقت ور غلبہ ہوتا تھا کہ خود پر قابو رکھنا کٹھن ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ اپنی فطری نرم دلی اور کچھ حالات کی مسلط کردہ مصلحت کے ہاتھوں بے بس تھا، ورنہ اسے کوئی زک پہنچا کر ہی دم لیتا۔
پرنیاں کے اسپتال آنے کی خبر شوکت صاحب کو یوں ہوئی تھی کہ وہ لگا تار دو، تین دن بغیر اطلاع کے اسکول سے غیر حاضر ہوئی اور ٹیلی فون کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود پرنیاں کے گھر چلے گئے اور وہاں جانے پر ایک پڑوسن کی زبانی معلوم ہوا کہ گزشتہ رات اسے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ بہر کیف اس خبر کا ان تک پہنچنا ایک لحاظ سے اچھا ثابت ہوا تھا۔
اسپتال کی انتظامیہ خودکشی کا معاملہ ہونے کے باعث متعلقہ پولیس اسٹیشن کو مطلع کرنا چاہتی تھی۔ یہ شوکت صاحب ہی تھے جنہوں نے اپنے مراسم کے بل بوتے پر انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ دراصل یہ ہی وہ احسان تھا جس نے عمر کو انہیں برداشت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے لیے عمر کے جذبات جو بھی رہے ہوں مگر حقیقت تھی کہ ان کی کوششوں سے وہ لوگ ایک بڑی الجھن میں پھنسنے سے محفوظ رہے تھے۔
''تمہاری آنٹی کی طبیعت تو خدا کے فضل سے اب بہت اچھی ہے، اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ بہت جلد انہیں اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ خدا انہیں لمبی زندگی دے، میں تو یہ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ انہوں نے آخر ایسا کیا ہی کیوں؟ ڈاکٹر کے پوچھنے پر انہوں نے یہ ہی جواب دیا کہ اپنی کلائیاں انہوں نے خود کاٹی ہیں۔ مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا، کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی اور نے انہیں زخمی کر دیا ہو اور وہ گھبراہٹ میں اس کے بارے میں بتا نہ پا رہی ہوں۔ انہوں نے حقیقت اور تخیل کو گڈمڈ تو نہیں کر دیا؟ ان جیسی معتدل مزاج خاتون سے ایسے عمل کی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔ تمہیں تو ان کے ہاں آئے ہوئے زیادہ سے زیادہ دو سال ہوئے ہوں گے، مگر میں پچھلے چودہ، پندرہ سالوں سے ان سے واقف ہوں، انہوں نے آج تک اپنے کسی طالب علم سے بھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ وہ ایسی نفیس اور لائق احترام خاتون ہیں کہ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔''
شوکت صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو گفتگو میں بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عمر کو ایسے لوگ ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ شوکت صاحب کی باتوں سے اسے سخت چڑ ہو رہی تھی۔
''ویسے تو یہ آپ لوگوں کا گھریلو معاملہ ہے اور اتنا تجسس ظاہر کرنا مجھے زیب نہیں دیتا، پھر بھی میں اصرار کروں گا کہ تمہیں

اس بارے میں کچھ بھی معلوم ہو تو مجھ سے مت چھپاؤ۔ بے شک میرا ان سے کوئی خون کا رشتہ نہیں، مگر میں انہیں اپنی سگی بہن کی طرح ہی عزیز جانتا ہوں۔"

عمر کوان کی زبان سے لفظ 'بہن' سن کر دھچکا لگا تھا۔ بڑے سے بڑا منافق بھی اپنے مفاد میں اس رشتے کی آڑ لیتے ہوئے سو بار سوچتا ہے۔ اس نے شوکت صاحب کے چہرے پر ریاکاری تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں، میں جب گاؤں سے واپس آیا تو وہ......اس وقت وہ بے ہوش پڑی تھیں۔"

اس نے بدقت خود کو جواب دینے پر مائل کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسی حرکت ان سے کیوں سرزد ہوئی؟ ان سے بتانے کے لیے اصرار کرنا بھی موزوں نہیں، ان کی ذہنی کیفیت ہی ابھی نارمل نہیں ہے۔ زیادہ حیرانی مجھے اس وجہ سے بھی ہے کہ اسلام آباد سے واپسی پر وہ بے حد خوش تھیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے کبھی انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا، پھر یکایک کیا ہو گیا کہ......"

"آپ کی بیوی نے بھی تو خودکشی کی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ اسکول میں آ کر آپ سے جھگڑتی تھیں۔ آپ پر چیختی چلاتی تھیں۔ کیا انہیں کوئی ذہنی عارضہ تھا؟"

عمر نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ یہ بات کہنے سے اس کا مقصد شوکت صاحب کو طعنہ دینا نہیں تھا۔ یہ اس کی فطرت میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ تو محض انہیں خاموش کروانے کے لیے یہ چبھتی ہوئی بات کہہ گیا تھا اور اسے اپنے کہے پر فوراً ہی پشیمانی بھی ہوئی تھی۔ کاش اس نے ضبط کیا ہوتا، کیسی گھٹیا حرکت ہوئی تھی اس سے۔

"شگفتہ کی بات کر رہے ہو، تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟ تمہاری آنٹی نے بتایا ہوگا، مگر وہ ایسی بے بنیاد بات کیوں کہیں گی، وہ تو شگفتہ کی بابت تمام حقیقت سے واقف ہیں۔ ہاں بیٹا اسے ایک نفسیاتی بیماری تھی، لیکن جانے تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ وہ اسکول میں آ کر مجھ سے جھگڑا کرتی تھی۔ وہ ایسا کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ ہماری شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی وہ بیمار پڑ گئی تھی، اسے ڈپریشن کے شدید دورے پڑتے تھے۔ کئی کئی روز وہ کسی سے بات چیت کیے بنا کمرے میں بند ہو کر گزار دیتی۔ شادی کے پہلے ہی سال اس نے چار دفعہ خودکشی کی کوشش کی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی کیفیت میں ایک بدلاؤ آنے لگا۔ اسے اتنا شدید غصہ آنے لگا کہ بعض اوقات اسے اپنے حواس پر قابو ہی نہ رہتا۔ ایسی حالت میں وہ مقابل کو جسمانی نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ہماری گھریلو ملازمہ کے بیٹے کا بازو توڑ دیا۔ کئی بار میری نیند کے دوران اس نے میرا گلا دبایا، میرے منہ پر تکیہ رکھ کر میرا دم گھونٹنے کی کوشش کی۔ ہم نے بہت علاج کروایا، پر اس کے مرض کی مناسب تشخیص ہی نہیں ہو پائی۔ دو، تین سالوں میں اس کی ذہنی ابتری اس حد تک بڑھ گئی کہ اسے گھر میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ بالآخر میرے گھر والوں اور شگفتہ کے ماں، باپ کی باہمی رضامندی سے اسے ایک سائیکاٹرک انسٹی ٹیوٹ میں داخل کر دیا گیا۔ اپنی باقی ماندہ زندگی کے تمام برس اس نے اسی ادارے میں بسر کیے۔"

شوکت صاحب کی وضاحت نے عمر کو مخمصے میں ڈال دیا۔ اسکول میں اس نے دو عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ شوکت صاحب کی بیوی بنا پیشگی اطلاع کے اسکول آ گئی تھی اور اچانک پرنسپل آفس کا دروازہ کھول کر آیا اور شوکت صاحب کو اندر جانے کس حال میں دیکھ لیا تھا کہ روتے ہوئے لوٹ گئی تھی۔ اور اس واقعے کے بعد اس نے خودکشی کی تھی۔

"لیکن میں نے سنا تھا کہ وہ اسکول میں آئی تھیں اور کسی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔" اسے اپنی آواز کھوکھلی اور اپنا سوال بودا لگا۔

"تم نے غلط سنا ہے بیٹا، میرے اس اسکول کا چارج لینے سے قبل ہی شگفتہ انسٹی ٹیوٹ کی چار دیواری میں بند ہو گئی تھی اور

اپنی موت تک ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے باہر نہیں آئی اور وہ انسٹی ٹیوٹ پاکستان میں بھی نہیں ہے، بلکہ لندن میں ہے۔"

وہ ہکا بکا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے پورے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اچانک ایک عجیب سا خوف اس کے اندر سرایت کرنے لگا۔ جیسے اس نے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہو، لیکن وہ غلطی کیا تھی، اس بارے میں اس کا ذہن واضح نہیں تھا۔ شوکت صاحب کے مسلسل ہلتے ہوئے ہونٹوں نے اسے باور کرایا کہ وہ ان کی باتوں سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ان کی آواز پر کان دھرنے کی کوشش کی۔

"برخوردار! اس قصے کو رہنے دو، باتوں کے دوران اصل بات تو مجھے بھول ہی گئی۔ دراصل میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں میرے علم میں آیا ہے کہ چند دنوں تک تم امریکہ جا رہے ہو۔"

اس نے گردن کی جنبش سے تصدیق کی۔

"ویسے تمہیں اپنی آنٹی کو اس حال میں چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہیے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تم کچھ عرصہ رک جاؤ۔"

"آپ کسی ضروری کام کا ذکر کر رہے تھے۔" عمر نے ان کا مشورہ نظر انداز کیا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہیں موزوں لگے۔ میں تمہیں فورس تو نہیں کر سکتا، ضروری کام یہ ہے کہ اپنی فلائٹ سے پہلے جب بھی تمہیں وقت میسر ہو، میرے ساتھ وکیل سے ملنے چلو۔"

"وکیل سے ملنے؟ کس لیے؟" اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

شوکت صاحب ذرا سا مسکرائے تھے۔ "وکیل سے کیوں ملا جاتا ہے؟ ظاہر ہے یہ وکیل لوگ قانونی معاملات طے کرتے ہیں تو بس ایسا ہی ایک معاملہ ہے۔"

"میرا تو ایسا کوئی قانونی معاملہ نہیں ہے، آپ کھل کر بتائیے تو۔"

شوکت صاحب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "بہتر ہوتا کہ یہ اچھی خبر تمہیں تمہاری آنٹی کی زبانی سننے کو ملتی، بہر کیف اب حالات ہی اس نوعیت کے ہو گئے ہیں تو کیا، کیا جائے۔ تمہاری آنٹی نے ایک مکان خریدا ہے جسے وہ تمہارے نام کر رہی ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ تمہارے امریکہ جانے سے پہلے ہر صورت یہ کام ہو جائے اور انہوں نے کر کے چھوڑا۔ یوں تو کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ انہوں نے تمہیں اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے مالکانہ حقوق مل جائیں، پھر وہ تمہیں خبر دیں گی۔"

شوکت صاحب اسے تفصیل بتانے لگے اور وہ لفظ نہیں تھے، پگھلے ہوئے سیسے کی بوندیں تھیں جو شوکت صاحب ایک تواتر سے اس کے کانوں میں انڈیل رہے تھے۔ اذیت سے بے حال ہوتے ہوئے وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

"تو آپا آپ کی بہن سے ملنے مری گئی تھیں؟" اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہاں، وہ ثروت کو برف باری دیکھنے کا شوق چرایا تو مری جا کر بیٹھ گئی اور بے چاری تمہاری آنٹی، وہ اتنی مسافت طے کر کے اسلام آباد تک اس کی پیچھے گئی تھیں۔ مجبوراً انہیں مری بھی جانا پڑا۔ تمہیں پتا نہ ہو شاید کہ تمہاری آنٹی برف سے مر جانے کی حد تک خوف کھاتی ہیں۔ مری ان کے ناپسندیدہ ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ وہ کبھی وہاں کا رخ نہ کرتیں، اگر انہیں تمہاری خوشی مقصود نہ ہوتی۔ صرف تمہاری وجہ سے انہوں نے یہ زحمت اٹھائی اور وہاں چند گھنٹے ٹھہرنے سے ہی ان کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں تمام راستہ چھینکتی رہیں، مگر ایکسائٹڈ بہت تھیں کہ عمر یہ خبر سن کر زیادہ خوش ہو گا یا زیادہ حیران، اور تم حیران تو ضرور لگ رہے ہو، خوش غالباً ذرا دیر میں ہو گے، جب تمہیں اس بات کی سچائی پر ایمان آ جائے گا۔"

عمر کو یاد آ رہا تھا کہ لوٹتے وقت آپا کی آنکھیں متورم اور ناک سرخ تھی۔ اس نے بتایا بھی تھا کہ وہ مری جا کر بیمار ہو گئی تھی اور اس نے آپا کو بیٹھ کر تھوڑی دیر سستانے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ اس کی باتوں سے آپا کو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ پہلی بار صحیح معنوں

میں اسے ادراک ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور اس کے وجود کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ کر دے۔

آپا کے اسلام آباد جانے کے بعد اس نے کیا، کیا نہیں سوچا تھا۔ اس کے مری جانے کی خبر سن کر اس کے تخیل نے کیسی کیسی گندگی آپا کے کردار پر پوتی تھی۔

اسے کیا حق تھا کہ وہ منصف بن کر گناہ گاروں اور معصوموں میں تفریق کرنے لگے۔

اسے کس نے اختیار دیا تھا کہ وہ کسی کو مغضوب قرار دے۔

''گندا، چوہڑا'' حکیم بیگم کے مارے ہوئے طمانچے کا درداب اس کے گال کو جلا رہا تھا۔

''لکی ہوئی ٹوم واسطے گودڑ پھرولنا چوز دا کم ہے، تو چور کیوں بنا۔'' (چھپے ہوئے زیور کے لیے میلے چیتھڑوں کو کھنگالنا چور کا کام ہے، تو چور کیوں بنا۔)

وہ چور تھا، اسے کھوج لگانے کی لت کہاں سے پڑی تھی؟ وہ معاف کرنے کے ہنر سے کیوں نا آشنا تھا؟

''یہ آپ کا جہنم ہے جو آپ کے سامنے جل رہا ہے۔''

اپنا کہا ہوا جملہ اس کی سماعت میں گونج رہا تھا۔ کسی کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کرنے کا حق انسان کو کب دیا گیا تھا۔ اللہ کے سوا کون ہے جو یہ تعین کر سکے۔ اس نے زندگی میں بہت سی ذلتوں کا سامنا کیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کبھی ایسی ذلت اور شرمندگی سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

اپنی نظر میں ذلیل ہونے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلت نہیں، کیونکہ خود سے چھپنے کے لیے کوئی اوٹ نہیں ہوتی، کوئی پردہ نہیں ہوتا، سب کچھ ایسا صاف ہوتا ہے جیسے کانچ کی شفاف دیوار کے ایک طرف بیٹھ کر دوسری طرف کا منظر دیکھ رہے ہوں۔

اس کے پاس آپا کے خلاف ثبوت ہی کیا تھے جن کی بنا پر اس نے اتنی رکیک باتیں آپا کی ذات سے منسوب کر دی تھیں۔

اس نے ثبوتوں کو شمار کرنا شروع کیا اور ایک ایک کر کے وہ سارے غیر حقیقی اور خود ساختہ نظر آنے لگے۔

دو ان دیکھی، اجنبی عورتوں کی حسد میں کی ہوئی باتیں کس لحاظ سے معتبر ہو سکتی تھیں۔ ان کی صداقت کو جھٹلانے کے سو دلائل ہو سکتے تھے، مگر تب وہ کسی دیگر خطوط پر سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شک کو اپنا رہنما بنایا تھا۔

شک جو محدب عدسے کی طرح کام کرتا ہے، جو ایک معمولی چیونٹی کو بھی بھیانک مخلوق بنا کر دکھا سکتا ہے۔ اس نے شک کے سنگریزوں سے جو دیوار اساری تھی وہ حقیقت کے ایک ہی دھکے سے زمین بوس ہو گئی تھی اور وہ خود اس کے بوجھ تلے دب گیا تھا، اس کی سانسوں میں ریت اڑ رہی تھی۔ وہ گرد و پیش سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ اندر کی آوازوں کا شور اتنا بلند تھا کہ باہر کا شور معدوم ہو گیا تھا۔ وہ گویا بہرہ ہو گیا تھا۔ شوکت صاحب نے اس کا کندھا تھام کر ہلایا تو وہ یوں چونک گیا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔

''برخوردار! تم تو یوں کھو گئے جیسے میں نے تمہیں سات مرلے کے مکان کی ملکیت کی خبر نہ سنائی ہو، بلکہ بکنگھم پیلس کی چابیاں تمہارے حوالے کر دی ہوں۔''

عمر ساکن پلکوں سے انہیں ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔

''تو کل شام چھ بجے کا وقت مناسب رہے گا وکیل صاحب سے ملاقات کے لیے؟ تیار رہنا، میں کل شام کو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا، کوئی لمبا چوڑا کام نہیں ہے، بس ایک، دو گھنٹوں کی فرصت کافی ہوگی۔''

وہ چپ چاپ کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا۔

شوکت صاحب اس کی خاموشی کو اقرار سے تعبیر کرتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ ''میں ذرا تمہاری آنٹی کو دیکھ آؤں، تم سے ان شاء اللہ کل دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

وہ شبنم آلود گھاس پر آنکھیں گاڑھے کتنی ہی دیر وہیں رکا رہا۔حکیم بیگم کی آواز پر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔

''کاکا! نرس بلانے آئی تھی تجھے۔اندر جا کے ڈاکٹر دی گل سن آ، تے اس نوں پچھ (پوچھ) لے کہ تیری ماں دے کھان واسطے کیہڑی (کون سی) شے ٹھیک رہے گی۔''

اندر جا کر ڈاکٹر کی بات سن لے اور اس سے پوچھ بھی لینا تیری ماں کو کھانے کے لیے کیا چیز ٹھیک رہے گی۔)

عمر نے تھوک نگلتے ہوئے گلا تر کیا اور فروتریں آواز میں بولا۔

''بے جی! دعا کر کہ میں نے جو غلط کر دیا ہے، وہ صحیح ہو جائے، دعا مانگ کہ مجھے سکون مل جائے۔اللہ سے کہہ کہ وہ مجھے سکون دے دے، اس سے میرے لیے مانگ، اس سے کہہ دے کہ مجھے کھوجی نہیں بننا، مجھے چور نہیں بننا، مجھے ظالم بھی نہیں بننا، مجھے رحم کرنے والا بننا ہے، مجھے معاف کرنے والا بننا ہے، مجھے شکر کرنے والا بننا ہے۔

☩ ☩ ☩

جہاز کے سفر میں اس کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔زیادہ وقت وہ آمنہ اور یوسف کی نومولود بیٹی باربینہ کے متعلق سوچتا رہا۔ان دونوں نے اتنے برسوں میں اولاد پانے کی غرض سے کیا، کیا پاپڑ نہ بیلے تھے اور بالآخر اللہ نے ان کی آس پوری بھی کر دی تھی، مگر پیدا ہونے والی بچی قبل از وقت پیدائش سے جڑی کئی بیماریوں میں مبتلا تھی۔

پیدائش کے وقت سے ہی ایک بے حد مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں اپنی فیلڈ کے نامور ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے تھے اور اب تک بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔دن بدن اس کی زندگی کی امید کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔سب دنیاوی وسائل ہوتے ہوئے بھی تقدیر کے مقابل انسان کی ازلی بے بسی سے کوئی مفر نہیں تھا۔

وہ بچی آمنہ اور یوسف کی زندگی میں ایک انقلاب لے کر آئی تھی۔وہ چلی جاتی تو بھی ایک انقلاب برپا کر جاتی، البتہ دونوں تبدیلیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

پچھلے کچھ ماہ میں جب بھی اس کی ان دونوں میاں، بیوی سے بات ہوئی، وہ ایک عجیب ہیجان کے زیر اثر محسوس ہوئے۔شادی کے بیس سال بعد پہلی دفعہ اولاد کی آمد کی امید بندھنے پر شاید دنیا کا کوئی بھی جوڑا ایسے ہی ہیجان میں گرفتار ہو جاتا۔آمنہ اور یوسف جو عام طور پر سنجیدہ اور بردبار قسم کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ان دنوں چھوٹے بچوں کی مانند جذباتی اور ہنسوڑ ہو گئے تھے۔ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے معمولی معمولی باتوں پر وہ اس قدر ہنستے کہ کئی مرتبہ عمر کو انہیں ٹوکنا پڑتا۔

یوسف اسے متوقع اولاد کے لیے اپنے منصوبوں سے آگاہ کرتا رہتا کہ بیٹی ہوئی تو اسے یہ بناؤں گا، بیٹا ہوا تو اسے وہ بناؤں گا اور فون کے اختتام تک وہ دس بار ان چنے ہوئے پیشوں میں تبدیلی کرتا۔ہر فون کال میں اس کے منصوبوں میں ترمیم جاری رہتی۔آمنہ کے پاس بتانے کو اپنے ہی بیسیوں موضوعات تھے۔وہ اسے نرسری کی آرائش اتنی باریکیوں سے سمجھاتی کہ وہ عاجز آ جاتا۔بچے کے لیے کی جانے والی خریداری کی تفصیلات سنتے سنتے اس کا سر دکھنے لگتا۔

آمنہ نے کچھ ایسے کھلونے بھی ابھی سے خرید لیے تھے جنہیں چار، پانچ سال سے کم عمر کے بچے استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس کی فون کالز اتنی طویل ہوتیں کہ بعض اوقات عمر کو منت کر کے فون بند کروانا پڑتا۔جب اس کے خیال میں گفتگو کا اختتام آ جاتا تو آمنہ کو کوئی نئی بات یاد آ جاتی اور کال کی طوالت بڑھ جاتی۔

اور حکیم بیگم کی خوشی بھی تو دیدنی تھی۔اس کی دعاؤں کو قبولیت ملی تھی۔اللہ نے اس کی عرضی منظور کر لی تھی۔اس جوش و خروش کو زوال تب آیا تھا جب آمنہ کی گائناکولوجسٹ نے بچی کی صحت کے بارے میں تشویش ناک باتیں کرنا شروع کیں، یوں جیسے

تیار شدہ لذیذ پکوان میں راکھ اڑ کر پڑ گئی ہو۔

ایئر پورٹ پر آمنہ اور یوسف میں سے کوئی بھی اسے لینے نہیں آیا تھا۔ یوسف کے اک کولیگ نے عمر کے نام کا کارڈ اٹھا رکھا تھا جسے دیکھ کر عمر اس کے قریب چلا آیا اور اپنا تعارف کروایا۔ ایئرپورٹ سے آمنہ اور یوسف کے گھر تک کم و بیش ایک گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ یوسف گھر پر ہی موجود تھا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے عمر کو خوش آمدید کہا تھا۔

''سوری عمر! میں تمہیں ریسیو کرنے ایئر پورٹ نہیں آسکا۔ بس میرے سر میں بہت درد تھا۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟ اور تمہارا سفر آرام دہ رہا نا؟'' اس نے رسما معذرت کی تھی۔

''نہیں۔ برا کیوں لگے گا؟ آپ اپنے دوست کو نہ بھی بھجواتے تو میں ٹیکسی لے کر خود آ سکتا تھا۔ آپ نے خوامخواہ زحمت کی۔'' عمر کو اپنی اہمیت جتانے کا شوق کبھی نہیں رہا تھا اور موجودہ حالات میں تو تکلفات جیسی چیزوں کی توقع رکھنے کو وہ بے حسی تصور کرتا تھا۔

''آمنہ باجی کہاں ہیں؟'' یوسف کی تقلید میں سٹنگ روم میں آتے ہوئے عمر نے سوال کیا۔

''وہ اسپتال میں ہے، وہ دن کا زیادہ حصہ وہیں پر ہوتی ہے۔''

''تو پھر ہم بھی اسپتال چلتے ہیں۔ میں بارینہ کو دیکھ لوں گا اور آمنہ باجی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔'' عمر نے اپنا سوٹ کیس دیوار کے سہارے ٹکاتے ہوئے مڑ کر یوسف سے کہا۔

''نہیں۔ تم تھکے ہوئے ہو گے، تھوڑی دیر آرام کر لو، میں شام کو تمہیں لے چلوں گا۔ میڈ دو دن سے نہیں آ رہی تو تمہارے لیے گیسٹ روم کی صفائی بھی نہیں ہو سکی۔ فی الحال تم اسی کمرے میں رہو، یہ واش روم ہے۔''

اس نے داہنی دیوار میں نصب دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''بھوک لگ رہی ہے تو بتاؤ، میں تمہارے لیے کوئی چیز بنا لاتا ہوں۔''

''ابھی اس کی ضرورت نہیں، میں نے فلائٹ میں کچھ کھا لیا تھا۔''

''تو ٹھیک ہے تم ریسٹ کرو، اس کمرے سے باہر نکلو گے تو کوریڈور میں پہلا دروازہ کچن کا ہے۔ تمہیں جب بھی کھانے پینے کو کچھ چاہیے ہو تو جھجکے بغیر لے لینا۔ میک یور سیلف ایٹ ہوم۔''

اس نے نہا کر کپڑے بدلے۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر ظہر کی نماز ادا کی، پھر سونے کی نیت سے کاؤچ پر لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تھا، لیکن نیند نہیں آئی، بارینہ کو دیکھنے کے تصور سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ آمنہ کے سامنے آنے سے قبل وہ ذہن میں ان الفاظ کو مرتب کر رہا تھا جو اس موقع پر اسے آمنہ سے کہنے تھے۔ بہت سوچنے کے باوجود اسے کوئی ایک موزوں تشفی آمیز جملہ بھی نہیں مل سکا۔

حکیم بیگم نے بارینہ کے حوالے سے جو کام اسے سونپا تھا اسے پورا کرنا بھی ایک مسئلہ تھا، اسے خدشہ تھا کہ آمنہ کو اس پر اعتراض ہو گا، وہ شش و پنج میں تھا کہ کیسے اسے قائل کرے گا۔ دراصل اسے رخصت کرتے ہوئے حکیم بیگم نے کانچ کی ایک چھوٹی سی بوتل اس کے سپرد کی تھی، جس میں سادہ پانی بھرا ہوا تھا۔

''کاکا! لکھ درداں دی اک دوا ہے اللہ۔ کوئی بیماری، کوئی روگ ایسا نئیں جس کو وہ قدرتاں والا ٹال نہ سکے۔ اس پانی تے میں نے ان گنت واری (بے شمار دفعہ) اللہ داناں پڑھ دیا ہے، آیتوں کا وِرد پکایا ہے۔ جنی وی (جتنی بھی) میری اوقات تھی۔ بسم اللہ پڑھ کے اس دا اک قطرہ میری دوہتری (نواسی) کو پلا دے جا کے۔ شفا ہو گی، تے یقین پکا کر کے، شک نہ کرنا اس دی رحمت وچ۔ ڈاکٹر تے یقین ہوتے فیر ہی دوا شفا دیتی ہے۔ آمنہ بڑی وسواسن (وہمی) ہے۔ وہ سوجھتاں کرے گی، کہے گی کہ حکیم بیگم کو تھری (صفائی سے بے بہرہ) ہے۔ اس کو جراثیماں دا پتا ئیں۔ تو بتا دینا کہ میں نے گیس والے چلہے تے پانی کو ابالا دے دیا ہے۔ بوتل وی

نویں ستھری ہے، کوئی وہم نہ کرے۔ میں پینڈو (دیہاتی) ہوں، پر کملی (پاگل) نہیں۔ جا میرا پتر تے مجھے خیر کی خبر پہنچا۔" عمر نے ہامی تو بھر لی تھی، مگر یہاں آنے کے بعد آمنہ کی متوقع مخالفت کا سوچ کر وہ متذبذب ہو گیا تھا۔

کروٹیں بدلتے بدلتے عصر کی نماز کا وقت ہو گیا اور اس پر ذرا سی غنودگی بھی نہ چھائی، اس نے اٹھ کر نماز پڑھی، کچن میں جا کر ایک گلاس دودھ کے ساتھ دو توس سینک کر کھا لیے اور یوسف کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سات بجے کے قریب اپنے بیڈ روم سے تیار ہو کر نکلا تھا۔ عمر پہلے سے ہی تیار تھا۔ وہ دونوں اسپتال چلے گئے۔ رت جگوں کی ماری ہوئی، ستے ہوئے چہرے والی آمنہ اسے دیکھ کر تھکن گزیدہ آواز میں بولی۔

"تم آج آنے والے تھے، جانے کیوں ذہن سے محو ہو گیا۔ آج کل کسی شے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ تم ٹھیک ہو؟ بے جی اور تمہاری امی کیسی ہیں؟"

جواباً عمر نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"بارینہ کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"آؤ! میں تمہیں لے چلتی ہوں۔" آمنہ نے مڑتے ہوئے کہا تھا۔

یوسف ان کے ساتھ جانے کے بجائے وہیں ٹھہر گیا تھا۔

"یوسف اتنا بزدل ہے کہ حد نہیں۔ بارینہ کو دیکھنے سے ڈرتا ہے۔ اسپتال آ بھی جائے تو کونوں کھدروں میں چھپتا پھرتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اگر میری آنکھوں کے سامنے وہ مر گئی تو ساری زندگی یہ منظر مجھے haunt کرتا رہے گا۔ مجھے غصہ آنے لگتا ہے اس پر۔ کوئی مرد اتنا کم حوصلہ بھی ہوتا ہے۔" اس کے ساتھ چلتے ہوئے آمنہ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

انہیں بارینہ کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چند فٹ کی دوری پر رک کر ایک کانچ کے دروازے سے وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ عمر نے کبھی بارینہ جتنا کم وزن بچہ نہیں دیکھا تھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کی لمبائی بمشکل بارہ انچ تھی۔ اس کی کھال اتنی باریک تھی کہ اس کے جسم کی ساری ہڈیاں بغیر کسی دقت کے گنی جا سکتی تھیں۔ اس کے بدن پر بے شمار ابھری ہوئی نسیں تھیں جو تیزی سے دھڑک رہی تھیں۔

"میں گھنٹوں یہاں کھڑی اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ اس ڈر سے کہیں جاتی نہیں کہ میرے جانے کے بعد وہ مر نہ جائے۔ بے وقوفی ہے میری، میرے رکنے سے بھی کب وہ زندہ رہے گی۔ پر میں کیا کروں، میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے ایک لمحے کی بھی چوک ہو گئی تو میں دوبارہ اسے دیکھ نہیں پاؤں گی۔ یوسف کہتا ہے میں پاگل ہو گئی ہوں۔ کیا میرا پاگل ہونا کوئی غیر فطری بات ہے، مجھے پاگل ہونا ہی چاہیے۔ میں کیوں پاگل نہیں ہوں گی؟ کئی سالوں سے ہم نے طے کر رکھا تھا کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام اسد اور بیٹی ہوئی تو بارینہ نام رکھیں گے۔ بارینہ آئرش نام ہے۔ اس کا مطلب ہے پہاڑی کی چوٹی۔ کتنی مضبوط، اونچی اور شان دار ہوتی ہے پہاڑی کی چوٹی، میری بیٹی کو دیکھو یہ کتنی لاچار اور حقیر ہے، اس سے زیادہ مجبور کوئی مخلوق تم نے دیکھی ہے کبھی؟ پھر بھی میں نے اس کا نام بارینہ رکھا ہے۔ یہ نہ رہی تو میرے رکھے ہوئے نام کا کیا ہوگا۔ میں کسے بارینہ کہوں گی؟ اسے کچھ ہو گیا تو زندگی کا کیا کروں گی میں؟ پھر مجھے یہ زندگی بھی نہیں چاہیے۔"

وہ گویا دیوانگی کے عالم میں خود کلامی کر رہی تھی۔

اس کا لباس شکن آلود اور بال الجھے ہوئے تھے۔ گہرے سانولے چہرے پر زردیاں کھنڈی تھیں۔ جانے کتنے دنوں سے وہ نہانے اور لباس تبدیل کرنے جیسی ضرورتوں سے کنارہ کش تھی۔ عمر کو اس پر ترس آیا۔ اسے الفاظ ڈھونڈنے میں سخت ناکامی ہو رہی تھی۔ زندگی ہر گام پر ایسے ادق سوال پیش کرتی ہے کہ عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔

''آپ اتنی مایوس نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ہمت کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''مایوس نہ ہوں؟'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''کبھی ڈاکٹر کہتے ہیں یہ دو دن مزید جیے گی، کبھی وہ ایک دن کی مہلت بڑھا دیتے ہیں۔ کل صبح پورے بیس سیکنڈز تک اس نے سانس نہیں لیا، ڈاکٹرز کا دعویٰ ہے کہ نیو بورن بے بیز کا اتنی دیر تک سانس نہ لینا ایک نارمل بات ہے۔ میں ان پر اعتبار کیوں کروں، باربینہ پر نارمل بچوں والے اصول کیسے لاگو ہو سکتے ہیں؟ میں موت کے پروں کی سرسراہٹ کو اس ہاسپٹل کے کوریڈورز میں سنتی ہوں۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھی مجھ پر ہنستی ہے۔ وہ مجھ سے باربینہ کو چھیننے آئی ہے اور میں اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتی اور تم کہتے ہو میں مایوس نہ ہوں۔ امید تو کہیں ہے ہی نہیں، میں ایک ناموجود شے کو کیسے پکڑوں؟''

''اللہ کوئی راہ نکالے گا۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔'' اس نے پھر آمنہ کو دلاسا دینا چاہا۔

''اللہ آسمان پر ہے اور ہم زمین پر رہتے ہیں۔ زمین اور آسمان کے بیچ کتنا فاصلہ ہے، کوئی اندازہ ہے تمہیں؟''

عمر کو اس بات سے دکھ ہوا۔ ''آپ کو دعا مانگنی چاہیے، اس سے بے چینی کم ہو جاتی ہے۔ بے جی ہر وقت باربینہ کی زندگی کی دعا کرتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ......''

اسے حکیم بیگم کا سونپا ہوا کام یاد آیا تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کانچ کی چھوٹی سی بوتل کو گرفت میں لے لیا۔

''کیا کہہ رہی تھیں بے جی؟'' آمنہ نے قدرے تلخی سے کہا۔ ''ان کے پاس کہنے کو ہے ہی کیا؟ فون پر مجبور کر رہی تھیں کہ میں ان کا دم کیا ہوا پانی باربینہ کو پلاؤں، میں نے جواب دیا کہ میں ایسی چیزوں پر یقین نہیں کرتی تو انہوں نے اس قدر بحث کی کہ تنگ آ کر میں نے کال کاٹ دی۔ انہیں کوئی کیسے سمجھائے کہ باربینہ کی ایک ایک دھڑکن اور ایک ایک سانس جدید آلات کے ذریعے مانیٹر کی جاتی ہے۔ یہاں ان کے دم کیے ہوئے پانی کی کوئی گنجائش نہیں۔

Her ignorance is all she knows. She is an old naive village woman.

(اپنی جہالت کے سوا وہ کوئی علم نہیں رکھتیں۔ وہ ایک بوڑھی، سادہ لوح دیہاتی عورت ہیں)''

حکیم بیگم کے بارے میں کہے گئے ان حقارت بھرے الفاظ نے عمر کو بہت تکلیف دی۔ آمنہ کو شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''She may be naive but she is not ignorant.

(وہ سادہ لوح ہو سکتی ہے، مگر وہ جاہل نہیں ہے)''

آمنہ نے کوئی دھیان نہیں دیا اور بولتی رہی۔ ''وہ کسی طور اپنی ضد سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہی نہیں تھیں، کہنے لگیں کہ عمر کے ہاتھ وہ پانی تمہیں بھجوا دوں گی۔ اور وہ پانی اتنا کراماتی ہے کہ اس سے سر درد سے لے کر کینسر تک ہر قسم کی بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔''

جیب کے اندر بوتل پر جما ہوا عمر کا ہاتھ پسینے سے بھیگنے لگا تھا۔

''بھلا بتاؤ، اس دور میں بھی اتنی جہالت کا مظاہرہ ممکن ہے۔ بے جی کی باتیں سن کر بسا اوقات مجھے لگتا ہے کہ وہ اسٹون ایج میں رہتی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس جہالت پر فخر بھی کرتی ہیں۔''

ہتھیلی میں نمی کی سبب بوتل اس کے ہاتھ سے پھسل رہی تھی۔

''شکر ہے کہ بے جی تمہیں اپنے جیسا بنانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ تم نے اپنی تمام زندگی ان کے سائے میں گزاری ہے پھر بھی ان کا رنگ تم پر نہیں چڑھا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ تم میں زمانے کے ساتھ ڈھلنے کی اہلیت ہے۔ تمہیں دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ پیدائش سے لے کر جوانی تک تم ایک پسماندہ گاؤں میں رہے ہو۔ خود میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ میں کیا

تھی اور کیا ہوگئی ہوں۔تم بھی میری طرح ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے عمر! I see a great deal of myself in you. (مجھے تم میں اپنا پرتو دکھائی دیتا ہے)''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس تعریف پر خوش ہونا چاہیے یا شرمسار۔

''تم نے America آنے کا فیصلہ کر کے مانو اپنی تقدیر بدل ڈالی ہے۔تم دیکھو گے کیسے دولت اور بلندی تمہارے قدموں میں لوٹتی ہیں۔ بے جی کے پاس تمہیں دینے کے لیے دقیانوسی نظریات سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے، مجھے یقین ہے دم والے پانی کی بات سن کر تمہیں بھی اتنا ہی غصہ آیا ہوگا جتنا مجھے آیا تھا۔''

اس نے بوتل پر سے انگلیاں ہٹاتے ہوئے آہستگی سے ہاتھ کو جیب سے باہر نکال لیا۔ اگلی صبح اسے بیدار ہوئے کچھ لمحے ہی بیتے ہوں گے کہ یوسف سٹنگ روم میں داخل ہوا۔

''میں اسپتال جا رہا ہوں، اگر تمہیں بھی جانا ہے تو جلدی تیار ہو جاؤ۔ میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' عجلت میں کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

مقدور بھر پھرتی سے لباس تبدیل کر کے عمر باہر آیا۔ یوسف کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس جل رہی تھیں۔ آسمان پر ستارے ابھی بجھے نہ تھے۔ اس کے دل میں کھد بدسی ہونے لگی۔ اس وقت انہیں اسپتال جانے کی کیا مجبوری تھی؟ دعا مانگتے ہوئے تیز قدموں سے چل کر وہ کار میں بیٹھ گیا۔

لکڑی کا پھاٹک پار کر کے جب کار سڑک پر آ گئی تو یوسف نے کسی جذبے سے عاری آواز میں کہا۔

''بارینہ مرگئی ہے۔''

✠ ✠ ✠

جب یوسف حکیم بیگم کو بارینہ کی موت کی خبر دے چکا تو اس نے عمر سے بات کرنے کو کہا تھا۔ یوسف کے ہاتھ سے ریسیور لیتے ہوئے خدا جانے کیوں اس پر بدحواسی چھا رہی تھی۔ ان ماں جی سے اس نے سلام کیا۔

''بے جی! جو ہونا ہوتا ہے، وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ تو بے حوصلہ نہ ہونا۔ جس کے بس میں جو تھا، وہ اس نے کر دیا، لیکن اللہ کی رضا تو ماننا پڑتی ہے۔''

دوسری جانب بوجھل خاموشی تھی۔ غالباً وہ رو رہی تھی، مگر عمر کو اس کے رونے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ممکن تھا اس نے ماؤتھ پیس اپنے منہ سے دور ہٹا دیا ہو۔ بہت دیر بعد حکیم بیگم نے ایک مختصر جملہ کہا جو عمر کو کسی چابک کی طرح لگا۔ وہ حیرت سے گنگ ہوگیا تھا۔ حکیم بیگم نے کہا تھا۔

''تو نے شک کیا نہ بیبا!''

وہ یہ کیسے کہہ سکتی تھی؟ وہ کیسے جانتی تھی کہ اس بار بھی وہ یقین کے امتحان میں ناکام رہا تھا۔ کیا حکیم بیگم کا یقین اتنا اٹل تھا کہ وہ بارینہ کے مرنے کی کوئی دوسری وجہ قبول کرنے پر تیار ہی نہیں تھی۔ پوچھے گچھے بنا ہی اس نے جان لیا تھا کہ عمر سے لغزش ہوگئی تھی۔ وہ منوں وزنی سل کے نیچے پسا جا رہا تھا۔

''پر بے جی! مہلت کتنی ہوگی یہ تو اس نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے۔ اللہ ہی موت کو بھیجتا ہے اور اللہ نے ہی اس کا وقت طے کر رکھا ہے۔ موت کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔''

''تو اللہ دی گل کرتا ہے تے فیر 'نمیں' وی کہتا ہے۔ اللہ اگے 'نمیں' دا کی کم؟ (اللہ کے سامنے 'نہیں' کا کیا کام؟) یہ 'نمیں'

میرے میرے لئے ہے۔ تجھے تو بس یقین کرنا تھا، تجھ سے وہ بھی نہ ہوا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر وہ حکیم بیگم اور اپنے یقین کا موازنہ کرنے لگا۔ حکیم بیگم نے جب بھی اللہ سے کچھ مانگا تھا، کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا ناممکن جبکہ وہ خود ہمیشہ اسی حساب کتاب میں الجھا رہتا تھا۔ اللہ سے وہ چیز کیوں مانگی جائے جو ہو ہی نہ سکتی ہو۔ وہ کبھی بھی ممکن اور ناممکن کے پھیر سے آزاد نہیں ہو پایا تھا۔

"میرا یقین آدھا ادھورا کیوں ہے؟ وسوسوں کا ڈسا ہوا، راہ بھٹکا ہوا، سوتا جاگتا، میں نظر کے فریب میں کیوں آ جاتا ہوں؟ نظر آسمان تک دیکھ سکتی ہے، لیکن آسمان پر کائنات ختم نہیں ہوتی، کوئی حد ہے تو میری نظر کی ہے۔ کائنات کی کوئی حد نہیں، جو میری آنکھ سے اوجھل ہے وہ غیر موجود نہیں اور جو مجھے نظر آتا ہے وہ کل نہیں۔ جہاں اوجھل اور ظاہر ملتے ہیں، جہاں وجود اور عدم میں دوئی مٹتی ہے، جہاں کل اور جزو ہم آغوش ہوتے ہیں، اس سرحد کو پار کرنے سے ہی بات بنتی ہے، بندھن وہیں ٹوٹتے ہیں، آزادی وہیں ہے۔"

بارینہ کے مرنے کے بعد کئی راتوں تک وہ پرسکون نیند نہیں سو سکا تھا۔

✠ ✠ ✠

اس نے مکان کی تختی پر کندہ الفاظ کو غور سے دیکھا، پھر جیب سے خط کا لفافہ نکال کر اس پہ لکھا ہوا پتا پڑھا اور مطمئن ہو گیا، یہ مکان ڈھونڈنے میں اسے کافی مشکلات کا سامنا ہوا تھا، کیونکہ اتنے برسوں میں بے تحاشا نئی تعمیرات ہوئی تھیں۔ کچھ نئی سڑکیں وجود میں آ گئی تھیں۔ بلاکس کی حد بندی میں ردوبدل ہوا تھا۔ لہٰذا یہاں تک پہنچنے میں اسے خاصا تردد کرنا پڑا تھا۔ اطلاعی گھنٹی کا جواب دینے ایک ادھیڑ عمر کا کیشین (caucasian) مرد آیا تھا۔ دروازے سے باہر آ کر وہ اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ عمر نے دو قدم آگے آتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

"یہاں مسٹر داؤد رہتے ہیں، مجھے ان سے ملنا ہے۔"

اس آدمی کا سر نفی میں ہلنے لگا۔ "ہے نہیں تھا، وہ رہتا تھا، یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے۔"

عمر کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔

"تو کیا مجھے ان کا نیا پتا مل سکتا ہے؟ تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ اب ان کی رہائش گاہ کہاں ہے۔ دیکھو میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے، میں انہیں تلاش نہ کر سکا تو ایک بے حد اہم کام ہونے سے رہ جائے گا۔ انسانیت کی ناتے تم میری مدد کرو۔" اس نے منت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

"میرا اس سے کوئی ذاتی تعلق تو نہیں ہے، میں نے یہ گھر ایجنٹ کے ذریعے خریدا تھا، البتہ میں ایک، دو بار اس سے ملا ضرور ہوں۔"

"پھر میں ان سے کیسے ملوں؟ کیا راستہ ہو سکتا ہے؟"

اس کے مخاطب نے شانے اچکا دیئے۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ ویسے اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ سلور لیک ڈسٹرکٹ میں منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن وہ بہت وسیع علاقہ ہے۔ درست اسٹریٹ اور مکان نمبر کے بغیر اسے ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔"

وہ پلٹ کر اندر چلا گیا تو عمر بے بسی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔

"ذرا رکو نوجوان۔" عقب میں آواز سن کر وہ دوبارہ مڑا تھا۔

''ابھی ابھی ایک بات مجھے یاد آئی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ مکان کے attic میں جو اخروٹ کی لکڑی کا صندوقچہ پڑا ہے، وہ بعد میں کبھی آ کر لے جائے گا، کیونکہ ٹرک میں اسے رکھنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ اب تک وہ اسے لینے نہیں آیا، لیکن اس کے رابطہ کرنے کا امکان تو ہے، ایسی صورت میں اسے تمہارا پیغام میں دے دوں گا، تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟''

''محمد عمر پاکستان سے۔'' اس نے شکریہ ادا کیا اور اپنا رابطہ نمبر دیتے ہوئے ایک مختصر سا پیغام بھی لکھوا دیا۔

''میں پرنیاں آئزک کا بیٹا ہوں، اگر یہ نام آپ کے نزدیک کوئی معنی رکھتا ہے تو جتنا جلدی ہو سکے، مجھ سے رابطہ کیجئے۔''

اس گھر کا پتا اس خط میں درج تھا جو اسے پرنیاں کے ٹرنک سے ملا تھا۔ خط کے متن سے صاف ظاہر تھا کہ داؤد یا تو پرنیاں کا رشتہ دار تھا یا کم از کم اس کے گھر والوں کو جانتا تھا۔ داؤد کو تلاش کرنے سے اس کا مقصد محض اتنا تھا کہ اس کے ذریعے پرنیاں کے گھر والوں کا سراغ پا سکے۔ اپنے اصل سے کٹ کر جیتے ہوئے آپا کو ایک عمر بیت گئی تھی۔ وہ کب سے تنہائی کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اسے اب اس قید سے نجات ملنی چاہیے تھی۔ آپا کی خاطر وہ اتنا تو کر ہی سکتا تھا۔



اپنے عکس پر نظریں جمائے ہوئے صوفیہ دیوار کے قریب سے آئینے کی سیدھ میں چل کر آئی۔ آئینے کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے اسٹول پر بکھری سنگھار کی مختلف اشیاء میں سے ایک سرخ لپ اسٹک منتخب کر کے احتیاط سے ہونٹوں پر لگائی اور ہونٹوں کو آپس میں ملا کر دباتے ہوئے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے آئینے کی طرف کمر کر دی اور گردن گھما کر پشت سے خود کو دیکھنے لگی۔ اس نے دل میں خود کو سراہا تھا۔ وہ بڑی دلکش نظر آتی تھی۔

اس نے سفید ٹیوب ٹاپ کے ساتھ سرخ رنگ کا جدید بناوٹ والا ٹراؤزر پہن رکھا تھا جس کے پائنچے ترچھے اور لہریے دار تھے۔ اس کے پیروں میں الپا کے سرخ stiletto جوتے تھے۔ بالوں کو بل دے کر اس نے ایک خوشنما سفید کنگھی اس ڈھب سے بالوں میں اٹکا دی تھی کہ ان کے نچلے سرے کمر کو نہ چھوئیں۔ اس ترکیب سے اس کی گردن اور شانوں کی ملائم جلد اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ ہنسلی کے اندر والے خم میں اس نے گلٹر glitter چپکا رکھا تھا۔ اس کے کانوں میں بیضوی ساخت کے سفید آویزے تھے جو چلنے کے دوران یا گردن کی جنبش سے ہلکورے لینے لگتے تھے۔ اس کا سراپا اتنا فسوں خیز لگ رہا تھا کہ کوئی مرد اسے آنکھ بھر کر دیکھ لیتا تو اسے نظر پھیرنے کی جرأت نہ ہوتی، خواہ وہ مرد کیسا ہی خشک مزاج اور پتھر دل کیوں نہ ہوتا۔ اس کا حسن ہر پتھر کو موم کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ اور وہ یہ ہی چاہتی تھی کہ مردوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکیں، اس کی بے اعتنائی پر تھم جائیں۔

یہ اہتمام اس نے مردوں کے لیے ہی کیا تھا۔ آج وہ خود کو دنیا کے مردوں کے سامنے پیش کرنے جا رہی تھی۔

کارل میکارتھی کا نام اس نے cops سے کیوں مخفی رکھا تھا، یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اسے زبان سے محض چند الفاظ ادا کرنے پڑتے اور کارل لمبے عرصے کے لیے جیل چلا جاتا۔ اس کا مستقبل داؤ پر لگ جاتا لیکن صوفیہ نے اایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اسے معاف کر نا نہیں کہہ سکتی تھی۔

اس نے کبھی کسی کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی معاف نہیں کی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ کارل سے بدلہ لینے پر خود کو آمادہ نہ کر پائی۔ اس کے اندر جیسے کسی جذبے کی موت ہو گئی تھی۔ غصہ امڈا ہی نہیں، خون ابلا ہی نہیں، گویا چائے کی بھاپ اڑاتی پیالی میں، کسی نے برف کی ڈلی پھینک دی ہو۔ کارل زندہ رہتا یا مر جاتا، دونوں باتیں یکساں طور پر غیر اہم تھیں۔

کارل کے ہاتھوں زخمی ہو کر اسپتال جانے کے بعد گرانٹ چند دنوں کے لیے گھر آیا تھا، پھر دوبارہ اسپتال گیا تو اس کی واپسی نہیں ہوئی۔ اس کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا کوئی امکان موجود نہ تھا کہ موت سے قبل اسے اسپتال سے باہر نکلنے کی

ضرورت پیش آئے گی۔ تنہا ہوتے ہی صوفیہ نے اس بڑا پارلر میں جاب شروع کر دی تھی جس کا برو شر دکھا کر اس نے گرانٹ سے وہاں کام کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور جواب میں بے لچک انکار سنا تھا۔

پارلر میں روزانہ اس کا بھانت بھانت کے مردوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں سے اپنے لیے کلائنٹس تلاش کرنا ذرا بھی دشوار نہ تھا لیکن وہ ایک وقت میں ایک ہی پیشہ اپنانے کے اصول پر عمل پیرا تھی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایک سے زائد سمتوں میں منقسم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ خود کو آزادی کا عادی بنا رہی تھی۔ گرانٹ کے ساتھ رہتے ہوئے جن کاموں کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ اب انہیں کھلے عام کرنے میں بھی کوئی شے مانع نہ تھی۔ پارلر کی نوکری اگر ہنگامہ خیز نہیں تھی تو سرے سے غیر دلچسپ بھی نہیں تھی۔

وہ مرد کسٹمرز کے معنی خیز فقروں اور کنایوں سے محظوظ ہوتی تھی۔ ایک، دو نے اسے ڈیٹ پر جانے کی دعوت بھی دے ڈالی تھی۔ ایسی دعوتیں قبول کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنی آئندہ زندگی کا جو نقشہ تصور کیا تھا اس میں ان مردوں کی کوئی جگہ نہیں تھی جو قیمت ادا کیے بغیر اس سے کسی مہربانی کی توقع کرتے، اس کی ترجیحات قدرے مختلف تھیں۔

اسے بڑا پارلر کی ملازمت کرتے ہوئے تقریباً تین ماہ گزر چکے تھے اور اب وہ اس معمول میں زیادہ کشش نہیں پاتی تھی، پھر اسے گرانٹ کی صحت کا تیز انحطاط بھی تشویش میں ڈال رہا تھا۔ وہ مزید تاخیر کرتی تو ممکن تھا کہ گرانٹ ایک دردناک اذیت سے روشناس ہوئے بغیر ہی دنیا سے چلا جاتا اور گرانٹ کو اس تکلیف سے محروم رکھنا اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے آج رات ہی یہ فریضہ انجام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ طویل مدت سے جس کی منتظر تھی، اس وقت کی آمد پر اس کا گھبرانا ایک فطری امر تھا۔ اس نے آئینے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔ بھاری مسکارے کے سبب اس کی پلکوں میں اکڑن سی تھی۔ ایک سگریٹ لگا کر اس نے سرخ لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں کے گوشے میں قرینے سے دبایا اور چھوٹے چھوٹے کش لینے لگی۔ کھلی کھڑکی سے بہار کی ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں در آیا تھا۔ ہوا کے نیم گرم لمس سے اسے اندازہ ہوا کہ آج رات خاصی گرمی ہوگی۔ یہ سوچ کر اسے کوفت ہوئی تھی کہ اس موسم میں اسے کلائنٹس تلاش کرنے کی خاطر سڑکوں پر مارے مارے پھرنا ہوگا۔ اس نے پھر سے اپنے لباس پر غور کیا اور سوچا کہ موسم کی مناسبت سے اس کا انتخاب موزوں تھا۔

نصف سگریٹ جل بجھا تھا۔ اس نے آئینے سے نظر سرکائے بنا ہاتھ بڑھا کر اسٹول پر رکھا ہوا پرس اٹھا لیا۔ باہر گہرا ہوتا ہوا اندھیرا اعلان کر رہا تھا کہ اب جانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اصل کام پر کمر بستہ ہونے سے قبل اسے گرانٹ سے ملنے اسپتال بھی جانا تھا یا غالباً گرانٹ سے ملنا ہی اصل کام تھا۔

اب یہ طے کرنا دشوار تھا کہ اس نے کب hooker بننے کی ٹھانی تھی وہ کسی خاص لمحے یا ایک حتمی تاریخ کی نشاندہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی زندگی اس طرز پر گزری تھی کہ واقعات، حادثات اور جذبات کا ملغوبہ سا بن گیا تھا۔ اس ملغوبے میں سے کسی ایک واردات کی جداگانہ پرکھ کرنا ایسا ہی کٹھن تھا جیسا پکی ہوئی جیلی میں سے جیلاٹن سفوف اور پانی کو الگ کرنا۔

سگریٹ کا جلتا ہوا سرا اس کی انگلیوں کے قریب آ گیا تھا۔ بائیں ابرو کے کنارے سے باہر پھیلی ہوئی آئی پنسل کی مدھم سیاہی کو انگلی سے مسل کر صاف کرتے ہوئے اس نے آخری کش کھینچا اور دھوئیں کا مرغولہ آئینے کی سطح پر اچھال دیا۔ لمحاتی طور پر اس کا عکس یوں دکھائی دیا تھا جیسے وہ دھوئیں میں لپٹی ہوئی جل رہی ہو۔



صوفیہ جب شعوری بیداری کے اس مرحلے پر پہنچی جس کو ہوش سنبھالنا کہتے ہیں تو اس نے خود کو دو نیم پاگل افراد میں گھرا

ہوا پایا۔ گرانٹ اور البا، جو اس کے ماں باپ تھے، ایک گھر میں اکٹھے کیوں رہتے تھے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن طلوع ہوا ہو جب البا، گرانٹ کے ہاتھوں مار کھانے سے محفوظ رہی ہو۔

وہ اسے اتنی بے دردی سے مارتا جیسے کسی پتھر یا لکڑی کو مار رہا ہو۔ اس کے باوجود البا نے کبھی گھر چھوڑنے یا گرانٹ کو گھر سے نکالنے کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب صوفیہ نے اس سے سوال کیا کہ وہ گرانٹ سے الگ کیوں نہیں ہو جاتی تو اس نے کراہتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں کیا پتا کہ محبت کتنی بڑی لعنت ہے۔ دنیا کی کوئی تکلیف اس تکلیف کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو مجھے گرانٹ کو نہ دیکھنے سے ہوتی ہے۔ کوکین کی بڑی سے بڑی ڈوز بھی وہ سرور پیدا نہیں کرتی جو اس کی قربت سے پیدا ہوتا ہے۔''

صوفیہ کو اس کی یہ توجیہہ سن کر اس پر طیش آیا تھا۔ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان ایسی باتیں کر سکتا تھا۔

ان کے گھر کے بیرونی دروازے کے اوپر پھیلے ہوئے سائبان پر سرخ اور سنہری روغن سے ''گرانٹ اور البا کا Love nest'' لکھا تھا۔ اسے ان الفاظ سے اتنی چڑ تھی کہ آتے جاتے اس کی نظر ان پر پڑتی تو اس کا خون کھولنے لگتا۔ قریب کے گھروں میں رہنے والے بچے ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اس کی تضحیک کرتے تھے۔ وہ سب واقف تھے کہ صوفیہ کے ماں، باپ میں کتنا ''پیار'' تھا۔ کوئی بچہ اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا اور بناوٹی حیرت کے ساتھ دوسرے بچوں سے پوچھتا۔

''یہ تو وہ ہی ہے نا۔ Love nest کی باسی، پیار کرنے والے پنچھیوں کی بیٹی ننھی پیاری چڑیا۔''

اور وہ سب قہقہے لگاتے۔ پھر یوں ہوا کہ کچھ شیطان لڑکوں نے Love nest کے پہلے ایل L اور آخر والے تین حروف پر سیاہی پھیر دی۔ اب جو نیا لفظ بنا وہ ''Oven'' تھا۔ اپنے گھر کے لیے یہ نام صوفیہ کو موزوں لگا تھا۔ گھر کی فضا کسی اوون کی طرح ہی حبس زدہ اور جھلسانے والی تھی۔ چند روز یہ بات بھی چٹکلوں کا موضوع بنی رہی۔ پھر بچے بھول بھال گئے اور صوفیہ کی زندگی سے کم از کم ایک تلخی دور ہو گئی۔

وہ البا اور گرانٹ دونوں سے متنفر تھی۔ یہ تعین کرنا آسان کام نہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کس سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ دونوں سے نفرت کرنے کی مختلف وجوہات تھیں۔

البا کے نزدیک اس کا وجود اور عدم وجود دو مختلف باتیں نہیں تھیں۔ کسی روز اگر اسکول سے واپس گھر آنے کے بجائے وہ کسی دوسری جگہ چلی جاتی تو یقیناً اگلے کئی دنوں تک البا کو یاد نہ آتا کہ اس گھر میں ایک چھوٹی لڑکی بھی رہتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ پورا دن بیت جاتا اور البا اس سے ایک جملہ تک نہ کہتی، اس پر ایک مکمل نظر تک نہ ڈالتی۔

ایک بار کھیل کے دوران اسکول کی ایک لڑکی کے دھکا دینے پر گرنے کے باعث اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے، لیکن البا کو اس کا سوجا ہوا ہونٹ اور خون آلود مسوڑھے اس لیے دکھائی نہ دیے کہ اس کے رونے کی آواز سن کر اس نے بند دروازے کے پیچھے سے ہی چیختے ہوئے اسے دفع ہو جانے کو کہا تھا۔ وہ کمرے کے اندر اپنے ایک موسیقار دوست کے ساتھ اس کی بنائی ہوئی دھنیں سن رہی تھی۔

گرانٹ اور کوکین کے سوا کسی تیسری شے کی البا کو پروا نہ تھی۔ اسے تو صوفیہ کی تاریخ پیدائش تک یاد نہیں تھی۔ کبھی کبھی اسے شک ہونے لگتا کہ البا سے اس کا خون کا رشتہ تھا ہی نہیں، اس نے بری سے بری ماؤں کو بھی اپنے بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کم سے کم وہ اتنا ضرور جانتی تھیں کہ ان کے بچوں کی عمریں کتنی تھیں، وہ اسکول میں کس کلاس میں پڑھتے تھے اور وہ دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے یا بائیں ہاتھ سے۔

گرانٹ کا معاملہ اس کے یکسر برعکس تھا۔ وہ اس کی ایسی کڑی نگرانی کرتا کہ اس کی نظروں سے چھپ کر کچھ کر لینا صوفیہ

کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اس کے اٹھتے ہوئے قدم گنتا، اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظ شمار کرتا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ اسے اپنی مرضی سے سانس لینے کی اجازت بھی نہ دیتا۔

گرانٹ مسلمان تھا، وہ صوفیہ کو بھی اپنے مذہب پر چلا رہا تھا۔ دن بھر کی عبادات اور روزانہ قرآن پڑھنا اسے بہت مشکل لگتا تھا۔ وہ جان چھڑانے کے کئی حیلے کرتی، مگر گرانٹ کسی صورت اسے بخشنے پر تیار نہ ہوتا۔ اس کے خیال میں صوفیہ ایک ناپاک مخلوق تھی۔ اسے مصفا اور خالص بنانا ہی گرانٹ کی سب سے اہم ذمہ داری تھی۔ اسے سدھارے کی غرض سے وہ ہر طرح کے حربے آزماتا تھا۔ اس سدھار میں زبانی ڈانٹ پھٹکار سے جسمانی سزائیں تک شامل تھیں۔

گرانٹ اور البا کے اودن میں وہ دھیرے دھیرے جھلس رہی تھی۔



وہ اس تنگ اور تاریک خلا میں سمٹی ہوئی بدقت سانس لے رہی تھی۔ اس قدر گاڑھا اندھیرا تھا کہ اسے اپنے ہاتھ تک نظر نہ آتے تھے، جن سے وہ لکڑی کی ٹھوس دیوار پر لگا تار دستک دے رہی تھی۔

''مجھے باہر نکال دو، میرا سانس بند ہو رہا ہے، میں مرجاؤں گی۔''

ہذیانی انداز میں روتے ہوئے وہ ایک جیسے لفظوں کی تکرار کیے جاتی تھی۔ اگر باہر سے گرانٹ کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی نہ دے رہی ہوتیں تو وہ خوف سے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

گرانٹ نے بطور سزا کچھ دیر قبل اسے الماری کے خانے میں گھسیڑ کر پٹ بند کر دیا تھا۔ پچھلے کئی منٹوں سے وہ گرانٹ سے التجائیں کر رہی تھی کہ وہ اسے باہر نکال دے، مگر اب تک اس کی رائے تبدیل نہ ہوئی تھی۔

گرانٹ نے آج صبح سکول جانے سے پہلے اسے قرآن کی ایک طویل سورت زبانی یاد کرنے کی ہدایت کی تھی، جس کا امتحان اسے شام کو لینا تھا۔ صبح ہی صوفیہ کی اسے یاد کرنے کی نیت نہیں تھی۔ کیونکہ اسے وہ طویل سورت اتنی کم مہلت میں حفظ کرنا ناممکن لگ رہا تھا اور پھر اسکول سے آتے ہی وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن ہو گئی تو گرانٹ کی ہدایت اس کے ذہن سے نکل گئی۔ اپنے مقرر کیے ہوئے وقت پر جب گرانٹ نے اسے وہ سورت سنانے کو کہا تو وہ گونگوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگی۔

اب وہ الماری میں بند اسی کوتاہی کی سزا بھگت رہی تھی۔ روتے روتے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔

''اندر اندھیرا ہے نا؟'' گرانٹ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں اندازہ ہوا کہ اندھیرا کتنی خوفناک شے ہے، وہ کیسے انسان کو ڈراتا ہے؟ قبر کا اندھیرا اس اندھیرے سے ہزار گنا زیادہ ڈراؤنا ہوگا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری قبر میں ذرا بھی روشنی نہ ہو، اتنی بھی نہیں کہ تمہارے بدن کا گوشت نوچنے والے کیڑے تمہیں نظر آ سکیں۔ یہ ہی تمہاری خواہش ہے تو میں تمہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ یہ ضرور پوری ہوگی۔ خدا سے بغاوت کرنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ایک مسلمان ہو کر تم اپنی مرضی کی بے لگام زندگی گزارو گی۔''

اشتعال میں گرانٹ الماری کے پٹ پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔

''مجھے معاف کر دو، میں اب نہیں کروں گی، میں معافی مانگتی ہوں، اب ایسا نہیں ہوگا، ایک بار مجھے معاف کر دو۔'' ہچکیوں کے دوران وہ بے ربط جملے بول رہی تھی۔

''مجھ سے نہیں خدا سے معافی طلب کرو، وہ تمہیں معاف کرے گا تو عذاب تم سے دور ہوگا۔ اونچی آواز میں سو دفعہ کہو کہ اے میرے خدا میرا گناہ معاف کر دے۔''

وہ تیزی سے اس کا بتایا ہوا فقرہ دہرانے لگی تھی۔

''اونچی آواز میں کہو، مجھے سنائی نہیں دے رہا۔''

اس نے گرانٹ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آواز بلند کر دی تھی۔

''اور اونچا۔ اتنی اونچی آواز میں معافی مانگو کہ تمہاری آواز آسمان تک جائے۔ شاباش دہراتی رہو، میں گن رہا ہوں، ابھی تمہیں چالیس دفعہ اور کہنا ہے۔''

✠ ✠ ✠

اس کی انگلش کی ٹیچر نے اس کے والدین میں سے کسی ایک کو اسکول بلوایا تھا۔ لہٰذا گرانٹ اس کے اسکول آیا تھا۔ ٹیچر مارشا نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر گرانٹ کے حوالے کیا۔

''یہ صوفیہ نے لکھا ہے، تم اسے پڑھ لو تو اس کے متعلق بات کرتے ہیں۔''

گرانٹ نے کاغذ کی تحریر پر نظر ڈالے بغیر اسے ٹیچر مارشا کو لوٹا دیا اور قدرے ترش لہجے میں بولا۔ ''اگر تم مجھے اس میں سے گرامر اور ہجوں کی غلطیاں نکالنے کو کہہ رہی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ یہ تمہارا کام ہے، اگر پڑھائی میں صوفیہ کی کارکردگی تسلی بخش نہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے صوفیہ ذہین ہے اور سیکھنے کے معاملے میں بھی زیادہ بری نہیں۔ دراصل میں نے کلاس کے بچوں کو تخلیقی لکھائی کا کام دیا تھا۔ ہر بچے کو کسی دوسرے کی مدد لیے بنا ایک مضمون تحریر کرنا تھا۔ جس کے لیے موضوع کا چناؤ بھی اسے خود کرنا تھا۔ صوفیہ کے مضمون کا موضوع ہے خدا۔''

''یہ تو بڑی عمدہ بات ہے، اس سے اچھا موضوع کیا ہوگا۔'' گرانٹ نے صوفے کے کونے میں سہم کر بیٹھی ہوئی صوفیہ کو خوشی بھری نظروں سے دیکھا۔

''موضوع تو بلاشبہ بہترین ہے، لیکن مسئلہ موضوع میں نہیں ہے، مجھے صوفیہ کے خیالات جان کر تشویش ہوئی ہے، بلکہ میں کہوں گی کہ میں اس لڑکی کے لیے پریشان ہوگئی ہوں، دس سطروں کے اس مضمون میں جہنم، عذاب، آگ، قبر، قیامت جیسے لفظوں کی بھرمار ہے۔''

گرانٹ کے چہرے پر فخر کا تاثر ابھرا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ صوفیہ کی سمجھ داری کا ثبوت ہے۔ وہ خدا کو پہچان رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری تربیت بالکل ہی رائیگاں نہیں جا رہی۔''

اس تبصرے نے ٹیچر مارشا کو حیران کر دیا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایک نو دس سال کی بچی کا اس طرح سے سوچنا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے کہ وہ تمام منفی حوالوں سے خدا کو شناخت کرتی ہے۔ خدا کے تصور سے اس کے دماغ میں صرف سزا اور عذاب جیسی چیزیں ہی کیوں آتی ہیں۔ پورے مضمون میں کسی ایک جگہ بھی اس نے خدا کے محبت کرنے والے روپ کا ذکر نہیں کیا۔ کیا اسے ذرا بھی اندازہ نہیں کہ خدا اپنی مخلوقات سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے خدا کے وجود سے دہشت زدہ ہونا سیکھ لیا ہے۔ خدا سے ڈرنا اور خدا سے دہشت کھانا دو جدا کیفیات ہیں، یقیناً تم دونوں میں تمیز کر سکتے ہو۔ آگے چل کر اس کے دماغ میں نفسیاتی کجیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کی شخصیت مسخ ہونے کا امکان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم نے اسے خدا کی محبت سے روشناس نہیں کروایا۔ محبت ہی تو خدا کا اصل تعارف ہے۔ شاید تمہیں صوفیہ کی تربیت کے طریقے میں بدلاؤ لانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ میں سنجیدگی سے اس کی

ضرورت محسوس کرتی ہوں۔''

گرانٹ نے نخوت سے ہنکارا بھرا تھا۔

''تمہاری مذہبی فلاسفی اور ہمارے دینی عقائد میں بہت فرق ہے۔ یہ محبت محبت کی گردان کر کے شتر بے مہار پھرنے کا نظریہ تمہیں ہی مبارک ہو۔ تمہیں اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے ٹیچر مارشا کے کرسچن ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیچر مارشا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''دیکھو، بات مذہبی فلاسفی کے مختلف ہونے کی نہیں ہے۔ صوفیہ کے اندر جو منفی خیالات پنپ رہے ہیں، وہ اس کی شخصیت کے توازن کو بگاڑ دیں گے۔'' ٹیچر مارشا نے تحمل سے کہا۔

''اب اس بحث کو سمیٹ دو تو بہتر ہے۔ صوفیہ کی پرورش کیسے ہونی چاہیے، یہ مجھے کسی سے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میری رائے میں اس کی سوچ کا بہاؤ بالکل درست سمت میں ہے، کیا اس کے علاوہ کسی اور مسئلے پر بھی تم مجھ سے بات کرنا چاہو گی یا میں جاؤں۔''

گرانٹ نے چڑچڑے پن سے کہتے ہوئے گفتگو کا اختتام کر دیا تھا۔

✠ ✠ ✠

گرانٹ فلموں میں معمولی نوعیت کے کردار ادا کرتا تھا۔ جب کبھی اس کی فلم ریلیز ہوتی تو اسے مفت ٹکٹ ملتے۔ بعض اوقات وہ اسے اور البا کو اپنی کوئی فلم دکھانے بھی لے جاتا تھا۔ انہیں پوری فلم میں ان چند سیکنڈز کا انتظار کرنا پڑتا جن میں گرانٹ اسکرین پر دکھائی دیتا۔ گرانٹ کو باقاعدگی سے کام نہیں ملتا تھا، کبھی وہ دو، تین ہفتے مسلسل مصروف رہتا اور کبھی مہینوں گھر سے باہر جانے کی نوبت نہ آتی۔

البا نے بھی گنتی کی چند فلموں میں بطور ایکسٹرا کام کیا تھا، لیکن یہ صوفیہ کی پیدائش سے پہلے کا قصہ تھا۔ ان دنوں اس کے ذرائع معاش کیا تھے اور وہ ان کے بارے میں غلط بیانی کیوں کرتی تھی، یہ غور طلب معاملے تھے۔ وہ ہمیشہ بلند و بانگ دعوے کرتی کہ کاسٹنگ ڈائریکٹرز اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور فلمی حلقوں میں کئی اہم ناموں سے اس کی شناسائی تھی، البتہ صوفیہ کو ان بیانات کی تائید میں کبھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

وہ اتنی ہی معروف اداکارہ ہوتی تو ٹیلی ویژن پر کبھی تو اس کے متعلق کوئی خبر آتی، کسی دن تو ان کا کوئی ہمسایہ دروازہ کھٹکھٹاتا اور کہتا کہ ''اداکارہ البا اتنے عرصے سے میرے پڑوس میں رہتی ہیں اور میری بدقسمتی دیکھو کہ مجھے خبر ہی نہیں۔'' یا راہ چلتے کوئی اسے پہچان کر آٹوگراف کا تقاضا کرتا۔ وہ روزانہ رات کو کہاں جاتی تھی اور رات بھر گھر سے کیوں غائب رہتی تھی۔ یہ معمہ بہت عرصہ تک صوفیہ سے حل نہ ہوا۔

اسے شبہ ضرور تھا کہ البا کوئی ایسا کام کرتی تھی جس کا عام لوگوں سے پردے میں رکھنا ضروری تھا۔ غالباً وہ کوئی بار ڈانسر تھی یا پھر prostitute بھی ہو سکتی تھی۔ دوسری بات کے امکانات اس لیے زیادہ تھے کہ گرانٹ اکثر اسے 'cheap hooker' کہہ کر پکارتا تھا۔ جب وہ کسی بات پر صوفیہ کو لعنت ملامت کر رہا ہوتا تو البا کے لیے ایسے الفاظ بارہا اس کی زبان سے ادا ہوتے۔ ''تمہاری جسم فروش ماں کا گندہ خون تمہیں گناہوں پر اکساتا ہے۔''

''تمہیں ایک بدکار عورت نے پیدا کیا ہے، تم سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ تم اس سے زیادہ گناہگار اور

اس سے بڑھ کر گمراہ ہو جاؤ گی۔"

"اس عورت کے سائے سے بھی دور بھاگو وہ تمہیں بھی اپنے جیسی prostitute بنا کر دم لے گی۔"

ایسے جملے کم و بیش ہر روز اسے سننے پڑتے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ محض گرانٹ کے غصہ اتارنے کا ایک انداز نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ تھی، ورنہ وہ اتنی باقاعدگی سے ان باتوں کو کیوں دہراتا۔ پھر البا نے اپنے معمول میں ایک تبدیلی کی اور اپنے کسٹمرز کو گھر میں لانا شروع کر دیا تو صوفیہ کا گمان یقین میں ڈھل گیا۔

ابتدا میں اسے لگا تھا کہ شاید البا کے ہمراہ آنے والے مرد اس کے بوائے فرینڈز تھے مگر ہر رات ایک نیا بوائے فرینڈ بنا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر متعدد مواقع پر اس نے البا کو ان مردوں سے رقم وصول کرتے بھی دیکھا تھا۔ نتیجہ اخذ کرتے اسے دیر نہ لگی کہ اصل صورت حال کیا تھی۔

البا کے ساتھ آنے والے مرد شکل و صورت کے فرق کے علاوہ تقریباً ایک جیسے ہی ہوتے۔ وہ بدتہذیب، بداخلاق اور مخمور ہوتے۔ ان میں سے بعض تو نشے میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہوتے کہ ان سے اپنے قدموں پر سیدھا چلا بھی نہ جاتا۔ ان کے بدنوں اور کپڑوں سے الکوحل کی بو کے بھبا کے اٹھتے، صوفیہ کی موجودگی میں بھی وہ گالی گلوچ اور فحش باتوں سے پرہیز نہ کرتے۔ البا اسے ان کے لیے بیئر لانے کو کہتی۔

"صوفیہ! مہمان کو ٹھنڈی بیئر پیش کرو۔ کتنا حبس ہے اس گھر میں، یقیناً اسے پیاس لگ رہی ہو گی۔"

جب کوئی آدمی بیئر کا کین پی چکتا تو البا خوش آمدانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہتی "تم تو صورت سے ہی فیاض نظر آتے ہو۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ تم کسی اونچے خاندان کے فرد ہو۔ بچی کی خوشی کی خاطر اگر تم اسے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ دے دو گے تو تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، بے چاری لڑکی کا جی خوش ہو جائے گا۔"

شاذ ہی کوئی اس کی فرمائش پوری کرتا، اکثر لوگ بحث کرنے لگتے۔

"اگر تمہیں پانچ ڈالر ابھی چاہئیں تو میں انہیں تمہارے معاوضے میں سے منہا کر لوں گا۔" یا "بیئر اتنی مہنگی کب سے ہو گئی؟"

البا فوراً پینترا بدلتی "اجنبیوں جیسی بات کیوں کرتے ہو؟ یہ بیئر کی قیمت تو نہیں ہے۔ ویسے تین ڈالر اور حتیٰ کہ دو بھی چلیں گے۔"

وہ صوفیہ کی منشا کے خلاف اسے ان مردوں سے متعارف کرواتی۔ "یہ میری بیٹی ہے۔ بارہ سال کی عمر میں ایسا قد کاٹھ نکالا ہے تو ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھو، دو چار سال بعد کیا عالم ہو گا۔ حسین بھی تو کتنی ہے۔ مانتے ہو نا کہ ایسا بھولپن اور خوبصورتی بہت کم چہروں میں یکجا ہوتے ہیں۔ میں تو یہ سوچ کر محظوظ ہوتی ہوں کہ مردوں میں اس کے حصول کے لیے کیسا کڑا مقابلہ ہو گا۔ کیا یہ بوسیدہ اور گھسا ہوا لبادہ اس پیاری لڑکی کے شایان شان ہے؟ اگر تم اسے چند ڈالر دے دو گے تو یہ ایک اچھا لباس پہن کر کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی دے گی۔"

البا اسے ڈھال بنا کر ایسے ہی حیلوں سے رقم بٹورتی اور اولین فرصت میں اس سے وہ رقم وصول کر لیتی۔

کچھ مرد صوفیہ میں غیر ضروری دلچسپی ظاہر کرتے، اسے زبردستی اپنے پاس بٹھائے رکھتے، عجیب انداز سے چھوتے اور ایسی نظروں سے دیکھتے کہ اس کا دل وہاں سے دور بھاگ جانے کو مچلنے لگتا۔ البا کو اس کی بے چینی کی کوئی پروا نہ ہوتی۔ وہ ان لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے انہیں بڑھاوا دیتی رہتی اور چھچھوری باتیں کرتی رہتی۔ صوفیہ کو جتنی کراہت ان گھناؤنی سانسوں والے مردوں سے آتی اس سے کئی گنا زیادہ گھن وہ البا کے لیے محسوس کرتی۔ وہ جھوٹی، تصنع کی پتلی اور اخلاقی گراوٹ کا نمونہ تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ سب گرانٹ کی لاعلمی میں ہو رہا تھا۔ اکثر یوں ہوتا کہ وہ گھر پر ہی ہوتا اور البا کسی مرد کو لے آتی۔ ایسے مواقع پر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ البتہ اس کی موجودگی سے اتنا فرق ضرور پڑتا کہ البا کی مجال نہ ہوتی کہ صوفیہ کو اپنے پاس بلالے۔ ان مردوں کی آمد کا ایک مفید پہلو بھی تھا۔

صوفیہ چونکہ البا کے کمرے میں سوتی تھی۔ اس لیے جب وہ رات کے پچھلے پہر گھر لوٹتی تو صبح تک صوفیہ کو اس کی صحبت برداشت کرنا پڑتی۔ وہ نیند میں دانتوں کو پیستی رہتی۔ وہ آواز اتنی نفرت انگیز ہوتی کہ صوفیہ کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ کئی بار البا اسے سوتے میں جھنجوڑ ڈالتی اور پوچھنے لگتی۔

''میری کھال کے نیچے کیڑے رینگ رہے ہیں۔ دیکھو، کیا میرے بازوؤں اور ٹانگوں پر تمہیں ان کی حرکت محسوس ہوتی ہے؟ وہ میرے جسم کے اندر کیسے گھس گئے ہیں۔ وہ میرا گوشت کھا رہے ہیں۔ ذرا میری پنڈلیوں پر زور، زور سے تھپڑ مارو، یہ مجھے سونے نہیں دیتے۔''

صوفیہ کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دونوں علامتیں کوکین کے دیرینہ اور مسلسل استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ بہر کیف ان راتوں میں صوفیہ کو کسی دوسری جگہ سونا پڑتا۔ گرمیوں کا موسم ہوتا تو وہ den میں سوتی اور سردیوں میں کچن کے فرش پر۔ اس طرح وہ البا کی پریشان کن عادتوں کا سامنا کرنے سے بچ جاتی تھی۔

ان ہی دنوں اس پر انکشاف ہوا کہ گرانٹ اس کا حقیقی باپ نہیں تھا، بلکہ وہ تو اس کا سوتیلا باپ بھی نہیں کہلا سکتا تھا، کیونکہ گرانٹ اور البا نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ دراصل یہ بات گرانٹ نے خود اپنی زبان سے اسے بتائی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ وہ کسی غلطی کو لے کر حسب عادت صوفیہ پر برس رہا تھا تو غصے کی حالت میں اس نے کہا۔

''خدا کا شکر ادا کرو کہ میں نے خون کا رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی تمہاری تربیت کا بیڑہ اٹھالیا ہے۔ میں تمہارے حال پر رحم نہ کھاتا تو نہ تم مسلمان ہوتیں اور نہ ہی عزت سے جی رہی ہوتیں۔ تمہاری رذیل ماں تمہیں کسی ڈمپسٹر میں پھینک کر تم سے جان چھڑا چکی ہوتی۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، پھر بھی میں تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔ اس کے بدلے مجھے تم سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ صرف خدا مجھے میری اس نیکی کا اجر دے گا۔''

''میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں؟ کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' صوفیہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''بکواس مت کرو، جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر کان دھرو، نہ تم میری بیٹی ہو اور نہ تمہاری ماں میری بیوی ہے۔ میرا تم دونوں سے کوئی رشتہ نہیں اور اس کے لیے میں خدا کا شکر گزار ہوں۔''

وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا، مگر صوفیہ کا ذہن اسی ایک نکتے پر اٹک گیا تھا۔ آخر کار یہ عقدہ کھل ہی گیا تھا کہ اسکول میں اس کا لاسٹ نیم گرانٹ کیوں نہیں درج کروایا گیا تھا۔

وہ اتنی خوش ہوئی کہ اگلے روز اسکول میں جا کر اپنے ایک ایک ہم جماعت کو پکڑ کر بتاتی رہی کہ گرانٹ اس کا باپ نہیں تھا۔ اس کے سر سے جیسے کوئی الزام اتر گیا تھا۔ کیا ہی خوب ہوتا اگر البا بھی اس کی اصل ماں نہ ہوتی۔

✠ ✠ ✠

اس روز اسکول سے واپس آتے ہوئے اس کی سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ گھر اس جگہ سے کم و بیش دو میل دور تھا۔ پریشان ہوتے ہوئے وہ ڈھیلے قدموں سے پیدل چلنے لگی تھی۔

وہ ایک بے حد گرم دن تھا۔ آسمان کے کنارے دھوپ سے بھرے ہوئے تھے۔ سائیکل کو جس کے ہتھے سے بھاری

اسکول بیگ لٹکا ہوا تھا، اپنے ساتھ گھسیٹ کر چلنے کی مشقت سے تھوڑی ہی دیر میں وہ نڈھال ہوگئی تھی۔ ان کے جمناسٹک کے استاد نے آج کچھ مشکل قسم کی نئی ورزشوں کی مشقیں کروائی تھیں، جس کی وجہ سے وہ پہلے ہی خاصی تھکی ہوئی تھی۔ اب رہی سہی کسر تیز دھوپ اور بار برداری کی اضافی محنت نے پوری کردی تھی۔ پیاس کے مارے اس کا حلق سینڈ پیپر کی مانند کھردرا اور خشک ہوگیا تھا۔ لیکن اس کی پانی کی بوتل میں ایک گھونٹ بھی نہ تھا۔

خود پر جبر کر کے وہ چلتی رہی تھی۔ جب تھکن اور پیاس حد سے تجاوز کر گئیں تو مجبوراً سائیکل کو سڑک کے کنارے زمین پر لٹا دیا اور خود قریب ہی صنوبر کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اس نے سڑک کے موڑ سے آرنسٹ کو جسے پیار سے آرنی پکارا جاتا تھا، سائیکل پر اسی سمت آتے دیکھا۔ آرنی اور صوفیہ کے گھروں کے بیچ صرف ایک پتلی سڑک تھی۔

صوفیہ کے گھر کی کھڑکی سے آرنی کے گھر کا لان نظر آتا تھا۔ وہ مسز برگنز امیک گریگور کا پوتا تھا۔ وہ اکثر کھڑکی میں سے آرنی کو ایک بڑے سے کتے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتی تھی۔ آرنی اس سے ایک سال چھوٹا تھا اور اس کے اسکول میں پڑھتا تھا، البتہ اس کے اور صوفیہ کے درمیان کبھی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔

اس وقت اس کی آمد پر صوفیہ کو خیال آیا کہ اسے روک کر مدد مانگے، پھر وہ جھجک گئی کہ جانے آرنی کس نوعیت کا ردعمل ظاہر کرے۔ آرنی کی سائیکل جب اس کے نزدیک پہنچ گئی تو اس نے جان بوجھ کر اپنی نظریں فٹ پاتھ پر مرکوز کرلیں۔

''کیا ہوا صوفیہ؟ تم گھر کیوں نہیں جا رہی ہو؟''

آرنی کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ ''ٹائر پنکچر ہوگیا ہے اور میں بہت تھک گئی ہوں، مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔'' اس نے آرنی کو بتایا جو ہمدردی بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم میرے ساتھ آجاؤ، میں تمہیں لے چلتا ہوں۔''

خوش ہوتے ہوئے وہ زمین سے اٹھ گئی تھی۔ ''لیکن میں اپنی سائیکل یہاں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔''

''ٹھیک ہے، ہم اسے یہاں نہیں چھوڑیں گے۔'' آرنی نے کہا۔ ''اس کی ایک ترکیب ہے، میں سائیکل چلاتا ہوں اور تم میرے پیچھے بیٹھ کر اپنی سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر کھینچتی رہنا، ایسا کرنے میں تمہیں مشکل تو نہیں ہوگی؟''

''نہیں، میں یہ کرلوں گی، لیکن میرا بیگ مجھ سے سنبھالا نہیں جائے گا۔ میرے کندھوں میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے ایک اور پریشانی بتائی۔

''کوئی بات نہیں اسے میں سنبھال لوں گا۔ میرا خیال ہے تمہیں پانی پینا چاہیے، تمہاری بیٹھی ہوئی آواز سننے میں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی۔''

اس نے اپنی پانی والی بوتل صوفیہ کے ہاتھ میں تھمائی۔ جھینپ کر مسکراتے ہوئے صوفیہ نے شکریہ کہا تھا۔ پھر آرنی نے اپنا بیگ کیریئر سے اتار کر کندھوں پر لادا اور صوفیہ کا بیگ اپنی سائیکل کے ہتھے سے لٹکا دیا۔ راستہ بھر وہ نہایت احتیاط سے سائیکل چلاتا رہا، گھر کے سامنے پہنچ کر وہ خدا حافظ کہتے ہوئے جانے لگا تو اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ اس نے آرنی کو رکنے کو کہا۔ صوفیہ پر مہربان ہونے والے لوگوں کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ آرنی کے احسان نے اس کا دل ممنونیت سے معمور کردیا تھا۔ اچانک وہ آگے آئی اور آرنی کا گال چوم لیا۔

''تم بہت اچھے لڑکے ہو۔''

اتنا کہہ کر وہ مڑی ہی تھی کہ اپنے سامنے گرانٹ کو پا کر ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شرارے دھوپ سے بڑھ

کرتند تھے۔ دھاڑتے ہوئے اس نے آرنی کو گالی دی۔

''ملعون لڑکے! دوبارہ تم مجھے صوفیہ کے آس پاس دکھائی دیے تو میں تمہاری یہ سفید کھال کھینچ لوں گا، تمہارے ہاتھوں اور پیروں کے بیس ناخنوں سمیت۔''

آرنی ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ گرانٹ نے صوفیہ کے سر کی پشت اور کندھوں پر لگاتار کئی تھپڑ مارے اور اسے دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔

''میں نے تمہیں لڑکوں سے دور رہنے کو کہا تھا۔ تم کون سی زبان سمجھتی ہو؟'' غصے سے کھولتے ہوئے گرانٹ نے اس سے باز پرس شروع کی۔

''وہ صرف گیارہ سال کا ہے۔'' صوفیہ نے خوف سے مغلوب ہوتے ہوئے آرنی کی عمر ایک سال کم کر کے اپنا جرم گھٹانا چاہا۔

''تم تو تیرہ سال کی ہو، کتنی ڈھیٹ اور بے حیا ہو تم، مجھے سب سے زیادہ خوف اسی چیز سے آتا ہے کہ کہیں تم اپنی ماں کی طرح prostitute نہ بن جاؤ اور تم میرے اس خوف کو سچ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ اس عمر میں تمہاری ایسی حرکتیں ہیں۔ تم تو ابھی سے ایک بنی بنائی prostitute ہو۔ اس لڑکے کے ساتھ جڑ کر کھڑی تم کیا کر رہی تھیں؟''

''کچھ بھی نہیں، میرا یقین کرو، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری سائیکل خراب ہو گئی تھی تو وہ مجھے اپنی سائیکل پر گھر لے آیا۔ میں صرف اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔'' صوفیہ نے لرزتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''مکار، جھوٹی، تم مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہی ہو، میں نے خود تمہیں اس لڑکے کو چومتے ہوئے دیکھا ہے۔''

خوف سے صوفیہ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ''ایسا نہیں ہوا، میں سچ کہتی ہوں، میں تو بس اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میری اس سے دوستی بھی نہیں ہے۔ میری کسی بھی لڑکے سے دوستی نہیں ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس کی زبان میں لکنت آ گئی۔

گرانٹ نے جھپٹ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔ ''تم خدا کے نام پر جھوٹ بولتی ہو، تمہیں معلوم ہے، خدا کو گواہ بنا کر جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اپنے ایک گناہ کو چھپانے کے لیے تم اس سے بڑا گناہ کرتی ہو۔ جہنم جو تمہارا منتظر ہے۔ اسے شاید تم مذاق سمجھتی ہو، آؤ میں تمہیں دنیا میں جہنم کا نمونہ دکھاتا ہوں۔''



وہ اسے گھسیٹ کر کچن میں لے گیا تھا۔ سنک میں ان دھلے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور گندا پانی جمع تھا۔ کچن کے سنک کی یہ حالت کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے ایسا ہی بد حال رہتا تھا۔ اس میں برتن جمع ہوتے رہتے اور جب بے حد مجبوری ہوتی تو ضرورت کے دو چار برتن دھو کر باقیوں کو یوں ہی پڑے رہنے دیا جاتا۔

گرانٹ نے سنک میں تیرتا ہوا ایک کپ نکالا اور اس کو غلیظ پانی سے بھر کر صوفیہ کے منہ کے نزدیک کر دیا۔

''پیو۔''

وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''میں کہہ رہا ہوں اسے پیو۔ تمہیں سنائی نہیں دے رہا؟''

اس نے بھاگ کر کچن سے باہر جانا چاہا مگر گرانٹ نے دروازے کے سامنے آتے ہوئے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

''جہنمیوں کو زخموں کی پیپ اور خون پینے کو دیا جائے گا۔ تم سے یہ بے ضرر پانی نہیں پیا جا رہا تو پیپ اور خون کیسے پیو گی؟''

اس نے دو انگلیوں اور انگوٹھے میں صوفیہ کا منہ جکڑ لیا اور وہ بدبودار پانی اس کے ہونٹوں پر گرانے لگا۔ ''تم اپنے ناپاک منہ سے خدا کا نام لے کر جھوٹ بولتی ہو، تم تو اس قابل ہو کہ میں تمہیں گٹر کا پانی پلاؤں۔''

اس نے اپنے بچاؤ میں بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر کچھ پانی اس کے منہ اور ناک میں گھس گیا۔ جھرجھری لے کر وہ قے کرنے لگی تھی۔

گرانٹ اس کے سر پہ تھپڑ مارتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''اب تم جھوٹ بولو گی؟ اب تم لڑکوں سے ملو گی؟ اب تم prostitute بنو گی......؟''

✠ ✠ ✠

''صوفیہ! تم نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟''

''نہیں۔''

کیوں نہیں؟''

''بہت لمبی نماز ہے، میں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہوں، آج میرے سر میں درد ہے۔''

''یہ نماز چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ابھی اٹھو اور وضو کرو۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہی، مجھے بخار بھی محسوس ہو رہا ہے، میں آج نہیں پڑھ سکتی۔''

''میں تم پر واضح کر چکا ہوں کہ تم خدا کے وضع کیے ہوئے طریقے پر نہیں چلو گی تو تمہارے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ بستر سے نکلو، ابھی اور اسی وقت۔'' گرانٹ نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ ''چلو جا کر وضو کرو۔''

"نہیں۔ میں آج نہیں پڑھوں گی، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو تم اپنا فیصلہ نہیں بدلو گی؟ شاید اس کے بعد میں تم سے نہ پوچھوں۔"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" گرانٹ اسے بیرونی دروازے تک لے گیا۔ "گھر سے نکل جاؤ اور تب واپس آنا جب تم خدا کی اطاعت کرنے والی بن جاؤ۔"

گرانٹ نے دروازہ کھول کر اسے باہر دھکا دیا۔

"میں کل سے ساری نمازیں پڑھوں گی۔"

"تو کل واپس آنا۔"

دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہ آیا کہ گرانٹ نے واقعی اسے گھر سے نکال دیا تھا۔

چند منٹ وہ خاموش کھڑی دروازہ کھلنے کی منتظر رہی، لیکن جب خاصا وقت گزر جانے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو پہلی بار اسے حقیقی پریشانی نے گھیرا۔ آسمان سیاہ بادلوں سے اٹا ہوا تھا، ہوا بے حد سرد تھی اور رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ کسی بھی آن بارش شروع ہو سکتی تھی۔ اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ اترنے لگی۔ ایک تو اسے بخار تھا اور دوسرے وہ گرم بستر سے نکل کر سیدھی خنک ہوا میں آ گئی تھی۔ اس کی گردن، کندھوں اور پنڈلیوں میں درد بھی ہو رہا تھا۔

وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگی، گو کہ اسے امید نہیں تھی کہ گرانٹ آسانی سے نرم پڑے گا۔ پھر بھی وہ اسے آوازیں دیتی رہی۔

"مجھے اندر آنے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ باہر بہت سردی ہے۔ خدا کے لیے مجھے اندر آنے دو۔"

دستک دیتے ہوئے اسے الیا کا خیال آیا تھا۔ اس وقت وہ گھر پر ہی تھی۔ وہ سبک قدموں سے گھر کے پچھواڑے آ گئی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے پہنچی تو بارش کا آغاز ہو چکا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ یخ بستہ بوندیں اس پر گرنے لگیں۔ کھڑکی کے شیشے سے چپکتے ہوئے اس نے الیا کو متوجہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر آزمائی، لیکن وہ ایسی بے سدھ سو رہی تھی کہ اس پر ذرا سا اثر نہ ہوا۔ یقیناً وہ کوکین کے خمار میں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر بھاگتے ہوئے وہ دوبارہ مرکزی دروازے تک آئی اور زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"اب تم جیسے کہو گے میں ویسے کروں گی، میں ابھی نماز پڑھوں گی، دروازہ کھولو۔ باہر تیز بارش ہو رہی ہے۔ سردی سے میں مر جاؤں گی۔ مجھے واقعی بخار ہے، میں غلط بیانی نہیں کر رہی۔ مجھے اندر آنے کی اجازت دے دو۔ میں اب کبھی نافرمانی نہیں کروں گی۔ میں ان سب چیزوں سے دور رہوں گی جن سے خدا نے روک دیا ہے۔ اگر چاکلیٹ کھانا یا سائیکل چلانا بھی گناہ ہو تو میں کبھی ان کاموں کے نزدیک نہ جاؤں۔ مجھے ایک موقع دے دو، میں پھر کوئی حکم عدولی نہیں کروں گی۔"

اب اس کے دانت شدت سے بجنے لگے تھے اور بولتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

بارش کی طوفانی بوچھاڑیں مکانوں کی چھتوں اور درختوں کی چوٹیوں پر بے رحمی سے جھپٹ رہی تھیں۔ تیز ہوا کے پیڑوں اور کھمبوں سے ٹکرانے پر ہولناک آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کا روئیں دار لبادہ بھیگ کر جسم سے چپک گیا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ اس نے چھجوں تلے گھس کر سر چھپایا، درختوں کے تنوں سے لپٹ کر جھولتی ہوئی شاخوں کی آڑ لی، مگر سب بے سود، بپھری ہوئی ہوا بوندوں کو ہر نکڑ اور ہر گوشے میں اچھال رہی تھی۔

وہ اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ ہڈیوں میں اترتی ہوئی ٹھنڈ نے اسے اس حد تک بے بس کر دیا تھا کہ رونے کے علاوہ اسے

کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو سر پر رکھے، زمین پر اکڑوں بیٹھی دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ اسے خوف آ رہا تھا۔ ہر شے اسے ڈرانے لگی تھی۔ بارش، ہوا، آوازیں، تاریکی، تنہائی، درخت، مکانوں کی روشن اور بجھی ہوئی کھڑکیاں، ساری کائنات بے مہر تھی۔ اس پر رحم کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ جب روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی، لیکن بارش، ہوا اور بند دروازے میں سے کوئی منظر بھی نہ بدلا تو اس نے سنجیدگی سے اپنی صورتحال پر غور کیا۔ وہ ساری رات ایسے ہی بیٹھی روتی رہتی تو کچھ بھی نہ ہوتا اس کے سوا کہ بارش اس کی کھال ادھیڑ دیتی۔ وہ کسی ہمسائے سے مدد مانگتی تو اسے ساری کہانی بیان کرنا پڑتی، اس کے بعد بھی ضروری نہیں تھا کہ سننے والا اسے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے دیتا۔ آس پاس کے گھرانوں سے ان کے تعلقات ذرا بھی خوش گوار نہ تھے۔ سوچتے سوچتے اسے ایک خیال آیا تھا۔

مسز بر گنزا میک گریگور کے لان کے گرد کوئی دیوار نہ تھی۔ گھاس کے وسیع قطعے کے حاشیوں پر ایک باڑ اگائی گئی تھی جس نے حد قائم کر رکھی تھی۔ باڑ کے اندر ایک گوشے میں صحرائی بید کی سدا بہار جھاڑیاں لگی تھیں۔ ان گھنی پھول دار جھاڑیوں کے حلقے میں سایہ دار جگہ پر لکڑی کے چند روغن شدہ تختوں کو جوڑ کر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنائی گئی تھی۔ جس کی چھت قبہ دار تھی اور داخل ہونے کا راستہ قوسی شکل کا تھا۔ یہ جھونپڑی درحقیقت مسز میگ گریگور کے Landser نسل کے پالتو کتے کی آرام گاہ تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں میں وہ اس میں لیٹ کر ستایا کرتا تھا۔

صوفیہ نے وہیں سر چھپانے کا سوچا اور گرتی پڑتی چلنے لگی۔ ہوا اس کے قدم زمین پر جمنے نہ دیتی تھی۔ وہ دائیں رخ بڑھنے کا قصد کرتی تو ہوا مخالف سمت میں دھکیل دیتی۔ آنکھوں میں گھستے ہوئے برفیلے پانی نے اسے راستہ دیکھنے سے محروم بنا دیا تھا۔ بارش تھمنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ باڑ سے تھوڑی دور رک کر اس نے آنکھوں کے گرد ہاتھوں سے ڈھال بنائی اور گھر کے رہائشی کمروں کا جائزہ لیا۔ مسز میک گریگور کے سونے کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ممکن تھا وہ جاگ رہی ہوں اور انگیٹھی کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں جیسا کہ وہ اکثر کرتی تھیں۔

ان کے پاس لمبی ناک والی ایک بندوق تھی جوان کے مرحوم شوہر نے انہیں خرید کر دی تھی۔ مسز میک گریگور اسے چلانے میں مہارت رکھتی تھیں اور اگر اس وقت اتفاقاً ان کی نظر صوفیہ پر پڑ جاتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ اسے چور گردانتے ہوئے وہ بنا خبردار کیے اس پر گولی چلا دیتیں۔ اس خیال نے صوفیہ کو اتنا ہراساں کیا کہ باڑ عبور کرتے ہی وہ زمین پر بارش کے پانی میں لیٹ گئی اور کہنیوں اور گھٹنوں کے بل لڑھکتی ہوئی ڈاگ ہاؤس تک پہنچی۔ اس دوران اس کے ایک پاؤں کا جوتا اتر کر کہیں کھو گیا اور پانی اس کے لبادے کی آستینوں میں بھر گیا۔ اب اسے پسلیوں میں شدید اکڑاؤ محسوس ہونے لگا تھا، اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا اور ہاتھوں پیروں کی انگلیاں سردی سے سُن ہو چکی تھیں۔

ڈاگ ہاؤس کے سامنے والے تختے پر ایک بڑی سی جھاڑی گری ہوئی تھی، جس نے دروازے کو ڈھانپ لیا تھا۔ بے جان ہاتھوں سے جھاڑی کی شاخیں ہٹاتے ہوئے وہ اندر رینگ گئی۔ جھاڑی کی وجہ سے بارش کا پانی اندر نہیں آ پایا تھا اور فرش تقریباً خشک تھا۔

تاریکی میں اس کے نتھنوں سے کسی مری ہوئی شے کی بو ٹکرائی۔ اسے بے اختیار ابکائی آئی تھی۔ دل چاہا کہ باہر نکل جائے، مگر جی کڑا کر کے لیٹی رہی۔

مسز میک گریگور کا سفید کتا، جس کے کان، تھوتھنی اور دم سیاہ تھی، بے حد جسیم جانور تھا، اس کے جسم کے حساب سے ڈاگ ہاؤس بھی کافی کشادہ تھا پھر بھی صوفیہ جتنی قامت کے انسان کو اس میں سمانے کی غرض سے کافی تردد درکار تھا۔ وہ اس حالت میں تھی کہ اس کا پیٹ گھٹنوں سے ملا ہوا تھا اور سر جھونپڑی کی دیوار کو چھو رہا تھا۔ وہ نہ کروٹ لے سکتی تھی اور نہ ہی اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی۔ ٹانگیں سیدھی

کرنے کی صورت میں اس کے پیروں یا سر میں سے ایک شے دروازے سے باہر بارش کی زد میں ہوتی۔ غنیمت تھا کہ جھاڑ نے پانی کو اندر آنے سے روک رکھا تھا۔ ڈاگ ہاؤس کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی بوندیں گونجیلی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ گیلی ہوا کی جو قلیل مقدار درزوں سے آ رہی تھی، وہ اس کے بھیگے ہوئے لباس کو برف کی پرتوں میں ڈھال رہی تھی۔ سانس لیتے ہوئے اس کے سینے سے سیٹی سی برآمد ہوتی اور اوپر تلے کے دانت آپس میں زور سے ٹکراتے۔ اینٹھی ہوئی گردن کو سیدھا کرنے کے لیے اس نے سر گھمایا تو اس کے گال سے کوئی نرم پردار شے چھوگئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ بڑی دقت سے اس نے چیخ کو حلق میں دبایا تھا۔ اس نے سر اور کندھوں کو اس جگہ سے ممکن حد تک دور ہٹایا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی سعی کی۔ اسے کچھ نظر نہ آ سکا اور کسی قسم کی ہلچل بھی محسوس نہ ہوئی۔ خاصی دیر بعد ڈرتے ڈرتے اس نے ہاتھ پھیلا کر اس مقام کو ٹٹولا۔

تھوڑی سی جانچ سے اسے معلوم ہو گیا کہ وہ پردار چیز کسی مردہ پرندے کا بچا کھچا جسم تھی۔ فضا میں رچے ہوئے تعفن کا باعث بھی یہ ہی تھا۔ شاید یہ کسی بلی کی کارگزاری تھی، کیونکہ مسز میک گریگور کا کتا اتنا امن پسند اور شریف طبع تھا کہ کسی جاندار شے پر حملہ آور ہونا تو درکنار، وہ غراتا تک نہیں تھا۔ اسے تو بس گیند سے کھیلنے اور تیراکی سے شغف تھا۔ پرندے کی باقیات کو ہاتھ سے پرے اچھالتے ہوئے اس نے بوجھل سر کو زمین پر گرا دیا۔

وہ رات اتنی طویل تھی کہ کسی طور ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ تمام رات وہ ایک لمحہ بھی نہیں سوئی۔ سردی، درد اور اندھیرے سے بُنی ہوئی اس کائنات میں وہ بالکل تنہا تھی۔ خوف کا ایک دائرہ اسے گھماتے ہوئے اگلے دائرے میں دھکیل دیتا۔ دائروں کے اس تسلسل میں کوئی وقفہ نہ تھا، کہیں نجات نہ تھی۔ اس یادگار رات نے صوفیہ کی کایا پلٹ دی۔ تمام رات وہ ایک ہی سوال حل کرتی رہی۔

خدا گرانٹ کو اس کے ساتھ یہ سب کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ خدا گرانٹ کے ساتھ تھا، تو اس کے ساتھ کون تھا؟



جسٹن اور سلینا اسکول کے ان طلباء میں سے تھے جن کو مشہور ہونے کے لیے تعلیمی یا غیر نصابی سرگرمیوں میں نمایاں کارکردگی پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کے خاندان کا حوالہ ہی ان کی شناخت تھی۔ وہ دونوں کزن تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو پشتوں سے دولت اور نیک نامی کے خزانوں کا امین تھا۔ ان کے دادا نے فزیالوجی کے شعبے میں نوبیل انعام جیتا تھا۔ ایک چچا بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکار تھا، ایک خالہ سینیٹر تھی، دونوں کے باپ ایک بڑی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن تھے۔ الغرض مراتب کو تسخیر کرنا ان کے خاندان کے افراد کا مشغلہ تھا۔

جسٹن اور سلینا اپنے حلقہ احباب میں صرف ان طلبا کو شامل کرتے تھے جو خاندانی جاہ و حشمت میں ان کے ہم پلہ ہوں۔ کسی کم حیثیت والے کو تو وہ منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔ وہ کسی کو دوست کا مرتبہ عطا کر دیتے تو سب اس کی قسمت پر رشک کرتے۔ یہ ہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر صوفیہ سکتے میں آ گئی جب ایک روز recess کے دوران ان دونوں نے اس سے گفتگو شروع کی۔

وہ ایک دور افتادہ گوشے میں کورل درختوں کے کنج کے باہر زمین پر بیٹھی انگلیوں سے مٹی پر کڈھب شکلیں بنا رہی تھی کہ سلینا اور جسٹن اس کے پاس آئے اور دونوں نے اسے 'ہیلو' کہا۔ پہلے تو اسے شک گزرا کہ وہ مخالف سمت سے چل کر آتی ہوئی میگن سے مخاطب تھے، لیکن جب جسٹن نے اس کا نام لے کر پکارا تو اسے اعتبار کرنا پڑا۔

''صوفیہ مارسیلو! کیا ہم تمہاری تنہائی میں مخل ہو رہے ہیں؟''

جسٹن کی زبان سے اپنا نام سن کر اسے فخر ہوا۔ اس نے کبھی نہیں ہو چا تھا کہ وہ اس کا نام جانتا ہو گا۔

سلینا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بوکھلا کر زمین سے اٹھ گئی۔اس نے اپنے ہاتھوں پر لگی گرد کو دیکھا اور سلینا کا ہاتھ تھامنے سے پہلے اپنے ہاتھوں کو لباس سے رگڑ کر اچھی طرح صاف کیا۔

''ہمیں افسوس ہے کہ اب تک ہم تمہاری دوستی سے محروم رہے۔اگر ہمیں پہلے علم ہو جاتا کہ تم ایک فلمی اداکارہ کی بیٹی ہو تو ہم تم سے تعارف حاصل کرنے میں اتنا وقت کبھی نہ لگاتے۔''

جسٹن نے شائستگی سے کہا تو صوفیہ کا دل ڈوب گیا۔وہ البا کی وجہ سے اسے قابل توجہ سمجھ رہے تھے۔بہرحال کسی تردید یا تائید کے بجائے وہ بے تکے پن سے سر ہلانے لگی۔

''تمہاری ماں فلم ایکٹریس ہے نا؟''اس بار سلینا نے پوچھا تھا۔

''ہاں،وہ فلموں میں کام کرتی رہی ہے مگر وہ کوئی زیادہ مشہور ہستی نہیں ہے۔''صوفیہ نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''تم بہت ہی عاجزانہ طبیعت کی مالک ہو۔تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک ہالی وڈ سلیبرٹی کی اولاد ہونے پر سارے اسکول کو اپنے پیچھے دوڑاتا۔''

اس مبالغے پر اسے شرم آئی تھی۔

''صوفیہ!ہم تمہیں اپنے دوستوں کے گروہ میں خوش آمدید کہتے ہیں۔امید ہے تمہیں اعتراض نہیں ہوگا''سلینا نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس اعزاز پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

''کل میں نے گھر پر دوستوں کو اکٹھا کرنے کی غرض سے ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔''جسٹن بتانے لگا۔''ہم تمہیں مدعو کر رہے ہیں۔ہم تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف بھی کروادیں گے۔دوستی کا آغاز کرنے کا یہ ایک عمدہ طریقہ ہے۔تم کیا کہتی ہو؟آؤ گی نا۔''

صوفیہ کو اقرار کرنے میں تامل تھا لیکن وہ ان دونوں سے اس قدر مرعوب تھی کہ ان کی کسی تجویز سے اختلاف کرنا اسے خلاف تہذیب لگ رہا تھا۔مرے ہوئے دل سے اس نے ہامی بھر لی۔

''تم ضرور آنا۔سب دوست تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''سلینا نے تاکید کی''تم کہو تو میں تمہیں لینے کے لیے شوفر کو بھجوادوں؟''

''نہیں،میں خود آجاؤں گی۔''صوفیہ نے لجاجت سے کہا۔

زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ البا کی ذات کسی حوالے سے اس کے لیے خوشگواریت کا سبب بن رہی تھی۔

وہ دونوں رخصت ہوگئے تو صوفیہ کچھ بے یقینی کی کیفیت میں دوبارہ زمین پر بیٹھ گئی۔اسے یہ ماننے میں بے حد مشکل ہو رہی تھی کہ جسٹن نے حقیقتاً اسے اپنی پارٹی میں آنے کی دعوت دی تھی۔اس نے وعدہ تو کرلیا تھا مگر اب اس پر گھبراہٹ کا غلبہ ہو رہا تھا۔اسے گرانٹ کی ممکنہ مخالفت کا ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لینے کینیڈا گیا ہوا تھا جہاں سے اس کی واپسی دو دن بعد ہونے والی تھی۔اور رہی البا تو وہ دن بھر سوئی رہتی اور رات کو اپنی معمول کی سرگرمیوں میں مشغول ہو جاتی۔اس کی جانب سے کسی روک ٹوک کی توقع نہیں تھی۔اسے کئی دوسری چیزیں پریشان کر رہی تھیں۔اس عالی نسب گھرانے کی کسی تقریب میں پہن کر جانے کے لائق اس کے پاس کیا تھا۔وہ طبقہ اشرافیہ میں رائج شدہ آداب واطوار سے بھی نابلد تھی۔کوئی خلاف تہذیب حرکت ہو جاتی تو کیسی شرم کی بات ہوتی۔

دن کا باقی وقت وہ اسی فکر میں ڈوبی رہی۔اسکول سے آکر اس نے اپنی سائیکل کے زنگ آلود حصوں کو رگڑ کر صاف کیا،

پانی سے دھو کر ٹائروں اور کلوں پر جمی ہوئی کیچڑ اتاری پھر اسے خشک کر کے اسپرے پالش سے چمکانے کی ناکام کوشش کی۔ ایک طویل عرصے سے وہ سائیکل صوفیہ کے تصرف میں تھی۔ مگر وہ کبھی بھی اسے صاف کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتی تھی۔ مسافت کی گرد اور بارشوں کی کیچڑ نے اس کی کہنگی کو مبالغے کی حد تک بڑھا رکھا تھا۔ سائیکل کی حالت میں کوئی نمایاں بہتری تو نہ آئی البتہ اس کی اصل رنگت دکھائی دینے لگی تھی۔

اس کا سب سے کم پرانا اسکرٹ، جسے استعمال کرتے ہوئے اسے ڈیڑھ برس ہونے کو آیا تھا۔ دو جگہوں سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ مارکیٹ سے اسکرٹ کے نمونے سے ملتے جلتے کپڑے پر چپکنے والے اسٹکر لے کر آئی جن کی مدد سے اس نے ان چھیدوں کو چھپا دیا اور جوتوں کے اکھڑے ہوئے تلوں کو گلو لگا کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھ چھوڑا۔

مقررہ وقت پر وہ جسٹن کے گھر کے سامنے پہنچی تو بری طرح پچھتائی۔ اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر کے سنگین غلطی کی تھی۔ اس گھر کی دیواریں اتنی طویل تھیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھنے کے لیے گردن کو نیم دائرے میں گھمانا پڑتا تھا۔ ٹاور روم، جو گھر کا سب سے بلند کمرہ تھا، زمین سے کم از کم ساٹھ فٹ کی اونچائی پر واقع تھا۔ بے تحاشہ وسیع پورچ میں دنیا کی مہنگی ترین گاڑیوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ ان میں سے دو لموزین تھیں، ایک مرسیڈیز، ایک رولز رائس اور باقی گاڑیاں بھی اسی معیار کی یا ان سے برتر تھیں۔ کئی گاڑیوں کے ساتھ باوردی شوفر موجود تھے جن میں سے چند پورچ میں کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے جبکہ چند گاڑیوں کے اندر براجمان تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جسٹن اور سلینا کے کافی دوست آ چکے تھے۔ جب اس نے اپنی سائیکل ان شاندار گاڑیوں کے بیچ ایک خالی جگہ پر کھڑی کی تو وہ یوں دکھائی دینے لگی جیسے کسی نے نئے اجلے کپڑوں کے ڈھیر میں ایک میلی دھجی اچھال دی ہو۔ ان روشن در و دیوار میں اسے اپنا آپ بھی ایک گدلی ناصاف شے کی مانند لگ رہا تھا۔ چمکتے ہوئے سفید فرش پر اس کے گرد آلود جوتے ایسے بھدے نظر آتے تھے کہ شرم سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ دل میں خود کو ملامت کرنے لگی۔ یہاں آ کر اس نے کتنی بڑی بیوقوفی کی تھی۔ مزید شرمندگی سے بچنے کی خاطر وہ لوٹ جانے کا ارادہ باندھ رہی تھی کہ چندن کے چھجے دار دروازے سے باہر آتی ہوئی سلینا کی نظر اس پر پڑ گئی۔

''اوہ صوفیہ! تم اب آ رہی ہو؟ کتنی دیر کر دی سب دوست تمہارے ہی منتظر ہیں۔ جلدی آؤ۔''

وہ صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے آئی۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ سبھی نظریں اس پر جم گئیں۔ اس نے ایک شرم آلود مسکراہٹ کے ساتھ 'ہیلو' کہا۔ جسٹن اور سلینا کو ملا کر وہ کل گیارہ تھے۔ چار لڑکیاں اور سات لڑکے۔ کچھ چہروں کو وہ اسکول میں دیکھتی رہتی تھی۔

''یہ صوفیہ مارسیلو ہے جس کے بارے میں تم لوگوں کو بتا رہا تھا۔ یہ ہماری نئی دوست ہے۔'' جسٹن کے جملوں سے اسے حوصلہ ملا تھا۔ وہ صوفے تک جانے کے لیے قدم اٹھا رہی تھی کہ سلینا نے روک دیا۔

''تمہیں برا تو لگے گا مگر آگے آنے سے قبل تمہیں اپنے جوتے اتارنے ہوں گے۔''

''وہ کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''قالین کی وجہ سے۔'' سلینا نے جواب دیا۔

''معاف کرنا میں سمجھی نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟'' صوفیہ نے فرش پر بچھے تین انچ موٹائی کے حامل پیچیدہ گرہوں پر مبنی نمونے والے سبز اور نیلے قالین کو دیکھا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ سب لڑکے لڑکیوں نے جوتے پہن رکھے تھے۔ قالین پر کوئی بھی ننگے پیروں نہیں تھا۔

''اپنے جوتوں کو دیکھو صوفیہ! یہ کتنے گندے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ تم ان جوتوں کے ساتھ قالین پر چلو۔ ہماری آنٹ

جو ینیئر ہیں، انہوں نے یہ قالین اصفہان سے منگوایا ہے۔ اس کی قیمت کا درست اندازہ تو مجھے نہیں ہے بہر حال تم اسے نوادر میں شمار کر سکتی ہو۔''

صوفیہ کی نظریں خود بخود اپنے جوتوں پر گئیں۔ تازہ کی ہوئی پالش پر مٹی کے بے شمار ذرات چپکے تھے۔ پھر اس نے باری باری قالین پر موجود سب جوتوں کو دیکھا تھا۔ وہ تمام یوں چمک رہے تھے جیسے ابھی ابھی دکان کی نمائشی الماری میں سے نکالے گئے ہوں۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی کچھ اور بوندیں نمودار ہوگئیں۔ آنکھیں فرش پر مرکوز کرتے ہوئے اس نے جھک کر جوتے اتارے اور قالین پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ہوئی ان کے درمیان آ گئی۔ جسٹن نے اسے گلے لگایا اور ایک ایک کے پاس لے جاتے ہوئے اس کا تعارف کروانے لگا۔ وہ بطور خاص البا کے اداکارہ ہونے کا ذکر کر رہا تھا۔ تقریباً سبھی لوگ گرم جوشی سے ملے تھے۔

ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اسکول کے قصے سنائے گئے۔ پسندیدہ کھلاڑیوں اور پسندیدہ اداکاروں پر تبادلہ خیال ہوا، دولڑکوں اور ایک لڑکی نے مل کر گٹار کی دھن پر گیت سنائے، لطیفوں کا ایک دور چلا۔ صوفیہ بھی مقدور بھر گفتگو میں شریک ہوتی رہی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ جلد از جلد یہ محفل برخاست ہو اور وہ ایک لمحہ گنوائے بنا یہاں سے بھاگ کھڑی ہو۔ پھر بٹلر نے آ کر انہیں کھانے کی میز پر آنے کے لیے کہا تو خوشگوار ماحول میں سب ڈائننگ ہال کی سمت چل دیئے۔ صوفیہ کے ننگے پیروں پر مزید کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی یہ خیال اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا کہ جوتوں کے بغیر پاؤں ذلت کی علامت تھے۔ ملائم قالینوں سے ڈھکی ہوئی غلام گردشوں میں چلتے ہوئے بلاوجہ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

کھانے کی میز پر چنے ہوئے کھانوں کی تعداد اور تنوع شاید اسے کہیں زیادہ مرعوب کرتا اگر ایک اور مسئلہ اسے الجھا نہ دیتا۔ جب وہ لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے تو سلینا نے اشارے سے بٹلر کو قریب بلا کر کوئی ہدایت کی۔ بٹلر تفہیمی انداز میں سر کو خم کرتے ہوئے چلا گیا اور چند لمحوں بعد دوبارہ آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھی۔ صوفیہ کے سامنے پہلے سے رکھی ہوئی پلیٹ اٹھا کر اس نے وہ دوسری پلیٹ رکھ دی تھی۔ اس کے دل میں کھد بدسی ہونے لگی۔ میز پر سجی ہوئی تمام پلیٹیں سفید تھیں جو کسی ایک ہی سیٹ کا حصہ تھیں جبکہ بٹلر اس کے لیے جو پلیٹ لایا تھا، وہ سبز رنگ کی تھی اس کا کنارہ ایک مقام سے ذرا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ اس امتیازی سلوک کی کوئی توجیہہ صوفیہ کے ذہن میں نہ آ سکی مگر کھانے کی اشتہا انگیز گرم خوشبو نے اس کے حواس پر اثر انداز ہونا بند کر دیا۔ یوں بھی اکثر کھانے اسے نامانوس اور اجنبی نظر آ رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ کھانے میں اس کی عدم دلچسپی کو کوئی محسوس نہ کرے، اس نے اسپنچ پڑا Spinach pizza کا ایک مختصر ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ سلینا نے اچانک اسے مخاطب کیا تھا۔

''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ ان میں سے کئی کھانوں کو تم نے آج سے پہلے دیکھا تک نہیں ہوگا۔ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے بائیں ہاتھ کے قریب پڑے ہوئے نوڈلز کے پیالے کی قیمت ستر ڈالر ہے تو کہیں تم کرسی سے گر تو نہیں جاؤ گی۔''

کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ منہ کی طرف فورک لے جاتا ہوا صوفیہ کا ہاتھ ہوا میں رک گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ہوا میں تحلیل ہو کر سب کی نظر سے اوجھل ہو جائے۔ اس کی پلکیں گالوں سے چپک گئی تھیں۔ سلینا کہہ رہی تھی۔

''تمہارے طبقے کے لوگ ایسی چیزوں کے متعلق سوچنے کی بھی سکت نہیں رکھتے۔ یہ کوئی عام نوڈلز نہیں ہیں۔ یہ جاپانی رامن Ramen کی ایک خصوصی ترکیب ہے۔'' وہ کسی سیکھے ہوئے سبق کی طرح اس کھانے کے محاسن اور فضائل گنوانے لگی۔ صوفیہ ضرور اٹھ کر بھاگ جاتی اگر تو ندیل بٹلر دروازے کے بیچ رکاوٹ بن کر کھڑا نہ ہوتا۔ وہ صوفیہ کی زندگی کا طویل ترین کھانا تھا۔ سلینا نے اس پر اور بھی کئی پھبتیاں کسی تھیں، برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا وہ سر جھکائے کھانے کے جلد اختتام کی دعائیں مانگتی رہی۔ بالآخر سب لوگ کھا چکے اور جسٹن نے ایک اور کمرے کی طرف ان کی رہنمائی شروع کی تو صوفیہ نے پست آواز میں اس سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔

''بہت دیر ہوگئی ہے۔ میں گھر میں کہہ کر آئی تھی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گی۔ اب تو نو بجنے والے ہیں۔''
جسٹن نے اس کی درخواست رد کردی تھی۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم کوئی ننھی بچی تو نہیں ہو جسے کوئی بھی کام کرتے ہوئے گھر والوں سے پوچھنا پڑے۔ میں اور سلینا اگر پوری رات گھر سے باہر رہیں تو کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ ہم سے جواب طلبی کرے۔ ابھی تم بالکل نہیں جاسکتیں۔ اس پارٹی اور آج کے دن کا سب سے اہم واقعہ تو اب پیش آنے والا ہے۔ کیا تم لوگ مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟'' جسٹن نے چہرہ گھماتے ہوئے باقی لوگوں سے دریافت کیا۔
''درست...... درست...... کوئی شک نہیں۔'' سب نے آواز لگائی۔
صوفیہ اس ہلڑ بازی سے کوئی مطلب اخذ نہ کرسکی۔ اس نے بے چارگی سے اپنی بات دہرائی۔ ''میں اور نہیں رک سکتی۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ مجھے اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔''
''ہمارے کہنے پر تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم اس دن کو کبھی نہیں بھولو گی۔ اگر میری بات غلط ثابت ہو جائے تو تمہیں اختیار ہوگا کہ مجھے کسی بھی برے نام سے پکارو جیسے چغد، احمق یا مسخرہ یا جو تمہارے جی میں آئے۔''
ایک بار پھر اس کے چاروں اور کھی کھی ہونے لگی۔ اس کے انکار اور احتجاج کو یکسر نظر انداز کردیا گیا تھا۔
وہ کمرہ ہال نما تھا۔ چھت سے ایک ہشت پہلو فانوس لٹکا تھا۔ قطاروں میں ترتیب سے کرسیاں رکھی تھیں جن کی اونچی پشتوں اور ہتھوں پر زعفرانی مخمل مڑھا تھا۔ کرسیوں کی اولین صف سے چند گز کے فاصلے پر ایک چبوترہ بنا تھا جس پر منبت کاری والی لکڑی کے چوکھٹے میں ٹیلی ویژن سیٹ نصب تھا۔ سب مہمانوں کو نشستوں پر بٹھا کر جسٹن نے دروازہ مقفل کردیا۔ پھر وہ چبوترے پر چڑھ گیا۔ چوکھٹے کے نیچے بنی ہوئی بڑی دراز کھینچ کر اس نے ایک ویڈیو کیسٹ برآمد کی۔ کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگانے کے بعد وہ چبوترے سے اتر کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اسکرین پر پہلا منظر ظاہر ہوا تو صوفیہ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ ایک پورنوگرافک فلم تھی۔ فلموں کی اس قسم سے وہ واقف تو تھی البتہ تاحال اس نے ایسی کوئی فلم دیکھی نہیں تھی۔
''میں اسے نہیں دیکھوں گی۔ ہم ابھی چھوٹے ہیں۔ ہمیں ان چیزوں سے دور رہنا چاہیے۔ مجھے اس کمرے سے باہر جانے دو۔''
اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا مگر ساتھ بیٹھی سلینا نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے پھر سے بیٹھنے پر مجبور کردیا۔
''پھر وہی چھوٹے بچوں جیسی بات صوفیہ!'' جسٹن کی آواز سنائی دی۔ ''بچپن کو خدا حافظ کہہ دو۔ ہم ٹین ایجرز ہیں۔ ہمیں ہر طرح کے تجربات سے آشنا ہونا چاہیے۔''
''میں اسے غلط تصور کرتی ہوں۔ جب تک ہم اٹھارہ سال کے نہیں ہوجاتے، ہمیں ان باتوں میں ملوث ہونا زیب نہیں دیتا۔''
اس بات کے جواب میں سب مل کر اس کا مضحکہ اڑانے لگے۔ مجبوراً اسے خاموش ہونا پڑا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ آخری لمحات کسی طور بیت جائیں تو وہ اس گھر سے باہر جا کر کھلی فضا میں سکھ کا سانس لے۔
''میں دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گی۔ جیسے تیسے یہ وقت گزر جائے تو میں اس عذاب سے نجات پاؤں۔''
اسے خبر نہیں تھی کہ جسے وہ عذاب گردان رہی تھی وہ تو محض معمولی خراشوں جیسا تھا۔ ویسی خراشیں جو کسی کو سائیکل سے گرنے یا دوڑتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرنے سے لگ جاتی ہیں۔ اصل زخم تو اب آنے والے تھے۔ کسی درخت کی چوٹی یا عمارت کی چھت سے گرنے پر جو چوٹیں لگتی ہیں۔ جن میں ہڈیاں ٹوٹتی ہیں اور گوشت پھٹ جاتا ہے ان سے تو اب اس کا واسطہ پڑنے والا تھا۔
فلم چند منٹ چل چکی تھی۔ جب ایک ایسا منظر ابھرا جس نے صوفیہ کو گندگی کے عظیم ڈھیر میں غرق کردیا۔ وہ جیسے کسی کچرا

دان میں تھی۔ عفونت اور گھٹن کے سوا دنیا میں کچھ نہ تھا۔ اسکرین پر البا نظر آ رہی تھی۔ اس نے پلکیں جھپک کر اپنی بصارت کو جھٹلانا چاہا۔ مگر وہ واہمہ نہیں تھا۔ نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔ کوئی بلبلہ نہیں تھا جو پھوٹ کر نیست ہو جاتا۔ وہ ٹھوس حقیقت تھی۔ دھڑکتی ہوئی...... سانس لیتی ہوئی...... آنکھوں کی پتلیوں کو نوچتی ہوئی۔ کسی نے جھلستی ہوئی راکھ کی مٹھی بھر کر اس کی آنکھوں میں جھونک دی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف سرپٹ دوڑی۔ قطار کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے جسٹن نے اس کے پیروں میں ٹانگ الجھا کر اسے گرا دیا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو تم؟ یہی تو ہے وہ نامور فنکارہ جس کی تم بیٹی ہو۔ تعجب ہے اپنی ماں کو اسکرین پر دیکھ کر تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔'' جسٹن اس کے اوپر جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔

وہ اٹھ کر دوبارہ بھاگ پڑی۔ سلینا اور ایک دوسری لڑکی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بے بس کر دیا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی مگر خود کو ان کی گرفت سے چھڑا نہیں پائی۔ وہ اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے ٹیلی ویژن کے نزدیک لے جا رہی تھیں۔ اچانک سب لڑکے لڑکیاں بولنے اور چلانے لگے تھے۔ کون کیا کہہ رہا تھا۔ وہ آوازوں میں تمیز نہیں کر سکتی تھی۔ صرف ایک چیز اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ وہ سب اس کے اور البا کے متعلق کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ اس نے چبوترے کی سیڑھی کے ساتھ گھٹنے پھنسا کر خود کو گھسٹنے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے کھینچ کر ٹیلی ویژن کے سامنے پھینک دیا گیا۔ اس کے گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ فی الحال وہ انہیں سہلا نہیں سکتی تھی۔ جونہی دونوں لڑکیوں نے اس کی بازو چھوڑے۔ اس نے گھٹنوں میں سر گھسا کر بازوؤں کو سختی سے سر کے گرد لپیٹ لیا۔ وہ سب اس کے چاروں اطراف گھیرا ڈالے شور مچا رہے تھے۔ کوئی اس کے ہاتھوں پر تھپڑ مارتے ہوئے اسے بازو کھولنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کچھ ہاتھوں نے اس کے سر کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس سے گردن اٹھانے اور آنکھیں کھول کر اسکرین کو دیکھنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس نے کان کے قریب جسٹن کی چیختی ہوئی آواز سنی۔

''اپنی عظیم ماں کی اداکاری دیکھنے سے گریز کیوں؟ تمہیں دیکھنا پڑے گا کیونکہ ہم سب اصرار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا ہے۔ اس دن کو تم کبھی فراموش نہیں کرو گی۔ آنکھیں کھولو ورنہ ہم تمہارے ڈھیلے کاٹ کر ٹی وی کی اسکرین سے چپکا دیں گے۔ آنکھیں کھولو...... آنکھیں کھولو...... آنکھیں کھولو......'' وہ سب یک آہنگ ہو کر نعرے لگانے لگے۔

پھر وہ اس کے بازوؤں کی گرفت چھڑانے میں کامیاب ہو گئے اور اس کا منہ اسکرین کے ساتھ دبا دیا گیا۔ اس نے اتنی سختی سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ پپوٹے اور رخساروں کی ہڈیاں دکھنے لگی تھیں۔

قہقہے...... چیخیں...... ٹی وی کی آواز...... خوف...... نفرت...... غصہ...... ذلت...... بے بسی...... اس دن کے یادگار ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس دن کے بعد اس نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ گرانٹ کو اس عمل پر کوئی اعتراض نہ ہوا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ صوفیہ مستقل گھر میں موجود ہو گی تو وہ اس کی زیادہ اچھی تربیت کر سکے گا۔ اگلے دو تین برس اس نے اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ جب اسے موقع میسر آتا وہ ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس چلی جاتی اور شاپنگ مالز میں گھومتی رہتی۔ وہ کسی بھی شے کو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی مگر ان قیمتی، چمکتی ہوئی چیزوں کو دیر تک گھورتے رہنا اسے دلچسپ لگتا تھا۔ انہی دنوں میں اس نے چیزیں چرانا شروع کر دیں۔ وہ پہروں چوری کے طریقوں پر غور کرتی رہتی اور جب کوئی طریقہ آزمانے کا موقع ملتا وہ ہرگز نہ چوکتی۔ دو تین دفعہ اس مہم جوئی کے دوران وہ پکڑی بھی گئی تھی۔ مگر کم عمر ہونے کی بنا پر معمولی سرزنش کر کے اسے جانے دیا جاتا۔ چاکلیٹ کی بار اور کھلونوں سے لے کر ٹائیوں اور کراکری تک وہ ہر شے پر ہاتھ صاف کرتی۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ چرائی جانے والی چیزوں کی اسے ضرورت بھی ہوتی تھی یا نہیں۔ بس اس طرز پر وہ اپنا غصہ نکالا کرتی تھی۔

✠ ✠ ✠

اس رات البا خاصی تاخیر سے گھر آئی تھی۔ گرانٹ کہیں گیا ہوا تھا اور صوفیہ کچن کے فرش پر کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ البا کے ہمراہ ایک مرد تھا۔ جب وہ دونوں کچن کے دروازے کے سامنے سے گزر رہے تھے تو صوفیہ کو اس شخص کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ ایک کوتاہ قد آدمی تھا۔ اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھے تھے، سر پر اونی ٹوپی تھی اور نصف سے زائد چہرہ اونی مفلر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بمشکل اس کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ رات خنک تھی مگر ایسی شدید ٹھنڈ بھی نہیں تھی کہ گھر کے اندر آنے کے بعد بھی اسے دستانے اور مفلر ہٹانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

''کیا گھر میں کوئی اور ہے؟'' اس کی آواز میں سرسراہٹ سی تھی۔ غالباً مفلر کی اوٹ سے بولنے پر ایسا تاثر پیدا ہو رہا تھا۔

''کوئی نہیں۔ اور تو کوئی بھی نہیں۔ صرف تم اور صرف میں۔ میں اور تم۔ تم اور میں۔''

اس نے البا کو گنگناتے ہوئے سنا۔ وہ نشے میں شرابور تھی۔ آواز کی لہک گواہ تھی کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

صوفیہ نے سر تک کمبل تان کر کروٹ لے لی۔ کب سے وہ ایسے ہی کروٹیں بدلے جا رہی تھی۔ لیکن اونگھ اور نیم غنودگی کے بیچ اٹکی ہوئی تھی۔ کثرت استعمال سے وہ کمبل کئی جگہوں سے جھرجھرا ہو چکا تھا اور اندر گھسنے والی ٹھنڈی ہوا اسے سونے نہ دیتی تھی۔ معاً ایک دردآلود چیخ بلند ہوئی۔ خوف سے صوفیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک اور چیخ گونجی جو چیخ سے زیادہ خرخراہٹ لگتی تھی۔ البا یوں چلائی تھی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ گہری اور جامد خاموشی۔ صوفیہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس سے ہاتھ پاؤں بھی ہلائے نہ جاتے تھے۔ بھاری جوتوں کی تیز چاپ کچن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس نے دروازے میں سے اس آدمی کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔

اس کی صورت اب بھی مفلر نے چھپا رکھی تھی۔ اس کے دستانوں اور کوٹ پر تازہ خون لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا جس کا تیز دھار پھل گاڑھے سرخ خون سے تر ا ر یز تھا۔ صوفیہ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر تھم گیا۔ صوفیہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں کسی افسوں کے اثر سے اسی رخ جم گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا وہ قیامت تک پلکوں کو جنبش نہیں دے سکے گی۔

''مجھے دیکھ کر تم ایک بھیانک غلطی کا ارتکاب کر رہی ہو۔ تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ منہ پر کمبل ڈال لو۔''

اس سرسراتی ہوئی آواز نے صوفیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑا دیں۔ اس نے جھرجھراتے ہوئے تیزی سے کمبل کو منہ اور سر کے گرد لپیٹ لیا۔

''تم ایک خوش قسمت لڑکی ہو کہ تم نے میرا چہرہ نہیں دیکھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو خیر چھوڑو...... تم ہمیشہ شکرگزار رہو گی کہ ایسا نہیں ہوا۔'' وہ پرسکون ٹھہرے ہوئے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

صوفیہ نے نل کھولے جانے اور پانی گرنے کی آواز سنی تھی۔

''شاید ہماری ملاقات نہ ہوتی کیونکہ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ ادھر ادھر کے معاملات میں بالکل نہیں الجھتا۔ مگر ہوا یہ کہ باتھ روم میں پانی نہیں آ رہا تھا اور باہر جانے سے پہلے مجھے کچھ چیزوں کو دھونے کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے مجبوراً مجھے کچن میں آنا پڑا۔ میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔ میرے دماغ میں آوازیں آتی ہیں جو مجھے اکساتی ہیں۔ مجھے ان کی بات ماننا ہی پڑتی ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں معاشرے کی صفائی پر مامور کیا گیا ہوں۔ ہر کسی کو اپنے فرائض نبھانے چاہئیں۔ میں یہی نبھا رہا ہوں۔ میں برا آدمی ہوتا تو میں تمہیں بھی...... ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں...... میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ہاں اتنا یاد رکھو کہ مجھے نافرمانی اور چالاکی سے نفرت ہے۔ مجھے امید ہے ان میں سے کوئی عادت تم میں نہیں پائی جاتی ہو گی۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ تم صبح تک اسی جگہ ایسے ہی کمبل تانے لیٹی رہو۔ میں تمہیں سہانے سپنوں کی دعا دیتا ہوں۔''

گرتے ہوئے پانی کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ چلا گیا تھا یا وہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ سانس روکے پڑی رہی۔ جب بہت وقت بیت گیا اور معمولی سی آہٹ بھی نہ ابھری تو اس نے نہایت آہستگی سے کمبل نیچے سرکایا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کچن سے نکل آئی اور دیوار کے ساتھ لگ کر سہمے ہوئے قدم بڑھاتی الیا کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے کمرے تک پہنچی۔ بتی روشن کرنے پر اسے بے اختیار ابکائی آ گئی تھی۔ الیا اپنے پسندیدہ رنگ میں لت پت تھی۔ اس کی آنکھیں مردہ مچھلی کی مانند کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب جانے کے لیے صوفیہ کو اپنی تمام تر ہمت صرف کرنا پڑی۔ الیا کی ناک کا بانسا اور نچلا جبڑا ٹیڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر چاقو سے کچھ حروف کھدے ہوئے تھے۔ صوفیہ نے بغور دیکھا تو اسے WHORE لکھا ہوا دکھائی دیا۔ الیا کی جلد میں گدی ہوئی اس گالی کو دیکھ کر جانے اسے کیا ہو گیا وہ بھاگتی ہوئی کچن میں واپس گئی اور وہاں سے صابن، پانی اور ایک رومال لے کر آئی۔ الیا کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے وہ تن دہی سے اس کی پیشانی دھونے لگی۔ کسی اور کی نظر پڑنے سے قبل اسے وہ گالی مٹانا تھی۔ وہ صابن اور پانی سے مل مل کر الیا کی پیشانی صاف کرتی رہی مگر وہ اس گالی کو معدوم نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کسی قلم سے تحریر کیے ہوئے حروف نہیں تھے۔ وہ کھال کے اندر اترے ہوئے، گوشت میں کھبے ہوئے لفظ تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے انداز میں دیوانگی آنے لگی۔ وہ رکے بغیر ان لفظوں کو مٹانے کی سر توڑ جدوجہد میں مگن ہو گئی۔

جب گرانٹ اس کمرے میں داخل ہوا تو اس نے صوفیہ کو پاگلوں کی طرح ایک خون آلود کپڑے سے مری ہوئی الیا کا ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔

الیا کے فیونرل پر گرانٹ نے اس سے کہا تھا۔ ”کبھی کبھی خدا گناہ گاروں کو دنیا میں ہی عبرت کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر شرمناک موت کیا ہو گی۔ اس کی نعش خود لوگوں کو بتا رہی ہے کہ وہ کس طرح کی عورت تھی۔ وہ قیامت کے دن بھی اپنی پیشانی پر بدکاری کے اس نشان کے ساتھ اٹھے گی۔ اس کا عذاب ابھی تمام نہیں ہوا۔ وہ جہنم میں جلے گی۔ اس کے گناہوں کی سزا تا ابد جاری رہے گی۔ وہ قابل نفرت عورت تھی۔ تم کبھی اس جیسی بننے کی خواہش نہ کرنا۔ اس کے ماتھے پر لکھی ہوئی یہ گالی ہمیشہ یاد رکھنا۔“

درد مکڑی کا جالا ہوتا ہے۔ جتنا پھڑ پھڑاؤ، جتنے ہاتھ پاؤں مارو، اسی قدر زیادہ تار لپٹتے چلے جاتے ہیں۔ اسیری کا درجہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ واویلا کرنے سے درد کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ درد کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ پسپائی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ سیس نوانے سے ہی درد گھٹتا ہے۔ صوفیہ نے کبھی درد سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ مزاحمت کرتی رہی اور اپنا درد بڑھاتی رہی یہاں تک کہ درد نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صلب کر لی۔ وہ کیا چاہتی تھی اور کیوں چاہتی تھی؟ اس نے ان سوالوں کا گلا گھونٹ کر ان کی لاشیں اپنے اندر کہیں گہرائی میں دفن کر دی تھیں۔

✠ ✠ ✠

عمر کو جس فون کال کا شدت سے انتظار تھا آخر ایک دن وہ آ گئی۔

”کیا تم محمد عمر ہو؟ میں آج اپنے پرانے گھر گیا تھا اور مجھے تمہارا پیغام ملا۔ میں ڈاکٹر داؤد بات کر رہا ہوں۔“

عمر تعین نہ کر سکا کہ اس کی آواز میں قدرتی طور پر کپکپاہٹ تھی یا وہ کسی جذباتی رَو کے زیر اثر تھا۔

”جی میں عمر ہوں۔“ اس نے تصدیق کی۔

”میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کہ مجھے کہاں آنا ہو گا؟“

”آپ مت آیئے، میں خود آپ کے گھر آ جاتا ہوں۔ آپ مجھے پتا بتا دیجیے۔“

''ٹھیک ہے جیسے تم کہو، پتا ہے چھ سو بائیس این، رابنسن سٹریٹ، سلور لیک ڈسٹرکٹ۔ تم آج ہی آؤ گے نا؟''

''ہاں میں ابھی کچھ دیر میں روانہ ہو جاتا ہوں۔'' عمر نے کہا۔

''ہم لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہیں یہاں تک آنے میں اندازاً کتنا وقت لگے گا؟ تم فوراً آ جاؤ۔''

اس کے انداز میں بے تابی تھی۔ فون رکھنے سے قبل اس نے متعدد بار یہی بات دہرائی تھی۔ جب وہ داؤد کے بتائے ہوئے مکان پر پہنچا تو اسے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے دو افراد دکھائی دیئے۔ وہ جیسے اس کا استقبال کرنے وہاں موجود تھے۔ اسے تھوڑی سی جھجک محسوس ہوئی تھی۔ پینتالیس چھیالیس سال کا ایک درمیانے قد کا خوش رو مرد آگے آیا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ اشتیاق بھری آنکھوں سے عمر کو گھور رہا تھا۔

''میں داؤد ہوں۔ وہ گھر میرا تھا جہاں تم پیغام چھوڑ گئے تھے۔''

فربہ جسم والی بوڑھی عورت داؤد کو پرے ہٹاتی ہوئی اس کے سامنے آئی اور روہانسی آواز میں بولی۔ ''تم پرنیاں کے بیٹے ہو؟ میری پرنیاں کے بیٹے۔ وہ کہاں ہے؟ اسے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے؟''

داؤد نے اس عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا۔ ''آنٹی! ابھی اندر چل کر تسلی سے بات کرتے ہیں۔ مجھے اطمینان کر لینے دیں کہ یہ واقعی ہماری پرنیاں کا بیٹا ہے۔''

بوڑھی عورت کو اس بات سے تکلیف ہوئی تھی۔ ''اسے دیکھنے کے بعد بھی تمہیں کسی پوچھ تاچھ کی ضرورت ہے؟ تمہیں اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہیں؟ رنگ اور بناوٹ میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں ہے۔ اور یہ دیکھو اس کی گردن پر تل ہے۔ پرنیاں کی اولاد کے سوا کسی کی گردن پر ایسا تل ہو سکتا ہے بھلا؟''

اب وہ مرتعش ہاتھوں سے عمر کی گردن کو چھو رہی تھی۔

عمر اس صورت حال سے خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ داؤد نے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ پرنیاں کی امی ہیں۔ ان کا اس طرح سے محسوس کرنا ایک قدرتی سی بات ہے۔''

تو وہ اس کی نانی تھی۔ عمر نے ایک نئی نظر سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ اگر بڑھاپے نے اس کے نقوش کو اتنا بدل نہ ڈالا ہوتا تو اس میں پرنیاں کی شباہت ڈھونڈنا آسان ہوتا۔ اس کی رنگت پرنیاں کی طرح ہی سفید تھی اور پیشانی پر بالوں سے بننے والی قوس بھی مماثل تھی۔ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر کبھی آپا کے گھر والوں سے سامنا ہوا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس وقت وہ متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ وہ آپا کے لیے خوش تھا اور خود ان سے بے گانگی محسوس کرتا تھا۔

پرنیاں کی ماں کبھی اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرتی اور کبھی اس کے چہرے کو انگلیوں سے چھوتی۔

''یہ اپنے منہ سے انکار کر دے تو بھی میں نہ مانوں کہ یہ پرنیاں کا بیٹا نہیں ہے۔ میں پہچان سکتی ہوں۔ میری نظر دھوکہ نہیں کھا سکتی۔ بیٹا! میں تمہاری نانی ہوں۔ پرنیاں تم سے میرا ذکر کرتی رہتی ہوگی؟''

وہ خاموش رہا۔

داؤد نے مداخلت کی تھی۔ ''وینس آنٹی! ہم لوگ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ذرا تحمل سے کام لیں۔ آؤ عمر! ڈرائنگ روم میں چلیں۔''

داؤد، وینس کو بازوؤں سے تھام کر اسے داخلی دروازے کی سمت لے جانے لگا۔ وہ مسلسل گردن گھما کر عمر کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی تیرتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں اسے گھر کے دیگر لوگوں سے ملوایا گیا۔ ڈاکٹر داؤد کی بیوی، اس کا بیٹا اور دو بیٹیاں، ایک پختہ عمر کا گونگا

بہرا آدمی جو غالباً دماغی لحاظ سے غیر متوازن تھا۔ داؤد نے اس کے بارے میں عمر کو بتایا کہ وہ اس کا ماموں گونی تھا۔

''کیا پرنیاں امریکہ میں ہے؟ کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟''

داؤد کے اس سوال پر فضا میں امید کروٹیں لینے لگی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ مجسم سماعت بن گئے تھے۔

''نہیں وہ پاکستان میں ہیں۔ لاہور میں رہتی ہیں۔''

''لاہور میں کب سے رہتی ہے؟''

''شاید پچھلے انیس بیس سالوں سے۔''

وینس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ''وہ مجھ سے چند سو میل دور رہتی تھی اور میں اسے ڈھونڈ نہ سکی۔ کیسی بدقسمت ہوں میں۔''

''لاہور میں کس کے پاس رہتی ہے؟'' داؤد نے اگلا سوال کیا۔

''اکیلی رہتی ہیں۔ وہ ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔''

''تمہیں میرے گھر کا پتا کیسے ملا؟ کیا اس نے تمہیں میرے پاس بھجوایا ہے، کیا اب وہ ہم لوگوں سے ملنا چاہتی ہے؟''

انہیں مایوس کر کے عمر کو دکھ ہوتا لیکن اس نے صاف گوئی سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔

''میرا نہیں خیال کہ وہ آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے گھر والوں کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ آپا کے علم میں نہیں کہ میں آپ لوگوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ سراسر میرا اپنا ہے۔ میں مکمل یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ سے ملنے پر راضی ہوں گی یا نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ان سے کوئی غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ آپ سب سے شرمندہ ہیں۔''

''نہیں۔ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔'' وینس نے تڑپ کر کہا۔ ''غلطی مجھ سے ہوئی بیٹا! سارا قصور میرا ہے۔ جب ہم نے اس کی شادی طے کی تو وہ پہلے ہی ایک مسلمان آدمی سے نکاح کر چکی تھی۔''

اس جملے نے عمر کو ساکت کر دیا۔ اس کا باپ مسلمان تھا۔ یہ وہ غلطی تھی جس نے آپا کو در بدر کر دیا تھا۔

وینس رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بول رہی تھی۔ ''وہ سرکش نہیں تھی اس میں بغاوت نہیں تھی۔ وہ محبت میں مجبور ہوئی ہو گی۔ وہ کم عمر تھی، بڑی ناسمجھ تھی۔ اس نے مجھ سے حقیقت بیان کر دی تھی مگر میں خود غرض بن گئی۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ میں نے اسے اتنا عاجز کر دیا کہ گھر سے بھاگ جانے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ بچا۔ وہ شرم کے مارے مجھے یہ نہ بتا سکی کہ وہ پریگننٹ تھی۔ جو وہ کر چکی تھی، وہ کیسے لوٹتا؟ میں چاہتی تو اسے معاف کر دیتی۔ میں چاہتی تو اس کی مدد کرتی۔ میں نے نہیں چاہا۔ میں نے معاف نہیں کیا۔ وہ اور کیا کرتی؟ جب اس کی ماں ہی کوئی لچک دکھانے پر آمادہ نہیں ہوئی تو وہ کس سے کہتی؟ اور کس سے مدد مانگتی؟'' آنسوؤں کی تندی سے وینس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

داؤد کے ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

عمر نے جیب سے پرنیاں کا لکھا ہوا خط نکال کر داؤد کو دے دیا۔ ''یہ ایک روز اتفاقاً قاآن کے ٹرنک میں سے مجھے ملا تھا۔''

داؤد سے پہلے وینس نے اسے پڑھا تھا۔ پڑھتے ہوئے بار بار وہ گالوں پر بہتا ہوا پانی پونچھ رہی تھی۔ پھر وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز سے رونے لگی۔

''مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں منا لوں گی اسے۔ ماں سے بھی کوئی چھپتا ہے کیا؟ یہ گونی ہر روز مجھے مارتا ہے۔ کئی دفعہ

اتنے زور سے کہ میرے جسم پر نشان پڑ جاتے ہیں اور یہ کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ میری پرنیاں نے اپنے لیے اتنی کڑی سزا تجویز کر لی۔ اتنی شرمندہ ہے کہ تمام زندگی اپنی ماں سے آنکھ ملانا نہیں چاہتی۔ مجھے اس کا فون نمبر بتاؤ۔ میں ابھی اس سے بات کروں گی۔ میری آواز سن کر......'' اس سے آگے وینس سے بولا نہ گیا۔

داؤد خط پڑھ چکا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر وینس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''آنٹی! ہم آج ہی اس سے بات کریں گے۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ وہ پھر کہیں روپوش نہ ہو جائے۔ عمر اس کی مرضی سے یہاں نہیں آیا۔ پرنیاں کے گلٹ نے اسے اس حد تک خود اذیتی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے گی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس خط کو پڑھ کر آپ کو لگتا ہے کہ وہ آسانی سے ہم سے ملنے پر تیار ہو جائے گی؟ ہمیں اس بارے میں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔''

وینس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ برستی آنکھوں سے عمر کی صورت دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد آنسوؤں کی روانی میں کمی آئی تو وہ بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ وہ میری بیٹی ہے اور میں اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہر قیمت پر۔ کچھ بھی کرو، اسے میرے سامنے لے آؤ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی۔ کسی بھی طرح اسے مجھ سے ملوا دو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' داؤد نے اسے حوصلہ دیا تھا۔

پھر وہ دونوں عمر سے سوال پوچھنے لگے۔

اس کی تربیت پرنیاں کی تھی تو وہ مسلمان کیوں تھا؟ اس کے پورے نام محمد عمر سے داؤد کو اس بات کا دھیان آیا تھا۔

وہ پرنیاں کو آپا کیوں کہتا تھا؟ کیا پرنیاں نے کبھی اس کے باپ کے متعلق کچھ بتایا تھا؟ وہ کیسی زندگی بسر کر رہی تھی؟ اس کی صحت کیسی تھی؟ کیا اس کے پاس پرنیاں کی کوئی حالیہ تصویر تھی؟ ان کے ہونٹوں پر سوال ہی سوال تھے۔

✠ ✠ ✠

''آپا کی ماں اور بھائی آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟''

''نہیں وینس آنٹی علاج کے سلسلے میں آئی ہیں۔ پچھلے دنوں ہی ان کی ہارٹ بائی پاس سرجری ہوئی ہے۔''

''آپ کزن ہیں آپا کے؟''

اس کے پوچھنے پر داؤد اداسی سے مسکرایا۔ ''کزن کہہ سکتے ہو، ویسے ہمارے درمیان کوئی قریبی رشتہ داری نہیں ہے۔ ہم دونوں کی گریٹ گرینڈ مدر ایک ہیں۔ پرنیاں کے ابو اور میرے ڈیڈی میں شروع سے ہی بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ ایک اسکول اور ایک کالج سے پڑھے۔ وہ سگے بھائیوں سے زیادہ قریب تھے۔ پرنیاں میرے ڈیڈی کو چچا اور میری مدر کو چاچی کہا کرتی تھی۔ اسی بنا پر میرے اور پرنیاں کے درمیان......'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''میں اسے پسند کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا، وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہے۔ میں غلط تھا۔ اس کی شادی مجھ سے ہونے والی تھی۔''

عمر کو اپنے سوال پر ندامت ہوئی۔ میز پر پڑی ہوئی ایک کتاب اٹھا کر وہ بلا مقصد اس کے اوراق پلٹنے لگا۔

''آپ کو یہ تو علم ہوگا کہ وہ میرے فادر سے کہاں ملی تھیں۔ امریکہ میں یا پاکستان میں۔'' اس نے بدستور صفحے الٹتے ہوئے کہا۔

''پرنیاں نے اپنی زبان سے تو کبھی کچھ نہیں بتایا البتہ میں سب جانتا ہوں۔ مجھے ان کی ایک ایک ملاقات کا احوال معلوم ہے۔ وہ ایک مفلوک الحال شخص تھا۔ وہ میساچوسٹس سے ہالی وڈ اسٹار بننے کا عزم لے کر لاس اینجلس آیا تھا۔ یہاں ایک پارک میں اس

کی پرنیاں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہیں سے ان کے بیچ پسندیدگی کا سلسلہ شروع ہوا۔"

"آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟"

"کیونکہ میں تمہارے باپ کو جانتا ہوں عمر!"

اس نے کتاب بند کرتے ہوئے داؤد کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

"وہ کون ہیں؟ کیا آپ کبھی ان سے ملے ہیں؟ وہ کہاں ہیں؟ آپ ان کے متعلق کیا جانتے ہیں؟" وہ مضطرب ہو کر کرسی میں آگے کھسک آیا۔

"یہ سب باتیں خود اسی نے مجھے بتائی ہیں۔ اس سے نکاح کرنے کے ایک دن بعد پرنیاں اور ہم سب پاکستان چلے گئے کیونکہ تمہارے نانا بستر مرگ پر تھے اور مرنے سے پہلے میری اور پرنیاں کی شادی کے خواہش مند تھے۔ اس دوران پرنیاں اور تمہارے باپ احمد، اس کا اسکرین نیم ایڈم گرانٹ ہے، ان دونوں کی فون پر بات ہوتی رہی۔ اس نے پرنیاں سے وعدہ کیا کہ شادی کی تاریخ سے قبل اسے لینے پاکستان پہنچ جائے گا۔ جب وہ پاکستان جانے کی تیاری مکمل کر چکا تو اس کی ایکس گرل فرینڈ البا نے بلیک میل کر کے اسے روک لیا۔ دراصل اس نے معاشی حالات سے مجبور ہو کر ایک پورنوگرافک رسالے کے لیے کام کیا تھا۔ اسی کو بنیاد بنا کر البا نے اسے پاکستان جانے نہیں دیا۔ ان دنوں اسے ایک بڑی امپورٹنٹ فلم میں لیڈ رول ملا تھا۔ اگر البا ڈائریکٹر یا اسٹوڈیوز کو وہ میگزین دکھا دیتی تو اسے بلیک بال کر دیا جاتا۔ پرنیاں کو علم ہوا کہ وہ پریگنٹ ہو چکی ہے وہ کسی کو بتائے بغیر گھر سے کہیں چلی گئی۔ اس نے پھر گرانٹ سے کانٹیکٹ کیا اور اپنے پریگنٹ ہونے کی خبر سنائی مگر البا کی بلیک میلنگ سے ڈر کر اس نے پرنیاں سے کہہ دیا کہ ان کے نکاح کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بعد پرنیاں کا کچھ پتا نہیں چلا۔ بعد میں گرانٹ کے ہاتھ سے وہ فلم بھی چلی گئی۔ وہ ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے لگا۔ ادنیٰ سے کردار اور گمنام پروڈکشنز۔ وہ اور البا کئی سال ایک اپارٹمنٹ میں اکٹھے رہے۔ البا کا مرڈر ہو گیا تو اس کی بیٹی صوفیہ کی گرانٹ نے پرورش کی۔ وہ آج بھی پرنیاں کو یاد کرتا ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ دو دفعہ پاکستان گیا۔ پرنیاں کو تلاش کرنے مگر وہ کیسے ملتی۔ ہم لوگ ہر جگہ ڈھونڈ چکے تھے۔ اس نے پرنیاں کے نام بے شمار خطوط لکھے۔ ظاہر ہے ان کا کبھی جواب نہیں آیا۔ پرنیاں کہاں رہی اور کس حال میں رہی، ہمیں کچھ پتا نہیں۔"

لیکن عمر کو پتا تھا کہ آپا کس حال میں رہی تھی۔ محبت نے اسے کتنا خوار کیا تھا۔ پورنوگرافک رسالے اور فلموں کا تذکرہ سن کر اس کا سر گھومنے لگا تھا۔ اس نے اپنی نظر پر اعتبار کیا تھا۔ آپا کے آنسوؤں پر نہیں۔ اس کے ذہن کے پردے پر دیوانہ وار آگ بجھاتی ہوئی آپا کا عکس نمودار ہوا۔

"انہیں نہ جلاؤ، تمہیں خدا کا واسطہ، ایسا نہ کرو، میں تمہیں ان کے متعلق سمجھا سکتی ہوں......"

اسے کوئی چیز چبھ رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کو یہ باتیں کیوں بتاتے رہے۔ نیچرلی آپ دونوں کے درمیان rivalry (رقابت) ہونی چاہیے تھی۔ پھر آپ لوگوں میں ایسے مراسم کیسے بن گئے کہ وہ انتہائی ذاتی چیزیں آپ سے شیئر کرتے تھے۔" اس نے صدمے سے سنبھل کر کہا۔

داؤد ہاتھ کی پشت سے کنپٹی کو سہلا رہا تھا۔ "شیئر کرنے کو کوئی اور تھا ہی نہیں۔ پرنیاں کی باتیں کرنے کے لیے صرف میں ہی دستیاب تھا تو اس نے مجھ ہی پر اکتفا کر لیا۔ پرنیاں کی گمشدگی کے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں پرنیاں تک جانے کا کوئی راستہ دکھا سکوں۔ پھر ہم وقفے وقفے سے ملتے رہے۔ میں اس سے پرنیاں کی بابت پوچھتا اور وہ مجھ سے سوال کرتا۔ ہم دونوں میں ایک عجیب سا تعلق استوار ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہماری ملاقاتوں کا درمیانی وقفہ بڑھتا رہا۔ پھر بھی ہم ایک

دوسرے سے مکمل غافل نہیں ہوئے اور عمر! میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں۔''
اس کا جسم تن گیا۔ گھٹنے پر دھری ہوئی کتاب پھسل کر فرش پر جا گری تھی۔

✠ ✠ ✠

''یہ ایڈم گرانٹ ہے۔'' داؤد نے بیڈ پر لیٹے ہوئے ایک دبلے اور نحیف شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا۔
عمر بے ساختہ اس کے قریب چلا گیا۔ پھر اس کے قدم یوں رک گئے۔ جیسے کسی چابی بھرے کھلونے کی چابی گھوم کر چکر مکمل کر چکی ہو۔ وہ جیسے کسی آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ عکس تیس سال بعد والے عمر کا تھا۔ ان کے سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک ایک ایک عضو میں عمر کو اپنا آپ دکھائی دیا۔ اگر وہ اسے پہلے کہیں ملا ہوتا تو کسی کے بتائے بغیر بھی اسے پہچان لیتا۔ وہ بھی عمر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی حلقہ زدہ آنکھوں میں الجھن اور ناگواری تھی۔ پھر اس کی توجہ داؤد کی جانب مبذول ہوئی۔
''داؤد فرڈیننڈ! تم کل پورا دن نہیں آئے۔ میں آدھی رات تک اسٹاف سے پوچھتا رہا۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تمہیں میری تنہائی پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ اگر تم مصروف تھے تو کم از کم تمہیں پیغام بھجوانا چاہیے تھا۔ جب تمہیں پتا ہے کہ تمہارے علاوہ یہاں کوئی نہیں آتا تو تم اتنی لاپروائی کیوں برتتے ہو؟'' بولتے ہوئے وہ اٹک رہا تھا۔ بیماری اور تکلیف نے اس کی صورت مسخ کر رکھی تھی۔
''میں تمہاری تنہائی کا بندوبست کر کے لایا ہوں۔ اب ایک اور مہمان بھی تم سے ملنے آیا کرے گا۔ اس سے ملو یہ تمہارا بیٹا ہے عمر۔'' داؤد نے عمر کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ وہ یوں بدکا جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔
''تم کتنے برے مذاق کرتے ہو ڈاکٹر۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اپنی بیوی کو تو میں نے مار دیا تھا۔ پرنیاں کو قتل کر دیا تھا۔ پھر بیٹا کہاں سے آ گیا۔'' وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا ''لیکن مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے پرنیاں کو قتل نہیں کیا تھا۔ کسی اور کو کیا تھا۔ کسی کو جان سے مارا تو ضرور تھا مگر وہ تھا کون؟''
عمر نے تشویش سے داؤد کو دیکھا۔ جواباً اس نے سر کو اس انداز سے جنبش دی جیسے اسے انتظار کرنے کو کہہ رہا ہو۔
''گرانٹ! یہ پرنیاں آئزک کا بیٹا ہے۔ تمہارا اور پرنیاں کا بیٹا۔ پاکستان سے تمہیں تلاش کرنے آیا ہے۔ تم اس سے بات تو کرو۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ۔'' داؤد نے رسان سے گرانٹ کو سمجھایا۔
''میں نہیں مانتا۔ میں یہ بات تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔'' گرانٹ درشتی سے بولنے لگا۔ ''میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ صوفیہ کو میں نے پالا ضرور ہے۔ مگر وہ بھی میری حقیقی بیٹی نہیں ہے۔ میں تو اکیلا ہوں۔ صحرا میں اگنے والے کسی تھوہر کی طرح۔ میری یادداشت اتنی بھی خراب نہیں ہوئی کہ میں اپنے بیٹے کو بھول جاؤں۔ پرنیاں نے کہا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ مگر اس بات کو زمانے گزر گئے۔ میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اسے میرے پاس ضرور بھیجتی۔ وہ مجھ سے لاکھ نفرت کرتی ہو، میرے بیٹے کو کبھی مجھ سے دور نہ رکھتی۔ اس کا دل ایسا سخت ہے ہی نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''وہ مجھے بہت یاد آتی ہے۔ ان دنوں تو اتنی کثرت سے کہ میں کچھ اور سوچ ہی نہیں پاتا۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ تکلیف رکتی کیوں نہیں؟ اول تو تم آتے نہیں داؤد اور اگر آتے ہو تو میری بے کسی کا مذاق اڑاتے ہو۔ لعنت ہو تم پر۔ چلے جاؤ اور اس لڑکے کو بھی لے جاؤ۔'' اس نے ایک ناراض نگاہ عمر پر ڈالی اور کروٹ لے کر رخ بدل لیا۔
داؤد نے ایک اسٹول کھینچ کر عمر کو بیٹھنے کے لیے کہا اور اس کے شانوں پر ہاتھوں سے ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔ عمر کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اس شخص سے کیا بات کرے۔ وہ چپ چاپ اس کی ابھری ہوئی ہڈیوں والی پشت کو دیکھتا رہا۔ وہ کسمسا رہا تھا اور دھیرے دھیرے دیوار کی سمت کھسکتا جاتا تھا۔ جیسے وہ بہت بے چینی محسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے آہستگی سے گردن موڑی اور پیچھے دیکھا۔ عمر کو وہیں بیٹھے دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل آ گئے تھے۔

''تم یہاں سے نکل جاؤ۔ تم کیوں مجھے ستا رہے ہو؟ کیا تمہیں ایک بوڑھے بیمار آدمی کی بے چارگی کا تماشہ دیکھ کر مزہ آتا ہے۔'' اس نے پھر سے دیوار کی طرف چہرہ گھما لیا اور تب عمر کو اس کی پنڈلی پر اوپر سر کے ہوئے نیلے پاجامے تلے سے کچھ ابھرے ہوئے نیلاہٹ مائل سرخ نشانات نظر آئے جو اپنی وضع سے بہت تشویش ناک معلوم ہوتے تھے۔ اس کی پنڈلی قدرے سوجی ہوئی سی تھی۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور اس کی نگاہ داؤد کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکنے لگی۔ وہ راہداری کے موڑ پر ایک ادھ کھلے دروازے میں استادہ نظر آیا تھا۔ وہ کسی شخص کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ اس نے بھی عمر کو دیکھ لیا اور اشارے سے اسے قریب بلایا۔ اسے لے کر وہ دفتر کی طرز پر سجے ہوئے ایک کمرے میں آ گیا۔

''تم کچھ پینا چاہو گے؟ چائے یا کافی؟''

داؤد کے پوچھنے پر اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔

''ان کو کیا بیماری ہے؟ میں نے ان کے جسم پر lesions (چھالے) دیکھے ہیں۔ کیا ان ہی کی وجہ سے وہ زیر علاج ہیں؟''

داؤد کے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا ہوئے جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ چند لمحے وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسائے انہیں چٹخاتا رہا۔

''یہ ایک قسم کا کینسر ہے۔ جو ٹیومرز تمہیں نظر آئے ہیں وہ Kaposi's Sarcoma کا نتیجہ ہیں۔''

عمر کو افسوس ہوا تھا۔ ویسا ہی افسوس جیسا کسی مصیبت زدہ انسان کے بارے میں جان کر ایک حساس دل رکھنے والا دوسرا انسان محسوس کرتا ہے۔

''کیا یہ جلد کا کینسر ہے؟''

''ہاں اسکن کینسر ہے لیکن ان معنوں میں نہیں جن میں تم پوچھ رہے ہو۔ یہ جلد تک محدود نہیں رہتا۔ بعض اوقات انٹرنل آرگنز تک پھیل جاتا ہے۔''

''اس کا علاج ممکن ہے؟ میرا مطلب ہے کیا ان کے صحت یاب ہونے کی امید ہے؟''

داؤد نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں کو ترتیب دیتے ہوئے دھیرے سے سر ہلایا۔ ''علاج تو ممکن ہے۔ کیموتھراپی ڈرگز، لیکوئڈ نائٹروجن کے ذریعے فریزنگ وغیرہ سود مند ہوتی ہے لیکن گرانٹ کے کیس میں یہ سب چیزیں کرنے کے باوجود......''

اس نے فقرہ ادھورا رہنے دیا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' عمر نے تعجب سے دریافت کیا۔

''اس کے بلڈ کے فی مائیکرو لیٹر میں سی ڈی فور پلس ٹی سیلز کا کاؤنٹ دو سو سے کم ہو چکا ہے۔''

''میں نہیں سمجھ سکا۔'' عمر کی الجھن بڑھی تھی۔

''اوہ میں معذرت چاہتا ہوں۔'' داؤد نے گویا چونکتے ہوئے کہا۔ ''بے دھیانی میں میری زبان سے ٹیکنیکل ٹرمز ادا ہونے لگیں۔ اصل میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ'' اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے گردن کی پشت کو ہاتھ سے دبایا ''اسے ایڈز ہے۔''

عمر کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''Kaposi's Sarcoma عموماً جان لیوا ثابت نہیں ہوتا لیکن ایڈز پیشنٹس کے متعلق یہ بات نہیں کی جا سکتی۔ کے ایس کی ٹریٹمنٹ سے ایڈز سے survival کے امکانات بہتر نہیں ہوتے۔''

عمر کو اس شخص پر رحم آ رہا تھا۔ وہ زندگی میں ایک ایسے مقام پر اس کے روبرو ہوا تھا جب اس سے قلبی وابستگی قائم ہونے کے امکانات ناپید نہیں تو محدود ضرور تھے۔ گرانٹ کی نذر کرنے کے لیے اس کے کھیسے میں ہمدردی سے زائد مالیت کا کوئی سکہ نہ تھا۔

''اس کی یادداشت کا بھی مسئلہ ہے۔ کبھی کبھار تو وہ اپنا نام تک یاد نہیں رکھ پاتا۔ وہ اندھیرے میں راہ بھولے ہوئے انسان کی مانند خوفزدہ اور تنہا ہے۔'' داؤد مزید کہہ رہا تھا۔ ''تم اسے ملنے آ جایا کرو تو اسے اچھا لگے گا۔ اس کی تنہائی کم ہو جائے گی۔ تمہاری مصروفیت آڑے نہ آتی ہو تو ضرور اس بارے میں سوچنا۔''

عمر نے خود کو یاد دلایا کہ اس کا کام یہیں ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کی اسے چاہت تھی نہ حاجت۔ آپا کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کے لیے وہ جو کر سکتا تھا، اس نے کر دیا تھا۔ جہاں تک گرانٹ کا تعلق تھا تو عمر اور اس کے مابین چھلکے اور گودے والا معاملہ تھا۔ ایک بار دونوں الگ ہو جائیں تو لاکھ یکجا کیے جائیں پھر سے پھل نہیں بنتا۔ اس نے طے کیا کہ یہاں سے جانے کے بعد دوبارہ گرانٹ سے نہیں ملے گا۔

معذرت طلب نگاہوں سے داؤد کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ''میں کوشش کروں گا البتہ وعدہ نہیں کرتا۔ فرصت ہوئی تو آؤں گا۔''

اسے کرسی سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر داؤد کی آنکھوں میں مایوسی در آئی۔ ''تم جا رہے ہو؟ وینس آنٹی تو بضد ہیں کہ تم جب تک امریکہ میں ہو، ہمارے پاس رہو۔ میری بھی یہی خواہش ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے عمر!''

''یہ مناسب نہیں لگتا۔''

''اس میں غیر مناسب کیا ہے؟ ہم تمہارے اپنے ہیں، کوئی غیر تو نہیں۔'' داؤد نے اصرار کیا۔

وہ کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ داؤد کے اجازت دینے پر ایک میل نرس نے اندر آ کر کہا۔ ''ڈاکٹر فرڈیننڈ! کمرہ نمبر تیرہ کا مریض آپ کو بلانے پر اصرار کر رہا ہے اور وہ بری طرح چیخ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔''

نرس کے جانے کے بعد داؤد دروازے کی جانب بڑھا تو عمر اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو پھر میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا۔''

داؤد گردن ٹیڑھی کر کے اسے دیکھتے ہوئے عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ مجھے بلانے کے لیے اس نے کبھی یہ حربہ نہیں اپنایا۔''

''کون سا حربہ؟''

''یہی چیخنے والا۔''

جب وہ گرانٹ کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ غضب ناک آنکھوں سے عمر کو گھورنے لگا۔ ''ادھر آؤ تم۔ یہاں میرے قریب آؤ۔'' اس نے چلا کر حکم دیا۔

''عمر نے اس کی فرمائش پوری کر دی تھی۔

''سچ سچ بتاؤ، تم نے یہ کیوں کہا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ یہ فریب کیوں دے رہے ہو تم؟ تمہیں میرے بارے میں معلوم کیسے ہوا کہ میری کوئی ایسی اولاد بھی ہے جس سے میں کبھی ملا ہی نہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی اس منصوبے میں تمہارا ساتھی ہے؟ تم دونوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنانے کا سوچا ہے۔ کیا یہ خیال کسی فلم کو دیکھ کر آیا ہے؟''

عمر اس افتاد سے گھبرا گیا تھا مگر اس نے نرمی سے کہا۔ ''میں فلمیں نہیں دیکھتا۔''

''وہ بھی نہیں دیکھتی تھی۔ میری خاطر اس نے دیکھنا شروع کر دیں۔'' گرانٹ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''آپ کی خاطر تو وہ اب بھی دیکھتی ہیں۔'' عمر کی زبان سے بے اختیار پھسل گیا۔

''میرے ساتھ یہ خوفناک مذاق کیوں کر رہے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا غلطی ہے میری جس کی سزا دینے تم آئے ہو۔ چلے جاؤ۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ عمر کو اس کے ہونٹوں پر سرخ بلبلے پھوٹتے ہوئے نظر آئے۔ وہ بستر پر دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ داؤد تیزی سے آگے آیا اور ایک ہاتھ سے گرانٹ کا سر تھام کر دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر سہلانے لگا۔ ''چیخو مت۔ کوئی تمہارے خلاف سازش نہیں کر رہا۔ کوئی تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا۔'' وہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

گرانٹ نے داؤد کے بازو کی اوٹ سے عمر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور بلغم زدہ آواز میں بڑبڑایا ''اس کی آنکھیں اوہ خدا اس کی آنکھیں۔''

وہ بے دم ہو کر داؤد کے بازوؤں میں جھول گیا۔

''عمر میں امید رکھوں کہ جلد ہی تم گرانٹ سے دوبارہ ملنے آؤ گے۔'' کمرے سے باہر آ کر داؤد نے اپنی بات دہرائی تھی۔

عمر خاموشی سے اس کے پہلو میں چلتا رہا۔

''میں تمہاری ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تمہیں آنا چاہیے۔''

''میرا ویزا مختصر مدت کا ہے۔ جانے میں وقت نکال پاؤں یا نہیں۔'' اس نے پھر معذرت کی تھی۔

''گرانٹ کے پاس بھی بہت کم وقت باقی ہے۔ تمہیں زیادہ دن نہیں آنا پڑے گا۔'' داؤد نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

✠ ✠ ✠

حکیم بیگم نے استری کیے ہوئے کپڑے ترتیب سے الماری کے خانے میں رکھے پھر چارپائی پر پڑی ہوئی بستر کی چادریں تہہ کر کے دوسرے خانے میں اوپر تلے جمانے لگی۔ پٹ بند کر کے وہ تھوڑی دیر کمر سیدھی کرتی رہی اور مڑ کر پرنیاں کو دیکھا جو بیڈ کی پشت کے سہارے نیم دراز، ایک کتاب پڑھتے ہوئے اونگھ رہی تھی۔ الماری کے زنگ کھائے ہوئے قبضوں سے برآمد ہونے والی گڑگڑاہٹ نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ کتاب بند کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

حکیم بیگم بولی۔ ''مجھے کپڑوں پر لوہا کرنے دی جاچ نئیں ہے دھیے! (مجھے کپڑے استری کرنے کا طریقہ نہیں آتا) نئیں تے دھوبی دا خرچہ بچ جاتا۔''

پرنیاں غائب دماغی سے اسے دیکھتی رہی۔

''کل سانجھرے چھوماں دا جوائی (داماد) آئے گا مجھے پنڈ لے جان لئی۔ ہن تو ٹھیک ہے۔ اپنے نکے موٹے کم (چھوٹے بڑے کام) آپ کر سکتی ہے۔ میں صالحہ تے مزمل سے بڑی اودر گئی ہوں۔ (اداس ہو گئی ہوں)۔ جے تو روکتی ہے تے میں نئیں جاتی۔ کی (کیا) مرضی ہے تیری؟'' حکیم بیگم نے نزدیک آتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں ہفتہ دس دن ٹھہر کے فیر پھیرا مار جاؤں گی۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آپ سے کہنے ہی والی تھی کہ بہت دن ہو گئے۔ آپ کو گاؤں جانا چاہیے۔ اچھا ہوا آپ نے خود ہی ارادہ کر لیا۔'' پرنیاں نے کہا۔

''میں ٹیلی فون تے خیر مہر پوچھتی رہوں گی۔ تجھے اک بھور (ذرا) پریشانی آئے، مجھے بلا لینا۔ میں کجھ (کچھ) کھان پین لئی لے آواں۔ کس شے کو جی کرتا ہے اج؟''

پرنیاں نے انکار کر دیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر تو ہوئی مجھے کھانا کھائے ہوئے۔ شام کو میں خود کوئی چیز پکا لوں گی۔''

''لے دس۔ چپا روٹی تے چار دانے دال دے کھا کے تیرا رج ہو گیا؟ کھادا پیتا کر۔ تیرے جثے میں ذری جان آئے۔'' (لو بتاؤ۔ ذرا سی روٹی اور دال کے چار دانے کھا کر تیرا پیٹ بھر گیا؟ کھایا پیا کر۔ تیرے بدن میں ذرا جان آئے)

''ابھی مجھے بھوک نہیں، ہو گی تو میں کھا لوں گی۔ میں زیادہ وقت بستر پر لیٹی رہتی ہوں، اس لیے بھوک کم لگتی ہے۔'' پرنیاں نے کہا۔

''چنگا تیری مرضی۔ میں ویہڑے دا کھلارا نبیڑ کے آتی ہوں۔ (میں صحن کی بے ترتیبی دور کر کے آتی ہوں)۔ تو سوچ لے اج ہانڈی کی پکانی ہے۔'' حکیم بیگم صحن میں چلی گئی اور جھاڑو سے گرد سمیٹنے لگی۔

چند لمحے پرنیاں اسے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پچھلے کئی روز سے حکیم بیگم اس کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ ایک ماں، نرس اور خادمہ کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اکتائے بغیر، کچھ جتائے بغیر۔ سسٹر سوزین نے اسے مدد کی پیشکش کی تھی۔ مگر حکیم بیگم کے ہونے سے اسے بہت آرام تھا۔ کوئی اور شاید اس طریقے سے اس کا خیال نہ رکھ پاتا۔ کلائیوں کے زخم اب مندمل ہو چکے تھے۔ بائیں ہاتھ میں بے حسی تھی۔ تاہم وہ کسی حد تک اس سے کام لینے پر قادر ہو گئی تھی۔

وہ آہستگی سے بستر سے پاؤں اتارتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ہلکی سی نقاہت باقی تھی۔ مگر وہ قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ سست روی سے چلتی ہوئی وہ صحن میں آئی اور حکیم بیگم کے ہاتھ سے جھاڑو لے لی۔

''مجھے کرنے دیں۔ ہلنے جلنے سے ہی میرے بدن کی توانائی بحال ہو گی۔ آپ آرام کر لیں۔''

حکیم بیگم معترض نہیں ہوئی۔ ''ڈاکٹر دی کہتا تھا کہ ٹرن پھرن نال (چلنے پھرنے سے) تو چھیتی ٹھیک ہو جائے گی۔''

جھک کر جھاڑو دینے کی مشقت سے جلد ہی اس کا سانس پھول گیا۔ وہ رک رک کر ستاتے ہوئی صفائی کرتی رہی۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو حکیم بیگم باورچی خانے کے دروازے میں کرسی پر بیٹھی چاولوں سے کنکر چن رہی تھی۔

''اج یخنی والا پلاؤ بنا لیتی ہوں۔ کرارا (تیکھ) کر کے بناؤں گی۔ بے سوادے مٹھلو نے کھانے کھا کے تیرا منہ بھسا ہو گیا ہے (بے مزہ پھیکے کھانے کھا کر تیرے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے)'' اس کے متوجہ ہونے پر حکیم بیگم مسکرائی تھی۔

کیسی بے ریا مسکراہٹ تھی۔ اس میں کوئی بھید نہیں تھا۔ کوئی دکھاوا نہیں تھا۔ وہ کل صبح واپس جا رہی تھی۔ پرنیاں نے سوچا کہ اب وہ کہہ ڈالے جو مدتوں پہلے اسے کہہ دینا چاہیے تھا۔ وہ لفظ جو اس پر قرض تھے انہیں حکیم بیگم کے سپرد کرنے کا موقع شاید اس کے بعد کبھی نہ آتا۔ وہ کمرے سے ایک کرسی گھسیٹ کر باہر لائی اور حکیم بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔ گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر آنکھیں جماتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

''میں نے کبھی آپ سے شکریہ کا ایک لفظ نہیں کہا۔ حالانکہ میں لاکھ بار بھی شکریہ کہتی تو کم ہوتا۔ آپ نے اس وقت میرے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھولا جب مجھ پر سب در بند کر دیئے گئے تھے۔ آپ نے تب میری مدد کی جب کوئی دوسرا یہ کام کرنے پر تیار نہیں تھا۔ آپ نے میری خاطر اپنی برسوں کی کمائی ہوئی نیک نامی کو داؤ پر لگا دیا۔ آپ نے لوگوں کی ملامت سہی، اپنوں کی ناراضی برداشت کی اور ایک لمحے کے لیے بھی احسان نہیں جتایا۔ کوئی صلہ وصول نہیں کیا۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ آپ انسان ہیں تو میں آپ کو فرشتہ کہتی۔ میں خاک بن کر آپ کے پیروں میں بچھ جاؤں تو بھی آپ کی نیکی کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔ اگر عمر کی تربیت میں نے کی ہوتی تو کبھی اسے اتنا اچھا نہ بنا سکتی۔ آپ نے جیسی تربیت کی، میں کبھی ویسی نہ کر پاتی۔ اس نے اپنی ہر احسن عادت آپ سے لی ہے۔ وہ

اچھا انسان ہے، اچھا مسلمان ہے۔ جو بھی خوبی اس میں ہے، وہ آپ کی وجہ سے ہے۔ مجھے عمر کی ماں ہونے پر فخر ہے۔ وہ میرا بیٹا ہونے پر شرمسار ہے تو اس میں اس کی غلطی نہیں۔ میں نے اس کی زندگی مشکل بنانے میں کیا کسر چھوڑی؟ کون سا ایسا قصور ہے جو مجھ سے نہیں ہوا؟ مجھے اس پر حق جتاتے ہوئے کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ آپ کے لیے اس کا پیار دیکھ کر مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ وہ آپ سے علیحدہ ہو کر کتنا ناخوش تھا مگر میں ضد پر اڑی رہی۔ جب میں اسے آپ سے مانگنے گئی تو آپ کے ماتھے پر ایک شکن تک نہیں آئی۔ ایسا حوصلہ کہاں سے لیا ہے آپ نے؟ اپنا دل نکال کر خود اپنے ہاتھوں سے کون کسی کو دیتا ہے؟ مجھے کسی نے ایک چڑیا کا بچہ پالنے کے لیے دیا ہوتا اور دس دن بعد آ کر مجھ سے واپس مانگتا تو میں کبھی نہ دیتی۔ آپ نے اٹھارہ سال عمر کو پال پوس کر میرے ایک بار مانگنے پر اسے مجھے دے دیا۔ میرا مذہب مختلف ہے لوگ اس فرق کو لے کر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ آپ نے اپنے خلوص میں تعصب کا ایک تنکا تک شامل نہیں ہونے دیا۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم کسی saint سے ملی ہو تو میں بلا جھجک آپ کا نام لے دوں گی۔"

حکیم بیگم کو اب کنکر نہیں مل رہے تھے۔ اس کے ہاتھ محض چاولوں کو بکھیرنے اور سمیٹنے میں مصروف تھے۔ پرنیاں نے نظر اٹھائی تو ان دونوں کی آنکھیں ملیں۔ حکیم بیگم کی آنکھوں میں نمی تھی۔ گلوگیر آواز میں وہ بولی۔

"میری صفتاں کر کے میرے دل وچ تکبر نہ پیدا کر۔ میرے پلے کجھ وی نئیں۔ میرے اللہ دا کرم نہ ہوتے میں پیر پیر تے منہ بھار ڈھے جاواں۔ (تو میں قدم قدم پر منہ کے بل گروں)۔ سب اس دی رضا ہے۔ بندے دی ڈور اس دے ہتھ وچ ہے۔"

پرنیاں اپنے کمرے سے سنہری غلاف میں لپٹی ہوئی ایک ضخیم کتاب لے کر آئی اور احتیاط سے اسے حکیم بیگم کے حوالے کیا۔

"میں آپ کو کوئی تحفہ دینا چاہتی تھی۔ میں نے بہت غور کیا اور اس سے بہتر کوئی تحفہ میرے دماغ میں نہیں آ سکا۔ یہ قرآن میں نے آپ کے لیے منگوایا ہے۔"

حکیم بیگم نے قرآن کے غلاف کو بوسہ دے کر اسے سینے سے بھینچ لیا اور اٹھ کر پرنیاں کا ماتھا چوم لیا۔ "میں صدقے، میں واری تیری سیانف توں (تیری دانائی کے) اللہ تیری اس نیکی دا اجر دے گا۔ تیری ہر مشکل، ہر اوکھیائی دور ہوگی۔ عمر دے دور جان دا غم نہ کر۔ وہ آپ تیرے کول آئے گا۔ تیری دلجوئی کرے گا۔ تیرا درد ونڈائے گا (تیرا درد بانٹے گا)۔"

پرنیاں کے ہونٹوں پر بجھی ہوئی راکھ جیسی مسکراہٹ آ گئی۔ "شاید آ جائے، شاید نہ آئے۔ وہ بھی تو تقدیر کا مارا ہوا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح میرے ساتھ گزارہ کر رہا تھا۔ وہ ضرور رہ لیتا اگر تقدیر اسے رہنے دیتی۔ جانے اس نے آپ کو مجھ سے متنفر ہونے کی وجہ بتائی یا نہیں۔ اسے میرے سامان میں غیر اخلاقی تصاویر والا ایک رسالہ ملا تھا۔ وہ اسے میرے کردار کی پستی کا ثبوت سمجھا ہوگا۔ دراصل اس رسالے میں اس کے باپ کی تصویریں تھیں۔ میں نے کچھ دوسری یادگاروں کے ساتھ اسے بھی سنبھال رکھا تھا۔ جب عمر روٹھ کر جا رہا تھا تو میرا دل چاہا کہ میں وضاحت کر دوں، اپنی صفائی پیش کروں۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ اس کا باپ اس کی نظر میں ذلیل ہو جائے گا۔ ماں پر تو اسے کبھی فخر تھا ہی نہیں، باپ بھی نظر سے گر جاتا، تو اس کی تکلیف بڑھ جاتی۔ میرے بے عزت ہونے سے اس کی اذیت کم رہتی تھی تو میرا بے عزت ہونا ہی اچھا تھا۔

حکیم بیگم کی آنکھیں دھندلا گئیں۔



سڑک کے کنارے، جہاں تک نظر جاتی تھی، سنبل کے سیدھے تنوں والے اونچے پیڑ صف آرا تھے۔ چمک سے محروم دھوپ سفید چونے کی چھینٹوں کی مانند سیڑھی کے قدمچوں پر پھیلی تھی۔ سوکھے ہوئے پیلے پتوں کی ایک ڈھیری ہوا کی ٹھوکر سے بکھری

اور کئی پتے اڑ کر اس پر گرے۔ ہوا تھم تھم کر بہہ رہی تھی۔ جب بھی کوئی جھونکا آتا، اس پر کچھ پتے اور تنکے اچھال دیتا۔ وہ اپنے بالوں اور لباس میں اٹکنے والے ان پتوں کو جھاڑتی نہیں تھی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں تھا کہ اس کی چادر شانوں سے پھسل کر نیچے گر چکی تھی اور چادر کا پلو سیڑھیاں اترتے چڑھتے لوگوں کے پیروں تلے روندا جا رہا تھا۔

اسی عالم میں چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے اسے کئی گھنٹے بیت گئے تھے۔ سروس شروع ہونے سے بہت پہلے وہ آ کر وہاں بیٹھ گئی تھی۔ عبادت میں شریک ہونے کے لیے آنے والے لوگوں نے اسے دیکھا تھا، کسی نے ہمدردی سے، کسی نے لاتعلقی سے، کسی نے حیرت سے لیکن وہ سب گزر گئے تھے۔ اس کے پاس رکے بغیر، منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر۔ اب جب کہ سروس اختتام پذیر ہوگئی تھی اور لوگ گھروں کو لوٹنے لگے تھے تو بھی وہ اسی کھوئی ہوئی کیفیت میں اسی جگہ موجود تھی۔ وہ چرچ سے باہر آنے والوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ ان میں سے بعض چہرے آسودہ تھے، بعض غمگین اور بعض عبادت کی پاکیزگی سے دمکتے ہوئے۔ ان سب میں ایک خاصیت مشترک تھی۔ وہ سب خدا کی قربت سے سرفراز تھے۔ ان سب پر خدا کی مہر والی نگاہ تھی۔ ہر چہرے کو دیکھنے کے بعد اس کی یاسیت اور ملال میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ وہ ٹکٹکی باندھے ان عبادت گزاروں کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھتی رہی حتیٰ کہ سب چلے گئے۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں خالی رہ گئیں۔ ان کا لمس سرد تھا اور تواتر سے اس کے بدن میں اتر رہا تھا۔ دھوپ کے دھبے اب اس کے پیروں پر چڑھ رہے تھے۔ اس کا نچلا دھڑ بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا تھا۔ اچانک ایک ہاتھ کا دباؤ اسے اپنے شانے پر محسوس ہوا۔ اس نے گردن گھماتے ہوئے پہلو میں دیکھا تھا۔

سسٹر سوزین اس کے برابر زینے پر بیٹھ رہی تھی۔

''میں نے نو بجے کے قریب تمہیں یہاں دیکھا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ تم تب سے اسی جگہ بیٹھی ہوئی ہو اور عبادت میں شامل نہیں ہوئیں۔ کیا میرا شک درست ہے؟''

جھوٹ بولنے کی خواہش کے باوجود اس نے اقرار کر لیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''ایسا کیوں پرنیاں! تم کیوں اس طرح راستے میں بیٹھی ہوئی ہو؟'' سسٹر سوزین پریشان ہوگئی۔

''یہ کوئی عام راستہ تو نہیں ہے۔ کیا مجھے چرچ کی سیڑھیوں میں بیٹھنے کا بھی حق نہیں ہے؟''

''وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ سیڑھیوں میں کیوں اندر کیوں نہیں جاتیں تم؟''

سسٹر سوزین اس کے بالوں میں الجھے ہوئے پتے چننے لگی۔

''مجھے اندر جانے کا اذن نہیں۔ دہلیز پر بیٹھ جاؤں، غنیمت ہے۔'' اس نے سنبل کے پیڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے اندر جو چھپائے پھرتی ہو، اسے ظاہر کرو۔ بوجھ اتار دو۔ تم تھک چکی ہو۔''

وہ درختوں کے تنوں کو گھورتی رہی۔

''میں نے اپنی مرضی سے خدا کو چھوڑا تھا۔ اب وہ مجھے چھوڑ دے تو مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔''

سسٹر سوزین نے اس کی چادر اٹھا کر جھاڑی اور اسے اوڑھاتے ہوئے بولی۔ ''خدا ایسا نہیں کرتا۔ ایسا تو دنیا کرتی ہے۔ دھوپ کو دیکھو، وہ ہر شے پر اتر رہی ہے۔ بلا تخصیص سب کو نواز رہی ہے۔ کسی کو حرارت اور روشنی سے محروم نہیں کر رہی۔''

پرنیاں کی بے تاثر نظریں ہوا میں معلق تھیں۔ ''دھوپ پیڑ پر اترتی ہے تو وہ پھول اور پھل دیتا ہے اور کسی پتھر پر سو برس دھوپ پڑتی رہے، وہ کیا دے گا۔ بے فیض، ناشکرا، پڑا رہے گا جوں کا توں۔ اس میں دھوپ کی کیا غلطی ہے۔ یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔''

سسٹر سوزین کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ چند ثانیے خاموش رہ کر وہ دھیمے پن سے بولی۔ ''ہم دنیا کو تھامے رکھنے کی خاطر

ہلکان ہو جاتے ہیں۔ دنیا چلی نہ جائے، دنیا چھوٹ نہ جائے، اس ڈر سے اتنی زور سے مٹھیاں دباتے ہیں کہ ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں، کلائیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اگر ہم مٹھیاں کھول کر دنیا کو جانے دیں تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹے گی۔ صرف ہماری تکلیف کم ہو جائے گی۔ ہمیں اس بے گار سے نجات مل جائے گی۔ میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ تمہیں اس بارے میں سوچنے کو کہا ہے۔ آج پھر کہہ رہی ہوں۔ سنجیدگی سے غور کرو۔ دنیا کو چھوڑ دو۔ خداوند کی مہربان پناہ میں آ جاؤ۔''

پریناں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ سسٹر سوزین اسے تشویش سے پُرنظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''دنیا تو وہ چھوڑے جس کے پاس دنیا ہو۔ میں تو خالی ہاتھ ہوں۔ خدا اور دنیا دونوں طرف سے کوری ہوں۔ آپ ایک مفلس سے دولت لٹانے کو کہہ رہی ہیں؟'' وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

''پریناں! تمہاری حالت پر میرا دل کڑھتا ہے۔ تمہارے رنج کی کوئی حد ہی نہیں۔ تم کیوں خود کو برباد کر رہی ہو؟ اگر دنیا نے تمہاری قدر نہیں کی تو خدا کے پاس آ جاؤ۔ تمہیں دروازہ کھلا ملے گا۔ کتنی ہی nuns کو میں جانتی ہوں جو ہر رشتے سے مایوس ہو کر سکون ڈھونڈتی ہوئی آئیں اور آج وہ چین سے ہیں۔ ان کا اضطراب دور ہو چکا ہے۔ کیونکہ خدا نے اپنا مسیحا ہاتھ ان کے غمگین دلوں پر رکھ دیا ہے۔''

پریناں کی ہنسی تھم گئی۔ اس نے سنگ مرمر کے قدمچے کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے ایک نظر سسٹر سوزین کو دیکھا۔

''ہم تب خدا سے رجوع کرتے ہیں، جب دنیا ہمیں رد کر چکی ہوتی ہے۔ تمام دروازوں سے دھتکارے جانے کے بعد ہم خدا کے در پر دستک دیتے ہیں۔ خدا ہمیشہ ہمارا سیکنڈ آپشن کیوں ہوتا ہے؟ ہماری اولین ترجیح ہمیشہ دنیا ہوتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ ہم اس پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ترتیب کے ردوبدل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتنی بڑی بھول ہے۔ ترتیب ہی تو اصل شے ہے۔ کون پہلے آتا ہے کون بعد میں، کھیل کا یہ بنیادی اصول ہی نظر انداز کر دیا تو باقی کیا رہ جاتا ہے، صرف بھگدڑ اور بدحواسی۔''

وہ اٹھ کر سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔

سسٹر سوزین چپ چاپ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

✠ ✠ ✠

ٹیلی فون کے ریسیور سے پھوٹتی آواز نے اسے پتھر کا بنا دیا تھا۔ کیا کسی آواز میں اتنی طاقت ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے بدن سے روح کھینچ لے۔ کم از کم اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔

''پریناں! بولو۔ اب بول پڑو۔ اور کتنا انتظار کرواؤ گی؟ تم نے کبھی تو پلٹ کر دیکھا ہوتا، ایک بار تو میرا حال پوچھا ہوتا۔'' وینس رونے لگی تھی۔

وہ اس کی ذہنی اختراع نہیں تھی۔ وہ حقیقت میں وینس کی آواز تھی۔ اس میں بڑھاپے کا ضعف آ گیا تھا پھر بھی اسے شناخت کرنے میں پریناں کو مغالطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بے جان ہاتھ میں ریسیور تھامے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کے اندر سینکڑوں آوازیں شور مچا رہی تھیں۔ لیکن انہیں لفظوں میں کیسے ڈھالنا تھا۔ پریناں کو یہ ہنر بھول گیا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے گونگی ہو۔ پھر وہ آوازیں اس کی آنکھوں کے راستے باہر آنے لگیں۔ پہلا آنسو گرتے ہی اس پر چھایا ہوا جمود ٹوٹ گیا۔ اس کا وجود کسی زلزلے کی زد میں آ گیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''امی! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں آپ کو دکھ دے سکتی ہوں کیا؟...... آپ تو جانتی ہیں مجھے۔ میں ایسی ہوں

بھلا؟''

اس کا دل پگھل کر آنکھوں سے رسنے لگا تھا۔

''تم مجھ سے اتنی دور چلی گئیں۔ اتنا دور تو آ ئزک بھی نہیں گیا۔ میں اس کی قبر پر تو جا سکتی ہوں، وہاں رو سکتی ہوں، تم نے تو کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا۔ پرنیاں! تم نے مجھے اندھا کر دیا۔''

''میں نے ابو کو نہیں مارا۔ ان میں تو میری جان تھی۔ میں انہیں کیسے مار سکتی ہوں۔ آپ بتائیں امی! کیا میں انہیں مار سکتی ہوں؟''

وہ بے خودی میں ریسیور کے ساتھ یوں گال رگڑ رہی تھی جیسے اس کا چہرہ ونیس کے چہرے سے مس ہو رہا ہو۔

''میں نے غصے میں کہہ دیا اور تم نے پلو میں گرہ دے لی۔ میری یہ ہی ایک بات یاد رہ گئی تمہیں؟ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ 'پرنیاں! تم خداوند کا تحفہ ہو، میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری ہنسی اور تمہارے آنسوؤں کے سوا دنیا میں کسی شے کی حقیقت نہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ تم میری آنکھوں کا نور ہو۔ ان میں سے کوئی بھی بات تمہیں یاد نہیں رہ گئی؟ تم مجھ سے کیوں چھپ گئیں؟ کیوں اوجھل ہو گئیں؟''

ونیس کا سانس چڑھا ہوا تھا جیسے وہ دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو۔

''میں آپ کو اپنی شکل کیسے دکھاتی؟ کیسے آپ کا سامنا کرتی؟ مجھ سے اتنی بڑی خطا ہو گئی، میں کیا کرتی امی!''

''وہ خطا تو میں نے معاف کی لیکن یہ غلطی میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھ پر اتنا بڑا ظلم کیا۔ رات کے اندھیرے میں چھپ کر گھر سے چلی گئیں اور پھر کبھی میری خبر نہیں لی۔ میں نے آخری بار تمہیں دیکھا تو تم بیس سال کی تھیں۔ آج اکتالیس سال کی ہو۔ تم نے کبھی سوچا کہ درمیان والے اکیس سال میں نے کیسے گزارے ہوں گے۔ تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تاکہ میں رو رو کر ختم ہو جاؤں۔ اگر میں تمہیں تلاش نہ کر لیتی تو تم کبھی میرے پاس نہ آتیں۔ یہی نیت تھی نا تمہاری؟''

''نہیں امی میں آپ سے دور رہ کر کتنی تکلیف میں رہی، کیسے سمجھاؤں۔ مجھ پر جو گزر گئی میں بیان نہیں کر سکتی۔ نہیں امی میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی تھی لیکن ہو گیا...... سب غلط ہو گیا۔''

وہ اور بھی شدت سے رونے لگی تھی۔ ونیس کی ہچکیوں کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

پھر ریسیور کسی اور کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

''کیسی ہو پرنیاں؟ میں داؤد بات کر رہا ہوں۔''

وہ نہ بھی بتاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کون تھا۔

''میں کیسی ہو سکتی ہوں؟''

''پوچھو گی نہیں کہ ہم تم تک کیسے پہنچے۔''

بھیگی آواز میں کیے گئے اس سوال پر اسے خیال آیا کہ یہ بات اب تک اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ مگر یہ بھی تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔

''تم خود ہی بتا دو۔'' اس نے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ عمر کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔''

اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ داؤد عمر کو کیسے جانتا تھا۔

''ایک خط جو تم نے لکھ کر پوسٹ نہیں کیا، وہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔'' داؤد اسے تفصیل بتانے لگا۔

اس نے عمر سے کبھی یہ امید نہیں کی تھی کہ وہ اس کی خاطر اتنا تردد کرے گا۔ اس نے الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر کھینچا تھا۔ اور الجھنیں سلجھ گئی تھیں۔ اس کے دل نے عمر کا احسان تسلیم کیا۔ وہ اپنی ماں سے بہتر تھا، وہ اپنی ذات سے آگے دیکھنے کی ہمت رکھتا تھا۔

وہ دیر تک ونیس اور داؤد سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اکیس سال کی کہانی ایک فون کال میں بیان کرنا چاہتے تھے۔ داؤد کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ چچا اور چاچی دونوں اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ گونی کے سر کے تمام بال سفید ہو گئے تھے۔ ونیس نے اسے گونی کی بے معنی آوازیں بھی سنوائیں۔ پھر داؤد بولا۔

''جب ہم دونوں کی شادی طے کی جا رہی تھی۔ تب تم نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور میں نے جواب میں جو کیا...... سچ مانو تو اس میں میرا اتنا بھی قصور نہیں تھا۔ میں ایک رومان پسند، جوشیلا نوجوان ہی تو تھا۔ لیکن میں آج بھی اپنے رویے پر نادم ہوں۔ میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو سال ہاتھ سے پھسل گئے، انہیں تو میں واپس نہیں لا سکتا البتہ میں کچھ ایسا کر سکتا ہوں کہ تمہارے دل پر بنے ہوئے سوالیہ نشان مٹ جائیں۔ میں تمہیں ایڈم گرانٹ سے ملواؤں گا۔''

ان کے بیچ خاموشی کا ایک طویل وقفہ حائل ہو گیا۔ دوسرے سرے پر داؤد کو اس کے تنفس کی مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔ وہ نام سن کر اس کا گم صم ہو جانا کچھ ایسا خلاف توقع بھی نہیں تھا۔ بالآخر پرنیاں کے حلق سے پھنسی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

''میں اس سے مل کر کیا کروں گی؟ کوئی اور بات کرو داؤد!''

''وہ بیمار ہے، سچ تو یہ ہے کہ وہ مر رہا ہے۔ تمہیں ایک آخری بار اس سے ضرور ملنا چاہیے۔''

''روزانہ لاکھوں لوگ مرتے ہیں۔ یہی قانون قدرت ہے۔ کسی کے مر جانے سے کیا ہوتا ہے۔ زمین پھٹتی ہے، نہ آسمان گرتا ہے۔ وہ مر رہا ہے تو مر جانے دو۔''

''اس کی حالت افسوس ناک ہے۔''

''مجھ سے زیادہ افسوس ناک نہیں ہو گی۔''

''اسے ایڈز ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں، وہ کس اذیت سے دوچار ہے۔''

''داؤد تم......'' وہ اٹک گئی۔ ''پہلی بار کسی ایڈز پیشنٹ سے واسطہ پڑا ہے، کیا سارے ڈاکٹر تمہاری طرح جذباتی ہوتے ہیں؟ خیر جانے دو۔ تمہاری زندگی میں کیا چل رہا ہے؟''

''پرنیاں! میں تمہیں امریکہ بلوا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ پیپرز مجھے میل کرنا ہوں گے۔ میں آج سے ہی بھاگ دوڑ شروع کرتا ہوں۔ بس میری دعا ہے کہ گرانٹ کے مرنے سے پہلے تم یہاں آ جاؤ۔''

وہ ساری رات جاگتی رہی اور اٹھ اٹھ کر آسمان پر سپیدی کے آثار ڈھونڈتی رہی۔ مٹیالے سرمئی پروں والے کبوتر جیسا آسمان تاریکی کا ایک ایک دانہ چگتا تھا۔ سیاہ دانوں کا انبار لگا تھا اور کبوتر کی چونچ میں ایک ہی دانہ سماتا تھا۔ اس انبار کا حجم گھٹنے میں ہی نہ آتا تھا۔

صبح کے انتظار سے عاجز آتے ہوئے وہ صحن میں ٹہلنے لگی۔ ''میں جاؤں گی۔'' وہ بڑبڑائی ''مجھے جانا ہی چاہیے۔ ایک بار تو اسے ویسے ہی ٹھوکر ماروں، جیسے اس نے مجھے ماری تھی، ایک بار تو اسے اپنے مقابل بے بس دیکھوں۔ ایک بار تو اس کی لاچاری پر قہقہہ لگا کر ہنسوں۔ اس کا ویسا ہی تماشا بناؤں جیسا اس نے مجھے دنیا کے سامنے بنایا تھا۔ اسے ایڑیاں رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھنا کیسا تجربہ ہو گا؟ اسے آخری چوٹ میرے ہاتھوں ہی لگنی چاہیے۔ کہیں اس سے پہلے وہ مر نہ جائے۔ میں نے اسے ہر روپ میں دیکھا ہے۔ لیکن کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ کسی فلم میں بھی نہیں۔ اسے روتے ہوئے دیکھنا کتنا ضروری ہے۔ میں نے اس بارے

میں کبھی سوچا کیوں نہیں؟''

وہ چلتے چلتے تھک کر بالائی منزل کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

✠ ✠ ✠

اس نے جونہی کمرے میں قدم رکھا، گرانٹ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جھلملاہٹ تھی۔

''آؤ۔ جلدی آؤ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ تم دوبارہ نہ آئے تو کیا ہوگا۔''

اس کا یا پلٹ نے عمر کو حیران کر دیا۔ ''آپ ٹھیک ہیں؟ کل آپ کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔'' اس نے بیڈ کے قریب رکھے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے محتاط انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں ساری رات تمہارا نام پکارتا رہا۔ مجھے چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس لیے میں بار بار تمہارا نام لیتا رہا تاکہ مجھے بھولے نہیں۔ بڑا ہی خوبصورت نام ہے تمہارا۔ یہ اس نے رکھا ہے؟''

اس کی مراد یقیناً پرنیاں سے تھی۔

عمر خاموشی سے اس کی بدلی ہوئی کیفیت پر غور کرتا رہا۔

''اس نے تمہیں مجھ سے ملنے کو کہا ہے؟ کیا تم اسے ہماری ملاقات کے بارے میں بتا چکے ہو؟'' اس کا لہجہ امید اور اندیشے کا ملغوبہ تھا۔

جواب دینے سے قبل عمر چند لمحے سوچتا رہا۔ ''نہیں۔ میں نے انہیں نہیں بتایا۔ آپ کہیں گے تو میں......''

''نہیں۔'' اس نے جملہ قطع کیا۔ ''اچھا ہے، اچھا ہے۔ اس کا لاعلم رہنا ہی اچھا ہے۔ اس کی نفرت سہنے کی طاقت نہیں ہے مجھ میں۔''

اس کے تاثرات الفاظ کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ اس کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ ''اچھا تو تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟'' اس کا سوال اجنبیت والا اور انداز اپنائیت بھرا تھا۔

کچھ دیر عمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ''میں آپ کی کہانی سننے آیا ہوں۔ آپ کی زندگی کہاں سے شروع ہوئی میساچوسٹس میں آپ کا بچپن کیسا گزرا؟ آپ کے ماں باپ کون تھے؟ جو بھی آپ سنانا چاہیں۔''

اس کی بات نے گرانٹ پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ ''ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ اس سے پہلے کیا تم مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو گے۔''

عمر نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا۔ ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اس نے گلاس لوٹا دیا اور بولا۔

''میرا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ مجھے اس کی شکل یاد نہیں آ رہی۔ کاش میرے پاس اس کی کوئی تصویر ہوتی تو میں تمہیں دکھا سکتا۔ اس کا نام ابراہیم تھا۔ اس نے میرا نام احمد ابراہیم رکھا تھا۔ کتنا اچھا نام ہے؟''

اس نے عمر سے تائید چاہی۔

''پتہ نہیں کیوں میں نے اسے بدل کر نیا نام اپنا لیا۔ میرا موجودہ نام یعنی ایڈم گرانٹ یہ میں نے کسی مشہور فلمی اداکار سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ اس اداکار کا نام کیا تھا۔ بہرحال اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے نام میں گرانٹ آتا تھا...... ہاں تو میں تمہیں اپنے باپ کے متعلق بتا رہا تھا۔ اس کی موت بہت ہی اذیت ناک طریقے سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ مرا کیسے تھا؟ مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا؟'' وہ جھنجھلا کر ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا۔

''مونا اسٹوکر ایک نن تھی۔ وہ مجھے پسند کرتی تھی۔ حالانکہ میں اس سے چھوٹا تھا۔ میری عمر پندرہ سال کے قریب تھی۔ لیکن

ٹھہرو......میں نے درست نہیں بتایا۔ وہ نن نہیں تھی البتہ اسے نن بننے کی تمنا تھا۔ مجھے اختلاف تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا کہ وہ راہبانیت اختیار کرے، پھر میں نے اس کا رستہ روک دیا۔ اسے خدا سے دور کر دیا۔ مگر میں نے ہمیشہ خدا کے قریب ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی ناراضی سے بچنا چاہا ہے۔ میں جب جوائنٹ (جیل) میں تھا تو ساری نمازیں باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ دعا مانگا کرتا تھا۔ وہاں یہ سب کرنا آسان نہیں تھا۔ کچھ قیدی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ مجھے مذہبی جنونی کہا کرتے تھے۔ میں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ خدا پھر بھی مجھ سے راضی نہیں ہوا۔"

وہ ناخن چباتے ہوئے دیوار کو گھورنے لگا۔

اس کے خیالات غیر مربوط تھے۔ وہ کہیں کا ٹکڑا اٹھا کر کہیں جوڑ دیتا تھا۔ اس کی الجھی ہوئی سوچوں سے جو نقش تشکیل پا رہے تھے، وہ بے ڈھب اور مہمل تھے۔

عمر نے اسے ٹوکا نہیں۔ وہ چہرے پر اشتیاق اور آنکھوں میں تجسس بھرے اس کی لایعنی باتیں سنتا رہا اور اس دوران اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا۔ جیسے اس کی گردن تلے تکیے کی سلوٹوں کو نکالنا، اسے سوپ پلانا اور بستر پر اس کے سوجے ہوئے پیروں کی جگہ تبدیل کرنا۔

جب اس نے جانے کی اجازت طلب کی تو گرانٹ پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو؟"

عمر نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔ کیا وہ اتنی جلدی بھول گیا تھا؟

"ڈاکٹر داؤد نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں کون ہوں۔"

"ہاں اس نے بے شک بتایا تھا مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

جواب دیتے ہوئے عمر کی آواز بکھری تھی۔ "میں آپ کا...... بیٹا ہوں۔"

"شکریہ شکریہ۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ بات کتنی خوش کن ہے۔" اس نے یوں تشکر کا اظہار کیا جیسے عمر نے اس پر کوئی عظیم احسان کیا ہو۔

"کیا میں تمہیں بیٹا کہہ سکتا ہوں؟"

"اگر آپ چاہیں تو...... میں اعتراض نہیں کروں گا" عمر نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

گرانٹ نے اطمینان بھری سانس لی۔ "کل کتنے بجے آؤ گے؟"

"میں کوشش کروں گا......"

"نہیں ایسا مت کہو۔ میں نے تو ابھی سے تمہارا انتظار شروع کر دیا ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔"

اگلی شام اسے ایک اسائنمنٹ تیار کرنا تھی جس کی وجہ سے وہ ہاسپٹل نہیں جا سکا۔ مزید دو دن پڑھائی کی مصروفیت نے اسے سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ وہ چاہ کر بھی گرانٹ سے ملنے کا وقت نہ نکال پایا۔ چوتھے دن جب وہ ہاسپٹل پہنچا تو اسے گرانٹ کا قہر جھیلنا پڑا۔

"تم اب بھی کیوں آئے ہو؟ میرے مرنے تک رک کیوں نہیں گئے؟ تم مجھ سے اپنی ماں کا بدلہ لے رہے ہو۔ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ میری بے بسی سے تم حظ اٹھاتے ہو۔"

وہ چیخ چیخ کر ادھ موا ہو گیا تھا۔

اس دن کے بعد عمر بلا ناغہ ہاسپٹل آنے لگا۔ اسے جتنا بھی فارغ وقت میسر ہوتا، وہ گرانٹ کے کمرے میں گزار دیتا۔ عموماً اس کی آمد گرانٹ پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی تھی تاہم کبھی کبھار وہ اسے پہچاننے سے منکر ہو جاتا۔

''داؤد فرڈیننڈ! یہ اسپتال ہے۔ کوئی عوامی تفریح گاہ نہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے، منہ اٹھا کر دوڑا چلا آتا ہے۔ تم میرے کمرے میں اجنبیوں کو کیوں آنے دیتے ہو؟ یہ لڑکا کیوں آیا ہے؟ اسے جلدی بھگاؤ۔ میرے کمرے سے باہر نکال دو۔''

وہ ہنگامہ مچا دیتا۔ عمر بددل ہو کر لوٹ جاتا اور خود کو سمجھا بجھا کر اگلی شام پھر آ جاتا۔

ایک رات وہ گرانٹ کے کمرے سے متصل باتھ روم میں واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا کہ ادھ کھلے دروازے سے کسی لڑکی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ایک نامانوس آواز تھی۔ وہ اسپتال کے عملے کے ان افراد میں سے کسی کی آواز نہیں تھی جن سے اب عمر بخوبی واقف ہو چکا تھا اور اس کے کانوں میں اترنے والے الفاظ نے شبہے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ وہ اسٹاف میں سے نہیں تھی۔

''تم ابھی تک زندہ ہو گرانٹ! یہ جان کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہے۔ تم بھی اتنے ہی خوش ہو گے جب میں تمہیں اپنے آنے کا مقصد بتاؤں گی۔ ویسے ڈاکٹر نے مجھے یقین دہانی کروادی ہے کہ تمہارے کان بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ تمہاری سننے کی صلاحیت ہی میرے لیے سب سے اہم ہے۔ لیکن اگر تم آنکھیں کھول کر مجھے دیکھو تو اس ملاقات کا لطف دوگنا ہو جائے گا۔ کیا تم نے ابھی تک یہ ہی نہیں سیکھا کہ آنکھیں بند کرنے سے سنائی دینا بند نہیں ہوتا۔''

وہ کیا کہہ رہی تھی اور اس انداز میں گرانٹ سے کیوں مخاطب تھی؟ عمر نے نل بند کیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

''جس جہنم سے تم ساری زندگی مجھے ڈراتے رہے، اب خود وہاں جا رہے ہو تو کیسا لگ رہا ہے؟'' وہ رک گیا۔ آنے والی یقیناً گرانٹ کو تنہا خیال کر کے اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔ وہ شش و پنج میں گرفتار دروازے کی اوٹ میں ٹھہر گیا۔

''تم اس بات سے خوف کھاتے رہے کہ کہیں میں prostitute نہ بن جاؤں۔ میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں۔ تمہاری پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ہو گئی ہے۔ میرے گندے خون نے مجھے کچھ اور بننے ہی نہیں دیا۔ آج میں hooker کے طور پر اپنے کیریئر کی ابتدا کرنے جا رہی ہوں۔ اور آئندہ تمام زندگی میں اسی پیشے سے وابستہ رہنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہوں۔ آج پہلا دن ہے تو میں نے سوچا تم سے بڑھ کر اس خوش خبری پر کس کا حق ہے۔''

عمر نے کمرے میں جانے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ جس نوع کی باتیں کر رہی تھی۔ اگر اسے علم ہو جاتا کہ گرانٹ کے سوا کوئی اور بھی اس کا سامع تھا تو اس کی خجالت کی کوئی حد نہ ہوتی۔ عمر سامنے آ کر اسے شرمسار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی گفتگو نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''میں ایک جز وقتی ملازمت بھی کر رہی ہوں۔ اسی پزا پارلر میں جہاں تم نے مجھے کام کرنے سے منع کیا تھا۔ تمہیں وہاں کا ناپاک ماحول پسند نہیں تھا۔ میں نے پہلے ہی ہفتے اپنی شفٹ کی تمام ویٹرسز سے زیادہ ٹپ اکٹھی کی، پتا ہے کیوں؟ دراصل میں مرد گاہکوں کو بے تکلف ہونے سے کبھی نہیں روکتی۔ میرا ذرا سا التفات ان کی جیبوں کو مجھ پر کشادہ کر دیتا ہے۔ تصور کرو جب میں کھل کر میدان میں اتروں گی تو کیسا طوفان اٹھاؤں گی۔ میری کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔''

گرانٹ اب تک کچھ نہ بولا تھا۔ شاید صدمے نے اس کے ہونٹوں پر قفل لگا دیئے تھے۔ عمر کو کسی حد تک اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کون تھی۔ اس نے ایک قدم آگے آتے ہوئے احتیاط سے کمرے میں جھانکا۔

وہ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ اس نے سرخ اور سفید لباس پہنا ہوا تھا اور اسی مناسبت سے گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ وہ گرانٹ پر نظریں مرتکز کیے زہر اگل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ وہ بے حد پرکشش تھی۔ اس کے حسین ہونے کے بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن یہ عمر کے ششدر ہونے کا باعث نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ اگر وہ خود اسے بولتے ہوئے نہ سن لیتا تو کبھی اعتبار نہ کرتا کہ وہ الفاظ اس کی زبان سے برآمد ہوئے تھے۔ وہ گویا لکھے

ہوئے مکالمے کسی اناڑی اداکارہ کی طرح غلط تاثرات کے ساتھ ادا کر رہی تھی۔ وہ اتنا ہی حیران ہوا جتنا کوئی خرگوش کو غراتے دیکھ کر ہو سکتا ہے، پلکیں جھپکائے بنا وہ اس عجیب امتزاج کو دیکھتا رہا۔

''کچھ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے میں نے اب تک خود کو روکے رکھا۔ میری واہیات ماں اپنا اپارٹمنٹ تمہارے نام لگا گئی۔ تم نے اس چیز کو میری کمزوری بنائے رکھا۔ میں تمہاری منشا کے خلاف چلتی تو تم مجھے بے دخل کر دیتے۔ اب یہ خطرہ ٹل چکا ہے۔ میں نے تمہارے اٹارنی سے مل کر اطمینان کر لیا ہے۔ وہ بھی تو مرد ہے، میری مسکراہٹ کا جواب بے رخی سے دینا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ تمہاری وصیت کے مطابق تمہاری موت کے بعد، جو جلد ہی متوقع ہے، وہ اپارٹمنٹ مجھے مل جائے گا اور بالفرض محال اگر مرنے سے قبل تمہیں موقع مل جاتا ہے اور تم وصیت میں تبدیلی کر دیتے ہو تو تمہاری موجودہ دماغی حالت کو کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ میری طنابیں تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہیں۔ مجھے جانے کی اس قدر جلدی نہ ہوتی تو میں دیر تک تمہاری تکلیف کا تماشا دیکھتی۔ تم بتاؤ گے نہیں کہ تم کیا محسوس کر رہے ہو۔''

گرانٹ کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔

''میں وہ سب کرنے جا رہی ہوں۔ جس سے مجھے روکتے روکتے تم پاگل پن کی سرحد پر آ پہنچے ہو۔''

عمر کو وہ لڑکی پاگل لگ رہی تھی۔ اگر وہ حقیقتاً یہ سب کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو اس کے پاگل ہونے میں کیا شک تھا۔

''میں سڑکوں پر آوارہ گھوموں گی، مردوں کو دعوت دوں گی۔ گناہ میرا اوڑھنا بچھونا ہو گا۔ میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتی۔ تمہیں تخیل سے کام لینا زیادہ اچھا لگے گا۔''

وہ جانے کے لیے مڑی، پھر دروازے کے پاس ٹھہر گئی۔ ''مجھے تم سے گلہ ہے گرانٹ! تمہیں اتنا تو بتانا چاہیے کہ آج مجھے کون روکے گا۔ تم یا تمہارا خدا۔ خیر یہ معاملہ تم خدا کے ساتھ طے کر لو۔''

عمر کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔

اس لڑکی کے باہر نکلتے ہی وہ عجلت زدہ قدموں سے گرانٹ کے سرہانے پہنچا اور اسے پکارنے لگا تھا کہ آواز حلق میں دبا لی۔

وہ سو رہا تھا!

صوفیہ مارسیلو بچپن سے اس کی مصاحبت میں رہی تھی۔ کیا وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ نیند میں اکثر گرانٹ کی آنکھیں نیم وا رہتی تھیں۔

اسے یقین تھا کہ وہ صوفیہ مارسیلو ہی تھی۔ داؤد اور گرانٹ کی زبانی وہ اس کے متعلق اتنا کچھ سن چکا تھا کہ اسے پہچان لینا دو جمع دو چار کرنے سے بڑھ کر سہل تھا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک نظر گرانٹ کے خوابیدہ چہرے کو دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

کاریڈور سنسان پڑا تھا۔ صوفیہ اسپتال سے نکل چکی ہو گی۔ اس نے اندازہ لگایا۔ وہ ایڈمن بلاک کی طرف رخ کر کے تیزی سے چلنے لگا۔ کاریڈور کے موڑ تک پہنچتے پر وہ تقریباً بھاگنے لگا تھا۔

صوفیہ جھکی ہوئی گردن اور بوجھل قدموں کے ساتھ اسپتال کے سنٹرل گارڈن میں سے گزر رہی تھی۔ پتھریلی روش کی حدوں پر لگے درختوں کے پھیلے ہوئے تاریک سایے لیمپ پوسٹوں کی سفید روشنی سے یوں لپٹے تھے جیسے میدے کی روٹی کو سیاہ گبریلوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔ اس پر بیزاری کا شدید غلبہ تھا۔ وہ بے خیالی میں بار بار مٹھیاں کھولتی اور پھر انہیں بند کر لیتی تھی اور کبھی کانوں کے آویزوں کو انگلیوں سے کھینچنے لگتی تھی۔ وہ کیا کر کے آ رہی تھی؟ کیا بے مزہ اور پھیکے لحات تھے جو وہ گرانٹ کے کمرے میں گزار کر آ رہی تھی۔ جیسے کوئی سنگترے کی بے رس پھانک منہ میں لیے تادیر اسے پپولتا رہے۔ کیا یہی وہ وقت تھا جس کی آمد کی وہ ایک مدت سے منتظر تھی۔ کیا ملا تھا اسے گرانٹ پر گرج برس کر؟ وہ تو ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ کیا کیا سوچ رکھا تھا اس نے کہ گرانٹ ایسے بھڑکے گا، ویسے جلے گا لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ وہ جیسے کسی لاش کو ٹھوکریں رسید کر کے آ رہی تھی۔ ایک ٹھنڈی اینٹھی ہوئی، فرسودہ لاش......

وہ آخری لیمپ پوسٹ اور آخری درخت کو پار کر کے بڑے محرابی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

سڑک پر روشنیوں اور آوازوں کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس بپھرے ہوئے دریا کی طغیانی نے لحظہ بھر کے لیے اسے ہراساں کر دیا تھا۔



لفٹ کے ذریعے وہ گراؤنڈ فلور پر آیا اور انٹرنس بلاک کی سمت دوڑ پڑا۔ نظر کی زد میں آنے والے ہر چہرے کو وہ کھوجتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسپتال کے سنٹرل گارڈن کو بھی اس نے اسی رفتار سے پار کیا۔ وہ پارکنگ لاٹ کے رخ بڑھ رہا تھا کہ مخالف سمت میں سڑک کے کنارے رکے ہوئے فائر انجن کے عقب سے صوفیہ ظاہر ہوئی وہ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گاڑی پر نہیں آئی تھی۔ اگر اس کے پاس گاڑی ہوتی تو وہ یقیناً پارکنگ کا رخ کرتی۔ عمر نے بے صبری سے سڑک پار کرنے کے موقع کا انتظار کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ صوفیہ کے قدموں کی دھیمی رفتار غماز تھی کہ اسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ گرد و پیش سے لاتعلق سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے چلتے چلتے اچانک عمر رک گیا۔ ایک سوال نے اس کے متحرک پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ کیا سوچ کر وہ اس کے پیچھے دوڑا چلا آیا تھا۔ آخر اس کی نیت کیا تھی؟ وہ صوفیہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ دور جا رہی تھی، عمر کے دل کی دھڑکن بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ سڑک پر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کا شور اس کے کانوں میں گھس رہا تھا۔ فٹ پاتھ کے بیچ وہ کسی مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

صوفیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ غالباً اس کے بالوں میں اٹکی ہوئی کنگھی پھسل گئی تھی اور وہ رک کر اسے درست کر رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بالوں کو سنوارنے میں مگن تھے اور اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں اس کا چہرہ پوری وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ دوبارہ اس کی صورت دیکھنے پر عمر کو ویسی ہی حیرت ہوئی جیسی پہلی نظر میں ہوئی تھی۔ اس نے طوائفوں کے بارے میں سن رکھا تھا، پڑھ

رکھا تھا مگر اس نے کبھی کوئی طوائف دیکھی نہیں تھی۔

''کیا طوائف ایسی ہو سکتی ہے؟'' صوفیہ کے چہرے کو یک ٹک گھورتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے تخیل میں روایتی طوائف کا جو خاکہ تھا، صوفیہ کسی بھی زاویے سے اس سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔

وہ پھر سے چل پڑی...... وہ دور جا رہی تھی۔ جب فاصلہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس کے کانوں میں ہلتے ہوئے سفید آویزے نظر آنا بند ہو گئے تو عمر مڑ کر اسپتال کی طرف چلنے لگا۔ اس کا دل نہایت غمگین تھا۔ وہ اپنے دکھ کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ بس ایسا لگ رہا تھا کہ سینے میں بائیں جانب بھیگی ہوئی روئی کا گولا رکھا تھا جو قطرہ قطرہ رس رہا تھا۔ اس وقت خدا جانے کیوں اسے بچپن کا ایک عظیم دکھ یاد آنے لگا۔ بچپن کے سب ہی دکھ عظیم ہوتے ہیں۔ کسی پسندیدہ کھلونے کا ٹوٹ جانا، ممنوعہ اوقات میں کھیل کود کی اجازت نہ ملنا یا کوئی بدذائقہ دوا پینے پر مجبور کیا جانا اتنا بڑا المیہ محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات کے دکھ اس کے مقابل ہیچ لگتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دکھ اس کی یادداشت سے ابھر رہا تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ حکیم بیگم چھپر کے نیچے چاک پر برتن بنا رہی تھی۔ بے ہنر ہونے کے سبب وہ عموماً کوئی نفیس شے تخلیق نہیں کر پاتی تھی۔ اس کے تراشے ہوئے ظروف میں بھدا پن خصوصیت سے نمایاں ہوتا تھا۔ البتہ اس روز معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ پسینے میں لت پت چاک سے اٹھی تو بہت پرجوش تھی، اس نے عمر کو بلا کر ایک نہایت خوبصورت پیالہ دکھایا جو اس نے ابھی ابھی چاک سے اتار کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھا تھا۔ پیالے کی بناوٹ میں ایسی عمدگی تھی کہ عمر کو یقین ہی نہ آتا تھا وہ حکیم بیگم نے بنایا ہے۔

''جد آوے سے نکال کر پھل بوٹے بناؤں گی تو کیسا روپ نکلے گا۔ بس تو اس وچ ددھ پیا کرنا۔ اج تو بول کہ میں کچی (بے ہنر) نئیں۔''

خوشی کے مارے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔

وہ ہانڈی پکانے چولہے کے آگے جا بیٹھی اور عمر وہیں گیلے برتنوں کی قطاروں کے قریب زمین پر کوئلے سے لکھنے لگا۔

معاً موسم رنگ بدلنے لگا اور بدلیوں کے سرمئی ہاتھوں نے سورج کا کندنی چہرہ ڈھانپ دیا تھا۔ حکیم بیگم کی ہدایت پر اس نے ایک ایک کر کے سارے برتن احتیاط سے اٹھا کر چھپر تلے ترتیب سے رکھ دیئے۔ چند لمحوں بعد آسمان کے پیالے سے ننھی ننھی بوندیں گریں جیسے حلوائی کے تھال سے چند نکتیاں کناروں سے اچھل جائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تھال الٹ پڑا۔ چھاچھم بارش کے چھینٹے دھرتی سے ٹکرا کر اچھلتے اور چھپر تلے رکھے گیلی مٹی کے برتنوں پر مدھم نشان چھوڑ جاتے۔ عمر کے دل میں جانے کیا آئی۔ اس نے اوک میں بارش کا پانی بھرا اور اس کوزے میں چند قطرے گرا دیئے جس کو بنا کر حکیم بیگم بجا طور پر فخر کے احساس میں گھری تھی۔

کوزے میں پانی کے قطروں نے چھوٹے چھوٹے گڑھے سے بنا دیئے تو اسے یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی اوک میں پانی بھر بھر کے کوزے میں انڈیلتا رہا پھر اس نے حکیم بیگم کی نظروں کی زد سے بچتے ہوئے وہ پیالہ اٹھا کر اولتی (چھپر کا کنارا) تلے دھر دیا۔ بارش کی بوندیں اولتی سے ٹپکتی ہوئی پیالے میں گرتی رہیں اور چھوٹے بڑے گڑھے اور مبہم سی لکیریں بنتی مٹتی رہیں۔ اسے یہ کھیل بڑا دلچسپ لگ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ بعد میں تھپک کر ان نشانات کو مٹا دے گا، جو بارش کے پانی سے کوزے کے بدن پر بن رہے تھے۔ پیالے کو دیکھتے ہوئے چھپر کی بیساکھی پر بازو لپیٹ کر وہ گول دائرے میں گھومنے لگا اور ساون کا ایک گیت گانے لگا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس نے آبخورے سے نظریں ہٹائیں اور جب دوبارہ اسے دیکھا تو ٹھٹک کر بیساکھی سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اب وہ بارش کی بوندوں سے پگھلنے لگا تھا۔

ہیئت بدل رہا تھا...... اس کی صورت بگڑ رہی تھی...... رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہا تھا۔

اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔ وہ اسے نیست ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کیچڑ کے بے شکل لوتھڑے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے بے ضرر کھیل نے کیسا غضب ڈھایا تھا۔

وہ اس پیالے کو کبھی بھول نہیں پایا تھا اور آج فٹ پاتھ پر صوفیہ کی جانب پشت کر کے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ پیالہ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس کی صورت بگڑنے سے بچانے کی کیسی طاقتور خواہش اس کے اندر شور مچاتی تھی پر وہ وقت گنوا بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی حکیم بیگم کو ویسا عمدہ برتن بناتے نہیں دیکھا۔ ایسے بے عیب برتن کبھی کبھی ہی تراشے جاتے ہیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے صوفیہ جتنا مکمل حسن آج تک نہ دیکھا تھا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ایسی صورت بہت کم تخلیق کی جاتی ہے تو مبالغہ نہ ہوتا۔ اس نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا۔ صوفیہ اب ایک سایے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ صوفیہ اور اس پیالے میں کیا فرق تھا؟ وہ چھپر کی اولتی تلے پڑا ہوا گیلی مٹی کا کوزہ ہی تو تھی۔ بس ابھی تک بارش کی کوئی بوند اس پر ٹپکی نہیں تھی۔ جوں ہی پہلا قطرہ گرتا، زوال شروع ہو جاتا۔ کیا وہ اسے اولتی کے نیچے سے ہٹائے گا نہیں؟ کیا اس بار بھی وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا؟

وہ گھوم کر پلٹا اور سرپٹ دوڑ پڑا۔ بس اسٹاپ کے قریب اس نے دوبارہ صوفیہ کو جا لیا تھا۔ جس بس میں وہ سوار ہوئی، اس میں وہ بھی سوار ہو گیا۔ بس قریب قریب خالی پڑی تھی۔ گنتی کے چند مسافر ایک دوسرے سے دور دور نشستوں پر بیٹھے تھے۔ صوفیہ کسی خالی نشست پر بیٹھنے کی بجائے ایک درمیانی عمر کے تنہا مرد کے ساتھ بیٹھ گئی جو اسپینش خدوخال کا مالک تھا۔ عمر نے قریب سے گزرتے ہوئے صوفیہ کو غور سے دیکھا تھا۔ نزدیک سے دیکھنے پر وہ اور بھی زیادہ دلکش دکھائی دی تھی۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ عمران کی پشت پر ایک نشست چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے متوازی دروازے کے پہلو سے جڑی ہوئی نشست پر براجمان ادھیڑ عمر موٹی عورت نے اپنے لیپ ٹاپ سے سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ لیپ ٹاپ کے علاوہ اس کی گود میں کچھ فائلیں، کاغذات اور ایک فلاپی ڈسک رکھی تھی۔ اس کے ہمراہ پانچ چھ سال کی گھنگھریالے بالوں والی بچی تھی جو لیپ ٹاپ اور دیگر چیزوں سے چھیڑ چھاڑ میں مگن تھی۔ لیپ ٹاپ کی کنجیوں پر تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے وہ عورت کاغذات کو بھی نگاہ میں رکھے ہوئے تھی اور بار بار بچی کو چیزوں کو چھونے سے منع کر رہی تھی۔

عمر نے صوفیہ کو اس مرد سے اجنبی زبان میں کچھ کہتے سنا۔ اس کی ہونٹوں پر ایک نمائشی مسکراہٹ تھی۔ جواب میں وہ مرد چند ساعتیں خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹ اتنے کھل گئے کہ اس کے دونوں جبڑے نمایاں ہو گئے۔ اس نے بھی نامانوس زبان میں طویل جملہ بولا تھا اور کھسک کر صوفیہ کے نزدیک ہو گیا تھا۔ وہ دونوں روانی سے گفتگو کرنے لگے۔ صوفیہ کا مخاطب مرد نہایت خوش نظر آتا تھا۔ وہ شاید اسپینش میں بات کر رہے تھے۔ بھلے مفہوم سے عمر نا آشنا تھا مگر اس مرد کے تاثرات سے اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کیسے صوفیہ کے سراپے میں گڑی جاتی تھیں۔ ان دونوں کے ایک مشترکہ قہقہے پر لیپ ٹاپ والی نے ناگواری سے سر ہلاتے ہوئے عمر کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اس کا ہم خیال تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اس نے صوفیہ اور اس اسپینش مرد پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور پھر ایک کاغذ میں الجھ گئی۔

کیا صوفیہ نے بس میں اپنے لیے کسٹمر ڈھونڈ لیا تھا؟ اس سوچ نے عمر کو سن کر دیا۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ اسے کیسے باز رکھ سکتا تھا۔ لازم نہیں تھا کہ جو وہ سوچ رہا تھا، حقیقت وہ ہی ہو۔ کیا معلوم صوفیہ پہلے سے اسے جانتی ہو اور بس میں اچانک سامنا ہو گیا ہو۔ یہ معاملہ ایک بے ضرر اتفاقی ملاقات سے زیادہ کچھ بھی نہ ہو۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

''تم بھی ان کمینوں کی وجہ سے پریشان ہو رہے ہو نا؟'' لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظر ہٹائے بنا موٹی عورت نے کہا۔

یہ سوال شاید اسی سے کیا گیا تھا۔ وہ خاموش رہا اور اس آدمی کو دیکھنے لگا جس کا شانہ اب صوفیہ کے شانے سے ملا ہوا تھا۔

''میں زیادہ قانون نہیں جانتی لیکن اتنی خبر ہے مجھے کہ عوامی جگہ پر soliciting کیلی فورنیا کے پینل کوڈ میں قابل سزا

ہے۔کیا براوقت آ گیا ہے۔ایک hooker ہمارے درمیان اپنے گاہک سے بھاؤ تاؤ کر رہی ہے۔میرے تو بچے بھی انہی بسوں میں سفر کرتے ہیں۔دل تو چاہ رہا ہے کہ پولیس کو بلا کر ان دونوں کو ابھی گرفتار کروا دوں لیکن مجھے گھر پہنچنے کی اس قدر جلدی ہے کہ میں معمولی تاخیر کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔''اس عورت کی آواز بڑبڑاہٹ سے ذرا ہی اونچی تھی۔

عمر نے اپنے دل کو رکتے ہوئے پایا۔اس کے خدشات سچ تھے۔صوفیہ نے اسپتال کے کمرے میں گرانٹ سے جو کچھ کہا تھا، وہ حقیقت میں اس پر عمل پیرا ہو گئی تھی۔وہ غصے میں کیے جانے والے بے روح دعوے نہیں تھے۔

''ممی! hooker کیا ہے؟''بچی اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی۔

''چپ رہو، یہ ایک برا لفظ ہے۔تم اسے نہیں بولو گی۔''اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''تو آپ نے کیوں کہا؟''

''خاموش ہو جاؤ اور اپنے ہاتھ دور ہٹا لو۔کسی بھی کاغذ کو مت چھوؤ۔''

بس رک گئی تھی۔صوفیہ اور وہ آدمی اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے۔عمر ایک بار پھر شش وپنج میں گھرا تھا۔آخر اس مہم جوئی کا مطلب کیا تھا؟اس نے کیا لائحہ عمل طے کیا تھا جس کے ذریعے وہ صوفیہ کو روک لیتا۔کس ذہنی رو میں وہ اس کے پیچھے آ گیا تھا؟ وہ کوئی مصلح نہیں تھا۔کوئی مبلغ نہیں تھا کہ اس کی پر تاثیر باتوں سے صوفیہ کا دل بدل جاتا۔اسے اس سلسلے کو یہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔ وہ مفلوج جسم لیے نشست پر جما رہا۔وہ نیچے اتر گئے تو موٹی عورت نے ایک اطمینان بھری طویل سانس لی۔عمر سے اب بھی ہلا نہ گیا۔ اس اسٹاپ پر اترنے والے صرف وہ دونوں ہی تھے۔دروازہ بند ہو گیا۔عمر نے کھڑکی میں سے انہیں اکٹھے ایک سمت بڑھتے ہوئے دیکھا۔بس روانہ ہو گئی۔اس نے نشست سے اچک کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔چند لمحوں میں وہ نظر سے اوجھل ہو گئے۔عمر نے حلق میں کانٹوں کی چبھن محسوس کی۔اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔

''بس روک دو۔ابھی۔فوراً۔''

اس نے موٹی عورت کو چلاتے ہوئے سنا۔وہ کھڑی ہو کر بدحواسی میں ڈرائیور کو پکار رہی تھی۔

''اگلے اسٹاپ سے قبل بس نہیں رکے گی۔آرام سے بیٹھ جاؤ۔''ڈرائیور نے تحمل سے اسے بتایا۔

''آرام گیا بھاڑ میں۔میری بیٹی نے فلاپی ڈسک دروازے سے باہر پھینک دی ہے۔وہ ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔ اگر وہ کھو گئی تو میری ملازمت چلی جائے گی۔بس روکو ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔''وہ وحشت سے چیخ رہی تھی۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس کی بات مان لی گئی۔بس رکنے پر عمر نے سوچا۔''کیا اب بھی مجھے نہیں اترنا چاہیے؟''پھر اس نے خود کو سڑک پر بھاگتے ہوئے پایا تھا۔وہ صوفیہ اور اس آدمی کے قریب پہنچا تو اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔اس کے دوڑتے قدموں کی آہٹ پر ان دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔

''میں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں۔''عمر نے اونچی آواز میں اٹکتے ہوئے کہا۔

صوفیہ کسی کل دار گڑیا کی طرح گھومی اور سیاہ آنکھوں میں حیرانی سمو کر عمر کو دیکھا۔

جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ دراز قد نوجوان لڑکا اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔اس کا چہرہ دیکھ کر صوفیہ کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔وہ پاکستانی یا انڈین تھا اور اتنا خوبصورت تھا کہ اس کو نظر بھر کر دیکھنے سے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔اس کے گالوں پر ہلکا سا بھورا رواں تھا۔بھرپور جسامت کا مالک ہونے کے باوجود اس کی عمر کے بارے میں صوفیہ کا اندازہ تھا کہ اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔وہ جیسے پہلے بھی اس لڑکے کو کہیں دیکھ چکی تھی۔ مانوسیت کا یہ احساس بڑا طاقتور اور کسی حد تک خوفزدہ کرنے والا تھا۔اس کے اندر سنسنی سی پھیل گئی۔

''تم نے ابھی کیا کہا؟''

صوفیہ نے پوچھا تو اس نے پہلے سے بڑھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنی بات دہرائی ''میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''کیا مطلب؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

صوفیہ کے ساتھی مرد نے مداخلت کی۔ ''چھوڑو اسے۔ پتہ نہیں کون ہے اور کیوں ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے۔''

''تم مت بولو۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔''

صوفیہ نے سختی سے کہا تو اس کی صورت پر کبیدگی پھیل گئی۔

''تو تم کیا کہہ رہے تھے؟'' صوفیہ عمر کی جانب متوجہ ہوئی۔

''جیسے یہ آدمی تمہیں لے کر جا رہا ہے، اسی طرح میں تم کو لے جانا چاہتا ہوں۔'' وہ لکنت زدہ آواز میں سمجھانے لگا۔ اس کی آنکھیں زمین پر مرکوز تھیں۔

''میں تمہیں اس سے زیادہ رقم دوں گا۔ تم اس کے ساتھ مت جاؤ۔''

اس کے الفاظ نے صوفیہ کو الجھا دیا۔ وہ اس بات سے کیسے واقف تھا؟ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ ''کیا بے معنی باتیں کر رہے ہو۔ میں اس سے رقم کیوں لوں گی؟ یہ تو میرا دوست ہے۔'' اس نے صاف مکرنا چاہا۔

''نہیں۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں حقیقت جانتا ہوں۔ میں بس میں تمہارے نزدیک بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے تم بہت اچھی لگی ہو۔ مجھے مایوس نہ کرو۔ تم جتنی بھی رقم کہو گی، میں دوں گا۔'' وہ اب بھی زمین کو دیکھ رہا تھا۔

اسپینش مرد غصے میں بھرا ہوا آگے آیا اور اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اسے عقب میں دھکا دیا۔ ''دفع ہو جاؤ۔ تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ تم ساری زندگی بھول نہیں سکو گے۔''

صوفیہ نے اسے کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے عمر سے دور کر دیا۔ ''وہ مجھ سے بات کر رہا ہے تو مجھے جواب دینے دو۔ تم بیچ میں مت پڑو۔''

اس کے جھڑکنے پر وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی۔ کیا تمہیں کسی نے سکھایا نہیں کہ ایک گھٹیا hooker کو معزز لوگوں سے کس انداز میں مخاطب ہونا چاہیے۔ کیا تم خود کو میرے برابر تصور کرتی ہو؟ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔ جہنم میں جاؤ۔'' وہ صوفیہ پر گرجتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

صوفیہ نے پلٹ کر اسے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

عمر نے اس کے جانے پر اطمینان محسوس کیا تھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جو تم سمجھ رہے ہو ویسا کچھ نہیں ہے۔ تم نے خوامخواہ اپنا اور میرا وقت برباد کیا ہے۔'' صوفیہ نے عمر سے کہا۔

اس دوران وہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے hookers کے لیے رہنما اصولوں پر مبنی ایک کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور ہالی وڈ کی فلموں نے بھی کسی حد تک اس موضوع پر اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ اسی فی صد احتیاطیں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے بیان کی گئی تھیں کہ John (گاہک کے لیے ایک اصطلاح) سادہ کپڑوں میں پولیس والا نہ ہو۔ ذہن نشین کیے ہوئے کلیوں سے اس کی شخصیت کا تجزیہ کرنے پر اس نے طے کیا کہ ایسا امکان بعید از قیاس تھا۔ ایک تو وہ اتنا کم عمر ظاہر ہوتا تھا کہ سرکاری عہدیدار ہونے کا شک کرنا بے بنیاد تھا اور پھر اس کی ٹی شرٹ اور پتلون اس کے توانا بدن پر کسی مقام سے بھی ڈھیلی نہ

تھی۔ اگر اس لباس کے نیچے اس نے گن چھپائی ہوئی ہوتی تو اس سے بننے والا ابھار کبھی بھی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکتا۔ پولیس والے عموماً ایسا لباس منتخب کرتے تھے کہ محض دیکھنے سے گن کی نشاندہی کرنا ممکن ہی نہ ہوتا تھا۔

"مجھے انکار نہ کرو۔ تم واقعی مجھے پسند آئی ہو۔ تمہیں رقم ہی چاہیے نا۔ میں تمہیں کوئی بھی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں۔ پھر تم کیوں منع کر رہی ہو۔"

صوفیہ کو اس کے غیر معمولی انداز نے مخمصے میں ڈال دیا۔ اگر وہ اسے اچھی لگی تھی تو اس کی آنکھیں زمین سے کیوں نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ اس پر نظر ڈالنے سے کیوں کترا رہا تھا؟ اس سے بڑھ کر ایک اور مکاشفے نے صوفیہ کو پریشان کیا۔ اس کے دل میں شدید خواہش تھی کہ وہ لڑکا آنکھ اٹھا کر اسے دیکھے۔ اس کی نظر میں آنے کی ایسی زور آور تمنا اس کے اندر کیوں مچل رہی تھی؟ اسے محسوس ہوا کہ کشش کے اس حصار کو توڑنا لازم تھا۔ وہ لڑکا ایک موزوں کلائنٹ نہیں تھا۔ اس کی خامی یہ تھی کہ اس میں کوئی خامی نہ تھی۔ اس کی رائے میں ایک John کو جیسا ہونا چاہیے تھا، وہ لڑکا ہرگز ویسا نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس کی پیشکش کو رد کر دے گی۔

"جب میں کہہ رہی ہوں کہ تم غلط جگہ پر کوشش کر رہے ہو تو تم باز کیوں نہیں آ جاتے۔ میں جا رہی ہوں۔ اب میرا پیچھا کرنے کی غلطی مت دہرانا۔"

اسے یہ کہنے کی باوجود وہ اس مقام سے سرکی نہیں تھی۔

"ابھی اس آدمی نے تمہیں ایک برے نام سے پکارا تھا۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو اس نے ایسا کیوں کہا۔" وہ اپنی ہتھیلیوں پر آنکھیں گاڑے ایک دلیل دے رہا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اس کے گداز ہونٹوں کے کناروں پر پسینے کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"کیونکہ وہ غصے میں تھا۔ غصے میں اکثر لوگ گالیاں دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ کوئی انوکھا واقعہ ہے؟"

اس توجیہہ نے اسے قائل نہ کیا۔ "اگر میں غلط جگہ پر قسمت آزما رہا ہوتا تو میری زبان سے اس طرح کی بات سن کر تمہیں طیش آ جاتا۔ تم مجھے برا بھلا کہتیں۔ کبھی اتنی آسانی سے مجھے اپنی توہین کرنے نہ دیتیں۔ اس کے برعکس تم پرسکون ہو۔ تلخی تو کیا، تمہاری آواز تک اونچی نہیں ہوئی۔" اس نے دوسری دلیل پیش کی۔

صوفیہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی بات میں وزن تھا۔

"سب کا مزاج ایک سا نہیں ہوتا۔ میں اتنی جلدی غصے میں نہیں آتی۔ تمہاری بات سے مجھے دکھ ہوا لیکن چیخنا چلانا کوئی حل نہیں۔" صوفیہ نے پھر اس کی منطق کو جھٹلا دیا "لیکن اگر تمہارا دعویٰ بجا ہے تو تم فوراً چلی کیوں نہیں گئیں۔ اب تک یہاں رک کر مجھے وضاحتیں کیوں دے رہی ہو۔"

اس بار وہ لاجواب ہوئی تھی۔ بولتے ہوئے وہ بے اختیار ہکلائی۔ "یہ تو ہے...... مجھے چلے جانا چاہیے تھا۔ یہاں رکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

اس پر ایک آخری نگاہ ڈال کر وہ مڑی اور سمت کا تعین کیے بغیر چلنے لگی۔ وہ اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ "تمہیں کتنی رقم چاہیے، بے جھجک تقاضہ کرو۔"

وہ رک گئی اور یکسر بدلے ہوئے تاثرات کے ساتھ بولی۔ "تم کتنی دے سکتے ہو؟"

عمر نے ذرا سی نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ "مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کیا۔ تم خود ہی بتا دو۔"

جواب دیتے ہوئے صوفیہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی چھٹی حس مسلسل سرخ اشاروں کی ترسیل کر رہی تھی، اس لڑکے سے دور

ہو جانے کو کہہ رہی تھی۔ مانوسیت کا جو احساس اسے دیکھتے ہی جاگا تھا، اب اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ اس سے جان چھڑانے کا ایک آسان حل تھا کہ وہ اسے ایسی قیمت بتا دے جو اس کی پہنچ سے باہر ہو۔ ایک دم اس کے ذہن میں وہ جوتے آ گئے جن کی وجہ سے میبل زندگی اور موت کے درمیان معلق تھا۔

''تین سو bucks۔ میں تم سے تین سو bucks لوں گی۔'' وہ جانتی تھی کہ Watts میں دور دور تک کہیں کوئی hooker اتنے بڑے معاوضے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سن سیٹ اسٹرپ جیسے علاقے میں بھی دو سو ڈالر سے زیادہ کا تقاضہ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے بے لچک لہجے میں تین سو bucks مانگ لیے تھے۔

اس لڑکے کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ صوفیہ اسی ردعمل کی توقع کر رہی تھی۔ ''تم چپ کیوں ہو گئے؟ تین سو bucks نہیں ہیں تمہارے پاس؟''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' ایک لمبی چپ کے بعد اس نے کہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن تم نے خود ہی کہا تھا کہ تم کوئی بھی قیمت ادا کرو گے۔''

''ہاں میں نے کہا تھا لیکن یہ تو...... کیا تم اپنا مطالبہ گھٹا نہیں سکتیں۔ میری جیب میں تمہیں دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ نوے ڈالر ہیں۔ باقی تیس ڈالر ٹیکسی اور ہوٹل کے کمرے کے کرایے پر خرچ ہوں گے۔ اگر میں وہ بھی تمہیں دے دوں تو پھر سڑک پر رات گزارنا ہو گی۔''

ایک نو آموز کے لیے یہ معاوضہ کم نہیں تھا۔ اس کے دل نے اسے ہاں کہنے پر اکسایا۔

''نوے؟'' وہ استہزا سے ہنسی۔ ''تین سو اور نوے کے ہندسوں کی تعداد بھی آپس میں نہیں ملتی۔ مجھے اجازت دو۔'' وہ جانے کے بجائے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

عمر تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فوری طور پر دو سو ڈالر کا بندوبست کرنا کیونکر ممکن تھا۔ صوفیہ سے اسے امید نہیں تھی کہ وہ لچک دکھائے گی پھر بھی اس نے منت بھری آواز میں کہا۔ ''تم مان جاؤ۔ نوے ڈالر کم نہیں ہوتے۔ یہ ایک معقول رقم ہے۔''

''تین سو سے ایک سینٹ کم نہیں۔ میری بات حتمی ہے۔ بحث سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

اس نے بدقت خود کو دوبارہ چلنے پر آمادہ کیا۔ پراسرار لڑکے نے ایک بار پھر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

''کیا تم مجھے تھوڑی سی مہلت دے سکتی ہو؟ میں تمہاری بتائی ہوئی رقم کا انتظام کر دوں گا لیکن تمہیں میرا انتظار کرنا ہو گا۔ میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔''

شاید وہ اے ٹی ایم مشین سے رقم نکلوانے کی نیت سے جا رہا تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے لوٹنے پر میں یہیں ملوں گی۔''

''ہاں مجھے اس پر یقین ہے۔'' اس نے جاتے ہوئے وہ عجیب جملہ کہا تھا۔

''کس پر یقین ہے؟''

اسے جواب نہیں ملا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک رہن کی دکان میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ کوئی چیز گروی رکھنے گیا تھا۔ ایسی کون سی قیمتی چیز اس کے پاس تھی جس کے عوض وہ دو سو ڈالر قرض حاصل کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اسے چھوڑ کر چلے جانے کا موقع تھا لیکن اس کا یقین توڑتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

وہ pawnshop اتفاقاً عمر کی نظر میں آ گئی تھی۔ رقم کا فوری بندوبست کرنے کا اس سے آسان ذریعہ کیا ہو سکتا تھا۔ pawn shop کا مالک اس وقت اکیلا تھا۔ عمر کو اندر آتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اسے خوش آمدید کہا۔

''میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔'' بنا کسی تمہید کے عمر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ Revue Thommen گھڑی تھی جو اس کی سولہویں سالگرہ پر آمنہ نے تحفے میں دی تھی۔ وہ اس کی ہر سالگرہ پر اسے کوئی تحفہ ضرور دیا کرتی تھی۔ وہ گھڑی اس کے دیئے ہوئے تحائف میں سب سے مہنگی چیز تھی۔

بوڑھے مالک نے گھڑی کا تفصیلی معائنہ کیا پھر ''بلو بک'' کی ورق گردانی کر کے کچھ مزید حساب کتاب کیا اور گھڑی کو اپنے سامنے کاؤنٹر پر بے نیازی سے رکھتے ہوئے بولا۔

''ایک سو نوے ڈالر۔''

عمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا ''کیا کہہ رہے ہو؟ ایسی نئی گھڑی کی قیمت تقریباً سترہ سو ڈالر ہے۔''

اس احتجاج نے کائیاں بوڑھے پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ ''نئی گھڑی کی قیمت بے شک اتنی ہی ہے مگر یہ گھڑی نئی نہیں ہے۔ ظاہری حالت بھی اتنی اچھی نہیں ہے اور سب سے بڑی قباحت تو یہ ہے کہ اس پر رقم خرچ کرنے کی صورت میں مجھے خسارہ اٹھانے کا خطرہ مول لینا پڑ رہا ہے۔ یہ فیک بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں کچھ ایسے نقائص ہو سکتے ہیں جو فوری طور پر قابل نشاندہی نہ ہوں۔ مگر جن کی وجہ سے اس کی وقعت دھات کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہ ہو۔'' وہ روایتی ہتھکنڈے آزمانے لگا۔

''یہ فیک نہیں ہے۔ یہ اصلی Thommen ہے۔ اس برانڈ کی بہت مانگ ہے۔'' عمر نے بے قراری سے کہا اور مڑ کر کانچ کے دروازے کے پار دیکھا۔

''اتنی بھی مانگ نہیں ہے جتنی تم کہہ رہے ہو۔ یہ Rolex تو نہیں ہے کہ اس کا خریدار ڈھونڈنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میں نے تمہیں معقول پیش کش کی ہے۔'' وہ اڑیل اور بحث سے لطف اندوز ہونے والے لوگوں میں سے تھا۔

''اگر مجھ پر ایسی افتاد نہ پڑی ہوتی تو کبھی اس گھڑی کے اتنے غیر مناسب دام قبول نہ کرتا۔ پھر بھی میری کم سے کم مانگ دو سو دس ڈالر ہے۔ میں اسے بیچنے پر تیار ہوں۔'' عمر نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''اور میری زیادہ سے زیادہ حد ایک سو نوے ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔'' وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔

عمر نے ایک بار پھر باہر نظر دوڑائی تھی۔ ''تمہارا رویہ غلط ہے۔ تم استحصال کر رہے ہو۔ اخلاقی اقدار اور کاروبار......''

بوڑھے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر میں اخلاقیات نبھانے میں لگ گیا تو کر چکا کاروبار۔''

''ٹھیک ہے رقم مجھے دے دو۔'' عمر نے بے بسی سے کہا۔

وہ بدستور دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''تم نے دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ تم مجھے اپنا ڈرائیونگ لائسنس دے دو تا کہ میں رسمی کارروائی پوری کر لوں۔''

''وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''تو کوئی شناخت نامہ۔ پاسپورٹ وغیرہ تا کہ تمہاری شناخت ہو سکے۔''

''ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوراً رقم دے دو۔ اگر میں اس قدر عجلت میں نہ ہوتا تو ایسا برا سودا کرتا ہی کیوں۔'' اس نے دروازے سے نظر ہٹائے بنا تیز آواز میں کہا۔

''تو یہ معاملہ ہے۔ میرے پاس اکثر ایسے عاجل لوگ آیا کرتے ہیں۔'' بوڑھے کا لہجہ معنی خیز تھا۔

عمر نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے انداز میں محسوس کیا جانے والا بدلاؤ آ گیا تھا۔ عمر کو پچھتاوا ہوا کہ اس نے کچھ غلط جملے بول دیئے تھے۔

''میں تمہیں اس گھڑی کی عوض ایک سو ستر ڈالر دوں گا۔ ظاہر ہے رسید کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں تو میں تمہیں کہیں دستخط

کرنے پر بھی مجبور نہیں کروں گا۔''

عمر کو اس پر شدید طیش آیا تھا۔ ''ابھی تو تم نے ایک سو نوے ڈالر دینے کی ہامی بھری ہے۔ پھر اب اپنی زبان سے پھرتے کیوں ہو؟''

بوڑھا بروکر طنزیہ ہنسی ہنسنے لگا۔ ''تم اتنی جلدی میں ہو کہ اپنی شناخت تک نہیں کروا سکتے اور بقول تمہارے اپنی بڑھیا گھڑی نہایت ادنیٰ نرخوں پر فروخت کر رہے ہو تو میں یہ فرض کیوں نہ کروں کہ یہ گھڑی چوری کی ہے اور تم ایک مجرم ہو۔ یہ تکرار طول پکڑ سکتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے قیمتی وقت کو ضائع ہونے سے بچالو۔''

وہ ایک دراز میں سے نقدی نکال رہا تھا۔

صوفیہ ٹہلتے ہوئے رک گئی۔ وہ لڑکا واپس آ گیا تھا۔ اس نے باریک بینی سے معائنہ کیا تو اسے پتہ چل گیا کہ وہ رہن کی دکان میں کیوں گیا تھا۔ اس کی بائیں کلائی اب خالی تھی۔

''رقم کا انتظام ہو گیا؟''

''ہاں لیکن یہ پورے تین سو نہیں ہیں۔ بیس ڈالر کم ہیں۔ مجھے امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کچھ نوٹ اسے دکھائے۔

صوفیہ نے جان بوجھ کر نوٹوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔

''تم pawnshop میں اپنی گھڑی رہن رکھوانے گئے تھے نا؟ تو اس کے بدلے میں تمہیں کتنا قرض ملا ہے؟''

صوفیہ کے سوال پر وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''میں نے قرض نہیں لیا۔ ایک سو ستر ڈالر میں وہ گھڑی بیچ دی ہے۔''

''کس برانڈ کی گھڑی تھی وہ؟''

''Revue Thommen''

صوفیہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ بروکر کے ہاتھوں صریحاً لٹ کر آ رہا تھا۔ اگر وہ پہلے اس کی نیت سے واقف ہو جاتی تو رقم کے بجائے اس سے وہ گھڑی مانگ لیتی۔

کیا وہ اس پر اس درجہ ریجھ گیا تھا۔ یا وہ بے وقوف تھا؟ اس دوسرے قیاس کو اس نے رد کر دیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اس کی اجلی پیشانی اور چمکدار آنکھیں ذہانت سے معمور تھیں۔ وہ جو کر رہا تھا سوچ سمجھ کر کر رہا تھا۔ اب اس سے پیچھا چھڑانا لازمی ہو گیا تھا۔ وہ کوئی تدبیر سوچنے لگی۔ پھر اس کی نظران نوٹوں پر ٹک گئی جو اس لڑکے نے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔

''میں تین سو bucks لوں گی۔ ان میں سے بیس کم ہوں چاہے ایک۔ مجھے منظور نہیں تم کسی اور سے......''

اس نے صوفیہ کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ''ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔ ایک آخری موقعہ دے دو۔ تھوڑا سا اور انتظار کرو۔''

اس کا جواب سنے بغیر وہ پوری قوت سے رہن کی دکان کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ چند لمحے تجسس نے صوفیہ کے قدم جکڑے رکھے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا کرنے والا تھا۔ پھر خود کو سمجھاتے ہوئے وہاں سے چل پڑی۔ وہ حتی الوسع تیزی سے دور جا رہی تھی لیکن محض دو منٹ بعد ہی اسے رک جانا پڑا تھا۔ وہ اسی رفتار سے بھاگتا ہوا لوٹ آیا تھا۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کچھ کہا جو وہ سمجھ نہ پائی اور اپنی جیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سر سے اشارہ کیا جیسے کامیابی کی یقین دہانی کروا رہا ہو۔ اس کے جسم کا سارا خون گویا سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا اور پسینے کے قطرے کنپٹیوں اور گردن پر رینگ رہے تھے۔ صوفیہ کو پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ اس بار وہ کیا بیچ کر آیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں کھڑا تھا!

''وہ بیس ڈالر میں میرے جوتے خریدنے پر فوراً ہی آمادہ ہوگیا حالانکہ میرا خیال تھا وہ آسانی سے نہیں مانے گا۔'' اس نے جھینپے ہوئے انداز میں بتایا۔

''میں نے تمہارے جوتوں پر غور نہیں کیا تھا کیا وہ کسی مہنگی برانڈ کے تھے؟'' صوفیہ نے اس کے ننگے پیروں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں وہ میری بہن نے مجھے ایک خاص موقع پر تحفے میں دیئے تھے۔ بازار میں ایسے نئے جوتوں کے جوڑے کی قیمت اندازاً چار سو پچاس ڈالر ہے۔'' اس کی آواز میں سادگی اور سرسری پن تھا۔

''کیا تمہارے پاس ایسے بہت سے جوتے اور گھڑیاں ہیں؟''

''نہیں۔ ان کے علاوہ اور تو نہیں ہیں۔ اتنی مہنگی چیزیں رکھنے کی استطاعت نہیں ہے میری۔''

صوفیہ کو اس سے خوف آیا تھا۔

اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہے۔ وہ دونوں خاموشی سے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ صوفیہ کو اس کے ننگے پیروں سے وحشت ہو رہی تھی۔ عمر نے محسوس کیا کہ صوفیہ کی چال میں مصنوعی بندش تھی۔ شاید اس کے جوتے آرام دہ نہیں تھے اور جانے وہ اتنی اونچی اور نوکیلی ایڑیوں کے ساتھ چل بھی کیسے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دو سرخ میخوں پر چلی جا رہی ہو۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ کیا تم نے موٹیل کا تعین کر رکھا ہے۔''

''نہیں۔'' یک لفظی جواب آیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

عمر نے متعدد دفعہ گزرتی ہوئی ٹیکسیوں کو رکنے کا اشارہ کیا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''کیا تم پہلی بار لاس اینجلس آئے ہو یا اس شہر میں اس سے قبل کبھی ٹیکسی کے ذریعے سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''یہ نیویارک نہیں ہے کہ جہاں جی چاہا ٹیکسی روک لی۔ لاس اینجلس میں ٹیکسی اسٹینڈ کے سوا کسی دوسری جگہ سے مسافر بٹھانے پر ڈرائیور کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ تم بے کار خود کو تھکا رہے ہو۔ ویسے اگر تمہارے ذہن میں کوئی خاص موٹیل نہیں ہے تو یہاں قریب ہی چند سستے موٹیلز ہیں۔ ہم پیدل وہاں تک جا سکتے ہیں۔'' صوفیہ نے تجویز دی۔

ان کے راستے میں جو پہلا خستہ حال موٹیل آیا اس کے سامنے رکتے ہوئے عمر نے کہا۔ ''یہ مجھے ٹھیک لگ رہا ہے اور لکھا ہے کہ گھنٹوں کے حساب سے کمرے دستیاب ہیں۔'' وہ بورڈ پر درج شدہ الفاظ پڑھ رہا تھا۔

صوفیہ نے سر کی خفیف جنبش سے تائید کی تھی۔ اس کی گھبراہٹ میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر لحظہ وہ دلدل میں گہری دھنستی جا رہی تھی۔

استقبالیہ کلرک اکتاہٹ زدہ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ اندر ایسا سناٹا تھا جیسے سالوں سے وہاں کسی کا گزر نہ ہوا ہو۔ عمر کے جوتوں کے بغیر پاؤں اس کے ماتھے پر شکنیں لے آئے البتہ مصلحت کے تحت اس نے زبانی اظہار سے پرہیز کیا۔

کلرک سے کرایہ دریافت کرنے کے بعد عمر نے کمرہ دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ کلرک نے ایک بیل بوائے کو بلا کر چابیوں کا گچھا اسے دیتے ہوئے عمر کے ساتھ جانے کی ہدایت کی ''تم ذرا یہیں رکو۔ میں ایک نظر کمرے کو دیکھ آؤں۔''

جوں ہی وہ بیل بوائے کے ہمراہ بوسیدہ لفٹ میں سوار ہوا، صوفیہ کنکھیوں سے کلرک کو دیکھتے ہوئے اٹھی اور سبک چال سے داخلی دروازے تک چلی گئی۔ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ کلرک ٹیلی ویژن کی

اسکرین پر آنکھیں جمائے ہوئے تھا۔ وہ باہر آ گئی مگر آگے نہیں بڑھی، وہیں ایک ستون کی اوٹ میں رک گئی۔

''آخر میں کس چیز سے خوفزدہ ہوں؟ کیا میری پریشانی کی وجہ صرف یہ ہی ہے کہ مجھے بنا کسی دوڑ دھوپ کے تین سو bucks مل رہے ہیں۔ میں بدقسمت تو ہمیشہ سے تھی، احمق کب سے ہوگئی۔ کیا یہ ایسی رقم ہے جس کو اس طرح سے ٹھوکر ماردی جائے۔''

وہ دیر تک اسی جگہ ٹھہر کر خود سے الجھتی رہی، پھر جی کڑا کر کے لابی میں داخل ہوگئی۔ اسی لمحے لفٹ نیچے آ کر تھمی تھی۔ اس لڑکے نے اب پیروں میں سلیپر پہن رکھے تھے جو یقیناً موٹیل کے کمرے سے دستیاب ہوئے ہوں گے۔ اس نے صوفیہ کو باہر سے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ جیسے اسے صوفے پر بیٹھا ہوا چھوڑ کر گیا تھا، وہ اسی حالت میں اسے ملی تھی۔ اس نے صوفیہ کو اپنے ساتھ آنے کو کہا تھا۔

کمرہ حسب امید چھوٹا، گندا اور ارزاں فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اندر قدم رکھتے ہوئے اس کی ناک سے ایک بو ٹکرائی جس سے تاثر ملتا تھا کہ وہ کمرہ عرصہ دراز سے بند پڑا تھا۔ اس کے پہلے کلائنٹ نے دروازہ کھلا رہنے دیا تھا اور اب وہ کمرے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

''تم دروازہ بند کرنا بھول گئے ہو۔'' صوفیہ نے مدھم آواز میں کہا۔

''نہیں میں بھولا نہیں ہوں۔ اسے کھلا ہی رہنا چاہیے۔''

وہ دیوار میں نصب الماری کی درازیں باری باری کھولتے ہوئے ان میں جھانک رہا تھا۔ صوفیہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ اس نے بیٹھنے کے لیے کوئی موزوں جگہ منتخب کرنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور بیڈ کے پاس بچھی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ ''تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ تم ریسپشن ڈیسک پر کال کر کے کیوں نہیں منگوا لیتے؟''

صوفیہ نے بولتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مجھے مل گئی ہے۔'' وہ لڑکا ایک دراز بند کرتے ہوئے گھوما تو اس کے ہاتھ میں ایک دھلی ہوئی بستر کی چادر تھی۔

''اس سے اپنا سر اور جسم ڈھانپ لو۔'' چادر صوفیہ کو دیتے ہوئے اس نے کہا۔

''کس لیے؟ کمرے میں ٹھنڈ تو نہیں ہے جو مجھے خود کو ڈھانپنا پڑے۔'' بے دھیانی میں چادر پکڑ کر وہ اس کی تہیں کھولنے لگی۔

''میں ٹھنڈ کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔''

''تو پھر؟''

''جسم چھپا ہوا نہ ہو تو وہ خوش ہوتا ہے۔''

''وہ کون؟''

''وہ جنوں میں سے ایک ہے اور اس کا خوش ہونا اچھی بات نہیں ہے۔''

وہ لڑکا عجیب تھا اور اس کی باتیں عجیب تر۔ اس نے چادر اپنے سر اور شانوں پر ڈال لی۔ اگر وہ اس عمل سے کوئی تسکین حاصل کر رہا تھا تو صوفیہ کا کیا جاتا تھا۔ آخر وہ اسے منہ مانگے دام ادا کر رہا تھا۔

''تمہیں گھبراہٹ ہو رہی ہوگی۔ قدرتی طور پر ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے اس سے پہلے کبھی تمہیں ایسا تجربہ نہیں ہوا۔''

خوف کی ایک لہر صوفیہ کے بدن کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے بستر کے آخری سرے پر خود سے دور ہٹ کر بیٹھے ہوئے مرد

کا خوبصورت چہرہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ کیسے جانتا تھا کہ وہ اس کا پہلا کسٹمر تھا۔ اس کا خوف ٹھوس شکل اختیار کرنے لگا۔ وہ کسی اتفاق کے نتیجے میں اس سے نہیں ٹکرایا تھا بلکہ کسی خاص مقصد کے تحت اسے یہاں تک لے آیا تھا۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ میرے لیے یہ پہلا تجربہ ہے۔''

وہ خاموش تھا۔

صوفیہ جانتی تھی وہ جواب نہیں دے گا۔

''تم نے ایسا کیوں کہا؟'' اس نے سوال دہرایا۔

''کیا میں نے غلط کہا ہے؟''

صوفیہ چپ رہی۔

''تمہاری عمر کتنی ہے؟ مجھے تو تم اٹھارہ سے بھی کم کے لگتے ہو۔ کہیں مجھے کسی قانونی پیچیدگی میں نہ پھنسا دینا۔'' بالآخر اس نے اعتماد بحال کرنے کی خاطر کہا تھا۔

''میری عمر بیس سال اور ایک ماہ ہے۔ تمہارے دنیا میں آنے کے ٹھیک پندرہ ماہ بعد میں پیدا ہوا تھا۔''

یہ دوسرا دھچکا پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ وہ اس کی بالکل صحیح عمر بتا رہا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ گنگ رہی۔ اس نے درحقیقت دلدل میں پاؤں رکھ دیا تھا اور اب وہ اسے نگل رہی تھی۔

''تمہیں اپنے اندازوں کی درستی پر بہت اعتماد ہے۔ میں تردید یا تصدیق کر کے تمہارا مان نہیں توڑوں گی۔'' خود کو سنبھالتے ہوئے صوفیہ نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

''میرا نام عمر ہے۔ کیا تم اپنا نام مجھے بتاؤ گی؟''

''میرے پیشے میں ناموں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں گی بھی تو وہ جھوٹ ہوگا۔ تم خود کوئی اندازہ کیوں نہیں لگاتے۔''

اس نے پرس کھول کر آئینہ نکالا اور اپنا عکس دیکھتے ہوئے ایک رومال سے ٹھوڑی اور گردن کو بلا ضرورت پونچھنے لگی۔ اس کا مقصد خود کو پراعتماد ظاہر کرنا تھا۔ ''اور میں تو اس پر بھی یقین نہیں کر سکتی کہ تم نے اپنا نام درست بتایا ہے۔ مجھے اس سے غرض بھی نہیں۔''

اس نے آئینہ اور رومال پرس میں ڈالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

''تم یہ کیوں کر رہی ہو؟''

''میں سمجھی نہیں تم کیا پوچھ رہے ہو۔''

''کیا تمہیں رقم چاہیے۔''

''رقم تو سب کو ہی چاہیے ہوتی ہے۔ مگر یہ میرا مسئلہ نہیں۔''

''تم تنہا ہو۔''

''تم مجھے بتا رہے ہو یا مجھ سے پوچھ رہے ہو؟''

''کیا تمہیں اکیلے پن سے نجات چاہیے؟''

''نہیں یہ بھی میرا مطمع نظر نہیں ہے۔''

''تمہیں کسی نے یہ راستہ اپنانے پر مجبور کیا ہے؟''

''میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں ہے۔ کہیں تم صحافی یا مصنف قسم کی مخلوق تو نہیں ہو۔ کیا تم میری

ذات میں کوئی دلچسپ کہانی ڈھونڈ رہے ہو؟ اگر ایسا ہے تو تم نے انتخاب کرنے میں غلطی کی۔'' اس نے ہنسنا چاہا مگر اس کے جبڑے اینٹھے ہوئے تھے۔

''تو کس شے نے تمہیں اکسایا ہے۔ مجھے ایک ٹھوس وجہ بتاؤ جس کی بنیاد پر تم نے اپنے لیے یہ پیشہ چنا ہے۔''

''میں گناہ کرنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں؟''

اس کے الفاظ نے عمر پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ اٹھا، اپنا والٹ اور سیل فون بستر پر رکھ دیا اور کچھ بھی کہے بنا باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ گر کر بہتے ہوئے پانی کی آواز صوفیہ تک آ رہی تھی۔

فرار ہونے کا ایک آخری موقعہ اسے مل گیا تھا۔ اگر وہ جوتوں سمیت چل کر باہر جاتی تو اونچی ایڑیوں سے ابھرنے والی آہٹیں اس لڑکے کے کانوں میں پہنچ جاتیں۔ تیزی سے نیچے جھکتے ہوئے وہ اپنے جوتے اتارنے لگی۔ دائیں پاؤں کے جوتے کے اسٹریپ میں سے ہک نہیں نکل رہا تھا۔ اس نے خاصی زور آزمائی کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تنگ آتے ہوئے اس نے اسٹریپ کو کھولنے کی کوشش ترک کر کے انگلیاں گھسا کر اسٹریپ کو کھینچتے ہوئے پاؤں کو سکیڑ کر بدقت جوتے سے باہر نکال لیا۔ دونوں جوتے ہاتھ میں لٹکائے وہ والٹ اٹھانے کی نیت سے بڑھی ہی تھی کہ وہ باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ، بازو اور پاؤں گیلے تھے اس نے صوفیہ کے ہاتھ میں دبے ہوئے جوتوں کو ایک نظر دیکھا پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''تم یہ سلیپر پہن لو۔'' اس نے سلیپروں کو پیروں سے الگ کرتے ہوئے ایک ٹھوکر سے انہیں اس کی جانب کھسکا دیا۔ ''جا کر وضو کر آؤ۔''

''کیا؟'' وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

اس نے اپنا والٹ اٹھا کر اس میں سے چند نوٹ نکالے اور صوفیہ کو دے دیئے۔ ''یہ تین سو ڈالر ہیں۔ انہیں گن لو اور جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ وضو کر کے آؤ۔''

صوفیہ نے نوٹوں کو گنے بغیر بے جان ہاتھ سے پرس میں ڈال لیا۔ ''مجھے نہیں پتہ تم کیا کرنے کو کہہ رہے ہو۔ وضو کیا ہوتا ہے؟''

''تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، وضو کیا ہوتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ تم نے سینکڑوں بار وضو کیا ہے۔''

اس کے الفاظ ہتھوڑے کی مانند صوفیہ کے اعصاب پر برسے تھے۔ اب خود کو مزید دھوکا دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس کے بارے میں ہر بات سے واقف تھا۔ پھندے کی جانب رہنمائی کرنے سے قبل وہ کب سے گھات لگائے ہوئے تھا۔

''تم کون ہو؟'' وہ اپنی آواز میں کپکپاہٹ کو چھپا نہیں پائی تھی۔

''میں عمر ہوں۔''

اسے کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ خود بخود اس کے پاؤں اسے باتھ روم کے اندر لے آئے۔ اس کی پشت پر دروازہ ایک ہلکی سی آہٹ کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ وہ واش بیسن کے سامنے کھڑی داغدار آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے منتشر حواس کو مجتمع کرتے ہوئے وہ تمام واقعات پر غور کرنے لگی۔

اس لڑکے نے اس کے متعلق تمام معلومات اکٹھی کرنے کے بعد اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ cop نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے یہ سب کھڑاگ پھیلانے کی حاجت نہیں تھی۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ماضی میں کبھی اس سے نہیں ملی تھی۔ ممکن تھا کسی دور میں وہ اسکول میں اس کے ساتھ پڑھتا رہا ہو یا...... سوچتے ہوئے اس نے خود کو ٹوک دیا۔ اس وقت اس شخص کو پہچاننا اصل مسئلہ نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ خود کو اس سے محفوظ رکھنا تھا۔ وہ کیوں اس امکان سے آنکھ چرا رہی تھی کہ وہ شخص کوئی جنونی قاتل ہو سکتا تھا۔ بعض سیریل کلرز

اپنے منتخب کیے ہوئے ہدف کے گرد گھیرا تنگ کرنے سے پہلے دنوں یا مہینوں اس کی نگرانی کیا کرتے ہیں۔ وار کرنے کے موزوں وقت کا انتظار صبر کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اس کی ماں ایک ایسے ہی جنونی کے ہاتھوں انجام کو پہنچی تھی اور اب وہ خود...... اس نے نل کو پوری رفتار سے کھول دیا تاکہ باہر موجود شخص مشکوک نہ ہو۔ دبے قدموں وہ دروازے کے پاس گئی اور اسے قفل لگانے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے کہ دروازہ باہر سے بند تھا جبکہ اندر سے اسے بند کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی اور خود کار تالا خراب تھا۔ اسے یہاں تک لانے والا کوئی اناڑی نہیں تھا۔ اس نے ہر طرح کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کمرہ دیکھنے کی آڑ میں وہ یہ ہی انتظام کرنے آیا ہوگا۔ اس نے پرس کو ٹٹول کر اس میں پیپر اسپرے (pepper spray) کی موجودگی کا اطمینان کیا جو اس نے کسی جارحیت سے نمٹنے کی خاطر پرس میں رکھ لیا تھا۔ حملہ آور کی آنکھوں میں دردناک جلن پیدا کرنے والے محلول کی دھار گرا کر اسے عارضی طور پر اندھا بنایا جا سکتا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اس کے جسم میں پھریری دوڑا دی۔ وہ یقیناً کسی دراڑ یا خفیہ درز میں سے اسے دیکھ رہا ہوگا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر واش بیسن کے پاس آ گئی۔ اگر اس وقت وہ اسے دیکھ رہا تھا تو اس کے وضو نہ کرنے پر کتنا ناخوش ہوگا۔ وہ اسے ناراض کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے وضو شروع کیا۔ وہ نہایت سست روی سے وضو کر رہی تھی۔ اسے سوچنے کے لیے مہلت درکار تھی۔ باتھ روم سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک روشندان تھا جس کی سلاخوں میں سے ایک بلی بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

وہ چہرے پر پانی بہانے لگی۔

یہ کمرہ موٹیل کی پانچویں منزل پر تھا اور اس منزل پر اسے کوئی ایک کمرہ بھی آباد نظر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی اس کے منصوبے کی ایک کڑی تھی۔ اس نے وہ کمرہ چنا تھا جس کے آس پاس آواز سننے والا کوئی نہ ہو۔

وہ سر کا مسح کر رہی تھی۔

ٹیلی فون خراب تھا یا اسے خراب کر دیا گیا تھا۔ وہ سیل فون سے نائن ون ون پر اطلاع دے سکتی تھی مگر پولیس کو یہ صورت حال سمجھانا کتنا دشوار تھا۔ پھر بھی جان گنوانے سے بہتر تھا کہ وہ پولیس کے سوالات کا سامنا کر لے۔

پاؤں دھونے کے علاوہ وضو مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے دایاں پاؤں اٹھا کر باتھ ٹب کے پھسلواں کنارے پر جمایا اور نل سے چلوؤں میں پانی بھر کر پیر دھونے لگی۔

''مجھے قتل کرنے کے لیے وہ کیا طریقہ اپنائے گا؟''

بائیں پاؤں پر پانی گراتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

''کیا اب میں دروازہ کھول دوں؟''

وہ اس کی بے بسی سے لطف لے رہا تھا۔ اگر وہ نفی میں جواب دیتی تو کیا وہ دروازہ بند ہی رہنے دیتا۔

''ہاں میں وضو کر چکی ہوں۔''

اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر پیپر اسپرے کی بوتل کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر وار کرنا چاہتی تھی۔

دروازہ کھل گیا اور اس نے پھرتی سے اسپرے والی بوتل کو باہر نکالنا چاہا۔ پر وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا تھا کہ دروازہ کھلنے پر پٹ کی آڑ میں آ گیا تھا۔ وہ ایک محتاط اور پیش بین لڑکا تھا۔ صوفیہ نے اس کی نظر سے بچتے ہوئے پرس میں سے ہاتھ کھینچ لیا اور آہستگی سے چلتی ہوئی اسی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں کمرے کے طول و عرض میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ کسی ایسی

شے کی کھوج میں تھی جس سے وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔
عمر اس کے قریب آیا اور اس کے گرد ہوا میں انگلی سے ایک دائرہ بنانے لگا۔
''میں جو کہوں گا، تمہیں میرے پیچھے اسے دہرانا ہوگا۔ حرف بہ حرف۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔'' عربی میں پڑھنے کے بعد اس نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔
صوفیہ نے بوکھلا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔
''ہاں پڑھو۔ ڈرو مت۔ اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''
صوفیہ نے اٹکتے ہوئے اس جملے کو دہرا دیا تھا۔
''کہو پناہ مانگتا ہوں میں صبح کے رب کی
شر سے ان چیزوں کے جو اس نے پیدا کیں۔''
صوفیہ کے لیے وہ الفاظ اجنبی نہیں تھے۔ وہ قرآن کے تیسویں پارے کی آخری دو سورتوں میں سے ایک کی ابتدائی آیات تھیں۔ اس نے تیسویں پارے کی کئی سورتیں حفظ کی تھیں مگر وہ ان کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ اس نے انہیں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں پڑھا یا سنا نہیں تھا۔
''شر سے ان چیزوں کے جو اس نے پیدا کیں۔''
عمر کی آواز میں بے پناہ سوز تھا۔ وہ اس کی تقلید میں آیتوں کو دہرانے لگی۔
''اور شر سے اندھیرے کے جب چھا جائے وہ
اور شر سے گرہوں میں پھونک مارنے والیوں کے''
اس کی گردن کی پشت پر رونگٹے اٹھنے لگے۔ وہ پہلی بار خدا کے کلام کو اس زبان میں سن رہی تھی جو اس کی سمجھ میں آتی تھی۔
''اور شر سے حاسد کے جب حسد کرے وہ''
اس کے بازوؤں پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''اور شر سے حاسد کے جب حسد کرے وہ۔''
اس کا روم روم بولنے لگا تھا۔
عمر نے ایک بار پھر تسمیہ پڑھ کر قرآن کی اختتامی سورت کا آغاز کیا۔
''کہو پناہ مانگتا ہوں میں انسانوں کے رب کی۔''
وہ کیوں اسے آیات سنا رہا تھا؟ کیا وہ اوجھا (عامل) تھا، اس پر کوئی عمل کر رہا تھا۔
''کہو پناہ مانگتا ہوں میں انسانوں کے رب کی
انسانوں کے بادشاہ کی
انسانوں کے معبود کی۔''
صوفیہ کی رگوں میں خون سرسراتے بھر رہا تھا۔ اس کی زبان اس کے اختیار میں نہیں تھی۔
''شر سے وسوسہ ڈالنے والے کے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔''
خون اس کی شریانوں میں وحشت سے اچھلتا اور گرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخی چھانے لگی۔
''جو وسوسے ڈالتا ہے انسانوں کے دلوں میں''
اس کی گردن کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ مرگی میں مبتلا کسی شخص کی طرح اس کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں مڑ کر

اکڑ گئی تھیں۔

''جو وسوسے ڈالتا ہے انسانوں کے دلوں میں'' عمر کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

''وہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے''

صوفیہ کسی معمول کی مانند پکار اٹھی۔ ''وہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے''

وہ چپ ہو گیا تھا۔ ساری کائنات چپ ہو گئی تھی۔ ہر شے ٹھہر گئی تھی۔ سانس، دھڑکن، نظر، وقت...... ہر چیز تھم گئی تھی۔

وہ کیفیت گزر گئی تو صوفیہ نے روہانسی آواز میں اس سے کہا تھا۔

''تم نے مجھ پر جادو کیا ہے؟''

''نہیں۔ یہ جادو کا توڑ ہے۔'' وہ ہتھیلی سے اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کر رہا تھا۔

''مجھ پر کوئی جادو نہیں ہوا پھر جادو کا توڑ کیوں۔''

''تم پر ہوا تھا لیکن تم جانتی نہیں۔ تم پر آگ سے پیدا ہونے والے نے جادو کیا تھا۔ اس نے تمہیں وسوسے کے جال میں الجھا دیا تھا۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں، وہ جادو ختم ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں اس کی پناہ میں دے دیا ہے جس کے جلال کے سامنے قوی سے قوی جادو بھی ناکام ہے۔ میں نے تمہارے گرد نور کا ہالہ قائم کر دیا ہے۔ اس ہالے کو پار کرنا کسی جادوگر کے بس میں نہیں۔''

صوفیہ نے اس کے پیروں کی چاپ کو لکڑی کے فرش پر گونجتے ہوئے سنا۔ اس نے گردن اٹھا کر دھندلی آنکھوں سے آس پاس دیکھا تھا۔

وہ باتھ روم میں واش بیسن پر جھکا آنسوؤں سے تر چہرہ دھو رہا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کر بھاگی اور باتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے اسے باہر سے مقفل کر دیا۔ پھر اس نے سر سے چادر اتار کر پھینکی، پرس اور جوتے ایک ہاتھ میں اٹھائے اور ایک لمحہ رکے بغیر کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ باتھ روم کے بند دروازے کے عقب سے آنے والی آوازوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دے رہی تھی۔ اسے اتنی فرصت بھی میسر نہ تھی کہ ٹھہر کر جوتے پہن لیتی۔ اس نے سوچا تھا کہ انہیں لفٹ کے اندر پہن لے گی۔

عمر بڑی دیر تک دروازے پر دستک دیتا رہا اور صوفیہ کو پکارتا رہا۔ اس نے روشندان کے نیچے کھڑے ہو کر آوازیں بھی دیں لیکن جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا اور وہ اس لاحاصل مشقت سے تھک گیا تو وہ باتھ ٹب کے خم دار کنارے پر بیٹھ گیا۔

صوفیہ کو آخر تو جانا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اسے روک کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے ٹب کی ٹھنڈی سطح پر ہاتھ پھیرا اور بازو لمبا کر کے اس نل کو بند کیا جس میں سے پانی کی پتلی دھار گر رہی تھی۔ جو اس کی طاقت کے دائرے میں تھا، اس نے کر دیا تھا۔ عمل کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اب دعا کرنے کا وقت تھا۔ دعا جو مقدر بدلتی ہے۔ دعا جو دل پھیر دیتی ہے۔ دعا جو معجزے کرتی ہے۔ لیکن اس کی دعا میں وہ اثر کہاں تھا۔ وہ یقین کے معرکے میں کئی بار پسپا ہو چکا تھا۔ وہ لڑنے سے پہلے ہی گھٹنے ٹیک دیتا تھا۔

''اس بار میں نہیں ہاروں گا۔ اب مجھ سے چوک نہیں ہو گی۔ میری دعا میں وہ یقین ہو گا جو شک کی آلائش سے پاک ہو گا۔ میری زبان جو کہے گی، میرا دل وہ مانے گا اور میری نظر اسے ہوتا ہوا دیکھے گی۔ میں تجھ سے اس انداز میں مانگوں گا کہ میری عاجزی تجھے پسند آ جائے۔ میرا گڑگڑانا تجھے بھا جائے۔ میں تجھ پر یقین کروں گا۔ ہاں میں تیری رحمت پر یقین کرتا ہوں۔''

حکیم بیگم نے کہا تھا دعا فرشتے کے پر جیسی کوری ہونی چاہیے۔ فرشتے کا پر کیسا ہوتا ہو گا؟ وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ اس کی آنکھ فرشتوں کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتی تھی۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ فرشتے کی ہیئت کیسی ہوتی ہے۔ ہاں اسے یہ معلوم تھا کہ وہ نور سے بنے ہیں۔ تو نور کیسا ہوتا ہے؟ وہ نور کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ نور کے تصور سے اس کے ذہن میں روشنی آتی تھی۔ دھلی ہوئی

سفیدی جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو۔کوئی داغ نہ ہو حتیٰ کہ آلودگی کا ایک ریزہ بھی نہ ہو۔ جو پاک ہے وہ نور ہے...... جو خالص ہے وہ نور ہے...... جو روشن ہے وہ نور ہے۔ اور نور سے خلق کیے گئے فرشتے کا نور سے بنا ہوا پر......''ویسی دعا مانگنی ہے مجھے۔''

اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ باتھ ٹب کے پیندے اور دیواروں پر پیلے دھبے، بھوری لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔ واش بیسن کے کنارے چکناہٹ زدہ اور لیس دار تھے۔ آئینے کی سطح پر چھوٹے بڑے داغ اور صابن کی جمی ہوئی چھینٹیں چپکی تھیں۔ کموڈ کے فلش ٹینک کا سرا ٹوٹا ہوا تھا اور اس میں سے مسلسل پانی گر رہا تھا۔ سامنے والی دیوار کی جڑ میں، جہاں جھاگ دار پانی ٹھہرا تھا، ایک تلچٹا رینگ رہا تھا۔ اس غلیظ جگہ پر اسے فرشتے کے پر جیسی دعا مانگنا تھی۔ یہاں اسے نور کا تصور کرنا تھا۔ اس گندگی کے ہوتے ہوئے نور؟ کیا ایسا ممکن تھا؟

''یہ گندگی رکاوٹ نہیں ہے۔ رکاوٹ میری نظر ہے۔ میں اس کی اطاعت نہیں کروں گا۔ اسے اپنے تابع کرلوں گا۔ اب میری رہنما نظر نہیں ہوگی، میں دل کو اپنا رہنما بناؤں گا۔''

اس نے پھر سے آنکھیں بند کیں اور دعا مانگنا شروع کی۔



وہ بس میں سوار ہو کر Watts میں ایک ایسے علاقے میں آ گئی جہاں hookers بھی روزمرہ استعمال کی اشیاء کی طرح بکتی تھیں۔ اس جگہ کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں رہنے والی صرف وہ عورتیں prostitution میں ملوث نہیں تھیں جو یا تو قبروں میں تھیں یا جیلوں میں۔ بس سے اتر کر مرکزی بازار کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اسے تین سیاہ فام اور دو مخلوط نسل کی عورتیں نظر آئیں جن کا حلیہ اور انداز چیخ چیخ کر ان کے پیشے کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ دکانوں کی نمائشی الماریوں میں سجے ہوئے روغنی پتلوں کی مانند سڑک کنارے اور دکانوں کے چبوتروں میں گڑی تھیں۔ ادھورے پہناوے، بھڑکتی ہوئی سجاوٹ۔ صوفیہ کو ان کے مقابلے میں اپنا حلیہ 'بے ضرر' اور بے کیف لگا۔ وہ جب تک زبان سے اظہار نہ کرتی، کوئی اسے ایک hooker ماننے پر تیار نہ ہوتا۔ اور اس بات نے اسے افسردہ کیا تھا۔

''اگلی دفعہ میں لباس کے انتخاب میں احتیاط برتوں گی۔'' اس نے خود کو باور کرایا تھا۔ اس نے اپنے سیل فون پر وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ ابھی اس کے پاس وافر وقت تھا۔ وہ گھوم پھر کر لوگوں کا مطالعہ کرنے لگی۔ ایک مدقوق چہرے والا پختہ عمر کا مرد سیٹی بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ وہ نظر میں آنے والی ہر عورت کو ہوس زدہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ نزدیک آنے پر صوفیہ نے قصداً اس کے کندھے سے کندھا ٹکرا دیا اور مسکراتے ہوئے معذرت کرنے لگی۔ وہ اس پر توجہ دیئے بغیر گزر گیا تھا۔ اسے حیرانی ہوئی تھی۔ کیا اس آدمی کی فطرت کے بارے میں اس نے غلط اندازہ لگایا تھا؟ سر جھٹکتے ہوئے وہ ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں گھس گئی۔ اندر زیادہ تر عورتیں تھیں۔ جو اکا دکا مرد تھے وہ یا تو اپنے کنبے والوں کے ساتھ تھے یا عمر کی اس منزل پر تھے جہاں انہیں نرس اور باورچن کے علاوہ عورت کے کسی روپ سے سروکار نہ تھا۔ کاؤنٹرز کے درمیان تھوڑی دیر آگے پیچھے چلنے کے بعد اس نے Sobranie کا ایک پیک نقد ادائیگی کر کے خریدا اور اسٹور سے نکل آئی۔ اس برانڈ کے سگریٹ اسے بہت پسند تھے لیکن ایک پیک کی قیمت چار ڈالر پچیس سینٹ ہونے کی وجہ سے وہ کبھی خریدنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ اسے جب بھی Sobranie سگریٹ درکار ہوتے، وہ انہیں چرایا کرتی تھی۔ آج پہلی دفعہ اس نے ان کی قیمت ادا کی تھی۔ اسے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر ٹھہر کر اس نے پیک کھولا اور ایک سگریٹ نکال کر اس کا سنہرا فلٹر ہونٹوں میں دبا لیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ایک طویل کش کھینچا تھا۔ نہایت نفیس تمباکو کا ذائقہ اسے تلخ اور کسیلا لگا تھا۔ اس نے دوسرا کش لیا اور اسے بھی ویسا ہی پایا۔ آج سے قبل کبھی Sobranie برانڈ

کے سگریٹ نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ بے دلی سے سگریٹ پینے لگی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے لگاتار تین سگریٹ پیے لیکن اس کا اعصابی تناؤ کم نہ ہوا۔ وہ اس کمرے اور اس لڑکے کے سحر سے نکل ہی نہ پا رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور اس کی باتیں رہ رہ کر اس کے اندر کلبلاتی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اسے فراموش کر دینا چاہتی تھی۔ اس کا تصور کسی جونک کی مانند اس کے دماغ کی نسوں میں پیوست ہو گیا تھا۔

''تم پر جادو ہوا تھا لیکن تم جانتی نہیں۔ تم پر آگ سے پیدا ہونے والے نے جادو کیا تھا۔''

اس نے جھنجھلا کر کر چوتھا سگریٹ، جو ابھی پورا خاکستر نہ ہوا تھا، فٹ پاتھ پر اچھال دیا اور ایک نیا سگریٹ جلا کر اس کے سرے سے پھوٹنے والے نیلگوں دھوئیں کو گھورنے لگی۔

''میں نے تمہیں اس کی پناہ میں دے دیا ہے جس کے جلال کے سامنے قوی سے قوی جادو بھی ناکام ہے۔''

اس نے اپنی تمام تر توجہ اس بھیڑ پر مرکوز کر دی جو ایک بار میں داخل ہو رہی تھی یا وہاں سے باہر آ رہی تھی۔ اس نے بار کے اندر جانے کا قصد کیا۔ وہاں وہ آسانی سے کلائنٹ ڈھونڈ سکتی تھی۔ رات کا باقی حصہ اسے وہ دہشت انگیز باتیں یاد کرتے ہوئے نہیں گزارنا تھا۔ وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آ گئی۔ پہلے قدم پر ہی ایک آواز اس کے تن سے لپٹ گئی۔

''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی

انسانوں کے بادشاہ کی

انسانوں کے معبود کی''

اس کا پاؤں ہوا میں معلق رہ گیا۔

''میں نے تمہارے گرد نور کا ہالہ قائم کر دیا ہے۔ اس ہالے کو پار کرنا کسی جادوگر کے بس میں نہیں۔''

وہ آواز اس کی پسلیوں کو بھینچ کر اس کا دم گھونٹ رہی تھی۔

''دفعہ ہو جاؤ۔ میری جان چھوڑ دو۔'' اس نے یوں ہوا میں ہاتھ چلایا جیسے ان دیکھی چیزوں کو دور بھگا رہی ہو۔

''نور کا ہالہ.....'' وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

میں بھی کس کی باتوں میں آ گئی ہوں۔ شعبدہ باز تھا۔ ڈھونگی۔ نوٹنکی کرنے والا۔

''نور کا ہالہ۔'' وہ اتنے زور سے ہنسی کہ اسے کھانسی آ گئی۔

ایک ابھری ہوئی توند والا میکسیکن اس سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے چھوٹی سی بوتل ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا اور وقفے وقفے سے اس میں سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ صوفیہ ایک ادا سے چل کر اس کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کا سر اس کے بھاری جسم کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹا تھا، ماتھے کی کھال میں باریک نیلی نسیں پروئی ہوئی تھیں اور آنکھوں کی نیچے سیاہ تھیلیاں بنی تھیں۔

''اگر تم ایک سو bucks خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہارا وقت بہت عمدگی سے کٹ سکتا ہے۔''

میکسیکن نے بوتل منہ سے الگ کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

''وضاحت سے کہو کیا چاہتی ہو۔''

''تم ایک سمجھدار آدمی دکھائی دیتے ہو۔ پھر بھی وضاحت مانگ رہے ہو۔'' اس نے ذو معنی لہجہ اختیار کیا۔

''اگر میں تمہاری آنکھوں میں الکوحل پھینک دوں تو تمہیں کتنی تکلیف ہوگی۔''

میکسیکن کی بے سر وپا بات اس نے تعجب سے سنی تھی۔

''تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں کو ایسی ہی تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھ پر رحم کھاتے ہوئے فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں

تمہاری مکروہ شکل مجھے قے کرنے پر مجبور نہ کر دے۔''

صوفیہ کے ہونٹ نیم وا ہوئے اور سگریٹ پھسل کر زمین پر جا گرا۔

وہ شخص رخ پھیر کر دوسری سمت دیکھ رہا تھا۔صوفیہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ایک گفٹ شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے قد آدم آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آیا تھا۔غیر ارادی طور پر ٹھٹک کر وہ خود کو دیکھنے لگی۔اس چمکتے ہوئے آئینے میں وہ اتنی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی کہ وہ دیر تک اپنے عکس سے نظر نہیں ہٹا سکی۔

شاید اس نے ایسی قیمت طلب کی تھی جو اس علاقے کے حساب سے بہت زیادہ تھی اور یقیناً وہ شخص نشے میں بھی تھا۔اس نے خود کو دلاسہ دیا اور نئے سرے سے کلائنٹ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی۔

دھرتی ایک سرمئی بانات کی مانند بچھی تھی اور رات ایک مشک فام نرتکی تھی جو اس سرمئی بانات پر جچے تلے قدموں سے ناچتی تھی۔روشنیوں کے زیورات سے سجی،خوشبوؤں میں بسی اس شیام رنگ رقاصہ کے ہر غمزے میں ایک بھید تھا۔

شہر اس کے کانوں میں شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتا تھا۔اس مصروف سڑک پر وہ یوں قدم گھسیٹ رہی تھی جیسے اس کے پاؤں گیلی روئی سے بنے ہوئے ہوں۔

بار سے نکلتے ہوئے تین کورین لڑکوں کو دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔جب وہ قریب پہنچے تو اس نے اپنی دلکش ترین مسکراہٹ چہرے پر تانی اور مخمور آواز میں پکار کر انہیں متوجہ کیا۔

''کیا ارادہ ہے......؟ایک گھنٹے کے پچاس bucks۔خیال برا نہیں......کیا سوچتے ہو؟''

وہ چند ثانیے خاموشی سے اسے گھورتے رہے پھر ان تینوں نے آپس میں سوالیہ نظروں کا تبادلہ کیا اور اتنی شدت سے ہنسے کہ ان کی چندھی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

''اگر پچاس اپنی جیب سے ہمیں دو پھر بھی تم مہنگی ہو۔''

ان میں سے ایک زرد رو لڑکے نے،جس کے دانتوں پر بریسز braces لگے تھے ہنسی کے دوران بمشکل کہا۔

''تم ہار رفلموں میں قسمت آزماؤ۔''وہ بے تحاشا ہنستے چلے گئے تھے۔

وہ بت بنی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

یہ دوسری بار ہوا تھا۔

اس چربیلے میکسیکن نے بھی اسے بدصورت کہہ کر دھتکار دیا تھا اور تب اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا کہ وہ نشے میں تھا لیکن کورین لڑکوں نے بھی وہی بات کہی تھی،اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور دیر تک اپنے عکس پر نظریں جمائے رہی۔کہیں کچھ غلط نہیں تھا۔وہی آنکھیں،وہی ہونٹ،ویسی ہی رنگت،اس کے سارے نقوش ہمیشہ کی طرح ہی تھے۔پھر اس کے ساتھ دو بار ایسا کیوں ہوا تھا۔

کیا اس کی سماعت اسے دھوکہ دے رہی تھی؟یا شاید وہ خود نشے میں تھی۔مگر کس شے کا نشہ......ان پانچ سگریٹوں کا جو پچھلے ایک گھنٹے میں اس نے پھونک ڈالے تھے۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔چھٹا سگریٹ سلگا کر اس نے ایک گہرا کش لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈھلتی عمر کے ہسپانوی مرد سے مخاطب تھی،جو پارکنگ لاٹ سے گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

''بیس bucks جواب دینے سے پہلے سوچو کہ اس سے کم میں تم کیا خرید سکتے ہو۔شاید چند ہاٹ ڈاگ۔''

کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

وہ خاموش رہا اور ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

''پندرہ۔''

اس نے ایک کوشش اور کر دیکھی۔

''اگر تم دنیا کی آخری عورت ہو تو بھی میرا جواب ناں میں ہوگا۔ تم نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ تم عورت نہیں عفریت ہو۔''

اس پر گویا کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ خوف میں بدل رہی تھی۔

گنجے جرمن اور اس کے ایشیائی ساتھی کے پاس جاتے ہوئے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔

''دس bucks تم دونوں کے۔''

''Hássliche Fratze۔'' جرمن نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''اس نے کیا کہا ہے؟'' اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ چلائی تھی۔

''وہی جو تم ہو۔'' ایشیائی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''ڈراؤنا چہرہ۔''

اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اس کے کانوں میں ناقوس بجا رہا تھا۔

''......Hássliche Fratze......ڈراؤنا چہرہ......عفریت۔''

وہ بھاگتے ہوئے سڑک کے پرلے کنارے پہنچی اور لوگوں کے چہروں کو کھوجنے لگی۔ وہاں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر عمر کے مرد تھے مگر اسے ایک بدصورت مرد کی تلاش تھی، جس کی شکل اتنی گھناؤنی ہو کہ کوئی عورت پیار کرنا تو کجا ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتی ہو۔ پھر وہ اسے مل گیا تھا۔

وہ ایک سیاہ فام تھا، جس کا ہونٹ نصف سے زائد کٹا ہوا تھا اور اوپری جبڑے کے پیلے دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں ایک پھریری دوڑ گئی تھی۔ وہ گفٹ شاپ کے دروازے میں کھڑا ونڈ چائمز کو اپنے بھدے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے چھیڑ رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی اس نے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔

''تمہارے لیے صرف پانچ bucks......'' حروف اس کے تالو سے چمٹ گئے تھے۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔ اس کٹے ہوئے ہونٹ نے ایک ابدی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چسپاں کر رکھی تھی۔

''ایک بات ایمانداری سے بتاؤں۔'' اس نے سانس روک لیا تھا۔

''میں نے اتنا خوفناک چہرہ اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔''

وہ دوبارہ ونڈ چائمز سے کھیلنے لگا تھا۔

وہ کسی کافکائی کابوس (جرمن مصنف فرانز کافکا کے تخلیق کردہ دہشت ناک خواب) میں مبتلا تھی اور اس بھیانک خواب کا کوئی اختتام نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ کر کاؤنٹر پر پہنچی اور سیلز گرل کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر چلانے لگی۔

''مجھے دیکھو کیا میں بدصورت ہوں۔ دیکھو میرا چہرہ کیا تمہیں مجھ سے خوف آ رہا ہے۔''

''دفع ہو جاؤ...... باؤلی کتیا۔''

وہ اس سے اپنا بازو چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔

''شراب پینے سے پہلے خود کو کمرے میں بند کر لیا کرو۔''

''اس شہر کا سب سے بدصورت مرد مجھے بدصورت کہتا ہے۔ اسے دیکھو کیا وہ اس قابل ہے کہ کوئی عورت اس کے قریب

جائے۔وہ مجھے بدصورت کہتا ہے۔''

''یہ واہیات مذاق کرنے کے لیے تمہیں میں ہی ملی ہوں۔کیا میں نہیں جانتی وہ ریمنڈ مادرزاد (پیدائشی) اندھا ہے۔''

اسے لگا جیسے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا ہو۔وہ گھٹنوں کے بل فرش پر ڈھے گئی تھی۔اس کا پورا بدن یوں لرزتا تھا جیسے آندھی کی زد میں آیا ہوا خشک گھاس کا تنکا۔

''اس نے مجھ پر جادو کیا ہے اور کہتا ہے میں جادو کا توڑ کر رہا ہوں۔وہ میرا دشمن ہے اور کہتا ہے ''ڈرو نہیں۔'' میں کیوں نہ ڈروں؟ وہ دشمن ہے۔کھلا دشمن......''

وہ سسکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔



ماریو کی نظر دروازے سے اندر آتے اوٹو اور عبدل پر پڑی تو اس نے جوش سے اپنی ران پر ہاتھ مارا تھا۔ ”شکر ہے وہ دونوں پہنچ گئے ہیں۔“

رافیل نے، جو گلاس سے چسکیاں لے رہا تھا، اس اطلاع پر گلاس رکھتے ہوئے گردن گھما کر دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا۔

”مجھے تو یقین ہو چلا تھا کہ آج رات کا پروگرام تہس نہس ہو جائے گا۔ ان لوگوں کو دس منٹ کی مزید تاخیر ہو جاتی تو میں لازماً گھر جا چکا ہوتا۔“

عبدل اور اوٹو ان کے ہاتھ ہلانے پر سیدھے ان کے پاس آئے تھے۔ حال احوال دریافت کرنے اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ بار کے سامنے رکھے ہوئے اسٹولز پر بیٹھ گئے۔

”تم دونوں اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ کیا بھول گئے تھے؟“ رافیل نے عبدل اور اوٹو کو دیکھتے ہوئے بھنوئیں اچکائیں۔

”سب اس جرمن کا قصور ہے۔“ عبدل نے تمبا کو گزیدہ دانتوں کی نمائش کی ”اس نے کہا کہ آج ایک شارٹ کٹ سے لے کر جاؤں گا اور وہ شارٹ کٹ شیطان کی آنت نکلا راستے میں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔“

اوٹو بالوں سے عاری سر پر ہاتھ گھماتے ہوئے بولا ”قصور تو ہمیشہ جرمنوں کا ہی ہوتا ہے۔ ہٹلر کی ماں نے اسے پیدا کیا۔ وہ بھی تو جرمن تھی۔“

چاروں نے قہقہہ لگایا پھر ماریو نے اوٹو کی آنکھوں کے سامنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں نچائیں اور لفظ چباتے ہوئے بولا۔

”تمہاری حس مزاح کی خوبی کے ہم قائل ہوئے مگر اتنی سی تصحیح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہٹلر کی ماں آسٹرین تھی، جرمن نہیں۔“

اوٹو جلد شرمندہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنس دیا۔ ”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہٹلر کے اتنے بڑے مداح ہو کہ اس کی ماں کا برتھ سرٹیفکیٹ تک دیکھ رکھا ہے۔“

عبدل نے دونوں بازو ہوا میں معلق کر کے انہیں بلندی پر ساکت کر دیا۔ ”مسٹر ایڈولف ہٹلر کے اعزاز میں پھر کبھی محفل جمائیں گے۔ بارہ بجنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ آج کے لیے منصوبہ کیا ہے؟ پہلے اس کی تفصیلات طے کر لیں۔“

”وہ تو رافیل ہی بتا سکتا ہے۔“ ماریو نے کہا اور وہ تینوں مشتاق نظروں سے رافیل کو دیکھنے لگے۔ وہ اس گروہ کا غیر اعلانیہ گرو تھا۔ ”منصوبہ“ ہمیشہ وہی تیار کیا کرتا تھا۔

رافیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکی تھی۔ ”میں سوچ چکا ہوں۔ لیکن تھوڑا پینا پلانا ہو جائے، اس کے بعد بتاؤں گا۔“

سب نے بارٹینڈر کو اپنے پسندیدہ کاک ٹیلز تیار کرنے کو کہا۔ جب ان کے گلاس آ گئے تو ماریو نے گلاس والا ہاتھ اونچا کرتے ہوئے پوچھا۔

”آج کا جام کس کے نام ہونا چاہیے؟“

''ہٹلر کے نام۔'' اوٹو نے برجستہ کہا تھا۔

چاروں نے ہنستے ہوئے ایک ہی وقت گلاس منہ سے لگائے تھے۔

ان کی ملاقات ایک دلچسپ اتفاق کا شاخسانہ تھی۔ چند سال پہلے وہ چاروں ایک امیوزمنٹ پارک کی لفٹ میں ایک دوجے سے متعارف ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور لفٹ میں ان چار افراد کے سوا کوئی اور نہ تھا کہ اچانک لفٹ رک گئی۔ وہ سب پریشان ہو گئے۔ وہ دو منزلوں کے درمیان اٹکے ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد مائیکروفون پر ایک آواز نے اعلان کیا کہ ''کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے لفٹ جام ہو گئی، لہٰذا انہیں باہر نکالنے کے لیے امدادی کارکنوں کو بلوایا جا رہا ہے۔''

کئی منٹ گزر گئے اور کچھ بھی نہ ہوا، حتیٰ کہ ہلکی سی آہٹ بھی نہ ابھری۔

''میرا اندازہ ہے کہ جس لفٹ سے امدادی گروہ کے کارکن ہم تک آرہے تھے، وہ بھی خراب ہو گئی ہے۔''

گنجے جرمن نے اونچی آواز میں کہا تو کوئی بھی مسکرایا نہیں۔

''میرے اس جملے پر تم لوگوں کو ہنسنا چاہیے تھا، کیونکہ یہ ایک مزاحیہ بات تھی۔ کیا تم میں سے کوئی واقف ہے کہ مزاح کیا ہوتا ہے؟'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

اسی پل دوبارہ وہ آواز گونجی۔ ''ہم معذرت خواہ ہیں۔ امدادی ٹیم کی گاڑی کو سڑک پر حادثہ پیش آگیا ہے۔ اس لیے آپ لوگوں کو تحمل سے کام لینا ہوگا۔ ہم جلد ہی آپ کو بحفاظت باہر نکال لیں گے۔''

• جرمن نے باری باری سب کو جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میکسیکن کی ہنسی چھوٹ گئی اور دیکھا دیکھی سب ہی ہنسنے لگے۔

''پتا نہیں کتنا وقت ہمیں یہاں قید رہنا پڑے تو کیوں نہ آپس میں تعارف حاصل کیا جائے۔''

جرمن کی تجویز سے سب نے اتفاق کیا تھا۔

جرمن کا نام اوٹو تھا، وہ ایک بینک کے پے رول سیکشن میں ملازم تھا۔ بنگالی عبدل بھی اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور وہ دونوں تفریح کی غرض سے آج اس پارک میں آئے تھے۔ رافیل میکسیکن تھا۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کری ایٹو رائٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔

''میں اپنی گرل فرینڈ کے ہمراہ آیا تھا اور پارک میں اچانک مجھے اپنی بیوی اور اس کا بھائی نظر آگئے۔ اس وقت مجھے لفٹ میں چھپنے کے سوا اور کچھ نہیں سوجھا...... تو اب میں تمہارے سامنے ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

چوتھے فرد کا تعلق اسپین سے تھا۔ اس کا نام ماریو تھا اور وہ اپنے کسی جاننے والے سے ملنے کے لیے پارک میں آیا تھا۔

قریب آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد اچانک لفٹ میں برقی رو بحال ہو گئی اور ان کا استقبال پارک کی انتظامیہ نے بڑے والہانہ پن سے کیا۔

''تاریخ دیکھیے۔ اپریل کا اولین دن شروع ہو چکا ہے۔ اپریل فولز ڈے۔ یہ ایک پریکٹیکل پرینک (عملی مذاق) تھا۔ امید ہے آپ اس سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔''

جب انہیں حقیقت کا علم ہوا تو وہ چاروں بہت ہنسے تھے۔ وہیں سے ان میں دوستی ہوئی اور انہوں نے ایک معمول ترتیب دیا کہ وہ ہر سال اکتیس مارچ کی رات بارہ بجے سے قبل ایک جگہ اکٹھے ہوتے اور کوئی زبردست پرینک کسی اجنبی پر آزماتے۔ وہ ہمیشہ Watts میں واقع اسی بار میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک تو یہاں hookers کی کثرت تھی اور دوسرے یہ رافیل کا انتخاب تھا اور رافیل کی بات وہ سب مانتے تھے۔ وہ ان کا سربراہ تھا۔ آج کی محفل بھی اسی تسلسل کی کڑی تھی اور اب رافیل اپنا منصوبہ بیان کر رہا تھا۔

''اس دفعہ مجھے ایک بڑا ہی انوکھا خیال سوجھا ہے۔ ہم کسی خوبصورت عورت کو یقین دلائیں گے کہ وہ بدصورت ہے۔''

''کوئی بدصورت عورت خود کو بدصورت ماننے پر آمادہ نہیں ہوتی تو خوبصورت عورت خاک مانے گی۔'' حسب عادت اوٹو نے ٹانگ اڑائی تھی۔

''اسی مشکل میں تو سارا مزہ ہے۔ ہم اسے اس طرح سے گھیریں گے کہ وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز ہی نہ کر پائے گی۔''

''اور ایسی عورت ملے گی کہاں؟'' ماریو نے سوال اٹھایا۔

''کوئی hooker۔ وہ سب سے آسان ہدف ثابت ہوں گی۔ کیونکہ ان سے مخاطب ہونا سہل ہے اور کسی زیادہ سخت رد عمل کا امکان تقریباً ناپید ہے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ پرینک ہمارے تمام سابقہ کارناموں سے بڑھ کر دلچسپ ہوگا۔''

تین کورین لڑکے جو بار کے نزدیک ترین میز پر براجمان تھے اٹھ کر ان کے پاس آ گئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ان میں سے ایک بریسز لگے دانتوں والے لڑکے نے گرمجوشی سے کہا۔

''کیا ہم تمہارے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں؟ ہم نے تمہارا پلان سنا ہے اور یہ باکمال ہے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' رافیل نے فوراً کہا۔ ''جتنے زیادہ لوگ ہوں گے، اتنا ہی زیادہ رنگ جمے گا۔ میں تمہیں منڈلی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

اندھا سیاہ فام ریمنڈ جو ایک طرف خاموشی سے بیٹھا ان کی بات چیت سن رہا تھا اچانک بولا۔ ''مسٹر رافیل! میری بھی ایک درخواست ہے۔''

رافیل کئی سال سے اسے جانتا تھا۔ وہ پیدائشی اندھا تھا اور اس بار کے قریب بنی ہوئی ایک گفٹ شاپ کی مالک اس کی خالہ زاد تھی۔ دن کا بیشتر حصہ وہ گفٹ شاپ اور اس بار میں گزارا کرتا تھا۔ رافیل چونکہ Watts کا رہائشی تھا اور ہر ہفتے کی شام کو اس بار میں باقاعدگی سے آیا کرتا تھا تو اس کا سامنا ریمنڈ سے ہوتا رہتا تھا۔ ریمنڈ کا وتیرہ تھا کہ وہ کبھی اپنی جیب سے نہیں پیتا تھا۔ بار میں آنے والے گاہکوں میں سے کسی نہ کسی سے عارضی دوستی گانٹھ کر وہ ڈرنکس حاصل کرتا تھا۔ رافیل بھی اس کے ایسے ہی ''دوستوں'' میں شامل تھا۔

''کہو ریمنڈ! ڈرنک دلانے کے علاوہ کوئی درخواست ہے تو ضرور کرو۔'' رافیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں بھی اس مذاق میں عملی کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا، لیکن تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ کوئی عورت خوبصورت ہے یا نہیں۔ تم تو انتہائی اندھے آدمی ہو۔'' رافیل نے اسے چھیڑا تھا۔

''وہ جتنی بھی بری شکل کی ہو، کم از کم مجھ سے تو بہتر ہوگی۔'' اس نے کٹے ہوئے ہونٹ کو اوپر چڑھاتے ہوئے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

سب نے اس کی حاضر دماغی پر داد دی تھی۔

''آج جو بھی عورت مجھے مخاطب کرے گی، میں اسے یقین دلا دوں گا کہ وہ دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہے، کیسا مزہ آئے گا۔'' ریمنڈ نے سیاہ چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے زبان سے پٹاخہ بجایا۔

''جو عورت تمہیں مخاطب کرے، اسے تو واقعی خوبصورت کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ اس سنگین جرم کی سزا اسے ملنا ہی چاہیے۔'' اوٹو نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

''اوٹو! اب بکواس کا سلسلہ ختم کرو۔ دیکھو پورے بارہ ہو گئے ہیں۔'' رافیل اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں ایک

ہی عورت کو نشانہ بنانا ہے اور اسے میں چنوں گا۔ تم لوگ بار سے نکل کر مختلف جگہوں پر ٹھہر جاؤ۔ اور مجھ پر نظر رکھو۔ جیسے ہی میں شروعات کروں، تم لوگ بقدر توفیق ناٹک میں رنگ بھرتے جانا۔'' وہ ہدایات جاری کرتا ہوا ان سے الگ ہو کر باہر آیا اور ایک ایسی جگہ دیوار سے کمر جوڑ کر کھڑا ہو گیا، جہاں سے وہ بار کے داخلی دروازے اور اردگرد کے مقامات کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وقت گزاری کی غرض سے اس نے جیب سے liquor کی چھوٹی بوتل برآمد کی اور اس میں سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک لڑکی نے اس کے قریب رکتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''اگر تم ایک سو bucks خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہارا وقت بہت عمدگی سے کٹ سکتا ہے۔''

اگر وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے گزر جاتی تو رافیل کبھی اندازہ نہ لگا پاتا کہ وہ hooker تھی۔ اپنے حلیے سے وہ کالج کی طالبہ نظر آتی تھی اور وہ اتنی حسین تھی کہ اس سے سخت برتاؤ کرتے ہوئے رافیل کو تاسف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوئی دوسری رات ہوتی تو......

''مجھ پر رحم کھاتے ہوئے فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں تمہاری مکروہ شکل مجھے قے کرنے پر مجبور نہ کر دے۔'' دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے رکھائی سے کہا تھا۔

وہ الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر بددل ہو کر رخصت ہو گئی تھی۔

رافیل نے اسے گفٹ شاپ کے آئینے کے سامنے کھوئی ہوئی کیفیت میں کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو شاباش دی تھی۔ لڑکی نے اس کی کہی ہوئی باتوں کا اثر قبول کر لیا تھا۔ جب وہ بار کی طرف جانے لگی تو رافیل نے بار کے دروازے میں ایستادہ کورین لڑکوں کو ہاتھ ہلا کر خبردار کیا اور اشارے سے اس لڑکی کی نشاندہی کی۔ وہ تینوں بیک وقت حرکت میں آئے تھے اور انتہائی فطری انداز میں چلتے ہوئے لڑکی کے مقابل آ گئے تھے۔ ان کے درمیان کچھ جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ رافیل نے کورین لڑکوں کے اعتماد کو دل میں سراہا تھا۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ ذرا بھی گھبرائے ہوئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ وہ لڑکی جب ان سے علیحدہ ہوئی تو واضح طور پر صدمے کے زیر اثر لگ رہی تھی۔ اب اس کا رخ پارکنگ لاٹ کی جانب تھا۔ رافیل نے پھرتی سے سیل فون نکالا اور پیغام لکھنے لگا۔

''وہ پارکنگ ایریا میں آ رہی ہے۔ تم اپنی کار نکال کر اس کے راستے میں آ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

اس نے پیغام ماریو کے نمبر پر ارسال کر دیا۔ وہ دیکھ نہیں سکا کہ ماریو اس سے ٹکرایا تھا یا نہیں۔ البتہ جب وہ دوبارہ سڑک پر دکھائی دی تو پہلے سے بڑھ کر بدحواس تھی۔

اوٹو اور عبدل ایک گوشے میں موجود اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ رافیل کے اشارے پر وہ تیزی سے چل کر لڑکی کے سامنے آ گئے اور تب وہ ہوا جس سے رافیل پیشگی ڈر رہا تھا۔ اوٹو نے لڑکی کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ وہ اکثر ایسی بھونڈی حرکتیں کیا کرتا تھا۔ وہ میونخ میں اپنے طالب علمی کے دور میں ڈرامہ سوسائٹی کا صدر رہا تھا اور بزعم خود ایک پیدائشی فنکار تھا۔ اسے اپنی ''بے بہا'' اداکارانہ صلاحیتوں پر بڑا ناز تھا۔

اسے اوٹو پر غصہ آیا تھا۔ لڑکی مشتعل ہو کر ہنگامہ برپا کر سکتی تھی اور وہ ایسی بدمزگی کا ہرگز خواہاں نہیں تھا۔ لیکن اس کے خدشات بے بنیاد نکلے تھے۔

وہ hooker پاگلوں کی طرح ادھر ادھر چکرانے لگی تھی اور اسے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ وہ پوری طرح ان کے بچھائے ہوئے دام میں پھنس چکی تھی، پھر کھیل میں ایک غیر متوقع موڑ آیا۔ اس نے حواس باختہ لڑکی کو گفٹ شاپ میں گھستے اور ریمنڈ کے پاس رکتے ہوئے دیکھا تھا۔ رافیل کے حلق سے ایک قلقاری نکل گئی، کیونکہ ریمنڈ تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ وہ لڑکی کاؤنٹر کے قریب زمین پر گر کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آج تک ان کا کوئی پرینک اتنے شان دار طریقے سے کامیاب نہیں ہوا تھا۔ رافیل نے اپنے

ذہن رسا کو ایک فخر بھری تھپکی دی تھی۔

دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے وہ آٹھ افراد انجان تھے کہ وہ احمقوں کے عالمی دن کی کوئی رسم نبھانے وہاں یکجا نہیں ہوئے تھے، انہیں کسی کی دعا نے اس مقام پر بلایا تھا اور وہ کسی کی بقا کی جنگ کے بے خبر سپاہی تھے۔

✠ ✠ ✠

وہ میٹرو اسٹیشن پر تھی جب اس کے سیل فون پر وہ کال آئی۔ متعجب ہوتے ہوئے اس نے وہ اجنبی نمبر دیکھا تھا۔ وقت معلوم کرنے اور گیم کھیلنے کے سوا اس کے سیل فون کا کوئی مصرف نہ تھا اور بعض اوقات وہ سنجیدگی سے سوچنے لگتی تھی کہ اس نے سیل فون رکھا ہی کیوں ہوا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے فون کان سے لگالیا۔

''صوفیہ! یہ میں ہوں۔''

اسے بجلی کے ننگے تار نے چھولیا۔ وہ مرتے دم تک اس آواز کو نہیں بھول سکتی تھی۔

''میں عمر ہوں صوفیہ! تم کہاں ہو؟''

وہ اس کے نام سے بھی واقف تھا۔ وہ اور کیا کیا جانتا تھا؟

اس نے کال کاٹ دی اور سہمی ہوئی نظروں سے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ کیا وہ اسی اسٹیشن پر کہیں موجود تھا؟ اس سے کوئی بھی امید کی جاسکتی تھی وہ کوئی عام انسان تو نہیں تھا۔

گھنٹی دوبارہ بج رہی تھی۔ پھر وہی نمبر اسکرین پر جلتا اور بجھتا تھا۔ اس نے لرزتی انگلی سے کال ریجیکٹ کردی۔ کچھ لمحوں کی تاخیر سے پھر کال آنے لگی۔ اس نے اسکرین دیکھے بغیر سیل فون آف کردیا تھا۔

تمام سفر میں اسے یہ وہم ستاتا رہا تھا کہ کوئی اسے گھور رہا تھا۔ وہ چونک چونک کر ساتھی مسافروں کو دیکھتی رہی تھی۔ پزا پارلر میں کام کرتے ہوئے بھی یہ احساس اس پر حاوی رہا۔ جب وہ پارلر کے کچن میں استعمال شدہ پلیٹوں کو ڈش واشر میں ڈال رہی تھی تو ایک پزا ڈیلیوری بوائے نے اس سے سیل فون مانگا تھا۔ اسے کہیں بات کرنا تھی اور اس کا اپنا فون بلندی سے گر کر خراب ہوگیا تھا۔ وہ اسے فون لوٹانے آیا تو اس کی رنگ ٹون گونج رہی تھی۔

''ایک نمبر سے مسلسل کال آرہی ہے۔ لو بات کرلو۔''

صوفیہ نے اس سے فون لے لیا اور ایک نگاہ چمکتے ہوئے ہندسوں پر ڈالی۔ پھر وہ کچن کے دروازے سے گزر کر عقب گلی میں آگئی۔ اس نے فون والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور فون کو ایک کچرا دان میں اچھال کر واپس مڑگئی۔ رنگ ٹون کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

✠ ✠ ✠

ابھی وہ گھر کے دروازے سے دور ہی تھی کہ اسے اپنا خوف مجسم شکل میں نظر آیا۔ وہ اس سائبان کے نیچے کھڑا تھا جس پر مٹے مٹے حروف میں ''گرانٹ اور البا کا اوون'' لکھا ہوا تھا۔ وہ عمر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کے بدترین شکوک سچ ہوگئے تھے۔

وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا؟ آخر وہ اس سے چاہتا کیا تھا، وہ اپنی پوری زندگی میں کسی سے اتنی خائف نہیں ہوئی تھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اتنے فاصلے سے وہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سن پائے گا تو وہ ناک کی

سیدھ میں دوڑنے لگی۔ وہ پیچھے دیکھے بنا بھاگتی رہی، یہاں تک کہ رہائشی عمارات کا اختتام ہوگیا۔ وہ رک کر سانس درست کرنے لگی تھی۔

''میں کیا کروں؟ کہاں چھپ جاؤں؟ وہ مجھے ہر جگہ سے ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ میری جان لیے بنا دم نہیں لے گا۔''

اب اسے اس گھر میں نہیں رہنا تھا۔ اسے فٹ پاتھ پر سونا منظور تھا لیکن وہ اس گھر کے قریب سے گزر تک نہیں سکتی تھی، جس کی دہلیز پر اس جادوگر کے قدم پڑ چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ وقتی طور پر ویٹرسز کی اس ٹولی کے ساتھ رہ لے گی جو ایک پے انگ گیسٹ کی تلاش میں تھی۔

✠ ✠ ✠

''سنو عمر! کیا تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟'' گرانٹ نے کراہ کر اسے پکارا تھا۔

''نہیں'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''تمہیں مجھ پر غصہ آتا ہے؟''

''نہیں۔'' عمر نے اسی انداز میں کہا تھا۔

''کیوں نہیں؟ غصہ تو ضرور آنا چاہیے۔ کیا میں اس لائق بھی نہیں ہوں کہ تمہیں مجھ پر غصہ آئے۔'' گرانٹ جانے اس سے کیا کہلوانا چاہ رہا تھا۔

''مجھے آپ پر غصہ کیوں آئے گا؟''

''کیونکہ میں نے تمہیں باپ سے محروم کر دیا۔ تمہاری ماں کی زندگی برباد کر دی۔ کیا غصہ آنے کے لیے یہ وجوہات ناکافی ہیں؟''

''میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔ بلکہ آپ سے ملنے سے پہلے میں نے آپ کے متعلق کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔''

''میری اتنی تذلیل نہ کرو۔ کم از کم مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔'' گرانٹ نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ گزشتہ رات سے اس کا سانس اکھڑا ہوا تھا اور اسے بولنے میں دشواری ہوتی تھی۔

''آپ سو جائیں۔ باتیں کر کے خود کو تھکائیں مت۔''

''اس amnesia (نسیان) کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو میں یاد رکھنا چاہتا ہوں وہ بھول جاتا ہے اور جو بھولنا چاہتا ہوں وہ یاد رہتا ہے۔'' اس نے ہچکی بھرتے ہوئے ویران آنکھوں سے عمر کو دیکھا تھا۔

''مجھے موت سے خوف آتا ہے۔''

''آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ ایک لمبی زندگی جئیں گے۔ میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔'' عمر نے ایک ملائم مسکراہٹ سے اسے دلاسا دیا تھا۔

''تم میرے لیے دعا کیوں کرو گے؟''

''کیوں کہ میں آپ سے...... میں آپ کو صحت یاب دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے رکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''لیکن تم مجھ سے پیار تو نہیں کرتے ناں۔ جب پیار نہیں ہے تو دعا بھی نہ کرو۔''

عمر خاموشی سے سنتا رہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ میں مرنے والا ہوں۔ مجھے موت سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''موت کوئی ہیبت ناک شے نہیں ہے یہ تو سفر میں آنے والا ایک پڑاؤ ہے جیسے پیدائش، بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے ان منازل سے نہیں گزرتا۔ اسے گزار دیا جاتا ہے۔ جو زندہ ہے، اسے مرنا تو پڑتا ہی ہے۔ موت کوئی انہونا واقعہ تو نہیں ہے اور مر کر ہم جہاں جاتے ہیں، وہ اس جگہ سے بہت اچھی ہے۔''

''مجھے جہنم سے ڈر لگتا ہے عمر! میرا دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا ہے۔'' اس کی آواز میں نقاہت بڑھ رہی تھی۔

''آپ جنت کی آرزو کریں۔ اللہ آپ کو ابتلا سے محفوظ رکھے گا۔''

''وہ ناراض ہے۔''

''آپ منالیں اسے۔''

''کیسے مناؤں؟''

''معافی مانگ کر۔''

''معافی مانگی تھی، پر وہ مانا نہیں۔''

''معافی مانگنے کا ڈھنگ صحیح نہیں ہوگا۔''

''کس ڈھنگ سے مانگتے ہیں؟''

''رو کر انکساری سے۔''

''رویا تو بہت ہوں۔''

''مایوسی اسے پسند نہیں۔ وہ معاف کرنے والا رحمان ہے۔''

''کچھ باتیں ایسی ہیں جو معافی کے لائق نہیں۔''

''وہ پھر بھی معاف کر دیتا ہے۔''

گرانٹ خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں خالی پن تیرتا تھا۔ اس کے سانس لینے کی آواز ایک خرخراہٹ تھی جو کمرے میں گونج رہی تھی۔

''کیا تم میری قبر پر آؤ گے؟''

عمر نے کوئی جواب نہ دیا اور اس پر جھکتے ہوئے اس کا بازو سہلانے لگا۔

''مجھے قبر سے خوف آتا ہے۔'' نمی کی پتلی لکیر اس کی آنکھ کے گوشے سے کان کی سمت رینگ رہی تھی۔

''تم پرنیاں کو مت بتانا کہ مجھے کہاں دفن کیا گیا ہے۔ اسے کبھی میری قبر پر لے کر نہ آنا...... اور میرا ایک کام کرو گے عمر؟'' وہ اپنی اداس آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''جی میں کروں گا۔ آپ بولیے۔''

گرانٹ اسے وہ کام بتانے لگا تھا اور اس کی آنکھ سے بہتی ہوئی نمی کی لکیر پھیل رہی تھی۔

''کیا تم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اگر کہو تو میں دہرا دوں۔''

''نہیں۔ میں نے ذہن نشین کر لیا ہے۔'' عمر نے اسے یقین دلایا تھا۔

''میرے مرنے کے بعد تم یہ کام ضرور کرنا۔ تمہارا تھوڑا سا وقت خرچ ہوگا۔ اسے بھولنا نہیں، تم کرو گے نا؟''

عمر کو اس کا سونپا ہوا کام عجیب لگا تھا لیکن اس نے یہ بات گرانٹ سے نہیں کہی۔

''تم اب جاؤ۔ اور ساری بتیاں جلتی رہنے دینا۔ تاریکی مجھے ڈراتی ہے۔''



کچن کی فضا پگھلتے ہوئے پنیر کی خوشبو سے بھری تھی۔ کک لینا ایک بڑے برتن میں گریوی تیار کرتے ہوئے ویٹرس ایلس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ صوفیہ نے پزا پارلر کے لوگو والی ٹوپی سر سے اتارتے ہوئے ایک گلابی پرچی لینا کو دی اور سلیب پر بیٹھ کر ستانے لگی۔

آج ہفتے کی شام تھی۔ پزا پارلر میں آنے والوں کی تعداد معمول سے کہیں زیادہ تھی۔ شفٹ کی ابتدا سے ہی کسٹمرز کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ ڈائننگ ہال اور کچن کے درمیان چکراتے چکراتے نڈھال ہو گئی تھی۔

''تمہارے سیکشن میں تو آج ایک بھی میز خالی نہیں ہو رہی۔'' لینا نے اس کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ''ٹپ جمع ہونے کی رفتار بھی اتنی ہی تیز ہے یا بس ٹانگیں ہی تڑوا رہی ہو۔''

''پتا نہیں۔'' وہ بیزار تھی۔

لینا اور ایلس دوبارہ باتوں میں مگن ہو گئیں۔

وہ اخبار ہاتھ میں لے کر سرخیوں پر سرسری نظر دوڑانے لگی۔ جس خبر پر اس کی نظر ٹھٹکی وہ ٹوبی کریگ Aka (المعروف) میبل پر چلنے والے قتل کے مقدمے کے بارے میں تھی۔ وہ تفصیل پڑھنے لگی۔

مرنے والی لڑکی کے گینگسٹر بھائی کے ایما پر نسلی فسادات شروع ہو گئے تھے۔ میبل کی حمایت میں سامنے آنے والی ایک نسل پرست سیاہ فام تنظیم تھی جو جارحیت کا جواب جارحیت سے دینے پر ایمان رکھتی تھی۔ دونوں جانب سے اشتعال انگیز بیانات جاری کیے جا رہے تھے اور کشیدگی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ عدالتی فیصلے کی نوعیت پر علاقے کے امن کا دارومدار تھا۔ اخبار رکھتے ہوئے وہ سلیب سے اتر آئی اور لینا سے کہنے لگی۔

''اس دفعہ میں ان چار لڑکیوں کا آرڈر لیے بغیر ہال میں گئی تو مجھے شک ہے وہ چاروں مجھے پیٹنے لگیں گی۔ وہ دس بار پوچھ چکی ہیں کہ ابھی کتنی دیر ہے۔'

گریوی میں چمچ ہلاتے ہوئے لینا ہنسی تھی۔ ''اگر ایسا خدشہ ہے تو مزید تین منٹ ہال میں جانے سے پرہیز کرو۔ توقع ہے کہ میں تمہیں پٹنے سے بچا لوں گی۔''

بھاری ٹرے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چلتے ہوئے وہ بدقت جسم کا توازن قائم رکھے ہوئے تھی۔ ابھی وہ برہم نظر آنے والی چار لڑکیوں کی میز سے تھوڑی دور ہی تھی کہ اس نے ایک چہرے کی سرسری جھلک دیکھی۔ وہ بلاارادہ رک گئی اور اس سمت نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور رنگت پنیر کی طرح پھیکی پڑ گئی۔ وہاں عمر موجود تھا۔

میز پر کہنیاں دھرے، ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی جمائے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ روح کو چھیدنے والی نظریں...... خوف نے اسے برف کی قاش میں ڈھال دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے عمر کو دیکھتی رہی۔

''تم نے ٹرے ترچھی کر دی ہے۔ چیزیں گر جائیں گی۔'' عمر نے اچانک اسے خبردار کیا۔

وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بنا اتنی تیزی سے گھومی کہ ٹرے نیچے گرتے گرتے بچی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کا رخ واپس کچن کی جانب ہو گیا تھا۔

''تم بہری ہو یا کوئی دوسرا مسئلہ ہے؟''

اپنے پیچھے اسے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ خالی الذہنی میں منہ کھولے ان چار لڑکیوں کو گھورنے لگی جو جانے کب

سے اسے پکارے جا رہی تھیں۔ منوں وزنی قدم اٹھاتی ہوئی وہ ان کی میز تک گئی اور ٹرے کے مشمولات کچھ سوچے سمجھے بغیر میز پر پھیلانے لگی۔ ان میں سے ایک لڑکی مسلسل اسے جھڑک رہی تھی۔ مگر وہ اس کی آواز پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ عمر کے سوا وہ کسی بھی بات پر دھیان نہیں دے سکتی تھی۔

وہ یہاں بھی آ پہنچا تھا۔ اس تعاقب میں بلاشبہ کوئی بھید مضمر تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے صوفیہ کا دل ڈوبتا تھا۔

خود کو اس سے پوشیدہ رکھنے کی خاطر اس نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ وہ اپنا سیل فون تلف کر چکی تھی۔ گھر میں رہنا چھوڑ چکی تھی، کہیں باہر جاتے ہوئے اسکارف اور چشموں کا استعمال کرنے لگی تھی تا کہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے مگر اس کی سب تدبیریں حماقت پر مبنی تھیں۔ جو چند الفاظ کے زور پر اسے ایک پیدائشی اندھے کے منہ سے بدصورت کہلوا سکتا تھا، وہ اسے ڈھونڈ نکالنے میں کیسے ناکام رہتا۔

کچن میں جاتے ہوئے اسے لامحالہ اس میز کے قریب سے گزرنا تھا۔ فرش پر آنکھیں مرکوز کیے وہ چل رہی تھی کہ پہلو سے عمر کی آواز ابھری۔

''صوفیہ! یہاں آؤ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ان سنی کر کے آگے بڑھتی رہی۔

''صوفیہ! رک جاؤ۔ میں اس رات کے بعد سے مسلسل تمہاری تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ کیا تمہارے پاس میری بات سننے کے لیے چند لمحے بھی نہیں ہیں؟''

فلور مینیجر آسکر، جو صوفیہ کی بے توجہی کا گواہ تھا، تیزی سے اٹھ کر آیا۔

''صوفیہ! کسٹمر تمہیں بلا رہا ہے اور تمہارے کان پر جوں نہیں رینگ رہی۔ کیا وجہ ہے اس لاپروائی کی؟''

''تم کسی دوسری ویٹرس سے کہہ دو۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''مگر کیوں؟ تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ وہ تمہارے سیکشن میں بیٹھا ہے۔ اسے سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اب جاؤ جلدی اور کتنا وقت ضائع کرو گی۔'' آسکر نے درشتی سے کہتے ہوئے اسے عمر کی طرف دھکیلا۔

''اگر تم انتخاب کر چکے ہو تو مجھے بتا دو۔ تم کیا کھانا پسند کرو گے؟'' ایک گلابی صفحوں والی نوٹ بک اور قلم ہاتھ میں لے کر صوفیہ نے پوچھا۔ آواز میں سراسیمگی کو عیاں ہونے سے روکنے کے لیے اس نے پورا زور لگایا تھا۔

''جو کچھ بھی مینو میں درج ہے، وہ میری قوت خرید سے باہر ہے۔ ویسے مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ بالکل اس رات کی طرح۔''

اس کی نظریں سختی سے گلابی کاغذ پر جمی تھیں۔

''فکر مت کرو۔ میں تمہیں قیمت ادا کروں گا تمہارے وقت کی۔ تمہاری شفٹ ختم ہونے تک میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ جب تم فارغ ہو جاؤ تو میرے ساتھ چلنا۔''

صوفیہ کا چہرہ اور بھی بے رنگ ہو گیا۔ اس کے معدے میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ وہ مڑ کر فلور مینیجر آسکر کے پاس گئی اور سرگوشی میں بولنے لگی۔

''مجھے رخصت چاہیے۔ اچانک مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔''

آسکر کی صورت پر ناگواری پھیل گئی۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ پارلر میں گاہکوں کی کس قدر فراوانی ہے۔ اس شفٹ کی ایک ویٹرس پہلے ہی چھٹی پر ہے۔ اب میں تمہیں بھی جانے کی اجازت دے دوں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ تم جا کر کام کرو۔''

''میں نہیں رک سکتی۔میری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

آسکر کے ماتھے کی جلد سکڑ گئی۔

''یہ کس قسم کے عذر تراش رہی ہو۔پہلے کہہ رہی تھیں کہ ضروری کام یاد آگیا ہے اور اب تمہاری طبیعت خراب ہے۔خرابی اگر کہیں ہے تو تمہاری نیت میں ہے۔اب جاؤ یہاں سے۔''اس نے چہرے کے آگے زور سے ہاتھ چلایا۔

وہ کچن میں آ کر چند لمحے سوچتی رہی۔پھر ایپرن اتار کر پھینک دیا۔

جب وہ لباس تبدیل کر کے کچن کے گلی میں کھلنے والے دروازے سے باہر جارہی تھی تو کک لینا''ارے ارے۔''کرتی رہ گئی۔

صوفیہ طے کر چکی تھی کہ دوبارہ پزا پارلر کا رخ نہیں کرے گی بلکہ وہ لاس اینجلس چھوڑ دینے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے غور کررہی تھی۔وہ لڑکا حقیقی معنوں میں اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ رہا تھا۔آخر وہ تھا کون اور اس کے عزائم کیا تھے؟

وہ جتنا سوچتی،اسی قدر الجھن بڑھتی جاتی اور وہ کتنا دیکھا بھالا سا لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے اسے دیکھتی آرہی ہو۔

''وہ جلد ہی میری غیر موجودگی کو محسوس کرلے گا اور پھر میری کھوج میں نکل کھڑا ہوگا۔اسی مہلت کے دوران مجھے یہاں سے دور چلے جانا چاہیے۔''اسکارف کو پیشانی پر نیچے کھینچتے ہوئے وہ گردن گھما کر پیچھے دیکھنے لگی اور قدموں کی رفتار تیز کردی۔

''ہمیشہ سامنے دیکھ کر چلا جاتا ہے۔اس طرح سے تو تمہیں ٹھوکر لگ سکتی ہے۔''

اس نے جھٹکے سے گردن سیدھی کی تو پیروں کے ساتھ ساتھ اس کا پورا جسم ساکت ہوگیا۔

عمر اس کے راستے میں حائل تھا۔یوں جیسے وہ اچانک زمین سے اگ آیا ہو۔اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر تھوک نگلا اور ہراساں نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''تم دیر تک کچن سے باہر نہیں آئیں تو مجھے شبہ ہوا۔میں نے کچن میں جانے کی کوشش کی تو مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی البتہ میں نے تمہیں عقبی دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔لہٰذا میں سڑک سے ہوکر اس گلی میں آ گیا۔شکر ہے کہ پارلر کی عمارت سے دوسری عمارتیں جڑی ہوئی نہیں ہیں ورنہ مجھے لمبا چکر کاٹ کر آنا پڑتا اور شاید تم جاچکی ہوتیں۔''

وہ اس کی جانب چل کر آتے ہوئے عام سے انداز میں بتا رہا تھا۔

''اور تم نے رات کے وقت اتنے گہرے رنگ کے چشمے کیوں لگا رکھے ہیں؟اگر یہ کسی جدید رجحان کا نتیجہ ہے تو مجھے معاف کرنا۔میں ایک سادہ مزاج دیہاتی لڑکا ہوں۔مجھے فیشن کی زیادہ سمجھ نہیں۔''وہ ایسے بات کررہا تھا جیسے ان دونوں میں خوشگوار مراسم ہوں۔

''تمہارے سیل فون پر میں نے لاتعداد کالز کیں،تم نے جواب کیوں نہیں دیا اور پرسوں رات سے تمہارا نمبر بند مل رہا ہے۔تم اپنے گھر بھی نہیں آئیں۔میں کئی کئی گھنٹے وہاں تمہارا انتظار کرتا رہا۔تم کہاں تھیں؟''

صوفیہ نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستگی سے چلنے لگی۔

''تم مجھے باتھ روم میں بند کر کے چلی گئی تھیں۔پوچھوگی نہیں کہ مجھ پر کیا بیتی۔پوری رات مجھے کسی نے نہیں نکالا۔میں نے باتھ ٹب میں لیٹ کر رات گزاری۔اگلی صبح نو بجے کے قریب ایک میڈ کمرے میں آئی تو مجھے رہائی ملی۔میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔بعض اوقات ہم جلد بازی میں کچھ ایسے کام کر جاتے ہیں۔جنہیں کرتے ہوئے ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ ہم یہ کس لیے کررہے ہیں۔صوفیہ!کیا میں اتنا برا ہوں کہ مجھ سے بات کرنا تک تمہیں گوارہ نہیں اور ہاں یہ اسکارف تم پر بہت جچ رہا ہے۔''

وہ اس سے دو قدم آگے چپ چاپ چلی جارہی تھی۔عمر ایک لمبا ڈگ بھر کر اس کے سامنے آ گیا۔

''میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔ گھبراؤ مت، میں تمہارے وقت کی مناسب قیمت ادا کروں گا۔ میں نے تمہارے ساتھ کام کرنے والی ایک ویٹرس سے معلوم کیا ہے۔ پارلر میں تمہیں ایک گھنٹے کے چھ ڈالر دیئے جاتے ہیں۔ میں بھی اسی حساب سے ادائیگی کر دوں گا۔''

''تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ میں کوئی hooker ہوں جو تم مجھے معاوضہ دینے کی بات کر رہے ہو؟ تمہیں میری توہین کرنے کا کیا حق ہے۔'' یکلخت وہ چیخ پڑی۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ......''

صوفیہ نے اس کا جملہ کاٹا۔ ''میں تمہیں نہیں پہچانتی۔ میں تم سے کبھی نہیں ملی۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم جو کوئی بھی ہو اور میں جاننا بھی نہیں چاہتی کہ تم کون ہو۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ، میرا تعاقب نہ کرو۔ میں اجنبیوں سے بات نہیں کیا کرتی۔ یہ میری عادت کے خلاف ہے۔''

وہ اس کے پہلو سے کترا کر نکلی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

''صوفیہ! مجھے معاف کر دو۔ میں نے حقیقتاً تمہاری توہین کی ہے۔ مجھے گفتگو کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ میں آئندہ محتاط رہوں گا۔ تم ایک بہت خاص لڑکی ہو اور میں دل سے ایسا سمجھتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو، ہم کسی پارک میں تھوڑی دیر بیٹھیں گے، باتیں کریں گے اور اس کے بعد اگر تم محسوس کرو کہ مجھ سے ملنا ٹھیک نہیں تو دوٹوک الفاظ میں مجھے بتا دینا۔ میں دوبارہ تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ کوئی جواب تو دو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟''

اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ کیا وہ اس قابل تھی کہ اس عاجزی سے اس سے معافی مانگی جائے؟

''تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟'' وہ رو دینے کو تھی۔

''میں تمہیں جاننا چاہتا ہوں۔''

''اور کتنا جانو گے؟ کیا ہے جو تم سے چھپا ہوا ہے؟''

''تمہاری ذات کے کئی پہلو ہیں جن سے میں بے خبر ہوں۔ میں ان سب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں، تمہیں ہر شے کی خبر ہے۔ تم جادو کرتے ہو اور پھر خود کو عام انسانوں جیسا ظاہر کرتے ہو۔''

''میں عام انسان ہوں۔ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت صلاحیت نہیں ہے۔ میں نے جادو نہیں کیا اور نہ ہی میں کر سکتا ہوں۔''

صوفیہ نے بے اعتباری سے اسے دیکھا تھا۔

''اس رات میرے ساتھ جو ہوا اس کے بعد بھی تم جادوگر ہونے سے انکار کر رہے ہو۔ وہ جادو نہیں تھا تو کیا تھا؟ کیا عام زندگی جینے والے عام انسانوں کو ایسا واقعہ پیش آنا ممکن ہے؟ اس کی کوئی عقلی توجیہہ تمہارے پاس یا دنیا کے کسی بھی آدمی کے پاس ہے؟''

''اس رات کیا ہوا تھا؟''

''انجان مت بنو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس رات مجھ پر کیا بیتی؟''

عمر نے آسمان کو دیکھتے ہوئے بہار کی ہوا جیسی پرسکون آواز میں کہا۔ ''ہاں میں جانتا ہوں کہ اس رات کیا ہوا ہوگا؟''

''کیا؟'' صوفیہ نے سانس روک کر پوچھا۔

''تم نے گناہ نہیں کیا۔ تمہیں روک دیا گیا۔''

صوفیہ رکی ہوئی سانس نتھنوں سے باہر دھکیل کر بولی۔ ''پھر بھی تم بضد ہو کہ تم جادوگر نہیں ہو۔ میں یہ کیسے مان سکتی ہوں؟''

''ہاں میرا دعوا برقرار ہے اور میرے پاس اس کی عقلی توجیہہ بھی موجود ہے۔ کیا تم اسے سننا نہیں چاہو گی؟ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو یہاں سے دو بلاک دور ایک چھوٹا سا پارک ہے۔ ہم وہاں آرام سے چند گھنٹے گزار سکتے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ اتنی دیر تک نہیں رہوں گی۔'' صوفیہ نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم پارک میں جانے پر راضی ہو بھلے تھوڑے وقت کے لیے ہی سہی۔''

صوفیہ کو ادراک ہوا کہ بے خیالی میں وہ اقرار کر چکی تھی۔

''میں اس لڑکے کے مقابل اتنی بے بس کیوں ہوں؟ میں سڑک کے کنارے پڑا ہوا یہ بھاری پتھر اٹھا کر اس کا سر کیوں نہیں پھاڑ دیتی اور راتوں رات یہ اسٹیٹ چھوڑ کر کہیں دور کیوں نہیں چلی جاتی؟''

وہ خود کو اس کے احکامات کی تعمیل کرنے کا پابند کیوں پاتی تھی؟

''میں وجہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی ذہنی وضاحت چاہیے ورنہ تجسس سے میری شریانیں پھٹ پڑیں گی۔ میں پارک میں چلوں گی۔'' اس کی زبان بھی تو اس لڑکے کے تابع تھی۔ اس سے وہ ہی الفاظ ادا ہوتے تھے جو وہ سننا چاہتا تھا۔

پھر ان دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ پارک تک کا راستہ خاموشی میں ملفوف رہا۔ جب وہ زمین میں گڑے ہوئے پایوں والے سنگی تخت کے دونوں سروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو صوفیہ نے اپنے جوتے اتار کر گھاس پر اچھال دیے اور ٹانگیں سمیٹ کر تخت پر رکھتے ہوئے ہاتھ سے پیروں کے پنجوں کو دبانے لگی۔

''میرے پاؤں درد کر رہے ہیں۔'' اس نے بلا وجہ عمر کو بتایا۔

عمر نے ایک نظر گھاس پر پڑے ہوئے اس کے جوتوں کو دیکھا اور بولا۔ ''اس روز بھی تم نے یہ ہی جوتے پہن رکھے تھے۔''

''ہاں۔'' صوفیہ نے سر کو جنبش دی۔

''میرا خیال ہے ان جوتوں کی وجہ سے تمہارے پاؤں دکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھنے میں ہی تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' صوفیہ بولی۔ ''یہ میرے پیروں کے لیے ذرا سے کھلے ہیں۔ چلتے ہوئے میرے پنجے اگلی سمت کھسکتے رہتے ہیں۔ میری ماں کے پاؤں مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ ہسپانوی عورتوں کے پاؤں بڑے حسین ہوتے ہیں۔ میری ماں کے معاملے میں یہ جھوٹ نکلا۔ وہ مجسم بدصورتی تھی۔ یہ اسی کے جوتے ہیں۔''

''البا مارسیلو کے۔''

عمر کے منہ سے البا کا نام سن کر وہ حیران نہیں ہوئی۔ اس میں مزید حیران ہونے کی سکت ہی نہیں تھی۔ اس نے گھٹنے کھڑے کر کے دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر رکھیں اور گردن ڈھلکا کر بیٹھ گئی۔

''تمہاری ماں کی المناک موت پر مجھے افسوس ہے۔''

''مجھے بھی ہے لیکن اس بات کہ وہ اتنی آسانی سے کیوں مری۔ اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو میں اس کی جان لینے کا کوئی بے حد دردناک طریقہ ایجاد کرتی۔''

اس کے لہجے میں نفرت کی ایسی شدت تھی کہ عمر ششدر رہ گیا۔

''اتنا غصہ کیوں؟ مرے ہوئے لوگوں کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ انہیں برا بھلا نہیں کہا جاتا۔ وہ تو تمہاری اپنی ماں تھی۔''

''غصہ؟'' صوفیہ نے چیخ کر کہا۔ ''میری نفرت کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں اس کی قبر کھود کر اس کی سڑی ہوئی لاش پر تھوکنا چاہتی ہوں، اپنے برتھ سرٹیفکیٹ سے اس کا نام مٹانا چاہتی ہوں۔''

''اس کے باوجود تم اس کے جوتے پہنتی ہو۔ کتنی عجیب بات ہے۔'' عمر نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

''ہم یہاں ابا اور میرے تعلقات پر بحث کرنے نہیں آئے۔ تم مجھے کچھ بتانے والے تھے۔'' صوفیہ نے اسے یاد دلایا تھا۔

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تم اس رات کا احوال بیان کرو۔ موٹیل کے کمرے سے نکلنے کے بعد کیا ہوا؟''

''کیا بتاؤں؟ مجھے خود نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ میں خواب میں تھی یا جاگ رہی تھی۔'' وہ آنکھیں بند کر کے بولنے لگی۔

عمر نے سنا، سمجھا اور جانا کہ دعا کی طاقت کیا تھی۔ اللہ کی بڑائی کے سامنے وہ ایک ذرے کی مانند سمٹا ہوا تھا۔ کن فیکون...... ہوا میں ایک صدا کی بازگشت تھی۔ اس نے فرشتے کا پر دیکھا۔ وہ منور تھا اور آسمان کی طرف اڑ رہا تھا۔ اس کا لمس عمر کے وجود کو ملائمت سے چھوتا تھا۔ اس کا دل اتنا نرم پڑ گیا کہ اس کے مائع بن کر بہہ جانے میں فقط ایک گام کا فاصلہ رہ گیا۔

''میں سب تفصیلات مکمل درستی کے ساتھ نہیں سنا سکتی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ وہ میری زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی۔''

صوفیہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ عمر کے چہرے پر ایک ناقابل بیان تاثر نظر آتا تھا۔ اس کے لب دھیرے سے ہلے۔ ''میں تمہیں لکھ کر دینے پر تیار ہوں کہ اس سے اچھی رات شاید تمہاری زندگی میں کبھی نہ آئے۔'' اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

وہ جملہ قابل فہم نہ تھا۔

''تم نے یہ کیسے کیا؟ تم نے مجھ پر کیا عمل کیا تھا، تم نے جادو کہاں سے سیکھا ہے؟''

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم سراسر غلط خطوط پر سوچ رہی ہو۔''

''تو تم میری غلطی درست کیوں نہیں کرتے؟ تم مجھے پاگل کر دو گے۔'' وہ جھنجھلا گئی۔

''میں ہر چیز کی وضاحت کروں گا مگر میری ایک شرط ہے۔''

''اور وہ کیا ہے؟''

''تمہیں اپنے متعلق ہر بات مجھے بتانا ہوگی۔ ہر وہ شے جو تمہاری یادداشت میں محفوظ ہے۔ ہر وہ واقعہ جس نے تمہاری شخصیت کو تلخ بنانے میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ وہ سب کچھ تم مجھے بتاؤ گی اور میں اس کے بدلے میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔''

''لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ ہر چیز تو تمہارے علم میں ہے۔ تم خود کو ایک عام انسان ظاہر کرنے کی زحمت میں کیوں پڑ رہے ہو؟ تم ثابت کر چکے ہو کہ تم جادوئی علوم پر دسترس رکھتے ہو۔''

''میں تمہارے سارے شکوک رفع کر دوں گا۔ فی الحال تم اپنی داستان شروع کرو۔'' عمر نے زور دے کر کہا۔

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''ہاں میں اس سے زیادہ سنجیدہ کبھی نہیں ہوا۔'' وہ ذرا سا مسکرایا تو صوفیہ نے نظر چرا لی۔ وہ حتی المقدور اس کے چہرے کو براہ راست دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملتے ہی صوفیہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے اسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ وہ باقی دنیا سے کٹ کر رہ جاتی تھی۔

''اتنی لمبی بات کرنے میں تو ڈھیر سارا وقت خرچ ہوگا۔'' اس نے گویا پسپائی کا اعلان کیا۔

''تو کیا ہوا؟ کیا تم عجلت میں ہو؟ تمہیں کہیں جانا ہے؟''

''نہیں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق پڑتا ہو۔ لیکن تمہارے پاس شاید اتنی فرصت نہ ہو اور ایک معمولی لڑکی کے غیر دلچسپ قصے سننے کے لیے حوصلہ بھی تو چاہیے۔''

''مجھے آزما کر دیکھ لو۔ یہ دونوں خواص مجھ میں ہیں۔''

وہ پھر مسکرایا تھا ''تمہیں برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟''

''کہو۔''

''پارک میں ناکافی روشنی ہے اور تم نے رنگین چشمے لگا رکھے ہیں۔ تم تھوڑی عجیب سی نظر آ رہی ہو۔''

وہ خفیف ہوگئی ''مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' اس نے چشمہ اتار کر تخت پر رکھ دیا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے صبح سے ایک سیب کے سوا کچھ نہیں کھایا۔''

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ ٹھہرو میں کچھ لے آتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''پارک کے نواح میں ایک گیس سٹیشن ہے۔ میں وہاں سے سینڈوچ لے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے البتہ ذہن میں رکھنا کہ میں کسی بھی طرح کا گوشت نہیں کھاتی۔''

''اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں یہ بات تم پہلے سے نہیں جانتے تھے کیا؟'' وہ تیزی سے جوتے پہنتے ہوئے بولی۔ ''ذرا رکو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

وہ کافی اور سبزیوں والے سینڈوچ خرید کر واپس اسی جگہ آ گئے۔

صوفیہ نے سینڈوچ کھاتے ہوئے بڑی انکساری سے کہا۔ ''میں نے تمہیں باتھ روم میں بند کر کے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ میں بے حد گھبرا گئی تھی۔ یقین مانو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا میں کیا کر رہی ہوں۔''

''میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ میں تمہیں قصوروار تصور نہیں کرتا۔'' عمر نے کافی والا کاغذی کپ اس کے نزدیک کھسکایا۔

''اب تم ابتدا کر دو۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''جو تم کہو۔'' صوفیہ نے کپ سے گھونٹ بھرا اور کہنا شروع کیا۔ ''جب میں پیدا ہونے والی تھی تو میرا باپ مارسیلو میری ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ان دنوں وہ بے روزگار تھی۔''

وہ کہتی رہی۔ وہ نفرت سے اٹی ہوئی کہانی تھی۔ اس میں کوئی ایک خوشگوار لمحہ بھی نہ تھا بس کڑواہٹ تھی اور درد تھا۔ صوفیہ اسے یوں سنا رہی تھی جیسے وہ کسی اور کی زندگی کا احوال ہو۔ اس کا لہجہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ کسی بھی مقام پر اس کی آنکھ میں نمی نہ آئی۔ وہ ایک چوبی گڑیا تھی جس کے ہونٹ کسی میکنزم سے کھلتے تھے اور بند ہوتے تھے۔

جب رات نصف سے زائد بیت گئی اور پارک تقریباً ویران ہو گیا تو عمر نے کہا۔ ''میں کل دوبارہ اسی جگہ تمہیں ملنے آؤں گا۔ میں صبح دس بجے تمہارا انتظار کروں گا۔''

صوفیہ نے چہرہ اٹھا کر درختوں کی چوٹیوں پر پھسلتے ہوئے روشن چاند کو دیکھا اور بولی۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنے بارے میں بتاؤ گے۔ لیکن اب تک میں اتنی ہی بے خبر ہوں، جتنی اس ملاقات سے پہلے

تھی۔"

"مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ تم آؤ تو اسکارف لے کر آنا۔ تم اس میں بہت اچھی لگتی ہو۔"

✠ ✠ ✠

اگلی صبح عمر پارک میں آیا تو صوفیہ پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سلیٹی رنگ کے لانگ اسکرٹ کے ساتھ ہم رنگ اسکارف پہن رکھا تھا اور اس کے پیروں میں وہی جوتے تھے جن کی ایڑیاں میخوں کی مانند باریک اور نوک دار تھیں۔ عمر کو دیکھ کر وہ آگے آ گئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک ٹوکری لٹکا رکھی تھی۔

"میں دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ چیزیں ساتھ لے آئی ہوں۔ رات والے سینڈوچ خاصے بدذائقہ تھے۔" ٹوکری کو گھاس پر رکھتے ہوئے اس نے چھپے ہوئے رنگین کپڑے کا مستطیل ٹکڑا نکال کر شاہ بلوط کے گھنے پیڑ تلے بچھایا اور عمر کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں جوتے اتار کر چادر پر بیٹھ گئے۔

"تمہارا خیال تھا میں آؤں گی؟" صوفیہ نے سوال کیا۔

"ہاں مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔"

"اور اگر میں نہ آتی تو......؟"

"تو کیا؟"

وہ پوچھتے ہوئے جھجکی۔ "تو کیا تمہیں دکھ ہوتا؟"

"یقیناً ہوتا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تم جوس پیو گے؟" صوفیہ نے انناس کے رس کا ایک ڈبا اسے دیا۔

"شکریہ۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں جھکائے ہوئے تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی پتلون اور آدھی آستینوں والی سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے بھورے بال شاخوں سے چھن کر آتی دھوپ میں چمک رہے تھے اور شاہ بلوط کے پتوں کا عکس اس کی پیشانی پر ٹھہرا تھا۔ اس نے جوس پیتے ہوئے نظر اٹھائی تو صوفیہ نیچے پھیلی ہوئی چادر کی دھاریوں کو دیکھنے لگی۔

وہ بڑی دیر دھوپ، چھاؤں اور گرم ہوا کو محسوس کرتے رہے پھر صوفیہ بولی۔ "تم کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟"

عمر کہنی زمین پر جماتے ہوئے پہلو میں جھک گیا تو پتوں کا سایہ سرک کر اس کی گردن پر آ گیا۔ "بات تو تمہیں کرنا ہے۔ میں یہاں سننے آیا ہوں۔ تم بولتی جاؤ، میں سن رہا ہوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی تم اتنے خوب صورت ہو، ممکن نہیں کہ اب تک کوئی لڑکی تمہاری کشش کا شکار نہ ہوئی ہو۔"

وہ واضح طور پر جھینپ گیا اور رخ پھیر کر دور کھیلتے ہوئے بچوں کے گروہ کو دیکھنے لگا۔

"تم کم سے کم ہاں یا ناں میں تو جواب دے سکتے تھے۔ بہر حال تمہاری مرضی۔"

"ابھی تم صرف اپنی بات کرو جب میری باری آئے گی تو میں سب کہوں گا۔ رات جب میں رخصت ہوا تو تم گرانٹ کے رویے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

صوفیہ نے کندھے سکیڑ کر گہرا سانس بھرا۔ ''گرانٹ کہتا تھا خدا گناہ گاروں پر عذاب اتارتا ہے لیکن میں نے سات سال کی عمر میں کیا گناہ کیے تھے، مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا۔''

انہوں نے اسی جگہ دوپہر کا کھانا کھایا جب دھوپ تیز ہوگئی اور وہ قطعہ سیدھا شعاعوں کی زد میں آ گیا تو عمر نے صوفیہ کی مدد سے چادر کو گھسیٹ کر شاہ بلوط کے بڑے گھیر والے تنے کے قریب کر دیا۔ ظہر کے وقت عمر نے پارک میں لگے ہوئے نل سے وضو کیا اور چادر کے ایک کنارے پر نماز ادا کی۔ عبادت کے دوران اس کا ارتکاز اتنا مکمل تھا کہ صوفیہ کو لگا تارا سے گھورتے رہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

وہ شاہ بلوط کے تنے سے کمر جوڑے ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

نماز کے بعد عمر کہنی کے بل نیم دراز ہو گیا۔ آج صوفیہ گزشتہ رات کے مقابلے میں زیادہ روانی سے بات کر رہی تھی۔ عمر نے کسی بھی جگہ اسے ٹوکا نہیں۔ جب دھوپ نے پر سمیٹ لیے اور سائے لمبے ہونے لگے تو صوفیہ بولی۔

''میں تھک گئی ہوں، مجھ پر سستی چھا رہی ہے۔''

عمر سیدھا ہو بیٹھا۔ ''آلو کے قتلے بڑے مزے کے تھے۔ کاش تم نے تھوڑے سے زیادہ بنائے ہوتے۔''

وہ الوداعی کلمات تھے۔ صوفیہ کو اچانک ایک بے پایاں محرومی کا احساس ہوا۔ وہ اس ملاقات کا اختتام نہیں چاہتی تھی۔

''میں اتنی بھی تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ اگر تم کچھ دیر اور رکنا چاہو تو......'' اس نے جملہ نامکمل رہنے دیا۔

''صوفیہ! تمہیں اللہ سے اتنی شکایتیں ہیں۔ میں نے تمہاری زبان سے اس کے کسی ایک احسان کا ذکر بھی نہیں سنا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس نے تمہارے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا۔''

اس نے زخم کو چھیڑا تھا، صوفیہ بلبلا اٹھی۔

''اس نے کئی اچھائیاں کیں۔ مجھے البا جیسی ماں دی اور گرانٹ جیسا شخص باپ کے روپ میں بخش دیا۔ میں نے جو مانگا، اس نے نہیں دیا۔ جو پایا اس نے چھین لیا۔ کون سی تکلیف اور کون سا دکھ ہے۔ جو اس نے مجھ پر وارد نہیں کیا۔ میں نے ہر طرح کی تذلیل سہی، جسمانی اور ذہنی تشدد برداشت کیا، تمام زندگی محرومی سے سسکتے ہوئے گزاری۔ کیا یہ سب اس کی مرضی کے بغیر ہوتا رہا؟''

عمر نے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھ کر متوازن لہجے میں کہا۔ ''اللہ نے تم پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ تم گننے بیٹھو تو تمہارا حساب جواب دے جائے۔ لیکن تمہیں ان کا شعور نہیں ہے۔''

''مثلاً؟''

عمر نے کچھ کہنے کی خاطر ہونٹ وا کیے تو صوفیہ نے شتابی سے کہا۔

''یہ گھسی پٹی باتیں مت کرنا کہ اس نے مجھے آنکھیں دی ہیں۔ ہاتھ اور ٹانگیں دی ہیں۔ یہ ساری چیزیں تو اس نے اربوں لوگوں کو دی ہیں لیکن ان اربوں لوگوں کو اس نے وہ تکلیفیں نہیں دیں جو اس نے میرے لیے چنی ہیں۔''

عمر گھاس کی پتی توڑ کر اسے مٹھی میں مسلنے لگا۔ ''میں ان چیزوں کا نام نہیں لینے والا تھا۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔ ان اربوں لوگوں میں سے چند سو ملین ایسے بھی ہیں جن کے جسمانی اعضاء پورے نہیں ہیں اور تم ان میں سے ایک نہیں ہو۔ تم سوچو اور خود فیصلہ کرو کہ البا اور گرانٹ کے بنائے ہوئے گھریلو ماحول میں رہنے اور اتنے سال ان کی صحبت میں گزارنے کی طاقت تمہیں کس نے دی؟ کیا سب لوگ اتنے ہی مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں؟ تم نے خودکشی کیوں نہیں کر لی؟ تم گھر سے بھاگ کیوں نہیں گئیں؟ تم اس وقت کسی پاگل خانے میں کیوں نہیں ہو؟''

وہ دم بخود رہ گئی۔ اس انداز میں تو اس نے آج تک نہ سوچا تھا۔ اسے اینا یاد آنے لگی۔ تین مردہ بیٹوں کی ماں اینا، قبرستان کو جانے والی راہ میں گاتی اور ہنستی ہوئی اینا۔

''خدا تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے جیسے اس نے مجھ پر نہیں اتارا......اس نے مجھے صبر دیا'' ''اور ایسی ہی بے شمار آسانیاں اس نے تمہارے لیے پیدا کی ہیں جن کی تمہیں خبر تک نہیں۔ میں تمہیں کوئی فہرست بنا کر نہیں دوں گا، تمہیں خود ان کو ڈھونڈنا ہوگا۔ کل جب ہم ملیں تو تم مجھے کسی ایک احسان کا حال سناؤ گی جو اس نے خاص تمہاری ذات پر کیا ہو۔ ایک رات کم تو نہیں ہے اسے تلاش کرنے کے لیے؟''

وہ طنز نہیں کر رہا تھا مگر صوفیہ کو اس کے الفاظ چبھے۔

''تو کل بھی ہم مل رہے ہیں؟'' چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا تھا۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔ ابھی ہماری بات ادھوری ہے۔ کل پیر ہے تو شام کے وقت ملیں گے لیکن۔'' اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ ''تمہیں تو پڑا یارلر جانا ہوگا۔ تم رات کی شفٹ میں کام کرتی ہو۔''

صوفیہ نے بکھرا ہوا سامان ٹوکری میں منتقل کرتے ہوئے گردن ہلائی۔ ''میں اب وہاں کام نہیں کرتی۔ میں سارا دن فارغ رہوں گی۔ تم جو بھی وقت مقرر کرو گے میرے لیے موزوں ہوگا۔''

''اچھا تو پھر شام چار بجے ٹھیک رہے گا کیونکہ مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔'' وہ چادر لپیٹنے میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

''چلو تمہارے بارے میں ایک بات تو مجھے پتہ چل گئی کہ تم پڑھتے ہو۔''

''یونیورسٹی کسی اور کام کے سلسلے میں بھی جا سکتا ہوں۔''

صوفیہ نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ''تم بڑے پراسرار ہو۔''

وہ ہنس رہا تھا۔ ''ویسے یہ واحد چیز نہیں ہے جو تم میرے متعلق جانتی ہو، تمہیں میرا نام بھی معلوم ہے۔''

پارک کے دروازے پر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگا تو بولا۔ ''سنو صوفیہ! انسانوں کے اعمال کو پیمانہ بنا کر اللہ کے بارے میں رائے قائم کرنا احمقانہ ترین افعال میں سرفہرست ہے۔ ہم زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر یہ غلطی ضرور کرتے ہیں۔ میں بھی کر چکا ہوں۔ تم اب کر رہی ہو۔

سنار کی کارگاہ میں ایک اہرن ہوتا ہے، لوہے سے بنا ہوا۔ سنار اس پر سونے کو زیورات کی شکل میں ڈھالتا ہے۔ سالہا سال اہرن پر سونا کوٹا جاتا ہے لیکن اہرن لوہے کا ہی رہتا ہے۔ اس کا ایک ذرہ بھی سونے میں تبدیل نہیں ہوتا۔ بعض دل سنار کے اہرن کی طرح ہوتے ہیں۔ سونے کا لمس اور سنار کی ہتھوڑی کی ضربیں ان پر کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔ یاد رکھو کہ ساری دنیا سونے کے زیور کو دیکھتی ہے، اہرن کو کوئی نہیں دیکھتا۔ تم اہرن بننا چاہتی ہو یا زیور، اپنے آپ سے پوچھ لو۔''

✠ ✠ ✠

وہ پل کے کٹہرے میں بازو پھنسائے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ان گھڑیوں میں وہ بیرونی دنیا سے یکسر لاتعلق تھی۔ اس کے اندر ایک جہان آباد تھا۔ پرہنگام اور متموج۔ تہہ در تہہ، پرت در پرت، ایک پردہ ہٹتا تو ایک آئینہ نمودار ہوتا اور اس آئینے کے اندر سینکڑوں آئینوں کے عکس ظاہر ہوتے...... ہر آئینے میں ایک جدا منظر۔ ایسے لاکھوں پردے اور ان گنت آئینے تھے۔ اس مینا خانے میں وہ ہر گام پر ٹھٹکتی، جھانکتی اور آگے بڑھ جاتی...... چکر پہ چکر۔ لامتناہی گردش جیسے وہ کسی بھنور میں گرفتار ہو۔ وہ تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی تھی اور راہ ڈھونڈتی تھی۔

خدا نے اس پر جو کرم کیے تھے، وہ اسے کیوں نظر نہیں آتے تھے۔ عمر کہتا تھا وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ گنتی ختم ہو جاتی ہے، شمار ختم نہیں ہوتا تو پھر وہ اس کی آنکھ سے اوجھل کیوں تھے؟

''اس نے مجھے خوب صورت بنایا ہے۔ یہ یقیناً ایک عنایت ہے لیکن یہ خاص مجھ پر تو نہیں۔ وہ اور لوگوں کو بھی خوب صورت بناتا ہے۔''

ان کے علاقے میں ایک وبائی بخار پھیل گیا تھا تو کنبوں کے کنبے اس میں مبتلا ہوئے تھے تاہم وہ بچی رہی تھی۔ اس بخار سے پیدا ہونے والی کیفیات دردناک تھیں۔ وہ خدا کا احسان ہی تو تھا پھر بھی وہ اس کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ کچھ اور لوگ بھی محفوظ رہے تھے الیا بھی ان بچ جانے والے لوگوں میں سے تھی۔ اگر خدا نے الیا جیسی بری عورت کو تکلیف سے بچالیا تھا تو اسے بچالینے میں کیا اختصاص ہوا۔ وہ تب ایک معصوم بچی تھی۔

اور جب وہ میبل کے ساتھ تھی اور پولیس کی اچانک آمد پر ان کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اسے بھی ایک احسان مانا جا سکتا تھا مگر وہ قصوروار تو نہیں تھی۔ اگر پولیس اس کی وہاں موجودگی سے واقف ہو جاتی تو وہ بآسانی انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔ یہ کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں تھی۔

اس نے کئی واقعات یاد کیے اور انہیں رد کر دیا۔

''کل شام میں عمر کو کیا بتاؤں گی۔ اگر میں کہوں گی کہ خدا نے مجھ پر کوئی خاص احسان نہیں کیا تو وہ سمجھے گا کہ میں ہٹ دھرم اور کوڑھ مغز ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بابت ایسا خیال اس کے دل میں آئے۔''

ایک گاڑی کا ہارن بار بار بج رہا تھا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک بنٹلے رکی ہوئی تھی۔ وہ اس کار کو اچھی طرح پہچانتی تھی اگرچہ وہ ایک عرصے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔

کارل میکارتھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ وہ اکیلا تھا اور قدرے دبلا ہو گیا تھا اور اس کا چہرہ پہلے کی نسبت لمبا لگ رہا تھا۔

''آہا صوفیہ!'' اس نے تھیٹر کے کسی اداکار جیسا اونچا اور کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

''دنیا میں کیسے کیسے واقعات ہوتے ہیں۔ آج گھر سے نکلتے ہوئے میں نے ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ تم سے سامنا ہوگا یعنی صوفیہ...... ''عظیم صوفیہ اور میں ایک حسین رات میں، سڑک کے درمیان، آمنے سامنے، رومان...... خالص رومان۔'' وہ پتلون کی جیبوں میں انگوٹھے اڑسے اس کے پاس آ گیا۔

ایک وقت تھا جب وہ اسے مسحور کر دیا کرتا تھا اور آج وہ ایک معمولی شخص تھا۔ اتنا معمولی کہ صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے ابھی اگر کوئی گاڑی اسے کچل کر گزر جاتی تو وہ نائن ون ون پر اطلاع دینے اور چند منٹ غمگین رہنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پاتی۔ نظر کیسے بدلتی ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے واقعات ہوتے ہیں۔ جانے کیوں وہ کارل اور عمر کا موازنہ کرنے لگی۔

اگر دونوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا کر دیا جاتا تو اسے یقین تھا کہ کارل کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن وہ یہ تقابل کر ہی کیوں رہی تھی۔ اہرن کو کون دیکھتا ہے، سب سونے کے زیور کو دیکھتے ہیں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''وقت گزار رہی ہوں۔'' اس نے بھڑکے بنا کہا۔

''وقت گزارنے کا یہ انداز کتنا اکتاہٹ بھرا ہے۔ تم چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں ایک شاندار قسم کی پارٹی میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی ساتھ لے چلتا ہوں بشرطیکہ تم اس کام کا معاوضہ طلب نہ کرو۔ البتہ تمہارا حلیہ ایسا

ہے کہ تم فیونرل کے علاوہ کسی دوسری پارٹی میں گھسنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔ فیونرل بھی ایک طرح کی پارٹی ہی تو ہے۔ تم بالکل نن دکھائی دے رہی ہو۔ بہرکیف تمہارے پاس اس مسئلے کا کوئی حل ہے تو فوراً بتادو۔ سوچنے کے لیے میں تمہیں دس سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔"

"میں سوچ چکی ہوں۔" صوفیہ نے ترت کہا۔

"اچھا تو کیا سوچا تم نے؟"

"پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ کیا میں تمہیں بدصورت نظر آرہی ہوں؟" کارل نے گال کو ناخنوں سے کھجایا۔

"نہیں تو، مجھے صرف اس اسکارف اور ننوں والے لبادے پر اعتراض ہے۔"

"لیکن کارل! تم مجھے بدصورت نظر آرہے ہو۔ تم ہر لباس اور ہر حلیے میں مجھے بدصورت لگو گے۔ میری نظر میں خرابی یا شاید درستی ہوگئی ہے۔ تم سڑک کے بیچ کھڑے ہو۔ کوئی گاڑی تمہیں کچل سکتی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔"

وہ اس کے ردعمل کا جائزہ لیے بغیر وہاں سے چلی آئی تھی۔

✠ ✠ ✠

وہ ایک بار پھر روبرو تھے۔ عمر کے پاس گتے کا ایک ڈبہ تھا لیکن اس نے صوفیہ کو بتایا نہیں کہ اس میں کیا تھا حالانکہ اس نے اصرار بھی کیا تھا۔

"کل میں نے تمہیں ایک سوال حل کرنے کو دیا تھا۔ تم اس کا جواب لائی ہو؟" عمر نے دریافت کیا۔

"جواب مجھے مل گیا ہے۔ تم صحیح کہہ رہے تھے۔" صوفیہ نے خوش دلی سے شکست کا اعتراف کیا۔

"یعنی تم مانتی ہو کہ اللہ نے خاص تمہاری ذات پر احسانات کیے ہیں؟" عمر کی آنکھوں میں خوشی کی جھلک تھی۔

"میں مانتی ہوں۔"

"تو بتاؤ۔"

"رات کو مجھے کارل میکارتھی ملا تھا۔"

عمر کے لیے یہ نام نامانوس تھا۔ "کون ہے وہ؟"

"ایک غیر اہم شخص ہے لیکن اس سوال کا جواب اس سے جڑا ہے......"

گزشتہ رات کارل میکارتھی کی باتیں سنتے ہوئے اس کی نظروں میں پروم پارٹی کا پورا منظر گھوم گیا تھا۔ اس رات وہ کارل کی "ڈیٹ" ہونے پر خود کو خوش نصیب گردان رہی تھی اور جب گرانٹ سب کے سامنے اسے مارتے پیٹتے ہوئے زبردستی وہاں سے لے گیا تھا تو اس بے عزتی پر اس کا مر جانے کو جی چاہا تھا۔ ہائی اسکول کے طلباء سے منہ چھپانے کی غرض سے اس نے اسکول جانا ترک کر دیا تھا۔ بعد میں کارل اور اس کے دوست کی گفتگو سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں اس رات خفیہ طور پر اس کی فوٹیج حاصل کرنے کا انتظام کر چکے تھے۔ اصل بے عزتی تب ہوتی جب وہ کارل کے ہمراہ اس کے دوست کے اپارٹمنٹ میں جانے میں کامیاب رہتی اور اس کی فوٹیج منظر عام پر آتی۔

پارٹی کے دوران گرانٹ سے ایک تھپڑ کھانا تو اس ذلت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ سر میں ایک مٹھی دھول پڑ جانا اور گٹر میں گر جانا...... دونوں تجربے یکساں نہیں ہیں۔ اس رات گرانٹ کو بھیج کر خدا نے ایک انوکھے طریقے سے اسے ذلیل ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس نے من و عن سارا قصہ عمر کے گوش گزار کر دیا اور حیرت کی بات تھی کہ اسے شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کوئی بھی چیز اس سے

پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

عمر نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

''آج بھی تم اپنا بھید نہیں کھولو گے؟''

صوفیہ نے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''آج نہیں، آج میں جلدی میں ہوں۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔''

''کس لیے؟''

''کوئی بیمار ہے۔ اسے دیکھنے جانا ہے۔''

''میری کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ کیوں نہ میں بھی اس بیمار کو دیکھنے چلوں۔'' عمر نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ ''پھر کسی دن تمہیں لے جاؤں گا اور ہاں یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔''

اس نے ڈبہ اٹھا کر گود میں رکھا اور اسے کھول کر بغیر ایڑی کے بے ڈھب سے جوتے نکال کر صوفیہ کو تھما دیے۔ ''ان کی قیمت محض بارہ ڈالر ہے اور یہ دیکھنے میں بھی کافی بھدے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ نوجوان لڑکیاں ایسے جوتے پہننا اپنی توہین کے مترادف سمجھتی ہیں۔ مگر ان جوتوں میں ایک خوبی ہے کہ یہ آرام دہ ہیں۔'' عمر لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے تمہارے پاؤں کے ناپ کا علم نہیں تھا تو میں اندازے سے خرید لایا ہوں۔ تمہیں پسند نہیں آئے ہوں گے۔ لیکن دیکھو یہ اونچی ایڑیوں والے لال جوتے تمہاری ماں کے ہیں جو مر چکی ہے۔ یہ تمہارے پیروں کے لیے نہیں ہیں۔ تم انہیں مت پہنو۔ جو پیروں کو کاٹیں، ان جوتوں کو چھوڑ دینا ہی اچھا۔ تو کیا تم میرے لائے ہوئے جوتے......''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل صوفیہ ان جوتوں کو پیروں میں پہننے لگی تھی۔ ناپ درست تھا اور وہ نرم سے جوتے حقیقتاً آرام دہ تھے۔ وہ آگے پیچھے چل کر عمر کو دکھانے لگی۔ اس کے انداز میں اتراہٹ سی تھی۔

''اتنے خوب صورت جوتے آج سے پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرے۔''

''تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ ان کا رنگ بھی خاصا برا ہے۔ انہیں خریدنا میری غلطی تھی۔'' وہ واقعی شرمندہ تھا۔

''میرے نئے جوتوں کو برا مت کہو، میرا دل دکھتا ہے۔'' وہ مسکرائی تھی۔

عمر کے جانے کے بعد اس نے البا کے جوتوں کے دونوں پاؤں ٹھوکروں سے مخالف اطراف میں اچھال دیے اور اپنے نئے جوتوں پر نظریں جمائے ہوئے سج سج قدم رکھنے لگی۔

پارک کے داخلی دروازے اور گھاس کے آخری قطعے کی بیچ ایک کچا میدان حائل تھا، جس میں گھاس نہیں لگی ہوئی تھی۔ اس میں داخل ہوتے ہوئے صوفیہ نے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑے اور ننگے پاؤں میدان کو پار کیا۔ اسے ڈر تھا کہ جوتوں کو گرد لگ جائے گی۔ پارک کے دروازے کے باہر سڑک پر اس نے ایک رومال سے اپنے مٹی بھرے پیروں کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور دوبارہ جوتے پہن لیے۔ بس اسٹاپ تک وہ نہایت احتیاط سے جوتوں کو مٹی سے بچاتے ہوئے چلتی رہی۔

اپارٹمنٹ میں گھستے ہی اس نے جوتے اتار کر انہیں جھاڑ پونچھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور اسٹول پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

رات کو سوتے ہوئے اس نے بتی جلتی رہنے دی اور بستر پر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف رخ کر کے لیٹ گئی۔ وہ دیر تک جوتوں کو پلکیں جھپکائے بنا گھورتی رہی۔

رات کو کسی وقت اسے لگا کہ جوتوں کے پیتاووں پر بنا ہوا مونوگرام اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھی اور انہیں بستر کے قریب ایک کرسی پر رکھ دیا۔ صبح تک اس نے تین دفعہ جوتوں کی جگہ تبدیل کی تھی۔ جب وہ پوری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد کسی نودمیدہ شگوفے کی مانند تروتازہ بستر سے اٹھی تو جوتے اس کے سرہانے رکھے ہوئے تھے۔



''میں ایڈم گرانٹ کا بیٹا ہوں۔''

یہ وہ آخری بات تھی جسے وہ عمر کی زبان سے سننے کی توقع کر سکتی تھی۔ وہ سکتے میں آ گئی۔

''تم نے کئی بار پرنیاں آئزک کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ میری ماں ہیں۔''

آج سماعت کا عمل صوفیہ کے ذمے تھا۔ وہ عمر کی طرح تحمل سے نہیں سن رہی تھی۔ وہ بے صبری سے جگہ جگہ اسے روکتی اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی۔ عمر اسے مطمئن کرنے کی اپنی سی سعی کر رہا تھا۔

صوفیہ کی بعض الجھنیں رفع ہو رہی تھیں تو بعض نئی الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ شدید مضطرب تھی۔ عمر کے نقوش کی مانوسیت کا عقدہ کھل گیا تھا اور وہ متعجب تھی کہ عمر اور گرانٹ میں اتنی گہری مشابہت کو وہ کیسے نظرانداز کر گئی تھی۔ دراصل وہ گرانٹ سے اس درجہ بدظن تھی کہ کوئی بھی اچھی بات اس سے منسلک نہ کر پاتی تھی۔

عمر کی کہانی پر غور کرتے ہوئے اسے ایک انوکھی سی خوشی ہو رہی تھی۔ اس میں اور عمر میں ایک تعلق تھا، ایک قدر مشترک تھی۔ ان دونوں کی زندگیوں میں ایک کردار یعنی گرانٹ مشترک تھا۔ وہ ایک حوالے سے جڑے ہوئے تھے اگرچہ یہ حوالہ خوش کن نہ تھا مگر تعلق تو اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ پیچیدہ نوع کی نسبت صوفیہ کو خوشی پہنچا رہی تھی۔

''میرا خیال ہے میں نے بہت سی خالی جگہیں پُر کر دی ہیں۔ اب میں ذرا کم پُراسرار ہو گیا ہوں۔'' عمر نے اپنے جوتے کی نوک سے ایک سوکھی شاخ ٹکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اسیل فون نمبر میں نے گرانٹ سے معلوم کیا۔ گھر کا پتا بھی انہوں نے بتایا۔ یوں بھی ان کی آدھی گفتگو تمہارے گرد گھومتی ہے۔ تم کبھی اسپتال نہیں آتیں۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی یادداشت ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے تو کبھی کبھی وہ خود سے فرض کر لیتے ہیں کہ ''صوفیہ آئی ہوگی لیکن مجھے بھول گیا ہے۔''

صوفیہ نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ وہ عمر کے سامنے تلخ باتیں کہنے سے گھبراتی تھی۔

''تم پارلر تک کیسے آ گئے؟ کیا اس کا پتا بھی گرانٹ سے ملا تھا؟ میں نے اسے بڑا پارلر کا بروشر ضرور دکھایا تھا لیکن اس پارلر کی تو بہت ساری شاخیں ہیں۔ اس نے اس مخصوص شاخ کی نشاندہی کیسے کر دی؟''

''تم درست کہتی ہو۔ انہیں تو اس کا نام تک یاد نہیں تھا۔ اس معاملے میں مجھے تھوڑا سا ذہن لڑانا پڑا۔ جس رات میں تمہیں موٹیل کے کمرے میں لے کر گیا تو تمہارے پرس پر پارلر کا لوگو بنا ہوا تھا۔ پھر ایک موقع پر تم نے رومال سے پسینہ صاف کیا تو اس رومال پر بھی مجھے وہ لوگو دکھائی دیا۔ میں اس سے قبل اسپتال میں تمہارے منہ سے سن چکا تھا کہ تم کسی بڑا پارلر میں ملازمت کر رہی ہو۔ میں نے لاس اینجلس میں قائم شدہ تمام شاخوں کے پتے حاصل کیے تمہارے گھر سے نزدیک ترین پارلر سے تلاش کا آغاز کیا اور تب......''

اس نے کندھے اچکا دیے۔

تفاخر کی طاقتور لہر صوفیہ کی رگوں میں سرائیت کر گئی۔ کیسا اعزاز تھا کہ عمر اسے ڈھونڈنے کی زحمت اٹھاتا رہا تھا۔

''صوفیہ! اگر میں کہوں کہ تم گرانٹ کو معاف کر دو تو؟''

وہ سابقہ موضوع پر لوٹ آیا تھا۔

صوفیہ نفرت سے سکڑ گئی۔ ''تم ایسا کیوں کہو گے؟''

''وہ شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔ قابل رحم ہیں۔ تم معاف کر دو گی تو ان کا بوجھ کم ہو جائے گا۔''

''اس نے مجھ پر کبھی رحم نہیں کھایا، میں اس پر رحم کیسے کروں؟''

عمر نے چھڑی کو زور سے جوتے پر مارا۔ ''میں نے بھی تو انہیں معاف کیا ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے۔ وہ تم سے کیے ہوئے سلوک سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ پھر بھی میں نے اللہ کے لیے......''

''میں، تم نہیں ہوں۔ میں تو بس میں ہوں۔ میرا دل چھوٹا ہے، بہت ہی چھوٹا۔''

اس نے عمر سے چھڑی لے لی اور ہتھیلی پر ضربیں لگانے لگی۔ ''تم مجھے اصل موضوع سے بھٹکا رہے ہو۔ موٹیل کے کمرے میں تم نے مجھ پر کیا عمل کیا تھا۔ میں ان مردوں کو بدصورت کیوں دکھائی دی؟ وہ مختلف نسلوں کے مرد تھے اور ان سب نے مجھے پہلی نظر میں ٹھکرا دیا۔ ان میں سے ایک اندھا بھی تھا۔ تم کس طرح مجھے قائل کرو گے کہ یہ واقعہ فطرت کے اصولوں سے ماورا نہیں ہے۔''

''میں تمہیں قائل نہیں کروں گا۔'' عمر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت کیوں نہیں ہے؟'' اس کی حیرانی میں اضافہ ہوا۔

''تم خود اس کا جواب جانتی ہو لیکن انسانی فطرت کے عین مطابق ناک کے نیچے کی چیز دیکھ نہیں پا رہی ہو۔ یقین کرو اس سے بڑھ کر سیدھا اور سادہ سوال میرے سامنے کبھی نہیں رکھا گیا۔''

''تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟''

''تم مجھ ہی سے سننا چاہتی ہو تو سنو، اللہ تم سے پیار کرتا ہے۔ اس نے تمہیں گناہ کرنے سے روک دیا کیونکہ اسے پسند نہیں کہ جہنم کی آگ تمہیں چھوئے۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے، کاش میں بھی اس صف میں تمہارے برابر ہوتا کاش وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیار کرتا۔ تم چنے ہوئے لوگوں میں سے ہو۔''

صوفیہ نے چھڑی پھینک دی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں، سیاہ آنکھیں پانی تلے ڈوب رہی تھیں پھر اس کا نچلا جبڑا کپکپانے لگا۔

''وہ مجھ سے پیار کرتا ہے؟ وہ مجھ سے پیار کیوں کرے گا جو اپنی پوری طاقت سے گناہ کرنے پر تل جائے، جو بغاوت میں حد سے گزر جائے، وہ اس سے پیار کیسے کر سکتا ہے؟ میں چنے ہوئے لوگوں میں سے کیسے ہو سکتی ہوں، تم مجھ پر رشک کر رہے ہو، میری برابری کی خواہش کر رہے ہو؟ تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ خدا مجھ سے پیار کر ہی نہیں سکتا۔''

کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔

عمر کچھ نہیں بولا۔ وہ شاہ بلوط کی شاخوں سے لپٹتی ہوئی شام کو دیکھ رہا تھا۔

✠ ✠ ✠

آہٹ پر عمر دروازے کی جانب متوجہ ہوا۔ صوفیہ چہرے پر ایک عجیب سا تاثر لیے اندر آ گئی۔ عمر مسکراتے ہوئے گرانٹ

کے بیڈ سے اٹھ گیا۔
''میں نے آپ سے کہا تھا کہ جلد ہی صوفیہ آپ سے ملنے آئے گی۔ دیکھیے! وہ آ گئی ہے۔'' عمر نے گرانٹ کو اطلاع دی تو اس نے کروٹ بدلتے ہوئے دھندلی آنکھیں صوفیہ پر گاڑ دیں پھر خفگی سے بولا۔
''آج تم نے کیسے تکلیف گوارا کی یہاں تک آنے کی؟ پچھلی دفعہ تم کب آئی تھیں؟ مجھے لگتا ہے کہ بہت طویل عرصہ گزر گیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔ تم بتا سکتے ہو کہ آخری بار کب صوفیہ مجھے دیکھنے آئی تھی؟'' وہ عمر سے مخاطب ہوا۔
''صوفیہ آئی تھی۔ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ آپ سو رہے تھے۔'' عمر نے صوفیہ کو بیٹھنے کو کہا مگر وہ کھڑی رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اور ہونٹ نہیں کھلتے تھے۔ لفظ بھی ناپید تھے۔
''تم کیسے ہو گرانٹ؟'' بالآخر اس نے ہمت کی۔
''تمہیں میری فکر کیوں ہونے لگی؟ میری موت تمہیں مسرت بخشے گی۔ تم ہو ہی ایسی۔ احسان فراموش۔ تمہاری ماں تمہیں قتل کرنے والی تھی، میں نے بچایا تمہیں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اس کی صحبت سے دور رکھا۔ میں نے فولادی ہاتھ سے تمہاری تربیت کی لیکن میں تمہارا بھلا چاہتا تھا۔''
گرانٹ کی آواز پست اور درد آلود تھی۔
''میں تمہارا احسان تسلیم کرتی ہوں۔'' معاً صوفیہ مڑی اور نہایت سرعت سے باہر نکل گئی۔ گرانٹ کی نظریں اس کی پیروی میں دروازے تک رینگ گئیں۔
''اس میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا لیکن محسوس کر سکتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ بدل گیا ہے۔ صوفیہ ویسی نہیں رہی، اس پر ایک نیا رنگ چھایا ہوا ہے۔''
''میں آپ سے متفق ہوں۔''
عمر نے گرانٹ سے کہا اور کاریڈور میں آ کر صوفیہ کو آواز دی۔ وہ دونوں اسپتال کے سنٹرل گارڈن میں آ گئے تھے۔
''میں نہیں کر سکتی عمر! مجھ سے نہیں ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی میرا لہو ابلنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں۔ بھڑوں کا چھتہ ہے جو میرے دماغ میں بھنبھناتا ہے۔ زہر پھیلاتا ہے۔''
وہ اعصاب زدہ نظر آتی تھی۔
''تم یہاں آئیں اور تم دل سے کوشش کر رہی ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں تمہاری ہمت کو سراہتا ہوں۔'' عمر نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔
''ہاں میں کوشش کر رہی ہوں میں اسے ضرور معاف کر دوں گی۔ آج نہیں تو کل یا اس کے بعد کسی دن، پر ابھی مجھے مجبور نہ کرو۔''
''کوئی بات نہیں کئی سالوں کا جمع کیا ہوا غصہ چند لمحوں میں نہیں ڈھل سکتا۔ تم آہستہ آہستہ خود پر قابو پا لو گی۔'' عمر نے خوش دلی سے کہا۔
''اور آخر میں تمہیں اچھا لگے گا۔ جب تم اپنے بغض کو پچھاڑنے میں کامیاب ہو جاؤ گی تو تمہیں خوشی ہو گی۔''
''خوشی۔'' اس نے کھوئے ہوئے انداز میں دہرایا۔ ''مجھے نہیں پتا خوشی کیا ہوتی ہے۔ میں اپنی پوری زندگی میں کبھی خوش نہیں ہوئی۔ مجھے نہیں یاد ایک بار بھی میں پورے دل سے ہنسی ہوں۔ مجھے تو ہنسنا آتا ہی نہیں، میں نے سوچا تھا کہ جب میں گرانٹ پر اپنے عزائم آشکار کروں گی تو مجھے خوشی ہو گی لیکن میں اس کے سامنے برنج کے خالی برتن کی طرح ٹھن ٹھن بجتی رہی، خوشی نہیں ملی۔ میں

خوشی کو ترستی ہوں۔ مجھے خوشی چاہیے۔''

عمر نے اسے بتانا مناسب خیال نہیں کیا کہ اس روز گرانٹ نے اس کا کہا ہوا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔

''تمہیں اصلی خوشی چاہیے تو اللہ کے لیے کچھ کر کے دیکھو۔ کسی صلے کی امید لگائے بغیر۔ بدلے میں کچھ مانگے بنا۔''

''خدا کی خاطر کیے جانے والے کام تو مشکل ہوتے ہیں۔ ان میں تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ وہ آسان کیوں نہیں ہوتے؟''

عمر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ امریکہ آنے سے کچھ دن پہلے اس نے اس سے ملتا جلتا سوال حکیم بیگم سے کیا تھا۔ اس نے صوفیہ کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔

''ہر کام کا ایک طریقہ مقرر ہے اور اس طریقے پر چلنے میں ہی بھلائی ہے۔

کچھ چیزوں کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ریشم کا کیڑا فنا ہوتا ہے تو ریشم ملتا ہے۔ کویے میں چھپ کر بیٹھنے سے بات نہیں بنتی، مشک آہو جان سے جاتا ہے تو کستوری حاصل ہوتی ہے۔''

''خدا کا نظام اتنا پیچیدہ کیوں ہے؟ جب اس نے پہیلیاں بنائی ہیں تو ان کو بوجھنے کا ہنر کیوں نہیں دیا؟''

''جسے تم پیچیدہ تصور کر رہی ہو، ہوسکتا ہے وہ پہیلی تمہارے لیے تخلیق ہی نہ ہوئی ہو۔ تمہارے نصاب سے باہر کے سوال وہ تمہیں حل کرنے کو نہیں کہے گا اور تم اسے خدا (God) کیوں کہتی ہو؟'' عمر کو اچانک خیال آیا تھا۔

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟''

''میری رائے میں تو بہت فرق پڑتا ہے۔ (God) ایک مبہم لفظ ہے۔ یہ کئی معنوں میں استعمال ہوسکتا ہے۔ اللہ اس کا ذاتی نام ہے۔ اس میں قربت ہے۔ ہو سکے تو اسے اللہ کہہ کر پکارا کرو۔ تمہیں خود ہی فرق محسوس ہو جائے گا۔''

''میں آزما کر دیکھوں گی۔''



بئیں کے مٹیالے پانی میں دھوپ کے نقرئی سکے گرتے اور خاکستری ہو جاتے۔ حکیم بیگم کنارے کی گرم ریت پر بیٹھی دھیرے دھیرے نزدیک آتی ہوئی بیڑی کو دیکھ رہی تھی۔ جب تمام مسافروں کی صورتیں اس کی بینائی کی پہنچ میں آ گئیں تو وہ سر نیہوڑا کر انگلیوں سے ریت کریدنے لگی۔ یہ چوتھی ٹولی تھی جو قاسو ملاح اڈہ نور کوٹ سے لے کر آ رہا تھا۔ اب اسے اگلے پھیرے کا انتظار کرنا تھا۔

''ماسی! گھر چل کے روٹی کھا لے۔ سورج ادھ آسمان میں آ گیا ہے۔'' صالحہ نے آ کر اس کا کندھا ہلایا۔

''تو جا۔ میں آ جاتی ہوں ہالی ایتھے رہن دے مجھے۔ (ابھی مجھے یہاں رہنے دے)'' وہ ہاتھوں کی جلد سے چمٹے ہوئے ریت کے ذرے جھاڑنے لگی۔

''کس کی راہ تک رہی ہے؟ کسی پروہنے نے آنا ہے؟''

''کالے کو اڈیک رہی ہوں۔'' حکیم بیگم کی نظریں بئیں کے پرلے کنارے پر جھکے ہوئے جھنڈ ولے برگد کے پہلو میں تیرتی ہوئی خالی بیڑی پر جمی تھیں۔

''بھاء عمر نے آنا ہے؟ وہ امریکہ سے مڑ کے آ رہا ہے؟ تو کوئی خاص کھانے نہیں پکے، بدانہ (مٹھائی کی ایک قسم) نہیں آیا۔ میں تو ابھی جا کے کھیر کا دیگچہ دھر دیتی ہوں۔'' صالحہ پُرجوش ہوگئی۔

''مجھے کوئی سدھ نہیں، اس نے آنا ہے کہ نہیں۔ میں تے اڈیک کرتی ہوں۔اڈیک لئی شرط نہیں کہ آن والے نے قول کیا ہو۔دل تانگھ کرے تے اکھ راہواں تے پہرہ نہ دے۔ بھلا ہو سکدا اے؟ (دل منتظر ہو اور آنکھ راہوں پر پہرہ نہ دے بھلا ہو سکتا ہے؟)''اس کے سفید بال ہوا سے کھل کر چہرے پر گر رہے تھے اور سر تواتر سے ہلتا تھا۔

صالحہ کی مسکراہٹ بجھ گئی۔''ماسی! اٹھ جا تو سیانی بیانی ہے۔ جب بھاء نے آنا ہو گا وہ خط ڈالے گا، ٹیلی فون کرے گا۔''وہ اسے گھر جانے پر آمادہ کرنے لگی۔

''نہ کڑیئے! میں نہیں جاسکدی۔ جد اخیرلی (آخری) بیڑی اس پار آ لگے گی میں آپی آ جاؤں گی۔''اس نے مٹیلے پن سے کہا۔

''تیرا وقت نہیں کٹتا ناں۔ تُو چل کے بھانڈے بنا ذرا دل لگ جائے گا۔'' حکیم بیگم نے پھولی ہوئی سیاہ نسوں والے کانپتے ہوئے ہاتھ صالحہ کے سامنے کر دیے۔

''ٹٹ جان، سڑ جان، نکمے، شہدے (ٹوٹ جائیں، جل جائیں، بے کار کمینے)''وہ ہاتھوں کو زمین سے ٹکرانے لگی۔

''ونگے ٹیڈھے (ٹیڑھے میڑھے) باسن گھڑتے ہیں۔کوئی ہنر نہیں کوئی چج (سلیقہ) نہیں ان میں، میرے ہتھ مجھے برباد کر گئے۔میرا ککھ کنڈا نہ رہا (میرے پاس کچھ نہ بچا)۔''



اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور صوفیہ نے باہر جھانکا۔نفیس لباس اور کھلا ہوا چہرہ اس کی خصوصی تیاری کی چغلی کھا رہا تھا۔عمر اس کی رہنمائی میں Den میں آ گیا۔

''میں نے خاصی مشقت کی ہے اس جگہ کو صاف کرنے میں پھر بھی اتنی قابل دید نہیں ہے۔اگر تمہیں یہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تو میرے کمرے میں چلتے ہیں وہاں کھڑکی میں بیل لگی ہے اور اچھا نظارہ ہے۔اس گھر میں اور کوئی ایسا مقام نہیں جہاں میں تمہیں بیٹھنے کی پیشکش کر سکوں۔''

صوفیہ گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ اسے ایک نظر دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا۔وہ بازوؤں کو کبھی سینے پر لپیٹ لیتی اور کبھی پہلوؤں میں گرا دیتی۔وہ مہک رہی تھی اور آنکھوں میں کھب رہی تھی۔

عمر نے کمرے میں نظر گھمائی اور ستائشی انداز میں ہنکارا ابھرا۔''یہ جگہ بہت اچھی ہے بلکہ شاندار ہے۔ مجھے پتا ہوتا میری وجہ سے تمہیں اتنی زحمت ہو گی تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔''

''کیسی زحمت؟''

''یہی صفائی وغیرہ اور لگتا ہے تم نے صوفوں کی پوشش اور پردے بھی دھوئے ہیں۔''اس نے تازہ دھلے ہوئے پردے کا کونہ ہاتھ میں لے کر اسے سونگھا۔

''تم بیٹھ جاؤ۔میں کھانا لگاتی ہوں۔سب تیار ہے۔''وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

عمر صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔چھوٹی چوکور میز پر کھانے کے برتن رکھتے ہوئے صوفیہ نے شرمندگی سے کہا۔

''ڈائننگ ٹیبل نہیں ہے تو اسی پر اکتفا کرنا ہو گا۔''

''مجھے تکلفات پسند نہیں ہیں۔''عمر نے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر آج میں خود کو ایک اچھی میزبان ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہوں۔''وہ بھنی ہوئی مرغی کی رکابی اور ٹماٹر کے

سوس والا پیالہ اٹھا کر لائی اور میز پر دھرتے ہوئے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ''شروع کرو۔''

''یہ کیا ہے؟'' عمر نے مرغی والی قاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا تمہیں پسند نہیں ہے؟'' وہ افسردہ ہونے لگی۔

''پسند ہے لیکن تم تو گوشت نہیں کھاتیں۔''

''تم تو کھاتے ہونا۔''

''پھر تم کیا کھاؤ گی؟''

''میں تمہیں کھاتے ہوئے دیکھوں گی۔ ویسے میرے لیے یہ سلاد جو ہے۔''

''مجھے کوئی کھاتے ہوئے دیکھے تو مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔'' عمر نے مکمل سنجیدگی سے بتایا۔

''اچھا ہوا تم نے بتا دیا ورنہ تم ایک لقمہ بھی نہ کھا سکتے۔'' صوفیہ اس سے زیادہ سنجیدہ تھی۔

کھانے کے بعد وہ کچھ خطوط اور پرانی تصاویر لائی اور انہیں صوفے کے چپٹے بازو پر ڈھیر کر دیا۔

''یہ تم رکھ لو۔ یہ تمہارے ماں باپ کی شادی کی تصویریں ہیں۔ گرانٹ ہمیشہ انہیں ایک دراز میں بند کر کے رکھتا تھا اور اگر کوئی ان کو چھونے کی جرات کرتا تو وہ غضب ناک ہو جاتا تھا۔ وہ طویل عرصے سے تمہاری ماں کے نام خطوط لکھتا رہا ہے۔ اکثر وہ مجھے ان خطوط کو پوسٹ کرنے کی ذمہ داری سونپا کرتا تھا۔ بہت سے تو میں ضائع کر دیتی تھی اور بہت سے اپنے بستر کے گدے تلے گھسیڑ دیتی تھی۔''

عمر نے ان مٹتی ہوئی، جا بجا اچٹی ہوئی تصویروں میں دو حسین، خوشی میں ڈوبے، جوانی کے رنگ سے دمکتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''میری ماں کتنی خوبصورت ہیں۔ میں نے کبھی انہیں غور سے دیکھا ہی نہیں۔'' اس نے ایک تصویر صوفیہ کی آنکھوں کے قریب کر دی۔



پرنیاں ایئرپورٹ کے چکنے فرش پر سنبھل سنبھل کر چلتی تھی کیونکہ اس کی ٹانگوں میں جان نہیں تھی اور گھٹنے کانپ رہے تھے۔ انسانوں کے جمگھٹے میں شکلیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ مختلف آوازوں کے اختلاط سے ایک بے ہنگم شور اٹھ رہا تھا جیسے بے شمار جھینگر مل کر جھنگارتے ہوں۔ اس کا سر یوں چکراتا تھا جیسے وہ کسی گول گول گھومنے والے برقی جھولے میں سوار ہو۔ جس پہلے چہرے کو اس نے شناخت کیا، وہ عمر کا چہرہ تھا اور اس کے پہلو میں کون تھا؟ اس کی نظر پھسلی، گری اور پھر سنبھلی۔ وینس اسے دیکھ چکی تھی۔ داؤد اس کی جانب قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ وہ چل رہی تھی یا تھم گئی تھی اس کی آنکھیں پتھر تھیں، زبان گنگ تھی۔ جب وینس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سینے سے بھینچ لیا تو وہ ایک گیلے اسفنج میں تبدیل ہو گئی۔ پانی سے بھرا ہوا اسفنج جب نچوڑا جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ وہ ہی پرنیاں کا حال تھا۔ ہر بن مو سے آنسو ابل رہے تھے۔ وینس اسے چوم رہی تھی۔ اس کی پیشانی، آنکھوں، ہونٹوں اور گردن کو اپنے ضعیف ہاتھوں سے کسی اندھے کی مانند ٹٹول رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ پرنیاں کو اپنے اندر جذب کر لے۔

''پرنیاں! تم نے کیا کر دیا؟ تمہیں مجھ پر ترس کیوں نہ آیا؟ کسی کا کچھ نہ بگڑا ہو گا۔ میرا تو کچھ بھی صحیح نہ رہا۔ کسی کا کیا گیا، دنیا ختم ہوئی تو میری، دل اجڑا تو میرا، تم ایک بار مجھ سے معافی مانگ لیتیں، میں معاف کر دیتی۔ ساری دنیا تمہیں دھتکار دیتی، میں نہ دھتکارتی میں تمہیں کبھی Disown نہ کرتی چاہے ساری دنیا تمہیں اپنانے سے انکاری ہو جاتی کیونکہ میں......'' وہ آنسوؤں میں بہہ

گئی۔

پرنیاں کل بھی اس کی مجرم تھی، آج بھی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکتی تھی۔ داؤد اور عمر خاموش کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

وینس ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''اب ماں بنی ہو تو تمہیں پتا چل گیا ہو گا کہ ماں خدا کی بنائی ہوئی سب سے مجبور مخلوق ہے۔ اولاد سے محبت نہ کرنا اس کے بس کی بات ہی نہیں۔ ماں کا دل خدا نے کسی مختلف مٹی سے بنایا ہے۔''

پرنیاں نے وینس کے ہونٹوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوب پتا چل گیا ہے۔'' وہ کنکھیوں سے عمر کو دیکھتی تھی۔ عمر نظریں ہٹا کر اس کے سامان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

کار ڈرائیو کرنے کے دوران داؤد بیک ویو مرر میں پرنیاں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے چہرے میں اب بھی وہ ہی سانس روک دینے والی صلاحیت ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ میں اتنے سالوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''تمہارے بچے کیسے ہیں اور تمہاری بیوی؟''

''تم ابھی تھوڑی دیر میں ان سب سے مل لو گی۔ البتہ میں پہلے سے بتا دوں کہ میرے تینوں بچوں میں سے کوئی بھی تمہارے بیٹے کی طرح خوب صورت نہیں ہے۔ وہ سب اپنی ماں پر گئے ہیں۔''

وہ ہنس رہا تھا اور اس کی آواز یوں پھنس کر نکل رہی تھی جیسے اس کے گلے میں درد ہو۔

✠ ✠ ✠

اسپتال کے اس کمرے میں جانے سے پہلے تک پرنیاں اسی گمان میں تھی کہ داؤد کسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ کسی اور کو گرانٹ تصور کر رہا تھا۔ بھلا وہ حقیقت کب تھا۔ وہ جو اس کے تخیل میں بستا تھا، جو پریوں کی کہانیوں کا ایک کردار تھا، جو رنگین مکھوٹے کی اوٹ سے اسے ''cara mia'' کہہ کر بلاتا تھا۔ جس کے ہاتھ مائیکل اینجلو کے ''موسز'' کے ہاتھ تھے جو اسے جہاں چھو لیتے، نشان چھوڑ جاتے۔ جو پھولوں کی زبان سے واقف تھا اور تین سفید جل زادیوں کے آسمانی گیت کا عنوان تھا بھلا وہ حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ داؤد نے کسی دوسرے کو گرانٹ سمجھ لیا تھا، کسی اجنبی کو۔ دروازہ کھولتے ہی اسے ایک دھچکا لگا۔

داؤد کو مغالطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے نقوش پر وقت نے جالا بن دیا تھا مگر اس کے گرانٹ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کوئلوں جیسی سیاہ تھیں، تاہم ان پر راکھ کے ذرے جمے تھے۔ مائیکل اینجلو کے موسز والے ہاتھ سفید چادر پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل ڈالا تھا۔ وہ زمین پر بسنے والی ایک عام لڑکی تھی۔ اس شخص سے ملنے کے بعد وہ یا تو آسمان پر رہی یا پاتال میں، پھر کبھی زمین اس کے قدموں تلے نہ آ سکی۔

وہ فسوں کار سیاہ آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں اور پھر اس نے کچھ کہا۔ وہ پرنیاں سے مخاطب نہیں تھا بلکہ اپنے سرہانے بیٹھے عمر سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ عورت کون ہے؟''



وہ شخص جسے اپنی کل کائنات مان کر اس نے تمام رشتوں کو بے مصرف کترنوں کی طرح لاتعلقی کے صندوق میں بند کر چھوڑا تھا، جس کی سوا وہ کچھ دیکھتی نہ تھی اور جس کے سوا کچھ سوچتی نہ تھی، جس کو اپنا کر وہ خود کو بھول گئی تھی، جس کو اپنی زمین سمجھ کر وہ ایک حقیر رینگنے والی بیل بن گئی تھی اور جسے اس نے آسمان کی مانند اوڑھا تھا، وہ شخص اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے پچھلے اکیس بائیس سالوں میں اس نے بے شمار دفعہ گرانٹ اور خود کو روبرو سوچا تھا اور وہ گرانٹ سے ہر تکلیف کی امید رکھتی تھی۔ وہ بے رخی سے پیش آ سکتا تھا، حقارت ظاہر کر سکتا تھا، اس پر ہنس سکتا تھا، اس سے نفرت کر سکتا تھا لیکن وہ اسے پہچانے گا نہیں، یہ پرنیاں کی ترتیب دی ہوئی ممکنات اور ناممکنات کی فہرست میں کہیں درج نہ تھا۔

''عمر! اسے باہر جانے کو کہو۔ میں کسی اجنبی کو اپنے آس پاس برداشت نہیں کروں گا۔''

وہ اس کی جانب سے رخ پھیرے عمر سے کہہ رہا تھا۔

ایک بار اس نے کہا تھا ''تمہیں بھولنا گناہ ہے۔'' اور آج وہ بے دھڑک یہ گناہ کر رہا تھا۔

پرنیاں کے بدن کو دہکے ہوئے سرخ لوہے سے داغا جا رہا تھا۔ وہ آگے نہ بڑھتی تھی اور پیچھے نہ ہٹتی تھی۔ وہ ایک بے جان کنکر تھی۔ اس میں حرکت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی تو وہ کیسے ہلتی۔

''میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ اس عورت کو کمرے سے باہر نکال دو۔''

اب کیا کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنے متعلق یاد دلانے کی کوشش کی جائے، چیخا چلایا جائے یا خاموش رہ کر انتظار کیا جائے کہ کب اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دیا جائے۔ وہ خود کیوں نہیں نکل جاتی؟ وہ اس کی زندگی سے بھی تو نکل گئی تھی، کمرے سے نکلنا کیا مشکل تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر لڑکھڑائے ہوئے قدموں سے چلنے لگی۔ دروازہ دھکیلتے ہوئے اس کی نظر کاریڈور کے درمیان کھڑے داؤد پر پڑی تو اس نے بے اختیار خود کو روک لیا۔ اسے احساس تھا کہ اس وقت اس کے چہرے اور سرد خانے میں پڑی ہوئی کسی لاش کے چہرے میں کچھ خاص فرق نہیں تھا۔ وہ اس چہرے کے ساتھ داؤد کا سامنا کیسے کرتی؟ وہ دروازے کا پٹ دونوں ہاتھوں میں جکڑے اسی جگہ تھمی رہی۔

''کیا آپ حقیقت میں ان کو نہیں پہچان سکے؟''

عمر کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں وہ کون ہیں۔''

''نہیں۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ تم بھی چلے جاؤ۔ مجھے تنہا رہنے دو۔''

''مجھے کوشش تو کرنے دیں۔ میں آپ کو یاد دلانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''میں اسے نہیں بھولا۔ میں چاہ کر بھی اسے نہیں بھول سکتا۔'' گرانٹ کی آواز کانپ رہی تھی۔

پرنیاں کو لگا کہ اس کا دل اب کبھی نہیں دھڑکے گا۔

''تو پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں کہا؟''

''کیونکہ اس کے علاوہ...... کیونکہ میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا تھا۔ تم کسی کو اندھی کھائی میں دھکا دے کر اسے مرنے کے لیے چھوڑ جاؤ اور وہ زندگی میں کبھی اچانک تمہارے سامنے آ جائے تو کیا تم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکو گے؟ کیا تم منہ نہیں چھپاؤ گے؟ ہوا میں تحلیل ہونا نہیں چاہو گے؟ میں نے پرنیاں کے ساتھ جو کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔ میں نہیں سہہ سکتا کہ وہ میری صورت پر نگاہ ڈالے۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ عمر! تم میری مدد کیوں نہیں کرتے؟ ہاں تم کر سکتے ہو۔ تم ایک بہت اچھے لڑکے ہو اور بھلے میں نے تمہارے ساتھ کوئی ایک اچھائی بھی نہیں کی پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ مرنے میں میری مدد کرو۔ ڈرو نہیں میں تمہیں قتل کرنے کو نہیں کہہ رہا۔ تم نے Mercy killing کا نام تو سن رکھا ہوگا۔ میرے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوگا۔ مجھے تو مرنا ہی ہے۔ اس لیے نہیں تو چند لمحوں بعد۔ تم ڈاکٹر فرڈیننڈ کو راضی کرو۔ تم اسے ضرور قائل کر لو گے۔ آج تو پرنیاں لوٹ گئی ہے، وہ ایک بار پھر یہاں آ گئی تو میں کیا کروں گا۔''

''آپ نے جان بوجھ کر انہیں جانے دیا؟ اس وجہ سے کہ آپ ان کا سامنا نہیں کر سکتے۔ میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ آپ کو ان سے ملنا ہوگا۔ ان سے بات کرنا ہوگی۔ میں ابھی ان کو لے کر آتا ہوں۔''

''عمر! میں تمہاری منت کرتا ہوں، مجھے اس آزمائش سے بچا لو۔ خدا کے لیے نہ جاؤ۔ میرا قصور معافی کے قابل ہوتا تو میں گڑگڑا کر معافی مانگتا، میں رحم کے لائق ہوتا تو رحم طلب کرتا۔ میں تو ایک نظر کا مستحق بھی نہیں ہوں، تم مجھے اس سے ہم کلام ہونے کو کہتے ہو؟ کیسی نادانی کی بات کرتے ہو۔''

پرنیاں دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ گرانٹ کی آنکھیں اسے دیکھ کر پھیلیں، پھر اس نے گردن جھکا لی۔

''تمہیں کس چیز کی معافی چاہیے۔ کہیں تمہیں میرا دل خالی کرنے پر معافی تو نہیں چاہیے؟ مجھے زندہ درگور کرنے پر بھی تمہیں معافی چاہیے ہوگی اور مجھے دنیا میں تماشہ بنانے پر بھی۔ میں کیا کیا معاف معاف کروں؟ تم نے اس وقت مجھے چھوڑ دیا جب میں تمہاری خاطر ساری دنیا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے لیے بھی یقیناً تمہیں معافی چاہیے ہوگی۔ میں عام تھی۔ تم نے مجھے خاص کر دیا۔ کالک ملے ہوئے چہرے ہجوم میں بھی آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ تم نے مجھے ایک تنکے سے بڑھ کر بے وزن کر دیا گرانٹ۔ اس پر بھی تمہیں معافی چاہیے۔ میں کیا کیا معاف کروں؟''

وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو کب کسی کی مانتے ہیں۔ اس پر وہ ہی بیت رہی تھی جو آگ کی قربت میں موم کی ٹکیہ پر بیتتی ہے۔

''مجھے تمہاری بددعا لگی ہے پرنیاں! دیکھو میں کیا ہو گیا ہوں۔''

اس نے گرانٹ کو روتے دیکھا تھا۔ وہ اسے روتے ہوئے دیکھنے کی خواہش کر رہی تھی۔ اسے خبر ہی نہ تھی یہ منظر اتنا تکلیف دہ ہوگا۔ وہ بلکنے لگی۔

''میں نے تمہیں بددعا نہیں دی۔ میں نے کبھی تمہیں بددعا دینے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔''

عمر اٹھا اور کچھ بھی کہے بنا کمرے سے چلا گیا۔ اس کی موجودگی میں وہ دونوں شاید کچھ ہچکچاہٹ محسوس کرتے۔

''تم نے کیوں بددعا نہیں دی؟ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میرے بوجھ میں اضافہ نہ کرو۔ پرنیاں پچھتاوے کا ایک پہاڑ ہے جس کے نیچے میں برسوں سے پس رہا ہوں۔ دم نکلتا ہے پر نہیں نکلتا۔ میں نے جب جب تمہیں سوچا میرے وجود میں ایک خنجر گڑ گیا۔ میں نے تمہیں کتنی بار سوچا اور کتنے خنجر میرے وجود میں اترے، میں شمار نہیں کر سکتا۔''

''تم پچھتاتے رہے اور میں محبت کرتی رہی۔ تمہیں ان دونوں باتوں کا فرق معلوم ہے گرانٹ؟'' وہ اس کے نزدیک آ گئی۔ ''تمہیں معلوم نہیں ہوگا۔ تمہیں کیا معلوم کہ محبت کرنا کیا ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے خود کو الٹی چھری سے ذبح کرنا اور مرنے کی چاہ

میں جیتے رہنا کیا ہوتا ہے۔"

گرانٹ نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ اس کے سوجن زدہ پاؤں اسے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔

"میرے پاس آ جاؤ پرنیاں! میں اٹھ نہیں پاتا ورنہ خود تمہارے پاس آ جاتا۔"

"جب میں نے تمہیں پاس آنے کو کہا، تم نے مجھے دور کر دیا اب میں کیسے پاس آؤں؟"

وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا اور آنسو بہتے رہے۔

"جب آخری دفعہ میں نے تمہاری آواز سنی تو تم نے کہا تھا 'البا سچ کہہ رہی ہے۔' تم میرے ماس کے ٹکڑے کاٹ لیتے مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس ایک جملے سے ہوئی۔ تم وہ جملہ کبھی نہ کہتے۔ تم کچھ بھی نہ کہتے۔ میں البا کی باتوں کو جھوٹ مانتی رہتی۔ مجھے اتنا درد تو نہ ہوتا۔"

"اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔ میں اسے ناخوش کرتا تو......"

"اس کی خوشی کے لیے تم نے میری زندگی چھین لی؟" وہ کراہ کر بولی۔

"میں اس کی بات تسلیم کرنے سے انکار کرتا تو میرے ہاتھ سے وہ موقع چلا جاتا۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو تب وہ میرے لیے کتنا اہم تھا۔"

"یہ میری قیمت ہے جو تم نے مقرر کی۔ ایک اہم موقعے کے عوض مجھے بیچ دیا۔ ترازو کے ایک پلڑے میں ایک اہم موقع اور دوسرے پلڑے میں غیر اہم پرنیاں۔ جس پلڑے میں پرنیاں تھی، وہ جھکا ہی نہیں۔ تمہاری پیمائش کو کیا الزام دوں۔ ایک پیمائش میں نے بھی کی تھی۔ ایک پلڑے میں پوری دنیا اور میرا ایمان اور دوسرے پلڑے میں ایڈم گرانٹ۔ تمہارے والا پلڑا اٹھا ہی نہیں۔ یہ تمہاری قیمت ہے جو میں نے طے کی۔"

گرانٹ خاموش رہا۔ اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ دھندلی آنکھوں سے دیر تک پرنیاں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ آ گئی۔

"پچھلی بار جب ہم ملے تھے تو تم جتنی حسین تھی آج بھی ویسی ہی نظر آتی ہو۔ لفظ 'حسن' تمہارے لیے ہی بنا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم چاند کی مٹی سے تخلیق ہوئی ہو۔ میں نے درست کہا تھا۔"

"ہوں تو مٹی ہی نا۔ مٹی کا کام ہے مٹی میں مل جانا۔ میں نے بھی وہ ہی کیا۔"

وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی، مٹی کے ڈھیر کی مانند کرسی پر گر گئی۔ گرانٹ کے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر آ ٹھہرے۔ وہ لمس آج بھی اسے جلا رہا تھا۔ گرانٹ کے ہاتھ کی پشت پر دو گرم بوندیں گریں اور پرنیاں کا سر جھک کر اس کے سینے سے آ لگا۔



عمر نے پرنیاں کو کمرے سے باہر آتے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ رو رہی تھی۔ عمر کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے نیچے جا رہی تھی۔ عمر نے اسے ٹوکا نہیں۔ جب وہ باہر سڑک پر پہنچ گئے تو عمر بولا۔

"آپا! کہاں جا رہی ہیں؟"

"امی کے پاس۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو کیا آپ بس میں جائیں گی؟ میں ڈاکٹر فرڈیننڈ سے کہتا ہوں، وہ آپ کو کار میں بھجوا دیں گے۔"

پرنیاں نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ سڑک کے پار خلا میں گھور رہی تھی۔

''آپا! میرا انتظار کیجئے۔ میں ابھی......''

پرنیاں نے سرخ آنکھیں اس پر جما دیں اور طیش سے کھولتے ہوئے بولی۔ ''دوبارہ مجھے آپا نہ کہنا۔ تم مجھے مخاطب نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ تمہاری مرضی لیکن ایک اور دفعہ تم نے مجھے آپا کہہ کر بلایا تو میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں گی اور مجھے حق ہے تم پر ہاتھ اٹھانے کا۔ جاؤ اور جا کر داؤد سے کار بھیجنے کو کہو۔''

''جی...... ٹھیک ہے۔'' وہ ہکلایا تھا۔



عمر نے رومال کے کونے سے گرانٹ کے ہونٹوں کی نمی صاف کی اور اس کے ماتھے پر پھسلتے ہوئے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

''آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ آپ سے ملنے کون آیا ہے۔''

گرانٹ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کے پپوٹے لرزتے رہے اور ان پر پسینے کے دھارے گرتے رہے۔

''میری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ مجھے نظر نہیں آتا۔ مجھے دیکھنا ہے۔ مجھے پرنیاں کو دیکھنا ہے۔'' وہ وحشت سے چلانے لگا۔

''میری پرنیاں آخری بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔ میں اسے کیسے دیکھوں؟'' اس پر رقت طاری ہو گئی۔

پرنیاں آگے آتے ہوئے اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ ''میں تمہیں دیکھ رہی ہوں گرانٹ! میں تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی اور میں ایک مدت سے ایسا ہی کرتی آ رہی ہوں۔'' اس نے انگلیوں کی پوروں سے گرانٹ کے تھرتھراتے ہوئے پپوٹوں کو چھوا۔

اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں اور اس نے پرنیاں کے چہرے کو خود پر جھکے ہوئے دیکھا۔

''پرنیاں! مجھے سینکڑوں فلموں کے مکالمے زبانی یاد ہیں۔ میں ان میں سے کوئی ایک تمہیں سنانا چاہتا ہوں مگر مجھے وہ یاد کیوں نہیں آ رہے۔ مجھے ان فلموں کے نام تک یاد نہیں آ رہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چند لفظ تو ہوں گے میری یادداشت میں۔ جو میں اس وقت بول رہا ہوں کہیں یہ کسی فلم کے مکالمے تو نہیں۔ کیا یہ کمرہ حقیقت میں ایک سیٹ ہے۔ ہاں تم 'ایکشن' کہو اور میں مکالمے شروع کرتا ہوں۔ جنوب کا ایک سپاہی ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ Scarlet جو اپنے گرد تمہاری بانہوں کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے بوسوں کی یادداشتیں اپنے ساتھ جنگ میں لے جانا چاہتا ہے۔ مجھے چاہنے کے بارے میں کچھ خیال نہ کرنا۔ تم وہ عورت ہو جو ایک سپاہی کو اس کی موت کی طرف روانہ کر رہی ہے...... ایک حسین یاد کے ساتھ...... Scarlet مجھے بوسہ دو، مجھے بوسہ دو، ایک بار۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔

''کیا میں تمہیں پیار سے Scarlet پکارا کرتا ہوں پرنیاں؟ کیا میں واقعی ایک سپاہی ہوں اور میں جنگ پر روانہ ہو رہا ہوں؟''

''عمر! تم کسی کو بلا کر لاؤ۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔'' پرنیاں نے روتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

عمر عجلت میں دروازے کی سمت بھاگا تھا۔

گرانٹ کے ہونٹوں پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں۔ آواز نکالنے کے لیے وہ جبڑوں کو بھینچتا اور گردن کو اکڑا اکڑا کر زور لگاتا۔

''مرنے والوں سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ تم نہیں پوچھو گی؟''

''مجھے اور کتنا رلاؤ گے؟ مجھے اتنا دکھی کیوں کرتے ہو؟''

''میری خواہش ہے کہ ہم دونوں پوری رات کھلے آسمان تلے ساحل پر گزاریں۔ سانتا مونیکا بیچ پر۔ ہم ایک پل بھی نہ سوئیں۔ میں تمہیں کیٹس کی شاعری سناؤں اور چاند کی پریاں ٹھہر کر ہمیں دیکھیں۔''

''نہیں۔ وہاں Scuba divers (غوطہ خور) ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور وہاں ستارے ٹوٹتے ہیں اور میرے جوتوں میں ریت چلی گئی تو کیا ہوگا؟''

''اچھا تو میں تمہارے سامنے سر کو خم کرتے ہوئے ایک گھٹنا فرش پر بٹھا کر اپنا دایاں ہاتھ تمہیں پیش کروں گا اور فرمائش کروں گا کہ مادموازیل (فرانسیسی طرز تخاطب) کیا مجھے تمہارے سنگ رقص کرنے کا اعزاز مل سکتا ہے۔''

''اور میں انکار کردوں گی۔ مجھے رقص کرنا آتا ہی نہیں۔''

''تو پھر ہم اس قدیم گاتھک عمارت میں تین جل پریوں والی ناند کے سائے میں چھپ کر بیٹھیں گے۔ وہاں گلابی مکڑیوں جیسے پھول ہمارے پیروں کے تلووں کو گدگدائیں گے اور بارش ہوگی تو جل پریاں بھیگ جائیں گی۔''

''لیکن تم بارش میں سگریٹ کیسے پیو گے؟ لائٹر کا شعلہ بار بار بجھے گا اور مجھے ٹھنڈ لگے گی۔ لاس اینجلس کے نومبر میں بھی مجھے ٹھنڈ لگتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں صرف ساون میں بھیگا جاتا ہے۔''

''تم نے مجھے اپنا ساون بھی تو نہیں دکھایا۔ بھلا کیسا ہوتا ہے وہ؟''

''اس میں کیچڑ ہوتی ہے، پتنگے اور مینڈک۔ کچھ آدھے اور کچھ پورے ننگے بچے اور گیت ہوتے ہیں۔ پھول اور حبس اور جھولے ہوتے ہیں۔ اور وہ سال کا سب سے خوب صورت وقت ہوتا ہے۔''

''نہیں۔ سب سے خوبصورت وقت وہ ہوتا ہے، جس میں تم اور میں قریب ہوں......اور ہم شادی کی انگوٹھی خریدنا تو بھول ہی گئے۔ اگر وقت اتنا کم نہ ہوتا، تو انگوٹھی ضرور بنوا لیتے۔ اب تصویریں اتارتے ہوئے فوٹوگرافر پوچھے گا کہ انگوٹھی کہاں ہے تو تم کیا جواب دوگی۔''

گرانٹ کی آنکھوں کی پتلیاں آدھے گرے ہوئے پپوٹوں کے نیچے گھسنے لگی تھیں اور آواز ڈوب رہی تھی۔

ایک ڈاکٹر، دو نرسیں اور ان کے پیچھے عمر کمرے میں آیا۔ گرانٹ کا معائنہ شروع کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پرنیاں اور عمر کو باہر جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ دونوں کمرے کے دروازے کے سامنے کاریڈور میں کھڑے رہے اور ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ خاصی دیر بعد دروازہ کھلا تھا۔ رخصت ہونے سے قبل ڈاکٹر نے عمر کو ایک طرف لے جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا تو پرنیاں بغور ان کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔

''ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟'' ڈاکٹر کے جاتے ہی اس نے عمر سے سوال کیا۔

وہ چپ تھا۔ اس کی خاموشی بیان سے زیادہ پریشان کن تھی۔ پرنیاں سے سوال دہرایا نہیں گیا۔

''میں دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا کیجئے۔ اللہ اس مشکل کو ان پر آسان کردے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمر نے کہا تھا۔

✠ ✠ ✠

''میں کلمہ پڑھوں گا۔'' گرانٹ بڑبڑایا۔

''آپ آسانی سے کلمہ طیب کے الفاظ ادا کرسکتے ہیں تو پڑھیے اس سے آپ بہت اچھا محسوس کریں گے۔ لیکن اگر آپ کو ایسا کرنے میں ذرا سی بھی تکلیف ہوتی ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔''

عمر نے کہا تو گرانٹ سہمی ہوئی نظروں سے اسے تکنے لگا تھا۔

''مجھے...... مجھے یاد نہیں آ رہا۔'' اس نے شرمندگی اور خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں پڑھتا ہوں اور آپ میرے پیچھے دہراتے رہیں۔ آپ کو یاد آ جائے گا۔ کہیے۔ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا......''

''نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا۔'' گرانٹ نے پرنیاں کا بازو زور سے دبوچ رکھا تھا۔

''نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا، محمد ؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' اس کی زبان سے خود بخود ادا ہوا۔ اس کی گردن کی تنی ہوئی رگوں میں نرمی آ گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ لوٹ آیا پھر وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں چلا گیا۔ اس کا تنفس اتنا پرشور تھا جیسے کوئی زنگ کھائی چرخی لوہے کے تنگ کڑے میں گھوم رہی ہو۔ پرنیاں نے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے گود میں رکھ لیا اور بے خیالی میں اس پر پھیلے ہوئے روئیں کو انگلیوں سے محسوس کرنے لگی۔

عمر نے اٹھتے ہوئے قمیص کی آستینیں کہنیوں سے اوپر چڑھائیں اور وضو کرنے چلا گیا۔ واپس آ کر وہ بستر پر گرانٹ کے سرہانے بیٹھا اور تسمیہ پڑھنے لگا۔

''یاسین۔

قسم ہے قرآن حکیم کی

یقیناً تم رسولوں میں سے ہو

سیدھے راستے پر ہو۔''

اس نے آیات کی تلاوت کا آغاز کیا۔

''یہ (قرآن کریم) نازل کردہ ہے غالب اور مہربان ہستی کا۔

تاکہ تم متنبہ کرو ایسی قوم کو کہ نہیں متنبہ کیے گئے ان کے باپ دادا اسی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

گرانٹ کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے عمر کو روکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیا پڑھ رہے ہو؟''

''سورۃ یٰسین۔ یہ قرآن کا دل ہے۔ جب کوئی سخت تکلیف میں ہو تو اسے پڑھنے کی ہدایت ہے۔''

گرانٹ کو یاد آ گیا کہ اس کا باپ ابراہیم کس طرح مرا تھا۔ خاکستری سیاہ پروں والے گدھ کی شکل والا خوف اس کے سر میں اپنی کرخت، مڑی ہوئی چونچ سے چھید کرنے لگا۔ اس نے خود کو ایک تنگ تاب کمرے میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کی بیلٹ تھی اور ابراہیم ایک کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرتے تھے جو اس کی بے ترتیب داڑھی کو بھگو رہے تھے۔ اچانک ابراہیم حرکت میں آیا اور ایک سفید گٹھڑی اس پر اچھال دی۔ اس نرم گٹھڑی نے اس کی ناک اور منہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ دراصل وہ ایک تکیہ تھا جو اس کے چہرے سے الگ نہ ہوتا تھا۔ اس نے سانس لینا چاہا۔

سانس کہاں تھا؟ وہ کہیں نہیں تھا۔

عمر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ''یقیناً پوری ہو چکی اللہ کی بات ان میں سے اکثر پر لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بلاشبہ ہم نے ڈال دیے ہیں ان کی گردنوں میں طوق کہ وہ ٹھوڑیوں تک ہیں تو یہ اوپر کو منہ اٹھائے رہ گئے۔''

ابراہیم نے کہا تھا کہ اس سورۃ کو پڑھنے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے تو پھر تکلیف بڑھتی کیوں جا رہی تھی۔ اس کی آنتوں اور سارے اندرونی اعضا کو آپس میں گانٹھیں دے کر ایک گچھا سا بنا دیا گیا تھا اور وہ گچھا کسی کانٹوں بھری جھاڑی میں الجھ گیا تھا۔

وہ ایک برف سے اٹے ہوئے میدان میں بھاگ رہا تھا اور اس کی موٹی اونی جراب گیلی ہو چکی تھی۔ وہ گھٹنوں تک برف

میں کھبا جاتا تھا۔ پھر اس کے آگے بھربھری برف میں سے پام کے دو درخت پھوٹ نکلے۔ جو چشم زدن میں آسمان تک اونچے ہو گئے۔ وہ رک گیا اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ ستواں ناک اور بجھی ہوئی نیلی آنکھوں والی لڑکی ننوں کا مخصوص لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے گالوں پر بہت سے زرد اور بھورے تل تھے۔ وہ اسے نہیں پہچانتا تھا۔ ایک گڑگڑاہٹ گونجی اور پام کے درخت اس پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ بھاگ نہیں سکا۔ برف نے اس کی ٹانگوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہ گردن تک برف میں دھنس گیا۔ اس کا خون جم رہا تھا۔

اسے حرارت چاہیے تھی۔ میلوں تک برف ہی برف تھی۔

عمر ٹھہر ٹھہر کر واضح اور صاف لب و لہجے میں پڑھ رہا تھا۔ ''اور ہم نے کھڑی کر دی ان کے آگے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور اس طرح ہم نے انہیں ڈھانک دیا تو انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔''

وہ ساؤنڈ اسٹیج پر اسارا گیا ایک سیٹ تھا جہاں وہ موجود تھا اور اپنے مکالمے یاد کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا مگر ایک لفظ بھی اس کے ذہن میں نہ آتا تھا یہاں تک کہ ''گھنٹی'' بجا دی گئی اور ڈائریکٹر نے صدا دی: ''ایکشن۔''

وہ چپ چاپ نظریں نیچی کیے شرمسار ہوتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ مکالمے تو اس تختی پر لکھے تھے جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ سیاہ تختی پر تحریر شدہ سفید حروف کو پڑھنے لگا۔ وہ عجیب سے مندرجات تھے۔ ''پولیس ڈیپارٹمنٹ'' کے الفاظ کے نیچے دو تاریخیں لکھی تھیں اور ان کے ساتھ کسی کا قد اور وزن درج تھا۔ آخر میں ایک نام تھا۔ احمد ابراہیم۔ وہ کس قسم کے مکالمے تھے اور وہ نام کس کا تھا؟ وہ ان تاریخوں پر غور کرنے لگا اور اسے یاد آ گیا کہ ان میں سے ایک اس کی تاریخ پیدائش تھی۔ اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ وہ تختی مگ شاٹس اتارتے ہوئے گرفتار کیے جانے والوں کو تھمائی جاتی تھی۔ اس نے بے اختیار ڈائریکٹر سے پوچھنا چاہا کہ اسے مسکراتے ہوئے تصویر کھنچوانی چاہیے یا مغموم تاثرات کے ساتھ۔ لیکن اسے ڈائریکٹر نظر نہیں آیا۔ اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا اسے نگل رہا تھا۔

اس نے روشنی کو ڈھونڈا۔ وہ ناپید ہو چکی تھی۔

''اور انہیں ایک سا ہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ

وہ ایمان لانے کے نہیں۔''

ایک آواز نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ ساحل پر تھا اور چمک دار ستاروں سے منور آسمان ناقابل یقین حد تک نزدیک تھا۔ ایک لڑکی جس کے بالوں پر ستاروں کی روشنی کا پرتو تھا، اس کی جانب پشت کیے سمندر کے رخ بڑھ رہی تھی۔ اس کا Poncho (لباس) ہوا سے لہرا رہا تھا اور وہ اس کے دامن کو ہاتھوں سے پکڑ کر اسے پھڑپھڑانے سے روک رہی تھی۔ وہ نم ریت پر بھاگتا ہوا اس لڑکی کے سامنے آ گیا۔ وہ پرنیاں تھی اور کسی بات پر اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ وہ کس قدر حسین تھی۔ وہ کبھی اس کے چہرے سے نظر نہ ہٹا تا اگر عین اوپر ٹوٹ کر ٹکڑوں میں بٹتا ہوا ایک ستارہ اس کا دھیان نہ بھٹکا دیتا۔ اس نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر گرتے ہوئے ستارے تلے کر دیا۔ وہ ستارے کی گرد جمع کر کے پرنیاں کو تحفے میں دینا چاہتا تھا تا کہ وہ مان جائے۔ ایک دم اسے یاد آیا کہ ستارے تو آگ ہوتے ہیں۔ لیکن تب دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہاتھ نہیں ہٹا سکا اور ستارے کی سلگتی ہوئی راکھ نے اس کے ہاتھوں میں آگ بھڑکا دی۔ آگ اس کی کہنیوں کی سمت اور وہاں سے آگے کندھوں اور سینے تک پھیل رہی تھی اور پھر وہ اس کے دل تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے دل کو جلتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

اس نے دھڑکن محسوس کی۔ وہ تھم چکی تھی۔

''تم تو اسی کو ڈر سناتے ہو جو نصیحت پر چلے اور رحمٰن سے بے دیکھے ڈرے تو اسے بخشش اور عزت کے ثواب کی بشارت دو۔''

وہ ایک جھیل کی سطح پر چت لیٹا تھا اور ڈوبتا نہ تھا۔ پانی کی بہاؤ کا شور اسے سنائی نہ دیتا تھا اور وہ پانی اسے گیلا بھی نہ کرتا تھا۔ ہوا اسے چھوتی تھی پر اس کا لمس کوئی احساس نہ جگاتا تھا۔ اجالا بھی تھا لیکن وہ اندھیرے سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھا۔ اس بار اس نے کچھ نہیں ڈھونڈا۔ اسے کسی بھی شے کی تلاش نہ تھی۔

✠ ✠ ✠

داؤد نے گلا کھنکار کر پرنیاں کی محویت توڑ دی۔

''اسے کل دفن کیا جائے گا۔ میں صبح تک سارے انتظامات کر دوں گا۔ اب تمہارے ہاسپٹل میں رہنے کا کوئی مطلب نہیں...... وینس آنٹی میرے آفس میں تمہاری منتظر ہیں۔ وہ تمہیں گھر لے جانے آئی ہیں۔ تم چلی جاؤ اور ہو سکے تو سو جاؤ۔''

پرنیاں نے داؤد کو نہیں دیکھا اور زیر لبی میں بولنے لگی۔ ''اسے تو دفن کر دو گے لیکن مری ہوئی تتلیوں کا کیا کرو گے۔ تمہیں خبر نہیں کہ تتلیاں مر جائیں تو انہیں دفن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ماتمی رنگوں کے ذرے ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ ایسی ہوا میں کوئی سانس کیسے لے؟''

''پرنیاں! تمہارا ذہن منتشر ہے۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ تم اس ماحول سے نکلو اور پلیز گھر چلی جاؤ۔''

''داؤد!'' پرنیاں نے تھکن گزیدہ لہجے میں پکارا۔ ''وہ زندہ تھا تو مجھے مرنے نہیں دیتا تھا۔ اب مر گیا ہے تو مجھے جینے نہیں دے گا۔''

✠ ✠ ✠

شاہ بلوط کے پتے ہتھیلیاں پھیلائے تیکھی شعاعوں کو ان تک پہنچنے سے روک رہے تھے۔ جو کرنیں ان کا سبز گھیرا توڑ کر نیچے آنے میں کامیاب ہوتیں، وہ گھاس کے تنکوں پر ایک چمکیلے سفوف کی مانند بکھر جاتیں۔ زردی مائل سفید سفوف کی کئی ڈھیریاں ان کے اردگرد نظر آتی تھیں اور ان مقامات پر گھاس کا سبز رنگ مدھم پڑ گیا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈھیری صوفیہ کے پیروں پر قابض تھی۔ جس نے اس کے ناخنوں کو گلابی چمک سے معمور کر رکھا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پیروں کے ناخنوں سے گلابی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔

عمر آلتی پالتی مارے ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ شاہ بلوط کا فراخ تنا اس کی پشت پر تھا اور دھوپ اسے چھونے میں یکسر ناکام تھی۔ ان دونوں کے بیچ کافی سے بھرے دو کاغذی کپ گھاس پر رکھے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد اس جگہ اکٹھے ہوئے تھے۔ گرانٹ کی موت سے چند روز پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئے تھے۔

صوفیہ نے گرا ہوا ایک پتہ اٹھایا اور اسے ہاتھ پر دھرتے ہوئے ایک پھونک سے عمر کی جانب اڑا دیا۔

''تم کبھی بات کرنے میں پہل نہیں کرتے۔ ہمیشہ میرے بولنے کا انتظار کرتے ہو۔'' اس نے شکایت کی۔

''میں جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ میری عادت ہی کچھ ایسی ہے۔''

''شکر ہے تم میں کوئی برائی بھی ہے ورنہ تمہیں انسانوں کی صف سے خارج کرنا پڑتا۔''

''نہیں مجھ میں اور بھی کئی برائیاں ہیں۔''

''اچھا وہ کیا ہیں۔ مجھے ضرور بتاؤ۔'' صوفیہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

''چونکہ وہ خامیاں ہیں اس لیے مجھے ان کا تذکرہ کرنا پسند نہیں۔ تم بھی انہیں دریافت کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ ہو سکتا

ہے، میں تمہیں برا لگنے لگوں۔''

''تم مجھے برے لگنے لگو تو میرے کئی مسائل حل ہو جائیں۔'' صوفیہ نے مبہم بات کی۔

''کیسے مسائل؟''

صوفیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ ہتھیلی کو کھردری گھاس سے رگڑنے لگی۔

عمر کو اس کے بدلے ہوئے مزاج نے حیران کیا تھا۔ ''تم نے مجھے جواب نہیں دیا۔''

وہ اپنے سامنے پڑا ہوا کافی کا کپ اٹھا کر منہ کے قریب لائی لیکن گھونٹ لیے بغیر واپس رکھ دیا۔

''تم مجھے برے لگنے لگو تو شاید مجھے نیند آنے لگے گی، مجھے بھوک لگنے لگے گی۔ میری ہر دم ایک کیف آور بخار میں جھلنے والی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ میں اکیلی بیٹھ کر بے مقصد مسکرانا بند کر دوں گی۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرنا چھوڑ دوں گی۔ ہر جگہ تمہارے نظر آنے کی امید ختم کر دوں گی۔ میں آسمانی چاند کو اپنے ارضی ہاتھوں سے چھو کر محسوس کرنا چھوڑ دوں گی۔ دیکھو عمر! ایک اس وجہ سے کہ تم مجھے برے نہیں لگتے، میری زندگی میں کتنے مسئلے ہیں۔''

عمر یہ سب سننے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر کچھ کہنے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی پریشانیاں لاحق ہیں۔ پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہیں برا لگوں۔ البتہ میں واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ میرے ویزے کی میعاد پوری ہونے والی ہے۔ میں چلا جاؤں گا تو شاید میری پیدا کردہ الجھنیں دور ہو جائیں۔''

''فاصلہ کسی کام آتا تو رونا کس بات کا تھا۔ تم سے جان چھڑانے کی غرض سے میں قطب شمالی میں جا بستی۔ یہ معاملہ سادہ ہے نہ آسان۔ میری جان میری انگلیوں کے ناخنوں میں اٹکی ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میری حالت کیسی ہے؟'' اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے اور وہ آنسوؤں کو واپس دھکیلنے میں کوشاں تھی۔

''عمر! اس رات تم نے میرا پیچھا کیوں کیا؟ تم نے اپنی سب سے مہنگی ملکیت اتنی کم قیمت پر کیوں بیچی، تم بغیر شرم کے بھیڑ والی جگہوں پر ننگے پاؤں کیوں چلے؟''

''میں نے جو بھی کیا، اللہ کے لیے کیا۔ اس میں میری ذاتی غرض شامل نہیں تھی۔''

''کیا تم نے میرے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کیا؟ میں ہمدردی کے علاوہ پوچھ رہی ہوں۔ میں محبت کے بارے میں سوال کر رہی ہوں۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟''

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

عمر دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

صوفیہ کا رنگ نچڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے یکدم خون کی لکیروں میں بدل گئے۔

''تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ کیا اس لیے کہ میں نے ماضی میں کچھ غلطیاں کی ہیں جبکہ تمہارے کردار میں ایسی کوئی خرابی نہیں اور اس حوالے سے تم مجھے خود سے کمتر تصور کرتے ہو۔''

''نہیں صوفیہ! مجھ سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ مجھے اچھے تو کیا کم برے لوگوں میں بھی نہیں گنا جا سکتا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ میں نے اپنی ماں کو اتنا عاجز کیا کہ انہیں زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی۔''

صوفیہ نے اضطراری کیفیت میں کافی کا کپ دوبارہ گرفت میں لیا اور اسے اپنے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

''مجھے احساس ہے کہ میں ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ جس سے تم محبت کرو لیکن میں تمہاری پسند کے مطابق بن جاؤں گی اور

میں بدل رہی ہوں۔ میں تیزی سے تبدیل ہو رہی ہوں۔ میں کبھی کبھی الکوحل استعمال کرتی تھی، اب بالکل نہیں کرتی۔ اور یہ سوچ کر کہ تمہیں سگریٹ پینے والی لڑکیاں پسند نہیں ہوں گی، میں نے پچھلے کئی ہفتوں سے ایک بھی سگریٹ نہیں پیا۔ میں ایسا لباس پہننے لگی ہوں جس میں پورا بدن پوشیدہ رہے۔ میں نے مردوں سے بے تکلفی برتنا ترک کر دیا ہے۔ میں عبادت بھی کروں گی۔ میں ہر وہ کام کروں گی جو تمہیں پسند ہو۔ کیا پھر بھی تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے؟''

اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے آنسوؤں پر ضبط کرنے میں کتنی دقت ہو رہی تھی۔ اس کے کپ والے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''تم ایک انسان کے لیے یہ سب کر رہی ہو۔ اگر یہ تمام کام تم اللہ کی خاطر کرو تو کتنا اچھا ہو۔''

''تم مجھے لاجواب کر سکتے ہو۔ تم ہمیشہ کر دیتے ہو۔ لیکن مجھے خود سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اچھا تو...... عمر! کیا تمہیں مہلت درکار ہے کہ تم اچھی طرح سوچ سکو۔ شاید چند دن بعد تمہیں ایسا لگے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔''

اس بار بھی جواب دیتے ہوئے عمر نے بہت وقت لیا تھا ''میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ بار بار ایک ہی بات نہ پوچھو۔ یوں بھی میرے پاکستان جانے میں......''

صوفیہ نے اس کا جملہ کاٹا۔ ''مجھے نہ بتاؤ کہ تم کب واپس جا رہے ہو۔ میں تم سے ایک آخری چیز مانگ رہی ہوں۔ میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں۔ چاہے تمہیں اچھا لگے یا برا۔'' وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ کر اسے چپ کروائے۔ اس کے گالوں پر روانی سے گرتے ہوئے آنسو اسے بے حد دکھ دے رہے تھے۔

''عام طور پر میں روتی نہیں ہوں کیونکہ لوگ آنسوؤں کو کمزوری پر محمول کرتے ہیں اور میں نے کبھی لوگوں پر ظاہر نہیں کیا کہ میں کمزور ہوں۔'' ایک آنسو اس کے ہونٹوں سے پھسل کر ٹھوڑی پر آیا اور اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کپ میں جا گرا۔

''میں اس لیے تمہارے سامنے نہیں رو رہی کہ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں اس لیے بھی نہیں رو رہی کہ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو۔ میں نہیں جانتی کہ میں کیوں چاہتی ہوں تم مجھے روتے ہوئے دیکھو۔'' ایک اور آنسو کپ میں گرا۔

''میں نے ساری زندگی اہمیت کے بغیر گزاری۔ مجھ پر کسی نے اتنی توجہ بھی نہیں دی جتنی کوئی عادی سگریٹ نوش اپنے راکھ دان پر دیتا ہے۔ تم نے اتنی اہمیت، ایسی توجہ دی تو یہ آنسو تمہاری موجودگی میں کیوں نہ بہیں۔ یہ تمہارے لیے ہیں۔ میں ان کو تم سے نہیں چھپاؤں گی۔''

ایک ساتھ کئی شفاف قطرے کپ میں ٹپکے تھے۔ اس نے روتے ہوئے نظر اٹھائی اور مسکرائی۔ وہ دل کو چیر دینے والی مسکراہٹ تھی۔

''کافی تو رہ ہی گئی۔ چلو جلدی پیو تاکہ میں جا سکوں۔'' اس نے اپنا کپ ہوا میں بلند کیا۔

''تم میرا کپ لے لو۔'' عمر نے پیش کش کی۔ ''تمہاری کافی میں آنسو ملے ہیں، مجھے یہ مناسب نہیں لگتا کہ تم اسے پیو۔''

صوفیہ بولی۔ ''اگر کافی کے اس کپ میں تمہارے آنسو گرے ہوتے تو جانتے ہو میں کیا کرتی......'' اس نے بات مکمل نہیں کی۔ ''رہنے دو۔ یہ کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے پینے میں اب کوئی مزہ نہیں۔''

اس نے کپ ایک طرف رکھتے ہوئے اپنا پرس کھولا اور کچھ نقدی نکال کر عمر کے پیروں کے نزدیک گھاس پر ڈھیر کر دی۔

''تمہارے دیئے ہوئے تین سو bucks میں نے بچا کر رکھے تھے۔ میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میں تمہیں لوٹا رہی ہوں۔ یہ پورے نہیں ہیں۔ پچھلے بہت سے دنوں سے میں کوئی ملازمت نہیں کر رہی تو انتہائی مجبوری میں اندازاً تیس bucks خرچ کرنا

پڑے۔"

عمر نے ہاتھ سے نوٹوں کو اس کی طرف دھکیلا۔"میں یہ واپس نہیں لوں گا۔تمہیں ان دنوں رقم کی ضرورت ہو گی۔کل جب تم کوئی ملازمت کرنے لگو تو بے شک لوٹا دینا۔"

صوفیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔"آنے والے کل کی بات نہ کرو۔ابھی تو مجھے 'آج' کو بھگتنا ہے۔" وہ پھر سے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔وہاں گزرے ہوئے وقت کی بری یادیں ہیں۔میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ آئندہ میں کہاں رہوں گی۔میں نے پچاس bucks کے نوٹ پر اپنا نیا سیل فون نمبر لکھ دیا ہے۔کاغذ پر اس لیے نہیں لکھا کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اسنبھال کر رکھنا مشکل ہے لیکن پچاس bucks کے نوٹ کو گم کر دینا آسان نہیں۔میں رابطے کا ایک ذریعہ چھوڑے جا رہی ہوں۔مگر تم اسے صرف اس صورت میں استعمال کرو گے اگر تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے۔اس کے سوا کوئی بھی دوسری بات کرنے کے لیے مجھے کال نہ کرنا۔" وہ ایک ہاتھ سے اسکرٹ سے چپکے تنکے جھاڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے گیلا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

"تم پہلے سے طے کر کے آئی تھیں؟ کیا تمہیں شک تھا کہ میرا جواب مثبت نہیں ہو گا۔"

عمر نے پست آواز میں کہا۔

"مجھے اچھے واقعات ذرا کم ہی پیش آتے ہیں۔تو میں منفی پہلو ہمیشہ نظر میں رکھتی ہوں۔میں ایک قنوطی لڑکی ہوں۔" روتے روتے اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔"مجھے ایک بات پر سخت تعجب ہے عمر! تم مجھے خدا کی محبت کے لائق سمجھتے ہو اور اپنی محبت کے لائق نہیں سمجھتے۔تم تو ایک انسان ہو۔"

اس کے چہرے پر جیسے نشتر سے چیر ا دیا گیا ہو۔

"تم منہ پھیر لو۔اس طرح مجھے جانے میں آسانی ہو گی۔"

اس نے بحث نہ کی اور رخ بدل کر شاہ بلوط کے تنے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

"تم سو تک گنتی کرنے کے بعد مڑ کر دیکھنا۔یہ کھیل میں بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔جب گنتی کرنے والا مڑ کر دیکھتا ہے تو دوسرا کھلاڑی نظر سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔"

عمر نے گنتی نہیں کی۔اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔کافی کی مٹتی ہوئی تلخ مہک اس کی سانسوں میں پھندے اٹکا رہی تھی۔ جو اس کے عقب میں دو کاغذی کپوں سے اٹھتی تھی۔اور ان میں سے ایک میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔



وہ آنکھیں موندے بستر پر دراز تھی کہ اس نے کسی کے اندر آنے کی آہٹ سنی۔قدموں کی چاپ اس کے سرہانے آ کر رک گئی۔اس نے پلکوں میں جھری پیدا کر کے عمر کو دیکھا۔

"میں یہاں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟ اگر آپ کو نیند آ رہی ہے تو بتا دیں۔میں چلا جاتا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔" پرنیاں نے لیٹے لیٹے اشارہ کیا۔

وہ اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔"میں بہت تھک گیا ہوں۔آج مجھے بڑی دیر تک پیدل چلنا پڑا۔دھوپ بھی تیز تھی۔میرا پورا جسم دکھ رہا ہے۔"

وہ واقعی تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

''تم لیٹ جاؤ۔ ذرا جسم کو آرام ملے گا۔'' پرنیاں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے لیٹنے کی جگہ دی۔ وہ خود پہلو کے بل ہو گئی تھی۔

عمر گردن کے نیچے تکیے کو دہرا کرتے ہوئے لیٹ گیا۔

''پانی پیا ہے تم نے؟ یا میں لے کر آؤں۔''

''جی۔ پانی پیا ہے۔''

''تم اتنی گرمی میں پیدل کیوں پھرتے رہے ہو؟'' اس کے انداز میں تشویش تھی۔

''مجھے ایک خاص چیز کی تلاش تھی اور وہ کہیں ملتی ہی نہ تھی۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے برا حال ہو گیا۔''

''لیکن وہ تھی کیا چیز؟''

''آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا امی!''

وہ لفظ کہتے ہوئے عمر ٹھٹکا نہیں اور اس کے منہ سے سنتے ہوئے پرنیاں چونکی نہیں۔ ان دونوں نے یوں ظاہر کیا جیسے عمر کا اسے 'امی' کہنا معمول کی بات ہو۔

''میرا سر بھی درد سے پھٹ رہا ہے۔ آپ چھو کر دیکھیں کہیں مجھے بخار تو نہیں ہو رہا۔'' عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے پر رکھ دیا۔

پرنیاں اس کے ماتھے کی جلد پر انگلیاں پھراتے ہوئے بولی۔ ''میرے اس ہاتھ کی تین انگلیاں قریب قریب بے حس ہیں۔ میں نے اپنی median اور ulnar نروز (رگوں کے نام) کو زخمی کر دیا تھا۔ تمہیں تو علم نہیں ہو گا کہ میں چند دن ایک میڈیکل اسکول میں بھی جاتی رہی ہوں۔ میں نے وہاں کچھ بھی نہیں سیکھا، کلائی کو درستی سے کاٹنا تو بالکل نہیں۔''

''مجھے کیسے علم ہو گا امی! آپ نے کبھی مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔''

پرنیاں کی انگلیاں اب اس کے بالوں میں چلنے لگی تھیں۔

''میں تمہیں کیا بتاتی؟ یہ کہ تمہاری ماں کا ماضی کوتاہیوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی پہلی ترغیب پر ہی پھسل گئی اور پھر کبھی سنبھلی ہی نہیں۔ اس نے ہمیشہ دل کی مانی اور دلوں کو غمگین کیا۔ اس میں اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مزید غلطیاں کیں۔ ان میں کون سی بات بتانے کے لائق تھی۔''

عمر نے پرنیاں کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب ہم غلطی کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے اور جب کوئی دوسرا غلطی کرتا ہے تو ہم معاف کرنا نہیں چاہتے ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

پرنیاں بہت قریب سے عمر کے چہرے کے نقوش دیکھ رہی تھی۔

''عمر! مجھے یہ کہنے میں سخت جھجک ہو رہی ہے۔ اگر تم......'' وہ ٹھہر کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ ''تم ......اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں چوم لوں۔ جب تم پیدا ہوئے تھے تو میں نے تمہیں ایک بار نہیں چوما اس ڈر سے کہ تمہیں چھوڑ کر جاتے ہوئے مجھے زیادہ اذیت نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں کس شے سے خود کو محروم کر رہی ہوں۔ میرے جیسا بے وقوف زمانے میں نہ ہو گا۔''

پرنیاں نے سب سے پہلے اس کی ناک کی نوک کو چوما تھا، پھر اس کے ماتھے کو۔ باری باری دونوں گالوں کو اور اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے وہ آنسوؤں سے اس کے چہرے کو بھگو رہی تھی۔ عمر کو شرم محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

''آپ صوفیہ کے متعلق تو جانتی ہیں نا۔'' اس عجیب لمحے کو گزارنے کی غرض سے جو پہلا موضوع اسے سوجھا، وہ اسی پر

بولنے لگا۔

''کون صوفیہ؟'' پریناں نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

''البا مارسیلو کی بیٹی صوفیہ۔''

''ہاں داؤد اس کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ اسے گود میں لیا تھا۔ تب وہ پانچ چھ ماہ کی ہوگی۔ بڑی پیاری بچی تھی۔ کیا تم اس سے ملے ہو؟''

''میں کئی بار ملا ہوں وہ ہاسپٹل آئی تھی تو اس کے بعد ہم دونوں میں اکثر ملاقات رہتی تھی۔''

''مجھے بھی ملواؤ۔ اسے دیکھنے کا اشتیاق ہے مجھے۔ وہ کیسی ہوگئی ہے؟ یقیناً بہت خوبصورت ہوگی۔''

''میرا قیاس تھا کہ آپ اس سے ملنا پسند نہیں کریں گی۔ کیونکہ وہ البا کی بیٹی ہے۔''

پریناں نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگالی۔

''یہ بات اہم نہیں ہے۔ میرے لیے اہمیت اس بات کی ہے کہ اسے گرانٹ نے پالا ہے۔ ویسے تم نے اچانک اس کا ذکر کیوں چھیڑ دیا ہے۔ کیا تم اسے پسند کرنے لگے ہو؟ کیسی لڑکی ہے وہ؟''

عمر اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے یہ موضوع کیوں چنا۔

پریناں کہہ رہی تھی۔ ''تم جس لڑکی کو اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرو۔ اسے ضرور بتا دینا کہ اس کی دو ساسیں ہوں گی۔ ایک میں اور دوسری تمہاری بے جی۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔ ''بلکہ تم صوفیہ کو ساتھ لے کر آنا۔ میں خود اسے خبردار کر دوں گی۔ کہیں بعد میں وہ شکوہ نہ کرے۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔'' عمر نے احتجاج کیا۔

''یہ بھی تو نہیں کہا کہ تم نہیں کر رہے۔ صوفیہ کا نام لیتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو تاثر آیا، وہ کسی خاص جذبے کی گواہی دیتا ہے۔ اس وقت میں اتنے قریب سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔'' اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے فاصلہ ناپ کر بتایا۔

''بہرکیف میں غلطی پر بھی ہوسکتی ہوں۔ تم تصحیح کر سکتے ہو اگر تم چاہو تو۔''

عمر ایک اور کڈھب لمحے میں گرفتار ہوگیا تھا۔ وہ فرار کے طریقے سوچنے لگا۔ اور وہ کامیاب رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گیا اور میز پر پڑے ہوئے دو لفافوں میں سے ایک کو اٹھاتے ہوئے اسے پریناں کو دے دیا۔

''مجھے اس کی تلاش میں کئی جگہوں پر جانا پڑا۔ مارکیٹ میں مل ہی نہ رہا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد یہ پھول میں آپ کو لا کر دوں۔''

پریناں ساکن آنکھوں سے اس کاسنی پھول کو دیکھ رہی تھی ''Gloxinia''۔ عمر کے مزید کہنے سے قبل وہ بول اٹھی۔ ''یہ Gloxinia ہے۔ پہلی نظر میں محبت کی علامت۔ وہ پھولوں کی زبان میں مجھ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ جب ہم پہلی بار ایک دوجے کے روبرو ہوئے تو اس نے مجھے یہ ہی پھول دیا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس نے جانے میں جلدی کی۔ میں ایک بات پوچھ ہی نہیں پائی وہ میرے دل میں ہی رہ گئی۔ اسے مجھ سے محبت تھی یا وہ محض پچھتاوے میں مبتلا تھا؟''

عمر نے ایک نگاہ میز پر دھرے دوسرے لفافے پر ڈالی اور دروازے کے نزدیک جاتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اس دوسرے لفافے میں ہے۔ اسے کھول کر دیکھ لیں۔''



وہ وائلن نوازوں کا ایک گروہ تھا جو بے گھر بچوں کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ سازندے ایک خاص ترتیب سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور اپنے سازوں کو ٹھوڑیوں اور کندھوں کے بیچ دبائے ایک طربیہ دھن بجا رہے تھے۔ ایک قلیل تعداد میں لوگ ان کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بچھے ہوئے پارچے پر چھوٹی مالیت کے چند نوٹ اور کچھ سکے پڑے تھے۔ جب تماشائیوں میں سے کسی کا جی وائلن کی آوازوں سے بھر جاتا یا اس کے پاس مزید وہاں ٹھہرنے کی فرصت باقی نہ رہتی تو وہ اس پارچے پر ایک ڈالر والا نوٹ یا کوارٹر کا ایک سکہ (پچیس سینٹ) اچھال کر اپنی راہ لیتا۔

صوفیہ بھی ان تماشائیوں میں موجود تھی اور پرس میں ہاتھ گھسائے ان نوٹوں کو ٹٹول رہی تھی جو اس نے گھر کا فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ اور اپنی سائیکل بیچ کر حاصل کئے تھے۔ وہ کب سے غور کر رہی تھی کہ خدا کی خاطر وہ کیا کرے۔ اور وائلن نوازوں کی ٹولی پر نظر پڑتے ہی اسے لگا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہو سکتا تھا جس سے خدا خوش ہوتا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے پرس میں سے ساری نقدی نکال کر اسے گنا تھا۔ حالانکہ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ وہ کتنی تھی۔ اسے مایوسی نے گھیر لیا، وہ اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی کسی کو دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر رقم کو گننے لگی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہو رہا تھا۔ پھر اس نے سب سے زیادہ مالیت کا نوٹ، جو بیس ڈالر کا تھا، الگ کر لیا۔ وہ کئی ثانیے شش و پنج میں مبتلا بیس ڈالر کے اس نوٹ کو انگلیوں میں مروڑتی رہی۔ آخر کار اس نے نقدی والے پارچے کی طرف پیش قدمی کی اور کھوئی ہوئی کیفیت میں نوٹ کو دیکھا۔ اس کی پشت پر درج شدہ الفاظ نے اس کی نظر کو جکڑ لیا تھا۔ ''IN GOD WE TRUST'' اس نے بارہا وہ الفاظ دیکھے ہوں گے لیکن ماضی میں وہ اس کے ذہن میں کوئی تاثر نہ ابھارتے تھے۔ اس وقت انہیں پڑھ کر وہ حتمی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس نے نوٹ کو پارچے پر پھینک دیا تھا۔

مطربوں کے سرخیل نے کمانچے کو وائلن کے تاروں سے دور لے جا کر ہاتھ کو ہوا میں اونچا کیا تو سارے مطربوں نے وائلن بجانے بند کر دیے اور ٹھوڑیوں کو کندھوں سے جدا کرتے ہوئے گردنیں سیدھی کر لیں۔ سرخیل خوشی سے اعلان کر رہا تھا۔

''اس لمحے تک یہ آج کے دن کا سب سے زیادہ چندہ ہے جو اس رحم دل لڑکی نے ہمیں دیا۔ یہ خصوصی داد کی مستحق ہے۔''

سب حاضرین اس کی طرف متوجہ ہوئے اور تالیاں بجانے لگے۔ مطربوں نے پھر سے کمانچے سنبھالے اور نئے جوش سے وائلن کے تاروں سے سُر نکالنے لگے۔ صوفیہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس مقام سے دور ہوگئی تھی۔

''کیا میں نے یہ نیکی محض خدا کی خوشی کو مدنظر رکھ کر کی ہے؟'' اس نے اپنے من کو کریدا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ خدا کی راہ میں کیے جانے والے کام تو خالص خوشی دیتے ہیں۔ شاید اس کام میں دکھاوا بھی شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ بیس bucks خیرات میں دینے پر لوگ مجھے سراہیں گے۔ مجھے ایک اچھی لڑکی تصور کریں گے۔ بدلے کی امید تو لگائی میں نے، صلہ تو چاہیے تھا مجھے۔ اور بیس bucks کی اوقات کیا ہے؟ خدا جو اپنی لاتعداد مخلوق میں سے مجھ پر بطور خاص مہربان ہوتا ہے اس کی محبت کا جواب میں بیس bucks سے دیتی ہوں۔ اس قدر ادنیٰ ایثار۔ اتنا پست حوصلہ ہے میرا؟''

وہ شرم سے مری جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بڑھ کر غم زدہ تھی۔



اس شام اٹارنی، آرچی گرفن کے دفتر پر تین چیزوں کا تسلط تھا۔ تمباکو کا دھواں، خاموشی اور مایوسی۔ وہ اتنا بیزار تھا کہ اس نے اپنا سیل فون بند کر رکھا تھا اور دفتر کے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اتار کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ راکھ دان میں سگریٹ کے بچے ہوئے ٹوٹوں اور راکھ کی مقدار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل کو میز کے آخری سرے پر پٹخا اور درد سے بھری

کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبانے لگا۔ وہ ایک یقینی شکست سے دو چار تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس سے قبل کبھی اس کا شکست سے پالا نہ پڑا ہو۔ وہ کوئی زیادہ کامیاب شخص نہیں تھا۔

وہ ایک 'پبلک ڈیفنڈر' تھا اور اپنی موجودہ حیثیت سے کسی بھی طرح مطمئن نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ سے کسی بڑی پرائیویٹ لاء فرم میں پارٹنر بننے کا خواب دیکھا تھا لیکن یہ خواب تب پورا ہوتا جب وہ غیر معمولی قابلیت اور لیاقت کا مظاہرہ کر پاتا اور بڑے نجی اداروں کی نظر میں خود کو پرکشش ثابت کر پاتا۔ اس کے برعکس اس نے دوسرے درجے کی ایک بری شہرت والی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی اور کم و بیش ہر معاملے میں اوسط واقع ہوا تھا۔ اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو حقیقت پسندی سے جانچتے ہوئے فیصلہ کرتا تو وہ پبلک ڈیفنڈر کے طور پر کام کرنے کا بھی اہل نہیں تھا لیکن انسانوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی خوش فہم تھا۔ وہ ہر ناکامی کا الزام قسمت کے کھاتے میں ڈال کر اپنی انا کو مطمئن رکھتا تھا۔ اس کا وتیرہ تھا کہ وہ کسی متوقع ناکامی پر جی بھر کے مایوس ہوا کرتا تھا اور جدوجہد کرنے کے بجائے ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہتا تھا۔

اس بار ناکامی کا نام میبل تھا۔ ویسے یہ اس کا اصل نام نہیں تھا۔ یہ تو وہ نام تھا جس سے پکارا جانا اسے پسند تھا۔ اس کے والدین کا رکھا ہوا نام ٹوبی کریگ تھا۔ بدقسمتی سے آرچی گرفن کو میبل کا اٹارنی مقرر کر دیا گیا تھا۔ وہ بدہیئت سیاہ فام لڑکا نہایت الجھے ہوئے کردار کا حامل تھا۔ فسادات میں اس کے ماں باپ اور بہن بھائی مارے گئے تھے۔ تب سے وہ اکیلا رہا تھا۔ اس کا نہ تو کوئی حلقہ تھا اور نہ ہی احباب۔ اس کا آئی کیو لیول ستر سے اسی کے درمیان تھا۔ اسے اپنی بہن سے جس کا نام میبل تھا، غیر معمولی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ کبھی بھی اس کی موت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا۔ غالباً اسی سبب اس نے خود کو میبل کہلوانا شروع کر دیا۔ اس پر ایک لڑکی کو قتل کرنے کا الزام تھا بلکہ الزام کیا تھا۔ ایک لحاظ سے ثابت ہو چکا تھا۔ تمام واقعاتی اور مادی شہادتیں اس کے مجرم ہونے کی نشاندہی کرتی تھیں۔

مقتولہ کے ناخنوں سے ملنے والے انسانی گوشت کے ذرات میبل کی کھال کا حصہ قرار پائے تھے یعنی وہ مرتے ہوئے ملزم سے جسمانی مزاحمت کر رہی تھی۔ پولیس نے میبل کو اس حال میں پکڑا تھا کہ وہ لڑکی کی لاش کو فٹ پاتھ سے نیچے گھسیٹ رہا تھا۔ آلۂ قتل جو ایک چھوٹی آہنی ہتھوڑی تھی، مردہ لڑکی کے لباس کے اندر سے ملی تھی۔ اگرچہ اس پر سے نشانات انگشت دستیاب نہیں ہوئے تھے لیکن اخبار پڑھنے والے اور ٹیلی ویژن دیکھنے والے کسی مجرم کے لیے یہ انتظام کرنا معمولی بات تھی۔ میڈیا کی دی ہوئی غیر ضروری آگاہی نے جرائم پیشہ افراد کو محتاط اور چالاک بنا دیا تھا۔

ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس میں واقع جوتوں کی ایک بڑی دکان کے سیلز بوائے نے گواہی دی تھی کہ اس نے قتل کے دن سے پہلے میبل کو مقتولہ سے ہاتھا پائی کرتے دیکھا تھا۔ یہ تصدیق بھی ہو چکی تھی کہ وہ لڑکی انتھونی جڈ کے گیراج میں جاتی رہتی تھی جہاں میبل کام کرتا تھا۔ یہ سارے حقائق premeditation (پیش بندی) کے نظریے کو تقویت دیتے تھے اور رہا motive (محرک) تو اس مسئلے کا حل بھی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے نکال لیا تھا۔ وہ ایک دلچسپ کہانی لے کر آیا تھا کہ میبل کو سفید فاموں سے نفرت تھی۔ مبینہ طور پر اس کے والدین اور بہن بھائی سفید فام لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے رشتے کے چچا انتھونی جڈ کے بقول میبل نے ایک سے زیادہ مواقع پر سفید فاموں سے انتقام لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیوری، جو آٹھ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی اور جس میں سب کے سب سفید کھالوں والے تھے، اس مفروضے سے مکمل متفق نظر آتی تھی۔ پروسیکیوشن (استغاثہ) کے پاس لاش تھی، آلۂ قتل تھا، premeditation کی تائید میں شہادتیں تھیں۔ ایک معقول motive تھا اور ایک مہربان جیوری بھی تھی۔ وہ میبل کو فرسٹ ڈگری مرڈر میں سزایاب کروانے کی پوری طاقت رکھتے تھے۔

دوسری طرف ڈیفنس اٹارنی (وکیل صفائی) آرچی گرفن تھا جس کو خود بھی میبل کے بے گناہ ہونے کا یقین نہ تھا۔ اس کی اپنی کہانی میں جوتوں کے ایک جوڑے کے ذکر کی بھرمار تھی۔ وہ اس درجہ بھونڈی اور حقیقت سے ماورا داستان تھی کہ اگر اسے جیوری

کے ممبران کے گوش گزار کیا جاتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آرچی کو فاتر العقل تصور کرتے۔ آرچی نے میبل سے حقائق اگلوانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی۔ مگر وہ اپنی 'فیری ٹیل' کا ایک حرف بھی ادھر سے ادھر کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

'پروسیکیوشن' اپنا کیس پیش کر چکی تھی اور کل 'ڈیفنس' کو شروعات کرنا تھیں۔ میبل اتنا بد شکل تھا کہ جیوری کو اس سے ہمدردی ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ جیوری تو ایک طرف رہی خود آرچی کے اندر اس کی صورت دیکھنے پر نفرت اٹدتی تھی۔ وہ معذور تھا، اس کے باوجود اس کی جسمانی قوت کے بارے میں کسی کو غلط تاثر دینا آسان نہیں تھا۔ وہ ایک دیوجثنی جسامت رکھتا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بھی وہ مرنے والی دبلی پتلی، سفید، نازک لڑکی پر حاوی دکھائی دیتا تھا۔ جب اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے عدالت میں مقتولہ کی تصاویر کی نمائش کی اور منظر کشی کی کہ کس طرح نفرت سے ابلتے ہوئے وحشی میبل نے ہتھوڑی کی پے در پے ضربوں سے اس کی کھوپڑی پچکا ڈالی تھی، سنہری بالوں سے سجے خوشنما سر کو ہڈیوں کے چورے میں تبدیل کر دیا تھا تو جیوری کا فورمین (نمائندہ)، جو ایک نفاست پسند معلم، اور دو سنہری بالوں والی نوجوان بیٹیوں کا باپ تھا، خوف سے تقریباً بے ہوش ہو چلا تھا۔

وہ ابھی سے خود کو ناکام قرار دینے میں حق بجانب تھا۔ ہارنے میں کوئی برائی نہ تھی۔ مگر اس شرمناک ڈھنگ سے ہارنا باعث اذیت تھا۔ جوں جوں کل کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی، توں توں اس کی مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ کمرہ کثیف دھوئیں سے اس حد تک بھر چکا تھا کہ ساری فضا دھندلی ہو رہی تھی۔ اسے کھڑکی کھول کر دھوئیں کو باہر نکالنے کا خیال آیا تاہم تساہل نے اسے ہلنے نہ دیا۔

ایک دم نادیہ اندر آئی۔ وہ اس کے ہمراہ اس کیس پر کام کر رہی تھی اور کچھ دیر قبل تک اتنی ہی ناامید تھی جتنا وہ خود لیکن اب اس کو دیکھنے پر آرچی کو ادراک ہوا کہ اس کے مزاج میں بدلاؤ آ چکا تھا اور وہ بولی تو اس کی آواز میں بھی ولولہ تھا۔

''ذرا باہر آؤ۔ تم نے اس کمرے میں اتنا دھواں نہ بھر رکھا ہوتا تو میں اسے یہاں لے آتی۔''

''کسے؟'' اس نے تلخی سے پوچھا۔

''تم باہر تو آؤ۔''

''میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ جو کوئی بھی ہے، اسے ٹال دو۔''

''خوش قسمتی کو ٹالنے والے احمق کہلائے جاتے ہیں۔ اٹھو اور ایک فاتح کی شان سے چل کر آؤ۔''

وہ بیزاری کی انتہا کو چھو رہا تھا لیکن نادیہ کے انداز نے اس کے اندر تجسس جگا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔

جب اس نے صوفیہ مارسیلو کو دیکھا تو اسے سخت کوفت ہوئی۔ نادیہ اسے خوش قسمتی کیوں کہہ رہی تھی؟ میبل نے پولیس کو اس کے بارے میں بتایا تھا کہ اس رات وہ دونوں اکٹھے تھے اور صوفیہ اس واقعے کی گواہ تھی۔ میبل آج بھی اس بات پر قائم تھا البتہ پولیس تحقیقات کے نتیجے میں میبل کا بیان دروغ گوئی پر مبنی نکلا تھا۔ صوفیہ نے تمام قصے سے مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا اور جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی بھی ثابت کر دی تھی۔ اس کیس میں اس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ پروسیکیوشن اور ڈیفنس دونوں نے ہی اسے قابل توجہ نہ گردانا تھا۔ اور اب نادیہ اس کی آمد کو فتح اور خوش قسمتی قرار دے رہی تھی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' اس نے منہ بگاڑ کر صوفیہ سے پوچھا۔

جواب میں اس نے جو کہا، اسے سن کر نہ صرف آرچی کا بگڑا ہوا منہ سنور گیا بلکہ اس کا جی بے اختیار گنگنانے کو مچلنے لگا۔

✠ ✠ ✠

''وہ ایک منفرد اور خاص لڑکی ہے۔ خوبصورت ہے، فطرتاً نیک ہے، مجھے اس سے ملنا، اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں، مجھے اس سے انس ہے۔ اس کے آنسو مجھے دکھ دیتے ہیں۔ میں اسے خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔

میں اسے ہمیشہ یادرکھوں گا لیکن محبت......نہیں...... مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ میں اس کے لیے ایسا محسوس نہیں کرتا۔ اگر میں اس سے محبت کرتا تو مجھے پتا ہوتا، مجھے خود کو ٹٹولنا نہ پڑتا، میرے اندر سے کوئی مثبت صدا آتی تو مجھے اس کے روبرو مان لینے میں کوئی عار نہ ہوتا۔ جب محبت نہیں ہے تو اعتراف کیسے کروں؟'' عمر نے سینکڑوں بار سوچی ہوئی باتوں کو ایک بار پھر سوچا تھا۔

اپنے آپ سے کیے جانے والے اس مکالمے کا نتیجہ اب بھی مختلف نہیں تھا۔ وہ پاکستان جانے سے پہلے ایک بار صوفیہ سے بات کرنے کی شدید خواہش محسوس کرتا تھا لیکن صوفیہ کے آخری الفاظ اسے روک دیتے تھے۔

وہ گروسری اسٹور کے عقب میں بنی ہوئی تنگ گلی پار کر رہا تھا۔ نکڑ پر رکھے ہوئے بڑے ڈمپسٹر سے ابھرنے والی آہٹوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ غالباً ڈمپسٹر میں کوئی جانور گھس گیا تھا اور کوڑا کھدیڑ رہا تھا۔ اس کا قیاس غلط نکلا۔ اسی لمحے اس نے ڈمپسٹر کے سرے سے اوپر اٹھتے ہوئے ایک انسانی سر کو دیکھا۔ وہ نو دس سال کا ایک بچہ تھا جس کے سر کے بالوں کو ایک طویل عرصے سے قینچی نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے کانوں کی لویں، گردن کی پشت اور ماتھے کا نصف حصہ بالوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ ان پھولے ہوئے روکھے بالوں میں وہ ایک جھبرا پلا نظر آتا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کوڑے کے انبار کو کرید رہا تھا۔ عمر نے نزدیک جاتے ہوئے اسے پکارا تو وہ اچھل پڑا۔ اس ویران گلی میں شاید وہ کسی مداخلت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے عمر کو جواب نہیں دیا اور جست لگا کر کچرا دان سے نکل آیا۔

''تم ڈمپسٹر میں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔

جھبرا پلا اپنی بدبودار برساتی اتار کر اسے تہہ کر رہا تھا۔ جس کے نیچے اس نے ہری اور سیاہ دھاریوں والا بے آستین کا اونی لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے ناتواں بدن پر خاصا کھلا تھا۔ اتنی سخت دھوپ میں اس نے وہ گرم لبادہ جانے کیوں پہنا ہوا تھا۔

''کوڑا چننا تمہارا پیشہ ہے لڑکے؟'' عمر نے پھر پوچھا۔

جھبرے پلے کے منہ سے پہلا جملہ برآمد ہوا جو تقریباً ناقابل فہم تھا۔ اس میں انگریزی زبان کے الفاظ موجود تو تھے البتہ وہ اتنے برے تلفظ سے انہیں ادا کر رہا تھا کہ وہ مہمل لگ رہے تھے۔ غور کرنے پر عمر نے جو مفہوم اخذ کیا وہ لگ بھگ یوں تھا کہ muchacho میں ایک غریب بچہ ہوں۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''شالم پیدرو۔'' اس نے برساتی کو کمر پر لٹکتے ہوئے چیتھڑا نما تھیلے میں منتقل کیا۔

''تم اسکول نہیں جاتے؟''

وہ خاموشی سے بالوں تلے ڈھکی ہوئی کان کی لو کو کھجانے لگا۔ یا تو وہ سمجھا نہیں تھا یا وہ اس سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

''تم کوڑے میں سے چنی ہوئی چیزوں کا کیا کرتے ہو؟''

''میری ماں سلویا......وہ بیمار ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی اور میرا باپ پیدرو ہماری پروا نہیں کرتا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ ہمارے پاس ڈالر نہیں ہیں تو کھانا نہیں ہے۔ میں رقم جمع کرتا ہوں تاکہ ہم سب بہن بھائی پکنک پر جاسکیں۔ ایک ماہ میں ایک پکنک۔ کوڑے سے اچھی چیزیں مل جاتی ہیں۔''

اس نے اٹک اٹک کر عمر کو بتایا تھا۔

''اگر تمہیں ابھی پچاس ڈالر مل جائیں تو تم کیا کرو گے۔''

''میں کہوں گا Diantre!''اس نے آنکھیں چمکائیں۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''جیسے لاس اینجلس کے لوگ کہتے ہیں Wow!''

''اچھا تو پھر کہو Diantre''

عمر نے والٹ میں سے پچاس ڈالر کا وہ نوٹ نکال کر اسے دے دیا جس پر صوفیہ کا سیل فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

''شالم نے Diantre نہیں کہا۔اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔وہ منہ کھولے یوں عمر کو تک رہا تھا جیسے وہ ایک بھان متی (مداری) ہو اور اسے کوئی شعبدہ دکھا رہا ہو۔

''اس کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''کچھ نہیں شالم! تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔یہ نوٹ تمہارا ہے۔''

شالم، جو انگلیوں سے مسل کر نوٹ کو پرکھ رہا تھا، یہ الفاظ سنتے ہی گھوما اور گلی کے موڑ کی سمت بڑھنے لگا۔عمر ڈمپسٹر سے آگے نکل کر گلی کے وسط میں ٹھہر گیا۔وہ نوٹ شالم کے حوالے کرتے ہی اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شالم ملحقہ گلیارے میں داخل ہو گیا۔اب وہ اسے نظر آنا بند ہو گیا تھا۔پھر اس کی مدھم گنگناہٹ عمر کے کانوں تک آنے لگی۔وہ اجنبی زبان میں گا رہا تھا اور cucú cucú کی تکرار کر رہا تھا۔

وہ نوٹ صوفیہ کا آخری سراغ تھا اور وہ اس سے دور جا رہا تھا۔صوفیہ اس کی زندگی سے جانے والی تھی......وہ جا چکی تھی......وہ چند قدم چلا اور دوبارہ رک گیا۔اسے گلی میں جھانکتے ہوئے شالم کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔

''مجھے ایک بات پر سخت تعجب ہے عمر! تم مجھے خدا کی محبت کے لائق سمجھتے ہو اور اپنی محبت کے لائق نہیں سمجھتے۔تم تو ایک انسان ہو۔''

کوئی بھاری شے اس کے سینے میں پھڑ پھڑانے لگی۔اس کا حجم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔اس کے پھیلنے سے گھٹن ہونے لگی۔وہ اتنی پھیل گئی کہ سانس کی راہ مسدود ہو گئی۔وہ درد آلود شے پسلیوں کو توڑ ڈالنے کے درپے تھی۔بے اختیار وہ شالم کے تعاقب میں چلنے لگا۔وہ اس گلی میں پہنچا تو شالم کو تیز رفتاری سے جاتے ہوئے پایا۔وہ لمبے ڈگ بھرنے لگا۔

''شالم! رکو۔''

اس کے آواز دینے پر شالم نے رکے بغیر کچھ کہا جو اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

''وہ نوٹ مجھے واپس دے دو۔میری بات سنو۔''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شالم بھاگ پڑا تھا۔وہ بھی بھاگنے لگا اور اسے مسلسل پکارنے لگا۔شالم ان سنی کر کے ناک کی سیدھ میں دوڑ رہا تھا۔وہ پوری قوت سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔شالم ایک پھرتیلا لڑکا تھا۔وہ دیر تک اسے بھگاتا رہا۔اگر وہ ایک بند گلی میں پھنس کر بے بس نہ ہو گیا ہوتا تو جانے کب تک عمر کے ہاتھ نہ آتا۔وہ شالم کے سر پر پہنچ گیا اور اس سے نوٹ لوٹانے کا مطالبہ دہرانے ہی والا تھا کہ شالم نے جھٹکے سے جیب میں انگلیاں گھسا کر نوٹ کو باہر کھینچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے درمیان سے پھاڑ ڈالا۔

''جہنم میں جاؤ Sanamagan''نوٹ کے ٹکڑوں کو ہوا میں اچھالتے ہوئے اس نے غصے سے چلا کر کہا۔

یقیناً وہ اسے گالی دے رہا تھا۔عمر کو اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔اس نے تیزی سے نیچے جھکتے ہوئے نوٹ کے پھٹے ہوئے حصوں کو مٹھی میں دبوچ لیا۔اس نے نظر اٹھائی تو شالم بری طرح رو رہا تھا۔بے قابو تنفس اور آنسوؤں کی ملی بھگت سے اس کا

کمزور بدن ہل رہا تھا۔

''رونا بند کرو۔'' عمر نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے یہ رقم چھین نہیں رہا۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ پچاس ڈالر میں ایک اچھی پکنک نہیں ہو سکے گی۔ کیوں نہ میں تمہیں سو ڈالر دے دوں تا کہ تم بہن بھائی خوب عیش کرو۔''

جھبرا پلا ایک بار پھر سکتے میں چلا گیا۔ ''اگر تم سو ڈالر دو گے تو میں Diantre ضرور کہوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔''

✠ ✠ ✠

صوفیہ پولیس آفیسرز کے ہمراہ عدالت سے باہر آئی تو لوگوں کے بپھرے ہوئے ہجوم نے اس پر گالیوں اور دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اس پر ہر وہ برا لفظ آزما رہے تھے جو ان کے ذخیرہ الفاظ میں موجود تھا۔ وہ اسے زندہ جلانے اور اس کا سر کاٹ ڈالنے کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ قتل ہونے والی لڑکی کے رشتہ دار اور دیگر سوگواران تھے۔ وہ ہر صورت میبل کو اس قتل میں سزایاب کروانے پر کمربستہ تھے لیکن عدالت میں دیئے گئے صوفیہ کے بیان کے بعد یہ ممکن نظر نہ آتا تھا، لہٰذا ان کا معاندانہ رویہ باعث حیرت نہ تھا۔

صوفیہ نے کسی پر توجہ نہیں دی تھی۔ آفیسرز کی حفاظت میں وہ اس ہنگامے سے دور سڑک پر آ گئی تھی۔ اسے پولیس کار میں بٹھایا گیا اور کار فوراً ہی روانہ ہو گئی۔ وہ کھڑکی کے شیشے میں سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگی۔ پولیس آفیسر نے اس سے کوئی بات کی جس کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ وہ کچھ کہنے یا سننے کی حالت میں نہیں تھی۔ وہ خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اس کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ اس تجربے سے گزر رہی تھی جس سے کوئی بدصورت عورت ایک خوبصورت بچے کو جنم دے کر گزرتی ہے۔ اس نے ایک ایسا کام کیا تھا جس سے کوئی بھی غرض بندھی ہوئی نہ تھی۔ اس نے میبل کی بے گناہی دنیا پر واضح کر دی تھی۔ اور میبل کون تھا؟ کوئی بھی نہیں۔ نوٹرے ڈیم کا کبڑا Quasimodo جو اس کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھید بھاؤ کا انتر نہیں سمجھتا تھا۔ اینچ پیچ سے انجان تھا۔ صوفیہ نے کسی کو خوش نہ کیا تھا، صرف خدا کو خوش کیا تھا تو اسے خوشی کیوں نہ ملتی؟

اس نے کھڑکی سے باہر آسمان کی سمت نگاہ کی۔ بادلوں والی دوپہر پام کے اونچے درختوں کے آرپار ہو رہی تھی۔ بادلوں کے چنگل سے چھوٹنے والی دھوپ ایک سفید بلی کی مانند چھلانگ لگا کر کار کی چھت پر اترتی تھی پر اس کے پنجے نہیں جمتے تھے اور وہ پھسل جاتی تھی۔ وہ راستے میں آنے والے ہر اگلے پیڑ سے کودتی تھی۔ پھر اس برق رو بلی کی چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ کوئلے کے برادے سے بنے ہوئے بھوتوں ایسے بادلوں نے سیاہ باز و دراز کر کے اسے درختوں کی چوٹیوں سے اچک لیا تھا۔

صوفیہ نے ڈرائیو کرنے والے آفیسر سے گاڑی روکنے کو کہا۔

''مجھے اسی جگہ اتار دو۔ یہاں سے آگے میں پیدل جاؤں گی۔''

''یہ موزوں نہیں ہوگا۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ تم نے جسے ناراض کیا ہے وہ گینگسٹر ہے۔''

اس تنبیہ پر صوفیہ مسکرائی تھی۔ ''میں نے جسے راضی کیا ہے، اس کا نام تمہیں بتا دوں تو تم جا کر اس گینگسٹر کو سمجھانے لگو۔''

''کیا؟''

صوفیہ اس کی حیرانی سے محظوظ ہوئی تھی۔

''اس شہر میں ایسا موسم پھر کبھی نہیں آئے گا۔ تم مجھے میرے حصے کی ہوا سے محروم نہ کرو۔''

وہ بضد رہی تو گاڑی روک کر اسے اتار دیا گیا۔ پولیس کار کے فاصلے پر جانے تک وہ ایک جگہ کھڑی رہی۔ پھر اس نے اپنے پیروں سے جوتے الگ کیے اور انہیں احتیاط سے سڑک کے کنارے رکھ دیا۔ عمر کے اس تحفے کی وہ ہر ممکن حد تک حفاظت کرتی

تھی۔ اس نے سیل فون بھی جوتوں کے ساتھ رکھا اور ننگے پاؤں سڑک پر پھرنے لگی۔ ہوا میں بارش کی مہک اس کی پوروں میں بستی تھی۔ درختوں تلے ملگجا اندھیرا تھا۔ وہاں ہوا تھی، بادل اور ان کی نمی تھی اور خوشی تھی۔ ایک بے کنار مسرت جو اس کے وجود میں سماتی نہ تھی۔ اس نے کسی پرندے کی مانند بانہیں پھیلائیں اور پنجوں کے بل گھومنے لگی۔

"Spanish dancer! turn around"

اس کے ہونٹوں پر 'اینا' کا گیت آ گیا۔ اس نے زور سے چکر کاٹا۔

"Spanish dancer! get out of town"

وہ ایڑیاں اچکا کر گھومی۔

"They called me out for the world to see"

اس کا گھیر دار اسکرٹ اس کے جسم کے گرد لپٹتا اور اٹھتا تھا اور اس میں ہوا بھر رہی تھی:

"Spanish dancer! get out of town"

وہ ایک اور چکر پورا نہ کر پائی۔ سڑک پر قدموں کی گہری دھمک گونجی تھی۔

"اسے سزا دو۔ اسے ایک عبرتناک سزا دو۔" کسی نے چلا کر کہا تھا۔

وہ خوف سے سُن ہو گئی۔ وہ لوگ دوڑتے ہوئے اس کے نزدیک آ گئے۔ وہ سنبھل نہیں سکی تھی۔ اسے کھینچ کر زمین پر گرا دیا گیا تھا۔ اس نے پوچھنا چاہا کہ وہ اس پر برہم کیوں تھے لیکن بولنے کے لیے منہ کھولا تو کوئی لفظ برآمد نہ ہوا۔ وہ منہ کو بند بھی نہیں کر سکی تھی۔ ان میں سے ایک جسیم مرد نے اس کے پیٹ میں ٹھوکر ماری تھی۔ درد نے اس کے جسم کو چیر ڈالا تھا۔ وہ آخری ٹھوکر نہیں تھی۔ وہ تو آغاز تھا۔

"اسے مار ڈالو۔ یہ چڑیل ہے۔ یہ اس کالے جانور کی مددگار ہے۔"

دوسری ٹھوکر پر وہ گھسٹ کر پرے ہوئی۔ وہاں کوئی "پرے" نہیں تھا۔ صرف کرخت جوتے تھے۔ جو بے جان سڑک اور زندہ گوشت میں تمیز نہیں کرتے تھے۔

پسلیوں میں پڑنے والے ٹھڈے نے اسے دہرا کر دیا۔ اس نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے ان بے رحم جوتوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ دو تھے لیکن اسے کچلنے والے پاؤں کتنے تھے؟ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اگر وہ چیخ پاتی تو شاید اس کا سانس رواں ہو جاتا۔ وہ اندر ہی کہیں قید ہو گیا تھا اور سانس نہ لے پانے سے وہ کسی آدھی کٹی ہوئی گردن والے پرندے کی طرح تڑپتی تھی۔ وہ اب بھی اسے گالیاں دے رہے تھے۔ لیکن یہ پریشان ہونے کی بات نہیں تھی۔ تشویش تو اس بات پر تھی کہ وہ اب تک سننے اور سمجھنے کے قابل کیوں تھی؟ وہ بے سدھ کیوں نہیں ہو جاتی تھی؟ اس کی حسیات کام کرنا کیوں نہیں چھوڑتی تھیں؟ ایک بار اس کا ہوش چلا جائے تو اسے کیا کہ وہ اسے گالیاں دیں یا اس کے ٹکڑے کر دیں۔ ٹھوکریں اسے لڑھکاتیں، اچھالتیں، سیدھا کر دیتیں، گھٹنوں کے بل یا اوندھے منہ۔ اپنے اعضا پر اس کا اختیار ختم ہو چکا تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے حرکت کر سکتی تو ان میں سے کسی ایک کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ کم از کم ایک رخ سے تو اس کا جسم محفوظ ہو جاتا۔ اس کی زبان مردہ گوشت کا لوتھڑا ہو چکی تھی ورنہ وہ ان کی منت سماجت کرتی۔ وہ پھیپھڑوں پر زور ڈالتے ہوئے چیخنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ اس کے تڑپنے میں کمی آنے لگی۔ وہ لحظہ بہ لحظہ ساکت ہو رہی تھی۔ پھر اندھیرے کا مہربان مکڑا ایک ریشمی تار سے جھولتا ہوا اس پر اترا اور اسے نرم جالے میں لپیٹنے لگے۔ حواس سلب ہونا بعض اوقات کتنا راحت بخش ہوتا ہے۔

وہ ایک تاریک اتھاہ میں ڈوبنے لگی۔ وہ ہرگز اس گہرائی سے ابھرنا نہیں چاہتی تھی مگر کوئی بھنبھناہٹ تھی جو اس کو اوپر کھینچ

رہی تھی۔ وہ بھنبھناہٹ بتدریج ایک گیت میں ڈھل رہی تھی۔ اس کے گرد جالا بنتا ہوا مکڑا بدک کر آسمان کی اور اڑنے لگا۔ درد لوٹ رہا تھا۔ وہ پہلے سے بڑھ کر بھیانک روپ میں لوٹا تھا۔ اس کے گال کے نیچے کھردری زمین گیلی تھی۔ اس پر ان گنت ننھے ننھے کنکر گر رہے تھے جو اسے بھگو رہے تھے۔ اگلے چند لمحوں میں اسے ادراک ہو گیا کہ بارش ہو رہی تھی۔ وہ گیت اس کے کان میں گھسا جا رہا تھا۔ اس کا منبع کہاں تھا؟ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس کا سیل فون تھا جو کہیں پاس ہی بج رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ وہ نمبر صرف ایک شخص کے علم میں تھا۔ کیا عمر اسے کال کر رہا تھا؟ اس خیال نے اسے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے بے چینی سے سیل فون کو تلاش کیا۔ وہ اس کے ہاتھ سے ذرا ہی دور تھا۔ کوشش کیے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی اس کے باوجود اس نے زمین کو ہتھیلیوں سے پکڑتے ہوئے خود کو آگے دھکیلا اور تب اسے اپنے ہاتھوں پر لگا ہوا خون دکھائی دیا۔ جانے وہ ہاتھوں سے بہا تھا یا جسم کے کسی دوسرے حصے سے نکل کر ہاتھوں پر لگ گیا تھا۔ یہ تعین کرنے کی فرصت کسے تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح سیل فون کو گھسیٹ کر منہ سے قریب کیا اور کانپتی ہوئی انگلی سے بٹن دباتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔

''صوفیہ! شکر ہے کہ تم نے فون اٹھا لیا۔'' وہ عمر تھا۔

اس نے ہاتھ کی آڑ بنا کر بارش کی بوندوں کو سیل فون پر گرنے سے روکا اور گردن ٹیڑھی کر کے نیچے دبے ہوئے کان کو زمین سے جدا کیا۔

''ہم لوگ ایئر پورٹ جا رہے ہیں۔ میں، میری امی، نانی اور میرے ماموں۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ تم سن رہی ہو صوفیہ؟''

''ہاں۔''

''میں بہت دیر سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔ کیا تم مصروف تھیں یا مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔'' وہ خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا تھا۔

''بولتے رہو عمر!'' اس نے کراہ کر کہا۔

''ہماری فلائٹ میں تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔ میں جلدی میں ہوں۔''

''میں بھی جلدی میں ہوں۔''

''میں پاکستان پہنچ کر تم سے پھر رابطہ کروں گا۔''

''جو بھی کہنا ہے، ابھی کہو۔ پاکستان جانے پر......'' اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ بارش کے قطرے بھاری ہو رہے تھے، ان کے گرنے میں تیزی آ رہی تھی۔

''بہت شور ہے۔ تمہارے الفاظ وضاحت سے سنائی نہیں دے رہے۔''

''بارش ہو رہی ہے۔''

''تم کسی دوسری جگہ کیوں نہیں چلی جاتیں۔ بارش سے دور تا کہ یہ شور مدھم ہو جائے۔''

''میں نہیں جا سکتی۔ تم باتیں کرتے رہو عمر!''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔''

سڑک پر بہتا ہوا پانی فون میں داخل ہونے لگا تھا۔ عمر کی آواز غیر واضح ہوتی جا رہی تھی۔

''تم تو جھوٹ نہیں بولتے۔'' اس نے حلق کے بل چلا کر کہا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''اب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے آری کے دندانوں جیسے درد سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

''صوفیہ! میں اگلے سال دوبارہ امریکہ آؤں گا تو میرے آنے کا مقصد محض سمسٹر میں شامل ہونا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی نا؟''

''ہاں تم جہاں لے جاؤ گے، میں جاؤں گی۔''

''تمہاری آواز بالکل ڈوب گئی ہے...... میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا، تمہیں کبھی دکھی نہیں ہونے دوں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی نا؟''

''ہاں میں کروں گی۔ میں مرنے تک تمہارا انتظار کروں گی...... تمہیں پتا ہے عمر! میں نے قیمت ادا کی ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ بعض چیزوں کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ کونے میں چھپ کر بیٹھنے سے بات بنتی ہی نہیں۔ قیمت ادا کرنے والے اچھے لوگ ہوتے ہیں عمر! خدا ان سے خوش ہوتا ہے۔''

''صوفیہ! صوفیہ!!''

نمی نے فون کو ناکارہ بنا دیا تھا۔

قطرے اس کی آنکھوں میں گر رہے تھے، نتھنوں اور باچھوں میں گھس رہے تھے۔ اس نے چہرہ موڑ کر زمین پر گال ٹکا دیا۔ عمر کہتا تھا کہ مشک آہو جان سے جاتا ہے تو کستوری حاصل ہوتی ہے۔ ریشم کا کیڑا فنا ہوتا ہے تو ریشم ملتا ہے۔ وہ فنا ہو رہی تھی۔ وہ خدا کی خاطر فنا ہو رہی تھی۔ اس کے حلق میں کوئی کسیلی چیز اٹکی تھی جو اس کا دم گھونٹ رہی تھی اور وہ یاد کرتی تھی کہ عمر نے ایک اور بات بھی کہی تھی جس کا یاد آنا بہت ہی ضروری تھا۔ روشنی کم ہونے لگی...... روشنی مٹ رہی تھی...... روشنی اس کی پتلیوں میں سمٹ رہی تھی۔ اور اچانک اسے وہ بات یاد آ گئی۔

عمر نے کہا تھا کہ اسے اللہ کہہ کر پکارو۔ یہ اس کا ذاتی نام ہے۔ اس میں قربت ہے۔ اس نے زور لگا کر جبڑوں میں پھنسی ہوئی زبان کو ہلایا اور وہ نورانی لفظ اس کے ہونٹوں تک آ گیا۔

''اللہ'' اس کا دل پگھلے ہوئے موم کی پیالی بن گیا اور پیالی چھلکنے لگی۔

اس لمحے میں قربت تھی اور ایک انوکھی لذت تھی۔ ایک مکمل خوشی اور سپردگی...... اس کے حلق میں اٹکی ہوئی کسیلی شے اچھل کر باہر آ گئی تھی اور اس کے منہ اور ناک سے رس رہی تھی۔ اس نے اپنے خون کو زمین پر رینگتے اور پانی سے پھیل کر ڈھلتے ہوئے دیکھا۔ تب اس نے ایک نقوش سے عاری چہرہ بھی دیکھا۔ وہ ایک موٹی سیاہ عورت تھی۔ اس کے چہرے پر آنکھیں، ناک، ہونٹ، کچھ بھی نہ تھا پھر بھی صوفیہ نے اسے پہچان لیا۔ وہ اس کی موت تھی جو اس پر جھک رہی تھی۔ وہ اس سے خائف نہیں ہوئی۔ وہ غمگین بھی نہیں ہوئی۔

کائنات میں کیا تھا جو اس لمحے صوفیہ کی مٹھی میں نہ تھا۔



پرنیاں خطوں کے اس ڈھیر میں گھری ہوئی حیرت سے انہیں تکتی تھی۔ وہ سب اس کے نام لکھے گئے تھے۔ ہر لفظ میں محبت تھی، ہر سطر میں فراق کا عذاب تھا اور جس شخص نے وہ عذاب بھگتا تھا، اس کی پوروں کی کھال ان زرد پڑتے کاغذوں سے چپکی رہ گئی تھی۔ مٹتی ہوئی روشنائی میں اس کے لمس کی باس قید ہو گئی تھی۔ ان میں سے کئی خطوط اردو اور فارسی میں تھے۔ گرانٹ ان دونوں زبانوں سے ناآشنا تھا اور ان میں اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے اسے کس امتحان سے گزرنا پڑا ہوگا، یہ پرنیاں بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی

کہ وہ اس گاڑھ میں کیوں پڑا تھا۔
ایک روز اس نے گرانٹ سے کہا تھا
''مجھے اردو اور فارسی سے عشق ہے۔ اردو سے اس لیے کہ یہ میری قومی زبان ہے اور فارسی سے اس لیے کہ محبت اور محبوب کی کیفیات کا اس سے زیادہ خوبصورت اظہار شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان میں ہوا ہو۔''

'' ہمہ آہوان صحرا سرخود نہادہ برکف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد
(صحرا کے ہرنوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پہ رکھ لیے ہیں، اس آس پر کہ ایک روز تو شکار کو آئے گا)
بیک آمدن ربودی دل و دین و جان خسرو
چہ شود اگر بدنیساں دو سہ بار خواہی آمد
(تیری ایک جھلک پر خسرو نے دل و دین و جان فدا کر دیئے ہیں، اس کا کیا ہوگا جو تُو دو تین بار آئے گا)''

ان گھڑ، خمیدہ حروف جیسے کسی قدیم معبد کی شکستہ سیڑھیوں پر پجاری سجدہ ریز ہوں۔
اس کی روح میں گڑی ہوئی سوئیاں چن کر نکال دی گئی تھیں۔ ایک مسیحا ہاتھ اس کے دل کو تھپک رہا تھا۔ خدا نے اسے گرانٹ کے دل سے کبھی نہیں نکالا تھا۔ خدا اس سے ناراض نہیں تھا۔

✠ ✠ ✠

ایک سفید دھبہ تھا جس کا پھیلاؤ اس کی آنکھوں پر قابض ہو رہا تھا۔ اس میں چمک تھی جو چبھتی تھی اور پپوٹوں کو اٹھنے نہ دیتی تھی۔ چند لمحے کوشش کرنے کے بعد اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔
''صوفیہ! کیا تم جاگ چکی ہو؟''
اس نے چبھنے والی روشنی کی پرواہ کیے بغیر آنکھیں کھول دیں۔
وہ اسپتال کا کمرہ تھا اور وہ سفید چادر والے بستر کے گدے کو اپنی کمر کے نیچے دبتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ دواؤں کی بو سونگھ سکتی تھی۔ درد کی ٹیسوں اور ان کی وجہ کو بھی اس نے شعوری سطح پر قبول کر لیا تھا لیکن وہ اپنی بصارت پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ حقیقت میں عمر کو دیکھ رہی تھی۔
''تم جاگ گئی ہو تو میں ڈاکٹر کو اطلاع دیتا ہوں۔''
''میں سوئی کب تھی جو جاگتی۔ میں تو مر گئی تھی۔''
''ان وحشیوں نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان میں سے دو کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ ایک راہگیر عورت نے ان کی گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ اسی نے پولیس کو تمہارے متعلق اطلاع دی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''
''تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔''
''میں کیا پوچھتا کہ صوفیہ! تم مر گئی ہو یا ابھی تمہارے مرنے میں کچھ دیر باقی ہے۔''
وہ پہلی بار غصے میں نظر آیا اور اس سے پہلے وہ صوفیہ کو کبھی اتنا دلکش نہیں لگا تھا۔
''مجھے پتا ہی نہ چلتا اور میں پاکستان چلا جاتا تو پھر کیا ہوتا۔''
''تو پھر کیا ہوتا عمر؟'' اس نے عمر کے چہرے کو بنا پلک جھپکائے دیکھتے ہوئے نقاہت سے چور آواز میں کہا۔

''جو بھی ہوتا، وہ اچھا ہرگز نہ ہوتا۔ ہماری فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہوگئی تھی اگر میں انتظار گاہ میں نصب ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والا نیوز بلیٹن نہ دیکھ لیتا تو میں یقیناً جا چکا ہوتا۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ تم مرنے تک میرا انتظار کروگی۔''

''میں نے مرنے تک ہی تو انتظار کیا۔''

''میں ڈاکٹر کو بتا کر آتا ہوں۔'' عمر جانے لگا تو وہ بول پڑی۔

''ٹھہر جاؤ اور میری تعریف کرو۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ تم میری تعریف کر سکتے ہو۔''

''میں کر سکتا ہوں لیکن اس وقت میں غصے میں ہوں۔''

''تو میں کیا کروں؟ میں بیمار ہوں۔ ایک غصے میں آئے ہوئے شخص کو کسی بیمار پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔'' اس نے ہٹیلے پن سے کہا۔

عمر حسب عادت جھجک رہا تھا اور اس کی نظریں چھت سے لے کر فرش تک صوفیہ کے سوا کمرے کی ہر شے پر باری باری ٹک رہی تھیں۔

''میں تمہیں دیکھتا ہوں تو میرا دل تشکر سے بھر جاتا ہے کہ اللہ نے مجھے آنکھیں دیں۔''

''تم تو مجھے دیکھتے ہی نہیں۔ تم اب بھی مجھے نہیں دیکھ رہے۔ تم ڈرپ اسٹینڈ کو دیکھ رہے ہو، دروازے کو دیکھ رہے ہو، اسٹول کو دیکھ رہے ہو۔''

صوفیہ نے اسے جھٹلایا۔

''تم بولتی ہو تو میرا جی چاہتا ہے کسی اور کو نہ سنوں۔ میں اپنی آواز تک برداشت نہیں کر سکتا۔''

''کیونکہ تمہیں بولنا ناپسند ہے۔ تم دنیا کے سب سے کم گو انسان ہو۔''

''مجھے ٹوکو نہیں ورنہ میں اور تعریف نہیں کروں گا۔'' وہ جھنجلا رہا تھا۔

''اچھا مزید کہو۔''

''تم ہنستی ہو تو ساری کائنات خوشی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ میرے اندر باہر اجالا ہو جاتا ہے۔''

''تم مجھے ہنسنے ہی کب دیتے ہو۔''

''میں نے تمہیں روتے ہوئے دیکھا تو مجھے خبر ہوئی کہ دکھ کس جنس کا نام ہے، درد کہتے کسے ہیں، تم نے بتایا نہیں کہ کافی کے کپ میں میرے آنسو گرے ہوتے تو تم کیا کرتیں۔''

''میں نہیں بتاؤں گی ورنہ تم غرور کرنے لگو گے اور تمہاری برائیوں میں ایک اور اضافہ ہو جائے گا۔''

''میں پوچھ کر رہوں گا۔'' اس نے اصرار کیا۔

''میں کسی کیمیائی ممتحن سے اس کا تجزیہ کرواتی کہ آنسوؤں کی آمیزش سے کافی کی ماہیت میں کوئی تبدیلی آتی ہے یا نہیں۔''

اس کے زرد چہرے پر چاندی جیسی ہنسی کی دھوپ تھی۔

✠ ✠ ✠

وہ گھومتے ہوئے چاک اور قالب بدلتی مٹی کو مشتاق نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ مٹی کا بے ڈھب تودا کس صورت میں ڈھلے گا۔ کوئی ناند، کٹورا، کلسی یا ٹھیا۔ وہ حیرت سے مٹی کے مقدر کو بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

حکیم بیگم نے سفید بالوں والا سر اٹھا کر عمر کو مخاطب کیا۔

''گل سن کا کا! اے کڑی میری بولی نئیں جاندی۔ (یہ لڑکی میری زبان نہیں سمجھتی)۔''

اس نے مٹی سے لتھڑی ہوئی انگلی سے چاک میں کھوئی ہوئی صوفیہ کی سمت اشارہ کیا۔

''تو اس نوں دس دے (تو اسے بتا دے)۔ میں لکھ ان ولی (بے ہنر) سہی، بے عقلی سہی پر میری نیت وچ (میں) کھوٹ نئیں، میرے من وچ میل نئیں۔''



تمت بالخیر